رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۲۸

کانفرنس گزٹ

یعنی

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

مرتبہ حامد علی صدیقی

جس میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصولِ تعلیم، نظامِ تعلیم مروجہ ملک اور دیگر اہم تعلیمی
امور پر تنقید کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبد السلام

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۳۴۲ھ

(اور صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ سے شائع ہوا)

فہرست مضامین

۱۔ شذرات	ایڈیٹوریل	۱ - ۸
۲۔ مذاہب	"	۱ - ۲
۳۔ نجات حقیقی		۲ - ۳
۴۔ شیش محل	"	۳ - ۴
۵۔ نگار خانہ حکمت	"	۴
۶۔ چپ چاپ دربا و از پڑھا	مولوی کریم احمد خاں بی اے بی کلاس	۴ تا ۸
۷۔ تعلیم التاریخ	سید اشفاق حسین صاحب	۹-۲۴
۸۔ جسمانی تربیت	مسٹر عبد اللہ ابن یوسف علی صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ	۲۵-۲۸
۹۔ کوآپریشن اور ہماری جدوجہد	مولوی عطاء اللہ خاں صاحب جی۔سی۔ایس اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز	۲۹ تا ۳۷
۱۰۔ اصلاح تمدن	سید نثار حسین صاحب	۳۸ تا ۴۶
۱۱۔ مختصر روداد اجلاس کانفرنس		۴۷-۴۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

مذہب مذہب کی سب سے بالائی منزل جس میں ربانیت اور اسرار الٰہی کے سوا کچھ نہیں ایک بالاتر مقام ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس کے خیال محض سے بھی انسان کا نفس امارہ مطمئن نہیں ہوتا۔ البتہ مذہب کی اخلاقی منزل کی کائنات زیادہ تسلی بخش ہے اور اگرچہ ہر ایک قوم و ملت کا مکمل ضابطہ اخلاق الگ ہے مگر کچھ صفتیں سب میں مشترک ہیں اس مسلمہ پر چلیں تو اہل مغرب اور اہل مشرق ہی باوجود اس بعد المشرقین کے کچھ اخلاقی خصوصیات آپس میں مشترک رکھتے ہیں۔ یہاں تک تو خیریت ہے لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھتے ہیں اور یہ جائزہ لینا شروع کرتے ہیں کہ اہل مشرق اُن اخلاقی خصوصیات کو کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اہل مغرب کس طرح۔ تو دونوں طریقوں کا تفاوت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ شاید قارئین کرام کو اس خیال میں ہم سے اختلاف نہ ہوگا کہ تقریباً ہر ایک مذہب کے ارکان عبادت بجائے خود عبادت نہیں بلکہ عبادت یا عبودیت تک پہونچانے کا زینہ ہے اور کسی نہ کسی طرح دنیاوی زندگی پر موثر ہیں۔ ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے مختصر یہ کہ مذہب کا ایک بڑا مقصود حسن اخلاق ہے۔ یعنی انسان میں بلند خیالی۔ اخلاص مندی۔ ادب حق و صداقت سے محبت پیدا کرنا یہ تمام صفتیں ہر ایک آدمی میں ہوتی

چاہئیں خواہ وہ کسی درجہ کا ہو۔ اور اُس کے مشاغل زندگی کچھ ہی ہوں مگر ان صفات کو اہل مشرق محض ارکان مذہبی ادا کرکے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی خارجی شان اور جلوہ آرائی کو وہ بڑی آب وتاب سے دنیا کو دکھاتے ہیں۔ مگر اس امر کا فیصلہ کہ اس طریقہ سے وہ ان اخلاقی صفات کو حقیقتاً اپنے میں پیدا کرسکتے ہیں یا نہیں ہماری قابلیت سے بہت زیادہ ہی قارئین کرام خود فیصلہ کرلیں اور خود ہی یہ بھی طے کرلیں کہ ارکان مذہبی کا مقصود حقیقی کیا ہی۔

دوسری طرف جب ہم اہل مغرب کے نظام عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کا طریقہ حصول بالکل مختلف ہی۔ وہ مقامات مقدسہ اور معابد کی تعظیم اور ادائگی ارکان کے ساتھ ایسی مجلسیں اور سوسائٹیں بھی قائم کرتے ہیں اور ایسے نظام بناتے ہیں جو انسان میں وہ اخلاقی صفات بالفعل پیدا کریں۔

نجات حقیقی

اصل میں دنیاوی زندگی کی کامیابی اور شاید عقبیٰ کی نجات بھی انسان کے طریقہ عمل پر منحصر ہی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ ور جب تک اپنے کام کو اچھی طرح سے نہ سمجھے کامیاب ہو نہیں سکتا۔ مگر کام کے دو رُخ ہیں ایک وہ جس میں اوزار آلات۔ مال مسالا۔ ہنرمندی۔ مشاقی وغیرہ کے متعلق ہی۔ خواہ کوئی پیشہ ہو مگر اس کی تکمیل بغیر ان صفات کے غیر ممکن ہی۔ کام کا دوسرا رُخ عامیانہ نظر سے پوشیدہ ہی یہ اخلاقی۔ اور معاشرتی حسن سے۔ یعنی اس شخص کا اپنے گاہکوں سے یا عوام وخواص سے کیسا برتاؤ ہی۔ یہ مقبول یا معتمد علیہ سمجھا جاتا ہی یا نہیں۔ وعدہ کا سچا بات کا پکا۔ خوش معاملہ ہر دلعزیز ہی کہ نہیں۔ ہر ایک پیشہ کی کامیابی کا ان صفتوں پر بھی کچھ کم انحصار نہیں۔ اول الذکر صفات۔ علم و ہنر اور قوت عمل سے پیدا ہوتی رہتی ہی۔ جن کی کوئی انتہا نہیں۔ آخر الذکر حصہ میں تعداد اور نوعیت کے لحاظ سے بہت تھوڑی اور سادہ باتوں کی ضرورت ہی۔ اور وہ ایسی ہیں کہ ہر ایک

کام اور مشغلہ میں - ناگزیر ہیں - مگر کیا یہ صفتیں مذہبی ارکان کی ظاہری صورت سنوارنے سے پیدا ہو سکتی ہیں - جبکہ قول و فعل پر اس کا کچھ بھی اثر نہو؟ - راے ناقص میں یہ صفتیں عملی مشق سے پیدا ہوتی ہیں - جو بچپن سے شروع ہو کر بڑھاپے تک انسان کا پیچھا نہ چھوڑیں - بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ان مباحث پر اکثر نظر ڈال چکا ہوں - مگر بڑے آدمیوں کے لیے اس قسم کی انجمنوں کا تذکرہ نہیں ہوا -

شیش محل

انگلستان میں اس قسم کی انجمنوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہی - منجملہ اُن کے ایک کی عمارت پر شیش محل کا کتبہ ہی - آئینے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک یہ ہی معمولی مسالے کا شیشہ جو آدمی کی ظاہری معائب کو موبمو دکھا دیتا ہی - اور دوسری قسم کا آئینہ وہ لیکچر اور تقریریں ہیں جن کے وساطت سے سوسایٹی اور قوم کے معائب دلکش پیرایوں میں قوم کے روبرو ظاہر ہو جاتے ہیں - ایسی انجمن حقیقت میں ایک شیش محل ہی ہی جس کی در و دیوار فرش اور چھت سب آئینوں کی ہی اور جب انسان ان میں غیر معروف منظر اور افراد اور اشیا کے وہ رخ جو نظر سے چھپے ہوئے ہیں دیکھتا ہی تو حیران ہوتا ہی انہی میں اُسے اپنے عیب نظر آتے ہیں اور جلد یا بدیر اُن کو رفع کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہی اپنے آپ کو ایک عجب مقام حیرت میں پاتا ہی - ایک آئینہ پیچھے سے پشت اور گدی تک کا عیب سامنے کھول دیتا ہی اور سامنے کا آئینہ چہرے ہر ایک نقص مُنہ پر بیان کر دیتا ہی نظر جدھر گردش کرتی ہوئی جاتی ہی نہ اُسے کہیں قرار ملتا ہی نہ مد بصر -

مگر یہ سب خیال ہی - حقیقی آئینہ وہ لیکچر ہیں جو معمولی آئینہ کی طرح سامعین کو نہ صرف اس کے عیوب و نقائص ہی بتاتے ہیں بلکہ ان کو رفع کرنے کی تدابیر بھی سمجھاتے ہیں - طلبا کو علمی میدان میں وہ دُور دراز کے نظارے دکھلاتے ہیں جو ابھی اُن کے خیال میں بھی نہیں ہیں - مثلاً سائنس کے تماشے - مگر سائنس کی کونسی شاخ ؟ محض معاشرت

اور تہذیب تمدن کی شاخ۔ روزہ کی زندگی کی ٹھوکریں۔ تلخ تجربے۔ ناکامیاں اور اُن کے
اسباب الغرض قومی اور ملی زندگی کے تمام رُخ۔ اس شیش محل میں جھلک کھا کر سبق دیتے ہیں
نگار خانہ حکمت طلباء کو نظر انداز کیجئے تو تمام کاروبار کے آدمیوں کے لیئے
بھی یہ نگار خانہ سبق آموز ہونے سے خالی نہیں۔ امیر و غریب۔ بیکار اور باکار۔
سب ہی ان اخلاقی لیکچروں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً گزشتہ اقوام کی تاریخ تہذیب
و تمدن۔ تاریخ تہذیب اقوام موجودہ۔ اُن کا ایوان معاشرت اصل و نسل۔ علم الحیوانات
اور علم النفسیات کا معاشرتی پہلو۔ علوم و فنون کے تمدنی برکات اور فلسفہ معیشات
معاشرتی جغرافیہ۔ الغرض انجمن کے تمام ملفوظات و مکتوبات کا رُخ معاشرت کی جانب
رہتا ہے جو خیالات ملی کی روح رواں اور قوت محرکہ کا مخفی خزانہ ہے اس نرالی درسگاہ
کے در و دیوار پر طرح طرح کے نقشے آویزاں ہیں۔

اس انجمن نے بعض نہایت ممتاز تصانیف حال ہی میں شائع کی ہیں۔ مثلاً
(۱) انسان اور اُس کا کارنامہ (۲) انسان اور اس کا بازار زندگی (۳) انسان
اور اس کی فتوح فطرت (۴) جغرافیہ اور دنیا کی قوت اعلیٰ (۵) صبح تاریخ کا ظہور
(۶) انسان اور ربع مسکون وغیرہ

ہم ان کتابوں میں سے بعض پر آیندہ وقتاً فوقتاً تبصرہ کریں گے۔

"چپ چاپ" اور "باآواز" پڑھنا

حالات موجودہ اس امر پر اساتذہ کو بالعموم اتفاق ہے کہ تحتانیہ مدارس میں پڑھنا
سکھانا وسطانیہ و فوقانیہ مدارس کی بہ نسبت زیادہ نتیجہ خیز اور امید افزا ہے اس کا سبب
ظاہر صرف یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اول الذکر مدارس میں اساتذہ کا مدنظر ایک خاص مقصد
ہوتا ہے۔

بچہ جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے۔ تو وہ الفاظ کے ایک بڑے مجموعے کو سمجھنے اور زبان سے ادا کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس وقت تحتانیہ کے مدارس کے اساتذہ کا صرف اتنا کام رہ جاتا ہے۔ کہ وہ بچہ کو کتابی الفاظ کا پڑھنا سکھادیں یہ بات عموماً سب کو تسلیم ہے۔ کہ انہیں اس میں ایک خاص درجہ تک کامیابی ہو جاتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ تحتانیہ میں "چپ چاپ" پڑھنا بھی سکھاتے ہیں؟ افسوس ہے کہ ذرہ برابر نہیں۔

ادھر مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ میں بلا آواز علم ادب کی تعلیم پر کوشش کی جا رہی ہے مگر وہاں بھی کامیابی کی غایت حد معلوم ہے محتاج بیان نہیں۔ امریکہ کے ماہران نفسیات نے اُن مضرتوں کو بڑی صحت اور وضاحت سے بیان کیا ہے جو "باآواز" پڑھنے سے اور اس طرز قرءت پر زور دینے سے پہونچتی ہیں اور بتایا ہے کہ "چپ چاپ" نہ پڑھنے میں کیا تعلیمی خطرات پیش آتے ہیں۔ مگر ان کے بیش بہا اقوال اور قیمتی تجربے ہمارے مدرسین کے کانوں تک نہیں پہونچے۔ اس لیے وہ پُرانے طریقہ سے "باآواز" پڑھنا سکھانے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔

حالات موجودہ پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد اور کوئی خاص نتیجہ اخذ کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ "باآواز" اور "چپ چاپ" پڑھنے کا مقابلہ مختلف پہلوؤں سے کیا جاوے۔ اور نتائج کو تجربوں کی مدد سے دکھا کر ثابت کیا جاوے کہ کونسا طریق زیادہ مفید ہے۔

پڑھنے کا اچھا یا بُرا ہونا دو باتوں پر منحصر ہے۔

(۱) رفتار

(۲) اخذ مطلب

اگر رفتار بہت زیادہ ہے۔ اور اخذ مطلب بہت کم ہے۔ تو وہ پڑھنا کسی کام کا نہیں۔ اور اگر اخذ مطلب بہت اچھا ہے۔ اور رفتار بہت کم ہے۔ تو وہ پڑھنا بھی

بے کار ہی لہذا اچھا پڑھنا وہ ہی جس میں رفتار بھی تیز ہو۔ اور اخذ مطلب بھی عمدہ ہو۔

اس سلسلہ میں اگلے زمانے کے ماہران تعلیم کے تجربات بیان کرنا بےموقعہ نہوگا اس سے واضح ہو جائے گا کہ "چپ چاپ" پڑھنے میں "باآواز" پڑھنے کی نسبت رفتار بہت زیادہ ہوتی ہی۔ اور اخذ مطلب بھی بہتر ہوتا ہی۔

۱۔ **رفتار کا مقابلہ** (۱) پنٹنر نے ۱۹۱۳ء میں ۲۳ طالبعلموں کی رفتار کا "باآواز" اور "چپ چاپ" پڑھنے میں مقابلہ کیا۔ یہ سب چوتھی جماعت کے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "چپ چاپ" پڑھنے میں "باآواز" پڑھنے کی بہ نسبت فی لمحہ آٹھ سطریں زیادہ پڑھی گئیں اور "چپ چاپ" پڑھنے کی رفتار "باآواز" پڑھنے کی رفتار سے چالیس فی صدی زیادہ تھی۔

(ب) اوبرائٹر نے جماعت سوم کے اٹھارہ سو طالب علموں کا سوم سے جماعت ہشتم تک مقابلہ کیا اور مفصلہ ذیل نتائج پیش کیے۔

الفاظ جو فی ثانیہ پڑھے گئے

نام درجہ تعلیم	"باآواز"	"چپ چاپ"
جماعت سوم	۲۶۱	۲۶۳
" چہارم	۲۶۳	۲۶۶
" پنجم	۲۶۴	۲۶۱
" ششم	۲۶۸	۳۶۹
" ہفتم	۳۶۱	۴۶۷
" ہشتم	۳۶۹	۴۶۸

اس سے ظاہر ہی کہ "چپ چاپ" پڑھنے کی رفتار "باآواز" پڑھنے کی رفتار کی بہ نسبت ہر جماعت میں زیادہ ہی۔ اور یہ نسبت زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہی۔

(ج) میڈ نے جماعت ہشتم کے سو طالب علموں پر ۴۴ مختلف مدارس میں تجربہ کیا۔ اور ثابت کیا کہ "چپ چاپ" پڑھنے میں باآواز پڑھنے کی بہ نسبت رفتار یقیناً بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔

۲۔ اخذ مطلب کا مقابلہ (۱) میڈ نے ۱۱۲ طالب علموں کو جانچا اور مفصلہ ذیل نتائج اخذ کیے۔

پڑھنے کا طرز	فی صدی اخذ مطلب
"چپ چاپ" پڑھنا	۳۸۶۷
"باآواز" پڑھنا	۳۲۶۲

اس نے پانچ اور جماعتوں کے طلبا کی جانچ کی اور ثابت کیا کہ "چپ چاپ" پڑھنے میں "باآواز" پڑھنے کی نسبت زیادہ عمدہ اخذ مطلب ہوتا ہے۔

(ب) پنٹنر نے ۲۳ طالب علموں کو آٹھ مرتبہ آزمائش کی۔ نتائج حسب ذیل ہیں۔

طرز	اوسط تعداد جوابات
"چپ چاپ" پڑھنا	۱۸
"باآواز" "	۱۵

مندرجہ بالا جدولوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ "چپ چاپ" پڑھنا "باآواز" پڑھنے کی نسبت بلحاظ رفتار اور اخذ مطلب زیادہ برگزیدہ اور فائدہ مند ہے۔

اس بحث سے ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے یہ کہ مدرسہ چھوٹنے کے بعد کونسا طریق زیادہ کارآمد ہے۔

ظاہر ہے، کہ دنیا میں زیادہ کام "چپ چاپ" پڑھنے سے ہی پڑتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کہ ہم اپنے بیمار دوست کو کوئی کہانی یا احباب کو اخبار پڑھ کر سنائیں

دنیا میں زیادہ کام ہم کو اس بات سے پڑتا ہے، کہ ہم کتاب یا اخبار خود پڑھ کر جتنی جلد ممکن ہو۔ اپنا مطلب اخذ کر لیں۔

مقابلہ بلحاظ علم نفسیات

اگر پڑھنے کے عمل کی تفرید کی جائے تو معلوم ہو گا کہ کونسا طریق زیادہ سادہ اور آسان ہے اور کسی طریق سے دماغ پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔

علم نفسیات ہم کو سکھاتا ہے کہ پڑھنے کے عمل سے جسم میں مفصلۂ ذیل افعال سرزد ہوتے ہیں۔

(خاموش پڑھنے کی صورت میں) (۱) مہیج کا آنکھ کی پتلی پر آنا۔

(۲) آنکھ کی پتلی پر صاف صاف استبصار کی وسعت۔

(۳) توجہ کی استبصاری مہیج کو سمجھنے کی وسعت۔

(۴) آنکھوں کی حرکت۔

(۵) استبصاری ارتسام کی آنکھ کی پتلی سے دماغ کے استبصاری مرکز میں تبدیلی۔

(۶) عمل تلازم کا ظہور جس سے دماغ میں آنے والے احساسات سمجھے جاتے ہیں۔ چھٹے درجہ پر آکر پڑھنے کا عمل پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے۔ اور دماغ میں مہیج کا شعور پیدا ہو جاتا ہے "چپ چاپ" پڑھنے میں صرف مندرجہ بالا اجزا کی ضرورت ہے۔

(باآواز پڑھنے کی صورت میں)

(۷) احساسات کی استبصاری مرکز سے بولنے کے مرکز میں تبدیلی۔

(۸) تحریکی احساسات کی دماغ کے بولنے کے مرکز سے بولنے کے اعضا (مثلاً ہونٹ زبان وغیرہ) میں تبدیلی۔

(۹) بولنے کے اعضا کی حرکت جس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

(۱۰) بولنے کی دماغ کو اطلاع۔

تو معلوم ہوا کہ "باآواز" پڑھنے سے دماغ کو چار اور افعال انجام دینے پڑتے ہیں۔ جس سے دماغ جلد تھکتا ہے۔ کیونکہ اس کی توجہ بٹ جاتی ہے اور طاقت زیادہ صرف ہوتی ہے۔

ان مختلف پہلوؤں سے "چپ چاپ" اور "باآواز" پڑھنے کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اظہر من الشمس ہے۔ کہ "چپ چاپ" پڑھنا زیادہ فائدہ مند ہے اس لیے ہمارے مدارس کے نظام اوقات میں اس کے لیے خاص وقت ہونا چاہیئے۔

کریم احمد خاں۔ بی۔ اے۔ بی ٹی متعلم درجہ ایم۔ بی ٹی

تعلیم التاریخ

(از جناب سید اشفاق حسین صاحب بی۔ اے بی۔ ٹی کلاس)

تاریخ کیا ہے

دورِ حاضرہ کی حیرت انگیز علمی ترقی نے اس مغالطہ کو بالکل رفع کر دیا ہے کہ تاریخ جنگ آزماؤں کی صف شکنی۔ عالم سیاسیات کی کشمکش اور مختلف قوموں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی ایک مسلسل داستان ہے اور صرف اُن واقعات کی بقید تاریخ ایک مکمل فہرست ہے جو مختلف ممالک میں مختلف اوقات میں پیش آتے رہے ہیں اب بجائے اس کہنہ عقیدہ کے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ تاریخ بنفسہٖ ایک مستقل علم ہے جس کا موضوع عمرانِ بشری و اجتماع انسانی ہے۔

تاریخ گویا وہ عالم ہے جس میں نظر ڈالتے ہی تجربہ کا آفتاب نور افشانی کرتا ہوا نظر آتا ہے جس سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ شاہراہ ترقی ایسی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہزاروں گم کردگانِ راہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ایسی بزم عام ہے جہاں ہر علم و فن کے باکمال اساتذہ کی زیارت کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ رہنمایان ترقی فدائیان ملک و ملت ارباب علوم و فنون۔ صاحبان صنعت و حرفت۔ ماہران علم و حکمت وغیرہ وغیرہ سے حسب لیاقت فیض صحبت حاصل ہو سکتا ہے۔

دنیا میں کوئی شے ایک حالت پر قائم نہیں رہتی روز بروز نہیں بلکہ لحظہ بلحظہ تغیر پذیر رہتی ہے

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

(اقبال)

نہ صرف انسانی زندگی بلکہ وہ تمام اشیا جو کارخانۂ قدرت میں کام کر رہی ہیں قانون انقلاب کے اثر سے محفوظ نہیں عالمگیر اصول کی بنا پر ہر شے جداگانہ اپنی تاریخ رکھتی ہے

جو بتاتی ہے کہ اُس شئے مخصوص کی کیا حالت تھی آج کیا ہے اور انداز کل کیا ہوگی۔

بکل تاریخ کی یہ تعریف کرتا ہے کہ انسان کے حالات میں جو تغیرات نیچر کرتی ہے اور نیچر میں جو تصرفات انسان کرتا ہے اُن تغیرات و تصرفات کو علم تاریخ بیان کرتا ہے۔

ہیروڈٹس کا قول ہے کہ جب ایسے عظیم الشان اجتماعاتِ انسانی وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ جن کے اثراتِ گوناگوں نتائج اور متنوعہ تعلقات کے (مثلاً سیاسی۔ تمدنی۔ مذہبی۔ علمی) منتج ہوں تو اُن کے بیان کا نام تاریخ ہے۔

ہیلی کی رائے میں تاریخ انسان کی اجتماعی اور انفرادی کامیابیوں اور مایوسیوں کا روزنامچہ ہے جو اُسے اپنا اقتدار قائم رکھنے اور اختیار حاصل کرنے کی جنگ و پیکار میں بالمقابل نظر آتی ہیں۔

تاریخ میں رستخیز انسانی کے وہ تمام پہلو شامل ہیں جو یکے بعد دیگرے عقال جہاں کی ژرف نگہی کو تجربہ کی روشنی میں نظر آتے رہے۔

مختصر یہ کہ تاریخ وہ علم ہے جس سے حضرت انسان کی اُن درجہ بدرجہ ترقیوں کا حال معلوم ہوتا ہے جو اُس نے نوع انسان کا ایک فرد ہونیکی حیثیت سے کیں۔

فن سیرت (Biography) جو علم تاریخ کی ایک شاخ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور تاریخ کا مابہ الامتیاز یہی ہے کہ اول الذکر میں اس کی حیثیت صرف انفرادی ہوتی ہے۔

بہت سے علوم ایسے ہیں کہ اگر علم تاریخ کی حدود کو وسعت دیجائے تو وہ سب اس کی وسعت میں اس طرح سما جائیں کہ اس کے صرف مختلف پہلو معلوم ہوں۔ مثلاً

۱ اقتصادیات (معاشیات) Economics

۲ اجتماعیات (معاشرت) Sociology

۳ سیاسات Politics

۴ **عضویات** Anthropology

اقتصادیات کا عالم انسانی زندگی کی صرف وہ پہلو اپنے مطالعہ کے واسطے منتخب کر لیتا ہے جس کی مدد سے وہ اُس کی اُن کارگذاریوں کی کامیابی اور ناکامی کے متعلق نتائج استنباط کرتا ہے جو وہ اپنی اقتصادی زندگی کے قیام کے واسطے عمل میں لاتا ہے۔

اجتماعیات کا ماہر اُن اجزا کی واقفیت کی تحصیل میں تگ و دو کرتا ہے جن سے انسان کی اجتماعی زندگی مرکب ہے۔ یا اُن اسباب کی ریشہ دوانی کرتا ہے جو سوشل تغیرات کے موجب ہوئے ہیں۔

سیاسیات کا ہیرو اپنی زندگی نظام حکومت کے مطالعہ میں اور حاکم و محکوم کے تعلقات اور سلطنتوں کے عروج و زوال کے اسباب کی سراغ رسانی میں وقف کر دیتا ہے۔

عضویات کا فاضل اعضائے انسانی کی تشریح اور اُن کی درجہ بدرجہ نشو نما کے متعلقہ مسائل سے بحث کرتا ہے۔

اگر وسعت نظری سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب علوم علم سیر ہی کی مد میں واقع ہوتے ہیں:۔

علاوہ ازیں بعض علوم ایسے ہیں جو تاریخ سے ایسا ہی تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ لازم اپنے ملزوم سے بعض علوم اس کے ماخذ ہیں اور بعض اس کے معاون مثال کے طور پر چند کے نام درج کرنے کے بعد اُن کے تعلقات کا ذکر کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا

۱ **جغرافیہ** Geography

۲ **علم ادب** Literature

۳ **فن ڈراما** Drama.

۴ فن ڈرائنگ Drawing

۵ فن تقریر Oratory

۶ فن داستانگوئی Story telling

قدیم الایام کا یہ خیال آجکل بجا طور سے رد کیا جا رہا ہے کہ ہر مضمون اپنی نوعیت میں دیگر مضامین سے اسقدر اختلاف رکھتا ہے کہ باہمی تعلق قطعی ناممکن ہے اس لیے ایک کی تعلیم کے وقت دوسرے کا ذکر بھی خیالات میں الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا رد مناسب موقع پر آئندہ درج کیا جائے گا یہاں صرف اسقدر کہدینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ وہ طریقہ تعلیم جو اس خیال کی بنا پر اختیار کرنا پڑتا ہے نہ صرف دلچسپی سے خالی ہوتا ہے بلکہ طلبا کی قوت متخیلہ کی پرواز کو روکتا ہے۔

تاریخ کا تعلق جغرافیہ سے

۱ تاریخ اور جغرافیہ کا باہمی تعلق اسقدر گہرا ہے کہ ایک کی تعلیم کے وقت دوسرے کا لحاظ کرنا اس کی امداد اس کے حوالہ جات لابدی ہیں اگر جغرافیہ کا جداگانہ مطالعہ نہ کیا جائے۔ تو تاریخی واقعات کے سمجھنے میں جسقدر علم جغرافیہ حاصل ہو جاتا ہے وہ کافی وافی ہوتا ہے۔

کارلائل کا قول ہے کہ اگر تاریخ و جغرافیہ ساتھ ساتھ پڑھائے جائیں تو جغرافیہ کا اتنا ہی علم طالبعلم کو حاصل ہو سکتا ہے جتنا کہ اس کے علیحدہ مطالعہ سے۔

ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ کتاب تاریخ کو بغیر نقشہ سامنے رکھے ہرگز مطالعہ نہ کرنا چاہیے ہر اُس مقام کی جستجو نقشہ پر کرنی ضروری ہے جس کا نام مصنف اپنی تاریخی تصنیف میں لایا ہے اُس قطعہ زمین کا پورا اور صحیح نقشہ۔ درست محل وقوع ذہن نشین ہونا ضروری ہے جسکی تاریخ تمہارے زیر مطالعہ ہے اس کے بغیر نہ تم اُس قطعہ زمین کی تاریخ کو سمجھ سکتے ہو اور نہ یاد کر سکتے ہو۔

ڈبلیو سی۔ کالر کی رائے میں آن تاریخی معلومات کی بنا پانی پر ہے جنکو جغرافیہ

کی امداد سے مستغنی ہو کر حاصل کیا گیا ہو۔

ہنسڈیل اپنی تصنیف (How to study and teach history)

میں کہتا ہی کہ پولیٹیکل جغرافیہ تاریخ کی ایک شکل مخصوص کا نام ہے یا یوں کہیے کہ تاریخی واقعات کے نتائج کی ایک تصویر ہے جو کاغذ پر کھینچدی گئی ہے۔

مس سالمن (miss Salmon) کہتی ہے کہ تاریخ کا انحصار اس ملک کی جغرافیائی حالت پر بدیہی ہے۔

تاریخ کیا ہے۔ نوع انسان کی اُس نقل وحرکت کا بیان ہے جو وہ زندہ رہنے کی خاطر ایک ملک سے دوسرے ملک میں کرتا ہی لیکن اُس نقل وحرکت کی وجہ اگر کوی خیال میں آسکتی ہی تو وہ جغرافیائی حالت ہے مثال کے طور پر ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیئے قوم آریہ نے ترکستان کو کیوں چھوڑا۔ ہندوستان ہی کا کیوں رخ کیا۔ کسی اور ملک کو جائے اقامت کیوں نہ قرار دیا۔ ہندوستان شروع سے لیکر آجتک غیر اقوام کے حملوں کی آماجگاہ کیوں بنا رہا۔ اسکی ابتدائی قومیں یا وہ قومیں جو اس میں ایک عرصہ تک سکونت پذیر رہیں اور ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈالکر اپنے گلے میں طوق ہزیمت کیوں ڈالتی رہیں۔ ان سب سوالوں کا جواب صرف سرزمین ہندوستان کی زرخیزی اور کثرت پیداوار ہی ہی ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ہے اور یہی انجام

کسی ملک کی تجارتی اور حرفتی ترقی اور سوشل اور کانسٹی ٹیوشنل پیش قدمی کی مدار غیر ممالک اور دیگر اقوام کے ساتھ راہ رسم ہے اور یہ راہ ورسم اس ملک کے محل وقوع پر مبنی ہوتی ہے۔

کسی ملک کے قدرتی مناظر اس کے باشندوں کے مطمح نظر اور عقائد پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

پہاڑوں کے دامن۔ دریاؤں کے طاس۔

ساحل سمندر۔ کوہستان اور صحرا ملک کی تاریخ میں اپنا اپنا جداگانہ کام انجام دیتے ہیں نہر سویز نے تجارتی تاریخ کا اک نیا ورق پلٹا ہے شہروں کے محل وقوع کی بنیادیں بھی جغرافیائی اصول کام کر رہے ہیں۔

ابتدائے آفرینش میں انسان کو محض اپنی حفاظت کا خیال پیدا ہوا اس خیال اور دیگر ضروریات نے اسے سمجھایا کہ مکان پہاڑوں کے اوپر بنانے چاہئیں۔ تمدنی اور تجارتی ترقی کے ساتھ شہروں کے محل وقوع میں اور باتوں کا بھی خیال رکھا جانے لگا اس لیے وہ دو دریاؤں کے مقام اتصال اور اون کے دہانوں اور کناروں کے قریب بسنے شروع ہوئے الہ آباد۔ دہلی۔ آگرہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جاپان کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے اسکی حیرت انگیز ترقی کی اصل وجہ کیا ہے اس کی وہ سہولتیں جو اس کا محل وقوع اس کو بہم پہنچاتا ہے۔ یہی اصلی وجہ ہو سکتی ہے۔

غرضکہ تجارتی شاہراہیں جنگی کارروائیاں۔ رسوم و رواج۔ خیالات و عقائد وغیرہ وغیرہ سب کی بنیاد ملک کی جغرافیائی حالت ہی۔

مسٹر ڈیل ایک اور مقام پر لکھتا ہی کہ وہ تاریخی واقعات جو بغیر معاونت جغرافیہ مطالعہ کیے جائیں اتنے ہی فرضی اور وہمی معلوم ہوتے ہیں جتنے وہ واقعات جو اس مخلوق کی طرف منسوب کیے جائیں جو چاند میں بسی ہوئی ہے۔

یہ کہنا بالکل واقعات پر مبنی ہوگا کہ تاریخی واقعات جغرافیائی مقامات کو اہمیت دیتے ہیں مختلف مذاہب کے مقامات مقدسہ کیوں مرجع انام ہیں محض اسوجہ سے کہ ایثار کے مجسموں نے ان مقامات کو ایک بڑی زندگی دیدی ہی عرب کی اہمیت اس تاجدار مدینہ کی ذات ستودہ صفات سے وابستہ ہے جو انک لعلی خلق عظیم کا مصداق ہے طور سینا کا نام محض کلیم اللہ سے اور فلسطین کا خلیل اللہ سے زندہ ہے۔

غرضکہ جغرافیہ ملزوم ہے جس کا لازم تاریخ ہے ایک گمے بغیر دوسرا بے معنی اور

فضول ہے۔

تاریخ اور علم ادب جتنا گہرا تعلق تاریخ کا جغرافیہ کے ساتھ ہے اتنا ہی علم ادب کے ساتھ ہے ادبیات کی بہترین تصانیف تاریخی مواد کا بہترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ علم ادب کیا ہے۔ اقوام کے خیالات کا مرقعہ یا اُن کے کارناموں کی لفظی تصویریں ہیں علم ادب سے اُن اقوام کے مطمح نظر۔ ان کے مذہب ان کی روزانہ زندگی اُن کا معیار اخلاق وغیرہ کے متعلق وحسب معلومات بہم پہنچ سکتی ہیں اس قوم کے تاریخی کارناموں کی تاویل صرف ان کے خیالات کر سکتے ہیں اور یہ خیالات علم ادب بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر شاہنامہ کو لیجئے گو دور حاضرہ کے لفظ 'تاریخ' کا صحیح طور سے اس پر اطلاق نہیں کیا جاسکتا تاہم اس کی تاریخی حیثیت کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ اُس زمانہ کے عجمیوں کی معاشرت۔ نظام حکومت۔ رسم و رواج کی ایک پوری تصویر ہے اُس سے سلطنت کے آئین و قوانین۔ فوجی نظام اور دیگر تاریخی مسائل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان کی قدیم رزمیہ نظمیں مثلاً مہابھارت اور رامائن گو کہیں کہیں واقعات کو روایات کے پردوں میں چھپا دیتی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس زمانے کی تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ہیں۔

ڈبلیو۔ سی۔ کالر۔ کا قول ہے کہ بچوں کی قوت متخیلہ کی تربیت کے واسطے وہ امداد بہترین کہی جاسکتی ہے جو کہ تاریخی نظمیں دیتی ہیں۔

فن ڈرامہ اور ایکٹنگ کی امداد سے طلبا گذشتہ قدیم سوشیل زندگیوں کی اصلی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایکٹروں کا لباس۔ اُن کی زبان۔ وضع قطع گذشتہ ایام کی رسم و رواج کو اصلی رنگ میں دکھا دیتے ہیں۔ اردو میں اس قسم کے ڈراموں کا فقدان اس کا مترادف نہیں کہا جاسکتا کہ فن ڈرامہ سے کوئی تاریخی فائدہ مترتب نہیں ہوتا

ڈرائنگ کی ضرورت ۔ لڑائیوں کے پلین یا خاکے کھینچنے میں بدیہی ہے

علم تاریخ کی تاریخ

تاریخ کی تعریف اور ماہیت بتانے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اسکی تاریخ بیان کیجائے یعنی یہ کہ اسکی ابتدا کیوں ورکب ہوئی اور اس نے موجودہ صورت کس طرح اختیار کی اُن مدارج کو حیطۂ تحریر میں لانا جو اس نے موجودہ زمانے تک طے کیے ہیں تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ایک حد تک ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ طریقہ تعلیم پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ کہنا بالکل سچ ہوگا کہ اس کی تعلیم کا بہترین طریقہ خود اس علم کے ارتقا میں مضمر ہے نیز یہ کہ صرف وہی طریقۂ تعلیم نیچرل ہوگا

Method according to nature

اس اجمال کی تفصیل تو مناسب موقعہ پر درج ہوگی لیکن یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب طالب علم تحصیل تاریخ کے درجۂ اولین میں قدم رکھے تو تاریخ کو درجہ ابتدائی ہی کی صورت میں اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

دورِ حاضرہ کا یہ ایک علمی اصول ہے کہ دنیا میں جسقدر علوم وفنون ہیں وہ سب ایک مسلسل اور تدریجی ترقی کا نتیجہ ہیں علم تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے یہ علم مختلف صورتیں اختیار کرتا چلا آیا ہے۔ اور مختلف سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے

پہلی منزل

انسانی سرگذشت کا پرانے سے پرانا ورق بھی تاریخ کے وجود کا شاہد ہے۔ ہندوستان کی پرانی رزمیہ داستانیں رامائن ومہابھارت گویا اسکی تاریخ کا پہلا زینہ ہیں جن کے واقعات گو وہم وقیاس کے پردوں میں پنہاں ہیں تاہم آفتاب تاریخ کی مدہم مدہم شعاعیں ضرور ضوفگن ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان کو دنیا میں آئے عرصہ نہ گزرا تھا۔

یاد ایام کہ بیرنگ تھی تصویر جہاں | دست مشاطہ نہ تھا محرم زلف دوراں
گلِ خود رو سے سبا تھا چمن کون ومکاں | چار سو حسن خداداد کا سکہ تھا رواں

وضع عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک

خط قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

اصل سے دور بہت ہونے نہ پائے تھے ابھی — دیس سے چھوٹ کے پردیس میں آئے تھے ابھی

دن جدائی کے نصیبوں نے دکھائے تھے ابھی — ڈال سے توڑ کے بازار میں لائے تھے ابھی

عرصہ گذرا تھا مسافر کو نہ غربت میں بہت

جی لگا تھا نہ ابھی غیروں کی صحبت میں بہت

(حالی)

کارخانہ قدرت کے گوناگوں مناظر اس کے حیرت انگیز واقعات لیل ونہار کے تغیرات اس کے دل پر ایک خاص اثر پیدا کرتے تھے۔ یہ اُن سے متاثر ہو کر اُن کیفیات کو تشبیہات کے رنگ میں ادا کرتا تھا۔ تجربہ شاہد ہے کہ آج بھی وہ وحشی اقوام جو اب تک تہذیب کے حقیقت کش اثرات سے اثر پذیر نہیں ہوئی ہیں جن کے دل و زبان میں ایک قانون کی پابند ہیں اپنی سادہ گفتگو استعاراتِ قریبہ کے انداز میں ادا کرتے ہیں مثال کے طور پر اگر کسی حبشی کو یہ کہنا ہو کہ فلاں شخص میرا ہمسایہ ہے تو اسکو یوں ادا کرے گا کہ میرے گھر کے درختوں کی پتیاں اُس کے گھر میں اُڑ کر جاتی ہیں۔ یہی سادہ خیال لفظ ہمسایہ میں توڑ مروڑ کر رکھا گیا ہے پہلی چیزیں جو اُسکی توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہیں وہ قدرت کی طاقتیں ہوتی ہیں رعد اپنی مہیب آواز سے اپنی ہیبت ناک طاقت کا اظہار کرتی ہے۔ تند ہوا درختوں کو اُکھاڑ پھینک کر اپنی تباہ کن قوت کا رعب اس کے دل پر بٹھاتی ہے علیٰ ہذالقیاس سورج چاند۔ بادل۔ پانی۔ زمین آسمان شفق وغیرہ مظاہر قدرت اُسے عین قدرت اور مخلوقات اُسکو عین خالق کے رنگ میں نظر آتی ہیں اس لیے وہ بے اختیار اُنکی پرستش شروع کر دیتا ہے اور جب اُس کے عقیدتمندی کے جذبات جوش میں آتے ہیں تو وہ اُن کا اظہار شاعرانہ انداز میں کرتا ہے اور یہی نظمیں (اگر صحیح معنی میں وہ اس نام کی مستحق ہوں) قدیم انسانوں فرضی اساطیر (mythology) کے رنگ میں تاریخ کی منزل اولین بنجاتی ہیں اس میں کوئی شک

نہیں کہ واقعات جو ان میں مذکور ہوتے ہیں مافوق العادت اور خلاف فطرت ہوتے ہیں لیکن انہیں اس خیال سے نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہوتا گو عین حقیقت ایں نہیں ہوتی تاہم اس زمانہ کے مذہب۔ اس وقت کے خیالات اس عہد کی تہذیب کا صحیح صحیح نقشہ قارئین کے پیش نظر کرتی ہیں۔

علم تاریخ کی دوسری منزل

جب انسان ترقی کے زینہ پر چند سیڑھیاں اور چڑھا اور اس کے تجربے نے اور زیادہ وسعت اختیار کی دل و دماغ کی پنہاں قوتیں عیاں ہونیکے واسطے بے قرار ہونے لگیں تو انہوں نے ان عقائد و جذبات کی داستانوں کو ایک نیا رخ دینا شروع کیا۔ یعنی چیدہ چیدہ افراد انسانی جن کو خداوند حقیقی نے مقابلۃً غیر معمولی طاقت جسمانی اور قوت روحانی عطا فرمائی تھی اپنے ہمجنسوں سے خراج تحسین و تعجب وصول کرنے لگے

ان عظیم الشان ہستیوں کے کارنامے زبان زد خلائق ہوئے انکی داستانیں نسلاً بعد نسلاً ورثے کے طور پر اعقاب و اخلاف تک پہنچنے لگیں لیکن اس حالت میں بھی یہ داستانیں حقیقت سے بعید اور غیر عادی اور فوق العقل مبالغوں سے مملو ہیں بہادری اور جانبازی کی داستانیں اسطرح لکھی گئیں جنکو عقل انسانی ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ مہا بھارت کے ہیرو بھیم کی نسبت یہ روایت تحریر ہے کہ ایک مرتبہ اس نے غیظ و غضب کے عالم میں ایک بہت بڑے درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر اپنے مخالف کی طرف اس طرح پھینکا جس طرح کوئی تنکا اٹھا کر پھینک دے یا رستم کی طاقت جسمانی اسقدر بڑھا کر دکھایا کہ جب وہ چلتا تھا تو زمین کی چھاتی دہلتی تھی اور اس کے پاؤں چلتے ہوئے زمین میں اسطرح دھس جایا کرتے تھے جیسے کہ ریت میں، مانا کہ یہ بیانات سراسر خلافِ عادت اور ناقابلِ اعتبار ہیں تاہم یہ نتیجہ ضرور نکالا جاسکتا ہے کہ یہ ایک بڑے طاقتور اور قوی ہیکل شخص کی قوت جسمانی اور دلیری کی مبالغہ آمیز تعریف ہے ؎

منش کردہ ام رستم داستاں　　　　دگرنہ یلے بود در سیستاں

ان بیانات کی اصلیت یہ اصول فطری ہے کہ ابتدائی تہذیب میں عظمت وطاقت کی قدر نہیں بلکہ پرستش ہوتی تھی س لیے اُس زمانے میں جو جو غیر معمولی ہستیاں ہوتہین انکو اُنکے مداح آسمان پر چڑھا دیا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہو کہ دنیا میں بڑے بڑے لوگوں کی بابت مبالغہ آمیز روایتیں اکثرت سے پھیل جایا کرتی ہیں - جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہی ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہی اور آخر کار "پیراں نمے پرند مریداں مے پرانند" کا مضمون ہو جایا کرتا ہی - مثال کے طور پر بدھ ہی کو لیجیے اُس نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا مگر اُس کے پیروں نے نہ صرف اُسے اوتار بنایا بلکہ مرنے کے بعد اسکی پرستش بھی شروع کر دی خیر یہ مثال تو زمانہ قدیم کی ہے ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

تعجب کی حد تو اس وقت نہیں رہتی جب کہ سیوا جی کو وشنو جی کا اوتار مانکر پوجا جاتا ہی انکے زمانے کی معتبر تاریخیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ وہ ایک معمولی انسان تھا اور جو اعلیٰ مرتبہ انسانیت کے معیار پر بھی پورا نہیں اترتا ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

(حالی)

ایک نہیں دو نہیں متعدد واقعات بالتصریح بتاتے ہیں کہ وہ لوٹ مار کا بندہ تھا و وقت پر مکر و فریب سے نہ چوکتا تھا - ایفائے عہد اُس کے مذہب میں گناہ تھا تاہم اُسکی پیدائش معجزہ سے وقوع پذیر ہوتی ہے وہ شیو جی کا اوتار ہے ایک ہستی جس پر جامہ انسانیت بھی کوتاہ ہو قابل پرستش ہو جاتی ہی ع -

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک حد تک وہ بیچارے بالکل بے قصور ہیں

کیونکہ قدرت نے انسانی فطرت میں الفت مشاہیر (ہیرو ورشپ) انتہا درجہ کی رکھی ہے۔

علم تاریخ کی تیسری منزل یہ علم تاریخ کی دوسری منزل تھی اسکی تیسری منزل میں واقعیت وحقیقت کے آثار پائے جاتے ہیں تاریخ تاریخ کی حیثیت سے معرض تحریر میں آتی ہے اب یہ محض ایک ایسی داستان نہیں ہی جس کا مقصد بزرگوں کی عظمت کا اظہار ہو بلکہ واقعات واقعیت کی روشنی میں نظر آتے ہیں اب اس کی حیثیت گویا واقعات کی ایک مسلسل فہرست کی سی ہے ملک کی اندرونی حالت باشندوں کی معاشرت واقعات کے علل ونتائج اب تک اس کی حدود میں داخل نہیں ہوتے۔

ہیروڈوٹس یونان کا پہلا مورخ ہے جس نے اس کے حدود کی اتنی وسعت دی کہ سوسائٹی کے اندرونی اور بیرونی حالات۔ اثرات اور تغیرہ واقعات بھی اس کی زد میں آگئے۔

چوتھی منزل جب انسان کی غور وفکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ واقعات کو صرف سطحی اور سرسری نظر سے دیکھنے کا عادی نہ رہا بلکہ واقعات کی رفتار اور علت ومعلول کا اندازہ کرنے لگا واقعات سے نتائج مترتب کرنے لگا اور ان نتائج کی بنا پر کلیتے قائم کرنے لگا۔ انسانی خیالات اور تصورات کی ترقی اور رفتار کو قوانین کا پابند بنایا بیرونی واقعات کے اثرات اندرونی خیالات پر اور اندرونی حالات کے اثرات بیرونی واقعات پر معلوم کیے اسکی مثال یوں سمجھیے کہ جب برہمنوں کی خودکامی حد سے بڑھ گئی جب انھوں نے یگیہ (قربانی) کو اپنی حرص اور زرپرستی کی آڑ بنالیا تو مہاویر اور گوتم بدھ اس عالمگیر نفرت دبےچینی کو جو برہمنوں کے خلاف عامۃ الناس میں پھیل رہی تھی محسوس کرکے قربانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے سرے سے قربانی ہی کو مہمل قرار دیا چونکہ ان کی آواز خلق خدا کی

آواز تھی اس لیے برہمنوں کو سر دست نیچا دیکھنا پڑا اس واقعہ سے مورخ نے نتیجہ نکالا کہ خود کامی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو زوال کی طرف منجر ہو جایا کرتی ہے جب اُس نے دیگر اقوام کے زوال پر نظر دوڑائی تو اس نتیجہ کی تصدیق ہوئی اور ایک نہیں بہت سی مثالیں ایسی نظر آئیں کہ جن میں ایسی دیمک نے قوموں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ ان مثالوں کی بنا پر مورخ نے یہ کلیہ قرار دے لیا کہ خود غرضی جب کسی قوم کے افراد میں پھیل جاتی ہے تو وہ قوم قعر مذلت کی جانب رخ کر لیتی ہے۔

سلطنت مغلیہ کی مثال پیش نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ جب عیاشی۔ تن آسانی حد سے بڑھ گئی تو دو سو سال سے زیادہ کی مستحکم سلطنت محمد شاہ رنگیلے کے عہد حکومت میں چند سالوں میں پاش پاش ہو گئی جب مورخ نے دیگر اقوام کے زوال کے اسباب معلوم کیے تو یہ سبب سب سے نمایاں اور پر اثر دکھائی دیا نتیجہ نکالا کہ تن آسانی قوم کو اوج ترقی سے حضیض تنزل میں گرا دیتی ہے۔

اس مادی ترقی کے ساتھ ساتھ نظام معاشرت کی سادگی میں فرق آتا چلا گیا اور زندگی کی داستان پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی اس حالت میں جب تاریخ لکھی گئی تو وہ واقعات کی صرف ایک فہرست نہ رہی بلکہ واقعات کے اسباب و نتائج کی ایک فلسفیانہ تشریح ہو گئی ابن خلدون کے علمی ذوق۔ وسعت مطالعہ اور سیاحت نے رفتار علم تاریخ کو اور بڑھا دیا اور اس نے اپنی کتاب لکھ کر تاریخ کو ایک مستقل علم قرار دیا مگر اب تک بھی تاریخ کو اتنی وسعت نصیب نہ ہوئی تھی کہ وہ اقوام کے عروج و زوال کی بھول بھلیاں سے قدم باہر نکالے یورپ میں سب سے پہلے میکی ولی Machiavelle نے فلسفیانہ تاریخ کی بنیاد ڈالی اس کے بعد جرمنی اور انگلستان میں ایسے مورخ پیدا ہوئے جنہوں نے سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں کو تاریخی روشنی میں نمایاں کیا۔

گیزو (Guizot) نے فرانس میں تاریخ تمدن لکھ کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

اب تاریخ فن نہیں سائنس ہے جس میں شاعری فلسفہ وغیرہ سب کچھ شامل ہے اب مورخ کے واسطے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف فلسفہ کا دماغ بلکہ مصور فطرت کا قلم بھی رکھتا ہو۔ فلسفیانہ طور پر واقعات کا صحیح صحیح طور پر اندازہ بھی کرے اور جادو نگار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی تصویر بھی کھینچے اس وجہ پر پہونچکر طالب علم یہ خیال نہیں کرسکتا کہ بادشاہوں کی تخت نشینی برطرفی جنگ وصل فتح وشکست مردانگی وشجاعت کی داستانیں پڑھ رہا ہے بلکہ وہ اندازہ لگاتا ہے کہ مختلف زمانوں میں اخلاق کا کیا کیا معیار رہا ہے ملکی اور مذہبی انقلابات کے اسباب کیا ہیں اُسکے واسطے تاریخ رسم ورواج۔ اخلاقی۔ مذہبی ومعاشرتی تغیرات کے اسباب ونتائج کا ایک ایسا نامتناہی سلسلہ ہے جو ازل سے شروع ہوا ہے اور ابدتک رہیگا۔ اس لیے وہ اپنے مطالعہ میں اس امر کا خیال رکھتا ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات ہی کو مستحضر رکھنا ہی کافی نہیں بلکہ زیادہ تر توجہ کے محتاج وہ جزئی واقعات ہیں جو بادی النظر میں غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل وہ قوم کی رجحان کا پتہ دیتے ہیں یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اپنے اندر وہ قوتیں پنہاں رکھتے ہیں کہ جنکی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے رہے ہیں۔ اور آئیندہ آتے رہیں گے۔

ہیگل تاریخ کے تین مدارج قرار دیتا ہوا لکھتا ہے کہ اول درجہ یہ ہے کہ جن واقعات کو دیکھیں یا سنیں انکو من وعن لکھدیں اسمیں عقل کو دخل نہ دیتے ہوئے کوئی کمی بیشی نہ کیجائے دوم یہ کہ درجہ اول کے تاریخی مواد کو لیکر مورخ اسکی تحقیق میں اپنی استعداد و ذہانت صرف کرے اور معلوم کرے کہ کون سے واقعات صحیح ہیں اور کون سے غلط انکی صحت اور غلطی کے وجوہ ودلائل کیا ہیں ان غلط واقعات کو لوگوں نے کیوں صحیح مان لیا ہے۔

سیوم یہ کہ تاریخی واقعات کی بنا پر مقدمات مرتب کرے اور ان سے نتائج کا استخراج کیا جائے اور کل واقعات کو ایک رشتہ میں پرو کر اس کو علت ومعلول کا ایک نامتناہی سلسلہ

قرار دیا جائے۔

درجہ آخر میں مورخین کی یہ کوشش ہے کہ تاریخ کو سائنس کے سانچے میں ڈھال دیا جائے

اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں تاریخ کی شمولیت کی ضرورت

اکثر یہ سوال ہوتا ہے کہ تاریخ طلبا کو کیوں پڑھنی چاہیے اس سے کیا فائدہ مترتب ہو سکتا ہے یہ ذہن میں کیوں مستحضر رہے یہ کہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کو ایسی شکست فاش ملی تھی کہ وہ قوم اس کے بعد جانبر نہ ہو سکی۔ اس سوال کو بالفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے مدرسوں کے نصاب تعلیم میں تاریخ کو کیوں شامل کرنا چاہیے۔

اس کا جواب دینے سے پہلے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا وجوہ ہیں جن کی بنا پر کسی مضمون کو اسکول کریکیولم (curriculum) میں داخل کیا جاتا ہے۔

وہ شرائط جن کی بنا پر کسی مضمون کو نصاب تعلیمی میں جگہ دی جاتی ہے

علاوہ اس کے کہ وہ مضمون تعلیم کی علت غائی اور اس کے مقصد اولین کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ ماہران علم التعلیم نے چار شرائط اور بھی قرار دی ہیں جن کی بجا آوری کی بنا پر کسی مضمون کو اس لائق سمجھ سکتے ہیں کہ وہ درسیات میں مشمول ہو۔

(۱) اُس مضمون کی تعلیم کے واسطے جو سامان درکار ہو وہ نہ صرف سہل الحصول ہو بلکہ ارزاں بھی ہو۔

(۲) اُس کی تعلیم میں معلم و متعلم کا تعاون ہو سکے۔

(۳) جماعت میں کام کرنے کے علاوہ اُس مضمون کی تحصیل و مزاولت کے واسطے مختلف صورتوں میں طلبا کو گھر پر کرنے کے واسطے کام دیا جا سکے۔

(۴) طلبا استاد کی مدد سے ایسے کلیے معلوم کر سکیں جو نئی معلومات کی تحصیل میں کارآمد

ہوں نیز یہ کہ وہ مضمون آیندہ عملی زندگی میں کسی نہ کسی صورت میں کام آ سکے
بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اسکی وجہ سے آدمی کو وہ قوت اور قدرت حاصل
ہو جائے کہ کشمکش حیات میں اُس کے پائے ثبات متزلزل نہوں اُس کی
مدد سے وہ ہر عقدۂ لاینحل کو حل کر سکے جو رونما ہو۔ مضر نتائج سے بچنے
کے واسطے وہ ایک وک ہو اور ہر مشکل کو کم سے کم وقت کے ساتھ رفع
کیا جا سکے

مثال کے طور پر علم الحساب کو لیجیے چند مثالیں طلبا کے روبرو تختہ سیاہ پر
حل کرنے کے بعد وہ خود بخود یا استاد کی کم از کم مدد سے اُس کے اصول پر دسترس
حاصل کر سکتے ہیں۔ بعد ازاں اُس کلیہ کی امداد سے وہ خود لاانتہا امثلہ حل کر سکتے
ہیں۔ علاوہ ازیں معلم و متعلم کے کام کی نوعیت جداگانہ اور صریح ہے اول الذکر کا کام
یہ ہے کہ طلبا میں وہ مادہ پیدا کر دے جس کی مدد سے اس قسم کی دیگر مثالیں حل کر سکے اور
موخر الذکر کا یہ کہ وہ ذاتی کوشش سے اُس قاعدہ کی اتنی مزاولت حاصل کریں۔ کہ جب
عملی زندگی میں وہ مثالیں رونما ہوں تو وہ سہولیت کے ساتھ اُن سے عہدہ برآ ہو سکے
مزید براں گھر پر بھی طلبا اپنی مرضی سے یا استاد کی خواہش سے کام کر سکتے ہیں۔

باقی باقی

جسمانی تربیت

جسمانی تربیت کے دو رخ ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی۔ بچوں کو کھیل کود کے ساتھ ہمیشہ سے طبعی انس رہا ہے اصل میں اس جذبہ کی تہ میں فطرت الٰہی کام کر رہی ہے۔ اور وہی ہر بچہ کو کھیل کود کی طرف مائل کرتی ہے۔ شروع زمانہ میں اس کھیل کا کوئی ضابطہ نہ تھا۔ ایک یا چند بچے اپنے اپنے طریق پر الگ یا ملکر کھیلتے تھے۔ اور اُس کھیل کے اثرات و نتائج سے نہ وہ خود آگاہ تھے اور نہ اُنکے بڑے۔ مگر جب تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلی اور مشاغل نے اپنی اپنی اہمیت کے مطابق نئے نئے کھیل نکالے تو یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر ایک شغل کے مطابق کھیل بھی ہونا چاہیے اور اُس کا ایک ضابطہ بھی بنا چاہیے چنانچہ رفتہ رفتہ اس کا اک نظام عمل بن گیا۔ اور مفید اور نتیجہ خیز کاموں کے متعلق کھیل کود بھی مرتب ہو گئے۔ آج کھیل کے بہترین طریقے کنڈر گارٹن اور نالٹی سارے طریقہ تربیت میں موجود ہیں جن میں کھیل اور کام دونوں فطری احکام کے مطابق ملے جلے ہوتے ہیں چنانچہ بچہ یہاں پوری آزادی سے کھیلتا بھی ہے اور کام بھی کرتا ہے۔ بچوں کے فطری تقاضے ایک سے نہیں ہوتے کسی کا میلان خاطر کسی جانب ہے اور کسی کا کس جانب دنیا کے بڑے بڑے جرنیل اور سپاہی بچپن ہی میں دلیرانہ کھیل کھیلکر اپنے مستقبل کی جانب اشارہ کر دیتے تھے مقنن اور واضعان قانون بچپن کے کھیل ہی میں اپنے فطری میلان کو ظاہر کرتے تھے اولیا اور انبیا بھی بچپن ہی میں روحانیت کی جانب ایک فطری رغبت کا اظہار کرتے تھے۔ اصل میں بچہ کے کھیل کو کھیل نہ سمجھیے بلکہ وہ اسکی فطرت کی ابتدائی صورت ہے۔ تاش کی بازی میں ہم کسی شخص کی طبیعت کا بہت اچھا اندازہ کر سکتے ہیں اگر کوئی شخص مجھسے دو گھنٹہ شطرنج کھیلے تو میں یہ اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ کس کام کے لیے موزوں ہے لندن میں اکثر دیکھا جاتا ہے

کہ جب کسی شخص سے معاملہ کرتے ہیں تو پہلے اُسکو دعوت دیکر کھانے کے بعد تاش یا شطرنج یا ٹینس یا باڈمنٹن کی دو چار بازیاں کھیلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس میں اخلاقی اور ذہنی صفات کس درجہ کی ہیں اور پھر اسی کے متعلق معاملات تفصیل کرتے ہیں شطرنج میں دماغی یکسوئی از حد ضروری ہے بغیر اس کے کامیابی ممکن ہی نہیں۔ الحاصل اس قسم کے کھیلوں میں ہر آدمی کی طبیعت کا اندازہ ہوجاتا ہے اور اس سے اُس کی اصول وضوابط اور عادات کا کم و بیش پتہ لگ سکتا ہے۔ انفرادی کھیل میں ایک ہی کھلاڑی کی ذمہ داری کی بات ہے مگر تاش کے بعد دیگر بعض کھیل ایسے ہیں کہ دو دو چار چار ملکر کھیلتے ہیں۔ جن سے اجتماعی ذمہ داریوں کے احساس کا پتہ چلتا ہے اس لیے کہ ہر ایک کو اپنے ساتھیوں کے نفع نقصان کا خیال رہتا ہے۔ وہسٹ کے کھیل میں بعض دفعہ اپنے ساجھی کے نفع کے لیے کھلاڑی کو اپنا سارا ہاتھ تلف کردینا پڑتا ہے یہی حال تاش کے اور کھیلوں کا ہے ایسی قوت اجتماعی کو محفوظ کرنے کا اصول پیش نظر رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو فٹ بال کرکٹ آتے ہیں کرکٹ میں گیارہ گیارہ کی ٹولیاں ایک دوسرے کے مقابل کھیلتی ہیں۔ ٹولی کے ہر ایک آدمی کو اجتماعی فتح کا خیال دامنگیر رہتا ہے۔ اپنے کسی کھلاڑی کو لوگوں کی طرف گیند لیجاتے میں چوٹیں کھاکھاکر مدد دیتے ہیں بعض سودیشی کھیلوں کے دلدادہ ہیں ان میں بھی انفرادی اور اجتماعی کھیل ہوتے ہیں جیسا کہ آپ صاحبان نے کل (بنوٹ گتکا پھری کے کھیل) دیکھے کبڈی اجتماعی کھیل ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اہل یورپ نے اجتماعی کھیلوں کو حد پر پہونچا دیا ہے اور وہ ہم سے بازی لے گئے ہیں۔ کرکٹ اور فٹ بال میں علیگڈھ کا نام بہت بلند ہوچکا ہے۔ اور ولایت تک پہنچا ہے اس کھیل میں محض جسمانی ہی قوت کی ضرورت نہیں بلکہ ذہانت اور چستی نظر بھی درکار ہے۔ مثلاً جدھر چاہیں گیند پھینک سکیں۔ اس میں گھبازی اور نشانہ بازی کام دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ بازو کی قوت بھی کامل درجہ کی ہونی چاہیے تاکہ گیند ضرب کھاکر ایسے زاویہ پر پہنچے جو اپنے فریق

کے لیے نفع بخشے۔ ان دونوں باتوں میں دماغ کی اعلیٰ قوت اور فوری عمل کی ضرورت ہی اس لیے کہ ہر ایک حرکت وسکون کی رہنمائی دماغ ہی کرتا ہی تمام اعضائے ظاہری اسکے تابع ہیں جو کامیابی کی کنجیاں ہیں تمام قوتوں کو ایک نقطہ پر بھی جمع کرتا ہی۔ آپنے مشہور کھلاڑی جام صاحب رنجیت سنگھ کا کھیل دیکھا یا سنا ہوگا جو نشانہ بازی میں کمال رکھتا تھا۔ الغرض کھیل تربیت کا ایک بڑا جز ہے۔ اکسفورڈ میں امتحان پاس کرنے سے اتنی شہرت نہیں ملتی جتنی کھیلوں کے ذریعہ سے ملتی ہے کیمبرج یونیورسٹی میں کھیل کے مشاق کو رنگلر (ایک علمی درجہ) پر ترجیح دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جو طلبار اپنی جسمانی قوتوں کو بڑھانے میں وہ قومی کاموں کو صلح اور جنگ دونوں حالتوں میں بہتر انجام دیسکتے ہیں۔ واٹرلو کی جنگ نے گویا دنیا کی تاریخ بدلدی مگر انگریزوں میں مشہور ہے کہ اُس لڑائی کو واٹرلو کے میدان میں نہیں جیتا گیا بلکہ آئین کالج کے کھیل کے میدان میں جیتا گیا جسکی تشریح یہ ہے کہ اس لڑائی سے پہلے آئین کالج کے طلبار کھیل کے میدان میں سپاہیانہ کرتب سیکھ چکے تھے اور ایسے ہی طلبار میں سے فوج کے افسر اُس زمانہ میں منتخب ہوتے تھے۔ الغرض کھیل کود تہذیب کا جزو ہے اس سے جسمانی اعضار اور دماغی قوی ایک دوسرے کے مطابق رہکر اجتماعی آسائش کے نظام کو قائم رکھتے ہیں۔

شروع زمانہ اسلام میں گو مسلمان ہتیار اور تعداد دونوں سے محروم تھے پھر بھی انھوں نے فتح پائی یعنی ہزار دو ہزار افراد لاکھوں پر غالب ہوگئے وجہ یہ کہ وہ اور انکی انفرادی اور اجتماعی زندگی روحانی تعلیم سے سرتاپا متاثر تھی اس لیے ہر میدان میں فتح و نصرت انکی رکاب تھامتی تھی اور اس میں روح اور جسم دونوں کے لیے فلاح تھی۔ شعائر اسلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو چیز دین کے لیے اچھی ہے وہ دنیا کے لیے بھی اچھی اور حسب اخیر نتیجہ اچھی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جسمانی تربیت کو اپنے نصاب سے کبھی خارج نہ کریں مگر ہر کھیل سے ایک غرض ضرور ہونی چاہیے ہندوستان میں مسلمانوں

کا زوال اسوقت سے شروع ہوا جب سے اُن میں اجتماعی معاشرت کے خیال کو تنزل ہوا۔ اور انفرادی اغراض نے جماعت کے مقاصد کو ملیا میٹ کر دیا۔ کھیل ہو یا کام ہر صورت قوم کے ہر ایک فرد کا فرض ہے کہ اجتماعی نفع کو مقدم اور شخصی کو آخر خیال کرے۔

کھیل کا فلسفہ یہی کہ جو شخص جسم کا کمزور ہے وہ دماغ کا بھی ضعیف ہی یا بعد میں ہو جاتا ہی پس جب دماغی مشاغل کی وجہ سے دماغ پر زور پڑے تو اُسکی قوت کا بدل جسمانی کھیل سے ہو جانا چاہیے۔ تعلیم کے ہر درجہ کے کھیل بھی اسی کے مناسب ہونا لازم ہے۔ اور اگرچہ کبھی کبھی اس شرط کو پورا کرنے کے بعد بھی ضعف دماغ ہو سکتا ہے مگر کلیہ وہی ہی جو میں نے بیان کیا۔ کھیل گھر میں بھی کھیل سکتے ہیں۔ بعض ورزشیں ضرور ایسی ہیں کہ باہر کھلے میدان میں جانے کی ضرورت نہیں پھر بھی باہر کے کھیل بہت مفید ہیں۔ بند ہوا میں کاربن زیادہ ہوتا ہی اور باہر آکسیجن کی مقدار کثیر ہوتی ہے جو کھیل کے لیے مفید ہے اس لیے کھلے میدان کی ورزش پھیپھڑوں کو مضبوط خون کی مقدار کو بڑھاتی اور صاف کرتی ہے۔ انفرادی کھیل کی بہ نسبت اجتماعی کھیل اور بند ہوا کی بہ نسبت میدانی کھیل زیادہ نتیجہ خیز اور نفع بخش ہے۔

میں قوم اور ملک کے بزرگوں سے مادبانہ التماس کرتا ہوں کہ کھیل کو حقیر نہ سمجھیں اپنے بچوں اور لڑکوں کو مرغوب کھیلوں کی جانب ہمیشہ مائل رکھیں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں بعض ورزشیں گھر میں بھی ممکن ہیں مگر اعضائے جسمانی کی صحیح تربیت اور تقویت کیلیے میدان کی ورزشوں سے ہوتی ہی۔ دماغ اور اسکی قوتوں کو انکھ ناک کو یہیں فرحت نصیب ہوتی ہی۔ اس سے جسم مضبوط ہوتا ہی اور صحت درست ہوتی ہی پھر اگر مل جلکر کھیلیں تو ان کی بہت سی اخلاقی کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے کی جبلی کمزوریوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ حریفوں پر فتح پانے سے دل میں کبر و غرور پیدا نہیں ہوتا بلکہ تعریف کرکے انکی حوصلہ افزائی کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اور انسان کی بڑی فضیلت یہ ہے کہ فتح سے مغرور نہو۔

مضمون کا ماخذ [illegible] عبداللہ [illegible] یوسف علی [illegible]

کوآپریشن

یہ ایک ایسی تنظیم ہے جس میں کہ چند اشخاص اپنی اقتصادی ترقی کے لیے باہم مل جاویں
انہیں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہ ہو۔ ہر ایک کی رائے برابر ہو۔ یہاں سرمایہ کا کوئی دخل نہیں
ان میں سے ہر ایک کا فرض ہو۔ کہ وہ سب امداد کرنا اپنا نصب العین قرار دیں اور سب کا
فرض ہو کہ وہ ہر ایک کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھیں یہی کوآپریشن کا اصول ہے۔ سلف ہیلپ یا
اپنی مدد آپ کرنا بہت اچھا ہے لیکن جب دو باہمی سے مل جاوے تو اسکی طاقت دگنی
ہو کر ترقی یقینی ہو جاتی ہے ریفائزن جسے اس تحریک کا بانی کہنا چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ
جو اس اتحاد میں اس غرض سے شامل ہو کہ اس کی ذات کو فائدہ حاصل ہو وہ خود غرض ہے
لیکن جو اس غرض سے شامل ہو کہ اسکی شمولیت سے اسکی دوسرے بھائیوں کو فائدہ
پہنچے اور پھر اسکو بھی فائدہ حاصل ہو تو یہ نہایت قابل تعریف ہے۔ گویا پہلے دوسری بھائی کا
فائدہ مدنظر ہو۔ اب آپ خیال فرماتے ہے کہ اگر اس مشترکہ فائدہ کے واحد مدعا کو دل میں
لیئے ہوئے چند اشخاص باہمی مل جاویں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ جس کام کے لیے کمر ہمت
باندھیں وہ کامیابی کو نہ پہنچے۔ دراصل یہ اسلام کا اصول تھا جسے ہمنے چھوڑ دیا اور یہی وجہ ہے
کہ ہم ابتر حالت میں ہیں دولت ہمارے پاس نہیں تعلیم ہم میں نہیں۔ غرض کونسی کمی ہے
جو ہم میں نہیں پائی جاتی۔ چند اصحاب جو شہروں میں بستے ہیں اور صاحب ثروت اور صاحب
علم ہیں اس سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری قوم خوش حال ہے۔ زراعتی آبادی قعر ذلت
میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان بیچاروں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آج شدھی کا ہر
طرف چرچا ہے یہ کیوں صرف اس لیے کہ روپیہ کا لالچ۔ مگر ہماری یہ مشکلیں اسیوقت حل
ہو سکتی ہیں جب قوم خوش حال ہو۔ لیکن یہ ایک دن کا کام نہیں انگلستان جو روپیہ کے زور سے

تمام دنیا پر حکومت کر رہا ہے یہ دولت اس کے باشندوں نے کفایت شعاری سے صدیوں میں جمع کی ہیں۔ بد قسمتی سے ہم جسقدر کماتے ہیں اسیقدر کھا لیتے ہیں۔ بچانیکی ہم میں عادت نہیں جو بری وقت میں کام آئے مصیبت کے وقت تو بچانے کا ہر وقت ضرور خیال آتا ہے لیکن اس کا فوری اثر جلدی رفع ہو جاتا ہے

آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ پنجاب کے زمینداران جو زیادہ تر مسلمان ہیں سالانہ ۱۲½ کروڑ روپیہ صرف سود میں ادا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم دوسری قوموں کا گھر اپنی محنت شاقہ سے تو خوب بھرتے رہتے ہیں اور خود بھوکے مریں۔ ہمیں دنیا میں اور قوموں کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ کوآپریشن باامداد باہمی ہماری ہر بیماری کا علاج ہے کون ملک ہے جو آج اس پر عمل پیرا نہیں ہے۔ جرمنی کی آج سے ساٹھ سال پہلے نہایت خراب حالت تھی لیکن آج وہ دنیا میں ایک نہایت ارگنائزڈ ملک ہے۔ باوجودیکہ جرمنی کو لڑائی میں بہت نقصان ہوا ہے لیکن کوآپریشن اب بھی وہاں نہایت زور سے پھیل رہی ہے۔ جو علاقہ ملک فرانس کو اُسے دینا پڑا۔ اسمیں ۲۳۰۰ سوسائیوں کو بھی خیر باد کہنی پڑی لیکن اس کے دو سال بعد دس ہزار اور نئی انجمنیں قائم ہو گئیں۔ اب وہاں ہر قسم کی ایسی انجمنوں کی تعداد ۰۰ ۴۰ ہے۔ جن میں ۰ لاکھ خاندان کسی نہ کسی طرح شامل ہیں۔ ڈنمارک میں امداد باہمی کے طریقہ پر مکھن کے کارخانوں نے اسے نہایت خوشحال ملک بنا دیا ہے اٹلی میں یہ تحریک نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ انگلستان میں کوآپریٹو سٹور نہایت کامیابی سے کام کر رہی ہیں جنمیں تقریباً ۳۰ لاکھ ممبران ہیں اور جو سالانہ چار کروڑ روپیہ کا مال فروخت کرتے ہیں۔ اور اپنے ممبران کو کروڑوں روپیہ واپسی قیمت میں دے چکے ہیں۔ غرضکہ ہر ایک ملک میں یہ تنظیم بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ کام ۱۹۰۴ء سے جاری ہے۔ ہر ایک صوبہ میں اسکی کچھ نہ کچھ ترقی ہو رہی ہے لیکن اگر پنجاب کی کچھ حالات بیان کر دیے جائیں

تو وہ خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔ صاحبان۔ زمیندار کو سب سے بڑی قرضہ کی ضرورت ہے
یہ اپنے بڑے بھلے وقت کے لیے کچھ نہیں بچاتا۔ اس کی ضرورت کا کوئی وقت نہیں
ساہوکاران اسکی ضرورت سے فائدہ اٹھا کر سود لیتے ہیں اس وقت چالیس ہزار ساہوکار
پنجاب میں موجود ہیں جن کا گذارہ انہیں غریبوں کی کمائی پر ہے اور یہ سالانہ ایک بڑی نہر کی
قیمت انہیں صرف سود میں ادا کرتے ہیں۔ پنجابی زمیندار کی سب سے بڑی ضرورت کواپریٹو کریڈٹ
کی تھی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قرضہ کی انجمن بنائی گئیں نو ہزار کے قریب ہیں جن میں
½ ۲ کروڑ ممبران شریک ہیں قرضہ کی انجمن بہت چھوٹے رقبہ میں قائم کیجاتی ہے۔ جہاں ممبران
آپس میں ایک دوسری سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں اس انجمن کا انتظام کرنے کی لیے
تمام ممبران سالانہ انتظامیہ کمیٹی کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ کمیٹی ممبران کو مناسب اور جائز ضروریات
کے لیے قرضہ دیتی ہے۔ بیرونی قرضہ جات کے لیے انجمن کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے
یعنی تمام ممبران مشترکًا و منفردًا ان قرضہ جات کی ادائیگی کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں۔ کہیں اس
خطرے سے بچنے کے لیے کمیٹی کئی ایک طریقے اختیار کرتی ہے۔ ہر ایک فصل پر ممبران کچھ رقم
جو کم از کم آٹھ آنہ ہوتی ہے بطور حصہ داری کے دس سال تک ادا کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح
سے جو رقم جمع ہوتی ہے اسے قرضہ پر دیا جاتا ہے کہیں ممبران کی ضروریات پورا کرنیکے لیے
یہ انجمن سنٹرل بنک جو ان دیہاتی بنکوں کو قرضہ دینے کے لیے قائم ہوتے ہیں ان سے
نو فیصدی پر قرضہ لیتی ہے۔ اور آگے اپنے ممبران کو ۱۲ نیصدی پر قرضہ دیتی ہے
اس طرح سے اور حصہ داری کی رقم پر جو سود سے منافع ہوتا ہے وہ ریزرو فنڈ میں جمع
ہوتا رہتا ہے اور اسے بھی قرضہ دینے میں ہی استعمال کیا جاتا ہے جو رقم اسطرح سود سے
بچتی ہے اور ممبران کے حصہ داری کی جو رقم ہوتی ہے ان سے ایک لمبا سرمایہ
قائم ہو جاتا ہے جو غیر محدود ذمہ داری کے خطرے سے بچنے کے لیے ایک بہترین پناہ
ہوتی ہے ان دیہاتی انجمنوں نے اب اس طرح سے ۷ لاکھ روپیہ منافع جمع کر

لیسا ہی اور ۴ لاکھ روپیا نکے حصہ داری کی رقم ہو گئی ہے گویا یہ ایک کروڑ اور ستر لاکھ روپیہ کی رقم بہت مجموعی سی کوشش اور بچت سے پیدا ہو گئی ہے اور ممبران اسے محسوس بھی نہیں کرتے ہیں۔ لیکن اس بچت کے علاوہ ممبران ساہوکاران کا پرانہ قرضہ بھی ادا کرتے رہتے ہیں۔ اپنی آراضیات فک کراتے ہیں اور جب روپیہ ہو تو اور زمین بھی خریدتے یا رہن لیتے ہیں جب کوئی انجمن دس سال کی عمر ختم کر لیتی ہے تو اسکی دس سالہ ترقی کا نقشہ بنایا جاتا ہی جس سے اس کی ترقی یا تنزل معلوم ہوتا ہی۔ چنانچہ گذشتہ سال تقریباً ۱۰۶ انجمنوں نے اپنی عمر کے دس سال پورے کیے تھے جن میں ۲۰۰۰ ممبران شریک تھے ان میں ۰۰ ممبران تو اس عرصہ میں ساہوکاری قرضہ جات سے بالکل آزاد ہو گئے ہیں۔ اور باقی ابھی مقروض ہیں جو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اس دس سال کے عرصہ میں ان ممبران نے ۳۳ لاکھ روپیہ تو کھلا قرضہ ادا کیا ہی اور ۱۷ لاکھ سے زائد کی آراضی فک کرائی ہے اور تقریباً ۱۰ لاکھ کی زمین خریدلی ہے اور ۱۲ لاکھ سے زائد کی رہن لی ہے۔ اس کے علاوہ ممبران نے ۲۷ لاکھ سے زائد حصہ داری اور منافع رقم کر لی ہے گویا ایسے دس سال کے عرصہ میں ممبران نے ۱۵ لاکھ سے زائد تو زیر باری قرضہ میں کمی کی اور ۴۶ لاکھ کے قریب اپنی اثاثہ میں بیشی کی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کسقدر مفید ہے اور اس سے زمینداروں کو کیا فوائد حاصل ہو رہے ہیں جہاں پر دیہاتی انجمن کامیابی سے کام کرتی ہے وہ لوگوں میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے وہ اپنی بری رسومات کی اصلاح کرتے ہیں۔ مقدمہ بازی کم ہو جاتی ہے ان میں بچانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہی اپنے حسابات رکھنے کے لوگ عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ کہنا چاہیے ہی کہ یہ روبا ہمی انمیں پوری اصلاح کر دیتی ہے یہ ایک چھوٹی سی سلف گورنمنٹ ہے۔ جہاں پر دیہاتی انجمن قائم ہے وہاں پر ہر ایک قسم کی ترقی کا کام ہو سکتا ہی۔ اب ضلع جالندھر ہوشیارپور گورداسپور جہلم میں یہ تحریک بہت پرانی ہے وہاں پر منتشر شدہ کھاتہ جات کو ایک جگہ اکٹھی کرنے کے لیے انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔

ان اضلاع میں ملکیتیں بہت تھوڑی ہیں اور وہ بھی کئی ایک جگہ پر واقع ہیں بعض جگہ اوسط رقبہ فی کھیت ½ ایکڑ اور بعض جگہ ¼ حصہ فی ایکڑ پایا گیا اکثر ملکیتیں تیس تیس چالیس چالیس جگہوں پر واقع ہیں ان حالات میں زراعتی ترقی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ کہیں یہ مشکل کوا پریٹو طریقہ سے رفع ہو گئی ہے لوگ ہر جگہ ایسا کرنے کے لیے تیار ہیں صرف عملہ کی ضرورت ہے لیکن یہاں ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا قرضہ کے بعد زمیندار کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اُسے اپنی پیداوار کی پوری قیمت ملے لیکن درمیانی آدمی اسقدر فائدہ اٹھاتے ہیں جو اسکی اصلی قیمت سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے آڑھت کی دو کانوں کا مختلف جگہوں پر تجربہ ہو رہا ہے ایسی چھ انجمنیں ضلع لائل پور اور منٹگمری میں جنہیں گذشتہ سال ۲۰ لاکھ سے زائد ممبران کی پیداوار فروخت ہوئی اور انہیں پوری قیمت ملی اسیطرح سے زمینداروں کو ارزاں قیمت پر اشیاء بہم پہنچانے کی بھی علیحدہ انجمنیں ہیں اور بھی کئی قسم کی انجمنیں ہیں۔

ہماری تعلیمی جدوجہد

مسلمانوں میں سب سے بڑی ضرورت تعلیم کی ہے اور مختلف صوبوں کی رپورٹیں صاف بتلا رہی ہیں کہ ہم اپنی ہمسایہ قوموں سے اس گھوڑدوڑ میں بہت ہی پیچھے ہیں۔ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے۔ اور وہاں وہ جاہل زمیندار ہیں جو اب بھی تعلیم کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ پنجاب میں نے خود ایسے دیہات دیکھے ہیں کہ جو اسکول قائم ہونے پر اپنے بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ باوجود اس کے تعلیم یافتہ اصحاب اور خاصکر ہماری علماء جہاں نے کبھی اسطرف توجہ نہیں کی کہ انکو آہستہ آہستہ تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ دیہاتی کو اکثر گنوار جاٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے ملنا تو درکنار اس سے بات کرنا بھی عار سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے جسقدر جلسے واعظین ہوتے ہیں وہ سب شہروں میں جہاں پر ہماری لیڈر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں اور انکی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور پھر اخباروں اور رسالوں میں یہ شور مچایا جاتا ہے کہ قوم تعلیم میں پیچھے ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب اور ہمارے لیڈروں کا قصور ہے۔ اسوقت تک جسقدر تعلیم پر زور دیا گیا ہے وہ شہروں میں دیا گیا ہے۔ لیکن آپ کو یاد رہنا چاہیے کہ مسلمانوں کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے۔ جب تک آپ اُن کی خبر نہ لینگے اسوقت تک ہماری ترقی ترقی نہیں کہلا سکتی ہے۔ پنجاب میں کوآپریشن کی ترقی نے دیہاتیوں میں احساس پیدا کر دیا ہے اب وہ اپنی ان کمیوں کو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے محسوس کرتے ہیں زمینداروں کی زیر باری قرضہ کا ایک یہ بھی باعث ہے کہ وہ ناخواندہ ہیں وہ بیچارے صرف انگوٹھا ہی لگانا جانتے ہیں۔ ساہوکار لوگ ان کی اس کمی سے فائدہ اٹھا کر جسقدر رقم چاہتے ہیں لکھ لیتے ہیں۔ کوآپریشن بذات خود تعلیمی پہلو لیے ہوئے ہے دراصل بڑی عمر کے لوگوں کے لیے

ایک اسکول ہی۔ جو انہیں اتنا حساب کتاب لکھنا سکھلاتی ہی اور ان میں ایک نئی زندگی پیدا کرتی ہی۔ کوآپریشن بغیر تعلیم کے کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ اس لیے ہر ایک کوآپریٹر کا ہمیشہ فرض اولین رہا ہے کہ وہ تعلیم کیطرف توجہ دلائے۔ دیہاتوں میں کسی انجمن کی کامیابی کے لیے سب سے مشکل یہی ہے کہ حساب کتاب رکھنے کے لیے پڑھے لکھے آدمی دستیاب نہیں ہوتے ہیں چنانچہ انہیں مشکلات کو رفع کرنیکے لیے سنہ ۱۹۲۰ء میں ضلع انبالہ میں ایک قرضہ کی انجمن نے ایک اڈیلٹ اسکول جاری کیا اور اسمیں سب ممبران پر تعلیم حاصل کرنا لازمی شرط قرار دی مقامی سکرٹری بطور ٹیچر کام کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس تحریک کو اور جگہ بھی وسعت دیگئی محکمہ تعلیم نے بھی اپنی توجہ اسطرف شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تقریباً ہر ایک ضلع میں یہ اسکول جاری ہو رہے ہیں اور اس کے لیے علیحدہ کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کیگئی ہیں ایسے جو اسکول کوآپریٹوڈ پارٹمنٹ نے جاری کیے ہیں وہ تقریباً ۶۵ ہیں جن میں سے اکثر بہت کامیابی سے کام کررہی ہیں۔ جب لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے ہیں تو اسکول کو اکثر بند کردیا جاتا ہی۔ سب سے بڑی مشکل محسوس ہورہی تھی وہ یہ تھی کہ ان اسکولوں کے لیے کوئی کورس نہیں تھی وہی بچوں والی کتابیں تھیں جو بڑی عمر کے آدمی کے لیے کچھ باعث دلچسپی نہ تھیں مگر یہ خوشی ہے کہ شیخ نورالٰہی صاحب انسپکٹر مدارس ملتان نے اب اس مشکل کو رفع کردیا ہے کتابیں چھپ رہی ہیں اور امید ہی کہ وہ ہر جگہ پسند کیجائینگی۔

لازمی تعلیم کے لیے ہر طرف چرچا ہو رہا ہے۔ اور اس پر زور دیا جارہا ہے۔ لیکن کوآپریشن نے لوگوں میں بالکل ایک نئی روح پیدا کردی ہے بجائے اس کے کہ ہم ہر ایک بات میں قانون سے مدد لیویں لوگوں میں مدد ذاتی کا وصف پیدا کردیا ہے۔ چنانچہ پنجاب میں اب لازمی تعلیم کی کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم ہورہی ہیں۔ جہاں آبادی کا کچھ حصہ اس پر رضامند ہوں وہاں یہ جاری کردیجاتے۔ ہر ایک ممبر جو اسمیں شامل ہو اس کا فرض ہوتا ہی۔ کہ بچوں کو پرائمری تک کے لیے تعلیم دلوائی اگر وہ ایسا نہ کرے تو پنچایت کو اختیار ہے کہ اس پر پچاس روپیہ تک

جرمانہ کر دیوے جو بذریعہ ثالثی وصول ہوتا ہی یہ اخلاقی دباؤ ہے اور بہت موثر ثابت ہوا ہے
بعض کریڈٹ سوسائٹیوں نے یہ قاعدہ بنا لیا ہے کہ ہر ایک ممبر کے لیے لازمی ہے
کہ وہ اپنے بچے کو پرائمری تک تعلیم دلوای ورنہ اُسے انجمن سے خارج کر دیا جائے اس
کام کے لیے نہایت وسیع میدان ہے صرف کام کرنے والوں کی ضرورت ہے
پنجابی زمیندار ہر ایک نئے خیال کو اختیار کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہی صرف اُسے
سمجھانے کی ضرورت ہی ہمیں پرائمری تعلیم کی وسعت سے ہماری تعلیمی جدوجہد ختم نہیں
ہوجانی چاہیے ہمیں اعلیٰ تعلیم کیطرف بھی متوجہ ہونا چاہیے کہیں تعلیم اب اسقدر مہنگی ہورہی
ہے کہ معمولی آدمی اُس کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا کئی ایک کریڈٹ
سوسائٹیاں تعلیمی وظائف کے لیے روپیہ دے رہی ہیں۔ کئی ایک نے مڈل اسکول
قائم کرنے کے لیے بھی روپے دیے ہیں۔ لیکن ایک ایسی جدوجہد ہے جو بہت معمولی
پیمانے پر ہے مگر مشکل ایجاد کی ماں ہی اس سال جو تعلیمی کانفرنس ہوئی اور اہمیں ایک
بھاری رقم چندہ کی جمع ہوئی بدقسمتی سے وہ رقم مقامی انجمن لینا چاہتی تھی جسپر لوگوں کو
اعتبار نہیں تھا۔ یہ کانفرنس جو خانصاحب ملک زماں مہندی خاں صاحب کی کوششوں
کا نتیجہ تھا انہیں ہر وقت فکر تھی کہ اس روپیہ کو کیا کیا جاوے اور آخر ہم سب نے مشورہ
کر کے ایک کواپریٹو مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی جس کا زیادہ تر مقصد یہ ہے
کہ وہ وظائف دے ان کے مفصل قواعد پر جو ایک علیحدہ ریزولیشن کی شکل میں ہے
بحث ہوگی۔ اب اس بات کی ضرورت ہی کہ ہر ایک اضلاع میں ایسی انجمنیں قائم ہوں۔

آیندہ تمہیں کیا کرنا چاہیے تعلیم یافتہ اصحاب نے اسوقت تک اس تحریک
میں بہت کم حصہ لیا ہے بلکہ بعض اصحاب تو
اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس تحریک کو
عام پھیلانے کے لیے شہروں کالجوں اور اسکولوں میں لکچروں کا سلسلہ شروع کیا

جاوے۔ کفایت شعاری کی انجمن بنائی جاویں جن میں ماہواری مقررہ دینے کے علاوہ
اس بات کی بھی ترغیب دلائی جاوے کہ اس میں بچوں کی تعلیم اور شادی اور دیگر مقاصد
کے لیے بھی روپیہ جمع کیا جاوے شہروں میں ایسی فلاح وبہبودی کی انجمنیں (Public
) بنائی جاویں جن کے ممبران کا فرض ہو کہ وہ اپنی وقت کا کچھ حصہ عام فلاح
کے کاموں میں خرچ کریں خواہ وہ سال میں ایک یا دوہی دن کیوں نہ ہو۔ اسی طرح سے
طالب علموں میں ایسی سوسائٹیاں قائم کیجاویں در تعطیلات کے زمانے میں ہر ایک طالب علم
دیہاتوں شہروں میں جاکر لوگوں کی تکلیفات معلوم کر کے اس کے رفع کرنے کی کوشش کریں
جاپان میں ایسی انجمنیں پہلے سے ہی کام کرتی ہیں۔ اس سے طالب علمی کے زمانے سے
ہی ان میں قومی کاموں کا خیال پیدا ہو جاوے۔ ہر ایک کالج اور اسکول کا اسطرح سالانہ
ریکارڈ جمع کیا جاوے کہ سکے طالب علموں نے کیا کیا ہے۔

مسلمانوں کے اقتصادیات پر غور کرنے کی لیے کانفرنس کی زیر نگرانی ایک بورڈ
قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔

عطاء اللہ خاں جی بی ایس اسسٹنٹ رجسٹرار
کواپریٹو سوسائٹیز (پنجاب)

اصلاح تمدن

ہم کہاں ہیں؟

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ایک جہاز پر سوار ہیں جس کا پیندا خطرناک رخنوں سے چھلنی۔ کوئلہ ذخیرہ اور پانی کا حوض خالی۔ کھانے کی چیزوں کا خاتمہ اور ناخدا خواب میں ہے ہم ہیں کہ تاش بلیرڈ اور طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف ہیں۔ میزوں پر خوان نعمت چار اور فواکہات چنے ہیں۔ ایکطرف سگار اور سگریٹ کے بکس خالی پڑے ہیں دوسری طرف سگرٹ کے کش لگ رہے ہیں۔ پانوں کی ڈھولیوں سے در و دیوار پر بے تمیزی کی گلکاری ہو رہی ہے کہیں سنگار میز پر چار ابرو کا صفایا۔ گلے میں نکٹائی اور کالر کا پھندا اور کہیں حضرات پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے سمندر کی لہروں کا نظارہ کر رہے ہیں کہیں یاوہ گوئی اور کج بحثیاں ہو رہی ہیں۔ طوفانی ہوا کے تھپیڑے ہیں کہ جہاز کو تباہی میں لیے جا رہے ہیں ان بیفکروں میں چند بوڑھے جو بیقرار ہو ہو کر دوڑتے پھرتے ہیں اور اپنی پگڑیوں اور عماموں سے رخنے بند کر رہے ہیں خدایا اس جہاز کا کیا حشر ہونے کو ہے؟ کبھی ساحل مراد دیکھنا نصیب ہوگا؟ آخر اس تباہی کی علت۔ یہ سب خرابی اور آہ یہ سب تمدنی اور معاشرتی سو نظمی کا انجام ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انسان مدنی الخصال ہے اور خلاق عالم نے اسکی سرشت میں ایک ایسا مادہ رکھا ہے جو اسکو ہر وقت ترقی پر ابھارتا رہتا ہے اسی جذبہ نے تمدن کی بنیاد ڈالی۔ تمدن بغیر ترقی ایک بے معنی لفظ تھا۔ تمدن کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی بڑھتی گئی۔ مختلف قوموں نے مختلف راہیں اختیار کیں۔

کوئی راہ مستقیم پر چلا اور منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ کوئی ادھر اُدھر ہی بھٹکتا رہا۔ بتلائیے اس وقت تمدن کے مختلف مدارج طے کرکے ہمارا ملک کہاں پہنچ گیا ہے۔ آیا یہ سیدھے راستہ پر جارہا ہے یا کہیں گم گشتہ راہ ہے۔ ہمارا موجودہ تمدن زندگی کے مقاصد کے مطابق ہے یا متضاد اس بحث کے لیے کافی وقت کی ضرورت ہے لیکن ہم ایک نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں اگر ہم اجمالاً ان اثرات کا ذکر کریں جو موجودہ طرز معاشرت کی وجہ سے ہماری معاشرتی، اقتصادی۔ اخلاقی اور روحانی حالت پر موثر ہیں۔ اس دور انقلاب کی ایک خصوصیت عجیب ہے۔ چاروں طرف آزادی آزادی کا شور ہے مگر ہمارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ہماری عزت وقار خوداری اور شان وشوکت اولوالعزمی اور علو ہمتی نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا اتحاد و یکجہتی علم و تعلم کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری موجودہ معاشرت نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ پانی سر سے گذرنے والا ہے۔ کیا اب بھی یہ ملک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوگا۔ اور ما فیہا سے بیخبر رہکر کروٹیں ہی بدلتا رہیگا۔ جہالت اسراف اور آندھی تقلید ستم ڈھارہی ہے کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے جس شعبہ کو دیکھئے ہماری ہستی کو فنا کردینے پر تلا ہوا ہے۔ کتنے گھر ہیں جو شادیوں کی بیجا رسوم سے ماتم کدے بنگئے ہیں۔ کتنے گھر ہیں جنھیں نفسانی خواہشوں اور چٹورپن نے مفلس کردیا ہے جو ذوق نمائش لباس وملبوس کے بھڑکیلے پن اور گوٹہ کناری کی نذر ہو چکے ہیں۔ اور تو اور تعلیم جو ہمارے لیے شمع ہدایت ہونے کا دعوی کرتی ہے جو ہماری کشتی حیات کی ناخدائی جاسکتی ہے ہمیں کہاں لیے جارہی ہے کیا تعلیم اسی کا نام ہے کہ آج ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہماری آنکھیں ہیں مگر دیدہ نرگس کی طرح بے نور۔ ہمارے کان ہیں مگر گنگ زبان ہے مگر لال دماغ ہے مگر بے حس۔ ہمارے دل ہیں مگر مردہ و بیثر مردہ۔ ہم دوسروں کی زبان سے بولتے ہیں۔ دوسروں کے کانوں سے سنتے ہیں اور ہماری ایک ایک

حرکت دوسروں کے تابع فرمان ہے۔ ہمارا تمام جسم ایک بیجان مشین ہے جسکی کلیں دوسروں کے ہاتھ میں ہیں جدھر ہیں گھما دیا گھوم گئے۔ افسوس

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے

ہمیں کچھ خبر نہیں کہ زندہ قومیں کس سرگرمی اور جانفشانی سے اپنی مدد آپ کرتی ہیں انہیں دنیا میں حکومت کرنے کے گرکسطرح یاد ہیں چلیے بازاروں میں چلیے دیکھیے غیر ملکوں کا مٹی کا کھلونا۔ بڑکی ایک گڑیا۔ شیشے پیتل تانبے لوہے اور مختلف ادنی دھاتوں کا ایک چھوٹا سا تنکڑا کسطرح ہماری جیبوں سے سونا کھینچ رہا ہے اور ملک کا خزانہ کسطرح روز بروز خالی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک جسم پر لاکھوں جونکیں لگی ہوئی ہیں جو دمبدم خون چوس رہی ہیں غیر ممالک کی ایک سوئی نے اس ملک کی جڑیں کھود ڈالی ہیں غیر ملک کی نمائش وضع قطع نے ہماری صورتیں مسخ کر دی ہیں۔ ہم اپنی روش بھول گئے نقالی نے ہماری ہر حرکت کو دوسروں کی نظروں میں مضحکہ بنا دیا ہے اور ہم ہیں کہ بے حس ہیں۔ اور ہمیں خبر نہیں کہ ہمارا سرمایہ کہاں جا رہا ہے۔ پان تماکو مدا اگل کھلا رہا ہے۔ کوکین الگ گلا گھونٹ رہی ہے۔ ناچ رنگ تھیٹر۔ بائسکوپ فیشن اور اسراف بیجا اخلاق کا خون کر چکے۔ سگار سگریٹ نے اندر ہی اندر گھر پھونک دیا ہے ذرا غور تو کیجئے ہم کسقدر بے پروائی سے اپنا سرمایہ لٹا رہے ہیں مان لیا جائے کہ تیس کروڑ آبادی میں صرف آٹھ کروڑ متنفس سگار سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ ایک سگار سگریٹ کے پینے میں دو دیا سلائیاں اوسطاً خرچ ہوتی ہیں تو سولہ کروڑ دیا سلائیوں یا سولہ لاکھ دیا سلائیوں کے بکسوں کی کیا قیمت ہوتی ہے کہئے پچیس ہزار روپیہ اب اگر سگار اور سگریٹ کی قیمت کا بھی حساب لگایا جائے جو روزانہ صرف میں آتے ہیں تو شاید کروڑوں پر نوبت پہونچے میں نے اس وقت صرف اقتصادی پہلو سے اس کمبخت زہریلی چیز کا ذکر کیا ہے میں اس وقت تیار نہیں

ہوگا۔ یقیناً تباہی اور بربادی۔ لیکن ہر درد سے را علاج ہے۔ تباہی اور بربادی اگر ہمارے سر پر منڈلا رہی ہے تو آخر اس سے بچنے کے کیا طریقے ہیں۔ جز رسی کفایت شعاری اور اصلاح تمدن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے ہم اپنی آمدنی کو جائز محل پر صرف کرکے دیکھیں کہ ہم اپنی جیبوں اپنی قوتوں پر کتنا اعتماد کرنے کے قابل ہو جائینگے ذرا اپنی عقلوں سے بھی کام لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہمارے رہنما میں کیا کیا اوصاف ہونے چاہئیں ہمنے جس کو لیڈر بنا لیا اگر وہ آخر کار ریاکار اور فریبی نکلا تو ہم کہیں نہ رہینگے۔

حضرات اس محدود چار دیواری سے نکلئے۔ ملک کے بندرگاہوں پر چلیے اور دیکھئے یہاں کی سونے چاندی کی لہریں کدھر کو جا رہی ہیں۔ اور سمندر کی جانب سے پیتل لوہا تانبا وغیرہ کسطرح اس ملک پر گولہ باری کر رہا ہے سوچیے اور سوچیے اسکی روک تھام کسطرح ہو سکتی ہے۔

دل تو چاہتا ہے کہ کہے جاؤں کوئی سنے یا نہ سنے لیکن کہانتک اب گفت وشنید کا وقت نہیں رہا۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور عمل شروع کیجئے۔ اصلاح تمدن ہی ایک ذریعہ ہے جو ہمیں معراج ترقی پر پہنچا سکتا ہے۔ اسکی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں ہمارے نوجوان بھائیوں کو اپنی خداداد قوتوں سے کام لینا چاہیے کیا مشکل ہے کہ گاؤں گاؤں ہماری ایک کمیٹی قائم ہو جائے جسکا نصب العین اور مقصد یہی ہو کہ تمدن کی خرابیوں کو دور کرکے ہماری معاشرت میں ایسی تازہ روح پھونکی جائے کہ ہم پھر زندہ قوموں میں شمار ہونے لگیں اگر ہم نہ جاگے تو زمانہ خود بتادے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

چہ مے پرسی زحال دل کہ چون است
دلم خوں گشت وخوں آزدل برون است

اے خداوند ہماری مدد کر کہ ہم راہ مستقیم پر چل سکیں اور اصلاح تمدن پر ہماری متفقہ توجہ

مبذول ہو اور ہم سمجھ جائیں کہ ہمارے بچوں کا نشو نما کیونکر ہو سکتا ہے ہمارے جوانان پاکباز
وصالح اپنی دماغی ذہنی اور روایتی کرشموں سے دنیا کو محو حیرت کر سکتے ہیں۔ ہمارے
مسن بزرگ اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے اپنے تجربوں اپنی رفتار و گفتار و کردار
اور اپنے طرز عمل کے نمونوں سے کسطرح رہبری کر سکتے ہیں ہمارے طلبار کی قابلیت اور اساتذہ
کا نصب العین ملک اور قوم کے لیے کہانتک مایہ ناز بن سکتا ہے پروردگار عالم ہمیں توفیق عطا
فرمائے کہ جب ہم اس جلسہ سے اٹھکر اپنے گھروں کو جائیں تو اس کانفرنس کی نیک صلاحوں
پر عمل کریں اور اپنی قوم کو بتائیں کہ ہم کہاں گئے تھے اور اس کے لیے کیا بیش بہا تحفہ لیکر
آئے ہیں ہم بیداری جزرسی کفایت شعاری اور اصلاح تمدن جیسی دولت سے مالا
مال ہونے کی کوشش کریں ورنہ

چوں دوست نمی دہد وصالت
دست من و دامن خیالت

سید نثار حسین

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چھتیسواں سالانہ اجلاس بمقام علی گڑھ ۲۶ لغایۃ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء

اس سال کانفرنس کا اجلاس بڑی دھوم دھام سے چھ روز تک مسلسل ہوتا رہا۔ اور اس اثنا میں صبح بعد دوپہر شب کو کل سولہ جلسے ہوئے۔ اس اجلاس کی شان تعلیمی نمائش کی وجہ سے دوبالا ہوگئی تھی۔ قرن اول کے بعد ایسی رونق پھر کبھی نہ ہوئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نمائش نے اجلاس کو ایک بے نظیر تقریب بنا دیا تھا۔

۲۶ دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء کو ساڑھے دس بجے جبکہ شرکا جلسے سے تمام اسٹریچی ہال بھرا ہوا تھا۔ جناب مولوی محمد عبد اللہ صاحب انصاری ناظم دینیات نے نہایت دلگداز آواز سے سورہ بقر کا وہ خاص رکوع سنا کر جس میں تعلیم و تعلم کی بحث ہے اور مسئلہ نیابت کی طرف اشارہ ہے حاضرین جلسہ کو بیخود اور جلسہ کا افتتاح فرمایا۔ اس کے بعد جناب نواب مزمل اللہ خاں صاحب کے۔ سی۔ آئی۔ ای صدر کمیٹی استقبالیہ نے ایک برجستہ تقریر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور اختتام پر جناب آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی صدارت کی تجویز پیش کی جس کی ہر طرف سے نہایت زور و شور کے ساتھ تائید ہوئی اور آپنے کرسی صدارت کو زینت بخش کر اپنا بے مثل خطبہ صدارت سنایا۔ یہ ایک مہتم بالشان تعلیمی دستاویز ہے جو بجائے مطالعہ کرنے کے قابل ہے۔ اور جس کی اردو اور انگریزی مطبوعہ نسخے عام طور پر تقسیم کیے گئے۔

جلسۂ دوم میں جو بعد دوپہر منعقد ہوا، جناب آنریری سکرٹیری صاحب کی اجازت سے جوائنٹ سکرٹیری صاحب نے سال بھر کی کارروائی کی روئداد پڑھ کر سنائی (دیکھو صفحہ ۴۹)

چند رزولیوشن پاس ہونے کے بعد بعض مفید اور اہم رزولیوشن پیش ہو کر اور دو رزولیوشن ۳۱ تاریخ کو منظور کیے گئے۔ جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۲۳ء کا دن کانفرنس مسلم یونیورسٹی کے لیے نہایت مبارک تھا کہ ایک طرف تو جناب میکنزی صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم یو پی نے کرسی صدارت کو عزت بخشی اور دوسری طرف جناب سر ولیم میرس صاحب بالقابہ گورنر صوبہ نے تشریف فرما ہو کر اول نمائش کا افتتاح فرمایا اور پھر اسٹریچی ہال میں رونق افروز ہوئے۔ جناب صاحبزادہ صاحب نے اپنا بے مثل ایڈریس پڑھ کر سنایا جس کے جواب میں حضور ممدوح نے ایک نہایت پاکیزہ اور محبت اور ہمدردی سے بھری ہوئی تقریر فرمائی۔ اس جلسہ کے اختتام پر ہمارے علی گڑھ کے مشہور زینت مجلس اور جناب نواب مزمل اللہ خاں صاحب بالقابہ نے حضور گورنر کی تشریف آوری کا نہایت پر اثر اور برجستہ تقریر میں شکریہ ادا کیا۔ اور جلسہ برخاست ہوا۔

شام کو نواب صاحب موصوف نے ہز اکسلنسی گورنر کو اور ان کے ساتھ تمام شرکاء جلسہ طلباء اور اسٹاف سمیت فٹ بال گراؤنڈ میں ایک شاندار ایٹ ہوم دیا۔

اس کے بعد ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۳ء تک بجز تعلیمی کاموں کے اور کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ نہ خالی رزولیوشن پاس کیے گئے جیسا کہ اب تک دستور تھا بلکہ اُن صدہا اساتذہ کو اور طلبا کو طرح طرح کے پیرایوں میں تعلیم و تعلم کے اسباق دیے گئے۔ ان کی دو قسمیں تھیں۔ اول نمائش کا سامان جو تقریباً دس بڑے بڑے کمروں میں آراستہ تھا جس کی تفصیل علیحدہ شائع کی جائے گی جناب مولوی ادریس احمد صاحب ہیڈ ماسٹر آگرہ اسکول نے ایک آرٹیکل کی صورت میں متعدد اخباروں میں شائع کی ہے۔ دوسرے وہ لکچر جو اپنے اپنے فن کے ماہروں نے برسر اجلاس دیے۔ اور جو سب تحریری صورت میں دفتر میں موجود ہیں اور عنقریب کانفرنس گزٹ میں وقتاً فوقتاً یا جداگانہ رسائل کی صورت میں شائع کیے جائیں گے۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس اجلاس میں ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ۶ روز تک ہر روز قوم کے اکابر اور ماہرین فن تعلیم میں سے ایک فرد فرد کرسی صدارت کو رونق بخشتے تھے اور کسی نہ کسی اعلیٰ موضوع تعلیم پر نہایت قابلیت سے بحث کر کے دن کے کام کا افتتاح فرماتے تھے یہ بات کانفرنس کو پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ رزولیوشن اور فہرست اسمائے لکچرار مع موضوع روداد میں ملیں گے۔

ہوں کہ اس کی ان مضرتوں پر بھی بحث کروں جو انسانی زندگی کے تباہ کن اسباب میں ایک نمایاں درجہ رکھتے ہیں؟ اسی طرح ہزاروں چھوٹی بڑی چیزیں ہیں جن سے بازار پٹے پڑے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے اس بیرونی مال کو سے لیجے جو جہازوں پر چڑھکر آیا اور ہندوستان پر دھاوا بول دیا جو ایک کروڑ آٹھ لاکھ بارہ ہزار روپیہ کھینچ لے گیا۔ موٹروں نے بارہ کروڑ چونتیس لاکھ تنتیس ہزار پانسو روپیہ وصول کیے خوردنی اشیار نے تین کروڑ پچاس لاکھ چھیانوی ہزار حاصل کیا۔ فرنیچر نے چون لاکھ چون ہزار کا ٹکس لگایا۔ کانچ کے برتن تین کروڑ سینتیس لاکھ باسٹھ ہزار لیکر ہٹے آلات آہنی نے پچپن لاکھ بیس ہزار کا خون کیا لکر (Lacquer) نے ایک کروڑ ایک لاکھ پچانوے ہزار سمیٹے مختلف شرابوں پر تین کروڑ چوبیس لاکھ گیارہ ہزار خرچ ہوا۔ تمباکو کی نذر دو کروڑ پچانوے لاکھ اکیانوے ہزار روپیہ ہوے اور بیرونی پارچہ جات ساٹھ کروڑ روپیہ دیکر خریدے گئے یوں کہیے کہ ۱۹۲۰ء میں بیرونی اشیار نے اٹھاسی کروڑ باسٹھ لاکھ چوہتر ہزار پانسو روپیہ ہندوستان کی جیب سے کھینچ لیا کاش یہ کل روپیہ اسی ملک میں رہتا اور لیسے لکھو کر ہم اپنی بربادی کے اسباب مہیا نہ کرتے۔ کیا یہ بدنصیب ملک بغیر بیرونی اشیار کے زندہ نہیں رہسکتا۔ ایک طرف یہ حالت اور دوسری طرف ملک کی ناقابلیت اور جہالت خود اپنی بربادی کے اسباب مہیا کرکے دھن دولت خاک میں ملا رہی ہے۔ ایک طرف تو دماغوں میں نور علم کی شعاعیں پڑ رہی ہیں اور دوسری جانب بے مغز سروں میں رنگین ٹوپیوں کا سودا سمایا ہوا ہے۔ اور ٹاٹ بافی جوتوں پر دل لوٹا جاتا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اس طرح اور فضولیات ہیں جو ملک کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں۔ حضرات انقلاب کی ہوائیں چل رہی ہیں ترقیوں کا بازار گرم ہے اور میدان عمل پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو زمانہ کی رفتار پہچانیں زندہ قوموں کے دوش بدوش چلنے کی

فکر کریں دور زماں کا ساتھ دیں اور اپنا موازنہ ان ہستیوں سے کریں جنہوں نے آج گوشہ گوشۂ عالم کو اپنا بنا لیا ہی۔ چپہ چپہ زمین جنکی حلقہ بگوش ہی۔ ہوا جنکی تابع فرمان ہی۔ پانی پر جن کا سکہ جاری ہے بجلی جنکی ایک ادنی کنیز ہے اور سائنس جن کے درکار ایک حقیر پاسباں۔ یہ کیوں۔ اسواسطے کہ قانون روزگار صاف بتا رہا ہے کہ علم کو تاج سر بناؤ۔ اپنی مدد آپ کرو اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہو پھر دنیا پر حکومت کرو۔ پروردگار عالم خود فرماتا ہی کہ تم اپنی حالت آپ بدلو تو ہم تمہاری حالت بدلیں ورنہ قعر مذلت ہے اور تم۔

اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اب بتائیے ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم نے کیا تعلیم حاصل کی ہی۔ اور ہماری تعلیم کے ذرائع کیا ہیں۔ اصل تو یہ ہی کہ ہم اپنی خواہشوں پر اپنی تعلیم کو قربان کر رہے ہیں۔ ایسی تعلیم کیا سکھاتی ہی۔ اسراف۔ فضولخرچی۔ کاہلی سستی اور غلامی کی تمنا۔ ورنہ اگر ہم حقیقی تعلیم حاصل کرتے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہوتا کہ ہم اپنی زندگی کو شاندار آزاد اور اعلیٰ بنائیں تو آج ہماری یہ حالت نہوتی۔ ہمیں تعلیم بتا سکتی ہی کہ ہم کسطرح اپنے دخل و خرچ پر مدبرانہ نظر رکھیں تاکہ دوسروں کے دست نگر نہیں کسطرح اپنی تھیلیوں کا منہ شاطر حریفوں کی دست و برد سے بچا کر بند رکھیں۔ اور ضرورت کے وقت کام میں لائیں۔ ہمارے ملک کی اقتصادی حالت کیا ہونی چاہیے۔ ضروریات زندگی کسطرح اور کہاں سے حاصل کیجائیں ملک کی فلاح و شادابی کے اسباب کیا ہیں اور ہمارے ملک کا سرمایہ کسطرح روز افزوں ہو سکتا ہی۔ تجارت صنعت۔ حرفت اور زراعت کی نشوونما ہمیں کہاں پہونچاد نیگی اور غلامی کی پستیوں سے نکالنے والی کیا چیز ہے۔ اپنے قومی اور ملکی وقار اور روایات شان و نمود کسطرح برقرار رکھیں اور غیر ملکوں کی دولت کسطرح خود ہمارے قدموں پر لوٹتی

پھر ہمارا ملک کسطرح سرسبز وشاداب ہو سکتا اور ہم غریبوں یتیموں اور ناداروں کی امداد کسطرح کر سکتے ہیں جز رسی کفایت شعاری کا کیا حاصل ہو۔ ایک بتی یا دیا سلائی بچاکر ایک طالب علم کی امداد کا کیا فائدہ ہے۔ اندھی تقلید کی جکڑ بند سے ملک کسطرح نجات پاسکتا ہے اور دولت وسرمایہ کا صحیح وجائز مصرف کیا ہے ہنسی آتی ہے جب موجودہ تعلیم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔ غلامی کی آرزو بڑھتی جاتی ہیں۔ ملک کی حالت سے واقفیت کیا معنی حس ہی نہیں کہ ملک پر کیا گزر رہی ہے وہ تو فیشن ایبل بننے کی دھن میں از خود رفتہ ہیں۔ غیر ملکی اشیاء کے استعمال میں اسدرجہ محو ہیں کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔ کاش وہ اس پر بھی غور کریں کہ یہ گراں بہا ضروریات زندگی خریدنے سے ملک کا سرمایہ کہاں جائیگا اور جب ملک میں سرمایہ نہیں رہیگا تو تعلیم پر اس کا کیا اثر پڑے گا اور کیوں کر یہ قیمتی تعلیم جو آئے دن گراں بہا ہوتی جاتی ہی خریدی جائیگی اور جب تعلیم کے خریدنے کی ملک میں سکت ہی باقی نہ رہیگی۔ قومی جیبیں خالی ہو جائینگی تو انجام کار کیا ہوگا۔ تباہی اور بربادی۔ آج ہی جسم میں خون کہاں ہیں۔ آخر یہ کس قوت کے کرشمے ہیں ملک کی فلاح وبہبودی پر کس نے پانی پھیر دیا ہے ظاہر ہے کہ فضول خرچی نے جہالت نے ملک کی دولت کے پرخچے اڑا دئیے ہیں جو کچھ ہمارے ہاتھ میں تھا ہم کھو چکے اور کچھ باقی ہے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اسکے بچنے کی بھی کوئی امید نہیں۔ سب سے زیادہ قابل رحم اور نکبت زدہ مسلمانوں کی ہستی ہی بتائیے آپکے پاس کیا ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو اسے سود کا گھن کھائے جاتا ہے۔ ایسے مسلمان تو بہت ہی کم ہوں گے جو اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہوں ترقی دولت کا ذکر کیا۔ آئے دن جائدادیں نکل رہی ہیں اور روز بروز افلاس ونا داری ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہی نکبت ادبار کا دور دورہ ہے اور اس پر بھی کروٹ نہیں بدلی جاتی صنعت حرفت تجارت اور زراعت ہمارے یہاں کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ جو چیز آزادی کی جان ہے ہم اس سے جان چراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب رہی ایک طاقت

اس میدان تقابل میں بھی پیچھے ہیں تو بیچارے مسلمان - حریف نہایت تیز رفتاری کے ساتھ انہیں روندتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور یہ ہیں کہ عالم بے حسی میں ان کی گرد راہ تک بھی پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے

ہیہات نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر یہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

اس پر ستم یہ کہ بے اعتدالیاں - سیاہ کاریاں جہالت غفلت اور کاہلی مشقت اور محنت سے گریز - اخلاقی جرائت و ہمت کا فقدان مصالح ملکی سے لاعلمی اور بے پرواہی نقص تربیت - حلم و بردباری - فروتنی - بلند حوصلگی - علو ہمتی - اولوالعزمی ایفائے عہد و پیمان سے تنفر اور سب سے زیادہ احکام مذہبی سے بےبصری -

خدا ہمیں آنکھیں دے تو ذرہ ذرہ سے درس عبرت حاصل کر سکتے ہیں آج ہی کانفرنس کے جلسوں اور نمائش کو دیکھ لیجئے - آپکے سامنے ہر طرح کی تقریریں ہو چکیں جغرافیہ - ورزش کشیدے - ریاضی - نقاشی - اندھوں کی تعلیم - علم حیوانات - نباتات - طریقہ تعلیم طفلاں خطاطی - خوشنویسی - ڈرائنگ صناعی طبعیات - کیمیا - فلکیات وغیرہ وغیرہ کے نمونے دکھائے جا چکے سمجھائے جا چکے اب آپ نتیجے نکالیے کہ انسان کسطرح اپنے تمدنی معاشرتی - مرحلوں کو طے کرے اور کیوں کر اپنی زندگی کے دوران کو ہوشیاری اور تدبیر سے انجام کو پہنچائے - کسطرح قانون فطرت سے جو انسان کے ساتھ وابستہ ہے پورا پورا مستفید ہو - اور کیونکر نعمائے ربانی کا شکریہ ادا کرے - وہی ایک ہوا پانی خاک آتش ہے - وہی حیوانات - نباتات - جمادات ہے - وہی دماغ آنکھ ناک کان اور دیگر اعضائے بدن ہیں جنسے ملکر ایک جسم کا نظام قائم ہوتا ہے - ہر جزو ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے اگر اس سے وہ کام نہ لیا جائے بلکہ خلاف فطرت استعمال میں آئے تو اس کا کیا انجام

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپیگا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف (۳ روپیے) مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجنا چاہیئے اور منی آرڈر کوپن میں صاف طور سے اس کی تشریح کردی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیئے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کیساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شایع ہوسکتے ہیں اُجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ ہونا چاہیئے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمان خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

مسلمانوں کو آیندہ کس تعلیم کی ضرورت ہے؟

ہندوستان میں کسی جماعت کی تعلیم و ترقی کا مسئلہ اسقدر پیچیدہ نہیں ہی جسقدر مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کا انگریزی حکومت کے زمانہ آغاز سے یہ مسئلہ ملک کے سامنے آیا اور اس زمانہ سے آجتک مختلف خیالات و افکار کا مرکز رہا لیکن افسوس ہی کہ شاہراہ عمل اب تک متعین نہ ہوسکی،

حقیقت یہ ہی کہ حکومت اور سلطنت کا انقلاب، صرف نظام حکومت اور قوانین معدلت ہی میں تبدیلی نہیں پیدا کرتا بلکہ اصول معاشرت اور تعلیم و تربیت کے دستور و آئین میں بھی انقلاب پیدا کردیتا ہی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات مذہب اور زبان کو بھی بدل دیتا ہی" اور یہ تو عام حالت ہی کہ پرانی ضرورتوں کی جگہ جدید ضرورتیں پیدا ہوجاتی ہیں اور کسب معاش کے وسائل بالکل بدل جاتے ہیں، اسیطرح دولت کے نئے نئے مصرف بھی پیدا ہوجاتے ہیں، غرض ہندوستان میں جو جدید حالات پیدا ہوئے وہ درحقیقت انقلاب حکومت کے لازمی نتایج ہیں، اس لئے مسلمانوں کا فرض ہی کہ وہ بھی جدید حالات کے ماتحت اپنی ترقی کے وسائل و اسباب فراہم کریں، اور اپنی تعلیم کو زمانہ کی ضرورت کے مطابق مفید و کارآمد بنائیں تاکہ اس سے عمدہ نتایج ظاہر ہوں،

اسلامی عہد حکومت میں تعلیم کا مسئلہ اسقدر پیچیدہ نہ تھا نہ مقابلہ اور کشمکش کی صورت

نی، مذہبی تعلیم کے علاوہ جس کا دائرہ محدود تھا عام طور پر جو لوگ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے وہ فارسی زبان اور معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے تھے جو اس زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے بالکل کافی تھا، معاش کا مسئلہ بھی اس قدر جانگداز نہ تھا، عام مسلمانوں کا پیشہ سپہ گری یا سرکاری ملازمت تھا، ہزاروں شخص دربار شاہی اور اُمرا سے توسل رکھتے تھے اور اُن کے خوان نعمت سے متمتع ہوتے تھے، اس کے علاوہ وہ زمین کے وسیع قطعات کے مالک تھے، اور اُن سے فائدہ اٹھاتے تھے، تجارت میں بے شبہ اُن کا زیادہ حصہ نہ تھا، لیکن اُن میں اہل حرفہ اور کاریگر کافی تعداد میں موجود تھے، جو ضرورت کی تمام چیزیں تیار کرتے تھے، کپڑا، برتن، زیور، ہتیار وغیرہ اسی ملک میں تیار ہوتے تھے، بعض چیزیں اسقدر زیادہ مقدار میں تیار ہوتی تھیں کہ بیرونی ممالک کو بھیجی جاتی تھیں، اور اُن کا روپیہ ہندوستان آتا تھا، طریق معاشرت عام لوگوں کا بالکل سادہ تھا، جو چیزیں آج لازمہ حیات ہیں، اُس زمانہ میں اُن کا وجود بھی نہ تھا، اُمرا و سلاطین کی معاشرت میں بیشک ایک حد تک تکلف و اسراف تھا لیکن اُن کے اسراف سے بھی اہل ملک ہی متمتع ہوتے تھے، غرض کسب معاش کے لئے اس قدر جد وجہد کی ضرورت نہ تھی جسقدر آج ہے،

انقلاب حکومت کے بعد جب رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلی ہوئی تو مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ دشواریاں پیش آنے لگیں اور کسب معاش کا مسئلہ اُن کے لئے نہایت دشوار بلکہ لاینحل ہوگیا، کیونکہ اکثر مسلمانوں کا ذریعہ معاش صرف سرکاری ملازمت تھی، اور موجودہ دور حکومت میں ملازمت کا دروازہ اُن کے لئے قریباً بند ہوگیا،

آغاز حکومت میں چونکہ انتظام مملکت بہمہ وجوہ مکمل نہ تھا اور جدید نظام تعلیم ملک میں قائم نہیں ہوا تھا اور نہ انگریزی زبان نے زیادہ رواج پایا تھا، اس لئے قدیم طرز کے تعلیم یافتہ مسلمان مختلف عہدوں پر مقرر ہوتے رہے، اور اردو زبان میں قانون وغیرہ کا امتحان

دیگر کامیابی سے حصول معاش میں مصروف و منہمک رہے، لیکن جب جدید حکومت کو استقلال واستحکام نصیب ہوا اور مغربی تعلیم کا عام انتظام ملک میں کیا گیا اور آہستہ آہستہ ہر ملازمت کے متعلق ایک خاص تعلیمی معیار اور امتحانات تجویز کئے گئے تو مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا ہوا کیونکہ وہ جدید تعلیم سے اب تک بالکل ناآشنا رہے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جدید تعلیم کے برخلاف اُن میں تعصب موجود تھا اور وہ مذہبی نقطہ نظر سے اس تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے،

اس زمانہ میں چند عاقبت اندیش مسلمانوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ جب تک مسلمان جدید تعلیم سے متمتع نہ ہوں گے موجودہ عہد حکومت میں کسی قسم کی ترقی نہ کرسکیں گے اور اور نہ حکومت کے کسی صیغہ اور محکمہ میں کوئی ممتاز منصب حاصل کرنا اُن کے لئے ممکن ہوگا، اس بنا پر انہوں نے یہ کوشش کی کہ مغربی تعلیم کے برخلاف مسلمانوں میں جو تعصب موجود ہے اس کو دور کیا جائے، چنانچہ اس کوشش میں ایک حد تک کامیابی حاصل ہوئی اور مسلمان، جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، موجودہ حالت یہ ہے کہ من حیث القوم مسلمانوں میں جدید تعلیم کے برخلاف کسی قسم کا تعصب نہیں ہے لیکن اگر باوجود اس کے وہ تعلیم میں پس ماندہ ہیں تو اس کا سبب اُن کا افلاس، جمود، اور غفلت ہے،

انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کا متوجہ ہونا کسی علمی ذوق کی بنا پر نہ تھا، بلکہ کسب معاش کی ضرورت نے ان کو جدید تعلیم پر متوجہ کیا تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ ہندو جدید تعلیم حاصل کرکے گورنمنٹ کے ہر محکمہ میں داخل ہورہے ہیں، یعنی انگریزی تعلیم کی بدولت سرکار کے تمام دفاتر میں ہندو ہی ہندو نظر آتے ہیں، غرض یہ حالات دیکھ کر مسلمان تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، اور جب اُن کے چند افراد تعلیم پاکر حکومت کے معزز عہدوں پر مقرر ہوئے تو

دوسروں کو بھی تعلیم کی طرف رغبت پیدا ہوئی یہاں تک کہ کافی تعداد تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ملک میں پیدا ہو گئی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہندو مسلمانوں میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے ایک ناگوار کش مکش اور مقابلہ شروع ہو گیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور شائد ابھی مدت تک جاری رہیگا؛

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے آغاز کو اب ۵۰ برس کا زمانہ گذر چکا ہے اور یہ ایسی طویل مدت ہے جو اس تعلیم کے ثمرات سے متمتع ہونے کے لئے بالکل کافی ہے، اور اس بنا پر ہم موجودہ تعلیم کے نتائج پر مختلف حیثیات سے گفتگو کر سکتے ہیں، مثلاً یہ کہ اس تعلیم سے کس قسم کی دماغی، ذہنی اور اخلاقی ترقی مسلمانوں نے حاصل کی، یا علم کی مختلف شاخوں میں کس قدر ترقی یا اضافہ ہوا؟ ملک کی سیاسی حالت میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں؟ قوم کی جسمانی قوت اور توانائی کے لحاظ سے کہاں تک ترقی کی؟ لیکن بالفعل ہم ان تمام نتائج سے بحث کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی دولت اور سرمایہ میں کس قدر اضافہ ہوا؟ اور معاش کے کس قدر جدید وسائل مسلمانوں کو معلوم ہوئے؟

جن لوگوں نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی بالفعل اُن کے مقصد سے ہم کو بحث نہیں، لیکن تعلیم پانے والوں کا تو ہمیشہ یہی مقصد رہا ہے کہ وہ تعلیم پا کر معاش حاصل کریں لیکن حصول معاش کا ذریعہ صرف ملازمت رہا، اور خود گورنمنٹ کا بھی تعلیم سے سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ وہ سرکاری دفاتر کے لئے کام کرنیوالے تیار کرے، ابتدا میں جب تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد محدود تھی تو سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں دشواریاں پیش نہیں آتی تھیں لیکن جب رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھنے لگی تو گورنمنٹ مختلف قیود اضافہ کر کر کے ملازمت کے معیار کو بلند اور دائرہ کو تنگ کرتی رہی، لیکن لوگوں میں سرکاری ملازمت کا ایسا ذوق

پیدا ہوگیا تھا کہ وہ برابر ان مشکلات کا مقابلہ کرکے حصول ملازمت کے لئے جد وجہد کرتے رہے، اور کسب معاش کے کسی دوسرے ذریعہ پر انھوں نے توجہ نہ کی، آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملازمت کا دائرہ بالکل تنگ ہوگیا، اور جسقدر گورنمنٹ کو ضرورت تھی، اُس سے زیادہ انگریزی تعلیم یافتہ ملک میں پیدا ہوگئے جن کے لئے سرکاری دفاتر میں گنجایش نکلنا دشوار ہی۔ اور وہ بجز ملازمت کے کسب معاش کے کسی اور طریقہ پر توجہ نہیں کرتے، اس لئے بیکاری اور بے سود انتظار میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، مایوسی و ناکامیابی نے ان میں سے اکثر کو انقلاب پسند بنا دیا ہی جو خیال کرتے ہیں کہ جب تک دفتری اقتدار اور بیرونی تسلط کا خاتمہ نہ ہوگا ہندوستانیوں کے لئے وسائل معاش پیدا نہ ہوں گے، حالانکہ اگر اُن کا مقصد صرف ملازمت نہ ہو تو معاش کے جدید وسائل پیدا کرنا اب بھی اُن کے لئے ناممکن نہیں ہی۔

ملازمت کبھی دولت وثروت کا ذریعہ نہیں سمجھی گئی نہ کسی ملک کے افراد نے ملازمت کے ذریعہ سے اپنی قوم کی دولت اور سرمایہ میں اضافہ کیا بلکہ وہ حصول معاش کا سب سے ادنیٰ درجہ کا ذریعہ ہی جس کو کوئی حوصلہ مند شخص بغیر مجبوری کے اختیار نہیں کرسکتا، پس اگر تعلیم کا مقصد صرف ملازمت ہی تو ہم کو تعلیم کی بدقسمتی پر ماتم کرنا اور مسلمانوں کی خوش حالی سے مایوس ہو جانا چاہیئے جن کا ملازمت کے سوا اور کوئی مقصد نہیں،

ہندوؤں کی حالت مسلمانوں سے مختلف ہی اگرچہ اُن کی ایک جماعت بھی ملازمت کے لئے جد وجہد میں مصروف رہتی ہی لیکن ہندو قوم کا ذریعہ معاش درحقیقت ملازمت نہیں، اُن کی قوم کا اکثر حصہ کاروبار میں مشغول ہی اور ہندوستان میں معاش کے جسقدر وسائل اور کاروبار کے جسقدر شعبے ہیں اُن پر زمانہ دراز سے قبضہ کر چکا ہی، اس لئے ہندو بہ نسبت مسلمانوں کے بہت زیادہ دولت مند ہیں، اور مسلمان اکثر تہیدست، ممکن ہی کہ

جدید علوم نے اُن کے کاسۂ سر کو علمی زر و جواہر سے لبریز کر دیا ہو' لیکن اُن کا کیسہ تو یقیناً خالی ہی اور بظاہر مستقبل قریب میں اُن کی حالت سنبھلنے کی کوئی امید بھی نہیں' چونکہ اُن کا نصب العین ابتدا سے صرف ملازمت رہا اور حصول دولت کے دوسرے ذرائع سے وہ بے سر غافل رہے اس لیے تعلیم نے اُن کی قومی دولت و ثروت میں کچھ بھی اضافہ نہ کیا بلکہ اُن کی حالت بد سے بدتر ہو گئی'

مسلمانوں کی یہ ایک دیرینہ عادت ہی کہ وہ وقت پر کبھی بیدار نہیں ہوتے اور جب تک اپنے طرز عمل کے نتائج آنکھوں کے سامنے نہ آجائیں اُن کو کسی قسم کا تنبہ نہیں ہوتا چنانچہ ابتدا میں جب انگریزی تعلیم ملک میں پھیلی تو وہ نہایت ناعاقبت اندیشی سے اُس کی طرف سے غافل رہے بلکہ نفرت کا اظہار کیا' برخلاف اس کے دوسرے لوگ اس تعلیم سے متمتع ہوئے اور آج حکومت کے اجزائے ترکیبی بنکر انتظام مملکت پر حاوی ہیں' موجودہ زمانہ میں از سر نو یہی صورت درپیش ہی' یعنی ملازمت کا دروازہ چونکہ قریباً بند ہو چکا ہی' اس لئے دوسرے لوگ کسب معاش کے جدید ذرائع اختیار کر رہے ہیں اور نئے نئے دروازے کھٹکھٹا رہے ہیں لیکن مسلمان اُسی پرانے راستہ پر اب تک چل رہے ہیں اور اپنی ناعاقبت اندیشی کے نتائج سے بے خبر ہیں'

افلاس اور بیچارگی نے مسلمانوں کو شکستہ حال بنا رکھا ہی' اُن کی تمام قومی تحریکیں قلت سرمایہ کی وجہ سے نیم جاں حالت میں ہیں اور اُن کا قومی وقار و اعزاز معرض خطر میں' اس لئے درحقیقت سب سے زیادہ مسلمانوں کو جدید وسائل تلاش کرنے اور قوم کو خوش حال بنانے کی ضرورت ہی' لیکن افسوس کہ مسلمان ہی سب سے زیادہ غافل ہیں' جدید تعلیم نے اُن میں یورپ کی تقلید کا شوق تو پیدا کر دیا ہی' لیکن یہ تقلید صرف مغربی معاشرت کی پیروی اور

یورپ کی ساختہ اشیاء کے استعمال پر محدود ہے، وہ یہ تو سیکھتے ہیں کہ ہم ان جدید چیزوں کو کیونکر استعمال کریں لیکن یہ سیکھنا نہیں چاہتے کہ ان چیزوں کو خود کیونکر تیار کریں، دولت کے جدید مصرف تو انہوں نے تلاش کر لیے ہیں لیکن حصول دولت کے جدید وسائل معلوم کرنے پر انہوں نے کبھی توجہ نہیں کی وہ مغربی تہذیب کے جزئیات کو نہایت شوق سے معلوم کر کے اسکی پیروی کرتے ہیں لیکن مغربی صنعت گری کو صرف ایک متحیر اور مرعوب تماشائی کی طرح دیکھتے ہیں اور اسکا سیکھنا اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے، انکی ظاہری چمک دمک اور جست و خیز تو اہل یورپ کی مانند ہے، مگر اُن کی دماغی و ذہنی قوتیں مردہ ہو رہی ہیں، اُن میں نہ ترقی کا حوصلہ ہے نہ ابھرنے کا ولولہ، اُن میں سے اکثر کی تنگ نظری اور سُبک سری کا یہ حال ہے کہ محض سادہ تعلیم سے متمتع ہو کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم یورپ کے دوش بدوش دنیا کی کش مکش میں حصہ لے سکتے ہیں، حالانکہ اپنے جسم کے معمولی لباس کے لئے بھی وہ یورپ کے منت کش ہیں، وہ اپنی بلند آہنگی اور زبان آوری سے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ترقی کے مدارج طے کر کے دنیا کی بلند رتبہ قوموں کے پہلو بہ پہلو کام کرنے کے لئے تیار ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

اے طبل بلند بانگ در باطن ہیچ

موجودہ زمانہ میں بغیر مادی ترقی کے کوئی قوم اپنی ہستی کو قایم نہیں رکھ سکتی، زمانہ تیز گامی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس لئے اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہم کو زمانہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا چاہئے ورنہ راستہ سے ہٹ جانا چاہئے، خدا کی یہ کائنات ہر قسم کی بیش بہا نعمتوں سے معمور ہے لیکن یہ نعمتیں صرف اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اُن کو حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھیں اور اپنے زور بازو سے دوسروں کو ہٹا کر اُن پر قبضہ کر لیں، عروج و ترقی، اور کامیابی و کامرانی کسی خاص قوم کا حصہ نہیں، بلکہ اس قوم کا حصہ ہے جو اُس کے حاصل کرنے کا عزم کرے،

آنکہ شمشیر زند سکہ بنامش باشد

مبدء فیاض نے بخل نہیں کیا ہی اُس کی نعمتیں عام ہیں لیکن باوجود اس کے اگر ہم ا[n]
نعمتوں سے محروم ہیں تو یہ ہمارا قصور ہی،

عام ہیں اُس کے تو الطاف شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہاں اس میں شک نہیں کہ ہر شخص بقدر اپنی ہمت اور حوصلہ، اور سعی و کوشش کے فا[ئدہ]
اُٹھاتا ہی اور جو شخص اپنے کو جسقدر زیادہ مستحق ثابت کرتا ہی، اسی قدر اس خوان نعمت سے
حصہ پاتا ہے، ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

مسلمان اگر دنیا میں ترقی کرنا اور اپنی قوم کے افلاس اور شکستہ حالی کو دور کرنا چاہتے
ہیں تو اُن کا فرض ہی کہ وہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھکر از سر نو اس پر غور کریں
کہ اُن کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہی؟ اور اپنی قوم کی ترقی و فلاح کے لئے وہ کونسا بہتر
ذریعہ اختیار کر سکتے ہیں،

نظر بہ حالات موجودہ یہ امر بالکل واضح ہی کہ جب تک مسلمان صنعتی تعلیم حاصل کر کے
ملک کے قدرتی وسائل سے فائدہ نہ اُٹھائیں اس وقت تک اُن کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہو سکتا
نہ ہندوستان کی فلاکت و مصیبت دور ہو سکتی ہی، ہندوستان تباہی کے کنارہ پر پہنچ چکا ہے
جدید صنعتی آلات اور بعض اندرونی مشکلات نے ملکی صنعت کا خاتمہ کر دیا ہی یعنی اکثر
صنعتیں مردہ ہو چکی ہیں، ہندوستانی مصنوعات کی نہ ملک کے اندر مانگ ہی نہ باہر، نہ یو[رپ]
نہ ایشیا میں ہندوستانی مصنوعات کی کوئی منڈی ہی، ہندوستانی صنعت کے اس زوال
کا اثر زیادہ تر مسلمانوں پر پڑا ہے کیونکہ صناع اور اہل حرفہ بیشتر مسلمان تھے، دیسی [صنعت]
کی کساد بازاری نے اُن کے کاروبار کو تباہ کر کے اُنکو مفلس بنا دیا جس کا افسوسناک نتیجہ

کہ ہندوستانی صنعتیں مٹ گئیں اور آج دوبارہ اُن کا زندہ ہونا دشوار ہوگیا، اب جسے تھوڑے
بہت اہل ہنر باقی ہیں جب تک سرمایہ دار اُن کی حوصلہ افزائی نہ کریں اور اُن کی مصنوعات
کی ملک میں مانگ نہ ہو قدیم صنائع کا زندہ رہنا ممکن نہیں،

یہ خیال کرنا کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور یہاں صنعت وحرفت کے لئے کوئی
میدان نہیں غلط ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ ہندوستانی اس قسم کی تعلیم ہی نہ حاصل کریں کہ
اپنے ملک کے قدرتی وسائل اور زیر زمین خزائن سے فائدہ اُٹھا سکیں، ہندوستان موجودہ دَور
ترقی سے پہلے اپنی صنعت وحرفت میں مشہور تھا، اور یہاں کی مصنوعات یورپ کی منڈیوں
کے لئے باعث زینت تھیں، کشمیر کی شال، بنارس کی کمخواب، ڈھاکہ کی ململ سے کون واقف
نہیں، ہندوستانی ساخت کے ریشمی کپڑے بھی عدیم المثال ہوتے تھے، ہاتھی دانت اور آبنوس
کا خوبصورت کام یہاں کی خاص چیز تھی، بیدر کے قابل دید ظروف اور ورنگل کے قالین بھی
مشہور تھے، یہاں کی مٹی و برنجی ظروف، گھر گھر پھیلے ہوئے تھے، یہاں کے خوبصورت دخوشنما
زیور امرا و سلاطین کے محلات میں خاص قدر وقیمت رکھتے تھے، یہاں کی مینا کاری اور مرصع
کاری ضرب المثل تھی، مچھلی پٹن کی چھینٹ کو خصوصیت کے ساتھ حسن قبول حاصل تھا
سنگ مرمر پر جیسا نازک اور حیرت انگیز کام ہوتا تھا، اس کا مشاہدہ آج بھی کیا جا سکتا ہے، فن
تعمیر نے جو ترقی کی تھی اسکی بہترین شاہدہ باقی ماندہ عمارتیں ہیں جو آج تک ہم کو گذشتہ سلاطین
کی عظمت وشوکت کا افسانہ سنا رہی ہیں،

غرض ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں کی کوئی خاص صنعت مشہور نہ ہو، اس
دور انحطاط میں بھی ہندوستان میں بہترین صناع اور کاریگر موجود ہیں، مگر قلت سرمایہ کی
وجہ سے اپنی مصنوعات کو اسقدر ترقی نہیں دے سکتے کہ اپنا مال ہندوستان کے باہر بھیجیں

لک اس قدر مال بھی تیار نہیں کرسکتے جو ہندوستان کی ضروریات کو پورا کرسکے لیکن میری
یہ عالم ہے کہ کوئی اُن کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا ہم نے خود ورنگل میں قالین بافی کے کارخانے
کو دیکھا اور جو اعلیٰ درجہ کا ریشمی کپڑا وہاں تیار ہوتا ہے وہ بھی نظر سے گذرا حقیقت یہ ہے کہ یہ
صنعت آج بھی وہاں اس درجہ پر ہے کہ اپنا جواب نہیں رکھتی، لیکن اس کا دائرہ اسقدر
محدود ہے کہ غالباً ہندوستان میں باوجود جستجو کے بھی ورنگل کا قالین بازار میں نہیں ملسکتا
اور اس سے زیادہ افسوس ناک یہ امر ہے کہ خود حیدرآباد کے اکثر اُمرا جاپان اور یورپ
وغیرہ کے قالین (جو ورنگل کے قالین سے فروتر ہیں) استعمال کرتے ہیں، بیدر میں آج بھی
ظروف تیار ہوتے ہیں لیکن ایسا نازک اور باریک کام اب دیکھنے میں نہیں آتا جو قدیم ظروف
میں پایا جاتا ہے۔

مغربی مصنوعات کی چمک دمک نے ہماری آنکھوں کو اسقدر خیرہ کردیا ہے کہ ہم ہندوستانی
مصنوعات کی قدر نہیں کرتے اور جہالت و ناواقفیت کے بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان
اعلیٰ درجہ کی مصنوعات، اور صنعت کی قابل قدر مثالوں سے بالکل خالی ہے، حالانکہ اگر کوئی
شخص تمام ہندوستان کا دورہ کرکے عمیق نظر سے ملک کی صنعتی حالت کا مطالعہ کرے تو اس
کو معلوم ہوگا کہ اس گئی گذری حالت میں بھی جب کہ ہزاروں قدیم صنعتیں برباد ہو چکی ہیں
ملک میں کیا کچھ موجود ہے، وہ دیکھے گا کہ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں کوئی مخصوص
صنعت نہ ہو، لیکن خود ہماری ناقدرشناسی اور مغرب پرستی کی بدولت تمام صنعتیں زوال
حالت میں ہیں، اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو باقی ماندہ صنعتوں کا مٹ جانا بھی یقینی ہے،

غرض ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی باقی ماندہ قدیم صنعتوں کو از سر نو زندہ
کرکے اپنے ملک کی عزت و دولت بڑھائیں یہ کام درحقیقت سرمایہ داروں کا ہے کہ وہ

کاریگروں کی اعانت وحوصلہ افزائی کریں اور اہل ملک کا یہ فرض ہی کہ وہ جاپان وغیرہ کی کمزور اور ناپائدار چیزوں کے مقابلہ میں ہندوستانی مصنوعات کی قدر کرکے بالواسطہ ملکی صنعت کی ترقی میں حصہ لیں،

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ضرورت صنعت پارچہ بافی کو ترقی دینے کی ہی جس کے لئے خود ملک میں کافی گنجائش موجود ہی، اور اگر ہم اسقدر کپڑا تیار کرسکیں جو ملک کی ضرورت کو پورا کرسکے تو ۶۰۰۰ کروڑ روپیہ سالانہ کا فائدہ اس غریب ملک کو پہنچا سکتے ہیں، گذشتہ زمانہ میں ہندوستان صرف اپنے ہی لئے کپڑا تیار نہیں کرتا تھا بلکہ یورپ کو بھی اپنا مال بھیجتا تھا چنانچہ صرف ۱۸۱۳ء میں ۲۰ لاکھ پونڈ کا کپڑا کلکتہ سے یورپ کو بھیجا گیا، لیکن یہ حالت زیادہ مدت تک نہ رہی کیونکہ یورپ کے کاریگروں نے شوروغل برپا کرکے ہندوستانی کپڑے پر ۷۰۔۸۰ فی صدی تک محصول اضافہ کراکر ہماری تجارت کا قریباً خاتمہ کردیا اور اب خود انگلستان سے لاکھوں پونڈ کا کپڑا ہر سال ہندوستان آنے لگا اور اب ہم اس کی امید نہیں کرسکتے کہ یورپ کے بازار میں ہماری تجارت کو از سرنو عروج حاصل ہوگا لیکن اگر ہم تجارتی حوصلہ مندی سے کام لیں تو خود ہمارے ملک میں کاروبار کے لئے وسیع میدان موجود ہی،

لیکن ہم کو یاد رکھنا کہ موجودہ زمانہ میں ہم ہندوستان کے اندر بھی صرف قدیم طرز پارچہ بافی اور ہندوستانی کرگہ اور چرخہ سے یورپ کی صنعت پارچہ بافی کا مقابلہ نہیں کرسکتے، ہندوستانی کپڑے کی کساد بازاری کا راز درحقیقت نوایجاد آلات اور مشینیں ہیں، ہماری صنعت کو اصلی زوال اس وقت شروع ہوا جبکہ انگلستان میں دخانی کرگاہیں ایجاد ہوئیں جن کی وجہ سے مال ارزاں اور کثیر مقدار میں تیار ہونے لگا یہاں تک کہ ہم خود

ہندوستان کے بازاروں میں بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے، لہذا اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود فراخ دلی کے ساتھ ان مشینوں سے فائدہ اُٹھائیں، اور مشترکہ سرمایہ سے جا بجا ہندوستان میں پارچہ بافی کے کارخانے قایم کر کے مختلف قسم کا کپڑا تیار کریں، برخلاف اس کے اگر ہم صرف چرخہ اور کھدر کے چکر میں رہے تو ناکامی کے سوا اور کچھ نتیجہ نہ ہوگا، ہمارا اصول یہ ہونا چاہئے کہ ہم یورپ کے اسباب تعیش و آرایش سے تو احتراز کریں لیکن مفید و کارآمد چیزوں سے کشادہ دلی کے ساتھ فائدہ اُٹھائیں، قدیم ہتیاروں سے مسلح ہو کر ہم دنیا کے موجودہ میدان جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اور نہ زمانہ کی ترقی کو پیچھے ڈھکیل سکتے ہیں، اس لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے تو اپنی ہمعصر قوموں کی دوش بدوش اُن ہی علوم میں ترقی کریں اور اُن ہی ذرائع کو اختیار کریں جن سے اُن ترقی یافتہ قوموں نے اس درجہ تک ترقی کی ہے،

ٹرکی، ایران، مراکش وغیرہ کی تباہی اور زوال کا ایک راز یہی ہے کہ باوجود قوت و شوکت اور سطوت و اقتدار کے انھوں نے بر بنائے تعصب و تنگدلی اور جمود و غفلت، اقوام یورپ کے دوش بدوش ترقی نہیں کی، یورپ اپنے علم و ہنر، آلات و اسلحہ، اور ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے برابر آگے بڑہتا رہا مگر مسلمان حکمراں اُن کی ترقی کو حقارت و تعصب کی نظر سے دیکھتے رہے، تعصب کی انتہا یہ تھی کہ جدید اسلحہ اور جدید طرز پر فوجی قواعد کو ناجائز قرار دیا گیا، آخر کار اس غفلت و خود فراموشی کا یہ انجام ہوا کہ یورپ نے ان کی قوت و شوکت کا خاتمہ کر دیا،

پس مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنا اور اقوام عالم کے درمیان اپنی حیثیت قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ صرف یہی ہو سکتا

ہی کہ عروج یافتہ قوموں نے جن دشوار گزار منازل سے گذر کر ترقی کی ہے انہی منزلوں سے گذریں اور کشادہ دلی کے ساتھ جدید اختراعات سے متمتع ہو کر اپنی قوم کو بام ترقی پر پہنچائیں،

ماحصل مذکورہ بالا خیالات کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ وہ حصول معاش کے جدید وسائل تلاش کریں کیونکہ ملازمت کا دائرہ اب تنگ ہو رہا ہے، اور اس ذریعہ سے فلاح و فارغ البالی کی اب مطلق امید نہیں ہے، جدید وسائل سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمان صنعت و حرفت کی تعلیم کی طرف باقاعدہ توجہ کرکے جدید آلات اور مشینوں کے استعمال سے واقفیت حاصل کریں، اور اس کے بعد ملک میں ان آلات کو رواج دیں نیز یہ کہ قدرتی وسائل اور خام پیداوار سے فائدہ اٹھا کر ضرورت کی چیزیں خود ہندوستان میں تیار کریں تاکہ جو روپیہ ممالک غیر کی ساختہ اشیا کے معاوضہ میں باہر جاتا ہے وہ ہندوستان میں رہ کر اہنائے وطن کی فارغ البالی کا باعث ہو، مثلاً سنہ ۱۹۲۰و۲۱ء میں ایک سال کے اندر ایک کروڑ، ۷ لاکھ روپیہ کی دیا سلائیاں اور ایک کروڑ ۴ لاکھ کا صابون باہر سے آیا، اگر ہم کوشش کریں تو یہ سب چیزیں اپنے ملک میں تیار کرسکتے ہیں اسی طرح اور سیکڑوں چیزیں ہیں جو بیرونی ممالک سے تیار ہو کر آتی ہیں حالانکہ ہم ان کو اس ملک میں بھی تیار کرسکتے ہیں کیونکہ جن خام اجناس سے وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں وہ زیادہ تر ہمارے ملک سے یورپ جاتی ہیں جہاں سے وہ مصنوعات کی صورت میں واپس آتی ہیں اور ہم ان کو معقول قیمت دیکر خریدتے ہیں، مثلاً کپاس اور چمڑا کثیر مقدار میں ہندوستان سے جاتا ہے اور دوبارہ کپڑوں اور جوتوں کی شکل میں واپس آتا ہے، چنانچہ کم و بیش ایک کروڑ کے صرف بوٹ باہر سے آجاتے ہیں،

مذکورہ بالا حالات کا یہ تقاضا ہے کہ ہم جدید آئینی اصول پر نو ایجاد آلات اور مشینوں

کے ذریعہ سے ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دیں اب محض دستکاری سے کسی قسم کی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ہاتھ سے مال دیر میں تیار ہوتا ہے اور گراں پڑتا ہے اس لئے بازار میں اس کی مانگ نہیں، برخلاف اس کے مشینوں سے مال جلد تیار ہوتا ہے اور اس لئے قدرتاً ارزاں ہوتا ہے، مثلاً ایک دیا سلائی بنانیوالی مشین ایک گھنٹہ میں ڈہائی لاکھ دیا سلائیاں تیار کر سکتی ہے جو ہاتھ سے ممکن نہیں۔ لہذا ہماری کامیابی کا راستہ یہی ہے کہ ہم تازہ ترین ایجادات و آلات کو اپنے ملک میں رواج دیں،

لیکن ملک کی صنعتی ترقی منحصر ہے اعلیٰ درجہ کی صنعتی تعلیم پر جس کا ہندوستان میں کوئی معقول انتظام نہیں اس لئے ہمارے نوجوانوں کو لامحالہ یورپ، امریکا اور جاپان جانا ہوگا، صاحب استطاعت لوگوں کو خود جانا چاہئے، اور غیر مستطیع طلبہ کے لئے قوم کو وظائف کا مستقل انتظام کرنا چاہئے، ابتدا میں جاپان نے بھی اسی طرح اپنے ملک کے نوجوانوں کو تعلیم کے لئے باہر بھیجا تھا،

جو نوجوان اعلیٰ صنعتی تعلیم حاصل کر کے آئیں گے اُن کے پاس اسقدر سرمایہ نہ ہوگا کہ وہ بڑے بڑے کارخانے جاری کر سکیں اس لئے یہ کام اولوالعزم سرمایہ داروں کا ہوگا کہ وہ اُن کی خدمات سے فائدہ اُٹھائیں، اور ملک میں مشترکہ سرمایہ سے کارخانے جاری کریں، لیکن ایک درجہ صنعتی کاروبار کا اس سے فروتر بھی ہے، یعنی جاپان کی طرح چھوٹی چھوٹی مشینوں کے ذریعہ سے مختلف صنعتوں کو رواج دینا، تاکہ گھریلو طور پر مختلف خاندان صنعت و حرفت میں مشغول رہ سکیں، یہ طریقہ ہمارے ملک کے لئے اول الذکر طریقہ سے زیادہ سہل، قابل عمل اور فوری توجہ کا محتاج ہے کیونکہ ابھی سرمایہ داروں میں عام طور پر اسقدر تجارتی حوصلہ مندی نہیں پیدا ہوئی ہے کہ وہ بڑے بڑے کارخانوں کے قائم کرنے کی ہمت کر سکیں، لہذا ہمارے نوجوانوں کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ وہ زیادہ تر جاپان جائیں جہاں نسبتاً ارزاں طریقہ سے کثیر المنفعت صنعتیں سیکھ

واقفیت حاصل کرسکیں گے،

محمد اکرام اللہ خاں ندوی سلطان جہاں منزل علی گڑھ

بچوں کی سزا کا مسئلہ

بچوں کی تربیت میں اُن کو سزا دینے کا مسئلہ نہایت مشکل مسئلہ ہے، محل سزا اور قسم سزا تجویز کرنے میں نہایت عقلمندی اور تمیز کی ضرورت ہے۔ بچہ جس کو سزا دیجائیگی جسم اور دماغ دونوں میں خام اور والدین سے اسقدر کمزور اور نادان ہے اگر اس کو سخت سزا دیجائے یا اس کے دل میں سزا کے بعد ناراضی کا احساس باقی رہے تو سزا سے بجائے نفع کے بجید نقصان ہوگا سزا ایسے موقعوں پر دینی چاہیئے جبکہ بچہ کے دلمیں اُس کے واجبی ہونے کا یقین ہو اور سزا سے بچہ کے دل میں قصور نہ کرنے کی سچی خواہش پیدا ہو۔ علاوہ ازیں بچوں کی طبیعتیں ایک دوسرے سے اسقدر مختلف ہوتی ہیں کہ ایک بچہ کیواسطے سزا نہایت مفید ثابت ہوتی ہے اور وہی سزا دوسرے بچے کو اسقدر نقصان پہونچاتی ہے کہ اُس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

لہذا انتخاب سزا اور درجہ سزا تجویز کرنے میں فقط قصور کی نوعیت ہی ہمارے پیش نظر نہ ہونی چاہیئے بلکہ ہم کو بچہ کی خصلت اور اُس کی جسمانی حالت کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ بار بار سزا دینا والدین کی کمزوری کی علامت ہے، اور اس بات کا کھلا اقرار ہے کہ سابق سزائیں بے اثر اور بے سود ثابت ہوئیں۔ دراصل جسقدر طریقہ تربیت اچھا ہوگا اوسی نسبت سے سزا کی کم ضرورت ہوگی۔ بعض ایسے غلط کار اور لغزش کرنیوالے بچہ ہوتے ہیں جو اپنی لاپروائی سے اکثر مستوجب سزا ہوتے ہیں اور اس کثرت سے اُن کو سزا دیجاتی

ہی کہ وہ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں اور سزا کا اُن پر بہت اثر نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اس بات کی ضرورت ہی کہ تربیت کنندہ اپنے طریقہ تربیت کو بدلے۔ اکثر دیکھا گیا ہی کہ جو بچے ایک دایہ یا معلمہ کی نگرانی میں بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں اور بار بار اُن کو ترجروتوبیخ کی ضرورت ہوتی ہی۔ دوسری دایہ یا معلمہ کی نگرانی میں جو دوسرے مزاج اور خصلت کی ہی اُن کا رویہ بالکل اچھا ہوتا ہی۔ کسی بچّہ کو بالکل بُرا نہ سمجھنا چاہیئے اور ہر وقت اُس کو بُرا نہ کہنا چاہیئے ایسا کرنے سے تم اُس کی بُرائی اس کو ہمیشہ یاد دلاتے رہتے ہو اور بُرا سنتے سنتے وہ دراصل بُرا ہو جاتا ہی۔ مثل مشہور ہی "بد بھلا بدنام بُرا" بچّہ کو اپنی اصلاح اور اوس سے اچھی توقعات کا موقع کیوں نہیں دیتے۔ بُرا کہنا آسان ہی مگر اوس کی اصلاح کرنا مشکل کام ہی۔

باپ کو ایسے وجود سے سابقہ ہی جو اخلاقی لحاظ سے ابھی خام ہی اور اُس کے ساتھ غلط برتاؤ کرنے سے بُرائی اور بھلائی کا اوس کو احساس کم ہو جائیگا۔ فاریس صاحب کہتے ہیں کہ بچّہ میں سب سے زیادہ پہلی صفت عفو کی ہی۔ مثل مشہور ہی کہ "ماں مارے اور بچّہ ماں ہی ماں پکارے" مگر ایک خاص عمر کے بعد یہ عفو کی صفت بچّہ میں باقی نہیں رہتی۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہی کہ بچّہ عفو کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ جب اُس کو اپنی شخصیت کا احساس ہو جاتا ہی تو لڑکا اس خودداری کی وجہ سے جو شخصیت کا خاصہ ہی بغیر اپنی روحانیت کا خون کئی ہوئے اُس زخم کو نہیں بھول سکتا جو اُس کو لگا ہے۔ یہی والدین کے امتحان کا موقعہ ہی یہیں والدین کی ہوشیاری معلوم ہوتی ہی کہ وہ بغیر ناگواری کے محسوس کریں کہ اب لڑکا اُن کی مرضی کا تابع نہیں ہی، بلکہ اپنی مرضی کا تابع ہی۔ ایک حد تک یہ صحیح ہی کہ اگر بچّہ کو کسی بچپنے سے پالا ہوتا ہی تو تقریباً چودہ سال کی عمر کے بعد وہ کسی دوسرے کی اطاعت نہیں

کر سکتا۔ اس عمر میں جبراً لڑکے سے حکم منوانا ہمیشہ کے لئے والدین اور لڑکے کے درمیان محبت کے تعلقات کو منقطع کرتا ہے۔ اسی عمر میں اکثر گھروں میں نہایت افسوسناک واقعات پیش آتے ہیں،

سزا سے کیا مقصد ہوتا ہے؟ سزا سے مقصد (۱) بدلہ لینا، (۲) ڈرانا اور روکنا یا (۳) اصلاح کرنا ہے۔ ان تین مقاصد میں سے آخر مقصد کا اکثر اوقات لحاظ نہیں رکھا جاتا اور یہی بہت زیادہ مفید مقصد ہے اگر یہ حاصل ہو جاتا ہے تو جو کچھ تم چاہتے تھے وہ حاصل ہو گیا۔ ایک محبت کرنیوالا بچہ اس کو ایک سخت سزا تصور کریگا اگر اس کے ماں باپ اس سے اظہار ناراضی کریں۔ وہ اپنی غلط کاری پر ماں باپ کے چہرہ سے تعجب آمیز تکلیف اور ان کی آواز سے اظہار رنج محسوس کریگا اور شرمندگی اور ندامت کے ساتھ کہیگا کہ مجھ کو اپنی حرکت پر افسوس ہے اس صورت میں اور کسی سزا کی ضرورت نہیں۔ ایک اور سخت سزا یہ ہو سکتی ہے کہ بچہ کو عارضی طور پر ماں باپ اپنے سامنے نہ آنے دیں۔ مگر بعض بچوں پر اس سزا کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یا تو ابتدائی تربیت میں کوئی نقص ہوتا ہے یا اُن بچوں کی صورت میں ہوتا ہے جن کے والدین خود بدلگام ہوتے ہیں اور اس لئے بچے بھی بے قابو ہوتے ہیں یا خود بچوں کی طبیعت میں کوئی نقص ہوتا ہے،

اپنی مرضی کا تابع بچہ نتائج کی سزا سے اکثر اوقات بہتر سبق حاصل کرتا ہے۔ روسو اور مسٹر ہربرٹ اسپنسر نے قدرتی نتائج سے سزا کے طریقہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ کیونکہ اس میں ذاتیات نہیں ہوتی اور وہ اٹل اور موزوں ہوتا ہے۔ اگر کوئی بچہ ایک سوئی اپنی انگلی میں چبھولے یا اپنا ہاتھ آتشدان کی سلاخوں میں ڈالدے تو سزا جسمانی تکلیف کی شکل میں اس کو ہوتی ہے۔ اور جتنی مرتبہ وہ ایسا کرے نتیجہ ہمیشہ تکلیف ہوتا ہے۔ بے پرواہی سے چلنے کا نتیجہ گر پڑنا ہوتا ہے۔ بہت زیادہ مٹھائی کھانے سے بدہضمی پیدا ہوتی ہے۔ جو سزا کہ بچہ کو اپنی غلط کاری سے ہوتی ہے اس کے واسطے وہ کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا

سکتا - نتیجہ سی سبب کا پتہ لگانیکی ابتدا غالباً اسی نتائج سزا کے قانون سے ہوتی ہی
اور اس کی مفید تعلیم عمر بھر یاد رہتی ہی - اسپنسر صاحب لکھتے ہیں "اگر کوئی نوجوان زندگی
کا کام شروع کرنیکے بعد اپنا وقت ضائع کرتا ہی اور جو فرائض کہ اُس کے سپرد ہوئی ہیں
اُن کو سستی سے یا بھدے پن سے انجام دیتا ہی اُس کو قدرتی سزا یہ ملتی ہی کہ وہ موقوف
ہو جاتا ہی اور کچھ عرصہ افلاس کی سزا بھگتتا ہی - جو ڈاکٹر کہ اپنے مریضوں کی طرف کم توجہ کرتا
ہی اُس کی طرف مریضوں کی کم رجوع ہونے سے اوس کو زیادہ توجہ کرنے کا سبق ملتا ہی
لیکن نتائج کی سزا اگرچہ اکثر لحاظ سے نہایت عمدہ ہی - مگر ہر موقع پر اس کا استعمال نہیں
ہو سکتا - جوان العمر لوگ اپنی غلط کاری کے نتائج برداشت کریں - لیکن بچوں کے
لئے بعض اوقات اس قسم کی سزا بہت پرخطر ہی بالخصوص اس وجہ سے کہ ان میں
دوربینی بہت کم ہوتی ہی - بچہ کو گہرے پانی کے کنارہ پر یا تیز چاقو سے کھیلنے دینا یا روغن
کئے ہوئے کھلونے کو چوسنے دینا تاکہ اس کو پانی کے ڈوبنے کی یا چاقو کی تیزی کی یا
روغن کے زہر کا تجربہ ہو بہت مہنگا تجربہ ہی - اس لئے کسی نہ کسی شخص کو دخل دینا اور
منع کرنا پڑتا ہی اور اُس لڑکے کو سزا دینی ہوتی ہی جو کہنا نہیں مانتا - لیکن ایک بچہ تنبیہ
سے بے پروائی کرنیکی بعد تجربہ سے بشرطیکہ بچہ مضبوط ہو معلوم کر سکتا ہی کہ ایک گرم سطح
جلاتی ہی - کچے پھل معدہ کو خراب کرتے ہیں - دن میں تین مرتبہ نہانا قرین عقل نہیں ہی
لیکن بچہ یہ محسوس نہ کرے کہ اس کو پھنسانے کے لئے جال بچھایا گیا ہی - بعض بچہ حکم کی
تعمیل اس قدر دیر میں اور ناگواری سے کرتے ہیں کہ تعمیل نافرمانی کے درجہ تک پہونچ
جاتی ہی اور اُس کو بعض پسند کرتے ہیں اور اس معاملہ میں دلیل و مباحثہ کرنیکی اجازت
دیتے ہیں اور اس طرح سے بچہ کو ہزاروں وجوہ صحیح و مصنوعی پیدا کرنے کا موقع مل
جاتا ہی - جہانتک ممکن ہو سزا جرم کے مطابق ہو یا داش ہو - مطلق العنانی نہ ہو -
پانی کا لوٹا لنڈھانے کی سزا یہ ہو کہ پانی کو بچہ سے خشک کرایا جائے - چاء کی پیالی

توڑنے کی سزا میں بچہ سے اُس کے ٹکڑے چنوائے جائیں اور آیندہ اس کو مٹی کے برتن میں چار دیجائے۔ کپڑوں کو خراب کرنیکی یہ سزا ہو کہ اُس کو خراب کپڑے پہنائے جائیں

ایک چھوٹی لڑکی جس کو وقت کا اندازہ نہیں ہے اور سیر کیواسطے جانے کے لئے اکثر دیر میں تیار ہوتی ہے اس کو وقت کا پابند نہ ہونیکی سزا یہ ہو کہ وہ کسی عمدہ تماشہ سے محروم رہے۔ لیکن ماں کو چاہئے کہ وہ لڑکی کو پیشتر سے تنبیہ کردے کہ اب دو بجے ہیں اپنے بھائی اور بہنوں کے ساتھ جانے کے لئے چار بجے تیار ہوجائے سارے کنبہ کو آخر وقت میں پریشان نہ ہونا چاہیئے اور بچہ کے وقت پر طیار نہ ہونے سے ریل گاڑی کو ہاتھ سے نہ کھونا چاہیئے۔

جو شخص بچہ کی کمزوری کے اسباب کی زیادہ کرید کریگا ممکن ہے کہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ بچہ کو وقت کا اندازہ کرنا سکھایا جائے ! بچہ کو معلوم ہو کہ ایک منٹ کتنی دیر میں گذرتا ہے تین منٹ کتنی دیر میں پانچ منٹ کتنی دیر میں اور ایک گھنٹہ کتنی دیر کا نام ہے اور وقت کا اندازہ کرنیکی اس کو ہر روز مشق کرائی جائے۔ بہت سے نقص خصلت کی خرابی سے منسوب کردئے جاتے ہیں حالانکہ وہ فقط ذہنی نقص ہوتے ہیں اور اُن کے رفع کرنے کے لئے تربیت کی ضرورت ہے سزا کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے کہ بچہ ہر کام دیر میں کرتا ہو یا خیال بند ہو اور عملی نہ ہو ہر حالت کے مطابق علاج مختلف ہوگا۔ ایک چھوٹا بچہ بے ڈھنگا ہے ہنگم ہے چیزوں کو آپس میں ٹکراتا ہے۔ کواڑوں کو زور سے بند کرتا ہے۔ نازک چیزوں کو اس طرح ہاتھ ڈالتا ہے گویا وہ لوہے کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کا سبب کوتاہ نظری یا پٹھوں پر قابو نہ ہونا یا کسی چیز کے وزن یا کشش کا ٹھیک اندازہ نہ کرنا ہو سکتا ہے۔ اخرالذکر صورت میں لڑکے کو اُس کا نقص دور کرنے کے لئے اٹھانے یا کھینچنے اور اشیا کے استعمال کرنیکی مشق کرانی چاہیئے۔ اس پر اس کو مارنا یا جھڑکنا نہیں چاہیئے۔

جھڑکنے کا کیسا بُرا اثر لڑکے پر پڑتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا ہے کہ بچہ بیکلی کی حالت میں

کھڑا ہی۔ آنسو اُس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے ہیں اور جھڑکیوں کی بوچھار اس کمبخت پر ہو رہی
ہی۔ جو بچہ کہ اس طرح جھڑکیاں کھاتا ہی، تم دیکھو گے کہ بہت جلد وہ خود ہی جھڑکیاں دینا
سیکھ جائے گا۔ نیز اور بھرائی ہوئی آواز، ناملایم الفاظ۔ غصہ کا لہجہ دھمکیاں اور الزامات
جو بچہ کے نازک لبوں سے نکلیں گے کیسے بدنما معلوم ہونگے۔ لیکن اگر سرزنش کے چند پر اثر
لفظ بچہ سے تنہائی میں کہے جائیں تو مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور بچہ کی خودداری بھی قائم
قائم رہیگی اور اُس کو ضبط نفس اور خوش اخلاقی کا سبق بھی حاصل ہوگا۔

بے اختیار غصہ کا اظہار ایک کمزوری ہی جس کا اظہار شور وغل کی صورت میں
ہوتا ہی۔ لیکن اخلاقی غصہ جو قابو میں رکھا جائے وہ ایسا ہی پر زور ہی جیسا کہ ایک بندوق
جو چلنے کیواسطے بھری گئی ہو اور بندوق کی طرح سے اپنی طرف سے متوجہ کرتا ہی اور ادب
کے ساتھ اُس کا خوف ہوتا ہی۔ نہایت ضروری ہی کہ سزا ملنے سے پیشتر بچہ پوری طرح
سے سمجھے کہ یہ سزا بدلہ لینے کی غرض سے یا غصہ کی وجہ سے نہیں دی گئی ہی، بلکہ وہ
یا دل ناخواستہ ہی اور اس بات کا افسوس ہی کہ اس کو اپنی غلط کاری کیوجہ سے تکلیف
اُٹھانی پڑی۔ اور سزا کا مقصد خطا کاری سے احتراز کرنے میں اُس کی مدد کرتا ہی۔ بچہ کو
یہ بھی سمجھانا چاہیے کہ غلط کاری کا لازمی نتیجہ سزا ہی ہر قانون کی خلاف ورزی کی پاداش
بھگتنی ہوگی وہ قانون جسمانی ہو یا اخلاقی یا دماغی۔ اگر کوئی فعل تین بار کرنے دیا جائے
اور چوتھی بار اُس سے روکا جائے۔ اس سے بچہ کی دل میں انصاف کا خیال لوٹ پوٹ
ہو جائے گا، ادب جاتا رہیگا، اور نافرمانی اُس کو جائز معلوم ہوگی۔

بدی کا نہ کرنا قابل تعریف بات نہیں ہی اور اُس پر انعام کا تو کوئی موقعہ ہی
نہیں ہی۔ ایسے موقعہ پر بچہ کو یہ کہنا کافی ہی کہ تم نے ٹھیک کیا۔ مثلاً سچ بولنے یا ایک
گم شدہ شے کے مالک کی تلاش پر انعام دینا اس سے بڑی خوشی کی بیقدری کرنا ہی
جو نیک کام کرنے سے بچہ کو ہوتی۔ جس بچہ کو نیک اطواری اُس کی بیحد تعریف کر کے

سکھائی جاتی ہی ۔ وہ تعریف پسند اور مغرور ہو جاتا ہی ۔ برخلاف اُس کے ایک نوعمر بچّہ کو اس خیال سے کہ وہ دل شکستہ نہ ہو ایسے کاموں پر کہ جن میں کوشش کرنی پڑتی ہے والدین کو اظہار پسندیدگی تبسم کے ذریعہ سے کرنا چاہیئے۔

فرض کرو کہ ایک بچہ سے اکثر کہا گیا ہی کہ وہ اپنے کھلونوں کو سونے کی وقت اُٹھا کر رکھدیا کرے ورنہ وہ اس سے لے لئے جاویں گے ۔ مگر وہ ان کو فرش پر بکھرا ہوا چھوڑ دیتا ہی ۔ ایسے بچہ سے اُسکے کھلونے لے لینی چاہئیں ۔ اور جب وہ کھلونے کے نہ ہونے سے تکلیف محسوس کرکے رات کو سوتے وقت اپنی ہر چیز مثل کنگھی، تولیا کپڑا وغیرہ کو ٹھیک کرکے رکھدے تو آیندہ دن اُس کو اُس کے کھلونے واپس دیدینے چاہئیں اگر ہم اپنے بچّوں کو اُن کی غلط کاری کے نتایج نہ بھگتنے دیں تو ضبط نفس اور حکومت ذاتی سکھانے کے سب سے بڑے ذریعہ سے ہم اُن کو محروم کرتے ہیں ۔

سزا کے دینے میں زیادہ دیر نہ کرنی چاہیئے ۔ ابھی قصور کی یاد تازہ ہو کہ قصور کی سزا ملجائے ۔ مگر سزا دینے میں اسقدر جلدی بھی نہ کرنی چاہیئے کہ سزا دینے میں والدین کے غصہ اور چڑچڑے پن کا اظہار ہو ۔ اگر سزا دینے میں دوسرے دن کا انتظار کیا جائے تو پھر اس بچہ کو کون سزا دے سکتا ہی جو اپنے پہلے دن کے قصور کو بھول گیا ہے اور مسکراتا ہوا خوش خوش صبح کے وقت ماں باپ کے پاس آتا ہی کہ وہ اُس کو پیار کریں ۔

سزا بھی قصور کے مطابق ہونی چاہیئے نہ بہت سخت ہو نہ بہت خفیف ۔ اگر پچھلی نسلوں نے سختی کی باب میں افراط کی تو اب نرمی میں تفریط ہی اور بچّوں اور نوجوانوں کو اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہی کہ جو چاہیں کریں ۔ بعض اوقات والدین میں سے ایک سزا کا کام دوسرے پر چھوڑ دیتا ہی اور اکثر اوقات یہ بار ماں کو اُٹھانا پڑتا ہے ۔ کیونکہ باپ اپنے کاروبار کیوجہ سے بہت تھوڑی دیر بچّوں کے پاس رہتا ہے

ای ہیرسن صاحب کہتے ہیں کہ ایک بچہ بہت جلد محسوس کر لیتا ہے کہ بکھرے ہوئے کھلونوں کو اکٹھا کرنا چاہئے۔ خراب کئے ہوئے کپڑوں کو بدلنا چاہئے۔ دیر کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اگر وہ روپیہ کو بیوقوفی سے خرچ کر دے گا تو والدین اُس کو پھر روپیہ نہ دیں گے۔ اگر وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دق کرے گا تو پھر وہ اس کے ساتھ نہ کھیلیں گے۔ اگر وہ ضد کریگا تو ماں اسکی طرف توجہ نہ کریگی جب ان خفیف لغزشوں میں فعل کے مطابق سزا دیجائے تو بچہ بہت جلد محسوس کریگا کہ جھوٹ بولنے سے وہ بے وقعت ہو جاتا ہے۔ ناجائز فائدہ سے دل خوش نہیں ہوتا تصنع سے آدمی تنگ آجاتا ہے۔ حسد کرنے سے خود انسان کو تکلیف ہوتی ہے خود غرض آدمی کا کوئی دوست نہیں ہوتا اس کو بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ جائز فائدہ سے آدمی کا دل خوش ہوتا ہے۔ ایماندار آدمی کی وقعت ہوتی ہے ہمدرد انسان سے ہر شخص محبت کرتا ہے۔ حسد نکرنے والیکو وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے جو قابل حسد تھی بے غرض آدمی کا دل ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

ایک زمانہ میں جسمانی سزا ہی ایک بڑا ذریعہ درستی کا تھا اور تعلیمی مدارس میں وہ اب بھی دیجاتی ہے۔ ہم ہیڈ ماسٹر کی بید پر بحث نہ کریں گے گو وہ نہ طالب علم کے واسطے قابل تعریف بات ہے اور نہ انتظام اسکول کی اس سے خوبی معلوم ہوتی ہے مگر گھر پر باپ کے ہاتھ میں تو بید بہت ہی بدنما ہے۔ بچہ کی ابتدائی تربیت میں کوئی بڑی غلطی ہوئی ہے کہ باپ کو بید کے استعمال کی ضرورت پڑی۔ کسی سخت اخلاقی جرم یا بے رحمی سے بچہ کو ستانے کیوجہ سے ایسے لڑکے کو جس کی اخلاقی حالت بہت خراب ہے اور جس پر سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا جسمانی سزا جائز ہے۔ مگر دراصل اس قسم کی سزا ذلیل کرنیوالی قابل نفرت اور خطرناک ہے اور اُس سے وحشیانہ جذبہ، فریب اور بزدلی کی تحریک ہوگی اور احساس کم ہو جائے گا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اس سے بچہ محسوس کرے گا کہ وہ مثل کتے کے ہے جو بید وں سے پٹتا ہے۔ وہ بطور ایک حیوان کے سمجھا گیا ہے ایک مصنف نے اعداد و شمار سے ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ بچے

جسمانی سزا کو کچھ نہیں سمجھتے۔ مگر یہ بچہ پر منحصر ہے کہ کس قسم کا بچہ ہے۔ جو بچے ایسے گھر میں پرورش پاتے ہیں جہاں زدوکوب ایسی ہی روزمرہ کی بات ہے جیسی کہ قسمیں کھانا بیشک وہ بچے جسمانی سزا کو معمولی بات سمجھیں گے۔ مگر اس سے سزا کا وحشیانہ پن کم نہیں ہوتا لیکن اُس لڑکے کے دل میں کب غلط بحث پیدا ہوگا جو نافرمانی۔ غیرپابندی وقت کپڑوں کو گندہ کرنے۔ اور جھوٹ بولنے پر جرم پر بلا امتیاز پٹتا ہے۔ گوشمالی کو حملہ مجرمانہ سے کم نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس سے کان سے نازک عضو کو ہمیشہ کے لئے نقصان پہونچ جائے۔ علاوہ ازیں ایک چنچل بچہ کے کان کے قرب دماغ کا حصہ معمول سے زیادہ متحرک حالت میں ہوتا ہے۔ صدمہ سے اُس کو اور متحرک کرنا چنچل پن کو دور کرنے کا طریقہ نہیں ہے۔ بعض مائیں تھپڑ کے موافق ہیں اور اُس کو بُرا اثر سمجھتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض بچوں کی صورت میں ایسا ہو۔ مگر اکثر کی صورت میں وہ نقصان رساں ہے۔ بہرحال تھپڑ مارنے والا چڑچڑے پن کو اپنے سے جدا نہیں کرسکتا اور بچہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں پر اس اصلاح کے طریقہ کو استعمال کرے گا اور دایہ بھی یہ سمجھکر کہ اس طریقہ سزا کی اجازت ہے استعمال کریگی۔

دوسری قسمیں سزا کی قید۔ سلادینا۔ خاموش بٹھانا۔ معمولی غذا سے محروم کرنا۔ فقط روٹی اور پانی دینا مقررہ کام کا کرانا۔ سبق یاد کرانا۔ کسی کھیل یا تماشہ سے روکدینا اور معافی مانگنے پر مجبور کرنا ہیں۔ ان سزاؤں کا صحیح یا غلط ہونا بچہ پر منحصر ہے۔ ایک سست بلغمی مزاج لڑکا چند گھنٹے بستر میں پڑا رہنا یا پانچ منٹ تک بے کام کے خاموش کرسی پر بیٹھنا اپنے واسطے بہتر سمجھیگا اور اس سزا کو محسوس نہ کرے گا مگر ایک مستعد لڑکا یا لڑکی قید یا کسی قسم کی روک کو ناقابل برداشت سزا محسوس کریں گے۔ کسی چیز کو سبق کی کتاب میں سے بطور سزا کے یاد کرانا بہتر طریقہ سزا کا نہیں ہے۔ غالباً اس طریقہ سزا سے بچہ کی دلمیں علم یا کم از کم اوس شعبہ علم کیسا

تکلیف اور سزا کا خیال جاگزیں ہوجائیگا۔ اگر بچہ کے کسی فعل پر ساراکنبہ اظہار ناراضی کرے تو یہ اکثر صورتوں میں زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ جبراً معافی مانگنے کا اکثر اوقات دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خطا کار سے ساراکنبہ اظہار ناراضی کرے اور کوئی شخص خطار کار کو منہ نہ لگائے تو خطا کار بہت جلد اونکی ناراضی کو دور کرنی کی کوشش کرے گا۔ اگر ماں باپ بچہ کو محبت کی نظر سے نہ دیکھیں تو قدرتی طور سے اس کے دل میں شرمندگی اور غلطی کا احساس پیدا ہوگا اور وہ اپنی غلطی کا احساس پیدا ہوگا اور وہ اپنی غلطی پر پچھتائے گا۔

کنگسلی کا قول ہو کہ کسی برے عمل پر اپنے تئیں سزا دینے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جاؤ اور اچھا کام کرو یہ سب دانائی کا قول ہو اور والدین کو اپنے بچوں کی تربیت میں اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔

جماعت میں ضبط اور توجہ کو کیونکر قایم رکھا جاسکتا ہی

زیرک معلم کی نگاہ غور سے دیکھنے اور تہ تک پہنچنے والی نگاہ لایق مدرس کی شناخت کا اعلیٰ ذریعہ اور عمدہ آلہ ہی۔ بعض معلم فی نفسہ قابل ہوتے اور علم میں بلند پایہ دستگاہ رکھتے ہوئے بھی اس وصف سے محروم ہوتے ہیں۔ بصارت کی بجائے بصیرت سے کام لینے میں انھیں مشاقی ہوتی اور بیرونی آنکھ کے بالعوض شاید ان کی اندرونی نظر زیادہ تیز ہوتی ہی کیونکہ پڑھاتے وقت ایسا ظاہر ہوتا ہی گویا طلبا کے دل پر اپنی تعلیم کے اثر سے بے خبر ہوکر وہ اپنی ہی لوح قلب کو پڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن زیرک معلم طلبا کے چہروں کو ہوشیاری سے دیکھتا اور صرف صورت دیکھنے سے خفیف علامات کے شروع ہوتے ہی اُن کے باطنی حالات و احساسات کو بھانپ لیتا ہی، وہ ایک ہی نظر میں ان کے دل کی کیفیت کو تاڑ جاتا ہی وہ انتشار توجہ کے اولین لمحہ ہی میں معلوم کرلیتا ہی آیا وہ اپنے مدعا میں کامیاب

ہوا ہے یعنی طلبا کے شغل کی محرک شوق و دلچسپی ہی یا وہ بے دلی اور بے پروائی سے کام کر رہے ہیں اور مجہولی و پژمردگی ان پر غلبہ پائے ہوئے ہے۔

نگاہ کا ملکہ اپس اپنے طلبا کی شکل دیکھ کر ہی حال معلوم کرنے کے لئے غور سے توجہ کرنے کی عادت ڈالو۔ تاکہ تکان، بے توجہی، پژمردگی اور انتشار توجہ کی پہلی نشانی صورت دیکھتے ہی معلوم ہو جائے۔ ایسا ملکہ حاصل ہو کہ ایک ہی نظر میں فوراً اور یقیناً چہرہ کی تر و تازگی اور افسردگی کا پتہ لگ جائے طلباء کے بشرہ سے تعلیم کا اثر محسوس کرنے کے لئے تمھیں اپنے مضمون پر حاوی ہونا اور کامل عبور حاصل کرنا چاہئے خواہ تمھیں اپنی لیاقت پر کیسا ہی ناز و اعتماد ہو تمھیں ہر ایک سبق کی تعلیم سے پیشتر بخوبی تیار ہونا واجب ہے۔

ہوشیاری کی ضرورت اپنی تعلیم کا اثر معلوم کرنے اور تعلیم کو بکار آمد بنانے کے لئے ہوشیاری کے ساتھ پیش نظر حالت سے منفعت حاصل کرنے کی صلاحیت واجب ہے۔ ایک ذہین معلم کو طلبا کی بے توجہی پہلی ہی نگاہ میں محسوس ہو جائیگی اور فوراً یہ بتلائیگی کہ اب کچھ توقف کرنے کے بعد معانی و مطالب کی تشریح و توضیح سے کام لینا چاہئے۔ تکان کا منظر فی الفور شغل میں کسی ایسے تغیر و تبدل کو جتائیگا جس سے مشکل رفع ہو جائے گا۔ بچوں کے احساسات و جذبات کا علم بے کار ہے اگر حسب ضرورت اپنے مفید و کار آمد بنانے کے لئے معلم میں کافی ذہانت و فطانت نہیں ہے۔ قوت مشاہدہ و ذہن رسا دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور بالعموم یہ باہم یکجا پائے جاتے ہیں۔ اول الذکر سے ہمیں نقائص کی وہ علامتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو بچوں میں کمی عمر کی نا واقفی سے پائی جاتی ہیں اور دوسری سے ہم حسب ضرورت اپنے علم کو بکار آمد بنا کر ان نقائص کا علاج کر سکتے ہیں۔

ہوشیار معلم جس معلم میں نگہبانی اور ہوشیاری دونوں اوصاف ہوتے ہیں وہ ہر وقت اپنا ہاتھ جماعت کی نبض پر رکھتا ہے۔ بدشوقی، بے توجہی، لاپروائی وغیرہ ہر مرض کی ہر ایک علامت کو فوراً بھانپ لیتا ہے اور انھیں بڑھنے کا موقع دینے سے پہلے ہی ایسا کافی اور موثر علاج کرتا

ہی جس سے مرض فوراً رک جاتا ہی، اور بعض رفع ہوجاتا ہی' وہ آموختہ پر سوال کرے گا تختۂ سیاہ پر نقشہ کھینچیگا، تمثیل و تشریح سے کام لیگا یا ورزش میں مشغول کرکے انھیں تفریح طبع کا موقع بہم پہنچائیگا غرض کسی نہ کسی ذریعہ سے تر و تازگی اور دلچسپی کے جذبہ کو برانگیختہ کرکے اپنے طریقہ کو مفید بنانے کی سبیل نکالیگا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔

قوت باصرہ اور ضبط مدرسہ | تعلیم دینے کے وقت نگہبانی اور ہوشیاری کی جس قدر ضرورت ہی اس سے کہیں زیادہ نظم و نسق قائم رکھنے میں بصارت سے کام لینے کی شدید حاجت ہے۔ جماعت میں ضبط قایم رکھنے کے لئے ہوشیار معلم کی نکتہ رس نگاہ کس قدر موثر ہے! معلم و متعلم کے درمیان وہ بہت خاموشی کے ساتھ پیغام رسانی کرتی رہتی ہی اور کس خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ، کچھ نہ کہے اور کہنے میں کوئی کسر باقی نہ رہے وہ یاد دلانے ہمت بڑھانے' ملامت کرنے ہدایت دینے اور جوش قایم رکھنے میں ہر بچہ کے ساتھ جداگانہ برتاؤ کرتی ہی وہ اپنا یقین اور موثر پیغام علانیہ خاموشی اور صراحتہً رازداری کے ساتھ ہر فرد متعلقہ تک پہنچاتی ہی۔ لطف یہ ہی کہ تعلیم میں ایک لمحہ کی بھی رخنہ اندازی نہیں ہوتی وہ بجلی کی مانند سرعت کے ساتھ کام کرتی ہی اور اس کے مطلب میں عبارت سے زیادہ صراحت ہوتی ہی متنبہ نگاہ کے ذریعہ سے لایق معلم خطا کار کو علانیہ توجہ دلاکر عزت نفس پر صریح حملہ کئے بغیر ان کے اکثر قصوروں کی اصلاح کرسکتا ہی اسے اس امر کی کوشش پر دسترس ہوتی ہی کہ بے توجہی اور بدنظمی کی ابتدائی حالت میں موثر طور پر تدارک کرسکے۔

جزئیات | جزئیات سے بے التفاتی ایسی ہی کہ کسی جہاز کے باریک سوراخ کی پروا نہ کی جائے یقیناً کچھ عرصے بعد اس غفلت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جہاز خواہ کیسا ہی مضبوط و محفوظ ہو رفتہ رفتہ بالآخر یقیناً ڈوب جائیگا۔ اعلیٰ نظم و نسق کی بڑی خوبی یہ ہی کہ ابتدائی علامتوں کی شناخت کا کافی ملکہ حاصل ہو اور دوران عمل ہی میں چھوٹی سے چھوٹی بات کا پورا خیال رکھا جائے عمدہ منتظم کا اعلیٰ وصف یہ ہی کہ وہ فی الفور بدنظمی کی ابتدائی نشانی کو پہچان جائے۔ اولین نشانی مثل

اس چنگاری سے ہوتی ہے جو اپنی حقیر ہستی میں اہل نظر کو مہیب آتش فشانی کے مہیب خطرہ کا پتہ دیتی ہے اور فوراً آسانی سے بجھائی جاسکتی ہے بدنظمی کی چنگاری بجھانے کا بہترین طریقہ اکثر صورتوں میں ایک تنبیہ نگاہ ہے مگر جب کہ معلم نے اپنا اخلاقی اقتدار طلبا کے دلوں پر بٹھا لیا ہو خاص کر اس وقت وہ بہت ہی مؤثر ہوجاتی ہے جب کہ آواز کے لہجہ میں کسی قدر معنی خیز تبدیلی نمایاں ہو۔

تنبیہ نگاہ | ہوشیاری کے ساتھ تنبیہ نگاہ کے استعمال کا بہت خیال رکھو اور بدنظمی و بد اخلاقی کی چنگاری فوراً بجھا دو۔ ایسا موقع ہی نہ دو کہ مرض بڑھ جائے اور کسی کو نقصان پہنچائے یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ معلم و متعلم پاس پاس ہوں اور ایک دوسرے کی رسائی کے اندر ہوں یہ یاد رہنا چاہیئے کہ درمیانی فاصلہ کا بُعد مشاہدہ کی قوت کو نہیں تو مشاہدہ کے عملی فائدہ کی وسعت کو یقیناً گھٹا دیتا ہے۔ قصہ مختصر معلم صرف موجود ہی نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کا وجود محسوس اور مؤثر ہونا چاہیئے۔

بدنظمی کا بہترین تدارک اور ضبط کا اعلیٰ ذریعہ | بے توجہی اور بدنظمی کا بہترین علاج مسلسل مگر گوناگون شغل ہے اور اس امر کا ہمیشہ اور بجنسہ خیال رکھو کہ طلبا کے لئے ہر وقت کوئی مشغلہ اور ہر ایک شغل کے لئے کوئی قوی محرک موجود ہو جو انھیں کام میں سرگرم رکھنے کے علاوہ پر امید و مسرور رکھے اگر تم یہ چاہو کہ وہ بالکل خاموش رہیں اور چپکے بیٹھے سنے جائیں تو تمہاری یہ توقع محض فضول ہے زیادہ عرصہ تک یہ ممکن نہیں بہت جلد ان کی خفیف توجہ منتشر ہو کر اپنی تفریح کی تلاش میں لگ جائیگی۔ پس تم ہر وقت انھیں کسی مفید اور دلچسپ شغلہ میں لگائے رکھو ان کی محنت میں خود بھی رفاقت کرو انھیں اپنے کام میں گہری دلچسپی اور بڑی خوشی محسوس ہوگی اور جو کام خوشی اور دلچسپی سے کیا جائے گا اس میں توجہ اور ضبط لازمی ہے۔

خلاصہ | المختصر معلم کے لئے صرف علمی لیاقت و قابلیت چنداں کافی نہیں۔ فن تعلیم کی صحیح واقفیت اور عملی مہارت درکار ہے ورنہ مدرس خواہ کیسا ہی قابل و فاضل ہو وہ ہمیشہ ناکام رہیگا اور طلبا کو کمزور رکھیگا۔ اگر مدرس آسان طریقہ سے دلچسپ پیرایہ میں سبق ذہن نشین

نہیں کر سکتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لایق و کامیاب وہی ہے جو حسب ضرورت مختلف ذریعوں سے توجہ کو قایم رکھ کر تمام تعلیم میں طلبا کی قوت ازادی کو اس طرح شریک رکھے گویا وہ خود اپنا سبق آپ تیار کر رہے ہیں۔

"خادم التعلیم"

پنجالہ دو تعلیم

صوبہ متحدہ میں

پنجاب اور متحدہ کے سررشتہ ہائے تعلیمات نے اپنے اپنے قلمرو کی روداد پنجالہ پچھلے مہینہ میں شایع کی ہیں۔ صوبہ متحدہ کی حکومت کی جانب سے ڈائرکٹر صاحب کی روداد کے آخر پر ایک مختصر تبصرہ بھی شامل ہوا ہے۔ ایوان حکومت سے معمولاً ہر ایک کاغذ مکمل اور مرصع صورت میں شایع ہوا کرتا ہے۔ یہ دونوں روداد یں بھی ویسی ہی ہیں۔ بلکہ یہ ایک خصوصیت زیادہ ہے کہ دور اصلاح کے بعد یہ سب سے پہلا روداد عمل ہے جس میں جدید تعلیمی کوششوں کے نتایج کو حسب معمول متعدد نقشوں اور جدولوں کے ذریعہ سے ہر پہلو پر دکھایا گیا ہے۔ صحافت نگاری کا تقاضا ہے کہ ان بیش بہا دستاویزات پر جامعیت اور تفصیل کے ساتھ الگ الگ بحث کی جائے۔ لیکن آج ترقی کے میدان میں وہ عالمگیر کش مکش ہے کہ نفسی نفسی کی صدائیں ذرا بھی معیوب نہیں۔ ہر قوم اپنے مراحل طے کرنے میں اس درجہ منہمک ہے کہ اُسے رفیق سفر کی غمخواری کی فرصت ہی نہیں اس لئے قارئین کرام معاف فرمائیں کہ اس رسم عام کی اتباع میں ہم صرف مسلمانوں کے اعداد و شمار سے بحث کرنے پر مجبور ہیں۔

حسن اتفاق سے دونوں صوبوں کی روداد تقریباً ایک ساتھ شایع ہوئی ہیں۔ دونوں صوبے ہمسر و ہمسایہ ہیں اور مزاج و طبیعت میں مساوی ہیں اس لیے دونوں کی پنجالہ تعلیمی کوشش اور نتایج پر بالمقابل نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

صوبہ متحدہ میں حکومت نے سررشتہ تعلیمات کی روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہی۔ پنجسالہ گذشتہ میں بمقابلہ پنجسالہ ماسبق کے مسلمان طلبہ کی تعداد میں فی الجملہ اضافہ ہوا اُن کے طلبہ زیر تعلیم کی تعداد۔ لڑکے اور لڑکیوں سمیت۔ تمام غیر مذاہب ہند کے مقابلہ میں ۱۴،۶۹ سے ترقی کرکے، وہ ۱۱ تک پہونچی۔ اور اگر ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کی نسبت قایم کرکے۔ لڑکوں کی ترقی کا اندازہ کریں۔ تو دونوں قوموں میں۔ بالترتیب ۷،۳ اور ۵ کا اضافہ ہوا۔ ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لئے جو نظام عمل مرتب ہوا تھا، اُس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ خاص مسلمانوں کے لئے۔ اسلامیہ مدارس اور مکاتب کی تعداد بڑہائی جائے۔ چنانچہ پنجسالہ گذشتہ میں ۶۵۳ مکاتب اور ۱۷۴ اسلامیہ مدارس زیادہ کئے گئے جن میں بالترتیب بقدر ۲۰،۸۵۰ اور ۷،۰۴ طلبہ کا اضافہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ مسلمانوں کو یہ خاص نظام تعلیم موافق آیا۔ لیکن پرائمری کے باقاعدہ مدارس میں مسلمان طلبہ کی تعداد صرف بقدر ۷،۱۲۸۱ کے بڑھی ...... دراصل جیسی کہ ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم کی رائے ہے۔ اسلامی مدارس و مکاتب میں الحاق و رونق ہونے سے۔ پرائمری سکولوں میں بدرونقی ہوگئی۔ اب یہ مسلمانوں کی ضلع وار کمیٹیوں کا کام ہی کہ بعد غور کامل فیصلہ کریں کہ دونوں میں سے کس قسم کی تعلیم گاہیں قوم کے لئے زیادہ مفید ہونگی۔ اسلامی مدارس و مکاتب یا بورڈ کے باقاعدہ پرائمری اسکول۔" بذاتخود ہمیں سررشتہ تعلیمات سے دیرینہ حسن عقیدت ہے لہذا اس بیان پر اعتماد کلی ہے لیکن مشکل یہ ہی کہ ملک میں ایک جماعت اہل قیاس کی بھی ہے جو خوردہ گیری کے عادی ہیں ؎

نکتہ چیں ہیں غم دل ان کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

یہ اصحاب تفرید و تجزیہ بعض مسلمات کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اگر اُن کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مندرجہ بالا حساب میں ایک اصول کی غلطی ہی۔ یعنی مسلمانوں کا مقابلہ تمام مذاہب ہند سے نہیں ہوسکتا۔ تقابل ہمیشہ دو ہمسر و ہمرتبہ افراد یا اقوام میں ہوسکتا ہے۔

نقشہ متناسبہ ماخوذ از نقشہ نمبر ۵ رودادِ تعلقات صوبہ متحدہ

تفصیل قرون پنجسالہ	اعلیٰ		ثانوی						ابتدائی				میزان	
	کالج		ہائی سکول		مڈل اسکول		اسپیشل		پرائمری		پرائیویٹ			
	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان
پنجسالہ گذشتہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۲۳ء تک	۵۶۵۵	۱۲۴۶	۸۹۷۰	۲۱۷۹	۵۷۰۰۶	۱۰۷۶۱	۱۰۱۹۱	۳۰۴۸	۶۰۳۷۷۰	۱۳۱۴۶۴	۳۰۱۴۳	۲۰۵۷۳	۷۱۵۷۳۵	۱۶۹۲۷۱
پنجسالہ پیوستہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۱۷ء تک	۵۱۳۱	۱۳۱۷	۸۲۶۳	۲۰۸۳	۴۴۱۰۳	۹۹۵۷	۹۴۵۲	۲۰۰۷	۵۲۴۸۵۸	۹۷۲۱۷	۳۹۹۷۳	۳۹۸۱۴	۶۴۳۷۸۰	۱۵۲۴۹۵
بیشی و کمی	۵۲۴ بیشی	۷۱ کمی	۷۰۷ بیشی	۹۶ بیشی	۱۲۹۰۳ بیشی	۸۰۴ بیشی	۸۰۴ بیشی	۱۰۴۱ بیشی	۷۸۹۱۲ بیشی	۳۴۲۴۷ بیشی	۹۸۳۰ کمی	۱۹۲۴۱ کمی	۷۱۹۵۵ بیشی	۱۶۷۷۶ بیشی

خلاصہ نقشہ صوبہ متحدہ

مدارج تعلیم	مسلمان		ہندو	
	سنہ ۱۹۲۲ء	سنہ ۱۹۱۷ء	سنہ ۱۹۲۲ء	سنہ ۱۹۱۷ء
اعلیٰ	۱۲۴۶	۱۳۱۷	۵۶۵۵	۵۱۳۱
ثانوی	۱۵۹۸۸	۱۴۰۴۷	۷۶۱۶۷	۶۱۸۱۸
ابتدائی	۱۵۲۰۳۷	۱۳۷۰۳۱	۶۳۳۹۱۳	۵۶۴۸۳۱
میزان	۱۶۹۲۷۱	۱۵۲۴۹۵	۷۱۵۷۳۵	۶۴۳۷۸۰

مسلمانوں اور ہندوؤں کے سوا ملک بھر میں کسی کو دعویٰ ہمسری نہیں ہے۔ عیسائی مرفوع القلم اور خارج از بحث ہیں۔ پارسیوں کی تعداد تعلیم کے نقشوں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ جینی ہمارے نزدیک ہندوؤں کے ہم عقیدہ اور ان ہی میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ اچھوت ذات کے افراد نے علم کی مکتب میں ابھی قدم رکھا ہے لہذا یہ ابھی تقابل کے میدان میں نہیں آسکتے۔ صوبہ متحدہ میں اب صرف ہندو اور مسلمان باقی رہجاتے ہیں جو نہ صرف تعلیم میں بلکہ حیات منزلی کے اکثر شعبوں میں باہم مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن خدانخواستہ یہ معاندانہ مقابلہ نہیں بلکہ برادرانہ۔ محض رفتار ترقی میں نسبت قایم کرنیکی غرض سے ہے۔ نیز زنانہ مدارس اور طالبات کو مردانہ مدرسوں میں شامل کرنے کا وقت ابھی دور ہے ابھی تعلیم نسواں کا انتظام بھی مکمل نہیں ہوا۔ اور نہ زنانی تعلیم قرآن خوانی محض ابھی عام تعلیم سے جدا ہوئی۔ جب تک نظام مکمل نہ ہوجائیگا تب تک لڑکیوں کی تعداد و شمار تقابل اور تناسب کی غرض کے لئے شامل نہیں کرنی چاہیئے وہ طبقہ ہی دوسرا ہے۔ اس لئے ہم صرف لڑکوں کی تعلیمی اعداد و شمار سے بحث کریں گے۔ ان وجوہ کی بنا پر ۹ر۱۴ یا ۷ر۱۵ کی نسبت ہمارے لئے وجہ تسلی نہیں ہوسکتی سررشتہ تعلیم کے اعداد و شمار میں بوجہ اختلاف ہمیں غلط فہمی ہوتی ہے یعنی صفحہ ۱۲۹ رو داد میں مسلمانوں کی تعداد۔ نقشہ نمبرہ کے مطابق نہیں معلوم ہوتی۔ نقشہ ذیل دیکھئے۔

تاریخ اختتام سنین	حسب جدول مندرجہ متن روداد		حسب نقشہ نمبرہ منسلکہ روداد	
پنجسالہ گذشتہ و پیوستہ	تعداد	فیصدی نسبت	تعداد	فیصدی نسبت
۳۱ر مارچ سنہ ۱۹۱۷ء	۱۱۹۹۷۵	۹ر۱۴	۱۵۲۴۹۵	×
۳۱ر مارچ سنہ ۱۹۲۲ء	۱۵۲۳۴۴	۷ر۱۵	۱۶۹۲۷۱	×

اس میں صرف لڑکوں کی تعداد ہے۔ اگر لڑکیوں کو بھی شامل کیا جائے تو برو سے نقشہ نمبرہ پنجسالہ پیوستہ میں ۱۶۲۴۹۹ گذشتہ میں ۱۶۲۴۹۹ تعداد ہوتی ہے اس کے ساتھ جب ہم پنجاب کی رپورٹ پنجسالہ گذشتہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سررشتہ تعلیم پنجاب

سکے بیان مندرجہ صفحہ ۱۳۰ متن روداد سے حسب ذیل بالمقابل جدول مستخرج ہوتی ہے۔ اور یہ نقشہ نمبر الف منسلک روداد کے امداد و شمار سے بالکل مطابق ہے۔ حساب میں کوئی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔

مدارج تعلیم	مسلمان		ہندو		سکھ	
	سنہ ۱۹۲۲ء	سنہ ۱۹۱۷ء	سنہ ۱۹۲۲ء	سنہ ۱۹۱۷ء	سنہ ۱۹۲۲ء	سنہ ۱۹۱۷ء
اعلیٰ	۱۳۸۹	۱۲۰۸	۳۶۳۴	۳۳۵۳	۸۸۸	۷۰۱
ثانوی	۳۴۶۷۲	۱۶۱۹۸	۴۹۵۱۳	۴۶۶۵۵	۱۸۲۰۴	۷۵۵۲
ابتدائی	۲۰۵۵۸۲	۱۵۲۴۴۳	۱۵۶۹۴۲	۱۲۴۱۵۱	۵۷۲۸۱	۴۵۶۲۹
میزان	۲۴۱۶۴۳	۱۶۹۸۴۹	۲۱۰۰۸۹	۱۷۴۱۵۹	۷۶۳۷۳	۵۳۸۸۲

اس میں صرف لڑکوں کی تعداد ہے لڑکیوں سمیت مسلمانوں کی تعداد پیوستہ میں ۱۹۶۹۲۱ گذشتہ میں ۲۷۸۳۴۰ ہوتی ہے پنجاب میں تین بڑی قومیں۔ میدان تقابل میں گامزن ہیں مسلمان، ہنود، سکھ۔ چنانچہ سررشتہ تعلیم نے تینوں کی رفتار ترقی کو جدول میں بالمقابل دکھایا ہے۔ یہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک پلے میں اور باقی عمرو بکر و زید کو دوسرے میں دھر کر تول دے۔ نقشہ مندرجہ صفحہ سے صوبجات متحدہ میں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کا اندازہ ہوگا ہم نے اسپیشل کو عمداً۔ ثانوی کے ذیل میں اس لئے لیا ہے کہ پرائمری تعلیم کسی نہ کسی درجہ تک حاصل کرنے کے بعد۔ اسپیشل سکول میں داخلہ اور کامیابی ممکن ہے۔ یہی شان مڈل اور انٹرنس کی ہے۔ اس کے خلاف پرائیویٹ میں زیادہ تر مکاتب، ملان مدرسے۔ اور قرآن خوانی کی تعلیم گاہیں یا پاٹ شالے ہیں۔ یہ سب ابتدائی تعلیم کے درسگاہ اور پرائمری کے ذیل میں آتے ہیں۔

ان تمام نقشوں پر سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ۔ صوبہ پنجاب کا جدید دور کم از کم تعلیمات کے حق میں۔ نسبتاً بہت زیادہ مبارک ثابت ہوا حسن سعی کے نتائج کبھی چھپ نہیں سکتے۔ اس کا سب سے موٹا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد تمام مدارس میں گذشتہ پنجسالہ

کے اندر بہ نسبتاً زیادہ تیزی سے بڑھی ابتدائی میں قریباً پوری دوگنی ثانوی میں زاید از دوگنی اور اعلیٰ تعلیم میں تقریباً سوا گنی ہوگئی۔ دوسری طرف صوبہ متحدہ میں ابتدائی و ثانوی میں سے ہر ایک میں ۱۰۹ کا اضافہ مگر اعلیٰ میں تقریباً ۱۲۵ کا تنزل ہوا۔ اگر مجموعی کل طلبہ زیر تعلیم کا حساب لگائیں تو پنجسالہ گذشتہ میں بہ نسبت پیوستہ سے صوبہ متحدہ میں ا سے کچھ زائد اور صوبہ پنجاب میں ۴۲ کی بیشی ہے۔ یہ دونوں قرنوں کی باہمی نسبت ہے جس سے بخوبی معلوم ہوگا کہ پہلے کی نسبت ہماری رفتار ترقی اب کس درجہ پر ہے۔ اہل ہنود سے تقابل نہیں کیا گیا خیر ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ زیادہ واقفیت کس صوبہ کی روداد میں ہے۔ سرکاری دفتروں میں جن اصول پر فیصدی تناسب قایم کئے جاتے ہیں اور اوساط برآمد ہوتے ہیں ہمیں ان میں کچھ مہارت نہیں۔ ع

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

رموز مملکت خویش خسروان دانند

ہم تو سیدھے سادہ واقعات وحقایق اور اعداد وشمار کو اور عامیانہ اسباب و نتایج کو پیش نظر رکھنا چاہتے ہیں۔ صوبہ متحدہ میں جس کی وسعت یورپ کے ایک اوسط درجہ کے ملک کی برابر ہے مسلمانوں کی پانچسال کی تگاپو سے صرف ۱۶۷۷ کی بیشی قابل مبارکباد نہیں۔ مرحلہ آخر یعنی اعلیٰ تعلیم میں مسلمان اس بری طرح گرے ہیں کہ دل پر چوٹ لگتی ہے۔ تقریباً پونے دو سو طلبہ کی کمی ایسی ہے جیسے کسی فیصلہ کن جنگ میں۔ دو سو پختہ کار سپاہیوں کا بغیر لڑے بالکل بیکار ہو جانا اس وقت ۹۳-۱۸۹۲ سے لیکر پنجسالہ گذشتہ تک تمام قرون پنجسالہ کی روداد ہمارے سامنے ہیں ان کے بالاستیعاب مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے اسقدر طلبہ لب بام پہونچکر کبھی نہیں گرے اس میں کچھ شک نہیں کہ ابتدائی سے ثانوی تک اور ثانوی سے اعلیٰ تک پہونچنے میں۔ مسلمانوں کی تعداد بوجہ افلاس و کم استطاعت۔ لاکھوں سے چند ہزار اور اخیر پر چند صد رہ گئی لیکن تنزل اور اس قدر تنزل نہیں ہوا کہ۔ اسقدر طلبہ کم ہوگئے ہوں۔ بلکہ ہر ایک سال گذشتہ۔ اپنے پیوستہ سے کم و بیش ترقی کرتا نظر آتا ہے۔ اگر سوء ادبی نہ سمجھا جائے تو ایک

تعداد کا بیشتر حصہ ترک موالات کی نذر ہوا تاہم ثانوی تعلیم کے مدارج میں بھی فی الجملہ سناٹا ہی ۔ ۱۹۴۱ کا اضافہ محض ابلہ فریبی ہے ۔ دراصل اتنے بڑے صوبے میں انٹرنس میں پانچسال کے آخر پر صرف ۹۶ مسلمان طلبہ بڑھے ہیں! اور صرف ۸۰۴ مڈل میں (تعلیم انگریزی اردو دونوں مدارج میں) یعنی فی ضلع ۲۵ طلبہ کا اضافہ بھی نہیں ہوا ۔ اسپیشل میں اگر اُن کی تعداد برادران وطن سے بڑھ گئی ہی تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں نے اُن کو مات دی بلکہ یہ معنے ہیں کہ باحتیاج زندگی سے از حد مجبور ہو کر یہ ادنی پیشوں پر زیادہ گرے چنانچہ اہل ہنود کی تعداد پیشہ کے مدارج اعلیٰ (ڈاکٹری ۔ انجینری ۔ وکالت وغیرہ) میں ۔ ان سے سات گنی ہی ۔ دیکھو نقشہ ذیل

۳۱ مارچ سنہ ۲۲ء کو طلبہ زیر تعلیم

قوم	قانون	طب	انجینری	معلمی	زراعت	تجارت	جنگلات	میزان	کیفیت
ہنود	۳۵۳	۱۵۵	۳۶۴	۱۸۳	۸۳	۱۰۶	۷۸	۱۳۲۲	۲ جینی ہیں
مسلمان	۹۶	۱۶	۳۱	۳۰	۲۰	۴	۸	۲۰۵	

پرائمری کی مد میں کچھ رونق نظر آتی ہی لیکن یہ بھی محض ایک نظر فریب صورت ہی جیسا کہ حکومت کے تبصرہ سررشتہ تعلیمات کی روداد و نقشوں سے واضح ہوتا ہی ۔ پرائمری میں مسلمان طلبہ زیر تعلیم کی مہیب تعداد کو دیسی مکاتب ۔ ملان مدارس اور قرآنی تعلیمگاہیں خدمت کرتے کرتے اس حد پر لے آئی ہیں کہ پیوستہ کے مقابلہ میں گذشتہ پنجسالہ کے آخیر پر صرف ۷۰۰۴ کی بیشی رہجاتی ہی جو بیشی کہلانیکی مستحق ہی ۔ اگر اس کو ۴۰ اضلاع صوبہ پر تقسیم کیا جائے تو فی ضلع بحساب اوسط ۔ کم از تین صد کی ترقی ہوئی ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اضلاع میں افسروں کی بے توجہی سے ۔ ضلع کمیٹیاں ۔ میونسپل ۔ اسلامی درسگاہوں کی نگرانی اور اشاعت تعلیم کے حقوق سے محروم ہیں جیسا کہ کانفرنس کے گذشتہ اجلاس کے رزولیوشن نمبر سے ظاہر ہے لیکن بیشتر ضلع کمیٹیاں اعراض فرائض سے غافل ہیں ۔ اگر یہ ذرا بھی

حب قومی کے جذبات سے متاثر ہوتیں۔ تو اس پنجاب کے آخیر پر۔ اسلامی درسگاہیں
ضابطہ اور قاعدہ کا جامہ پہنکر معمولی پرائمری سکولوں کی مجلس میں جگہ لے لیتیں۔ اور اُن
کے طلبہ کی تعداد گو اُنکی شمار سے نہ سرشتہ تعلیم تاہم اس حد تک خارج نہ کر سکتے کہ فی ضلع تین
سو کی اوسط بھی نہ پڑے۔ نقشہ پر مکرر نظر ڈالیے۔ اور دیکھئے کہ برادران ہنود پرائمری درجے
اور شعبے میں کس رفتار سے بڑھ رہے ہیں۔ اور پڑھنے میں کس قدر انضباط اور ترتیب ہے
پرائیویٹ مدارس کی ۳۰۴۹ کی کمی کو پرائمری مدارس کی زیادتی میں پورا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ بے
قاعدہ مدارس میں تعلیم دینے سے بچوں کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مڈل میں اُن
کی تعداد مسلمان طلبہ سے پیوستہ پنجاب میں ۲۴ دہ رہ گیا تقریباً ۴½) گئی تھی۔ گزشتہ میں
میں ۲ رہ (زائد از پچگنی) ہو گئی۔ اسی طرح انٹرنس تک ساتھ گنی سے زیادہ تر ہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم
کی تعداد دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جن اثرات سے مسلمانوں نے اس درجہ میں تنزل کیا برادران
ہنود اُن سے کیونکر بچے۔ رائے ناقص میں محض عاقبت اندیشی کی بدولت ان کو بھی سیاسی
اسباب کی بنا پر بہت جوش آیا مگر عقل جوش پر غالب رہی۔ انہوں نے بھی تو بہت جد وجہد
کی مگر حد کے اندر رہکر کی۔ ہم اپنے جوش کو مزاق کی حد تک لے گئے اور حدت اتنا گذر گئے
کہ اب پیچھے پلٹنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ واقعات حقائق اور ان کے اسباب و نتائج۔ تاریخ
آئندہ کے ابواب میں۔ ہمیں صرف اسقدر التماس کرنا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی کلید ہر قفل ہو سکتی
ہے تو وہ تعلیم ہے حریت کا باب الدخل اسی سے کھلتا ہے۔ لیکن رہنمائے مقصود ہر قسم کی رطب
یابس اور ایک نظام خانہ ساز کے ماتحت تعلیم نہیں ہو سکتی بلکہ وہ تعلیم جس پر زمانہ اپنی
مہر قبول لگا دے۔ جسے قبول عامہ کا شرف حاصل ہو جو سکہ رائج الوقت کی طرح مایحتاج
زندگی کے بازار میں بے تکلف رائج ہو ہمیں حیرت ہے کہ ایک قوم جس کی تہذیب اتنی
مکمل۔ تاریخ اتنی شاندار جس کے دل و دماغ میں صدیوں کی پختگی ہو۔ وہ قوم نہ از خود
نہ سمجھانے سے سمجھے کہ تعلیمی ترقی بغیر سیاست سے لیکر حیات ملی و منزلی کے ادنیٰ شعبہ

تک کہیں بھی جرأت نصیب نہیں ہو سکتی۔ صوبہ متحدہ جو قدیم سے مسلمانان ہند کی تہذیب کا گہوارہ ہے آج اس قدر تشنہ کدہ بن گیا ہے کہ اپنے مسلمان تعلیم میں ۲۵ فی صدی بھی ترقی نہیں دکھا سکتے۔

اسلامیہ مدارس ان خاص قسم کے مدارس اور معلموں کی صحیح تعداد پر خود سررشتہ تعلیم کو بھی بھروسہ نہیں۔ روداد پنجاب گذشتہ کے اختتام پر کل ۲۵۰۰ مدرسے اور ۳۲۵۶۴ متعلمین دکھائے گئے ہیں جن میں طلبا اور طالبات دونوں شامل ہیں۔ لیکن بیان ہے کہ سنہ ۲۳ کی تعداد اور آمدنی کا اندازہ نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض بوجہ عدم ادائے رسائل بند ہو گئے ہوں۔ ہم ضمیمہ روداد کے صفحہ ۳۳ الف کے نقشہ خاص سے مستنبط کر کے حسب ذیل نقشہ درج کرتے ہیں۔

مصارف	زنانہ		مردانہ		سنین روداد پنجاب
	طالبات	مدارس	طلبہ	مدارس	
۱۴۳۹۶۵	۲۹۰۵	۲۱۲	۴۷۸۶۰	۲۵۵۶	مارچ سنہ ۱۷ع
۳۵ ۹۶۸	۲۸۷۲	۱۳۶	۳۱۶۲۱	۲۰۸۲	مارچ سنہ ۲۳ع

اس سے تقریباً ہر مد میں تنزل معلوم ہوتا ہے اور جب یہ امر بھی مسلّم ہے کہ مکاتب کے کارپرداز صحیح اعداد بتانے میں مبالغہ یا اخفاء سے کام لیتے ہیں تو یہ رقوم بمشکل ہی قابل اعتماد ہیں۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ قلیل نتائج پر کثیر رقم خرچ ہو رہی ہے جو پیوستہ کے مقابلہ میں تقریباً دگنی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے سررشتہ تعلیم نے بدیں الفاظ ناخوشنودی کا اظہار کیا ہے۔ ڈسٹرکٹ کمیٹیوں سے بڑی امید تھی کہ ترقی تعلیم پر زبردست اثر ڈالیں گی لیکن کچھ مفید نتیجہ نہ نکلا تمام افسران اضلاع باستثنائے معدودے چند ضلع کی مکتب کمیٹی کی سہل انکاری اور بے توجہی کے ویسے ہی شاکی ہیں بلکہ واقعات اور اعداد سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ محض وجود معطل ثابت ہوئیں کمیٹیوں نے اس عرصہ میں جتنی تجاویز پاس کیں ان میں اکثر مسلمان ڈپٹی انسپکٹران کے

اشارہ ہے کیں۔ ممبروں کی جانب سے بہت تو کم ہی بات پیش ہوتی ہوگی۔ یہ سلسلہ کانفرنس
کے انعقادِ جلسہ کا بار وجہ بھی سرکاری افسروں کے ذمہ رہا۔"

ایک پرانی تعلیمی جماعت ہونے کی حیثیت سے کانفرنس کو اس بیان کی صداقت میں کچھ
کلام نہیں ہے لیکن استدراک یہ ہے کہ سررشتہ تعلیم اُس حکومت کے ہاتھ میں ہے جس نے ایک گری
ہوئی قوم کو سرے سے پیدا کر لیا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں پہنچ کر ان میں جو طلاطم
پیدا کیا اور راستہ پر ڈالا۔ پھر اُس کی رفتار میں فی الجملہ تیز قدمی پیدا کی۔ حکومت کی تقریباً
نصف صدی کی صبر آزما کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ اُس قوم کا صرف اعلیٰ اور کسی قدر متوسط
طبقہ تعلیم سے لذت آشنا ہوا۔ ادنیٰ طبقہ میں جس کی تعداد نسبتاً بہت ہی زیادہ ہے۔ سر
پانچ سال کی قلیل مدت میں ایک نموئی حرکت اور دریا کی روانی پیدا ہونا۔ وضع فطرت کے
مطابق نہ ہوگا۔ جیسا کہ روداد میں اثنائے مذکور ہے سرسید علیہ الرحمۃ نے قوم کے خاص تقاضوں کو
سمجھکر۔ اپنا نظام تعلیم الگ قائم کیا تھا۔ لیکن نظام رسم مختص تعلیم ہی کا نام نہیں بلکہ اس
میں اور اعضاء و جوارح بھی شامل ہیں۔ چنانچہ علی گڑھ کالج قائم کرنے کے بعد بہت جلد یعنی قابل
دس برس بعد۔ یہ کانفرنس قائم کرکے صوبہ صوبہ میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ اور مرحوم
نے خود حین حیات میں اور اُن کے بعد قوم کے اکابر نے منفرداً اور مشترکاً۔ حکومت عالی سے
ہمیشہ تقاضا کیا کہ مسلمانوں کے لئے خاص ثانوی اور ابتدائی مدارس قائم کرکے۔ اس نظام
خاص کو مکمل کیا جائے۔ یہ تقاضا بھی چوتھائی صدی تک ہوتا رہا یہانتک کہ گذشتہ پنجسالہ کے
آغاز میں اس نظام خاص کا افتتاح ہوا۔ اور اسلامی درسگاہیں۔ حکومت کے امداد سے
قائم ہونے لگیں۔ جنکی صحیح تعداد کا ہنوز اندازہ نہیں۔ دہرنہ نتائج کا سررشتہ تعلیم ذرا صبر سے کام
لے اور بہتر نتائج کا انتظار کرے ساتھ ہی ساتھ اپنے بعض فیصلوں پر نظر ثانی بھی کرے
مثلاً۔ صاف ظاہر بلکہ مسلمہ ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس بانی تحریک کی قائم کردہ۔ اُن کی پالیسی
پر عامل اور انہی کی تعلیمی وصی ہے لیکن اس خاص نظام تعلیم سے اُسے کبھی کوئی ذمہ دارانہ

تعلق نہ ہوا۔ بلکہ اتنا حق بھی نہ ہوا کہ ضلع کی اسلامی مکتب کمیٹی میں اپنے نمایندے نامزد کرکے
ایک معین نسبت سے داخل کرے کیا یہ ممکن نہیں کہ افسران ضلع اپنی صوابدید اور خوش طبعی
کی بنا پر بعض بلکہ اکثر ممبر ایسے نامزد کریں کہ گو وہ خود کم و بیش تعلیم یافتہ اور ذی اثر و وجاہت ہوں
لیکن قوم کی تعلیم سے کما حقہ دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔ ہمارے اس قیاس میں سررشتہ تعلیم کا یہ بیان
کہ ۴۸ اضلاع میں کل ۴۳ اضلاع کی مکتب کمیٹیاں سرگرم کار رہیں محض ایک نتیجہ ہے جس کے اسباب
افسران ضلع کی سعی اور ان کی تجاویز میں شامل ہیں۔ ۴۳ اضلاع کے افسروں کو مکتب کمیٹیاں بنا
دینے میں غلط فہمی ہوئی ہے اصل میں مقامی زمینداروں کو تعلیم پر توجہ ہے ان کی فرصت کہاں کہ وہ پنچ
علاقہ کے مسلمان اکابر کو کاٹنے میں ان کو فکر نہیں کہ کون تعلیمی مذاق میں پورا اترے لیکن
خاص تعلیمی جماعت کا کام ہے لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ کانفرنس کو اس نظام خاص کے حق و فیصلہ
کا پورا پورا اختیار دے دیا جائے۔ بلکہ ہم محض سررشتہ تعلیم کے زاویہ نگاہ سے۔ ان
نتائج کے حقیقی اسباب دکھاتے ہیں جن پر ایک رقم کثیر خرچ ہوئی۔ اور ایک ذرا سی
غلط فہمی یا غلط فیصلہ کے وجہ سے پورا فائدہ حاصل نہ ہوا۔ ایک اور زبردست سبب عہدہ
معلمین کے نامزدوں انتخاب میں مخفی ہے۔ روداد سے واضح ہوتا ہے کہ تعلیم کے اور برانچ
اور صیغہ جات میں تو مسلمان ملازموں کی تعداد ۳۱ فی صدی ہے لیکن ڈسٹرکٹ بورڈ کے
اسلامیہ مدارس ابتدائی میں انکی تعداد صرف ۱۶ فیصدی ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمان
ٹیچر نہیں ملتے بیشک یہ توجیہ صحیح ہے۔ بی ٹی مسلمان نسبتاً کم ہیں۔ ادنیٰ مدارس معلمی میں بھی یہ
قلیل تعداد میں ہیں لیکن جب تک جالون۔ سہارنپور۔ مظفرنگر وغیرہ کے مرکزی مقامات کے
جدید نارمل سکولوں میں اسلامی مدارس کے لیے ٹیچر تیار رہیں۔ تب تک حکومت اپنے ضابطہ
کو اس اصول پر نرم کر سکتی ہے۔ جس کے بموجب اس نے تعلیمی پالیسی کو مسلمانوں کے حق
میں نرم کیا ہے۔ اگر اس تدبیر سے چلیں تو حکومت کو براہ راست اور بوساطت کانفرنس
قابل تعلیم یافتہ نوجوان مل سکتے ہیں جب یہ تمام نظام ہی خاص مسلمانوں کے تعلیمی کمی کو

پورا کرنیکی غرض سے ہے تو اس کے کسی حصّہ میں مسلمانوں کا جائز اور مصلحت آمیز داخلہ برادران ہنود کو کیسے ناگوار ہو سکتا ہی۔ ہمیں امید ہی کہ جناب ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم ان چند مشوروں پر غور کریں گے صوبہ پنجاب کے متعلق ہم اگلے پرچے میں بحث کرینگے

کانگڑی گروکل

ایک مسلمان کی نظر سے

مقاصد کانگڑی گروکل جو ہردوار سے گنگا پار پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہی آریہ سماج کی ایک مذہبی درس گاہ ہی۔ سوامی دیانند سرستی کے بعد آریوں کی ایک جماعت نے تو اپنے فرقہ کے بچّوں کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم کو صرف اس قدر اصلاح کے ساتھ اختیار کیا کہ خاص اپنے اسکول اور کالج اور بورڈنگ ہوس قائم کئے جائیں جن میں انگریزی کی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو جیسا کہ ڈی۔ اے۔ دی کالج لاہور میں ہی۔ دوسری جماعت نے خالص مذہبی اور ویدک تعلیم کو اپنا نصب العین قرار دیکر یہ گروکل ایک ایسے جنگل میں قائم کیا جو شہروں کی آبادی سے بالکل علیحدہ اور منقطع ہی۔ اس جماعت کا اصلی مقصد وید کی کامل تعلیم ہی۔ تاہم اُن کے نصاب میں وید اور سنسکرت کی تعلیم کے ساتھ ریاضی، انگریزی، سائنس اور علوم جدیدہ رکھے گئے تاکہ اُس کے متعلم ہر شعبہ زندگی سے واقف ہو کر اہل دنیا کی کامل رہنمائی کے قابل بن سکیں مگر باوجود شدت مذہبیت کے سب سے زیادہ نوجوان طلبہ کی جسمانی صحت قایم رکھنے کا انتظام پیش نظر رکھا گیا۔ اِن مقاصد کے ساتھ ۱۹۰۲ء میں یہ گروکل قایم کیا گیا جس کو اب بیس سال کا عرصہ ہو گیا۔ اس گروکل میں چھ سے آٹھ سال تک کی عمر کے بچے لئے جاتے ہیں اور خاص صورتوں میں دس تک بھی لے لئے جاتے ہیں۔ داخلہ ہر وقت

ہیں۔ نیز ہر سال ایک بار سالانہ جلسہ ہوتا ہے کہ تعلیم پذیر ہیں۔ داخلہ کے وقت طلبہ کی جسمانی
صحت کی پوری جانچ کی جاتی ہے اور اس کے بعد ان کے جسمانی نشوونما کی خاص طور پر نگہداشت کی
جاتی ہے۔ جس قوم میں کم عمری کی شادی کا رواج قرنوں سے چلا آتا ہے اس قوم کے بچوں کی
لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اُن کے والدین اقرار کریں کہ پچیس سال کی عمر تک بچوں کی نہ نسبت
کریں گے اور نہ شادی۔ دوران تعلیم میں یہ بچے اس وقت تک جب تک کہ فارغ التحصیل
ہوں جس میں پندرہ سال کے قریب لگتے ہیں تعطیلوں میں بھی بجز خاص صورتوں کے اپنے گھر
نہ جا سکیں گے بلکہ خود والدین انہیں وہاں جا کر دیکھ آئیں گے۔ اس قدر طویل زمانہ تک
تعلیم پانے کے بعد لڑکوں کو کوئی ایسی سند بھی نہیں ملتی جس کو گورنمنٹ تسلیم کرکے بڑے عہدے
دے اور باوجود اُن شرائط اور سختیوں کے جو اوپر مذکور ہوئیں ایک کثیر جماعت نادار طلبا کی
نہیں بلکہ خوش حال طلبا کی جو اپنا خرچ برداشت کرتی ہے وہاں بڑے شوق سے تعلیم حاصل کرتی
جاتی ہے۔

طلبا کی غذا اور لباس اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوش حال طلبا اس گروکل میں کس
قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ننگے سر ننگے پاؤں جسم پر ایک کرتہ صرف سردی کے وقت ایک
گرم بنیان اور ایک زرد رنگی ہوئی دھوتی اُن کی یونیفارم ہے۔ لیٹنے کے لیے لکڑی کے تخت
رہنے کو کچے مکان، فرش، پردے اور پرتکلف فرنیچر ندارد، کھانے کو نہ پان نہ تمباکو نہ چائے
البتہ جسم کے نشوونما کے لئے جسقدر ضروری چیزیں ہیں وہ بافراط موجود۔ عمدہ اور خالص دودھ
اور گھی کے لئے مویشیوں کا مستقل انتظام، کھانے کے لئے اپنی کاشت کی ہوئی ترکاریاں
چھوٹے بچوں کو پندرہ روپیہ ماہوار فیس کے معاوضہ میں ہر قسم کی تعلیم و تربیت، کپڑوں، حجامت
دھلائی، روشنی، کھیل اور نگرانی کے علاوہ چار وقت صحت بخش کھانا، بڑے لڑکوں کے لئے
[illegible] روپیہ میں سب چیزوں کے ساتھ تین بار نہایت [illegible] کھانا۔
[illegible] انگریزی طرز کے بورڈنگ ہوس [illegible] میں [illegible] کے تکلفات میسر آتے ہیں

جس کا جی چاہے طرح طرح کی مٹھائیاں، چاٹ، مصالحہ دار چیزیں خرید خرید کر خوب کھائے، سگریٹ پان، حقہ، چائے ہر چیز کی آزادی ہے مگر لڑکے اچھے دودھ اور کافی مقدار میں صحت بخش کھانے کو ترستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ہر قسم کی آزادی اور ورزشی کھیلوں کے طرح طرح کے عوارض میں مبتلا رہتے ہیں اور بہت سے خرابی صحت سے درمیان میں بیکار ہو جاتے ہیں۔ گروکل میں مٹھائیاں، کیک، چا، حقہ، سگریٹ اگر ضرورت ہو تو تلاش سے دوا کو بھی نہیں مل سکتے۔ مشقت کی یہ حالت ہے کہ چار بجے سے رات کے دس بجے تک لڑکے مختلف مشاغل میں برابر جتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے صحت اور قوت برداشت کی جو حالت ہے وہ لڑکوں کے چہروں اور ماہران فن کی تصدیقوں سے عیاں ہے۔ تمام بچوں کی آنکھ، کان اور عام جسمانی حالت کی معین اوقات پر جانچ ہوتی رہتی ہے، اُن کا وزن درج رجسٹر ہوتا ہے اور اگر کسی قسم کا نقص یا وزن کم معلوم ہوتا ہے تو اُس کی تدبیر کی جاتی ہے۔

اخلاقی تربیت کو عمارات پر ترجیح

دماغی نشوونما کا یہ حال ہے کہ مذہبی اور ویدک تعلیم کے علاوہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ریاضی اور سائنس کے مختلف شعبوں کی تعلیم دیسی زبان یعنی ہندی اور سنسکرت میں دی جاتی ہے۔ طلبہ میں مناظرہ اور تقریر کرنے کا ملکہ خاص طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور استادوں کی نگرانی میں ان میں اعلیٰ کریکٹر پیدا کیا جاتا ہے۔ سادہ زندگی بالعموم افلاس کی مرادف سمجھی جاتی ہے اور افلاس مرادف ہے غلاظت اور گندگی کا۔ مگر سادگی کے ساتھ پاکیزگی اور ستھراپن اگر دیکھنا ہو تو کانگڑی گروکل میں دیکھو وہاں کی سادہ زندگی جو تمام محرکات اور منشیات اور تکلفات سے پاک ہے بچوں میں اعلیٰ درجہ کا ضبط نفس پیدا کرتی ہے۔ ہندوستان کے اکثر چوٹی کے کالج اپنی سر بفلک عمارتوں، شاندار بورڈنگ ہوسوں، بڑے بڑے تنخواہ دار پروفیسروں پر فخر کر سکتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ کارپردازان گروکل یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی توجہ اور روپیہ کو براہ راست طلبہ کی دماغی اور جسمانی نشوونما میں لگانا اور اُن میں عمدہ عادات پیدا کر دینے میں صرف کرنا عظیم الشان

عمارات بنانے سے کہیں زیادہ مفید ہے۔

گروکل کی عام حالت عرض کرنے کے بعد میں اُس کے سالانہ جلسہ کے کچھ حالات درج کرتا ہوں جو ہولی کی تعطیل میں ہوتا ہے۔

مہمانوں کے لئے قیام کا انتظام

مسلمانوں کے قومی جلسوں کے منعقد کرنے میں جو مصیبتیں پیش آتی ہیں اُن کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ شادیوں میں ہندو، مسلمان دونوں کو یکساں اہتمام کرنا پڑتا ہے اور یکساں زیر باری اور اسراف کا سامنا ہوتا ہے اور تب بھی مہمانوں کو شکر گذار کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی۔ یہی حالت مسلمانوں کے قومی جلسوں کی ہے کہ ان میں اعیان جلسہ شادیوں کے جملہ ارکان ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پر تکلف کھانا، سواری، مکان، فرنیچر، سب ہی چیزوں کا انتظام کرتے ہیں مگر اصلی معنوں میں جلسے کامیاب نہیں ہوتے اس بارے میں ہندوؤں نے اپنے قومی جلسوں کو شادیوں کے جلسوں سے بالکل ممیز کرکے اپنی قوم کے لئے کامیابی کا راستہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ کانگڑی گروکل کے وسیع میدان میں گرد و پیش کے جنگل سے پولے کٹوا کر پھونس کی لمبی لمبی بارکیں بنا دی جاتی ہیں جن میں پانچ چھ ہزار آدمی آسانی سے سما سکتے ہیں اور امیر و غریب، اعلیٰ و ادنیٰ سب زمین پر بستر بچھا کر یکرنگی کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے مختلف طبقوں میں مساوات کا بجا طور پر فخر تھا مگر یوروپین تمدن نے جب سے مسلمانوں میں کچھ لوگوں کو کرسی نشین اور کموڈ نشین کر دیا ہے تب سے اعیان جلسہ مجبور ہوتے ہیں کہ وہ مختلف حیثیتوں کے مہمانوں کے لئے مختلف انتظام کریں۔ چنانچہ مسلمانوں کے حال کے ایک جلسہ میں سب سے بڑی مصیبت کموڈوں کی فراہمی کی تھی جو بزرگان قوم کے لئے بڑے کرایہ پر دور سے لائے گئے تھے۔ ہندو باوجود دولت میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں اپنی خوش نصیبی سے اس قسم کے تکلفات سے بالاتر ہوتے جاتے ہیں۔ گروکل میں پھونس کی بارکوں کے قریب دو بازار لگائے گئے تھے ایک قومی کتابوں کی دوکانوں کا، دوسرا کھانے کی دوکانوں کا، مہمان اپنی پسند کی چیزیں خریدیں اور کھائیں خواہ جنس خرید کر خود پکائیں۔ مگر ان بازاروں میں لطف

یہ تھا کہ کھانا اور رکابیوں کے سوا تیسری چیز کسی صورت میں نہ ملسکتی تھی۔ میرا ملازم دور دور تک سگریٹ یا تماکو کا متلاشی رہا مگر یہ چیزیں اوسے دستیاب نہیں ہوئیں۔ تعجب ہی کہ پانچ چھ ہزار آدمیوں کے مجمع کے لئے پان یا چار کی ایک دوکان بھی نہ تھی۔ اسٹیشن سے گرکل تک جو پانچ میل کا کچا راستہ ہی اوس کے لئے سواری کا یہ انتظام تھا کہ بیلوں کے تانگے کثرت سے مہیا کردئے گئے تھے اور ان کا کرایہ دو روپیہ معین تھا۔ واقف اور نا واقف سب سے یہی لیا جاتا تھا۔ البتہ پانی کا انتظام گرکل کی طرف سے خاص طور پر تھا علاوہ متعدد کنوؤں کے جو ہر وقت جاری رہتے تھے پانی کی گاڑیاں تمام بازاروں میں پانی تسیم کرتی پھرتی تھیں۔ بہرحال میں نے یہ اندازہ کیا ہی کہ مسلمانوں کے بعض قومی جلسوں میں گھوڑوں کے دانہ گھاس اور موٹر کے تیل میں جو صرف ہوجاتا ہی وہ کانگڑی گرکل نے اپنے پانچہزار مہمانوں کے لئے نہ صرف کیا ہوگا اور فرق یہ ہی کہ ہمارے جلسوں میں پچاس فی صدی اصحاب انتظامات جلسہ کے شاکی ہوتے ہیں اور ان کے ہاں سب ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ میزبان اس سے خوش کہ انھیں بدحواس نہیں ہونا پڑتا اور تمام تر قوت خاص جلسہ کو کامیاب بنانے میں صرف کرسکتے ہیں اور مہمان اس سے خوش کہ وہ آزاد ہوتے ہیں جو جی میں آتا ہی خرید کر کھاتے ہیں کسی کے زیر بار احسان نہیں ہوتے اور خوش دلی کے ساتھ جو کچھ چندہ میں دیکر آتے ہیں اوس سے سرور اور روحانی خوشی حاصل کرتے ہیں۔

سادگی اور تکلفات کا مقابلہ۔ جب میں گرکل کے جلسہ میں مقیم تھا ایک خاص بات محسوس کرتا تھا وہ یہ کہ جس قسم کے تیر بیچے ہمارے قومی جلسوں میں ہوتے ہیں اُن کا وہاں نام ونشان نہ تھا۔

وہاں چار بجے صبح سے یہ دیکھا کہ بھجن کرنے والوں کی ٹولیاں بازاروں میں سوتوں کو جگانے والے گیت گاتی پھرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اٹھو اشنان کرو سندھیا کرو لوگ بکثرت اُٹھتے ہیں پہاڑی ہوا کی سردی میں جنگل جاتے ہیں اور گنگا کے ٹھنڈے پانی میں اشنان کرتے ہیں

اُس کے بعد تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سب اپنے طریقہ کی عبادت کرتے ہیں۔ ایک طرف یہ سلسلہ ختم ہو رہا ہے اور دوسری طرف علی الصباح پنڈال بھرتا جاتا ہے اور پھر بیٹھنے کو جگہ باقی نہیں رہتی۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ ہماری قوم کے تعلیم یافتہ اصحاب ضروریات سے فارغ ہونا تو درکنار ابھی چاء اور حقہ سے بھی فارغ نہیں ہو پاتے جن کے پئے بغیر آنتوں کی خشکی کی وجہ سے جو منشیات کے استعمال سے ہو جاتی ہے جائے ضرور جانے میں کامیابی نہیں ہوتی۔ ہندوؤں میں چونکہ اب تک جدید تہذیب کا اثر صرف دماغوں تک محدود ہے اور زبان تک نہیں پہونچا جس کی وجہ سے اُن کے کھانے کے اوقات محدود ہیں اور کھانا بھی وہ لوگ اپنے اپنے قیام گاہ پر کھاتے ہوں گے اس لئے ان چیزوں کا وہاں کچھ چرچا بھی نہ معلوم ہوتا تھا۔ برخلاف ہمارے جلسوں کے وہاں مفت کے مرغن کھانوں پر نہ ہیچ ہوتا تھا نہ پارٹیوں میں مٹھائیاں لٹتی تھیں نہ کوئی ایسا سین نظر آتا تھا کہ اچھے اچھے معقول آدمی ایک ایک خانساماں کی خوشامد ایک چاء کی پیالی، ایک لمنیڈ کی بوتل کے لئے یہ کہہ کہہ کر کر رہے ہیں کہ بھائی یہ ہماری چاء (یا نشہ) کا وقت ہے اور اگر نہیں ملتی تو حسب ضرورت لڑنے مرنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ سے سنتے چلے آتے تھے کہ بچوں کو خوب کھلاؤ پلاؤ تاکہ وہ ندیدے نہ ہوں مگر تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ بچپن سے سادہ کھانے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کا ذائقہ نشو ونما نہیں پاتا اُنہیں خوش ذائقہ چیزوں سے رغبت بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ زیادہ ندیدے وہی لوگ ہوتے ہیں جو دن رات عمدہ سے عمدہ کھانے اور احباب کو کھلاتے ہیں، چنانچہ دعوتوں اور پارٹیوں میں بھی اصحاب بالکل بے قابو اور آپے سے باہر ہوتے ہیں۔

بعض مقامات میں مسلمانوں کی پارٹیوں کے جلسوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ بھلے آدمی ان میں جاتے ہوئے شرماتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں کی شرکت کے معنی یہ ہیں کہ اتنا کہا کہ اوجیبیں بھر کر آ رہے ہیں کہ دو وقت اپنے داموں سے کھانے کی ضرورت نہ ہوگی بہرحال ضبط نفس اور تحمل اور قوت برداشت جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کی خصوصیات

تھیں اب وہ ہمارے برادران وطن کا حصہ ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ انہوں نے مذہبی اعتبار سے تمام ملک کو فتح کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ انھیں درس گاہوں کے تعلیم یافتہ اصحاب جو سادہ سے سادہ کھانے اور کم سے کم کپڑا پہننے کے عادی بنائے جاتے ہیں زمین پر لیٹ کر اور چنے چبا کر گاؤں در گاؤں اپنے مذہب کی اشاعت کرتے اور کر سکتے ہیں اور اپنا اخلاقی اثر ڈال کر ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل کر سکتے ہیں۔

خوش حال کیوں سادہ رہیں۔

ایک صورت تو وہ ہے کہ کسی شخص کو افلاس اور تنگدستی کی وجہ سے کھانے اور پہننے کو نہ ملے اور ایک وہ صورت ہے کہ خدا کے فضل سے گھر میں سب کچھ ہو مگر افراد قوم کی اخلاقی حالت بلند کرنے کے لئے اپنے کو تکالیف برداشت کرنے اور کم سے کم صرف کرنے کا عادی بنایا جائے مگر اس تنزل کے زمانہ میں ہماری قوم کی حالت یہ ہے کہ تنگدستی میں تمام تکلفات نہ صرف موجود ہیں بلکہ روز مرہ بڑھتے جاتے ہیں، یعنی قدیم زمانے کے تکلفات پر جدید تہذیب کے تکلفات کا بھی اضافہ ہو گیا ہے اور ہندوؤں میں جس نسبت سے دولت بڑھ رہی ہے اسی نسبت سے سادگی کی طرف قدم بڑھتا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب خدا نے دیا ہے تو اس کو خرچ کیوں نہ کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بالعموم اپنے پاس ہے ہی نہیں اور اگر خدا نے کچھ دے رکھا ہے تو اپنی اولاد اپنے اعزہ و اقربا، اپنے غریب اہل ملک کا حق ہے۔

یہ مسلم امر ہے کہ چماروں میں سے اگر ایک شخص ڈپٹی کلکٹر ہو جائے تو اس کی ڈپٹی کلکٹری اس کی ذات کو بھی معزز نہیں بنا سکتی جب تک کہ اس کی برادری کے لوگ بھی ذی حیثیت نہ ہوں۔ اسی طرح مسلمانوں میں ۵ فی صدی سے زیادہ خواندہ نہیں اور خواندہ لوگوں میں چوتھائی بھی اس قابل نہ ہونگے جو اپنی زندگی عزت سے بسر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح زیادہ سے زیادہ ایک فیصدی کو خوش حال اور فارغ البال سمجھ سکتے ہیں، باقی ماندہ ننانوے فی صدی تمدن میں اسقدر پست ہیں کہ ترقی یافتہ قومیں انھیں انسانوں میں ہی شمار نہیں کر سکتیں۔

پس جب تک کہ باقی ماندہ ننانوے فیصدی کی تمدنی سطح بلند نہ ہو ایک فیصدی اشخاص خواہ کیسی ہی اعلیٰ زندگی کیوں نہ بسر کرتے ہوں ہرگز ہرگز معزز نہیں ہو سکتے۔ انھیں اپنی آیندہ نسلوں کو معزز بنانے کیلئے ضرورت ہے کہ وہ غربا کا تمدن اختیار کرکے ادنیٰ طبقہ کو یکسانیت کے ساتھ بلند کرتے چلے جائیں اور یہی ہمارے برادران وطن بالعموم کر رہے ہیں۔

مسلمانوں میں عربی مدارس کا طبقہ ایسا ہے جس کے طلبہ سادہ اور سخت زندگی بسر کرتے ہیں مگر وقت یہ ہے کہ وہ اختیاری نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے گرد و پیش جو کچھ ہوتا ہے اس سے اُن کا نصب العین "سادگی" نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے استادوں میں اور مذہبی پیشواؤں میں سے جو خوش حال ہیں وہ بھی مثل دوسرے دنیاداروں کے عمدہ مکانات میں رہتے، اچھا پہننے اور لذیذ کھانے اور حلوے اور چاء اور پان کھاتے ہیں اس لیے شاگردوں کا بھی نصب العین یہی ہوتا ہے کہ جب اُن کا کام چل جائیگا تب وہ بھی اسی طرح گل چھرے اڑائیں گے۔ نہ کہ ہندو دولتمند اور تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح سنیاسی اور سادھو بنکر شودروں اور نومسلموں میں اپنے مذہب کی اشاعت کریں گے۔

بہرحال ہمیں اپنے برادران وطن کی اُن طریقوں کو جو وہ اپنی قوم کے ابھارنے اور اس کی تعداد بڑھانے کے لئے اختیار کر رہے ہیں نہ صرف مخاصمانہ بلکہ متعلمانہ نظر سے بغور دیکھنے اور اس سے سبق حاصل کرنیکی ضرورت ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ جن اقوام کی نسبت آجکل یہ خیال ہے کہ وہ نہ پورے ہندو ہیں نہ مسلمان اور دونوں قومیں انھیں اپنی اپنی طرف کھینچ رہی ہیں وہ اگر ہندوؤں کے زیر اثر ہو گئے تو کیا وہ اُن سے کیا سیکھیں گے اور ہمارے زیر اثر ہو گئے تو وہ ہم سے کیا سیکھیں گے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اُن لوگوں سے جو اب گروکلوں میں سے ہو کر نکلے ہیں دیہات کے لوگ سادگی، کفایت شعاری، ایثار، اور ضبط نفس سیکھیں گے اور ہم سے وہ لوگ [illegible] چھچھورپن، چاء نوشی، [illegible] نوشی، اسراف اور عیش پرستی سیکھیں گے جن کے ہم عادی ہیں۔ اب ہم خود ہی انصاف کریں کہ ہم کو اصلاح معاشرت کسقدر ضرورت ہے۔

طفیل احمد

فرائض والدین

پیارے ناظرین! میں آپ کو ایک نہایت اہم امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں لہذا آپ اس تحریر کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایسا امر ہے کہ جس پر آپ کے بچوں کی بہبودی آپ کے ملک کی ترقی اور خود آپ کی خوش نصیبی منحصر اولاد کو اس قابل بنا دینا کہ وہ زندگی خوشی اور نیکنامی کے ساتھ بسر کر سکے نہایت ضروری اور والدین کا اعلیٰ ترین فرض ہے۔ اس فرض کو حیوانی والدین تو بخوبی ادا کر رہے ہیں لیکن افسوس ہم انسانی والدین اس نہایت اہم فرض سے غافل ہیں۔ حیوانی زندگی میں جو باتیں ضروری ہیں وہ حیوانات اپنے بچوں کو سکھا دیتے ہیں مثلاً چڑیا اور مینا وغیرہ اپنے بچوں کو اڑنا۔ دانا تلاش کرنا۔ چگنا۔ دوست دشمن کو پہچاننا وغیرہ باتیں جو پرندوں کی زندگی میں ضروری ہیں وہ سب سکھا دیتے ہیں گویا وہ اپنی اولاد کو زندگی کے لئے تیار کر دیتے ہیں۔ اب ذرا ہم انسانی والدین کی طرف غور کیجیے۔ انسانی زندگی میں پانچ باتیں ضروری ہیں۔ (۱) تندرستی (۲) نیک چلنی (۳) مذہب (۴) علم ولیاقت (۵) روزگار یعنی روپیہ پیدا کرنا جس طرح حیوان اپنے بچوں کو حیوانی زندگی کے لئے تیار کر دیتے ہیں اسی طرح ہم والدین کو اپنے بچوں کو انسانی زندگی کے لیے تیار کر دینا چاہیئے لیکن ہم لوگوں میں کتنے فی صدی ایسے والدین ہیں جو اپنے اس نہایت اہم فرض کو پورا کرتے ہیں۔ ایک فیصدی بھی نہیں۔ یہ کتنے رنج کی بات ہے کہ حیوانات اپنے فرض کو ادا کریں اور ہم انسان ہو کر اور اشرف المخلوقات کہلاتے ہوئے اس سے غفلت کریں۔ ایسا کرنا نہایت نامناسب ہے لہذا والدین کو اس طرف فوراً توجہ کرنی چاہیئے۔

پیارے ناظرین اب تک جو کچھ ہوا وہ گیا گذرا آیندہ کے لیے ہم کو خبردار ہو جانا چاہیئے اور اس اہم فرض کو ضرور ادا کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے دین اور دنیا دونوں میں بھلا ہوگا اور اس کے خلاف کرنے کا نتیجہ بہت برا ہوگا اور غور سے دیکھا جاوے تو اس

بُرے نتیجے کو ہم میں سے بہت زیادہ والدین بھگت رہے ہیں۔ غور کیجئے اولاد ہونے کا ایک منشا یہ بھی ہے کہ والدین کو اولاد سے سکھ ملے لیکن سوچکر بتایئے کہ ہم لوگوں میں کتنے والدین ہیں کہ جن کو اولاد کا سکھ مل رہا ہے۔ ایک فیصدی بھی نہیں۔ کیا وجہ۔ وجہ وہی جو اوپر بیان کی گئی یعنی والدین اولاد کے متعلق اپنا فرض ادا نہیں کرتے۔ ایسا دیکھتے ہوئے اگر ہم والدین کی آنکھیں نہ کھلیں تو صرف افسوس ہی نہیں بلکہ ہمارے لئے شرم کی بات ہے اس لئے پیارے ناظرین اب زیادہ غفلت نہیں کرنی چاہیئے اور فوراً آمادہ ہو کر اس نہایت اہم فرض کو ادا کرنا چاہیئے۔ میں آپ کو ایسا کرنے کے لئے صرف مشورہ ہی نہیں دیتا بلکہ راستہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں جس پر چلنے سے آپ اپنا فرض ادا کر سکیں گے۔ لیکن اس کے پہلے میں آپ کو چند باتیں جو ضروری ہیں بتاؤں گا (۱) ہم اور آپ سب کے طریق زندگی اور عادات وخیالات ایسے ہو گئے ہیں کہ اس میں تبدیلی کرنا کٹھن معلوم ہوگا یعنی جو راستہ میں آپ کو بتاؤں گا وہ اگرچہ بہت آسان ہے لیکن چونکہ آپ کو اپنے موجودہ طریق زندگی میں کسیقدر تبدیلی کرنا پڑیگی اس لئے آپ کو وہ کٹھن معلوم ہوگا مگر بہت جلد آپ اس کو آسان سمجھنے لگیں گے اور اس سے جو فائدے آپ کو اور آپ کی اولاد کو حاصل ہوں گے اُن کو محسوس کر کے آپ رفتہ رفتہ اُس پر بہت شوق سے چلنے لگیں گے (۲) دوسری بات یہ ہے کہ آپ مصمم ارادہ کریں کہ آپ بحیثیت والدین اپنا فرض ضرور ادا کریں گے خواہ کچھ ہی ہو۔ یاد رکھیے قوت ارادی بہت زبردست طاقت ہے اور جس وقت آپ مصمم ارادہ کریں گے تو آپ ضرور کامیاب ہونگے یاد رکھئے پرمیشور اُن لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو سچے دل سے کوشش کرتے ہیں۔

پیارے ناظرین یہ دیکھکر مجھے بڑا رنج ہوتا ہے کہ جو سکھ انسانی زندگی میں ہم لوگوں کو ملنا چاہیئے وہ فی زمانہ ہم کو نصیب نہیں ہے بلکہ دن بدن دکھ بڑھتے جاتے ہیں۔ میں آپ سے اپنے ذاتی تجربہ کی بات کہتا ہوں آج سے پچپن سال پہلے جس وقت کا مجھکو ہوش ہے دکیونکہ اب مجھے باسٹھواں برس ہے) بدرجہا بہتر زمانہ تھا صرف اس تھوڑے عرصہ میں بہت بڑا فرق

ہو گیا ہی۔ اُس وقت کے لوگوں (ہندو مسلمان دونوں) میں بہت زیادہ ایمانداری اتفاق ہمدردی اور دیگر عمدہ باتیں تھیں مجھے اچھی طرح یاد ہی کہ ہم ہندوؤں کے لڑکے مسلمان بزرگوں کا جو ہمارے محلہ میں رہتے تھے ایسا ادب کرتے تھے کہ جیسا ہندو بزرگوں کا ہندو مسلمانوں کے تہواروں (رام لیلا محرم وغیرہ) میں دونوں فریق بڑی خوشی سے شریک ہوا کرتے تھے اُس وقت اناج گھی دودھ وغیرہ بہت سستے تھے لوگ زیادہ تندرست قوی اور قدآور ہوتے تھے اور بڑی عمر کے آدمی (ستر۔ اسّی۔ نوّے) بہت زیادہ نظر آتے تھے بیمار بہت کم تھیں لوگ اسقدر فضول خرچ نہیں تھے وغیرہ وغیرہ یہ حال صرف پچپن سال پہلے کا تھا اس تھوڑے عرصہ میں بہت تبدیلی ہو گئی اور آیندہ کے لئے اندیشہ ہی کہ اگر یہی رفتار رہی تو ہندوستانی قوم جس میں ہندو مسلمان دونوں سب سے زیادہ تعداد میں ہیں ان کی حالت نہایت افسوسناک ہو جاویگی۔ اس لحاظ سے بھی اولاد کی تعلیم و تربیت پر توجہ کرنا نہایت ضروری ہی پیارے ناظرین اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ذاتی لحاظ سے قومی لحاظ سے ملکی لحاظ سے دینی لحاظ سے اور دنیوی لحاظ سے ہر طرح ضروری ہی کہ آپ اپنے والدینی فرض کو ادا کریں اور خدا کے سامنے آپ اور آپ کی بیوی دونوں وعدہ کرلیں کہ اس نہایت اہم فرض کو آپ ضرور ادا کریں گے اور اُس کو بغیر پورا کئے چین نہ لیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ اپنے والدینی فرض کو ادا کرنے کے فائدے محسوس کرنے لگیں گا اور آپ اور آپکی اولاد کو بھی خوشی حاصل ہونے لگیگی اور آپکے دنیا اور عقبیٰ دونوں کا سکھ حاصل ہوگا۔

پیارے ناظرین اس تحریر کو آپ مکرر سکرر ملاحظہ فرمائیں اور اسپر غور کریں اور ایک ہفتہ کے اندر مصمم ارادہ کرلیں کہ آپ اپنا والدینی فرض ضرور ادا کریں گے۔ ایک ہفتہ بعد میں یہ تصوّر کرکے کہ آپ پورے طور سے تیار ہیں آپکو وہ طریقہ بتاؤنگا کہ جس سے آپکے لڑکے اور لڑکیاں جو اس وقت بچّے ہیں رفتہ رفتہ انسانی زندگی خوشی اور نیکنامی کے ساتھ بسر کرنیکے قابل ہوجاویں گی زیادہ بندگی۔ فقط

آپ کا خیر خواہ۔ رام نراین ٹنڈن براد رزا آگرہ شہر

شذرات

موجودہ زمانہ کی ایک عام روش یہ ہی کہ اکثر لوگ جو کسی قومی اور ملکی خدمت میں معروف ہیں اپنے معمولی کاموں کو بھی نہایت آب و تاب سے پبلک کے سامنے پیش کرتے اور حتی الامکان یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ قوم اور ملک کی نہایت مفید خدمت انجام دے رہے ہیں، بلکہ بعض جاہ طلب تو شہرت کے لئے ناجائز وسائل اختیار کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے، لیکن باایں ہمہ زمانہ ابھی ایسے بزرگوں سے خالی نہیں جو خالصاً لوجہ اللہ کام کرتے ہیں اُن کو نہ کسی صلہ کی تمنا ہوتی ہی نہ ستائش کی پروا۔

منجملہ انھیں مخلص بزرگوں کے ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی ہیں جو اپنے فضل و کمال اور محاسن صوری و معنوی کے لحاظ سے ملک میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں، اور بالفعل حیدرآباد میں ایک ایسے معزز مذہبی منصب پر مامور ہیں جو اپنے فرائض و اختیارات اور اعزاز و وقار کے لحاظ سے گویا شیخ الاسلام کے عہدے کے ہم پایہ ہی۔ یعنی جناب ممدوح دولت آصفیہ کے صدر الصدور امور مذہبی ہیں اور تمام ممالک محروسہ سرکار نظام کے مذہبی امور کا تعلق آپ کی ذات گرامی سے ہی۔

مولانا ممدوح آغاز شباب سے ایک خاص ذوق اور ولولہ دینی خدمت کا رکھتے ہیں اس لئے یہ حیدرآباد کی خوش قسمتی ہی کہ اس کو ایک ایسا فاضل اس منصب کے لئے ملا جو فطرتاً اس خدمت کا ذوق رکھتا ہی اور اپنے عہدہ کے فرائض کو ایک مذہبی فرض کی حیثیت سے انجام دیتا ہی، مولانا ممدوح نے اپنے عہدہ صدر الصدوری میں باوجود گوناگوں مشکلات اور موانع کے جو مفید خدمات انجام دی ہیں اور آپ کے زمانہ میں جن اصلاحات کا آغاز ہوا ہی حیدرآباد کے باہر بجز خاص خاص اصحاب کے غالباً کسی کو اس کا علم نہیں اور خود مولانا ممدوح کی یہ حالت ہی کہ وہ کبھی ان امور کا تذکرہ پسند نہیں کرتے، ہم کو یاد نہیں کہ کسی صحبت میں مولانا نے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا

ہو، جس سے ضمناً بھی اپنی ستائش یا کارگزاری کا پہلو نکلتا ہو۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ مولانا کی یہ خاموش خدمات اعلیٰ حضرت خسرو معظم فرمانروائے دکن کی دقیقہ شناس نگاہ سے مخفی نہ رہ سکیں چنانچہ اوائل ماہ فروری میں اعلیٰ حضرت نے ازراہ قدرشناسی و علم پروری مولانا ممدوح کو **نواب صدر یار جنگ بہادر** کا خطاب مرحمت فرمایا، یہ خطاب ایسے اسلامی فرمانروا کا عطیہ ہے، جو ہندوستان میں ہمارے کارروان رفتہ کی یادگار اور ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ عزوجل مولانا کو اور زیادہ حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ایک اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی خدمت کی سعادت اُن کو تادیر حاصل رہے، آمین،

موجودہ زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کا علمی انحطاط مُسلّم اور قحط الرجال کی عام شکایت ہے اگر ہماری قوم میں کوئی صاحب فضل و کمال پیدا ہوتا ہے تو اُس کا وجود غنیمت معلوم ہوتا ہے اور جب وہ اُٹھ جاتا ہے تو اُس کا قائم مقام نظر نہیں آتا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل کمال یکے بعد دیگرے اُٹھتے چلے جاتے ہیں اور اُن کی مسندیں خالی پڑی ہیں، گذشتہ زمانہ میں عرب کے ایک شاعر نے اپنی قوم کی مدح و ستائش کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ

جب ہماری قوم کا کوئی سردار مرجاتا ہے تو فوراً دوسرا اُسکی جگہ کھڑا ہوجاتا ہے
جو وہی باتیں کہتا ہے جو پہلا سردار کہتا تھا اور وہی کام کرتا ہے جو وہ کرتا تھا

لیکن آہ! آج یہ حالت ہے کہ ہماری قوم کے بہت سے سردار اُٹھ گئے اور اُن کی جگہ کوئی کھڑا نہیں ہوا، **سرسید، محسن الملک، وقار الملک، شبلی اور حالی** ہم سے رخصت ہوگئے مگر اُنھوں نے اپنا صحیح قائم مقام نہیں چھوڑا،

گذشتہ مہینہ میں بھی قوم کا ایک یگانہ روزگار فاضل اُٹھ گیا، جو اپنے فضل و کمال، عادات و اطوار اور خصوصیات کے لحاظ سے علمائے سلف کا نمونہ تھا، ہماری مراد مولانا حکیم

سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم ناظم ندوۃ العلماء سے ہی جنہوں نے فروری کے پہلے ہفتہ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی مولانا مرحوم سادات رائے بریلی کے ایک معزز خاندان سے تھے، جو اپنی فضیلت علمی کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہی آخری دور میں اس خاندان کے ایک محترم بزرگ حضرت مولانا سید احمد صاحب شہید تھے، جو مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی کے پیر تھے، اور تاریخ ہند میں ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔

مولانا مرحوم نے علم کی آغوش میں آنکھ کھولی، اور آخر ایام تک اپنی زندگی کا تمام زمانہ علمی خدمت میں نہایت ذوق و انہماک کے ساتھ بسر کر دیا، آپ مشرقی اور مذہبی علوم کے ایک زبردست فاضل تھے، اور تاریخ اسلام خصوصاً تاریخ ہند کے متعلق آپ کی واقفیت اور آپ کا تبحر حیرت انگیز تھا،

مولانا مرحوم نے علامہ **شبلی** رح کی تحریک سے ہندوستان کی ایک علمی تاریخ لکھی تھی جس کو مرحوم نے اپنی زندگی میں مکمل کر لیا تھا لیکن طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی مولانا نے کامل ۲۲ برس کی مسلسل محنت اور شبانہ روز کی مصروفیت کے بعد اس کتاب کو ختم کیا ہی جس میں ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد کے تمام علما و فضلا کے حالات مفصل طور پر لکھے ہیں اور اُن کی تصنیفات اور علمی خدمات کا وضاحت سے تذکرہ کیا ہی، فاضل مصنف نے اس کتاب میں تحقیق و تلاش کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہی، آپنے اس کتاب کے لئے ہندوستان کے تمام کتب خانے چھان ڈالے اور بہت سے پرائیویٹ کتب خانوں سے بھی فائدہ اُٹھایا، اور ہزاروں کتابیں لفظاً لفظاً مطالعہ کیں جب یہ گنج گرانمایہ وجود میں آیا، اس کتاب پر ممدوح نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہی جو بجائے خود ایک مستقل کتاب ہی، اس میں ہندوستان کے اسلامی عہد کے متعلق کوئی چیز نہیں چھوڑی ہی، اور جو کچھ لکھا ہی ایسی کاوش اور تحقیق سے لکھا ہی کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہی، پوری کتاب دس جلدوں میں تمام ہوئی ہی ہم کو خوش قسمتی سے اس کتاب کی دو جلدوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہی۔

عربی زبان میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بجز مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان وغیرہ کی اور کوئی کتاب نہیں ہے لیکن آزاد مرحوم کی کتابیں بجائے تاریخی حیثیت کے زیادہ تر ادبی و نیم مذہبی حیثیت رکھتی ہیں، اس بنا پر مولانا سید عبد الحی صاحب مرحوم نے یہ کتاب عربی زبان میں لکھی ہے، عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے، مولانا کو عربی زبان پر اسقدر قدرت حاصل تھی کہ ہم نے بارہا دیکھا کہ آپ بے تکلف اور قلم برداشتہ عربی لکھا کرتے تھے، اگر یہ کتاب طبع ہو گئی تو عربی زبان میں ایک جدید اضافہ ہوگا جس سے اُس کا دامن اب تک خالی ہے، اور امید ہے کہ ہندوستان سے زیادہ یہ کتاب مصر، شام، اور عربی بولنے والے ممالک میں ہاتھوں ہاتھ لیجائیگی یاد ایام جو اردو زبان میں گجرات کی ایک دلچسپ علمی تاریخ ہے اور جسکو مولانا نے کانفرنس کیلئے لکھا تھا، درحقیقت اسی معرکۃ الآرا کتاب کا ایک باب اور اسی دریا کا ایک قطرہ ہے،

علاوہ تصنیفی خدمات کے کم و بیش ۲۰ سال تک آپ نے مختلف حیثیت سے ندوۃ العلماء کی قیمتی خدمات انجام دیں چنانچہ آخر زمانہ میں بحیثیت ناظم (سکریٹری) ندوۃ العلما کام کیا، اس بڑی مدت میں آپکی مساعی جمیلہ سے ندوہ کو جو فائدہ پہنچا اُس کی داستان نہایت طویل ہے یہاں اسکے بیان کرنیکی گنجائش نہیں، ان مشاغل کے علاوہ آپ باقاعدہ مطب بھی کرتے تھے اور آپکا مطب مرجع خاص و عام تھا، مولانا مرحوم کی دماغی و ذہنی خصوصیات اور اخلاقی محاسن کے بیان کرنے کے لئے اس رسالہ کی گنجائش اجازت نہیں دیتی، البتہ ہم اپنی دوازدہ سالہ واقفیت اور مسلسل پانچ سال تک مولانا مرحوم کے ساتھ کام کرنے کے بعد بے تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپکی زندگی سلف صالحین کی زندگی کا ایک سچا نمونہ تھی، اگر حالات نے اجازت دی تو ہم کسی دوسرے موقع پر مولانا کے تفصیلی حالات لکھنے کی خدمت انجام دیں گے،

ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اُن کے خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے

محمد اکرام اللہ خاں ندوی سلطان جہاں منزل علی گڑھ

ریویو

قانون وراثت، یہ ایک جدید الطبع رسالہ ہی جسکا پورا نام "قانون وراثت متعلقہ مسلمانان اہل سنت والجماعت مع قانون شفع شرعی" ہی، اور اس کے مولف محمد اسمٰعیل صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل بی وکیل میرٹھ ہیں کاغذ سفید دبیز اور چھپائی صاف ہی، ضخامت ۸۴ صفحہ قیمت ۸/ یہ رسالہ درحقیقت نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہی جس میں مولف نے اسلامی مسائل وراثت کو صحت اور وضاحت سے بیان کیا ہی، آخر میں شفع کے مسائل لکھے ہیں اور عمدہ طریقہ سے لکھے ہیں، مسائل کا تجزیہ خوبی سے کیا ہی اور اُن کو دفعہ وار ترتیب کے ساتھ لکھا ہی، طرز بیان صاف اور ایک حد تک عام فہم ہی تمام مسلمانوں کے لئے عموماً اور طلبہ وکلا کے لئے خصوصاً اس رسالہ کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا، ضخامت کے لحاظ سے قیمت کسی قدر زیادہ ہی، ایسے مفید اور کارآمد رسالہ کو ارزاں ہونا چاہئے تاکہ عام طور پر لوگ فائدہ اُٹھا سکیں،

رہ نمائے انشاء - یہ ۸۰ صفحہ کا ایک رسالہ ہی جو چھوٹی تقطیع پر شایع ہوا ہی اس کے مولف پنڈت وشو ناتھ تیواری ہیڈ ماسٹر ٹون اسکول پوروہ ضلع اناؤ ہیں۔ رسالہ حسب ذیل چار ابواب پر مشتمل ہی، باب (۱) مضمون نویسی کی ابتدائی تربیت، (۲) مضامین اور انکے سرخیان، باب ۳ خطوط نویسی کے ابتدائی اصول اور ضروری امور باب ۴ خطوط کے نمونے، رسالہ بجائے خود مفید ہی اور مبتدی طلبہ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں البتہ کہیں کہیں زبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، جن کی اصلاح مولف کو طبع ثانی میں کرنی چاہئے۔ قیمت ۴/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کا پنجسالہ گزشتہ سنہ ۱۹۱۷ تا سنہ ۱۹۲۲ء

پچھلے مہینے میں صوبہ متحدہ کی پنجسالہ رو داد تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے پنجاب کے اعداد و شمار قلم سے بے ساختہ نکل گئے تھے جن سے قارئین کرام کو مجملاً معلوم ہوا ہوگا کہ متعدد مدارج تعلیم میں پیوستہ کی نسبت گزشتہ پنجسالہ میں تو موار ترقی کس نسبت سے ہوئی۔ اگلے صفحہ پر ہم اب ایک مفصل نقشہ رو داد پنجاب سے لیکر پیش کرتے ہیں اس سے ہر ایک شعبۂ تعلیم کا صحیح حال معلوم ہوگا۔ ہماری اور سررشتۂ تعلیم کی نظر میں کسقدر تفاوت ہے وہ اعداد و شمار سے یہ ثابت کرتا ہے کہ سررشتہ نے اہل صوبہ کو تعلیم دینے میں کس حد تک سعی کی۔ ہمارا زاویۂ نظر یہ بھی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ پنجاب کی ممتاز اقوام مسلمان، سکھ اور ہنود خصوصاً مسلمانوں نے سررشتۂ تعلیم کی حسن سعی کی کس حد تک قدر کی۔ سررشتہ کی نظر زیادہ تر طلبہ زیر تعلیم کے اعداد شمار پر ہے لیکن ہمیں اس کے ساتھ یہ بھی دکھانا ہے کہ کامیاب طلبہ کی جدول کہاں تک شاندار رہی۔

رو داد کے مطابق مسلمان، ہنود، سکھ پنجاب کی تینوں قوموں نے بالترتیب زائد از ۴ء۲ - ۲ء اور کم از ۲ء۴، ترقی کی۔ یہ تناسب فی صدی یا اوسط آبادی پر یا ہر سہ اقوام کے مابین نہیں ہے بلکہ ہر ایک قوم کے پیوستہ پنجسالہ سنہ ۱۷-۱۶ تا ۱۲ - 11 19ء کی رفتار سے نسبت لگائی گئی ہے۔ سررشتہ کی حسن سعی کا یہ ایک بدیہی ثبوت ہے اور اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گزشتہ پنجسالہ میں سررشتہ کا میلان بلحاظ قوت اور اثر کی جانب زیادہ نہیں رہا بلکہ اس

نے سیاسی مصالح کو پیش نظر رکھ کر سست یا پس ماندہ قوموں کی رفتار میں زیادہ تیز قدمی پیدا کی۔ تاکہ تعلیم کے میدان میں پنجاب کی تینوں ممتاز قومیں پہلو بہ پہلو گامزن ہو کر شائستہ فوج کی طرح ایک ساتھ منزل پر پہنچیں اور سیاسی کامیابیوں سے یکساں بہرہ مند ہوں۔ اگر کسی صوبہ میں تعلیمی ترقی پنجاب کے اصول پر نہیں ہوتی تو یہ درحقیقت اس صوبہ کی غلط فہمی ہے اس کو بھی جلد یا بدیر یہی اصول اختیار کرنا پڑیگا۔ اس بارے میں گورنمنٹ کی مالی امداد دینے کے قواعد وضوابط بھی بہت کچھ متعرّف ہیں۔ یعنی جو اقوام تعلیم میں پہلے سے پیش پیش ہیں اسلئے کہ اثر اور قوت میں افضلیت رکھتی ہیں انھیں محض اثر اور قوت کی بنا پر ضرورت بلا ضرورت امداد دینا حقیقت میں کمزور اور سست رفتار اقوام کو اور زیادہ کمزور کرنا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں کبھی کوئی دیرپا سیاسی نظام یا مکمل نظام آسایش قایم نہیں ہو سکتا۔ اگر پسماندہ اقوام میں ناقص قواعد امداد کی وجہ سے تعلیم نہ پھیلی اور ان کی نسلیں جاہل رہیں تو رفتہ رفتہ ایک سیاسی ضعف پیدا ہو جائیگا اور سر رشتہ تعلیم انھیں منت وسماجت کر کے تعلیم دینے پر مجبور ہوگا۔ ہمیں ایک تعلیمی جماعت ہونے کی حیثیت سے انسپکٹر راولپنڈی کی رائے کیساتھ اتفاق کلی ہے کہ "امداد کے موجودہ قواعد سخت ناقص ہیں جو قومیں پہلے سے تعلیم میں بڑھی ہوئی ہیں ان ہی کو اور زیادہ بڑھنے کی ہمت دلانا پس ماندہ قوموں کو جاہل رکھنا ہے۔ اگر کسی جگہ طاقتور قوم کے دس مدرسے ہیں اور کمزور کا صرف ایک ہی تو اول الذکر کو مالی امداد دے کر پانچ مدرسے اور کھلوا دینا اور آخر الذکر کو بحال خود چھوڑ دینا خلاف مصلحت ہے" (صفحہ ۴۴ روداد)

چنانچہ کانفرنس کا رزولیوشن نمبر ۱ گزشتہ اجلاس میں اسی مصلحت سے پاس کیا گیا ہے۔

نقشہ متناسبہ ماخوذ از رسالہ روداد سررشتۂ تعلیم پنجاب
تعداد طلبہ زیر تعلیم بابت سنہ ۱۹۱۷-۲۲ء

تقسیم تعلیم		مسلمان سنہ ۱۹۲۲ء	مسلمان سنہ ۱۹۱۷ء	ہندو سنہ ۱۹۲۲ء	ہندو سنہ ۱۹۱۷ء	سکھ سنہ ۱۹۲۲ء	سکھ سنہ ۱۹۱۷ء	کیفیت
تعلیم عام	جامعات: مغربیہ	۹۲۹	۸۴۸	۲۷۰۲	۳۶۸۰	۶۲۲	۵۰۲	
	جامعات: مشرقیہ	۵۳	۳۰	۴۰	۹۵	۸	۱۰	
	جامعات: میزان	۹۸۲	۸۸۸	۲۷۴۲	۲۷۷۵	۶۳۰	۵۱۲	
	ثانوی	۷۷۲۸۷	۳۶۸۸۲	۹۵۵۸۲	۵۶۵۶۰	۲۲۲۳۹	۱۵۶۴۱	
	ابتدائی	۱۲۹۳۸۱	۱۰۵۱۳۵	۹۶۸۳۸	۱۰۲۵۵۳	۳۸۲۹۲	۲۳۱۷۱	
	پرائیویٹ مکاتب وغیرہ	۳۱۰۸۹	۲۳۳۱۶	۱۳۳۴۷	۱۳۱۰۳	۳۳۲۹	۲۹۱۳	
تعلیم خاص	اعلیٰ	۵۰۷	۳۲۰	۸۹۵	۵۷۸	۲۵۸	۱۸۹	دیگر ... ڈاکٹری، انجینیری، ... زراعت، تجارت ...
	ثانوی (اسپیشل اسکول)	۲۳۹۷	۲۲۰۸	۱۵۷۱	۱۶۳۰	۵۲۳	۳۷۵	
	میزان	۲۳۱۷۴۳	۱۶۹۸۳۹	۲۱۲۰۰۵	۱۷۷۲۰۱	۷۶۳۷۳	۵۳۸۸۲	

نقشۂ بالا میں پرائیویٹ مد میں ملّاں مدارس و مکاتب اور بے قاعدہ درسگاہیں داخل ہیں۔ علوم و فنون کے ذیل میں ثانوی تعلیم سے مراد انٹرنیس اور مڈل کے مدرسے ہیں حرفت سے مراد پیشے یا پروفیشن کی تعلیم ہے۔ جس کے اعلیٰ مدارج قانون۔ ڈاکٹری اور انجنیرنگ وغیرہ شعبے ہیں اور ادنیٰ اسپیشل اسکول جن میں ان ہی پیشوں کی ادنیٰ تعلیم دی جاتی ہے گویا کہ اس کے ثانوی اسکول ہیں۔ خلاصہ یہ کہ علوم و فنون کی اور حرفت کی ابتدائی یا پرائمری تعلیم تو مشترک ہے مگر ثانوی الگ الگ ہے۔ اور نقشہ میں بھی اسی طرح جداگانہ دکھائی گئی ہے۔

اعلیٰ تعلیم

صوبہ متحدہ میں تو نمایاں تنزل ہوا لیکن پنجاب میں ۲۸۱ کی خاصی بیشی ہوئی یعنی ادب اور سائنس میں ۹۴ کی۔ پروفیشن میں ۱۸۷ کی بیشی ہوئی۔ اس طرح پر کہ قانون میں ۲ ۱/۲ گنی سے اور معلمی میں ۱ ۱/۲ گنی سے زیادہ ترقی ہوئی ڈاکٹری میں پچگنی تعداد ہوگئی۔ پھر بھی یہ محض بھرتی کے اعداد شمار ہیں کامیاب طلبہ یعنی میدان امتحان میں فتحمندوں کی تعداد زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔ جیسا کہ سنہ ۲۲ء کے نقشہ ذیل سے ظاہر ہے۔

اقوام	ایم اے و بی اے	سائنس	قانون	ڈاکٹری	معلمی	بقیہ گریجویٹ
مسلمان	۱۴۰	۱۳	۳۸	۹	۳۱	۶۱
سکھ	۴۹	۳۱	۱۳	۵	۳۰	۳۶
ہندو	۳۸۷	۹۲	۱۴۲	۴۱	۱۱۳	۵۷

برادرانِ ہنود کی تعلیمی قوت اس نقشے سے صاف ظاہر ہے۔ مسلمان اور سکھ دونوں مل کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہیں کر سکینگے جب تک گورنمنٹ انھیں مناسب مالی و اخلاقی مدد نہ دیگی۔ سائنس میں جو آج مشرق و مغرب میں سلطان العلوم تسلیم کیا جاتا ہے مسلمان برادران ہنود سے سات درجے پیچھے اور برادران سکھ سے بھی قریباً تین درجے پیچھے ہیں۔ ہمیں زندہ دلانِ پنجاب سے پختہ امید ہے کہ جس طرح انھوں نے تعداد زیر تعلیم میں سیاسی ہیجان

کے باوجود صوبہ متحدہ پر فضیلت ثابت کی اسی طرح کامیابی کے میدان میں بھی وہ امتیازی نشان حاصل کرینگے۔

فوج کی شان فتحمندی میں ہے نہ کہ بھرتی میں۔ ہمارے لیئے یہی ایک غمناک افسانہ کافی ہے کہ پنجاب میں ساٹھ باسٹھ لاکھ مسلمان ذکور میں سے صرف ایک لاکھ انتیس ہزار تین سو اکیاسی بچے ابتدائی تعلیم کے دروازہ تک پہنچے۔ ان میں سے بھی بکثرت قلت معاش اور تنگ دستی سے مجبور ہو کر عملی زندگی کے خارزار میدان میں بغیر کافی زاد راہ جھونک دیئے گئے۔ یہاں تک کہ ثانوی تک صرف ۴۸۷۹ پہنچے۔ یہ بھی گھٹتے گھٹتے ۱۴۸۹ کی تعداد میں اعلیٰ مدارج میں داخل ہوئے۔ آخری امتحان تک پہنچتے پہنچتے بھی بہت جھڑ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ امتحان کے بعد بھی ناکام طلبہ میں سے اکثر آئندہ مصارف تعلیم سے مجبور ہوکر فکر معاش میں مبتلا ہو گئے اور افسردگان خام کی فہرست میں رہ گئے۔ یہاں تک کہ اس بڑی تعداد میں صرف ۲۹۲ کو درجۂ اعلیٰ میں کامیابی کا منھ دیکھنا نصیب ہوا۔ کہنے کے لیئے تو یہ ایک بات ہے لیکن اگر کسی دل میں لگن ہو تو یہ اعداد شمار سخت خلش پیدا کرتے ہیں ؎ صد جا گرہ زدیم امید بریدہ را

ثانوی اگرچہ ثانوی تعلیم۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک پہنچانے میں محض ایک زینہ ہے مگر نقشہ اور جدول میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے بحث میں نظر انداز ہونے کے قابل نہیں۔ اس میں کل ۴۸۷۹ طلبہ ہیں جن میں ۲۴۹۷ اسپیشل اسکول یعنی ادنیٰ حرفت کے مدرسوں میں زیر تعلیم ہیں۔ یہاں پنجسالہ پیوستہ کے مقابلہ پر قریباً ۱۴۸۹ کی بیشی ہے جو کچھ بہت زیادہ وجہ تسلی نہیں اس لیئے کہ اس مد کے کامیاب اور ناکام طلبہ آگے نہیں بڑھتے۔ البتہ علوم و فنون کے ثانوی درجہ میں ۲۰۷۷ طلبہ زیر تعلیم کچھ قابل بحث ہیں ان میں ۱۳۸۷۹ انٹرنیس کے طلبہ ہیں اور پنجسالہ پیوستہ کی تعداد ۲۶۵۵ سے بقدر ۱۲۲۴ زیادہ ہیں۔ زود اعتقاد احباب اس تعداد کو دیکھ کر بہت خوش ہونگے اور خیال کرینگے

کہ سالِ آئندہ اس درجہ میں اژدہام ہونے سے کالج کے مدارج میں پہلے سے زیادہ رونق ہوگی۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ ۱۹۲۲ء کے کامیاب طلبہ انٹرنس کی تعداد صرف ۹۹۵ ہے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ بھرتی چاہے کتنی ہی زیادہ ہو مگر کامیاب سپاہیوں کی تعداد بہت کم ہے علاوہ ازیں پنجسالہ پیوستہ کے اخیر پر یہ تعداد ۹۴۸ تھی گویا پانچ سال کے اندر صرف ۴۶ کی بیشی ہوئی۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ مسلمانوں نے اس صوبہ میں جس میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے بحساب اوسط صرف ۹-۲۰، ۳۰ سالانہ کی ترقی کی؟ - قارئینِ کرام ہمیں معاف کریں گر ہم یہ کہیں کہ اس رفتار سے تو زندہ رولر انجن کی رفتار بھی تیز ہوگی۔ انٹرنس حقیقت میں اعلیٰ تعلیم کا مزرعہ ہے اگر یہاں رونق نہ ہوگی تو کالج کی کلاسوں میں سناٹا ہوگا۔ انٹرنس کے نتیجے میں سہ سالہ گزشتہ کا حقیقت حال یہ ہے۔

سنہ	مسلمان	سکھ	ہندو
۱۹۱۹-۲۰	۹۰۶	۶۴۸	۲۳۵۸
۱۹۲۰-۲۱	۹۱۶	۷۳۱	۲۳۰۱
۱۹۲۱-۲۲	۹۹۵	۸۱۸	۲۶۲۵

ظاہر ہے کہ گزشتہ پنجسالہ کے آخری سال میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً بقدر ۸۰ بڑھی ہے لیکن ابھی اور زیادہ ہمت کی ضرورت ہے اس لیے کہ مسلمانوں کے ہمعدیل یعنی سکھ طلبہ کی تعداد ۷۰۰ ہے حالانکہ یہ قوم تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کے بعد چلی ہے ان کی تعلیمی تاریخ خالصہ کالج سے ابتدائے بیسویں صدی میں شروع ہوتی ہے اور مسلمانوں کی تاریخ تعلیم جدید ایم اے او کالج علیگڑھ سے انیسویں صدی کے ربع آخر کے پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں میں یہ خصوصیت زیادہ ہے کہ دورِ جدید سے پہلے وہ تعلیم کا ایک دورِ قدیم بھی رکھتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھ میں کئی صدی سے شمشیر و قلم دونوں چلے آتے ہیں۔ سکھوں نے دوسرے ہاتھ میں قلم ابھی لیا ہے۔ پنجاب کے نوجوانوں کو تعلیم کے فوائد سمجھانا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ ہمیں

اُمید ہی کہ اگلے پنجسالہ کے اخیر پر زندہ دلان پنجاب اپنی تعلیمی ضرورتوں کا پورا احساس کرینگے

ابتدائی

درحقیقت تمام مدارج تعلیم کا ذخیرہ اسی مد میں ہی۔ جس میں ۲۴۲۴۹ کی بیشی ذکور آبادی کے لحاظ سے پانچ برس کے اندر ہی زیادہ قابل فخر نہیں اور اگر ہی تو ضرور سررشتہ تعلیم کی سعی و کوشش قابل فخر ہی۔ پڑھانا اور پڑھنا دو مختلف باتیں ہیں۔ پڑھنے کا شوق نہ ہو تو پڑھانا ایک لفظ بے معنی ہی۔ اصل میں ہندستان کے والدین ہی تعلیم کی قدر اور اس کی ضرورت کی محسوس نہیں کرتے ورنہ ابتدائی طلبہ کی تعداد نہایت تیزی سے بڑھتی چلی جاتی۔ البتہ پنجاب کے زنانہ مدارس کے انسپکٹرس اسٹریٹ فورڈ صاحبہ ہمیں یہ خوشخبری سناتی ہیں کہ "اُن کے مدارس میں نہ صرف طالبات کی تعداد ہی بڑھ رہی ہے بلکہ طالبات کا علمی مذاق اور فنون لطیفہ کی جانب میلان طبع روزبروز ترقی کرتا جاتا ہی۔ ثانوی جماعتوں میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہی۔ ان میں اکثر طبع رسا۔ ادبی ذوق اور جدت طرازی کے مادہ سے بہرہ مند ہیں۔ بعض کی قابلیت و استعداد بالکل انوکھی معلوم ہوتی ہی۔ اور لطف یہ کہ سب پردہ کی پابند ہیں"

اگر یہ سچ ہی تو بحمد للہ کہ قابل اور نیک ماؤں کا سلسلہ عنقریب شروع ہونے والا ہی۔ جن کی تربیت کی بدولت پنجاب کے تمام ابتدائی مدرسے طلبہ سے بھر جائینگے اور کانفرنس کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہو گی کہ تمام قوم میں بمشکل کوئی فرد جاہل یا اَن پڑھ نہ ملیگا۔

ہم نے تعلیمی اعداد شمار۔ ترقی و تنزل کے اسباب و نتائج اور کچھ خیالات قارئین کرام کے سامنے بقرینہ ڈال دیے ہیں۔ وہ ان سے خود نتیجہ نکالکر دیکھیں کہ سررشتہ تعلیم نے پچھلے پنجسالہ میں پنجاب کی پسماندہ اور بدمذاق قوموں کو تعلیم دینے کی پوری کوشش کی۔ وہ اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہی کہ تعلیم کا تمام سامان جمع کر دے۔ لیکن پڑھنا اور امتحان پاس کرنا یہ پڑھنے والوں کا کام ہی۔ اس لحاظ سے ہم بلاتکلف کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب کے مسلمانوں نے سررشتہ کی حسن سعی کی کم سے کم قدر کی۔ گو ہمیں خود تسلیم نہیں مگر اکثر

احباب کا خیال ہے کہ مسلمان طلبہ افلاس کی وجہ سے اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچ سکتے اس روداد میں صفحہ ۱۴۹ پر بتایا گیا ہے کہ آئندہ سے اینگلو ورنیکولر مدارس کے ثانوی درجوں میں غیر مستطیع مسلمان طلبہ کو اسکالرشپ (وظیفہ) دیکر یا فی صدی حساب سے ماہوار مصارف تعلیم معاف کرکے امداد دی جائے۔ تو نامناسب نہ ہوگا۔

حامد علی۔ صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نطق و قوتِ ناطقہ

انسان کا بچہ دنیا میں ایک ایسی ذات یا شخصیت لیکر پیدا ہوتا ہے جو باوجود مماثلت کے دیگر افراد سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ اس شخصیت میں چند خصائل ارثی اور چند رجحانات طبعی ہوتے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک رجحان نطق ہے۔ یہ بحث کہ بنی نوع انسان میں اس رجحان کی ابتدا کیونکر ہوئی اس مختصر مضمون کے دائرہ سے باہر ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ بحالت موجودہ رجحان نطق بچہ اپنے ہمراہ لے کر دنیا میں آتا ہے۔ اور دیگر رجحانات انسانی کے مانند یہ رجحان بھی بالیدگی و نمو کا محتاج رہتا ہے۔ ماہرین علم نفسیات نے یہ رائے متعدد تجربات کی بنا پر قائم کی ہے کہ ہر رجحان کی بالیدگی اور ترقی کے واسطے پروردگار عالم نے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے۔ اگر اس وقت مقررہ پر کسی وجہ سے بالیدگی نہ ہو سکی تو رجحان ضائع ہو جاتا ہے اور بقیہ عمر انسانی میں اُس کی بار آوری محال بلکہ بیشتر اوقات غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ رجحان نطق

کے انکشاف کا زمانہ بظاہر ایک سال کی عمر کی بعد سے شروع ہوتا اور پانچ یا چھ سال کی عمر تک رہتا ہی۔ اگر اس مدت میں ماحول کے اثر اور رجحان ابتلاع کی امداد سے بچے نے بولنا اور بات کرنا سیکھ لیا تو خیر ورنہ گفتگو کرنا اُس کے واسطے بہت دشوار ہو جاتا ہی۔ اگر اُس کی ایسے ماحول میں پرورش ہوئی ہی جہاں بات چیت کرنا مفقود ہی تو وہ ساری عمر گفتگو کرنے سے قاصر رہیگا۔ گزشتہ صدی کے آخری حصّہ میں اور نیز اس صدی کے شروع میں کئی بچے بھیڑیے کے بھٹ سے ہندوستان اور یورپ کے مختلف ممالک میں نکالے گئے۔ اُن میں سے کئی تو ۹ یا ۷ سال کے تھے اور کئی کی عمر ۱۱ یا ۱۲ سال کی تھی۔ اُن کو گفتگو کرنا سکھانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی لیکن بالکل بے سود ثابت ہوئی۔ ان میں سے ایک بھی بات چیت نکر سکا اور ان بچوں کی حالت بہائم سے بہتر نہ ہو سکی۔ اس کی ایک یہ بھی وجہ بتلائی جاتی ہی کہ عقل اور ادراک کی ترقی کا ذریعہ قوت نطق کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے مسدود ہو چکا تھا۔ یہ رائے اُصولاً بھی صحیح معلوم ہوتی ہی۔

ہر بامعنی لفظ جو بالارادہ انسان کی زبان سے نکلتا ہی اُس کے پس پشت خیال کا ہونا ضروری ہی۔ الفاظ درحقیقت نام ہیں جو ہر ملک کے رسم رواج نے اپنی ضروریات کے مطابق خیالات کے قائم کر دیئے ہیں۔ خیالات کی ماہیت کی جانب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ان کی ابتدا احساسات سے شروع ہوتی ہی۔ جب کوئی شئے انسان کے حاسہ کے مقابل ہوتی ہی اُس کا اثر یا عکس اُن اعصاب کے ذریعہ سے جو اُس خاص فعل کے واسطے قدرت نے انسان کے جسم میں پیدا کر دیئے ہیں دماغ تک پہونچتا ہی۔

اور دماغ سے بساطِ شعور پر منتقل ہو کر اُس پر اپنا نقش ثبت کر دیتا ہی۔ شعور پر پہونچتے ہی نفس انسان اس احساس کی صورت کو مختص و مستقل بنا کر اس کا نام رکھ دیتا ہی۔ نفس کا یہ فعل خیالات کے وجود اور قیام کے واسطے بہت ضروری ہی۔ اور جب تک خیال کی ایک خاص شکل قایم نہیں ہو جاتی نام نہیں رکھا جاتا۔ یعنی شکل کا قیام اور نام نہادی کا

کا فعل لازم و ملزوم ہیں۔ یہ عمل نہایت سُرعت کے ساتھ وجودِ انسانی میں جاری رہتا ہی اور کوئی بیدار لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ مختلف قسم کے احساسات شعور تک نہ پہنچے اور خیالات کی صورت نہ اختیار کرتے ہوں۔ ایک طبقہ حکما نے بساطِ شعور کو ابتدا میں بالکل سادہ قرار دیا ہی۔ بچے کے پیدا ہونے کے چند روز بعد سے نقوشِ دل پر ہونے لگتے ہیں یعنی خیالات کے قایم ہونے کی بنا پڑتی ہی۔ خیالات کے اثبات کے ساتھ ساتھ نفسِ انسان ایک دوسرا عمل بھی کرتا ہی۔ یعنی جیسے ہی حس شعور تک پہونچتا ہی وہاں اُن خیالات سے جو بساطِ شعور پر موجود ہوتے ہیں اس کا مقابلہ اور اُس کو پہچاننے کی کوشش کی جاتی ہی۔ اور اس عمل کے بعد بساطِ شعور پر اندراج ہوتا ہی اور تجربہ کہلانے لگتا ہی۔ عقلِ انسانی درحقیقت اِنہی تجربات کے تحفظ اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا نام ہی۔ جب نام رکھنے کا فعل مکمل ہوجاتا ہی اُس وقت رُجحانِ نطق نام کو ظاہر کرتا ہی۔ اور یہ اظہار بھی اُتنا ہی ضروری ہی جتنا کہ نام نہادی کا فعل۔ نام کے اظہار کی تکرار خیال کے استحکام کی باعث ہوتی ہی۔ جس خیال کے اظہار کا موقع نہیں ملتا وہ ماندہ ہوکر نسیان کے عمل سے اگر بالکل نہیں تو قریب قریب غائب ہوجاتا ہی۔

اِس مختصر بحث سے ثابت ہی کہ قوتِ نطق خیالات کے وجود اور استحکام کے لئے نہایت ضروری ہی۔ جب قوتِ نطق غائب ہوتی ہی خیالات بھی دُھندلے۔ بے ترتیب اور اکثر اوقات مفقود ہوتے ہیں۔ قوتِ نطق کے ضائع ہونے کے ساتھ ساتھ خیالات کی ساخت کا رُجحان بھی ضائع ہوجاتا ہی اور اسی وجہ سے بچے جو بھیڑیئے کے بھٹ سے نکالے گئے تھے باوجود ہزار کوشش کے ساری عمر انسانی جامہ نہ پہن سکے۔

یہ مسئلہ بدیہیات میں سے ہی کہ انسان اور دیگر حیوانات میں مابہ الامتیاز خیالات کی ساخت۔ اُن کا تحفظ، اُن کی تنظیم و ترتیب، اُن کا اظہار، اور اُن سے فائدہ حاصل کرنا ہی۔ کچھ عجب نہیں کہ عربی حکما نے اُنھیں وجوہات کو پیش نظر رکھنے کے بعد عقل انسانی

کو قوت ناطقہ کا نام دیا ہو۔ عقل کا ایسا جامع نام مشکل سے کسی دوسری زبان میں ملیگا۔ قوتِ نطق انسان کی اجتماعی زندگی کے انکشاف اور نمو کے واسطے اتنی ہی بلکہ اُس سے زیادہ ضروری ہے جتنی کہ انفرادی وجود کے لیئے۔ تقریر جو ارتباطِ انسانی کے واسطے لابدی ہے اسی قوتِ اظہار کا نام ہے۔ منجملہ اُن نتیجات کے جو خیالات کی بنا ہوتی ہیں تقریر سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اِس کے ذریعے سے انسان اپنے خیالات دوسری پر ظاہر کرتا اور اُس کے خیالات سے مستفید ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تقریر کا دوسرا نام تبادلہ خیالات ہے۔ تقریر پابند زمان و مکان ہے اور اُس سے بظاہر صرف حاضرین متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے اس کے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کی غرض سے ایک مشین ایجاد کی ہے جس کے ذریعہ سے تقریر کے حدود اثر کو بہت کچھ وسیع کر دیا گیا ہے اور شعور انسانی کے مانند خیالات کا ایک گودام ہماری خارجی دنیا کو فانی میں بھی قائم ہو گیا ہے۔ اسی مشین کا نام تحریر ہے۔ تحریر کا جس قدر اثر انسانی تمدن پر پڑا ہے اُس کی تشریح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ارباب نظر اُس سے پوری طور سے واقف ہیں۔ تحریر درحقیقت قوتِ نطق کے مظاہر کا ایک شعبہ ہے۔

ملک امریکہ کے فن تعلیم و پرورش کے ماہرین نے اس حقیقت کے احساس کے بعد کہ عقل انسانی کی بالیدگی و نمو قوت نطق کی بارآوری پر منحصر ہے اس قوت کی ترقی کے منازل و مدارج دریافت کرنے کے متعلق متعدد تجربات کیئے ہیں جن کے تذکرے سے الزام طوالت کا خوف بھی راقم الحروف کو باز نہ رکھ سکا۔

"پروفیسر ہولڈن ( ) نے ۱۸۷۷ء میں اس امر کے دریافت کرنے کی کوشش کی کہ دو برس کا بچہ عموماً کتنے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس تجربہ کا قابل اعتماد نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ دوسرے حضرات جنھوں نے یہی تجربہ کیا ہے اُن کی رائے ہے دو برس کا بچہ ۲۵ الفاظ سے ۲۰۰ الفاظ تک استعمال کرتا ہے۔

مس ٹینر (   ) نے اپنے رسالہ موسومہ "دی چائلڈ" (   ) کے صفحہ ۳۲ میں ایک تجربہ کا ذکر کیا ہے اور ایک فہرست درج کردی ہے جس میں چوبیس مہینہ کی عمر کے چار بچوں کے مستعملہ الفاظ کی تفصیل ہے۔ اُن میں دو لڑکے تھے جن میں سے ایک کو ۱۳۹ اور دوسرے کو ۲۰۵ الفاظ یاد تھے اور دو لڑکیوں میں سے ایک کو ۳۶ اور دوسری کو ۲۶۳ الفاظ معلوم تھے۔

. . . .

. . . .

ٹامس ولیم بیر (   ) کے متعلق جو تحقیقات کی گئی وہ ضرور کسیقدر نتیجہ خیز تھی اس بچے کی پرورش میں قوت ناطقہ کی ترقی شروع ہی سے مدِّ نظر رکھی گئی یعنی اِس امر کا لحاظ رکھا گیا کہ اُسی کے ماحول میں اُس قوت کو نمو دینے والی غذا موجود رہے۔ ترقی و نمو کے واسطے کسی قسم کا جبر یا سختی نہیں کی گئی۔ ایک سال کی عمر میں یہ بچہ صرف بیس الفاظ زبان سے نکال سکتا تھا۔ جن میں سے نصف انگریزی الفاظ تھے اور بقیہ نصف کو کسی زبان کا نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ محض الفاظ کو زبان سے نکالنے کی کوشش تھی۔ جب اس کی عمر ۱۷ ماہ کی ہوئی اُس وقت اُس کو ۱۶۰ الفاظ یاد تھے اور بیشتر ان میں سے انگریزی زبان کے تھے۔ پانچ مہینے میں ۱۴۰ الفاظ کا اضافہ ہوا۔ یعنی ۷۰۰ فی صدی کے حساب سے اضافہ ہوا۔ جب اس کی عمر چوبیس ماہ کی ہوئی اُس وقت اُسے ۷۷۱ الفاظ معلوم تھے یعنی اُس وقت سے جب وہ ایک سال کا تھا اڑتیس گنی ترقی کی اور ۴½ گنی اُس وقت کی بہ نسبت جب کہ وہ سترہ ماہ کا تھا۔ حساب سے ظاہر ہو جائیگا کہ بارہ و سولہ ماہ کی عمر کے درمیان بچے نے قریب قریب ہر روز ایک نیا لفظ سیکھا سترہ سے چوبیس ماہ کے اندر تین الفاظ روزانہ کا اوسط پڑیگا۔ اگر اتوار کے لیئے دو لفظ مقرر کردیئے جائیں اگر اسی شرح سے ترقی ہوتی گئی تو تیسرے سال میں بچہ ۱۰۵۵

الفاظ سیکھیگا۔ اور اگر اس میں وہ تعداد بھی جوڑ دی جاوے جو بچہ سیکھ چکا ہی تو میزان ۱۸۲۶ ہو جائے گی۔

. . . .

. . . .

مصرعۂ بالا اور دیگر تجربات نے اس امر کو ثابت کر دیا ہی کہ بچّہ اپنے عمر کے تیسرے سال میں بہت زائد الفاظ سیکھتا ہی۔ یعنی جملہ الفاظ کی تعداد تیسرے سال کے آخر میں ۲۲۰۰ سے ۵۰۰۰ تک ہو سکتی ہی۔ الفاظ خیالات کا لباس ہیں۔ نئے الفاظ کا بچوں کو سکھانا در اصل اُن کو نئے خیالات سے آشنا کرنا ہی جس کا لازمی نتیجہ عقل کی فزونی ہوگی لہذا اُستاد و والدین کا فرض ہی کہ بچے کے معلومات میں بذریعہ الفاظ اُس وقت سے اضافہ کرنے کی کوشش کریں جب کہ رُجحان گویائی نمودار ہوتا ہی۔ تیسرا سال خصوصیت سے نگہداشت کے قابل ہی۔ کیونکہ اس وقت اس رُجحان کا پورا زور ہوتا ہی۔

. . . .

. . . .

کچھ عرصہ قبل تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ رُجحان گویائی کی ترقی بھی رُجحان اتباعی پر منحصر ہی۔ مگر اہل الرائے اب اس خیال کے خلاف ہیں۔ رُجحان اتباعی کا قوت نطق پر عمل ضرور ہوتا ہی۔ لیکن بہت کم۔ اس سے نفس رُجحان پر کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ نوعیت لباس میں اس کا ضرور پورا حصہ ہی۔ یعنی رُجحانِ اتباعی بچے کے خیالات کو انگریزی، فارسی، اُردو، عربی وغیرہ کا لباس پہنانے میں مدد دیتا ہی۔ اِس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا

(ملاحظہ ہو اساس التعلیم صفحات ۱۰۴ لغایتہ ۱۰۹)

جب قوتِ نطق عقل انسانی کے نمو کے واسطے اتنی ضروری ہی تو اُس کی نگہداشت اور بالیدگی کی کوشش بھی اسی مناسبت سے ہونا چاہیئے۔ دیکھنا یہ باقی رہ جاتا ہی

کہ ہمارے ملک میں اس کے متعلق کیا انتظام کیا گیا ہے۔ افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو اب تک نہ اس کا احساس ہے اور نہ کوئی بالارادہ کوشش قوت نطق کی ترقی کی بابت کی جاتی ہے۔ جہلا اور نیچے طبقے کے بچوں کا کیا تذکرہ جب خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں بھی پرورش کے اس ضروری جزو پر بالکل لحاظ نہیں کیا جاتا۔ چھوٹا بچہ جاہل ماماؤں اور ملازموں کی صحبت میں پرورش پاتا اور انھیں سے ترتیب وتنظیم خیالات اور گفتگو کے اولین سبق سیکھتا ہے۔ اگر بہت زیادہ احتیاط برتی گئی تو ایسی ماما یا دائی رکھی جاتی ہے جس کی زبان صاف وشستہ ہو اول تو ایسا بھی کم ہوتا ہے اور اگر کیا بھی جائے تو ظاہر ہے کہ کتنا بے نتیجہ ہے۔ دراصل خیالات کی ساخت اور اس کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محض اظہار کی شستگی کی جانب توجہ کی بھی گئی تو بھی خیالات کی متعلق کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

بمقابلہ اس کے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں بچے کی عمر کے شروع کے ۴۔ ۵ سال کی خاص طور سے نگہداشت کی جاتی ہے صبح وشام اور دیگر اوقات پر ماں یا دایہ اسکو سیر کرانے لے جاتی ہے۔ اس کو مختلف چیزیں دکھاتی اور ان کے نام بتلاتی ہے۔ اس طرح سے نئے خیالات بچے کے شعور پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کی جانب سے بھی بچوں کے لیے باغات اور تفریحگاہیں مرتب ہیں جہاں وہ مختلف قسم کے پھولوں، پتوں اور دیگر اشیاء کو دیکھتے اور ان سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ گھر پر بھی ہر ممکن طریقہ سے اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رجحان نطق اور اس کے ساتھ ساتھ رجحان تحقیقات۔ رجحان مشاہدہ اور دیگر رجحانات عقلی کو پورا موقع نموا ور بالیدگی کا ملتا ہے۔ اور اسکول میں داخلہ کے وقت تعلیم کے اثرات کی قبولیت کے واسطے اس کی طبیعت پوری طور سے تیار ہوتی ہے۔

جن حضرات نے قومی تعلیم کا بار عظیم اپنے دوش پر لیا ہے ان کی خدمت میں یہ

عرض کرنا ضروری ہے کہ چھوٹے بچّوں کی ابتدائی پرورش و تعلیم ان کی توجہ کی محتاج ہے۔

محمد عبد الحق

اِبتدائی تعلیم کا جدید طریقہ

انگلستان میں۔ ابتدائی تعلیم کے نصاب سے۔ کتابیں روز بروز خارج ہوتی جاتی ہیں۔ بچّوں کو اعمال و افعال اور کیفیات کے مشاہدے سے تعلیم دینے کی رسم ترقی پر ہے۔ جو واقعات فی الحقیقت میسّر نہیں۔ اُن کو تصویروں کے ذریعے سے دکھاتے ہیں۔ مثلاً گزشتہ جنگ میں اینٹورپ (پایۂ تخت بلجیم) کا کیا حال ہوا۔ اِس کے لئے۔ تصویروں اور نقشوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ایک میں شہر اور حوالیِ شہر اور قلعہ بندیوں کا مرقع قبل از جنگ۔ ہُوبہو دکھائی دیتا ہے پھر جرمن افواج کی آمد، محاصرہ، حملہ، گولہ باری کی حالت یکے بعد دیگرے نقشوں میں دکھا کر، انہدام کا سین دکھاتے ہیں۔ خارجی اور داخلی حلقوں کے ایک ایک محافظ قلعے کا کیا حال ہوا۔ اخیر پر شہر کے حاشیہ اور متن کی عمارات کیونکر سرنگوں ہوئیں۔ دشمن کا فاتحانہ داخلہ وغیرہ غرض کہ اس محاذ جنگ کی ساری تاریخ بچّوں کو یوں ہی از بر کراتے ہیں۔ قدیم تاریخ تہذیب مصر کا بھی نقشوں اور تصویروں ہی سے بچّوں کو اندازہ کرایا جاتا ہے قدیم اہرام مصری اور دیگر عمارات، مصریوں کا لباس غذا، طرز زیست تمام سطحی حالات، سیاسی معاشرتی، مذہبی، ملّی، نقوش و تصاویر میں دکھا کر بچّوں کو ان مضامین سے اس قدر آشنا کر دیتے ہیں۔ کہ تعلیم کے مدارج اعلیٰ تک اُن کا راستہ سہل ہو جاتا ہے۔ جغرافیہ کی تعلیم کا قطعاً خاتمہ ہو گیا۔ ریاضی کے ابتدائی مسائل

کی تعلیم نے اور زیادہ عملی اور نمایاں صورت اختیار کی ہے۔ سٹاک یا راس المال کا قاعدہ پڑھانے کے بجائے اُستاد پوچھتے ہیں کہ تمھارے باپ نے کتنے روپیہ کے وار بانڈ یا سارٹیفکیٹ کس نرخ سے خریدی، شرح سود کیا تھی۔ سالانہ سود کس قدر رہا۔ اور چونکہ والدین اکثر لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ بینک سے داد وستد کرتے ہیں لہٰذا یہ ششماہی سود حساب کرکے اور سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ اور راس المال وغیرہ کے کتابی قاعدہ اُن کو ازبر ہو جاتے ہیں۔

دورِ جدید میں جس قدر وحید العصر گزرے ہیں اُن کے ناموں سے بھی بچوں کو نقشوں ہی کے ذریعے سے آشنا کرتے ہیں۔ اِس طرح پر کہ تمام علوم و فنون کو متعدد شعبوں پر تقسیم کرکے ہر ایک شعبے میں جو جو محقق و موجد و مجدد جس جس ملک میں ممتاز ہوئے ہیں۔ دُنیا کے نقشے میں اُن ملکوں کے خط حدود بند کے اندر ان کا نام اور ایجاد و تحقیق کردہ اشیاء وحالات کا مختصر حوالہ معہٗ سن درج کرکے بچّوں کو دکھاتے ہیں۔ اور حسب ضرورت زبانی سمجھاتے ہیں۔ نیز۔ بڑے کاغذ پر ولولہ انگیز واقعات اور حیرت انگیز کیفیات و مناظر قدرت کی ہو بہو تصویریں بناتے ہیں اور اُسکے گرد بطور حاشیہ، اپنی قوم کے تمام ممتاز افراد اور مشاہیر ملک کی آدھی تصویریں معہٗ نام بناتے ہیں۔ اور بچوں کو دکھاتے ہیں تاکہ محبانِ قوم کو دیکھ کر اُن میں حب قومی اور ملکی خدمت کا ولولہ پیدا ہو۔ یہی تصاویر سینما میں بھی دکھاتے ہیں مگر سینما میں اوقاتِ مقررہ پر اس قسم کے سبق آموز سین دکھاتے ہیں اور ان تصاویر کا سلسلہ مدرسہ یا گھر کے کمرے میں ہر وقت پیش نظر رہ کر۔ ایک مستقل اتالیق کا کام دیتا ہے۔ اگر قومی مدارس میں کم از کم اس طرزِ تعلیم کا آغاز کیا جائے اور مدرسہ کا ایک کمرہ اپنے حسب حال تصاویر سے آراستہ کرکے ایک ذہین اُستاد کے سپرد کیا جائے اور نقشہ ضبط اوقات تعلیم میں۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ اس تعلیم کے لیے بھی مخصوص کیا جائے تو محنت اور مصارف رائگاں نہ ہونگے۔ ہمارے ملک اور قوم میں اکثر مشاہیر واکابرین قابل فخر گزرے ہیں۔ اُنکی فہرست سے اکثر اسمائے گرامی منتخب کرکے کسی بڑی تصویر کے گرد حاشیہ پر درج کرسکتے ہیں

بچّے کی اصل وحقیقت

زمانہ حال کی تعلیمی تاریخ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ یورپ میں ابتدائی تعلیم وتربیت کی بالکل کایا پلٹ گئی ہے۔ بچہ اب حقیر بچہ نہیں رہا۔ بلکہ بڑا بن گیا ہے۔ ہم اسی انسانیت کا آغاز و بسم اللہ تصور کرتے ہیں۔ مگر اہل غرب نے تحقیقات جدیدہ سے بچے کو۔ نوع حیوانی میں مسئلہ ارتقا کی بنا پر۔ اونچے درجہ کا حیوان قرار دیا ہے۔ یعنی جس طرح پرند اور چوپایہ کے درمیان شپرک کی نسل حد فاصل ہے۔ اور پھر چوپایہ حیوان کی نسل میں بندر اشرف مخلوق ہے اسی طرح اب ان میں اور انسان کے بیچ میں بچہ بھی ایک ارتقائی حد فاصل ہے۔ گویا یہ نسل انسانی کی پہلی منزل نہیں بلکہ اپنی نسل حیوانات مطلق کی آخری منزل ہے۔ فزیالوجی خواص اعضا اور سائیکالوجی علم النفس کی بحث کو نظر انداز کرکے دیکھیں تو ان عقائد یا انکشافات سے بچوں کی تربیت وتعلیم کی تاریخ بدل گئی۔ اور ان کو وہ فطری حقوق و مراعات جو انسان نے ابتدائی تہذیب و تمدن سے بڑائی کے زعم باطل پر غصب کر لیے تھے پھر مل گئے۔ اب تک صرف ایک قوت یعنی جذبہ رحم و ہمدردی کے سوا بچے کا کوئی نگہبان اور پشت پناہ نہ تھا۔ اور چونکہ اس جذبہ کا احساس اختیاری نہیں ہے اس لیے بچے پر بڑوں نے ہمیشہ طرح طرح کے ظلم توڑے۔ لیکن اب اس جذبہ کے ساتھ سائنس نے شریک ہو کر اور بچے کی ذاتیات و خواص کو مشاہدات سے منکشف کرکے گویا اس معصوم اور بے بس ہستی کو مستحکم قلعہ بند کر دیا ہے۔ اب مغرب کے ماہران فن تعلیم اور عام اساتذہ و اتالیق یہ نہیں سمجھتے کہ بچہ کی تاریخ حیات رحم مادر یا پشت پدر سے آغاز ہوتی ہے۔ یا یہ انسانیت کی ابتدا اور حیوانات کے درجے سے بلند ہے ایک ذرا مار پیٹ سے یہ خود بخود ترقی کرکے انسان بن جائیگا بلکہ اب اسے بالاتفاق ارتقا کے مسئلہ

کی ایک کڑی تصور کرکے اور حیوانات کے نوع میں۔ سب سے اشرف مخلوق جانکر اسی درجۂ
عقل و فہم کے مطابق تعلیم و تربیت دیتے ہیں۔ بچے کی ہستی اور بچپن کے ذاتیات و خواص علوم
جدیدہ کا ایک شاندار شعبہ بن گیا ہے جس پر۔ اٹھارھویں صدی سے اب تک ہزاروں
تصانیف شائع ہوچکی ہیں حکماء کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جس نے بچے کو صلہ رحم ثابت کرکے
اُسے تمام مخلوقات میں عزیز الوجود اور محبوب تسلیم کرایا ہے۔ اس فرقہ کا پیش امام ایک اطالوی
الاصل شخص فسطالوز (پسٹالوزی) اٹھارھویں صدی کے آخیری ربع میں گزرا ہے
دوسرا گروہ علم الابدان کی متعدد شاخوں کے محققوں کا ہے۔ جن کا سلسلہ مشہور علامہ
دروین: (ڈاکٹر ڈارون) اور علامہ ہال (ڈاکٹر جی سٹانلی ہال) سے شروع ہوکر
فرانس کے ایک ممتاز عالم برقہ (بروکا) پر ختم ہوتا ہے۔ اوّل الذکر نے تشریحاتِ جسم
اور افعال و خواص دل و دماغ سے بچے کی ہستی کو۔ حیوان مطلق کا انتہائی درجہ ثابت کیا
ہے۔ اور فرانسیسی حکیم نے۔ دماغ کے طبقات و بطون میں وہ خاص مقام دریافت کیا۔
جس میں نطق و دیعت کیا گیا ہے۔ اور ثابت کیا کہ بچے میں یہ مقام بچپن کی حد سے گزر کر
ترقی پذیر ہوتا ہے۔ حکیم فسطالوز کی اصول تعلیم پر ہم کسی آئندہ اشاعت میں بحث کرینگے

(زیلای)

رُوس کا جدید نظام تعلیم

ہندوستان کی طرح روس بھی ایک زراعتی ملک ہے جس میں دیہات کی کثرت کاشتکاری
عام ذریعہ معاش۔ زندگی دہقانی۔ روسی سوسائٹی کے عوام الناس بیشتر کاشتکار پیشہ
ہی ہیں۔ جنوبی حصہ میں تمام ترخانہ بدوش مسلمان قبائل آباد ہیں۔ انقلاب جدید کے
قبل تمام علاقوں پر اس قدر گہرا جہل چھایا ہوا تھا کہ دیہاتیوں میں پڑھا لکھا آدمی عنقا

تھا۔ مسلمانوں میں کوئی فرد روسی زبان تک بے تکلف نہ بول سکتا تھا۔ افواج شاہی میں بھی ۸۰ فی صدی سے زیادہ سپاہی خواندہ نہ تھے تعلیم خود زار کے ہاتھ میں تھی یا پادری اور میونسپل کمیٹیاں اُس فرض کو برائے نام ادا کرتے تھے۔ اور چونکہ ملک داری کی بڑی مصلحت یہ تھی کہ عوام کو جاہل رکھا جائے تاکہ انھیں جس کام پر چاہیں جانوروں کی طرح لگا دیں۔ پس یہ جماعتیں بھی اس قدر گرانی اور سختی کے ساتھ تعلیم دیتی تھیں کہ قلیل التعداد مدرسوں اور کالجوں میں امراء کے سوا کسی کو مجال دخل نہ تھی۔ البتہ برائے نام یہ قانون تھا کہ یہودیوں کے سوا ہر کس و ناکس تعلیم پا سکتا ہے لیکن اس انقلاب نے روس کی دفعتاً کایا پلٹ دی اور تعلیم کو زندگی کی شرط بنا دیا ہے جدید گورنمنٹ نے آغاز کار ہی اصلاح و اشاعتِ تعلیم سے کیا چنانچہ اس وقت تعلیم تین حصوں میں منقسم ہے۔ مکاتب۔ دارالعلوم دارالفنون

۱۔ مکاتب سے مراد ابتدائی مدارس ہے۔ جن میں جنرل نالج یا معلوماتِ عامہ کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اُس کے متعدد شعبے ہیں۔ مثلاً ابتدائی۔ ثانوی تعلیم۔ لیبر اسکول (مدارس العمال) اسکول ریفارم (مدارس الاصلاح) ٹیکنکل اسکول۔ ٹریننگ اسکول (مدارس المعلمین) اور مدارس التربیت۔

۲۔ دارالعلوم میں سائنٹیفک سوسائٹی (مجالس علمیہ) داخل ہیں نیز سائنس کے اعلیٰ درسگاہیں اور کتب خانے ہیں۔

۳۔ دارالفنون کے ذیل میں تمام فنون لطیفہ کے مدارس ہیں۔ مثلاً تھیٹر یا تماشہ گاہ۔ سنیما یا قصر التصاویر۔ علم موسیقی اور مصاعف و مزامیر (ہاتھ اور منھ کے ساز)۔ مصوری اور سنگتراشی وغیرہ۔ اس نظام تعلیم کے ساتھ ایک اور جداگانہ محکمہ بھی ہے جو چیف پولیٹکل ایجوکیشن بورڈ (اعلیٰ سررشتۂ تعلیم سیاسیات) سے موسوم ہوتا ہے۔ یہ گویا عوام الناس میں کمیونزم (جمہوریت و اشتراکیت) کی روح پھونکنے کی بڑی (برقی آلہ) ہے۔ گزشتہ و پیوستہ نتائج کا مناسبہ نقشہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک

ملک جس کے صدیوں کے عقائد تھوڑے دنوں میں تہ و بالا ہو گئے ہوں جس کی منزل آئندہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہو۔ ایک قوم جو افلاس [illegible] میں گرفتار ہے سر و سامان۔ ہر طرف سے محصور اور در رزق بند ہو وہ قوم تعلیم [illegible] میدان کو اس تیز قدمی سے طے کرے کہ چار ہی سال میں مدارس و طلبہ کی تعداد دو چند ہو جائے درحقیقت یہ سب مردانہ ہمت و استقلال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ نقشہ ذیل ملاحظہ کیجئے۔

سنہ	ابتدائی و ثانوی مدارس	طلبہ
۱ ۵	۴۶۸۵۵	۳۰۹۱۰۰۰
۱۹ ۱۶	۳۳۱۷	۴۶۹۱۸۲
۱۵ ۲۱	۵۱۵۰۰	۲۰۰۰۰۰

حقیقت یہ ہے کہ [illegible] ہے۔ [illegible] خصوصاً [illegible] اشاعت اور علم کی پرداخت کے کافی اسباب میسر نہیں ہیں۔ نئی کتابیں چھاپنے اور شائع کرنے کا سامان [illegible] لکھنے پڑھنے کے پورے لوازم بھی نہیں طلبہ کی کثرت ہے مگر معلم نہیں۔ ان وجوہ سے تعلیم میں گورنمنٹ اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق پوری تیز قدمی نہیں دکھا سکتی۔ پھر بھی قابل اطمینان [illegible] کے [illegible] نے خود یہ ایک نئی شاخ لگائی ہے جو خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں پرانی وضع کے [illegible] قسم کے ابتدائی اور ثانوی مدارس کو توڑ کر ایک جمہوری درسگاہ قائم کی ہے [illegible] قوم کے بچوں کو بلا تفریق و امتیاز تعلیم دی جاتی ہے۔ طلبہ کی عمر کے لحاظ سے [illegible] کئے گئے ہیں پہلے میں ۸ تا ۱۲ برس اور دوسرے میں ۱۲ تا ۱۷ برس عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ تعلیم کا [illegible] اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اٹھایا گیا ہے کہ ہر ایک بچہ [illegible] کرے اتنا حاصل کر سکے۔ اپنی حوائج زندگی خود مہیا کر لے۔ جہاں تک ممکن ہو غیر [illegible] ساختہ اشیاء کا محتاج نہ رہے۔ چنانچہ درجہ اول کے مدارس میں کپڑا بننا سینا پرو

پہ عمالی، بڑھئی اور معمار کا کام اور اور اسی طرح کے ریاض سکھائے جاتے ہیں جن بغیر زندگی محال ہے۔ لیکن یہ تمام کام سائنس کی تحقیقاتِ جدیدہ کی رو سے عملی اصول پر اور ماہرانِ فن کی نگرانی میں سکھائے جاتے ہیں۔ نصاب کی کتابوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہی بجنسہ بالعمل کر کے دکھایا جاتا ہے۔ گویا علم و عمل ساتھ ساتھ ہیں تعلیم کے مصارف نیز خورد و نوش اور کپڑا گورمنٹ مہیا کرتی ہے بلکہ بعض مدارس میں بستر بھی ملتے ہیں۔ اور طلبہ دن رات مدرسہ ہی میں رہ کر مدرسے کے متعلقہ فرائض کو اساتذہ کی نگرانی میں انجام دیتے ہیں۔ دوم درجہ کے مدارس (۱۲ تا ۱۷ برس کی عمر) میں وہی مضامین اعلیٰ پیمانہ پر علم اور عمل دونوں ذرائع سے پڑھائے جاتے ہیں جس لڑکے نے جو پیشہ اپنے لیے منتخب کیا ہو مدرسہ میں وہ اسی پیشہ کا کام تکمیل کے ساتھ کرتا ہے۔

صنعت دستکاری کے کارخانوں میں ایک نظام تعلیم الگ عمل پذیر ہے۔ یعنی جس طرح انگلستان میں قانون ہے کہ کوئی بچہ ۱۴ برس سے کم عمر کا کسی کارخانہ میں ملازم یا اجیر بنکر کام نہ کرنے پائے اسی طرح روس کی جدید گورمنٹ نے قانون وضع کیا تھا مگر اقتصادی مشکلات اور عام قحط سے مجبور ہو کر عارضی طور پر ۱۴ کے بجائے اب ۱۲ برس کی حد عمر قرار دیگئی ہے۔ چنانچہ قلی لڑکوں کو کارخانوں کی عملیات کے مطابق عملی تعلیم باقاعدہ مدارس میں دی جاتی ہے۔ اور بچے ہر روز ۴ گھنٹے صبح یا شام مدرسہ میں جانے پر مجبور رہیں اور اس مقصد کے لیئے ملک میں جابجا شبینہ اور صباحیہ مدارس کھول دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ خاص پیٹرو گرڈ میں ۴۶ اس قسم کے نیز نیم روزہ مدارس کھلے ہوئے ہیں جن میں دس ہزار کارخانوں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ پائے تخت میں ایک مدرسہ نئی نرالی وضع کا قایم ہوا ہے جس کے طلبہ نے باہم ملکر مدرسہ کی عمارات اور مطبخ خود تعمیر کیئے۔ آبخانہ کی اپنے ہاتھ سے مرمت کی ایک پرانے مکان کی صورت بدل کر کھانے کا کمرہ بنایا۔ اور ایک کلب گھر بھی اسی طرح آپ اپنے لیئے تیار کیا۔ اس مدرسہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ طلبہ نے اپنے گروہ میں سے چند ممتاز

طلبہ کو منتخب کرکے ایک جمہوریت تعلیم قایم کرلی ہے۔ جو نصاب ضبط اوقات۔ عام شائستگی اور رفع نزاعات کے متعلق آخری فیصلے کرتی ہے۔ مدرسہ کا ہر فرد اخلاق و ادب میں ایک دوسرے کو جواب دہ ہے اور سب بھائیوں کی طرح مل کر رہتے ہیں اُس میں مکاتب اور تعلیم گاہیں قایم کرکے طوطے کی طرح پڑھانے ہی پر بس نہیں کیا جاتا بلکہ طلبہ کو باعمل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جو ہمیشہ نئی نئی صورتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے مثلاً پیٹرو گریڈ کے قریب ایک گاؤں آباد ہوا ہے جو خاص بچوں کے لیئے ہے۔ دراصل یہ مقام زار روس کا گرمائی نزہتگاہ تھا۔ مگر اب گورنمنٹ نے اس کی صورت بدل کر طلبہ کا تفرّجگاہ بنا دیا ہے۔ سالانہ تعطیل کے ایام میں ملک بھر کے طلبہ یہاں آکر ٹھہرتے ہیں۔ قافلوں کی صورت میں علمی تحقیق و تدقیق کے لیئے باہر دورے کرتے ہیں۔ قسم قسم کی صحت بخش ورزشیں سبق آموز کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ درس و تدریس کے حلقے قایم ہو کر ان میں سیاسیات پر تقریریں ہوتی ہیں اور آس پاس کے دہقانوں کو روس کی قدیم روایات اور تواریخ سناتے ہیں۔ غرض کہ یہ خاص نظام روس ہی کا ایجاد ہے جس کا بڑا مقصد ہے کہ تعطیل میں طلبہ کو آوارہ گردی تضیع اوقات سے بچا کر ذہنی، اخلاقی اور جسمانی ترقی کی راہوں پر رکھیں۔ ملک بھر میں اس قسم کی آبادیاں اکثر علاقوں میں قایم کی گئی ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے بچوں کو بھی اس تفریح میں شریک ہونے کے لیئے ۱۵ روز کی حکماً تعطیل ملتی ہے۔ اس کے تمام مصارف گورنمنٹ ادا کرتی ہے۔ ان کے علاوہ ملک میں پانچہزار مدارس ابتدائی خاص شیرخوار بچوں کی تربیت و پرورش کے لیئے قایم کیئے گئے ہیں ان میں تین لاکھ شیرخوار بچوں کی آسایش و سکونت کا کافی سامان طبّی اصول پر مہیا رہتا ہے۔ اور مائیں اپنے بچوں کو ان پرورش گاہوں کو سپرد کرکے خود کارخانوں میں بے فکر ہو کر کام کرتی ہیں یہ بات دنیا کے کسی ملک کو نصیب نہیں۔

اگرچہ قانون یہ ہے کہ ۱۰ برس تک ہر ایک بچہ مدرسہ میں حاضر ہو کر تعلیم حاصل کریگا

اِس کے تمام مصارف گورنمنٹ ادا کریگی مگر چونکہ ملک میں آزوقہ کی کمی ہی ہنوز اقتصادی پیچیدگیاں رفع نہیں ہوئیں اس لیئے ابھی اس قانون پر پورا عمل درآمد نہیں مگر حال ہی میں گورنمنٹ نے ایک حکم نافذ کیا ہی جس کی رو سے ہر ضلع کے لیئے لازم ہی کہ آزوقہ کا سامان اور دیگر حوائج معین مقدار میں صدر حکومت کو سالانہ دیا کرے یقین ہی کہ اب بہتر صورت حال ہوگی۔ تاہم روس نے صدیوں کی جہالت کو دور کرنے میں وہ کمال دکھایا ہی کہ اور کسی قوم کی تعلیمی تاریخ میں مشکل سے نظیر ملیگی۔ ایک سال سے بھی کم مدت میں ۴۰ لاکھ نفوس کو جہل سے نکال کر لکھا پڑھا بنا دیا ہی۔ سرخ فوج میں جاہل سپاہیوں کی تعداد ۸۰ فی صدی سے کبھی کم نہیں ہوئی مگر اب صرف ۳۵ فی صدی ہی۔ بلکہ کچھ عرصہ ہوا اعلان ہوا تھا کہ مئی ۱۹۲۲ء کے شروع تک فوج کا ایک سپاہی بھی جاہل نہ رہیگا۔ مہتمم اعلیٰ سررشتہ تعلیمات نے تعلیم کی روزافزوں ترقی کو پیش نظر رکھ کر اعداد شمار سے ثابت کیا ہی کہ اب سے دس برس بعد روس بھر میں ایک شخص بھی جاہل نہ رہیگا۔

اجانب کو حصول تعلیم میں کافی سہولت دیجاتی ہی۔ خصوصاً اہل مشرق یعنی ایشیا کے باشندوں کو روسیوں کی طرح آزادی حاصل ہی۔ چنانچہ ماسکو کی یونیورسٹی میں ممالک مشرقیہ کے ایک ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اُن کے نہ صرف مصارف تعلیم ہی معاف ہیں بلکہ طالب علمانہ زندگی کی جمیع ضروریات معہ سامان خواب و خورش اور ملبوسات و پوشاک کل بذمہ گورنمنٹ ہیں۔ علوم جدیدہ اور سائنس کی درسگاہوں میں مشرق کے طلبہ روسیوں کے پہلو بہ پہلو مساوی حقوق کے ساتھ تعلیم پاتے ہیں۔ کوئی تفریق و امتیاز نہیں۔ اصل میں روس کی موجودہ گورنمنٹ نے رنگ و روپ یا حسب نسب کی بنا پر کوئی تفاوت نہیں رکھا۔ ہر کس و ناکس کو تحصیل علوم کی عام اجازت ہی بشرطیکہ وہ کسی اصول حکومت کی خلاف عقائد نہ رکھتا ہو۔ مشرقی طلبہ کو کمی پیداوار اور قلت سامان کے باوجود ہر طرح کی آسایش حاصل ہی۔ داخلہ کیلیئے محض ذاتی قابلیت اور استعداد کافی سمجھی جاتی ہی۔ داخلہ کیلیئے کسی خاص امتحان کی شرط نہیں۔

قریشی

(ماخوذ از موڈرن ریویو مارچ سنہ ۱۹۲۳ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ بازی

کم سے کم جہاں دو چار انسان بھی رہتے ہوں ان میں بھی کبھی نہ کبھی اختلاف خیال اور کچھ نہ کچھ پرخاش ہو ہی جاتی ہے یہ کہنا کہ ہر حالت میں انسانی جماعتوں اور انسانی گروہوں میں چشمک اور پرخاش ہونی نہیں تمدنی مراحل اور تمدنی حالات سے ناواقفیت ہوگی۔ بیشک اچھا اور مفید یا درخشاں تمدن وہی ہے جس میں محض سلامت روی اور آشتی ہی آشتی ہو نہ تو پرخاش ہو نہ اور کوئی چشمک۔ لیکن چونکہ مختلف رنگوں میں معاملات جاری رہتے ہیں اس واسطے ایسی امید رکھنا گو کہ ایک نیک خیال تو ہے لیکن ایسا ہونا ایک بڑی حد تک مشکل ہے دوسرے تو جدا گانہ صرف ایک شخصیت ہی کبھی خیال کرتی ہے اور کبھی کچھ۔

اگر ایک طرف تنازعات اور اختلافات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ان کا ہونا کبھی کبھی لازمی ہے تو دوسری جانب اس سے بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کہ جس گھر جس خاندان جس جماعت اور جس قوم میں تنازعات کی کثرت ہو جاتی ہے اور لوگ بہیئت مجموعی اس کے عادی ہو جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس گھر اس خاندان اس جماعت اور اس قوم کا شیرازہ آسائش اور عقدۂ فارغ البالی بھی بکھر جاتا اور رشتۂ قومیت بری طرح کھل جاتا اور طشت از بام ہو جاتا ہے۔

ہر گھر اور ہر جماعت ایک قوم یا ایک حکومت ہوتی ہے جو گھر اور جماعت تنازعات کے سلجھانے میں ہمیشہ خاشی پہلو ہی لیتی اور مقدمہ بازی میں لگی رہتی ہے اس کی عزت اور اس کا احترام اور حیطۂ آسائش ہمیشہ زیر صدمہ رہتا ہے اس میں شبہ نہیں کہ کبھی نہ کبھی تنازعات کی صورت میں متنازعین اور متخاصمین کو انفصال متنازعات کے واسطے ممانعت

اور بڑی بڑی طاقتوں کی جانب دوسرے الفاظ میں جن کا نام سیاسی یا حکومتی عدالتیں ہو سکتا ہی جانا پڑتا ہی لیکن اگر کسی قوم اور کسی جماعت میں خلاف اپنی سابقہ اور مذہبی روایات کے عادی مجرموں کی طرح عادتاً عدالتوں میں جاکر مقدمہ بازی کرنی پڑے تو پھر یہ دنیا ایک عارضہ ہو گیا۔ کیا سخت عارضہ جس سے قومیں برباد ہوتی اور جماعتیں دوسری ترقی یافتہ قوموں کی نگاہوں میں ذلیل اور بے حرمت ہو جاتی ہیں۔

آہ ہم

تمھیں اپنی قوم مسلمانوں کی سرگزشت مقدمہ بازی سنائیں کس قوم اور کس ملت کی یہ سرگزشت ہی اس قوم اور اس ملتِ بیضا کی جن کی مذہبی کتابوں ہاں قرآن مجید میں صاف طور پر لکھا ہے۔

" اگر تم میں کوئی تنازعہ ہو تو اللہ اور رسول کی جانب رجوع لاؤ۔ قانون اور یہ دفعہ ہوتے ہی ہمارا بد قسمتی سے یہ حال ہو کہ ہم میں سے فیصدی ۵۰ ہی نہیں بلکہ ۹۵ سال کے ۳۶۰ دنوں میں ایک ذلت کے ساتھ عدالتوں میں رہتے ہیں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں مثلاً پنجاب میں وہاں خصوصاً میندار وں میں اس قدر مقدمہ بازی رہتی ہو کہ خدا کی پناہ بات بات پر جھگڑا اور بات بات پر تنازعہ چھوٹے سے چھوٹے تنازعات بولئے عدالتوں کے طے نہیں ہوتے اور صرف چند دنوں میں ہی نہیں طے ہوتے۔ بلکہ سالوں دائر رہتی ہیں اور اُس کے ساتھ ہی متنازعین کے خاندانوں میں قریباً ہمیشہ کے واسطے جنگ چھڑ جاتی ہی ہزاروں روپیہ خرچ کر کے بھی جو لوگ یا جو مقدمہ باز عدالت سے جیت کر بھی نکلتے ہیں وہ گویا ہار مان کر آتے ہیں اور جو لوگ ہار جاتے ہیں وہ تو گویا مر ہی جاتے ہیں۔

پنجاب میں زیادہ تر مسلمان زمیندار ہیں اور بہ حیثیت مجموعی کل آبادی مسلمانوں کی بمقابلہ دیگر اقوام اور دیگر مذہب کے ۵۵ فی صدی ہو زمینداروں کے مصارف مقدمہ بازی

اگر سرسری طور پر بھی تخمینہ لگایا جائے تو سالانہ پچاس لاکھ سے کم خرچ نہیں ہوتا اگرچہ پنجاب
ں گورنمنٹ کی مہربانی سے ایکٹ انتقال جاری ہونے کی وجہ سے کوئی زمیندار آراضی فروخت
یں کرسکتا یعنی غیر زمینداروں کو نہیں دے سکتا پھر بھی لاکھوں روپیہ سالانہ سود زمیندار
رتے ہیں اگرچہ اکثر سالوں میں پیداواریں بھی اچھی اور وافر ہوتی ہیں پھر بھی بار سود
سے سبکدوش نہیں ہوتے۔

جو قوم قرضوں سود اور مقدمہ بازی میں اس قدر دب چکی ہو اس کی آسائش زندگی کے
سائل اور اس کا تمدن کیا کچھ قیمت رکھ سکتی ہے وہ مخفی نہیں رہ سکتا حسن تمدن اس صورت میں
متصور ہے کہ جب بازیات اور متعلقین بحسن تمدن حسن آسائش اور حسن زندگی رکھتے ہوں جن کو ان
ن کنبوں اور ان خاندانوں کے ایام نحوست مقدمہ بازی میں ہی گزرتے ہوں۔

ان کی زندگی اور ان کا تمدن کس طرح سرسبز اور کامیاب ہو سکتا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ
ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں پر کہاں تک مقدمہ بازی ہوتی ہے اور
ن کے قرضوں کی کیا کیفیت ہے خواہ کچھ بھی ہو تمدنی ضروریات اور آسائشی حوائج کے
ت لازمی ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس طرف لگائی جائے کہ مقدمہ بازی میں فرید احتیاط
سے کام لیں قوم کے لیڈر خاص طور پر اس پر زور دیں کہ یہ آفت اور یہ نقصان رساں
سلسلہ رفتہ رفتہ کم کیا جائے جو قوم اور جماعت ہمیشہ بار سود اور بار مقدمہ بازی کے تحت
بی رہے گی سمجھ سکتے ہو کہ اس کا مستقبل روشن اور کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

بوجہ مقدمہ بازی اور آئے دن کے تنازعات کے مسلمانوں کا معاملاتی پہلو بہت کچھ
بتا جاتا ہے کیونکہ کثرت مقدمہ بازی کی صورت میں انسان کے دل و دماغ پر بھی اثر پڑتا ہے
ر آج کل کی مقدمہ بازی صداقت کے مقابلہ میں بہت کچھ کذب و افترا اور ناجائز چارہ جوئی
ر جوابدہی کو بھی چاہتی ہے۔ جن دوسری قوموں سے سودی لین دین کیا جاتا ہے وہ بھی
ن حالات میں سخت سلوک کی عادی ہو جاتی ہیں بدولت انہوں سے حد ۱۲ فی صدی سود

لیتے ہیں وہ ہم سے بوجہ ہماری بے اعتباری کے ۳ سے ۳ اور ۱۲، ۱۶ روپیہ فیصدی تک بھی سود لے کر خوش اور راضی نہیں ہوتے یہ تماشا ہم روز دیکھتے اور سنتے ہیں ؎

از ماست کہ بر ماست

(کثرتِ مقدمات)

مسلمانوں میں کثرت سے مقدمہ بازی اس واسطے ہی ہو رہی ہے کہ ان کا باہمی اعتبار اُٹھتا جاتا ہے جب یہاں تک نوبت پہنچ جائے کہ کسی قوم کا باہمی اعتبار بھی باقی نہ رہے تو دوسری قوموں کی نظروں میں کیا کچھ اعتبار و احترام رہ سکتا ہے وقت آگیا ہے کہ مسلمان مقدمہ بازی سے ایک بڑی حد تک پرہیز کریں اور اپنا معاملاتی پہلو بھی سدھاریں کیونکہ جو قوم معاملاتی پہلو درست نہیں رکھتی اُس کی زندگی معمولی آسایش سے بھی رفتہ رفتہ بیگانہ ہوتی جاتی ہے۔

تنازعات پیدا ہونے پر بھی اگر حسنِ تمدّن کی خاطر مسلمان بطور خود قومی پنچایتوں میں نبٹ لیا کریں تو جو مصارف اس وقت پڑتے ہیں اُنکا آٹھواں حصہ بھی نہ پڑے سیاسی عدالتیں اور سیاسی قانون ہرگز کسی کو مجبور نہیں کرتے کہ ضرور ہی عدالتوں کی چوکھٹیں دیکھی جائیں اور خواہ مخواہ ہی معاملہ کی رسّی دراز کی جائے یہ تو اپنے اختیاری بات ہے۔

(دوسری جماعت)

کبھی وہ زمانہ تھا کہ وہ لوگ جو کسی شہر قصبہ یا کسی گانوں میں کم درجہ کی حیثیت مالی رکھتے تھے متوسط درجہ یا اعلیٰ درجہ والوں کے پاس اپنے تنازعات لیجاتے اور فیصلہ کرا لیا کرتے تھے اب جب بڑی بڑی ہستیاں خود ہی گرفتارِ بلا یا گرفتار مقدمہ بازی رہتی ہیں تو وہ غریب الحیثیت لوگ بھی مقدمہ بازی کے عادی ہوتے جاتے ہیں جن سے اور بھی مقدمہ بازی

میں ترقی ہو رہی ہے اور کاروباری محنت اور تردد میں دن بدن فرق اور کمی آتی جاتی ہے

چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

کانفرنسوں پر جو تعلیم و تدریس پر زور دیا جاتا ہے یہ لازمی ہے لیکن ان ہی کانفرنسوں میں اس پر بھی زور دیا جائے تو کیا اچھا ہو کہ مقدمہ بازی کا عنصر مسلمان جماعتوں میں سے کم ہونا چاہئے اگر اس پر زور نہ دیا جائے تو قومی اعتبار اور قومی آسایشی عناصر میں رفتہ رفتہ انحطاط کرتا رہیگا جس سے قوم اور ملت کی ذلت ہے کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ عوام الناس اور دنیا داروں کو چھوڑ کر علمائے اسلام میں بھی مذہبی تنازعات عدالتوں میں جاتے ہیں اور یہ جھمیلہ شروع رہتا ہے جب مشاہیر مذہبی بھی نہ بچ سکیں تو ہمارے ایسے لوگ کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں۔

کاش قوم سوچے اور اپنے تنازعات کو کم کرے اور بہ صورت تنازعات ہونے کی بطور خود ان کا فیصلہ کرے کاش قوم میں اعتبار جمانے کا ولولہ پیدا ہو کاش ہم فرداً فرداً اور مشترکۃً اس پر مزید غور کریں بے شک کوئی قوم اور کوئی ملک بھی تنازعات سے خالی نہیں لیکن یہاں مقدم سوال یہ ہے کہ ہر کسی قوم کی گاڑھی کمائی کا روپیہ اور اندوختہ پانی کی طرح سمندر مقدمہ بازی میں بہایا جانا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے اگر باہمی اقرار و وعدہ پر انسان قایم رہے تو باوجود عذر و معذرت کے بھی مقدمہ بازی کی نوبت نہیں آتی۔ جو قوم ایک سال میں لاکھوں روپیہ مقدمہ بازی میں گنواتی ہے اس کی مرفہ الحالی کا خدا حافظ وہ قوم دنیا کی دوسری قوموں کے سامنے کیونکر پنپ سکتی اور کس طرح سرسبز ہو سکتی ہے۔

ہر شخص اور ہر قوم کو دنیا میں مال و زر کی ضرورت ہے اور کوئی قوم سوائے مال و زر کے آسایشی عناصر کا تہیہ نہیں کر سکتی جب ہماری دولت کا کثیر حصہ سال وار خواہ مخواہ کی پرخاشوں اور مقدمہ بازی میں خرچ ہوتا ہے تو ہماری خوش حالی کی قسم کون کھا سکتا ہے

اگر عدالتوں میں جانا ہی پڑے تو اس صورت میں بھی صلح کے دروازے کھلے رہتے ہیں کوئی عدالت نہیں چاہتی کہ مقدمہ رجوع عدالت کرکے پھر صلح نہ کرے اور یوں نفسانی غضب تو یہ ہے کہ ضدیت حائل ہو کر ایک معمولی تنازعہ کے واسطے بھی سالوں منہ پھیر رہتی ہے اور اس کے ساتھ ہی رفتہ رفتہ بہ دگر مراحل اور بھی خرخشے پیدا اور حائل ہوتے جاتے ہیں یوں تو ہر یہ مقدمہ بازی ایک معمولی رنگ رکھتی ہے لیکن قومی کمزوری اور بے اعتباری کے نقطۂ نظر سے کبھی کمزوری ہمارے تمدن کی کمزوری کا موجب ہے ہم تمدنی رنگ میں جو دن بدن کمزور ہو رہے ہیں اسکی تہہ میں اسی قسم کی باتیں شریک اور دخیل ہیں خدا کرے کہ ہم سوچیں اور بار بار سوچیں۔

سلطان احمد

سادگی اور صحت نمبر (۲)

موتھ، معدہ، اور آنتوں کی صفائی کے بعد اب عام طور پر اندرونی صفائی کے متعلق چند امور عرض کیے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب انسان کی طبیعت بدمزہ ہو، یا کوئی معمولی شکایت معدہ وغیرہ کی خرابی کی ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ جسم میں سمیت بڑھ جانے کا نتیجہ ہے۔ سمیت کو جسم سے خارج کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ روزہ رکھا جائے یا فاقہ کیا جائے اور ادنی صورت یہ ہے کہ پھل اور ترکاری کا روزہ رکھا جائے جس سے یہ مراد ہے کہ نشاستہ دار چیزیں کھانی ترک کر دیجائیں اور دن میں دو تین بار عمدہ تازہ پھل کھائے جائیں۔ کسی ایک یا چند ترکاریوں کا شوربا چند بار پیا جائے۔ روزہ رکھنے میں بالعموم یہ غلطی ہوتی ہے کہ سحری اور افطار میں ثقیل غذائیں کھائی جاتی ہیں اور شکم پری زیادہ کی جاتی ہے۔ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ جس قدر زیادہ دیر تک غذا معدہ میں ٹھہرتی ہے اسیقدر

زیادہ سڑ کر خون میں سمیت پیدا کرتی ہے اور امراض کی موجب ہوتی ہے۔ اس لیے روزہ رکھنے
میں ہلکی غذا کھانے کی نہایت ضرورت ہے۔

جلد کی صفائی

پہلے نمبر میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ عمدہ صحت کے لیئے اندرونی اور بیرونی
صفائی کی ضرورت ہے۔ یہاں تک اندرونی صفائی کا ذکر کیا گیا۔ اب بیرونی
صفائی کی نسبت عرض کیا جاتا ہے۔ بیرونی صفائی سے مراد پہننے کے کپڑوں کی صفائی نہیں بلکہ
جلد کی صفائی ہے۔ مہذب دنیا میں اب جلد کی جگہ کپڑوں نے لے لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے
جسم کو سردی گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیئے جلد بنائی گئی تھی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ انسان نے
لباس کو آسایش کے لیئے نہیں بلکہ آرایش کے لیئے اختیار کیا ہے۔ قدرتی طور پر اگر جلد اس
قابل نہ ہوتی کہ وہ سردی گرمی کو برداشت نہ کر سکتی اور اس کی حفاظت کے لیئے کسی مصنوعی
چیز کی ضرورت ہوتی تو اس سے صانع حقیقی کی صنعت میں بٹہ لگتا ہے۔ بہر حال اس امر
کی شہادتیں موجود ہیں کہ انسان کی جلد سردی اور گرمی کی متحمل ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا تحمل
اسی پر منحصر ہے کہ اُسے اکثر کھلی ہوا میں رکھا اور بار بار خوب صاف کیا جائے۔ مہذب انسانوں
کی جلد اور ان کا جسم چونکہ کپڑوں میں پوشیدہ رہتا ہے اس لیئے انھیں ان کا کبھی خیال بھی
نہیں آتا۔ اور بجائے اُن کی صفائی اور خوبصورتی قائم رکھنے کی کوشش کرنے کی وہ شب
و روز کپڑوں کی خوبصورتی اور تراش اور صفائی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی غلطی
ہے۔

پھر یہ کہ جلد کی صفائی کے لیے طرح طرح کی شرائط مقرر کر رکھی ہیں۔ یعنی یہ کہ اُس کو
گرم پانی سے دھویا جائے۔ صبح کا وقت سردی کا ہوتا ہے۔ سہ پہر سے رات تک حرارت
کم ہوتی جاتی ہے اس لیئے اُس وقت نہانا مضر سمجھا جاتا ہے۔ دوپہر کا وقت کھانے کا ہوتا ہے
اور کھانے کے دو تین گھنٹہ بعد واقعی طور پر نہانا مضر ہے۔ اس طرح تمام جسم کو دھونے
کا وقت مشکل سے نکلتا ہے۔ حالانکہ ضرورت ہے کہ تمام جسم کی جلد کو تقریباً اسی طرح بار بار

دہونے کا عادی کرنا چاہیئے جس طرح کہ ہاتھ پاؤں اور منہ کے دہونے کا۔

نہانے میں سب سے اوّل تو یہ ہی کہ گرم پانی کی عادت نہ ڈالنی چاہیئے۔کیونکہ اس سے پٹھے ڈھیلے ہوجاتے ہیں۔اس کے علاوہ گرم پانی سے نہانے کے بعد سردی لگ جانیکا اندیشہ رہتا ہی۔

پس جب تک کہ جلد کو خاص طور پر صاف کرنے کی ضرورت نہ ہو گرم پانی کے استعمال سے بچنا چاہیئے۔البتہ تکان کے وقت گرم پانی سے نہانا چاہیئے۔زیادہ سردی کے زمانہ میں گرم پانی سے نہانے کی نوبت آئے تو اوّل تو نہانے کے بعد دیر تک مکان میں رہنا چاہیئے ورنہ بہترین صورت یہ ہی کہ آخر میں نیم گرم اور پھر تازہ یا سرد پانی جسم پر ڈال لینا چاہیئے تاکہ جلد کے مسامات بند ہوکر جسم کو سردی سے محفوظ کردیں۔جوان آدمیوں کے لیئے بہترین چیز سرد پانی ہی اور وہ جسم کو نہایت قوت بخشنے والا ہی۔سرد پانی سے نہانے سے قبل اگر جسم کسیقدر گرم ہو یا ہلکی ورزش سے گرم کرلیا جائے تو بہتر ہی۔البتہ جن اصحاب کے جسم میں قوت کم ہو وہ تازہ یا گنگنے پانی سے نہائیں مگر ہر روز کم سے کم ایک بار ضرور بالضرور نہائیں۔

گرمیوں میں تو نہانا سب کو اچھا معلوم ہوتا ہی اس لیے اُس زمانہ میں جتنی بار نہائیں اُس سے طبیعت خوش ہوتی ہی۔مگر دوسرے موسموں میں نہانے کے بہترین اوقات دو ہیں۔صبح کا وقت سرد پانی سے نہانے کا۔یہ جسم کو قوت بخشتا ہی اور شام کو تمام دن کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد جسم کا میل دھونے کے لیئے نہانا۔شام کو اگر سرد پانی ناگوار ہو تو تازہ نیم گرم پانی استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔کیونکہ اُس سے میل دُور ہوتا ہی۔

اور رات کو پھر باہر نکلنے کی ضرورت کم ہوتی ہی۔ہندوستان میں شام کے نہانے کو عام طور پر مخدوش سمجھا جاتا ہی مگر جن لوگوں کو شام کے وقت نہانے کی عادت

ہوجاتی ہے وہ اُس کے بدنی نفع کو خوب محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ تمام دن کی مشقت سے جلد پر جو میل جمع ہو کر مسامات کو بند کر دیتا ہے اُس کو دھو کر دور کر دینے سے جسم میں چستی اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

جدید تہذیب میں صابون کے استعمال کا بہت زیادہ رواج ہے۔ یہ اسقدر زیادہ مفید نہیں جس قدر کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اکثر صابون جسم میں خشکی پیدا کرتے ہیں اور جلد کو غیر محسوس نقصان پہونچاتے ہیں۔ اس لیئے بجز خاص صورتوں کے عام طور پر صابون سے بچنا چاہیئے۔ بلکہ پرانے زمانہ میں کھل وغیرہ سے جسم دھونے کا جو رواج تھا وہ غیر مضر ہے۔

بہرحال جہاں تک ممکن ہو مصنوعی چیزوں کے استعمال سے احتراز کرنا بہتر ہے۔

جلد کو ملنا نہانے کے بعد اور بالخصوص سرد پانی سے نہانے کے بعد جلد کو ہاتھوں سے رگڑنا نہایت مفید ہے۔ اگر جلد زیادہ خشک ہو تو کسی قدر وسلین ہاتھوں کو لگا لی جائے مگر جہاں تک خشک ہاتھوں سے جلد کو ملنے کی عادت کی جائے وہ بہتر ہے۔ جب تک عادت نہ ہو جلد کو ملنا بہت بھاری معلوم ہوتا ہے مگر تھوڑے دنوں کے ملنے سے اُس کا بدنی نفع محسوس ہونے لگتا ہے۔ تعجب ہے کہ انسان اپنے گھوڑوں اور دوسرے پالتو جانوروں کی جلدوں کو خوب صاف کراتے اور اُنھیں رگڑنے کے لیئے ملازم رکھتے ہیں۔ مگر خود اپنے بدن کی جلد کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ اُس پر چند منٹ کے لیئے ہاتھ پھیر کر اُس میں دوران خون پیدا کریں۔ جسم پر پھنسیاں، اور مسّے وغیرہ کچھ تو اندرونی غلاظت سے اور زیادہ تر جلد کے معطل اور نہ صاف رہنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں سے بچنے کے لیئے جلد کو خوب رگڑنا یا دوسرے شخص سے رگڑوانا چاہیئے۔ اگر ٹھنڈے پانی سے نہایا گیا ہے تو کھلی ہوا میں جلد کو رگڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جلد رگڑنا گردن سے شروع کر کے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان سے اور تلووں سے خوب میل اُتارنا چاہیئے۔ بالعموم پاؤں کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اُن کی صفائی اہتمام سے کی جائے حالانکہ وہ بھی جسم کے ایسے ہی اجزا

ہیں جیسا کہ مونہہ۔ اس لئے اُس کی صفائی بھی اسی توجہ کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ غرضکہ جسم کے تمام حصوں کو ملنے سے جسم میں خوب حرارت پیدا ہو جاتی ہی جو نہایت خوشگوار اور مفید ہوتی ہی۔ یہ تو جلد کو پانی سے دہونا ہوا۔ اب دو قسم کا غسل اور باقی ہی۔ ایک سرد ہوا کا دوسرے دہوپ کا۔ اوپر ذکر ہوا ہی کہ جلد کو سرد ہوا کی عادت ہونی چاہیئے اس کے لئے ضروری ہی کہ کسی ٹھنڈے وقت میں تمام جلد کو کچھ عرصہ کے لئے کھول دیا جائے جاڑوں میں بدن کھولنے سے لوگ بہت ڈرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُس سے زکام کھانسی اور نمونیا ہو جاتا ہی۔ حالانکہ یہ چیزیں اوّل نوجوان میں سمیت ہونے سے، دوم سرد ہوا کی عادت ہونے سے ہوتی ہیں۔ جس جلد کو سرد ہوا کی عادت ہی اُس کو بجائے نقصان کے سرد ہوا ہوا کا نفع پہونچتا ہی۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ سرد موسم میں بھی انسان کو علی الصباح یا کسی اور وقت جو مناسب ہو تمام بدن برہنہ کرکے سرد ہوا لگنے دینا چاہیئے۔ اور اُس حالت میں اگر کوئی ورزش کیجائے تو بہت مناسب ہی۔ سرد ہوا میں جلد خوب سکڑتی ہی اور یہ جلد کی ورزش ہی۔ جو لوگ ہر وقت اپنی جلد کو کپڑوں میں چھپائے رہتے ہیں وہ اُس کو بالکل معطل اور بیکار اور ذکی الحس کر دیتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ کھل جاتی ہی تو اُس سے طرح طرح کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ تیسرا غسل دہوپ کا ہی۔ یعنی یہ کہ تمام جلد پر دن میں ایکبار بالخصوص صبح کے وقت دہوپ پڑنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ جب دہوپ تیز ہو تو سر کو بچانا مناسب ہے۔ جاڑوں میں تو دہوپ خوشگوار معلوم ہوتی ہی۔ البتہ گرمیوں میں ناگوار ہوتی ہی مگر تھوڑی دیر کے لئے اُس کو برداشت کیا جائے تو فی الجملہ صحت کے لئے وہ مفید ہوتی ہی۔

کپڑا پہننا جلد کے سلسلہ میں کپڑے کا ذکر آنا لازمی ہی جو جلد کو چھپانے کے لئے ایجاد کیا گیا ہی۔ حساب لگایا گیا ہی کہ جس قدر تازہ ہوا پھیپڑے کھینچتے ہیں اس کا ایک ثلث انسان کی جلد اپنے باریک مسامات کے ذریعہ سے کھینچتی ہے۔ اگر کسی شخص کے جسم پر مٹی

کا لیپ کیا جائے جس سے اُس کے مسامات بند ہو جائیں تو اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔
اس سے ظاہر ہے کہ زندگی اور صحت کے لئے جلد کا کھلا رہنا بمقابلہ ڈھکے رہنے کے زیادہ
مفید ہے۔ مگر موجودہ تمدن کی وجہ سے چونکہ جلد کا چھپانا ضروری ہے اس لئے جہاں
تک ممکن ہو ہلکا کپڑا پہننا بہتر ہے۔ جو لوگ زکام اور سردی سے بچنے کے لئے زیادہ
سے زیادہ کپڑا پہنتے ہیں وہ ہر وقت خطرہ میں رہتے ہیں۔ اول تو زیادہ کپڑے سے
طبیعت افسردہ اور پژمردہ رہتی ہے کیونکہ جلد کے مسامات سے تازہ ہوا داخل نہیں
ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ جب ذرا بھی کپڑا علیحدہ ہوتا ہے تو جلد بوجہ اس کے کہ سست
ہوتی ہے کافی طور پر سکڑ کر سردی کو جسم میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی جس کا نتیجہ
بیماری ہوتا ہے۔ اسی طرح عمامہ اور گلوبند لپیٹنے سے سر اور گردن کی جلد ذکی الحس
ہو جاتی ہے۔ بھاری کپڑوں میں ایک اور نقص یہ ہے کہ تھوڑی حرکت سے انسان کو
پسینہ آجاتا ہے اور کپڑے کے اندر چونکہ وہ خشک نہیں ہوتا اُس کی نمی سے لوگوں کو
زکام اور بعض وقت نمونیا ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو ڈھیلا کپڑا پہننا چاہئے۔

پہلے زمانہ کی انگریزی کتابوں میں لکھا ہے کہ جلد سے متصل اونی کپڑا پہننا چاہیے
مگر جدید کتابوں میں تحریر ہے کہ جسم سے جو پسینہ نکلتا ہے وہ اون میں جذب نہیں ہوتا
اس لئے بعض وقت اُس سے سردی لگ جاتی ہے۔ اون کے مقابلہ سوتی کپڑے کو
اور سوتی کے مقابلہ ریشمی کپڑا اچھا سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ کپڑے کو بار بار بدلنا مفید ہے
اس سے یہ غرض نہیں کہ ہر بار کپڑا اتار کر دھویا جائے۔ نہیں بلکہ ایک دن استعمال ہونے
کے بعد دھوپ یا کم سے کم ہوا میں ڈال کر سکھا دیا جائے۔ غرضکہ کوئی کپڑا مسلسل چوبیس
گھنٹہ نہ پہننا چاہئے۔ بلکہ جو کپڑا دن میں پہنا جائے اُسے رات کو اُتار کر دوسرا پہن لیا
جائے۔ غریب آدمی بار بار کپڑا نہیں دھلا سکتے۔ اس لئے اس میں آسانی ہے کہ وہ ایک
بار دو جوڑے نکال لیں اور انھیں بدلتے رہیں تاکہ پسینہ سوکھتا رہے۔ جب کسی کپڑے

میں پسینہ کی بو آنے لگے تو پانی کے ایک لوٹہ میں دھو کر سکھالیں اس طرح یہ دو جوڑے ہفتہ بھر اور اس سے زیادہ تک نہایت صفائی اور ستھرے پن سے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

کپڑے کا رنگ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ کفایت کے لئے سیاہ یا دوسرے گہرے رنگ کا کپڑا پہنتے ہیں تاکہ میلا نہ ہو۔ مگر سیاہ کپڑے میں یہ نقص ہے کہ اس میں گرمی کی شعاعیں داخل ہو کر تکلیف دیتی ہیں اور مضر ثابت ہوتی ہیں اور روشنی کی کرنیں جو جلد کے لئے مفید ہیں جلد تک نہیں پہونچ سکتیں۔ اس لئے سفید کپڑا نہ صرف گرمیوں میں بلکہ جہاں تک ممکن ہو جاڑوں میں بھی استعمال کرنا چاہیئے تاکہ حرارت کی شعاعیں اس میں داخل نہ ہو سکیں اور روشنی کی کرنیں داخل ہو کر جسم کے لئے مفید ثابت ہوں۔ اکثر لوگ جاڑوں کے کپڑوں کو اس وجہ سے کہ وہ خراب نہ ہو جائیں کبھی نہیں دھلواتے۔ حالانکہ ان میں بھی میل جمع ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کم سے کم سال میں ایک بار گرم کپڑوں کو دھلوا کر صاف کرایا جائے۔ چونکہ اس زمانہ میں موزوں کا رواج زیادہ ہے اس لئے ان کی نسبت اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ بالخصوص ان لوگوں کو جن کے پاؤں میں پسینہ آتا ہے بار بار موزوں کو خود دھولینا چاہئے۔ میلے موزوں کو سونگھ کر دیکھئے تو وہ ٹھنڈے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے پسینے میں زکام کا اندیشہ رہتا ہے۔ اول تو جہاں تک ممکن ہو پاؤں کو کھلے رہنے کا عادی بنانا چاہئے اور سردیوں کے دوسرے موسم میں موزے استعمال کرنا چاہئیں۔ تاہم اگر موزے پہنے جائیں تو انھیں ایک دو دن کے استعمال کے بعد خود یا اپنے نوکر سے دھلوا دینا چاہئے اور دھوبی کے آنے کا انتظار نہ کرنا چاہئے۔

اسی طرح رات کو سونے میں بہت بھاری کپڑوں کی عادت نہ ڈالنی چاہئے۔

منہ کی صفائی اسی سلسلہ میں منہ کی صفائی کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ غذا جو جسم میں داخل ہوتی ہے اس کا دروازہ منہ ہے۔ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ جو چیز

اس کے جسم میں داخل ہو وہ صاف ستھری خوشبودار ہو جس چیز میں ذرا بھی بدبو ہوتی ہے اسے جسم میں داخل کرنا کوئی شخص بھی گوارا نہیں کرتا۔ مگر بہت کم لوگ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے منہ کو غلاظت سے اس لئے پاک رکھیں کہ جو غذا اس میں سے گذر کر جسم میں داخل ہوتی ہے وہ غلیظ نہ ہو جائے۔ کوئی شخص اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کھانے کو منہ میں داخل کرنے سے قبل کسی غلیظ چیز میں لپیٹ دیا جائے مگر اس بات کو اکثر لوگ گوارا کر لیتے ہیں کہ اپنے بدبودار منہ کے لعاب میں اور سڑے ہوئے دانتوں کے جمع شدہ میل میں غذا کو ملا کر حلق کو اتارا جائے جس سے کثیف خون پیدا ہوتا ہے پس ضرورت ہے کہ منہ صاف رکھنے کے جتنے طریقے ممکن ہیں انہیں اختیار کیا جائے دانتوں کو صاف رکھنا چاہئے اور سڑے ہوئے دانتوں کو نکلوا دیا جائے۔ یہ نہایت ضروری ہے۔

طفیل احمد

وزیر تعلیمات صوبہ پنجاب کی تشریف آوری برین مڈل سکول قصبہ نوح ضلع گوڑگانوہ میں

۲۷۔ مارچ کو دس بجے دن کے آنریبل میاں فضل حسین وزیر تعلیمات پنجاب گوڑگانوہ میں تشریف لائے۔ ریلوے اسٹیشن پر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر معہ دیگر حکام اور معززین ضلع کے استقبال کے واسطے موجود تھے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے استقبال کنندگان کا وزیر صاحب سے تعارف کرایا بعد ازاں وزیر صاحب کو ان کے فرودگاہ پر لے گئے۔ ۲ بجے سے ۴ بجے تک لوگوں سے ملاقات کا وقت تھا۔ ۴ بجے سے ۶ بجے شام تک فٹ بال کرکٹ

بورڈ و میونسپل بورڈ اور مڈیکل ڈیپارٹمنٹ کی زیر تجویز مثلوں پر ڈپٹی کمشنر صاحب سے گفتگو اور شام کے ۹ بجے سے مثلوں کے متعلق موقعوں کا معائنہ کیا گیا۔ ۲۸۔ کو وزیر صاحب دس بجے دن کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے ہمراہ نوح تشریف لے گئے۔ ۱۱ بجے سے ۲ بجے دن تک ڈسٹرکٹ بورڈ کی میٹنگ تھی۔ ۲ بجے سے ۴ بجے تک لوگوں سے ملاقات کا وقت تھا اور ۴ بجے سے ۶ بجے شام تک قوم میو اور برین میو اسکول کی طرف سے ایڈریس اور میو اسکول کی عمارت کا سنگ بنیاد نصب کرنے کی رسم ادا ہوئی۔ ان تقریبات میں شرکت کی غرض سے سپرنٹنڈنٹ دفتر اور جائنٹ سکرٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ مدعو کئے گئے تھے۔ آنریری جائنٹ سکرٹری شریک نہ ہو سکے۔ سپرنٹنڈنٹ دفتر کانفرنس ان تقریبات میں شریک ہوئے اور جلسہ سے قبل برین میو اسکول کی ضرورتوں کے متعلق وزیر صاحب سے گفتگو کی اور ان کو بہت ہمدرد پایا۔ بعد ازاں برین میو اسکول کی طرف سے ایڈریس پیش ہوا جس میں بیان تھا کہ مدرسہ علاوہ قوم میو کے ہر قوم کے لڑکوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان تعلیم دیتا ہے۔ بورڈنگ ہوس میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے طلبا رہتے ہیں اور دینی تعلیم کا بھی ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لئے برابر انتظام ہے اور شاید اس آخری خصوصیت کی مثال ہندوستان کے کسی دوسرے قومی یا سرکاری مدرسہ میں ابھی تک موجود نہیں ہے۔ معافی فیس میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے طلبا کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔

ایڈریس میں مدرسہ کی حالت بیان کرنے کے بعد برین میو اسکول کو سررشتہ تعلیم کی طرف سے باقاعدہ مدرسہ تسلیم ہونے، مستقل سرکاری امداد ملنے، ڈسٹرکٹ بورڈ کی موجودہ امداد برقرار رہنے اور عمارت کے واسطے یک مشت چالیس ہزار روپیہ عطا ہونے کی درخواست کی گئی تھی۔

ایڈریس کے جواب میں وزیر صاحب نے مدرسہ کی حالت پر اطمینان اور سب قوموں کے طلبا کے ساتھ یکساں برتاؤ ہونے پر اظہار مسرت کیا۔ ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کی ملک

کی ترقی کے لئے ضروری بتایا اور کہا بقول مسٹر ایڈرسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کچھ عرصہ سے کسی مدرسہ کی خوبی کا اندازہ زیادہ تراس کی ظاہری نمائش کی چیزوں سے کیا جاتا ہے اور اس کی تعلیم و تربیت کا چنداں لحاظ نہیں کیا جاتا حالانکہ مدرسہ کی اصلی خوبی کا اندازہ اس کے طلباء کے کیرکٹر یعنی چال چلن سے ہونا چاہئے۔ امید ہے کہ یہ مدرسہ اپنے طلباء کے کیرکٹر کا زیادہ لحاظ رکھے گا۔

وزیر صاحب نے سوائے مدرسہ کی عمارت کے واسطے مبلغ چالیس ہزار کی یک مشت رقم کے باقی سب درخواستوں کو منظور کرنے کا وعدہ کیا۔ ایڈریس کے جواب میں مفصل اور معقول تقریر کرنے کے بعد وزیر صاحب نے مدرسہ کا سنگ بنیاد نصب کیا اور مغرب کے وقت جلسہ برخاست ہوا دس بجے شب کے وزیر صاحب بمعیت ڈپٹی کمشنر صاحب بلب گڈھ ضلع گوڑگانوہ تشریف لے گئے۔ بریں منوال اسکول کا جلسہ ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔

ولایت حسین

ہندوستان میں

دس سالہ ترقی تعلیم

روس کے سلسلہ میں ہندوستان کی دس سالہ ترقی تعلیم پر سرسری نظر ڈالنا بھی کچھ بے موقعہ نہ ہوگا۔ ہمارا ماخذ حکومت ہی کا ایک جریدہ ہے یعنی مارٹن صاحب کمشنر مردم شماری گذشتہ ایک مبسوط اور جامع روداد طیار کر رہے ہیں جو بعض خصوصیات کے لحاظ سے فن مردم شماری میں آپ اپنی نظیر ہوگی۔ اس کا ایک دلچسپ خلاصہ ۲۳ فروری کے جلسہ میں رائل سوسائٹی میں لندن میں پیش ہوا ہے۔ جس پر بحصہ

لندن ٹائمز نے بھی تبصرہ کیا ہے۔ یوم شمار سے ۱۵ روز کے اندر ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا تھا کہ مارچ ۱۹۲۱ء کو مملکت ہند میں کل نفوس کی تعداد ۳۱۹۰۰۰۰۰۰ تھی اس حساب سے گویا بیسویں صدی کے عشرہ دوم میں عشرہ اول سے بقدر ۲ء۱ کے اضافہ ہوا (عشرہ صدی = ۱۰ سال) کمشنر نے گوشوارہ آخر میں بعض نہایت دلچسپ مدات قائم کر کے بہت سے اہم نکتے بتائے ہیں لیکن ہمیں صرف تعلیم کے ذیل میں خواندہ آبادی کی مد سے سروکار ہے اس لئے کہ ہندوستان کی حکومت اعلیٰ اپنے تمام اعضاء و جوارح سمیت بہت مدت سے تعلیم کی اشاعت میں جد و جہد کر رہی ہے۔ چنانچہ صاحب کمشنر کے گوشوارہ سے ذیل کی جدول مستخرج کی گئی ہے جس میں ۹ برس سے زیادہ کے عمر کے خواندہ افراد کی تعداد بحساب فی ہزار دکھائی گئی ہے۔

خاتمہ عشرہ صدی	مرد	عورت	میزان
۱۹۰۱	۱۲۹	۹	۱۳۸
۱۹۱۱	۱۴۰	۱۳	۱۵۳
۱۹۲۱	۱۶۱	۲۳	۱۸۴

ظاہر ہے اور صاحب کمشنر کو بھی تسلیم ہے کہ یہ تعداد کچھ زیادہ قابل فخر نہیں ہے اس لئے کہ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کا نصاب باقاعدہ ہو یا بے قاعدہ نسبتاً زیادہ سہل اور سادہ ہے۔ لوازم تعلیم بھی ارزاں اور ہر کس و ناکس کے دسترس میں ہیں اور قابل تعلیم افراد کی تعداد بھی اس گذشتہ عشرہ میں عشرہ پیوستہ سے ملک بھر میں زیادہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں ۴۳ لاکھ ۵۸ ہزار طلبہ تقریباً زیر تعلیم رہے لیکن شمار کے وقت یہ تعداد اس لئے گھٹی کہ مردم شماری کے اصول کے مطابق تعلیم یافتہ کم سے کم اتنا ہو کہ معمولی خط لکھ پڑھ سکے اور حال یہ ہے کہ اس قدر مہیب تعداد کے طلبہ زیر تعلیم میں سے اکثر افلاس و ناداری سے مجبور ہو کر معمولی

شدید حاصل کیے۔ یہ مدرسے سے مکمل آئے ان میں اتنی قابلیت بھی نہ پیدا ہوئی کہ معمولی چٹھی لکھ پڑھ سکیں۔ اس لیے خواندہ شمار نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں سنہ ۱۹۱۸ء کے عالمگیر انفلوینزا نے تقریباً سوا کروڑ نفوس کو فنا کر دیا۔ ان میں اکثر نوعمر ہی تھے بہرحال دنیا بھر کے ممالک کو پیش نظر رکھکر دیکھا جائے تو ہندوستان تعلیم کے کمیت میں یا انداز سے بھی بہت نیچے نظر آتا ہے۔ مگر مقام شکر ہے کہ ہم نے کچھ تو ترقی کی۔ خواہ قدرت کی وضع کے مطابق کی یا حکومت کی توجہ سے کی۔ اتنا بھی غنیمت ہے۔

یہ تو مجموعی ترقی کا حال ہے۔ صوبہ وار کی جدولیں بھی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتیں۔ برما کی آبادی میں اگرچہ پچاس فی صدی مرد خواندہ ہیں لیکن یہ جدید نظام تعلیم کی حسن سعی کا نتیجہ نہیں بلکہ بدھ مذہب کے قدیم پاٹ شالوں کی برکت معلوم ہوتی ہے جن کی تعداد تقریباً تمام دیہات میں نسبتاً زیادہ ہے۔ اکثر والدین مذہبی تعلیم کے شوق میں اپنے بچوں کو ان مکتبوں بھیج کر تعلیم دلا دیتے ہیں۔ بنگال اور مدراس میں خواندہ مرد صرف ۱۰ فی صدی ہیں۔ احاطہ بمبئی میں اتنے بھی نہیں۔ ریاست بڑودہ کی خواندہ مردم شماری دیکھکر عبرت ہوتی ہے یہاں تقریباً تیس سال سے جبری اور مفت تعلیم کا غلغلہ سن رہے ہیں دربار کی حسن سعی میں بھی کچھ کمی نہیں لیکن نتائج تعلیم توقع سے اس قدر کم ہیں کہ پاس کے سرکاری علاقہ میں گجرات بھی بڑودہ سے بڑھ گیا ہے۔ جیسا کہ بیس سالہ جدول ذیل سے واضح ہوگا۔

عشرہ	بڑودہ		گجرات		فی ہزار
	مرد	عورت	مرد	عورت	
سنہ ۱۹۰۱ء	۱۶۳	۸	۲۰۶	۱۶	
سنہ ۱۹۲۱ء	۲۱۰	۴۰	۲۲۳	۴۲	

اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں اور ضرور ہیں تو ہمیں بادل ناخواستہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ

ہندوستان وہ ملک ہے کہ جب تک اس سے ہندوستانیت دور نہ ہوگی تب تک جبری تعلیم کے نفاذ سے خواندہ مردم شماری زیادہ نہ ہوگی۔ قابل تعلیم عمر کے بچے فیصدی کتنے ہی زیادہ تعداد میں مدرسوں میں نہ بھیجیں پھر بھی یہ لازمی نہیں کہ قوم میں اشاعت تعلیم کا یہی ایک مستحکم ذریعہ ہے۔ مسٹر سیجوک کمشنر مردم شماری احاطۂ بمبئی نے تو اس مسئلہ پر ایک طول طویل بحث کر کے فلسفیانہ نتائج نکالے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہم نتیجہ یہ ہے کہ مفت اور جبری تعلیم کے نفاذ سے بڑودہ میں صرف یہ فائدہ ہوا کہ اعلیٰ طبقہ نے اپنے بچوں کو بغیر کسی خاص مقصد یا ضرورت کے خوب تعلیم دلائی۔ ادنیٰ طبقہ کے افراد پہلے کی طرح جاہل اَن پڑھ ہی رہے بلکہ بچوں کی غیر حاضری کے جرمانے ادا کر کے انھوں نے الٹا نقصان برداشت کیا۔ صاحب کمشنر کا غالباً یہ مطلب ہے کہ جب تک کسی قوم کو تعلیم کی اشد ضرورت محسوس نہ ہوگی، اور انھیں حقیقی ذوق و شوق پیدا نہ ہوگا تب تک جبری تعلیم کے نفاذ کے باوجود ادنیٰ اعلیٰ تمام جماعتوں میں اشاعت تعلیم مشکل ہے۔ درحقیقت یہ مسئلہ سرسری طور پر فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر فن تعلیم کے ماہروں کو غور کرنا چاہیے۔

تعلیم کی عام ترقی میں عورتوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ طفولیت سے اونچی عمر کی لڑکیوں اور عورتوں کی تعداد فی ہزار ۱۳ سے ۴۲ تک ترقی کر گئی۔ اور عام لکھی پڑھی عورتوں میں ۲۰.۵ سے ۴۰.۴ فی ہزار تک کا اضافہ ہو گیا۔ ٹراونکور اور اجین میں بڑودہ سے زیادہ ترقی ہوئی۔ ٹراونکور میں جہاں عیسائی زیادہ ہیں عورتیں ۱۰ فی صدی لکھنا پڑھنا جانتی ہیں مگر حیدرآباد میں پوری ایک فیصدی بھی تعلیم یافتہ عورتیں نہیں ہیں۔ اب کے تعلیم نسواں میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اٹل بے جوڑ ترقی ہوئی یعنی گذشتہ بیس برس کے اندر فی ہزار ۱۴۷ سے ۲۱۰ تک عیسائیوں نے ۵ سے ۱۶ تک ہنود نے ۴ سے ۹ تک مسلمانوں نے ترقی کی۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ صوبہ جات متوسط۔ بہار۔ آڑیسہ۔ راجپوتانہ ایجنسی۔ کشمیر حیدرآباد اور ہندوستان کے شمالی صوبوں میں ترقی کی رفتار بہت سست ہی۔ یہ وہ حصص ملک ہیں جہاں مسلمان نسبتاً زیادہ ہیں۔ اور ان کی طرح اور قومیں بھی جو تعلیم میں پست ہیں آباد ہیں۔ عیسائی آبادی نے تمام مدارج عمر میں گذشتہ بیس برس کے اندر تعلیمی ترقی صرف اس حد تک کی کہ ۲۷۵ سے بڑھکر ۲۰۵ فی ہزار ہوگئی۔ یہ کچھ زیادہ نمایاں ترقی نہیں پھر بھی ہندوؤں سے ہوگئی اور مسلمانوں سے بیچ گئی ترقی ہے سکھوں نے گذشتہ عشرہ میں تعلیم میں تنزل کیا یعنی پہلے ۷۷ فی ہزار تعلیم یافتہ تھے اب صرف ۶۸ رہ گئے۔ ان کی آبادی تقریباً ۳۲ لاکھ پچاس ہزار ہی۔ ابوالحسنات

پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

ہمیں بیحد مسرت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ملک میں سیاسی ہیجان کے بجائے اب ہر طرف تعلیمی جذبات دوچند قوت سے ہر طرف پھر ابھرتے آتے ہیں۔ حقیقت میں ہر ایک چھوٹی بڑی رہنورد قوم کے لئے تعلیم ہی ایک توشہ ہے اور یہی ایک خیرالزاد التقوی ہے۔ بغیر اس کے سیاست اور سیاسی حریت کا دشوار گذار میدان ایک قدم بھی طے نہیں ہوسکتا چنانچہ زندہ دلان پنجاب نے اپنے ہاں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بصدارت جناب مسٹر عبداللہ ابن یوسف آئی۔ سی۔ ایس حسب معمول بمقام لاہور بڑی دھوم دھام سے اپریل کے پہلے عشرہ میں منعقد کرکے دس تجاویز بالاتفاق منظور کیں۔ جن کی بنیاد جداگانہ حق انتخاب و نمایندگی کے متعلقہ مسائل پر تھی۔ خطبۂ صدارت جیسی کہ ہمیں صدر سے توقع تھی نہایت شاندار تھا جس میں جناب صدر نے بجا طور پر زندہ دلان پنجاب کی تعلیمی سرگرمی اور افضلیت کا اعتراف کیا اور انھیں تعلیمی رستخیز میں گویا ملک بھر کے مسلمانوں کے

پیش پیش قرار دیا ہے۔ نیز مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ قومی کاموں کو تنظیم اور ترتیب کے ساتھ انجام دیا کریں یہ عادت اچھی نہیں کہ کسی ایک فرد واحد کو بعض فضائل کی بنا پر امام بنا کر تمام جماعت بلا احساس فرائض اور جذبۂ عمل اس کی اندھا دھند تقلید کرتی چلی جائے۔ نہ اسے اپنی حیات ملی اور منزلی گی کی ح... سے آگاہ کرے اور نہ رائے زنی سے مفید مشورہ دے۔ اس کا ہمیشہ ایک ہی نتیجہ ہوتا ہے یہ کہ اس ایک شخص کی افتاد کے ساتھ ساری جماعت از پا افتادہ ہو جاتی ہے اس لئے قوم اور جماعت کے ہر فرد میں جوش عمل۔ احساس فرض اور قوت فیصلہ ہونی چاہئے۔

خطبہ صدارت میں دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنا تعلیمی اُفق اور زیادہ وسیع کرنا چاہئے جس کا غالباً یہی مطلب ہے کہ ادیان کی تعلیم کو چند موٹے موٹے مذہبی فرائض وارکان کے تنگ دائرہ سے نکال کر حق وصداقت اور اخلاقی محاسن تک وسیع کیا جائے اور علم الادیان کے حصول کا مقصد محض پیٹ پالنا اور تن ڈھکنا ہی نہ سمجھا جائے در حقیقت یہ ایک زریں مشورہ ہے لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس بلند مقصد تک پہنچنے کا کوئی خاص ضابطہ یا طریقہ کیونکر میسر ہو سکتا ہے ہم اہل پنجاب کے ممتاز اکابر سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اسے ایک مستقل اور جداگانہ موضوع قرار دے کر اہل علم وقلم اور ماہران فن سے مبسوط رسالے لکھائیں۔ اور کھول کر بتائیں کہ المعارف الاسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) اور علوم دینیہ کو کیونکر اور کس طرح وسعت دیکر زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق کیا جائے۔ یہ ایک نہایت پر پیچ مسئلہ ہے لیکن مجملاً کہا جا سکتا ہے کہ جب تک دینی اور دنیوی تعلیم کے مدارس ملکر ایک نہ ہو جائیں گے تب تک کامل الفن انسان قوم میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ حالت موجودہ جس میں دو رخے تعلیم یا فتوں کے بجائے یک

رشتے عالم و علامہ پیدا ہوتے ہیں کبھی قوم کو منزل مقصود پر نہیں پہنچا سکتے۔ تمام عربی مدارس میں علوم مغربیہ کی تعلیم کا اور تمام مغربی تعلیم گاہوں میں علوم والسنہ مشرقیہ کا دخل ہونا چاہئیے۔ اسلام نے دین اور دنیا کی تعلیم کو کبھی الگ الگ نہیں کیا۔ نہ اس کی بنیاد اس تفرقہ اندازانہ اصول پر قائم ہوئی ہے۔

جناب صدر نے خطبہ میں جس قدر تاریخی شواہد اس بارے میں پیش کی ہیں وہ سب الف سے ی تک ان تعلیم گاہوں سے وابستہ ہیں جن میں دین اور دنیا دونوں کی تعلیم ایک ساتھ دی جاتی تھی۔

پانچویں صدی ہجری کے اخوان الصفا اور اس کے زریں کارنامے قرطبیہ اور اشبیلیہ کے کوثر علوم اور ابن رشد جیسے ساقی۔ سلطان محمد الثانی الفاتح قسطنطنیہ کی جامعہ عثمانیہ جو مدارس الثمانیہ سے موسوم تھی۔ سلیمان ذی شان کے علمی خدمات ان سب کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ صرف ہندوستان میں انیسویں صدی کے ربع آخر کے اندر علوم اور تعلیم گاہوں کے دو ٹکڑے ہوئے۔ دین الگ اور دنیا الگ۔ چہرہ کا بایاں رخسار الگ اور دایاں الگ ہو گیا۔ اس سے پہلے تیرہ سو برس کی تعلیمی ترقی کی تاریخ میں ایک صفحہ بھی ایسا نہ ملیگا جہاں ناخن اس طرح گوشت سے الگ ہو گیا ہو۔

بہر حال معزز صدر کے خطبہ صدارت کے اس حصہ پر سرسری نظر ڈالنے سے جو کچھ خیالات اول دل میں پیدا ہوئے وہ یہ ہیں کہ زندہ دلان پنجاب اس مسئلہ کو بھی ایک بحث عام بنائیں کہ کیا دونوں قسم کی تعلیم گاہوں کے ایک ہو جانے سے تعلیم کا افق زیادہ وسیع نہ ہوگا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اہل مصر نے اپنی عام تعلیم گاہوں کے دو ٹکڑے نہیں کئے صرف ایک جامعہ ازہر ایک قدیم علوم والسنہ مشرقیہ کا خالص نمونہ بطور آثار قدیمہ موجود ہے۔ ترکی میں تعلیمات کی گویا کایا پلٹ گئی۔ ایران نے بھی اب پرانا ڈھرا چھوڑ دیا ہے

افغانستان کا تعلیمی انقلاب ایک زبردست مثال ہے۔ ہندوستان میں سرسید نے بھی علی گڑھ کو اسی اصول پر تعلیم جدیدہ کا مرکز بنایا تھا۔ خلاصہ یہ کہ

شداں مرغ کو بیضہ زریں نہاد
زمانہ دگرگونہ آئین نہاد

دنیا کا چپہ چپہ اس انقلاب عظیم سے متاثر ہے مگر یہاں لاونعم کی بحث نہیں بلکہ بحث یہ ہے کہ اس برگزیدہ مقصد تک پہنچنے کا راستہ کدھر سے شروع ہوتا ہے۔ پرواز کس طرح اٹھائیں۔ اور کیونکر قدم بڑھائیں۔ کیا زمانہ جدیدہ کا مقبول عام لباس پہننے سے یہ مقصد حاصل ہوگا یا طرز معاشرت۔ سکونت و غذا بدلنے سے۔ عقائد بدلنے سے حاصل ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس وقت قوم کی ضروریات جدید نظریئے قائم کرنے سے یا اصولی نصیحتوں سے پوری نہیں ہو سکتیں اب تو یہ وقت ہے کہ ضابطہ عمل بنائیں۔ اور کرکے دکھادیں۔ زندگی کی شرطیں اس قدر سخت ہو گئی ہیں کہ قوم کا ادنیٰ بلکہ متوسط طبقہ بھی رفاہ عام کی تدبیریں سوچنے کی فرصت نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک طوفان خیز تلاطم میں گاہ بگاہ اکابر قوم سے چشم داشت رکھتا ہے کہ انہیں نظام عمل مہیا کر دیا جائے۔ اور ایک جیتی جاگتی مثال ان کے پیش نظر رکھدی جائے۔

مجال دیدہ کشودن دریں غبار کجاست
مگر کہ از تنگ و تار آسماں بیاساید

کہفی

حکیم فسطالوز

جان ہنری پیسٹا لوزی جسے آج ہم ناظرین سے حکیم فسطالوز کے نام سے متعارف کرتے ہیں۔ ملک سوئٹزرلینڈ میں قصبہ زوریچ کا رہنے والا تھا۔ اصلی وطن تو اطالیہ میں تھا مگر تقریباً دو سو برس سے اس کے آباد اجداد ترک وطن کر کے زوریچ میں آباد ہو گئے تھے۔ فسطالوز کا باپ اپنے زمانہ کا مشہور شخص جراحی اور طبابت میں عمدہ مہارت رکھتا تھا۔ لیکن بدبختی اور تنگدستی نے عمر بھر ساتھ نہ چھوڑا آخر ۳۳ برس کی عمر میں تین بچے اور ایک بیوہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوا فسطالوز نے افلاس میں پرورش پائی۔ زیادہ تر اسی وجہ سے اس میں غیر معمولی ہمدردی اور دلسوزی اور رحم و خدمت خلق اللہ کی صفتیں پیدا ہوئیں۔ یہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے مغربی دنیا کو بیدار کر کے بچوں کی اصل حقیقت اور ان کے قدرتی حقوق سے سوسائٹی کو آگاہ کیا اور پادریوں کے جابرانہ فتووں کے خلاف اس نے بچوں کو صلہ رحم۔ پاک خلقت اور عزیز الوجود ثابت کیا۔ نہ صرف بالمستقبل بلکہ بالفعل۔ چنانچہ حکیم فسطالوز کو مغربی دنیا میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق خاص شہرت حاصل ہے اس کے ملفوظات و مکتوبات پر آج تک نقد و تبصرہ ہوتا رہتا ہے اس کے چند اصول تعلیم و تربیت ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ قوم کی ایک نسل خواہ کتنی ہی جدوجہد کرے لیکن حیات کے کسی شعبہ میں وہ اپنے اسلاف کی شرائط زندگی سے بلند نہیں ہو سکتی۔ نہ مالی حیثیت سے نہ جسمانی قوت یا ذہنی فضائل میں۔ جو حال اسلاف کا ہوگا تقریباً وہی اخلاف کا رہیگا ترقی کی راہوں میں جو مشکلات اور مزاحمتیں ان کو پیش آئی ہیں وہ ان کو بھی آئیں گی۔ غیر معمولی وسائل ترقی کا یک بیک پیش آکر کوئی خلاف توقع مدد دینا اور

اخلاف کو اسلاف کی حیثیت سے بلند کر دینا اتفاقیہ ہے نہ کہ اکثر یہ بالکلیہ حقیقت ہیں جس طرح پانی اپنی قدرتی سطح سے بلند نہیں ہو سکتا اسی طرح قوم کی موجودہ نسل گذشتہ نسل سے معمولاً زیادہ خوشحال اور خوش نصیب نہیں ہو سکتی۔

۲۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچوں کو ایسی تعلیم و تربیت دینا مناسب ہے جو ان کی خاندانی زندگی کے حسب حال ہو مثلاً افلاس اور تنگدستی میں بسر کرنے والے گھرانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ غریبانہ زندگی بسر کرنے کے قابل رہیں۔ انھیں امیرانہ زندگی کے لئے طیار کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ تاہم اس زمانہ میں ذمہ داران تعلیم کی نظر اس اصول پر نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غریبوں کے بچے عیاش بن جاتے ہیں اور عمر بھر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ عام مدارس جفاکش اور محنتی طلبہ طیار نہیں کرتے بلکہ احدی طیار کرتے ہیں جنھیں محنت و مشقت کی عادت نہیں ہوتی۔ نہ اس درجہ کا استقلال اور صبر پیدا ہوتا ہے کہ سوء اتفاق اور ناکامی کا مقابلہ کر سکیں۔ غربا کے بچوں کے لئے بہترین تعلیم دستکاری کے مدارس میں دینی چاہیے۔ ان کی پہلی مکتب گھر ہو چاہیے کہ انہیں ۷ برس کی عمر سے گھر کے کاموں کی عادت ڈالی جائے اور محنت و مشقت سے آشنا کر کے دستکاری کے مدارس میں بھیجا جائے۔ اس طرز تعلیم سے یہ لازم نہیں کہ اخلاقی تعلیم نظر انداز ہو جائے گی۔ اخلاقی اور روحانی تعلیم لکھی ہوئی کتابوں کے لفظوں میں چھپی ہوئی نہیں ہے اور نہ کتابی تعلیم سے آ سکتی ہے بلکہ اخلاق و روحانیات تو انسان کی رگ و پے میں اس کے اعضا و جوارح میں مخفی ہیں۔ چاہیے کہ ان چھپی ہوئی صفتوں کو مشق سے باہر نکالیں اور بچوں کو خود نمونہ بنکر دکھلائیں۔ دل کی رہنمائی دل ہی سے ہو سکتی ہے اگر اتالیق صاحب دل ہے تو کیسا ہی گم گشتہ بچہ ہو ضرور سیدھے راستہ پر آ جائیگا۔

۴۴۔ تعلیم کا راستہ فطرت کا راستہ ہے یعنی فطرت نے طریقۂ تعلیم کو خود قائم کیا ہے جیسے جیسے بچوں کے دل و دماغ کی طاقتیں منکشف اور ترقی پذیر ہوتی جاتی ہیں ویسے ویسے تعلیم بھی بڑھتی جاتی ہے پس چاہئے کہ بچوں کو ان کی سمجھ سے بڑھ کر باتیں نہ بتائیں۔ میدان زندگی کے ان حصوں کا نظارہ کرانا جو ابھی دور ہیں بالکل لاحاصل ہے۔ نہ انھیں الفاظ کی بھول بھلیاں میں ڈال کر بدحواس کر دینا مناسب ہے۔ جب وہ عمر کے اس درجہ میں پہنچیں گے اور مادۂ تعقل میں اس حد تک پختگی آجائے گی تو وہ اپنے محسوسات اور متمسکات کو خود سمجھیں گے الفاظ اور اسمار انھیں خود آجائیں گے (بشرطیکہ وہ گونگے اور بہروں کی صحبت میں نہیں ہیں) اصل میں بچوں کی استعداد اور قوائے دماغیہ کو موقعہ دینا چاہئے کہ مشق استعمال سے خود ترقی کریں۔

اقتباس

رسالہ جامعہ گذشتہ جنوری سے جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے ایک ماہوار رسالہ جامعہ کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا ہے، لیکن ابھی صرف ایک ہی نمبر شائع ہوا ہے جو مع ٹائیٹل پیج ۶۰ صفحہ کا ہے، کاغذ سفید دبیز استعمال کیا گیا ہے لکھائی چھپائی بھی قابل اطمینان ہے، مضامین کے لحاظ سے یہ ایک علمی اور نیم سیاسی رسالہ ہے، جو مجموعی حیثیت سے مفید و دلچسپ ہے، منجملہ دیگر مضامین کے ایک دلچسپ مضمون بعنوان "سیاسی انقلابات کا اثر علوم ایران پر" شائع ہوا ہے جو عمدہ معلومات پر مشتمل ہے امید ہے کہ رسالہ حسن قبول کریگا۔

سلسلہ جدید جلد ۱ — رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۲۰ — مئی سنہ ۱۹۲۳ء
نمبر ۱۱ — شوال سنہ ۱۳۴۱ھ

کانفرنس گزٹ

یعنی

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

جس میں

مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصول تعلیم، نظام تعلیم مروجہ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر
تنقید کی جاتی ہی

زیر نگرانی

عالی جناب نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبد السلام
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوکر
اور دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڈھ سے شائع ہوا

فہرست مضامین

		صفحہ
(۱) شذرات	ایڈیٹر	۱
(۲) ابتدائی نصاب کی چند خصوصیات	مولانا ابوالحسنات قریشی	۹
(۳) بیمہ حیات اور مسلمان	مولانا سید طفیل احمد صاحب آنریری جائنٹ سکریٹری کانفرنس	۱۹
(۴) اقوام عالم میں مسلمانوں کا درجہ	مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی حیات نگار کانفرنس	۲۴
(۵) سادگی اور صحت	مولانا سید طفیل احمد صاحب موصوف	۳۰
(۶) مدراس کی پنجسالہ تعلیمات پر تنقیدی نظر	مولوی حامد علی صدیقی لٹریری اسسٹنٹ کانفرنس	۳۳
(۷) یاد رفتگاں	ایضاً	۴۵
(۸) ٹرکی کا نظام تعلیم	سید محمد زبیر	۴۶
(۹) فہرست انعامات خوش خطی صوبہ متحدہ		۵۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آیندہ سالانہ اجلاس کا انعقاد مسلمانان منٹگمری کی استدعا پر آخر الذکر مقام میں ہونا قرار پایا ہے اور آیندہ غالباً ہر سال اسی مہینہ میں انعقاد جلسہ ہوا کریگا۔ منٹگمری میں انعقاد کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اسلامیہ ہائی اسکول منٹگمری کے متعلق کوئی بورڈنگ ہاؤس نہیں۔ یہہ مقامی اکابر سے کچھ بھی بعید نہیں اسلئے کہ منٹگمری پنجاب کا ایک زرخیز اور دولتمند ضلع ہے حقیقت یہ ہے کہ کوئی تعلیم گاہ بورڈنگ ہاؤس بغیر تعلیم کی تکمیل نہیں کرسکتی۔ طلبہ کے دل و دماغ پر چوبیس گھنٹے پرورش گاہ علم کی آب وہوا میں رہنا خاص اثر رکھتا ہے۔

اسٹینڈنگ کمیٹی نے اس اہم مسلہ کے علاوہ ۲۱ ممبر اپنے زمرہ سے منتخب کرکے ایک ورکنگ کمیٹی ترتیب دی ہے جس میں چودھری عبدالحق صاحب بیرسٹر و پریسیڈینٹ میونسپل کمیٹی فیروزپور نیز شیخ محمد امین صاحب رئیس و تاجر قصور بھی شامل ہیں۔ ۲۹ اپریل

کا یہ پہلا جلسہ اسٹینڈنگ کمیٹی خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا۔

علمی مصطلحات بچوں کی اصل و حقیقت اور بچپن کے خواص وغیرہ نیز ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق تحقیقات جدیدہ نے جو کچھ ذخیرہ اکٹھا کیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً مگر سلسلہ وار اس گزٹ میں یا رسالوں کی صورت میں شائع ہوتا رہے اس موضوع کو سائنس کی تقریباً تمام شاخوں سے تعلق ہے اس لئے ہر ایک شاخ کے مشاہدات اور مسلمات اس سلسلہ میں قلم انداز نہیں ہو سکتے لیکن مشکل یہ ہے کہ ان شاخوں کے لئے اُردو میں ابھی تک صحیح نام قرار نہیں پائے مثلاً زواولوجی کا ترجمہ علم الحیوانات کیا جاتا ہے حالانکہ لفظ حیوان کا اطلاق ہر ایک ذی روح پر ہے خواہ وہ ارتقائی سلسلہ میں کسی درجہ پر ہو۔ یہ ترجمہ اگر بیالوجی کا ہو تو زیادہ مناسب ہے اسلئے کہ اشیاء ذی روح میں ہر ایک شئے حیوان ہونے سے خالی نہیں۔ خواہ وہ اشرف المخلوقات ہو یا سمندر کا کوئی ادنیٰ جانور ہو جو دیکھنے میں جڑی بوٹی معلوم ہوتا ہے مگر فی الحقیقت ذی روح ہے۔ اور ارتقائی سلسلہ میں ایک حد فاصل ہے۔ زواولوجی کا بہتر ترجمہ علم الوحوش ہو سکتا ہے۔ انسان اور اصطلاحی حیوان میں وحشت کا فرق ہے۔ ایران میں اس لفظ کا استعمال ہمیشہ جانوروں کے لئے ہوتا ہے پھر اگر انتھراپولوجی کو علم الانسان سے تعبیر کیا جائے تو فزیالوجی کے لئے کوئی مختصر مگر جامع لفظ نہیں ملتا۔ البتہ سائیکولوجی کا ترجمہ علم النفس یا نفسیات مقبول ہو چکا ہے۔ انوٹومی یا تشریحات کو جو نسبت اجسام کے مادی حصہ سے ہے وہی نسبت ہسٹولوجی کو سائیکولوجی یا علم النفس سے ہے۔ ان تمام شعبوں کے لئے جامع الفاظ مگر مختصر وضع ہونے چاہئیں۔ ہم حیران ہیں کہ بغیر اس کے ہم اپنے سلسلہ کو کیونکر شروع کریں۔

ظاہر ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت تمام مدارج عمر میں ایک قاعدہ کے پابند نہیں ہو سکتی ایک سے تین برس تک کے بچہ کے لئے کچھ ضابطہ ہے تین سے سات تک کے لئے دوسرا

ضابطہ تعلیم و تربیت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ تفاوت اس لئے ہے کہ تشریحات جسمانی کی بنا پر بچہ کی جسمانی حالت مختلف ہے اور اس کے ساتھ علم النفس یا سائیکالوجی کی بنا پر بھی تفاوت ہوتا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس وقت زیادہ تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث نہیں کر سکتے مجملاً یہ کہ بچہ بڑا ہونے تک جیسے جیسے جسمانی مدارج طے کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کے دل و دماغ کی کیفیات ترقی کرتی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت کے ضابطے بدلتے جاتے ہیں جسم اور نفس کی ان منزلوں اور مرحلوں کی تفصیل بغیر علمی مباحث ممکن نہیں ہے اس لئے ان تمام شاخہائے علوم سے مجملاً بحث کرنا ناگزیر ہے کیا علمی مصطلحات طے کرنے میں احباب ہمیں مدد دینگے۔

رزولیوشن نمبر ۲۳ متعلقہ روئداد تعلیم مدارس کی نقل معہ مراسلہ صوبہ مذکور کے ذمہ داران تعلیم کی خدمت میں بھیجی گئی تھی۔ مسٹر گریو۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات جواباً تحریر فرماتے ہیں کہ نقشہ نمبر ۵ سے خانہائے ۱۶ تا ۲۳ کو حکومت اعلیٰ ہند نے خارج کر دیا ہے اسلئے روئداد تعلیم میں یہ تفصیل نہیں دکھائی جاسکتی کہ کامیاب گریجویٹ میں قوموار کتنی کتنے طلبہ تھے۔ یونیورسٹی مدراس سے اس قسم کی تفصیلات معلوم ہوسکتی ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ بیان صحیح ہو مگر پچھلے چھ سال کی رپورٹوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹی مدراس نے سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء سے یہ تفصیل دینی بند کر دی اس لئے سررشتہ تعلیم نے بھی قوموار تعداد کامیاب طلبہ کو نقشہ سے حذف کر دیا اب اگر یہ حکومت اعلیٰ ہند کے کسی حکم عام کی بنا پر ہوتا تو باقی اور صوبوں کی روئداد میں بھی گریجویٹ کی تعداد قوموار درج نہ ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہے بلکہ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء تک سالانہ روئداد میں مدراس کے سوا ہر ایک صوبہ نے قوموار تفصیل درج کی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر سررشتہ تعلیم مدراس کی توجیہ سے کچھ زیادہ تسلی نہیں ہوتی اور مجبوراً حکومت اعلیٰ کو اس معاملہ میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں کچھ بھی حرج نہیں کہ حسب دستور سابق نقشہ کے

ان خانوں کو معمور کیا جائے۔ کیا محنت کرنے والوں کو یہ حق نہیں کہ انہیں اپنی محنت کا اندازہ الگ الگ کرا دیا جائے تاکہ وہ حقیقت حال سے آگاہ ہو کر آیندہ کے لئے جو مناسب تدابیر ہوں اختیار کریں۔ بظاہر مدراس یونیورسٹی کی یہ محض سخن پروری ہے کہ سررشتہ تعلیم کو تو موادِ تفصیل سے آگاہ نہ کیا جائے۔ ہمیں اس تفصیل پر اس لئے زیادہ اصرار ہے کہ کانفرنس کے دفتر کے رجسٹر تعلیمات بغیر اس کے مکمل نہیں ہو سکتے۔

مشرقی خوشنویسی

عہد اسلام میں اکثر علوم و فنون قرآن مجید کی بدولت وجود میں آئے یا ترقی پذیر ہوئے۔ مثلاً صرف۔ نحو۔ معانی۔ بیان۔ ایام عرب۔ اشعار جاہلیت وغیرہ۔ چنانچہ کلام مجید کو سمجھنے کے لئے مسلمان ان علوم پر بھی متوجہ ہوئے اور اس طرح ایک فن سے دوسرا فن پیدا ہوتا گیا جس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضخامت بھی شاید ناکافی ہو۔

گو خوشنویسی یا خطاطی ان فنوں میں نہیں ہے جن کا براہ راست قرآن مجید سے تعلق ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ زیادہ تر قرآن مجید کی تحریر و کتابت کے ذوق نے لوگوں کو اس فن کی تحصیل و ترقی پر آمادہ کیا۔ اکثر لوگ حسن عقیدت اور ذوق مذہبی کی بنا پر قرآن مجید کی کتابت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ امرا و سلاطین کے یہاں بھی اعلیٰ درجہ کے لکھے ہوئے مطلّا و مذہب قرآن مجید ادب و عقیدت کی بنا پر لئے جاتے تھے اور اس کے معاوضہ میں معقول صلہ ملتا تھا۔ اس لئے لوگوں نے اپنی عمریں اس فن کی ترقی اور قرآن مجید کی کتابت میں صرف کر دیں اور طرح طرح کی جدتیں اور صنعتیں پیدا کیں جس کے حیرت انگیز نمونے آج بھی کہیں کہیں موجود ہیں جو ایک شاہی کتب خانہ کے لئے بھی زیب و زینت بلکہ فخر و برکت کا باعث ہو سکتے ہیں۔

غرض یہ فن رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا اور خط نسخ کے بعد مختلف دلچسپ خطوط نے رواج پایا۔ مثلاً خط تعلیق۔ نستعلیق۔ ثلث۔ شفیعہ وغیرہ۔ چنانچہ بعض مصنفین نے

۴۲ اقسام کے خطوط کا ذکر کیا ہے۔ غالباً خط ماہی۔ خط گلزار۔ خط غبار وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ خلیفہ مامون الرشید عباسی کے زمانہ میں اس فن نے بہت ترقی کی۔ اس زمانہ میں لوگ حسن کتابت کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے۔ اس زمانہ کے بعد بھی خلفا اور عام لوگ اس فن کی قدر کرتے رہے اسی وجہ سے ابن مقلہ اور یاقوت جیسے کاتب پیدا ہوئے۔

ایران میں بھی اس فن پر خاص توجہ کی گئی اور بڑے بڑے نامور خطاط وہاں گزرے وہاں سے یہ فن ہندوستان آیا۔ سلسلہ مغلیہ میں کئی فرمانروا۔ ماہر فن گزرے ہیں مگر سلاطین تیموریہ اس کے خاص قدردان تھے چنانچہ اس دَور کے جو شاہی فرامین اور عام تحریریں پائی جاتی ہیں وہ اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ امراء و سلاطین خود بھی اس فن کو باقاعدہ سیکھتے تھے۔ شہزادہ داراشکوہ کے ہاتھ کے قطعات جواب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، اُستادانہ شان رکھتے ہیں اور اہل نظر سے مخفی نہیں شاہ جہاں اور عالمگیر دونوں اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے۔

اُس زمانہ میں خوش خطی تعلیم کا ایک لازمی جزو تھی اور اس عہد کے شرفا سپہ گری کی طرح اس فن میں بھی کمال حاصل کر کے صاحب السیف والقلم بنتے تھے۔

مغرب کی خوشنویسی

خوش خطی کو دستکاری کی حیثیت سے یورپ میں کبھی درجہ قبول نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ اہل مغرب ایسٹرن کیلی گرافی (مشرق کی خوش خطی) ہی کو بطور ضرب المثل صدیوں استعمال کرتے رہے۔ جب علم استشراق کی بنیاد پڑی اور یورپ نے ایشیا کے علمی اندوختوں سے استفادہ شروع کیا تو مشرقی خوش خطی نے بھی اہل یورپ کے ہاتھوں مغربی وضع کی ترقی پائی یعنی ٹائپ۔ بلوک۔ ڈائی۔ لیتھو مشین۔ زنکوگرافی وغیرہ کے مختلف قالبوں میں ڈھل کر دستکاری کے مرحلہ سے گزر گئی یہاں تک کہ اب یورپ میں ہاتھ کے خوشنویس

خال خال اس طرح ہیں کہ گویا خوشنویسی آثارِ قدیمہ کی فہرست میں باقی رہ گئی ہے
مشرق پر بھی اس کا اثر ہے۔ آہنی قلم قدیم کلکِ خوش نگار کو میدان سے پسپا کرتا جاتا ہے
پھر بھی ممالکِ مشرقیہ کم و بیش خوشنویسی کی اسی طرح قلمرو ہے اور جب تک مروجہ ٹائپ
ترقی کر کے نستعلیق خط کے برابر نہ آ جائیگا اور لیتھو کا موجودہ نظام نہ بدلیگا تب تک میر
پنجہ کش کی خطاطی سے مخلصی پانا دشوار ہے یا شاید اس صدی کے کسی حصہ میں زمانہ کے
سخت تقاضوں سے مجبور ہو جائیں اور اہلِ علم و قلم کا مذاق کند ہو کر مروجہ ٹائپ کو قبول
کر لے مگر صدی کے دوسرے تیسرے ربع تک تو خوشنویسی کی حکومت ختم نہیں ہو سکتی
چنانچہ اسی ناگزیر ضرورت کو محسوس کر کے کانفرنس ہر سال مدارس کے طلبہ کو خوشنویسی
میں سند اور انعام دیا کرتی ہے تاکہ زیادہ نہ ہو تو بایقرا خط لکھنے پڑھنے کی قابلیت
پیدا ہو جائے۔ انشا کا مقام تو بہت اونچا ہے کانفرنس کا مقصود صرف املا ہے تاکہ
مدرسہ کے بچوں میں آج کل کی طرح جنی خط زیادہ ترقی نہ کرے۔ اسناد و انعامات
انسپکٹر حلقہ کی معرفت دیے جاتے ہیں سال گزشتہ کی فہرست کامیاب طلبہ گزٹ کے
اخیر پر درج کی جاتی ہے اور والدین اور اساتذہ سے التماس ہے کہ طلبہ کو زیادہ
توجہ دلائیں۔

خاص مضمون

فن تعلیم کے ماہروں میں بعض کا یہ خیال ہے کہ جب تک کوئی قوم تعلیم کا
مطالبہ نہ کرے تب تک اس قوم کو تعلیم دینا خواہ بالجبر یا بالاختیار زیادہ
نتیجہ خیز نہیں۔ مطالبہ سے مراد یہ ہے کہ اعلیٰ سے ادنیٰ طبقہ تک بیشتر افراد قوم تعلیم کا براہ راست
یا بالواسطہ تقاضا کریں۔ بغیر اس کے صرف امرا کا طبقہ ضرورت بلا ضرورت جبری تعلیم
سے فائدہ اوٹھائیگا۔ حزب العمال یا ورکر طبقہ جس کے لئے جبری تعلیم خصوصیت کے ساتھ
وضع ہوتی ہے تعلیم سے محروم رہیگا۔ ایسی حالت میں جبری تعلیم کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ماہران
تعلیم کا دوسرا گروہ اس رائے کے خلاف ہے۔ اس بنا پر کہ جبریہ تعلیم کے قانون کے اجرا سے

قوم میں تعلیم کی عادت پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اور جب عادت ہوگی تو تقاضا بھی ہوگا۔
تعلیم حقیقت میں فطری تقاضا نہیں بلکہ سوسائٹی کا مطالبہ ہے اور یہ بھی محض عارضی ہے یعنی
جس طرح تعزیری قانون ملک میں نافذ ہوکر ہمیشہ اہل ملک کی جان و مال کی حفاظت کرتا
ہے یا قانون دیوانی شہریت کے حقوق کو معین کرتا ہے اور زندگی کی ناگزیر ضرورت میں
شمار ہوتا ہے اور یہ دونوں قانون ایک فطری تقاضے (نظام آسائش کی تکمیل و قیام)
کو پورا کرتے ہیں اس طرح جبری تعلیم کے قانون کو یہ رتبہ حاصل نہیں بلکہ اپنا مقصد پورا کرنے
یعنی قوم کو تعلیم کا عادی بنانے کے بعد یا تو مفقود ہو جاتا ہے اور یا زیادہ شدت سے نافذ
نہیں رہتا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال تو یہی ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے ہر حصہ میں جبریہ
قانون ابھی تک جاری نہیں ہوا پھر بھی عیسائیوں میں تعلیم کو بہت زیادہ عروج ہے
یہاں تک کہ عیسائیوں سے ہندوؤں کو بہت دور کی نسبت ہے اور مسلمانوں کو ان سے
کچھ بھی نسبت نہیں جیسا کہ نقشہ ذیل سے ظاہر ہوگا۔

نقشہ تعلیم ہندوستان

تعداد خواندہ فی ہزار

	مرد	عورت	میزان
پارسی	۸۰۰	۶۶۰	۷۱۱
عیسائی	۰	۰	۲۰۰
ہندو	۱۰۱	۸	۰
سکھ	۱۰۰	۱۴	۶۷
مسلمان	۶۹	۴	۰

اس میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب عیسائیوں کی مد سے تمام فرنگی نسل کو خارج

کرکے صرف ہندوستان کے نومسیح کی تعداد میں تعلیمی ترقی کا اندازہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خواندہ کی تعداد ہندوؤں سے تگنی اور مسلمانوں سے چوگنی ہے۔ حالانکہ مسیحیت کو اچھوت یا ادنیٰ ہندو ذاتیں یا ہندوستان کے قدیم باشندوں میں سے بعض قطعاً کوری جاہل قومیں قبول کرتی ہیں۔

وجہ یہ کہ عیسائی اقوام میں جبری تعلیم کے قانون نے تعلیم کی عادت پیدا کر دی ہے اور پارسی۔ فرنگیوں کی صحبت میں تعلیم کے عادی ہو گئے۔ یہاں تک کہ جس طرح ہم کسی مستطیع اور صاحب مقدرت شخص کو میلے کچیلے کپڑے یا لنگوٹی باندھے ہوئے دیکھکر شکوہ آمیز حیرت سے دیکھتے ہیں اسی طرح ایک عیسائی کو جاہل دیکھکر اس کے برادران ملت ترک عادت سے ناخوش ہوتے ہیں۔

(۱) اب سوال یہ ہے کہ ماہران تعلیم کی دونوں جماعتوں میں سے کس کا خیال صحیح ہے یعنی قوم کو تعلیم کا عادی بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔

(۲) تعلیم کی عادت پیدا کرنے کا طریقہ جبریہ قانون کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ہم دعوت دیتے ہیں کہ باذاق اصحاب اس موضوع پر سلیس اردو میں مدلل مضامین لکھیں زیادہ اختصار و طوالت سے قطع نظر کرکے مضمون میں گزشتہ و موجودہ نظیریں اور شہادتیں ہونی چاہئیں۔ بہتر مضمون پر ایک نفیس تمغہ نذر کیا جائیگا مضامین اخیر ستمبر تک دفتر کانفرنس میں موصول ہونے چاہئیں۔

اڈیٹر

ابتدائی نصاب کی چند خصوصیتیں

مروّجہ نصاب کی حقیقت

بچوں کی فطرت - استعداد او رضرورت کو پیش نظر رکھکر ہندوستان بھر کے سرکاری یا قومی مدارس میں ابتدائی تعلیم کی کتابیں تلاش کریں تو بچوں کے حسب حال شاید کوئی کتاب مشکل ملیگی - اصل میں دونوں جگہہ ایک ہی رائے کی حکومت ہے ٹیکسٹ بک کمیٹیوں میں ابتدائی نصاب کے انتخاب یا ترتیب کے وقت وہی مصلحتیں پیش نظر ہوتی ہیں جو قومی تعلیم گاہوں کی مجالس منتظمہ میں ملحوظ ہیں وہاں مضامین میں عمومیت بیحد ہوتی ہے یعنی تمام اقوام وملل کے خصائص تھوڑے تھوڑے جمع کرکے کتاب کو عطر مجموعہ کی شیشی بنا دیا جاتا ہے - ادہر قومی مدارس میں اپنے خصائص کو جس طرح آڑے ترچھے ممکن ہوتا ہے محفوظ رکھنے کا خیال مراق کی حد تک پہونچ جاتا ہے حالانکہ خصائص ملی یا عقائد مذہبی ہرگز کتابوں کے الفاظ میں مخفی نہیں ہیں بلکہ گھرانہ یا سوسائٹی کے روز مرّہ کے اعمال میں مضمر ہیں جو بچہ دہریہ عقائد کی سوسائٹی میں پرورش پائیگا وہ قومی مدرسہ کا نصاب پڑھ کر بدلیگا نہیں - الاماشاء اللہ - اسمیں شک نہیں کہ ایک حالت یہ بھی ہے کہ

سگِ اصحابِ کہف روزے چند
پئے نیکاں گرفت مردم شد

لیکن یہ محض اتفاقیہ ہے کلّیہ نہیں -

ہمارے تعلیمی عقائد

بہرحال عام مدارس ابتدائی صحیح نصاب سے ایک حد تک محروم ہیں اول تو ملک اور قوم میں تعلیمی عقائد ہنوز معین ہی نہیں یعنی ابھی تک یہ قرار نہیں پایا کہ ہم کیوں پڑھیں اور کیوں پڑھائیں - جو مادہ یا استعداد قدرت نے انسان میں ودیعت کردی ہے وہ بغیر تعلیم کے بھی جلد یا بدیر منکشف ہوتی ہی اور اگر تعلیم کی مدد سے اس مادہ کا انکشاف قبل از وقت اور بسہولت ہونا ممکن ہے تو وہی تعلیمی عقائد

سد راہ ہوتے ہیں یعنی اوّل اس سوال کا طے کرنا لازم ہوتا ہے کہ ہم بچّوں کو تعلیم کے ذریعہ سے شرف و فضیلت کی کس منزل پر لیجانا چاہتے ہیں۔ اس تخیل کے باوجود بھی اگر کچھ افراد ملک میں ایسے ہیں کہ اونہیں تعلیم کا مقصود حقیقی بطور عقیدہ تسلیم ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے عقائد پر نہ عامل ہیں نہ منتقین تعلیم کے کچھ خانہ ساز اصول قائم ہو گئے ہیں اور تمام ملک بھیڑ چال سے ان ہی پر چلا جا رہا ہے۔

ابتدائی کتب درسیہ پر عقائد کا اثر

کاش نصاب کی تالیف و ترتیب میں یہ امر خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا جائے کہ کتاب کا کوئی مضمون بچہ کے تصوّرات اور جذبات میں مداخلت نہ کرے نہ اسکے بچپن کی امنگوں اور ولولوں کو مٹائے۔ انہیں میدان زندگی کے اگلے حصّوں کا نظارہ نہ کرائے بلکہ بچوں کو اون کے فطری مدرکات کی حد تک قائم رکھے تو ابتدائی سے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے میں بہت سہولت ہو سکتی ہے۔

ابتدائی نصاب کا مقصود حقیقی

حقیقت میں تعلیم کی ذمہ دار جماعت ابتدائی نصاب کی غرض و غایت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس کا کہیں مواد بھی نہیں اور نہ کسی کو صحیح مواد فراہم کرنے کی جستجو ہے۔ اصلی طریقہ یہ ہے کہ بچپن کے علم النفس کا غائر نظر سے مطالعہ کریں اور سمجھیں کہ بچپن کے اصلی تقاضے کیا ہیں تعصبات اور من گھڑت خیالات سے دل و دماغ کو پاک و صاف کر کے سب سے اوّل یہ عقیدہ دلنشین کرنا چاہیے کہ تعلیم کا مقصود ناقابل عمل اور محض بے نتیجہ اصول کا سکھانا نہیں۔ نہ بچوں کو طوطے کی طرح الفاظ یاد کرانا مطلوب ہے۔ بلکہ اوسے سوسائٹی کا مفید ممبر بنانا چاہیے۔ قدرت نے اُسے جس طرح کی طبیعت دی ہے جو کچھ قابلیتیں اُس کے گوشت و ہڈی کے بنے ہوئے جسم میں ودیعت کی ہیں۔ اسکے دل میں جس قسم کا جذبہ دماغ میں جس وضع کا خیال و تصوّر۔ مزاج میں خصوصیت تخمیر کی گئی ہے ان ہی کو بجائے خود

ترقی دیکر بڑے ہونے سے پہلے بچہ کو بڑائی کے راستہ پر ڈالدیا جائے۔ ہم اس قضیہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

بچے کا مذاق

بڑے آدمی کے سامنے بہت سی کتابیں رکھکر کہئے کہ ان سے دل بہلائیے وہ اس انبار سے اپنے ذوق کی کتاب ڈھونڈکر مطالعہ میں مصروف ہوجائیگا اگر کوئی کتاب دل چاہتی نہ ملیگی تو خاموش بیٹھ کر کچھ سوچنے لگیگا۔ وجہ یہ کہ اسکا دماغ پختہ۔ مذاق معین اور طبیعت کا فیصلہ ناطق ہوچکا ہے اب اس میں ادل بدل مشکل ہے۔ مگر بچہ اس درجہ میں نہیں ہے اس کا مذاق نصاب کی کتابوں سے معین ہوتا ہے پس اگر اس کی کتاب میں اَنمل بے جوڑ باتیں ہونگی۔ اس کی سمجھ سے بالاتر مسائل درج ہونگے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا ذہن کند اور مذاق مفلوج ہوجائیگا۔

کہانی جزو نصاب نہیں

بعض اصحاب کے نزدیک نصاب میں دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہونی چاہئیں جن کو پڑھ کر بچے خوش ہوں۔ خود ہنسیں اور دوسروں کو سنا کر ہنسائیں۔ انہی میں کچھ اخلاقی نتائج بھی مخفی ہوں کہ بچے اُن سے سبق لیں۔ مگر یہ کوئی لازمی بات نہیں۔ کہانی چاہے کیسی ہی ہو بچے اسے بڑے ذوق وشوق سے سنیں گے اور ختم ہونے پر بھی پوچھیں گے کہ پھر کیا ہوا۔ تم انہیں دن بھر کے واقعات میں سے کوئی واقعہ کہانی کے رنگ میں رنگ کر سناؤ تو وہ اس میں بھی خوش ہونگے اور اصرار کرینگے کہ تمہارا سلسلہ بیان دیر تک جاری رہے۔ ابتدائی کتابیں بچوں کو خوش کرنے کے لئے ہرگز نہیں ہیں بلکہ قدرت نے جو خصوصیات ان کی طبیعت میں ودیعت کی ہیں ان کو ملحوظ رکھکر انہیں حقیقی زندگی سے نہ کہ افسانوں کی فرضی زندگی سے آگاہ کرنا مقصود حقیقی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن کتابوں میں گھڑی ہوئی بے سروپا کہانیاں درج ہوتی ہیں۔ لفاظی اور مبالغہ کی کثرت۔ واقعات کی غیر ضروری تفصیل اور طول کلام سے کام لیا جاتا ہے وہ کبھی بچوں کے لئے مفید نہیں ہوسکتیں۔

البتہ اخلاقی نتیجہ خیز ہونے سے ہمیں اتفاق ہے۔ مگر نتائج کے لئے بچہ کو بہت زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے بلکہ ان کو سلسلہ بیان میں جا بجا اس طرح ابھار کر دکھا دیا جائے کہ بچہ کو نتیجہ آخر کا نود اتقا ہونے لگے تاکہ اس کا انتقال ذہنی کہیں رکے نہیں اور نہ فہم و فراست کی قوتوں کی پرواز کو صدمہ پہنچے۔

نصاب کے اجزاء ترکیبیہ

شاید قارئین کرام کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہ سب صفات ہمیں موصوف کہاں ہے۔ جبتک یہ نہو گا بھلی بری کہانی میں تنیہ کیسے پہنچتی ہے ہم نے مانا کہ بچوں کی ابتدائی کتاب کی کہانی میں مفروضات کے بجائے واقعات اور حقائق ہونے چاہئیں اس کا آغاز اور انجام اور نتیجہ کا سلسلہ سب سرویا بھی نہ ہونا چاہئیے۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ واقعات کے سلسلہ میں ہر ایک واقعہ پہلے واقعہ کا ایک نتیجہ اور اگلے واقعہ کا سبب ہو گا اور یہ تمام سلسلہ اسباب و نتائج بچہ کی چشم بصیرت کے سامنے ابھرا ہوا ہو گا اور نتیجہ آخر کی جانب اشارہ کریگا۔ بہرحال یہ سب کچھ محض تعریف ہے مگر ضرورت یہ ہے کہ اس شئے ناظرین کو دکھا دی جائے ہم اس کی نسبت کوئی شافی جواب نہیں دے سکتے لیکن بالکل مایوس بھی نہیں کر سکتے بہت ممکن ہے کہ ود مین کہانیاں تمثیلاً اس سلسلہ میں آئندہ اپنے موقعہ پر ملیں۔ مگر اس اشاعت میں ہم صرف اصول اور ضابطہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

واقعات و حقائق

بچوں کی کہانی میں زندگی کی حقیقتوں کا ذکر ہونا لازمی ہے حقائق اور اعمال بھی عامیانہ درجہ کے نہ ہوں بلکہ ایسے زبردست اور وزن دار ہوں کہ نتیجہ آخر تک منتقل ہونے میں کوئی شئے ان کے ذہن کی مزاحمت نہ کرے۔ فوق العادت انسانوں کا تذکرہ کہانی میں نہیں کرنا چاہئیے بلکہ یہی معمولی انسان گوشت ہڈی کے بنے ہوئے جو روزمرہ دیکھنے میں آتے ہیں کہانی میں لائے جائیں۔ نہ بعید القیاس واقعات بیان کریں۔ صبح سے شام تک ہر ایک انسان معمولاً کسی

نہ کسی مقصد کو حاصل کرنے میں جد وجہد کرتا ہے یہی زندگی کے واقعات ہیں اور یہی کہانی میں مذکور ہونے چاہئیں۔ کچھ مضائقہ نہیں اگر کہانی میں اس حد تک افسانہ کا رنگ آجائے کہ اسباب ونتائج کا سلسلہ گھٹا ہوا۔ واقعات دلچسپ اور پر جوش اور انداز بیان معمول سے زیادہ زوردار ہو۔ کہانی شروع کرنے میں کسی لمبے چوڑے دیباچہ یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ جن اشخاص کا ذکر ہے ان ہی سے کہانی کا فوراً آغاز کر دیا جائے تاکہ بچوں کے دل ودماغ پر ایک ناگوار کیفیت منتظرہ طاری نہ ہونے پائے۔

وقت اور جگہہ کا تعین واقعات کے تذکرہ میں وقت اور جگہہ کا حوالہ بھی حسب ضرورت دینا چاہئے یعنی جو واقعہ جس جگہہ اور جس وقت ہونا طبیعت اور عادت انسانی کے مطابق ہو اس واقعہ کو اسی جگہہ اور اسی وقت کی قید کے ساتھ دکھانا چاہئے۔ تاہم اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ کہانی کو کسی سرکاری اہلکار کا روزنامچہ بنا دیا جائے مگر یہ بھی نہ ہو کہ کہانی نابینا ملٹن کی بہشت کا افسانہ بن جائے جس میں اوّل سے آخر تک مکان وزمانہ کا کہیں ذکر ہی نہیں۔ کہانی ایسی ہونی چاہئے کہ پڑھنے یا سننے والے کے ذہن کو خاتمہ کی جانب خود بخود پہنچنے میں مدد دے نہ یہ کہ کھینچ تان کر اس طرف لیجائے۔ قارئین کرام معاف کریں اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے معیار کے مطابق نصابات مروجہ میں ایک کتاب بھی نہیں ہے۔ کتاب میں مشکل سے ایک آدہ کہانی ایسی ہوگی کہ اسکے بڑے بڑے واقعات اختصار کے ساتھ عام فہم زبان میں بیان کئے گئے ہوں۔ یا غیر متعلقہ اور بے نتیجہ واقعات نظر انداز ہو گئے ہوں بچوں کی کہانی کی بڑی بڑی صفتیں حسب ذیل ہیں۔

بچوں کی کہانی کی خصوصیات (۱) کہانی مفرد ہو۔ کئی قسم کے اسباب ونتائج سے مرکب نہ ہو (۲) کہانی میں عملی باتوں کا ذکر ہو یعنی روزمرہ کی حقیقی زندگی سے ایسے واقعات چنے جائیں کہ بچہ ان کو سمجھ سکے اور بآسانی

عمل کرے۔

(۳) کہانی کے اسباب و نتائج کا سلسلہ مرتب ہو یعنی ہر ایک اگلا واقعہ پچھلے سے مشتق ہو۔

(۴) کہانی کا ایک انجام اور ایک نتیجہ آخر ہی ہونا چاہئے جو اپنی نوعیت میں نیچ کے نتائج کے مطابق ہو۔ بعض کہانیاں ایسی دیکھنے میں آتی ہیں کہ زبردست واقعات کا سلسلہ پُراثر اسباب و نتائج کو ساتھ لئے ہوئے اخیر پر آکر اس طرح بے نتیجہ ختم ہو جاتا ہے بس طرح سرسبز ندی زور سے بہتی ہوئی آکر ریت میں اچانک غائب ہو جاتی ہے۔

یہ مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں کہ کتاب کی تالیف کے لئے پورا اہتمام کیا جائے۔ مؤلف کے ذہن میں پہلے سے ایک نقشہ جم جائے۔ بغیر اس کے روپیہ وقت۔ محنت سب ضائع ہوگا۔ اور بچوں کو بجائے فائدے کے دس گنا نقصان پہنچیگا۔

ابتدائی کتابیں ذی روح ہیں

یاد رکھنا چاہئے کہ اور کسی قسم کی کتابیں غیر ذی روح ہوں تو ہوں مگر بچوں کی ابتدائی کتب لازمی طور پر ذی روح حقیقی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہونی چاہئیں۔

بے کارم و باکارم چوں مد بہ حساب اندر
گویانم و خاموشم چوں خط بہ کتاب اندر

اس شعر کے لکھنے کے بعد ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کتاب گو دیکھنے میں بے جان ہے مگر فی الحقیقت جانداروں کے افعال و اعمال کا ایک زبردست مصدر ہے یہ بچہ کو متحرک اور سرگرم کئے بغیر نہیں چھوڑتی۔ اس کی ہر کہانی کا ایک ایک واقعہ اور ایک ایک نتیجہ بچے کے لئے ایک مستحکم اصول زندگی بن جاتا ہے۔

یورپ میں ابتدائی تعلیم

یورپ میں ابتدائی تعلیم کے مسائل اگرچہ تقریباً ایک صدی سے زیر نظر ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ینگ کے بعد سے

اس سمندر میں اس قدر طغیانی آئی ہے کہ آج تعلیمی جماعت کا ہر رکن ہر ملک میں ابتدائی تعلیم کے سوائے اور کسی شعبہ کی طرف متوجہ نہیں۔ ہزاروں نئے نئے نظام عمل پیش ہو رہے ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ بچوں کی فطرت کے مطابق ابتدائی تعلیم اس قدر مکمل ہو جائے کہ اس سے ثانوی تعلیم کی شاخ خود بخود پھوٹ نکلے اور اعلیٰ تعلیم کا راستہ خود ہموار اور صاف ہو جائے۔ اگر ابتدائی تعلیم اچھی ہوئی تو بچہ کی قوت متصورہ اور متخیلہ۔ اس کا ادراک و ذہن فطری وضع پر نشو و نما پا کر آئندہ اس کی رہنمائی کرینگے دماغ پر لایعنی نصاب کے اثر سے ہیولائی کیفیت طاری نہ ہوگی۔

طرزادا کی قوت اگر ابتدائی کتاب کی کہانیاں زوردار اور اصلی ہیں تو حقیقی زندگی کے واقعات و حوادث کا جلوہ ان میں موجود ہوگا اور آئندہ زندگی میں ایک حقیقی مرقع بچوں کی نظر کے سامنے رہیگا۔ بچے طبعاً لاابالی نہیں ہوتے نہ ان کا ذہن اور خیال بے قرینہ ہوتا ہے بلکہ غور سے دیکھیں تو ہر ایک بچہ کا میلان خاطر ضرور کسی نہ کسی مفید کام کی طرف ہوگا۔ پس کہانی میں جو بات اپنی طبیعت کے موافق ملیگی وہ اُسے فوراً جذب کر لیگا اور اس سے زیادہ مستفید ہوگا۔ اخلاقی نصیحتیں کھلے لفظوں میں کبھی کسی کو پسند نہیں آتیں۔ کہانیوں میں کھلی نصیحتیں بچوں کو بھی مرغوب نہیں ہوسکتیں بلکہ ایسے پیرایہ میں نصائح کرنا چاہیے کہ کہانی کا سلسلہ بیان رفتہ رفتہ ایک اخلاقی نصیحت پر ختم ہو کر بچہ کے دل میں خود بخود کسی خاص کام کی بھلائی یا برائی ڈالدے۔ سلسلہ بیان میں جتنے واقعات ہوں وہ حقیقی کرشمہ گاہوں سے چن کر لیے جائیں۔ اور بچوں کی سمجھ کے مطابق ہوں۔

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

قبول عام کے اسباب انوار سہیلی۔ نگار دانش۔ کلیلہ دمنہ کو پختہ دماغ طبقہ میں

اس قدر درجہ قبول کیوں ملا محض اسلئے کہ حقیقی زندگی کے واقعات نیک و بد اسباب و نتایج ایک دلکش پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں جس سے ہر درجہ کا آدمی اپنی ضرورت کے مطابق اصول زندگی مستخرج کرکے ان پر کاربند ہو سکتا ہے کسی حکایت میں ایک بات بھی خیالی یا ناقابل عمل نہیں۔ ذکر اگرچہ جانوروں کا ہے لیکن اسلوب بیان اسقدر صاف اور طرز ادا اتنی پُرزور ہے کہ حکایت کی چند سطریں پڑھنے کے بعد جانوروں کا خیال دل سے کافور ہو جاتا ہے اور نظر کے سامنے معمولات زندگی کا نقشہ جم جاتا ہے لیکن یہ کتابیں بغیر سوچے سمجھے تالیف نہیں ہوئیں ہم چاہتے ہیں کہ اسی طرح بچوں کی ابتدائی کتابیں سوچ سمجھکر لکھی جائیں۔

ابتدائی کتابوں کا ماخذ

انگلستان کے ابتدائی نصاب میں بکثرت ایسی کتابیں ہیں کہ ترمیم و اصلاح کرکے اور ان کا مزاج بدلکر ہم اپنے ملک میں جاری کر سکتے ہیں یا ان کتابوں کو سرمشق یا نمونہ بنا سکتے ہیں اور اپنی سوسائٹی کا رنگ پیش نظر رکھکر اور اپنے منزلی اور ملکی زندگی سے واقعات اخذ کرکے حکایات ترتیب دے سکتے ہیں۔ ماخذ ایسے ہوں مثلاً ملک اور قوم کی قدیم روایات۔ دنیا کے ناموروں کے حالات۔ تاریخی افسانے۔ ابتدائے آفرینش اور آغاز صنعت و دستکاری کے حالات سپہ گری کے کرتب اور شجاعانہ مہمات آگ پانی اور ہوا کے پنجہ سے چھوڑانے کے تذکرے۔ کسان اور چرواہے۔ ملاح و ماہی گیر کی سرگزشت مشین مستری اور انجن ڈرائیور کے حالات زندگی۔ جنگلات اور جنگلوں میں کام کرنے والوں کا ماجرہ مختلف ملکوں اور باشندوں کے حالات۔ موجدوں اور محققوں کی زندگی کے واقعات۔ ملک و سرزمین دریافت کرنے کی داستانیں۔ الغرض بچوں کو ان کی سمجھ کے مطابق معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کے تہذیب و تمدن نے کیونکر ترقی کی۔ اس کشمکش میں انسانوں کی قیمتی جانیں کیسے قربان ہوئیں تاکہ ان کے کارنامے سنکر اول انہیں حیرت و استعجاب ہو

اور پھر یہی جذبہ رفتہ رفتہ ہمت اور حمیت کی صورت اختیار کرلے۔بچوں کو مختلف طریقوں سے گویا فلسفۂ حیات کا دیباچہ ازبر ہوجانا چاہیئے اور ساتھ ساتھ یہ بھی یقین کرادینا چاہیئے کہ انسان میں کیسی کیسی قوتیں ودیعت ہیں اور وہ کیا کچھ کرسکتا ہے۔ اس سے بچوں کو نفس پر اعتماد کرنے کی عادت پیدا ہوگی۔

جیسا کہ بار بار ذکر ہوچکا ہے۔ ابتدائی کتب کا مقصود یہ ہے کہ بچہ انسانی سوسائٹی سے روشناس ہوجائے۔ اور انسانی کاموں سے ہمدردی کرنے لگے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اُسے آئندہ زندگی کی حقیقتیں معلوم ہوجائیںگی۔ مگر اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ کتاب کے صفحہ پر یا اوراق میں محض واقعات وحقائق بھر دینے سے مقصد حاصل نہیں ہوگا بلکہ انتخاب اور ترتیب میں عقل سے کام لینا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے کے دل میں عرفانِ حیات کی ایک خاص کیفیت پیدا ہوکر اُسے زندگی سے محبت ہو اور جس طرح کی زندگی کا نقشہ کتاب میں کھینچا ہے اس سے بہتر زندگی جینے کا شوق پیدا ہو۔

زندگی کی حقیقت ظاہر ہے کہ انسان کی حقیقی زندگی نہ بالکل نیک ہی نہ بالکل بد ہے بلکہ نیکی و بدی۔ زہد و رندی۔ سب طرح کے رنگ ملے جُلے ہوتے ہیں۔ دنیا سے کبھی بدی کا بیج زائل نہیں ہوسکتا بلکہ نیکی اور بدی ایک ترازو کے دو پلّے ہیں جو ایک دوسرے کو تول کر قدر و قیمت معین کرتے ہیں۔ مؤلف کتاب کا فرض ہے کہ بچہ کو نیکی کا پلّہ جھکا کر دکھا دے اگر بدی کا پلّہ بالکل خالی کر دیا گیا تو بچہ کو حقیقت حال کیسے معلوم ہوگا۔ اور اُسے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اصلی زندگی میں نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی۔ ابتدائی نصاب کی بعض کتابوں میں ہم یہ عیب بھی دیکھتے ہیں مگر یہ ایک بالکل زہد خشک ہے۔ بچہ کو خیالی تصویر دکھانے سے کیا حاصل۔ ہر ایک ہستی میں جس طرح فطرت نے بُرائی۔ بھلائی ودیعت کی ہی اس کی ہو بہو تصویر

دکھا دینی چاہیئے۔ روغن قاز ملا حاصل ہے۔ کہا ہے گلستان ہمہ پروردہ خار اند۔

تمثیل بچوں کی ابتدائی کتاب کوئی علمی صحیفہ نہیں بلکہ اصلی زندگی کے مکان کی کنجی ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد بچہ ایک عالیشان باغ میں داخل ہوتا ہے جس میں ہر ایک پھول پتہ قدرتی ہے گلاب کی ایک ہی ٹہنی پر پہلو بہ پہلو ادھر کانٹا پھوٹتا ہے ادھر کلی چٹکتی ہے حسن و پاکیزگی فطری وضع میں ہر طرف جلوہ گر ہے۔ یہی حال انسانی سوسائٹی کا ہے اور کتاب اسی سوسائٹی کا خاکہ ہے جس میں ہر طرح کے انسان مقطع اور ہمنوا متین اور چلبلے۔ نیک اور بد ملے جلے ہوتے ہیں۔ کہانی میں ان سب کو کھولکر دکھا دینا چاہیئے۔ کتاب کے صفحوں سے ہر قسم کے پیکر قدرتی وضع میں اٹھ اٹھ کر بچہ کی چشم بصیرت کے سامنے آجانے چاہئیں جیسے میکدۂ گل سے شہد کی متوالی مکھی اپنی دھن میں باہر نکلتی ہے۔ قوم کا لٹریچر قوم کی زندگی کی ہو بہو تصویر ہے اور بچوں کا لٹریچر قوم کے لٹریچر کا جزو ہے۔

انگریزی میں حسب ذیل سلسلے رائج ہیں۔ جن کے مطالعہ سے اردو کی ابتدائی کتب درسیہ کی تالیف میں استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۱) مادر گوز سیریز یعنی ماما قاز کی کہانی

(۲) دی لیٹل ریڈ ہن یعنی لال مرغی اور بچوں کی کہانیاں

(۳) اولڈ مادر ہبرڈ یعنی ماما ہبرد کی سرگزشت

(۴) لیٹل ٹومی گریس یعنی ٹومی عرف ننھے میاں کا قصہ

بعض انجمنیں ولایت میں یہی کام کرتی ہیں انکے سلسلہ کتب نہایت سنجیدہ اور مقبول عام ہیں مثلاً

(۱) دی سٹوری ٹیلرس لیگ۔ مجلس داستان گو

(۲) پٹسبرگ لائبریری۔ کتب خانہ پٹسبرگ

قریشی

بیمہ حیات اور مسلمان

یورپ میں جان کا بیمہ عالمگیر ہے

بیمہ بحری مسلمانوں کی ایجاد ہے جبکہ وہ اسپین میں تجارت کرتے تھے۔ بیمہ بحری نے دنیا کی تجارت کو محفوظ کرکے اوس میں حیرت انگیز ترقی کے مواقع پیدا کردیے۔ پھر رفتہ رفتہ زندگی کے ہر شعبہ میں بیمہ جاری ہوگیا۔ چنانچہ اب یورپ میں تقریباً ہر شخص کا، ہر بچہ کا، ہر کارخانے کا، ہر مکان کا بیمہ ہوتا ہے۔ ہر شخص ایک خفیف رقم ماہوار یا سالانہ دیکر اس امر سے مطمئن ہوجاتا ہے کہ اگر اوس کے مکان کارخانہ وغیرہ میں آگ لگ جائے اوس کی سواری حادثہ سے ٹوٹ جائے تو اوس کو مالی نقصان نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر خود مرجائے تو پس ماندگان کو بسر اوقات کے لئے روپیہ مل جائیگا اور جن بچوں کا تعلیمی بیمہ کرادیا ہے اون کی تعلیم کے لئے سال بسال روپیہ ملتا رہیگا۔ اولاد بن بیاہی رہ گئی ہے تو وقت پر اوس کی شادی کے لئے روپیہ مل جائیگا۔ غرضکہ غیر یقینی اور غیر مطمئن زندگی بیمہ کے ذریعہ سے یقینی اور مطمئن ہوجاتی ہے۔ مگر افسوس کہ اس نعمت عظمیٰ سے جو مسلمانوں کی ایجاد ہے اور جس کی بدولت مہذب دنیا ایک اطمینان کی زندگی بسر کررہی ہے خود مسلمان محروم ہیں۔ اس بنا پر کہ وہ جوا ہے۔ حالانکہ اگر اُس سے واقفیت حاصل کی جائے تو کوئی تجارت اوس سے زیادہ یقینی نہ ملیگی۔

بیمہ کی ابتدا

بیمہ کی ابتدا اس طرح سے ہوئی کہ تجارتی جہاز طوفان سے جب ڈوب جاتے تھے تو جن سوداگروں کا مال اون جہازوں میں ہوتا تھا وہ بالکل تباہ و برباد ہوجاتے تھے۔ چونکہ ہر سوداگر جو بحری تجارت کرتا تھا سخت خطرہ میں رہتا تھا اسلئے ابتدا میں سوداگروں نے یہ انتظام کیا کہ جس شخص کا مال جہاز ڈوبنے سے ضائع ہوجاتا اوس کو باقی ماندہ سوداگر چندہ کرکے اوس کا نقصان پورا کردیتے تھے۔ رفتہ رفتہ زیرک

لوگوں نے یہ حساب لگانا شروع کیا کہ کتنے جہازوں میں جو روانہ ہوتے ہیں کتنے ڈوبتے ہیں اور اوسطاً کتنا مال روانہ ہوتا ہے اوس میں سے کتنا ہر سال تلف ہوتا ہے۔ یہ حسابات لگا کر ایک معین فیس مقرر کردی گئی اور اوس کی باضابطہ کمپنیاں بن گئیں جو بیمہ بحری کا کام کرنے لگیں۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں یہ جاری ہوا۔

تمثیل

مثلاً انسانی زندگی بالکل ایک غیر یقینی چیز ہے۔ مگر عجیب بات یہی کہ انفرادی زندگی جس قدر غیر یقینی ہے اوسی قدر اجتماعی زندگی یقینی ہی

مثلاً یہ کہ صدیوں کی اموات کا حساب لگانے سے معلوم ہوا ہے کہ چالیس [۴۰] سال کی عمر کے دس ہزار اشخاص میں سے اٹھانوے [۹۸] سے لیکر ایک سو تین [۱۰۳] آدمی تک سال بھر کے اندر مرجاتے ہیں یعنی نہایت تندرست قوموں میں اٹھانوے اور کمزور قوموں میں ایکسو تین اشخاص مرتے ہیں۔ اگر اوسطاً دس ہزار اشخاص میں ایکسو اموات سمجھی جائیں۔ اور چالیس سال کی عمر کے دس ہزار آدمی ایک ایک سو روپیہ کا بیمہ کرائیں تو ہر ایک کو ایک روپیہ دینا چاہیے تاکہ ایکسو آدمی جو اوس سال مریں اون میں سے ہر ایک کے ورثا کو سو سو روپیہ ملجائیں۔ امداد باہمی کی یہ بہترین شکل ہے اور اگر صدہا سال کے نقشوں سے یہ ثابت ہوجاے کہ اموات کی شرح تقریباً یہی رہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس معاملہ کو جوا قرار دیا جاے۔ غرضکہ ہر عمر کے اسی قسم کے نقشے پچھلے تجربوں کی بنا پر بنائے جاتے ہیں اور اولاً محض امداد باہمی کے طور پر بیمہ کی کمپنیاں بنائی جاتی ہیں جن میں بجز ممبران کمپنی کے کوئی شریک نہیں ہوتا اور وہی نفع نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں اسی قسم کی ایک کمپنی اول ۱۸۲۹ء میں انتظام مدراس ایکوئیٹیبل جاری ہوئی۔ بیمہ کی کمپنیاں جب باقاعدہ چلائی جاتی ہیں تو اون میں نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا بلکہ نفع یقینی ہوتا ہے اس لئے رفتہ رفتہ ایسی کمپنیوں کا بھی رواج ہوگیا جو ممبران کے علاوہ اور لوگوں کا بھی بیمہ کرتی ہیں اس قسم کی کمپنی ہندوستان میں سب سے اول ۱۸۷

میں اورنیٹل کے نام سے قائم ہوئی اور اب کل ہندوستانی کمپنیوں کی تعداد اکیاون ہے۔

ایک احتیاط یہ کی جاتی ہے کہ کمپنیوں کا سرمایہ کسی ایسے کام میں نہیں لگایا جاتا جس میں نقصان کا خطرہ ہو۔ چنانچہ بالعموم بیمہ کی کمپنیوں کا روپیہ سرکاری تمسکات، سرکاری بنکوں اور اسی قسم کے مستحکم کاموں میں لگایا جاتا ہے۔ جن میں اگرچہ منافع کم ملتا ہے۔ تاہم استقلال اور استحکام کی وجہ سے اون کا سرمایہ مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے بایں وجہ یورپ کی کمپنیوں کا سرمایہ لاکھوں اور کروڑوں نہیں بلکہ اربوں تک پہونچ گیا ہے۔ مثلاً نیویارک کمپنی کا سرمایہ ۱۹۲۰ء میں دو ارب اٹھاسی کروڑ تک پہونچ چکا تھا جو ہندوستان کی دو سال کی آمدنی کے قریب ہوتا ہے۔

دیسی کمپنیاں کیوں بیٹھ گئیں

ہندوستانی کمپنیوں کو چونکہ کافی معلومات اور کافی تجربہ نہ تھا اسلئے اونہوں نے شرح اقساط بہت کم رکھی تاکہ زیادہ بیمہ کرانے والے دستیاب ہوں۔ اس کی وجہ سے متعدد کمپنیاں ٹوٹ گئیں اور لوگوں کو نقصان ہوا۔ اسلئے گورنمنٹ نے اس کا ایک جداگانہ محکمہ قائم کر دیا اور اوس کا ایک افسر مقرر کر دیا اور ایک قانون پاس کر دیا جس کی رو سے کمپنیوں کے سرمایہ اور شرح اقساط وغیرہ کی نگرانی ہوتی ہے اور ہر کمپنی کی حقیقی اور اصلی مالی حالت سرکاری رپورٹ میں دکھائی جاتی ہے اور اس امر کی احتیاط کی جاتی ہے کہ لوگوں کو نقصان نہ ہو۔

مسلمانوں کے قوائے جسمانیہ کو زوال

اسوقت ہمارے سامنے ۱۹۲۰ء کی سرکاری رپورٹ ہے۔ اوس میں یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جسمانی صحت جس پر مسلمانوں کو ہمیشہ سے ناز رہا ہے اب اوس میں بھی مسلمانوں کا بدیہی انحطاط شروع ہو گیا۔ قاعدہ یہ ہے کہ بیمہ کرنے والی کمپنیاں اول بیمہ کرانے والے شخص کی صحت کی نسبت اطمینان کر لیتی ہیں۔ کچھ تو مردم شماری کی رپورٹوں سے

زیادہ تر افراد کے ڈاکٹری معائنہ سے۔ جن لوگوں کی صحت عمدہ ہوتی ہے اونکے
کم شرح کی قسط مقرر کی جاتی ہے اور خراب صحت والوں سے زیادہ شرح کی قسط
ئی جاتی ہے۔ اسی اعتبار سے اوس سرکاری رپورٹ میں تحریر ہے کہ "زندگی کا بیمہ
نے والے مسلمان کا پیمانہ حیات ہندو سے کم قرار دیا گیا ہے، ہندو کی عمر کا اندازہ
، برما سے کم، اور اہل برما کا پارسی سے کم قرار دیا گیا ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ اہل یورپ
ب سے زیادہ دراز عمر ہیں کیونکہ اون کی بود و باش کے طریقے سب سے زیادہ صحت
ئ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمان صحت کے اعتبار سے ضعیف میں کیوں پہونچ گئے۔
ہر ہے کہ افلاس اور جہالت کی وجہ سے۔

لمانوں کی
ع دلی

بیمہ کی رپورٹوں میں ہماری نظریں اس جستجو میں لگی ہوئی تھیں کہ کسی مسلمان کی کمپنی کا پتہ چلے، کیونکہ مسلمانوں کی قوم کو بیمہ سے ایک ابتدائی نسبت ہے۔ مگر کسی کمپنی کا ملنا درکنار مختلف کمپنیوں میں
کرانے والوں میں بھی وہ اپنی تعداد کے اعتبار سے بمنزلہ صفر کے ہیں۔ چنانچہ
وستان کی سب سے بڑی کمپنی یعنی اورینٹل میں ۱۹۲۲ء میں بیمہ کا روپیہ پانے
ں میں مسلمانوں کی تعداد اور رقم کا اندازہ حسب ذیل نقشہ سے ہوگا۔

م	تعداد بیمہ کرانے والوں کی	رقم بیمہ جو دی گئی
ندو	۵۹۹	۱۳،۵۹،۶۱۶ روپیہ
رپین	۱۰۲	۲،۶۸،۱۴۸ 〃
سی	۱۰۴	۴،۲۶،۶۱۷ 〃
لمان	۴۴	۱،۰۲،۴۰۷ 〃

اس نقشہ سے ظاہر ہے کہ مسلمان باوجود تعداد میں سات کروڑ ہیں مگر بیمہ کرانیں

چندلاکھ پارسیوں سے بھی پیچھے ہیں۔ کیا اس وجہ سے کہ وہ بیمہ کرلانے سے مستغنی ہیں، نہیں بلکہ ہر ایسی چیز سے جس سے وہ اطمینان اور یقین کی زندگی بسر کرسکیں اونہیں نفرت ہے۔ کسی شخص نے اون کے لئے کیا خوب کہا ہے کہ مسلمان پیدا ہوں اتفاق سے، بڑہیں اتفاق سے، پڑہیں اتفاق سے، نوکر ہوں اتفاق سے، جئیں اتفاق سے، مریں اتفاق سے، حضرت عیسیٰ نے اپنی اُمت کو نصیحت کی تھی کہ کل کے لئے روٹی مت رکھو مگر اوسے کر دکھایا مسلمانوں نے۔ انسانی تہذیب کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اپنا ہر قدم غیر یقینی سے یقین کی طرف اُٹھائے جس قدر حوادث انسان کو پیش آتے ہیں اون کا حساب لگا کر اون کے نقشے بنائے جاتے ہیں اور پھر اون حوادث کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اوس میں کامیابی ہوتی ہی جن ممالک مین بچوں کی اموات زیادہ ہوتی ہیں وہاں بچوں کی صحت کی خاص نگرانی کی گئی اور شمار و اعداد سے ثابت ہے کہ اوسط عمر میں بیشی ہوگئی۔ مگر مسلمان اب تک یہ بھی گناہ سمجھتے ہیں کہ پس ماندگان کے لئے کوئی رقم پس انداز کی جاسے، اپنی زندگی کا بیمہ کرایا جاسے، بچوں کا تعلیمی بیمہ کرایا جاسے، تاکہ بچوں کی تعلیم کا جب وقت آئے تو اونہیں قرضہ حسنہ اور وظائف کے لئے دربدر نہ پھرنا پڑے۔ اچھے اچھے خوش حال مسلمانوں کو پریشان حال دیکھکر افسوس ہوتا ہے۔

طفیل احمد

اقوام عالم میں مسلمانوں کا درجہ

نمبر (۱)

گزشتہ زمانہ میں چونکہ سفر کے وسائل محدود اور ناقابل اطمینان تھے اسلئے مختلف ممالک کے لوگوں کو باہم تعارف اور تبادلہ خیالات کا شاذونادر ہی کوئی موقعہ ملتا تھا اس کے علاوہ پیام رسانی اور واقفیت عامہ کا بھی کوئی سہل ذریعہ نہ تھا، لہذا ایک ملک کے رہنے والے دوسرے ممالک کے حالات سے عموماً بےخبر رہتے تھے یہاں تک کہ ان کو اکثر اوقات یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں کون کون سی قومیں آباد ہیں؟ ان کے مذہبی عقائد وخیالات کیا ہیں؟ طریقہ معاشرت کیسا ہے اور وہ ترقی یا تنزل کے کس درجہ پر ہیں؟

ہندوستان کا عہد گزشتہ

اس زمانہ میں خود ایک ملک کے رہنے والوں کو بھی آپس میں ملنے جلنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملتا تھا، سفر صورت سقر سمجھا جاتا تھا خصوصاً ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں بغیر کافی جمعیت اور زادراہ کے چٹیل میدانوں اور دشوار گزار اور پرخطر جنگلوں میں سفر کرنا سہل نہ تھا اس لئے کوئی شخص بغیر شدید ضرورت کے اپنے کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا، بلکہ ہندوستان کی ایک خصوصیت اور بھی تھی کہ یہاں کے ہندو بحری سفر کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے اور بربنائے تعصب وکوتاہ بینی دوسری قوموں سے نفرت کرتے تھے اس لئے انہوں نے کبھی ہندوستان سے باہر جانے کا ارادہ نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو باہر جانے کی ضرورت بھی نہ تھی، ان کی معاشرت اس قدر سادہ تھی کہ ان کی ضرورت کا سب سامان ہندوستان ہی میں مہیا ہو جاتا تھا جس نے ان کو بیرونی دنیا سے قطعاً بےنیاز کر دیا

تھا، معاشرت کی سادگی اور فطرت کی قدر شناسی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ ان کے لاکھوں افراد لباس سے بھی مستغنی تھے، اور بمقتضائے فطرت جامہ عریانی پر قناعت کرتے تھے، البتہ جو زیادہ متمدن تھے وہ لنگوٹی باندھ لیتے تھے، یا بعض لوگ اس پر کچھ اور بھی اضافہ کر لیتے تھے۔

غذا بھی محض سادہ تھی نباتات، جنگلی پھلوں اور جانوروں کے دودھ پر گزر تھا، اور یہ چیزیں فطرت کی فیاضی سے یہاں کافی مقدار میں موجود تھیں، بس اسکے علاوہ زندگی کا اور کوئی اہم مقصد نہ تھا، جس کے لئے قدم باہر نکالیں نہ تو جہاں گیری اور کشورکشائی کا حوصلہ تھا نہ علمی تحقیقات کا ذوق و ولولہ، اس لئے صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کی ضرورت ہی کیا تھی، کئی صدیاں اسی حالت پر گزر گئیں، یہاں تک کہ مسلمانوں نے بزور بازو ہندوستان کے دروازوں کو کھولا، یہاں کے باشندوں کو تہذیب و تمدن سے آشنا کیا اور دنیا سے روشناس کرایا۔

زمانہ گزشتہ میں تعلقات بین الاقوام

اس میں شک نہیں کہ تمام دنیا ہندوستان کی طرح عزلت پسند نہ تھی بلکہ اس زمانہ میں بھی مختلف ممالک کے سیاح تحصیل علم و توسیع معلومات کی غرض سے سیاحت کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ چند اشخاص کی یہ سیاحت اتحاد بین الاقوام کا باعث نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک گروہ مذہبی سیاحوں کا بھی تھا جو زیارت حرمین یا بیت المقدس کے لئے سفر کرتے تھے، لیکن ان کے مقاصد سفر محدود اور دنیوی اغراض سے بالاتر تھے، اسلئے حجاج و زائرین کو دوسرے مقاصد پر توجہ کرنے اور مختلف اقسام کے لوگوں سے ملنے کا کافی موقع نہیں ملتا تھا غرض کہ ایک طرف تو قابلیت وسائل اور خطرات کی وجہ سے سفر کرنا آسان نہ تھا، دوسری طرف خبر رسانی کے ذرائع اس قدر ناقص تھے کہ بعض ممالک میں مدت تک جنگ جاری رہ کر صلح ہو جاتی تھی یا حکومت بدل جاتی تھی مگر دنیا کے دوسرے لوگوں کو

مہینوں برسوں خبر نہیں ہوتی تھی، البتہ جب کوئی سیاح اس طرف کا آنکلتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں حصہ دنیا میں یہ واقعہ پیش آیا۔

دَورِ جدید کی ابتدا

یہ حالات تھے جبکہ صلیبی محاربات نے یورپ کو ایشیا سے اچھی طرح روشناس کرایا، اور دونوں کو ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے کا زیادہ موقع ملا، اس کے بعد آہستہ آہستہ یورپ کا وہ دَورِ ترقی شروع ہوا جو اُنیسویں صدی میں معراجِ کمال تک پہنچ گیا، اس صدی میں علوم نے جس قدر ترقی کی اور انسان کی راحت و آسائش اور ترقی و عروج کے لئے جو سامان مہیا ہوا اور نوایجاد آلات نے انسان کی روزمرہ کی معاشرت میں جو تبدیلیاں پیدا کیں ان سب کے بیان کرنے کا تو یہ موقع نہیں، اسلئے ہم یہاں صرف بعض اہم ایجادات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو موجودہ زمانہ میں اپنے دُور رس نتائج اور انقلاب آفرینی کے لحاظ سے نمایاں امتیاز حاصل ہے، یعنی نقل و حرکت اور خبر رسانی کے نوایجاد وسائل جن کی وجہ سے اقوامِ عالم کے خیالات واعمال اور مذہب و معاشرت میں حیرت انگیز تغیر پیدا ہوگیا اور آج دنیا میں وہی قومیں سب سے زیادہ کامیاب ہیں جو ان وسائل سے سب سے زیادہ متمتع ہوتی ہیں۔

وسائلِ نقل و حرکت کا اثر تعلقات بین الاقوام پر

جدید وسائلِ سفر اور ذرائع پیام رسانی کا سب سے زیادہ مہتم بالشان نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام ایک دوسرے کے عقائد، خیالات، طرزِ معاشرت، اور رسم و رواج سے واقف ہوگئیں، اور ایک قوم نے دوسری قوم کے علوم سے فائدہ اُٹھایا، اسکے علاوہ ہر قوم کو دوسرے ملک کی خصوصیات ارضی سے واقف ہونے اور وہاں کی پیداوار اور مصنوعات سے متمتع ہونے کا موقع ملا۔

گزشتہ زمانہ میں تو صرف خاص خاص اولوالعزم سیاح ایسے ہوتے تھے جنکو ذوقِ تحقیق و تلاش، دشوار گزار منازل کے قطع کرنے یا بادبانی جہازوں کے خطرناک سفر پر

آمادہ کرتا تھا، لیکن اب یہ صورت ہے کہ دخانی جہازوں اور ریلوں نے مشرق اور مغرب کو باہم پیوستہ کردیا ہے، سینکڑوں جہاز اور گاڑیاں بحر و بر میں رات دن دوڑتی پھرتی ہیں، اور لاکھوں مسافر دنیا کے تمام بندرگاہوں پر روزانہ اترتے چڑھتے اور مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اس کے علاوہ اربوں روپیہ کا مال تجارت ان ذرائع سے یورپ و امریکہ کی خوبصورت اور ولآویز مصنوعات گھر گھر پھیل کر ہمارے لیے لازمہ حیات بن گئی ہیں۔ اور ان تجارت پیشہ ممالک کو دولتمند بنا رہی ہیں، اگر نقل و حرکت کے یہ وسائل نہوتے تو آج تجارت اور کاروبار میں یہ ترقی اور سرگرمی کیوں کر پیدا ہوتی۔ اور یورپ و امریکہ کی مصنوعات کو ایشیا کے بازاروں میں داخل ہونے کا موقعہ کس طرح ملتا، جو درحقیقت ان ممالک کی ترقی کا راز ہے۔

ایک خاص فائدہ ان جدید وسائل کا یہ ہے کہ ایک ملک دوسرے ممالک کی مخصوص پیداوار سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس طرح مختلف مقامات کی مختص المقام چیزیں ہوگئی ہیں جن سے تمام دنیا یکساں مستفید ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ فائدہ ان وسائل کی بدولت دنیا کو یہ پہنچا کہ علوم و فنون نے ترقی کی، اور مختلف قوموں نے دوسرے قوموں کے علوم سے اور زبانوں سے فائدہ اٹھایا جغرافیہ اور آثار قدیمہ کے متعلق جدید تحقیقات عمل میں آئی اور خدا کی اس کائنات کے متعلق نوع انسان کے معلومات میں اضافہ ہوا، انہی وسائل نقل و حرکت کی بدولت یورپ کی مختلف اقوام کا سیاسی اقتدار قریباً تمام دنیا پر قائم ہوگیا، اور جس قوم کے قبضہ میں یہ وسائل زیادہ تھے اسی نے زیادہ فائدہ اٹھایا چنانچہ گزشتہ عالمگیر جنگ میں اس کا تجربہ ہوا کہ جن سلطنتوں کے پاس ریلوے کا سلسلہ محدود تھا یا جہازوں کی تعداد ناکافی تھی انکو زیادہ نقصان اوٹھانا پڑا۔

جرمنی میں ریلوے لائن کا جال تمام ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہی برخلاف اس کے روس کی یہ حالت نہ تھی، اس بنا پر جرمنی کو فوج کی نقل و حرکت میں خاص آسانی تھی وہ بروقت ضرورت اپنی فوج ایک میدان جنگ سے دوسرے میدان

میں جہاں دشمن کا زور ہوتا منتقل کر دیتا تھا، نظام اتنا مستحکم اور باضابطہ تھا کہ اس نے دنیا کی مضبوط ترین سلطنتوں کا سالہا سال تک کامیابی سے مقابلہ کیا، لیکن برطانیہ کے وسائل جرمنی سے بھی زیادہ وسیع تھے، اس کے تجارتی جہاز دنیا کے تمام سمندروں میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر گوشہ سے سامان جنگ لا رہے تھے، نہ خام اجناس کی قلت تھی نہ اسلحہ کی، ہر چیز کافی مقدار میں بیرونی ممالک سے آجاتی تھی، انہی غیر محدود وسائل کا نتیجہ تھا کہ آخر کار برطانیہ کامیاب ہوا اور جرمنی باوجود اعلیٰ نظام اور جدید ترین اسلحہ کے ناکامیاب ہا، ٹرکی میں وسائل نقل و حرکت کی اور بھی زیادہ قلت تھی اسلئے فوج اور ذخیرہ جنگ کی نقل و حرکت میں دشواریاں پیش آئیں، اور انجام کار جزیرہ عرب فلسطین اور بغداد وغیرہ ہاتھ سے نکل گیا، اسی طرح موجودہ زمانہ میں صلح و جنگ دونوں حالتوں میں ذرائع پیام رسانی وتار برقی یا لاسلکی کا ہونا ضروری ہے، آج کل کسی خبر کا صحیح وقت پر نہ پہنچنا کبھی تو تجارت اور کاروبار کو تباہ کر دیتا ہے، کبھی نقشہ جنگ کو بدل دیتا ہے، کبھی ایک قوم کو دوسری قوم کے عزائم و اعمال سے بے خبر رکھکر نقصان پہنچاتا ہے۔

اقوام عالم کی پیوستگی اب دنیا کی اقوام باہم اس طرح پیوستہ ہو گئی ہیں۔ اور مختلف اقوام کے باہمی دوستی اور دشمنی کے تعلقات کچھ ایسے ناگزیر ہیں کہ ہر قوم کے لئے جو زندہ رہنا چاہتی ہے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسری اقوام کی ادنےٰ نقل و حرکت سے بھی ایک لمحہ کے لئے غفلت نہ کرے، آج جب دو قوموں میں صلح یا جنگ ہوتی ہے تو اس کا تعلق درحقیقت صرف انہیں دو قوموں سے نہیں ہوتا بلکہ درصورت جنگ اس کا سیاسی اور اقتصادی اثر دوسری اقوام اور ممالک پر بھی پڑتا ہے، اسی سبب سے آج ہر قوم کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے، کہ وہ دوسری قوموں کے معاملات صلح یا جنگ سے بھی نہ صرف خبر رکھے، بلکہ بوقت ضرورت اُن معاملات میں مداخلت کرے۔

آج لوزان میں صلح کانفرنس بیٹھی ہے اور معاملات کا تعلق زیادہ تر یونان یا عراق عرب

سے ہے لیکن باوجود اس کے تمام دنیا کی آنکھیں اس کانفرنس پر لگی ہوئی ہیں اور ہر ہر گھنٹہ کی خبریں بذریعہ تار تمام ممالک کے دفتر خارجہ اور اخبارات میں پہنچی جاتی ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آجکل تعلقات بین الاقوام نے کیا صورت اختیار کر لی ہے اور ہر قوم کو دوسری قوموں کے معاملات سے واقف ہونے بلکہ ان معاملات میں حصہ لینے کی کس قدرت ہی۔

اقوام عالم میں مسلمانوں کا درجہ

اب دنیا کی مختلف قوموں کے باہمی تعلقات اور مدارج ترقی کو پیش نظر رکھکر ہمکو یہ دیکھنا چاہیے کہ موجودہ اقوام عالم کی مجلس میں مسلمانوں کا کیا درجہ اور مرتبہ ہے اور دوسری قومیں ان کی ہستی اور قوت کا کس حد تک اعتراف کرتی ہیں، نیز یہ کہ مسلمانوں نے کہاں تک۔

مسلمان اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ہر جگہ ان کی حیثیت یکساں نہیں، کہیں وہ حاکم ہیں اور کہیں محکوم، کہیں ان کو زیادہ آزادی حاصل ہے اور کہیں برائے نام، لیکن باوجود اس اختلاف حیثیت کے ان کی عام حالت کم وبیش ہر جگہ یکساں ہے اور اگرچہ ان کی تعداد کم از کم ۴۰ کروڑ تجویز کی جاتی ہے مگر با ایں ہمہ اقوام عالم کے درمیان ان کو وہ اہمیت حاصل نہیں جس کے وہ اپنی تعداد کے لحاظ سے مستحق ہیں در اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ قوموں نے جن اسباب سے ترقی کی مسلمانوں نے انکو نظر انداز کر دیا اور ان ایجادات سے فائدہ نہ اٹھایا جن سے دنیا موجودہ دور عروج و ترقی تک پہنچی، اس لئے دوسری قومیں آہستہ آہستہ مضبوط و مستحکم بن گئیں اور مسلمان لازمی طور پر کمزور ہو گئے، تنزل صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ کوئی قوم اپنی جگہہ سے پیچھے ہٹ جائے بلکہ تنزل کی سب سے زیادہ افسوسناک صورت یہ ہے کہ دوسری قومیں ہم سے آگے بڑھ جائیں۔ کیوں کہ جیسے جیسے وہ بڑھتی جائیں گی ہماری ترقی کے دروازے بند ہوتے جائیں گے اور ہماری ہستی معرض خطر میں آجائیگی یہاں تک کہ آخرکار ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ ہم اپنی جگہہ سے بھی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونگے، اور یہ سکون و

جمود ہماری بربادی کا باعث ہوگا۔ اسلئے کہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں سکون موت کے ہم معنی ہے بلکہ سم قاتل کا حکم رکھتا ہے، دنیا میں صرف وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو بغیر ایک لمحہ توقف کئے برابر آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں، جس طرح اوائل عہد اسلام میں اہل عرب سیلاب کی طرح بڑھتے ہوئے چلے گئے، یہاں تک کہ دنیا کی بڑی بڑی مضبوط اور سرکش قومیں اس طوفان کے سامنے نہ ٹھیر سکیں۔ وہ برابر اسی طرح دنیا کو زیر و زبر کرتے ہوئے اس وقت تک آگے بڑھتے رہے، جبکہ اُن میں شخصی اغراض نے نشو و نما پایا، اور خانہ جنگی نے اُن کی خانہ بربادی کا سامان پیدا کر دیا، اسوقت تک اُن کی ترقی رُک گئی اور یہی سکون آخرکار اُن کے زوال کا باعث ہوا، کیونکہ دنیا کی دوسری قوموں نے جو آگے بڑھ رہی تھیں قدم قدم پر مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور ہر طرف سے انکو پیچھے ڈھکیلنا شروع کر دیا۔

سادگی اور صحت

نمبر ۵

ورزش وغیرہ کے ذریعہ سے صفائی

مندرجہ بالا نمبر دو میں جسم کو اندرونی اور بیرونی غلاظتوں سے پاک صاف کرنے کے متعلق متعدد طریقے عرض کئے گئے۔ اس نمبر میں جسم کا میل ورزش اور سانس کے ذریعہ سے خارج کرنے کے متعلق عرض کیا جائیگا

ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ جسمانی مشقت سے جلد پر پسینہ آجاتا ہے اور اسکے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جلد پر میل کی ایک تہ جم گئی، یہ میل دراصل اندرونی غلاظت ہے جو پسینہ کیساتھ جلد کے مسامات میں سے ہوکر اوپر آجاتی ہے جسکو پانی سے دھوکر صاف کر دیا جاتا ہے۔ جسم کو حرکت دینے اور ورزش کرنے سے یہ میل جلد پر زیادہ مقدار میں آجاتا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ ورزش کے ذریعہ سے اندرونی غلاظتیں

ہیں اور آسانی سے صاف ہوسکتی ہیں اور چونکہ عمدہ صحت کا انحصار اس پر ہے کہ جسم کو
پاک کیا جاتا ہے اسلئے ورزش کرنا بدیہی طور پر ایک لازمی اور ضروری چیز ہے اس ملک میں
لئے اور زیادہ سے زیادہ جوانوں کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بچپن اور جوانی
زش کے کچھ تندرستی رہ ہی سکتی ہے مگر بوڑھاپے میں بہت مشکل ہے کہ آلات ہضم اور دیگر
بغیر جسم کو حرکت دیے عمدگی سے کام کرسکیں مگر جبتک کہ بچپن اور جوانی میں ورزش نہ کی ہو
ورزش ہونہیں سکتی اسلئے یہ لازم آتا ہے کہ انسان کو بچپن سے بوڑھاپے تک اپنی عمر کے
نہ کوئی ورزش کرنی چاہیئے - اب سوال یہ ہے کہ کس قسم کی ورزش کیجائے - ہندوستان
رشیں کھیل کود کی ہیں جو انوں کی ورزشیں ڈنڈ مگدر ہیں یورپ میں کھلے میدان کے کھیل
غیرہ ہیں، ہر ملک میں بوڑھوں کے لئے ٹہلنے کی ورزش ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ محض ایک قسم کی
رد و رہنے سے جسم کے مختلف اعضا کا یکسانیت کیساتھ نشو و نما نہیں ہوتا - اکثر ورزشیں
ہیں جن سے ہاتھوں کے اور گردن وغیرہ کے عضلات بہت فربہ اور مضبوط ہوجاتے ہیں مگر
نا کا پوری طرح نشو و نما نہیں ہونے پاتا - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض وقت کسی کمزور عضو پر زیادہ زور
عضو کو سخت نقصان پہونچ جاتا ہے جنکا قلب ضعیف رہجاتا ہے اُنکے قلب کی حرکت بند ہوجاتی ہے
اس فن کے ماہروں کی رائے یہ ہے کہ جہانتک ممکن ہو ایسی ورزشیں کی جائیں جن سے جسم کے
نہ کچھ حرکت ہوا سکے لئے بیشمار ورزشوں سے واقف ہونیکی ضرورت ہے مگر یہ ضرور نہیں
م ورزشیں کی جائیں بلکہ وقتاً فوقتاً ہر عضو سے کچھ نہ کچھ کام لیا جائے -

ن کی جسقدر عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اُس سے ورزش کرنے کی قابلیت سلب ہوتی جاتی ہے اور
ضعیف لوگونکو ورزش کرنیسے قلب پر زیادہ زور پڑتا ہے اسلئے مناسب ہے کہ ایسے لوگ لیٹ کر
ورزشیں کریں جنکی تفصیل کسی موقعہ پر کیجائیگی - بعض لوگ ورزش کیلئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ
ھ روزانہ کیجائے ورنہ بالکل نہ کیجائے - بیشک روزانہ پابندی کیساتھ ورزش کرنا بہت اچھا
لکل ورزش نہ کرنیکے کبھی کبھی ورزش کرلینا بدرجہا بہتر ہے اسلئے ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ

ورزش اس طریقہ سی شروع کیجائے کہ کبھی ناغہ نہونے پائے بلکہ جب موقعہ ہو ورزش کیجائے اور نہو سکے تو چھوڑ دیجائے، تھوڑے دنوں تک ورزش کرنے اور چھوڑنے سی اور پھر کرنے سے اکثر یہ ہوتا ہی کہ ورزش سی رغبت ہوجاتی ہی اُسمیں لطف آنے لگتا ہی اور پھر اوسکی عادت ہوجاتی ہی۔

سانس کی ورزشیں

جس قدر ورزشیں ہیں اونمیں انسان کا سانس پھولتا ہی اسلئے جسم کی ہر حرکت میں قدرتی طور پر سانس کی ورزش ہوتی ہی مگر بعض سانس کی ورزشیں ایسی بھی ہیں جو بغیر زیادہ مشقت کے کیجاسکتی ہیں اور اونکے ذریعہ سے بھی صحت جسمانی کو بہت فائدہ ہوتا ہی۔ انسان کا قلب مثل ایک ایسے پمپ کے ہی جسمیں سی زور کیساتھ خون پھینکا جاتا ہی اور وہ تمام جسم میں پھیل جاتا ہی وہانسے وہ خون جسم کی غلاظتوں سی غلیظ ہوکر صاف ہونیکے لیے پھیپھڑونمیں آتا ہی جو تازہ ہوا ناک میں سی ہوکر پھیپھڑونمیں داخل ہوتی ہی وہ غلیظ خون کو صاف کرکے اُسکو اس قابل بنادیتی ہی کہ وہ قلب کے ذریعہ سی تمام جسم میں منتشر ہوکر جسم کا تغذیہ کرے جس نسبت سی تازہ ہوا پھیپھڑونمیں داخل ہوگی اوسی نسبت سی وہ خون کو زیادہ صاف کرکے اُسکو اس قابل بنائیگی کہ وہ جسم کا زیادہ تغذیہ کرسکے لوگ غلطی سی سمجھتے ہیں کہ مرغن اور لذیذ کھانوں سی جسم میں بہت قوت آتی ہی حالانکہ معمولی سادہ غذا، تازہ اور عمدہ ہوا سی زیادہ کوئی چیز جسم کی حقیقی قوت بخشنے والی نہیں ہی سانس کی ورزشوں کی انگریزی میں بہت سی کتابیں ہیں جنمیں میرے نزدیک سب سے بہتر مُلر کی کتاب ہی جو صاحب سانس کی ورزش کی سب سے زیادہ سہل صورت یہ ہی کہ بھاگتے یا ٹہلتے میں موہنہ بند کرکے خوب لمبا سانس ناک سی لیا جائے اور ساتھ کی ساتھ قدمونکو شمار کیا جائے، مثلاً شروع میں چار قدم تک سانس کھینچا جائے، دو قدم سانس روکا جائے اور اسیطرح چار قدم سانس خارج کیا جائے پھر سانس روک کر چار قدم سانس اندر کھینچا جائے وغیرہ وغیرہ

جب پھیپھڑونکی قوت بڑھ جائے تو چار قدم کی جگہ پانچ اور پھر چھ کردیے جائیں اور اُنہیں شمار کیا جائے اس طریقہ سی ورزش یکساں ہوتی ہی ہواخوری سہل ہوجاتی ہی اور یہ صحت کیلئے نہایت مفید ہی۔

ٹہلنے کے علاوہ جس قدر بھی ورزشیں انسان کرتا ہی اونمیں اگر اسی طرح لمبے سانس لئے جائیں اونہیں شمار کیا جائے تو ساتھ کی ساتھ سانس کی ورزشیں ہوجاتی ہیں جو بہت مفید ہیں۔

(طفیل احمد)

مدراس کی پنجسالہ تعلیمات پر

(سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء تا سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء)

تنقیدی نظر

معذرت

گزشتہ و پیوستہ باہ میں پنجاب اور متحدہ صوبہ کے پنجسالہ نتائج تعلیم پر جس تدقیق و تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے افسوس ہے کہ مدراس کے پنجسالہ پر اتنی گہری نظر ڈالنے سے معذوری ہے۔ کچھ اسلئے کہ حکومت کی سالانہ روداد میں نقشہ نمبر ۳ و نمبر ۶ ہمیشہ سے طلبہ زیر تعلیم اور کامیاب کی تعداد قوم وار، شعبہ وار اور درجہ وار دکھاتے چلے آتے ہیں مگر پانچ چھ سال سے مدراس کا نقشہ نمبر ۶ (کامیاب طلبہ) اس تفصیل سے خالی ہوتا ہے یعنی فنون اور معلمی کے شعبوں میں بی اے کے کامیاب طلبہ کی میزان آخر درج کر کے خانہائے ۱۶ تا ۲۳ میں یہ تفصیل نہیں دکھائی جاتی کہ قوم وار کتنے طلبہ پاس ہوئے

وجوہ معذرت

ایسی صورت میں یہ معلوم کرنا نہایت مشکل ہے کہ تعلیم میں پانچ سال کے اندر کس کس قوم نے کتنی ترقی کی۔ اور قوم کے اکابر اور تعلیمی جماعتوں کی سعی کہاں تک مشکور ہوئی۔

معذوری کی ایک خفیف وجہ یہ بھی ہے کہ شمالی حصص ملک اور جنوبی ہند میں بجز تجارتی واسطہ کے محض معاشرت کی بنا پر بہت زیادہ ارتباط نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہل مدراس خصوصاً مسلمانوں کی حیات منزلی کی اکثر خصوصیات سے شمالی ہند والے کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ ایسی حالت میں مسلمانان مدراس کی تعلیمی ترقی و تنزل یا ان کے اسباب و نتائج پر سرسری نظر ڈالنے سے وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو تبصرہ و تنقید کا منشا ہے تاہم سلسلہ بیان میں کوشش کی جائیگی کہ قارئین کرام اہل مدراس کے خصائص سے

اس حدتک واقف ہو جائیں کہ ان کے جنوبی برادران وطن تعلیم کی کس منزل میں ہیں؟

آبادی — صوبہ مدراس کے ۱۴۲۲۶۰ مربع میل کے اندر ۴۲۳۱۸۹۸۵ نفوس آباد ہیں ان میں ۲۸۴۰۴۸۸ مسلمان ہیں، ۳۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو منجملہ ان کے ۱۸۰۱۵۱ لڑکے ۱۳۰۷۴ لڑکیاں یعنی کل ۱۹۳۰۸۸ مسلمان بچے بحساب فیصدی اپنی کل آبادی میں

تعلیم — ۶ر۸ کی نسبت سے زیر تعلیم تھے جن میں ۱۰ر۸ لڑکے اور ۲ر۹ لڑکیاں ہیں مدارج تعلیم کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جدول مناسب

نقشہ الف طلبہ زیر تعلیم مستخرج از رودادِ حکومت مدراس

سنہ		مدارج ثانوی				مدارج ثانوی				ابتدائی	
		علوم وفنون		پروفیشن		علوم وفنون		پروفیشن		علوم وفنون	
		ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمات	ہندو	مسلمان
سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء	علوم مغربیہ	۴۹۱۷	۱۴۱	۱۶۹۵	۴۱	۱۲۸۱۳۷	۶۶۴۰	۱۱۶۰۰	۹۳۹	۹۹۵۶۷۵	۱۱۴۴۸۲
	علوم مشرقیہ	۲۳۶									
	میزان	۵۱۵۳									
سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء	علوم مغربیہ	۴۶۸۳	۱۸۲	۱۳۷۳	۱۸	۱۱۵۹۳۷	۶۰۷۹	۸۰۹۵	۷۹۷	۹۰۱۳۸۸	۱۰۳۳۱۲
	علوم مشرقیہ	۱۸۶									
	میزان	۴۸۶۹									
بیشی		۲۳۴ ۵۰	۴۱	۳۲۲	۲۳	۱۲۲۰۰	۵۶۱	۳۵۰۵	۱۴۲	۹۴۲۸۷	۱۱۱۷۰
تخمیناً اوسط سالانہ		۲۸۴ ۵۷	کمی	۶۵	۵	۲۴۴۰	۱۱۴	۷۰۱	۲۸	۱۸۸۵۷	۲۲۳۴

تنقید

یہ صرف لڑکوں کی تعداد ہی جدول کا آخری اندراج جس میں پانچ سال کی ترقی کی اوسط سالانہ دکھائی گئی ہی مسلمانوں کی رفتار کا بخوبی اندازہ کراتا ہی۔ ابتدائی درجہ میں ۳۳۴۹۱ طلبہ ان غیر امدادی اور غیر مسلمہ تعلیم گاہوں کے بھی شامل ہیں جو ملاں مدرسوں اور مکتبوں سے موسوم ہوتے ہیں اُن کو خارج کرکے دیکھیں تو باضابطہ پرائمری مدرسوں

پرائمری

میں پانچ برس کی تگاپو کے بعد صرف ۲۲۳۴ مسلمان بچوں کا سالانہ اضافہ کسی طرح بھی وجہ تسلّی نہیں ہو سکتا، صرف ایک طفل تسلّی ہے کہ بحساب پیوستہ یعنی مارچ سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء میں غیر امدادی و غیر مسلمہ مکاتب میں ۴۰۱۸۶ طلبہ تھے مگر مارچ سنہ ۱۹۲۲ء میں ان کی تعداد ۳۳۴۹۱ رہ گئی ادھر مسلمہ اور امدادی کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا یعنی ۱۴۲۶۲۸ سے ۱۴۹۱۳۲ ہوگئی۔ یہ غالباً مسلمان انسپکٹران مدارس کی حسن سعی کا نتیجہ ہی کہ مسلمان مدراس کا رُخ بے ضابطہ تعلیم اور بے قاعدہ مدارس سے پلٹ کر اب مروجہ نظام تعلیم کی جانب پھرتا جاتا ہے۔ بے قاعدہ تعلیم اور تعلیم گاہوں کا اندازہ نقشہ نمبر ب مندرجہ صفحہ آئندہ سے ہوگا۔ پھر بھی رُوداد کے تفصیلی نقشوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اس خفیف ترقی میں شمالی سرکار اور تنجور کے علاقوں کے مسلمان پیش پیش ہیں جنوبی کنارہ اور بلاری کے اضلاع سب سے پیچھے ہیں۔ پروفیشن کے اعلیٰ اور ثانوی مدارج میں مسلمان

پروفیشن

پورا ایک قدم بھی نہ بڑھے تاہم اب انہیں مفید تعلیم کا احساس ضرور ہونے لگا ہی چنانچہ پہلے سے اب تعداد زیادہ ہے گو قانونی درجہ میں ۶۴۲ ہندوؤں کے مقابلہ میں کُل ۱ مسلمان اور جنگلات میں ۵۲ ہندوؤں کے مقابلہ میں کل ۷ مسلمان قابل فخر نسبت نہیں مجموعی طور پر بھی علوم و فنون کے مدارج اعلیٰ میں وہی عبرتناک تنزل ہے جو صوبہ متحدہ میں ہوا۔ تنزل اتفاقیہ

تنزل کا سبب

نہیں بلکہ تدریجی رفتار کے ساتھ سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء سے شروع ہو کر سال گزشتہ تک اس طرح پہنچا ہی کہ گویا ایک مجوزہ نظام کے ماتحت ہوا ہی اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

سنہ	سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء	سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء	سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء	سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء	سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء
تعداد	۱۸۲	۱۷۶	۱۷۰	۱۶۳	۱۳۸

یہ وہی انقلاب انگیز زمانہ ہے جو دَور ترک موالات سے موسوم ہے۔ زیر تعلیم کے بعد نقشہ کامیاب طلبہ پر نظر ڈالئے۔ تو شبہ ہوتا ہے کہ شاید مسلمانان مدراس کو بوجہ توکل تعلیم کی ضرورت نہیں

جدول تناسب

سنہ	علوم مغربیہ				السنہ مشرقیہ		قانون		طب		انجینیری		معلمی		زراعت	
	ایم اے		بی اے													
	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان
	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
سنہ ۱۹۲۲ء	۱۸	۱	۸۸ ۱۲۲۲	۳	۵۱ سنسکرت سندیافتہ	۰	۳۱۶	۴	۳۰	۰	۳۸	۲	۰ ۲۴۱	۰	۱۷	۰
سنہ ۱۹۱۷ء	۴۹	۱	۱۰۵ ۵۸۰	۱	۲۶ سنسکرت سندیافتہ	۰	۱۷۷	۱	۱۹	۰	۳۵	۰	۹۵	۰	۰	۰

نوٹ:- ۱۲۲۲ - ۵۸۰ اور ۲۴۱ کے اعداد صوبہ بھر کے کامیاب طلبہ کی میزان کل ہے جسمیں کچھ تمیز نہیں کہ کتنے مسلمان، ہنود اور کتنے پارسی اور یہود ہیں

قانون | مثلاً قانون میں مسلمانوں کو ہندوؤں سے کچھ نسبت نہیں۔ ٨٠ ہندوؤں کے مقابلہ پر ایک مسلمان ہے طب جس میں سائنس کا علم ضروری ہے ایک بھی مسلمان نہیں۔ انجنیری میں اگر دو صورتیں

انجنیری | نظر آتی ہیں تو یہ الیکٹریکل کی شاخ میں ہیں۔ باقی فنون اور معلمی کے بی اے سب ملے جلے درج ہیں پتہ نہیں چلتا کہ کون کتنے ہیں، نہ ہم ترقی و تنزل کی رفتار معلوم کر سکتے ہیں۔

ایک خصوصیت | زیر تعلیم اور کامیاب دونوں نقشوں میں ایک عجیب و غریب خصوصیت نظر آتی ہی یعنی حکومت کی روئداد اور یونیورسٹی کے کلینڈر میں جیسا کہ صوبہ کے نظام تعلیم میں ہی اورینٹل کالجوں اور مدرسوں کا جا بجا پتہ ملتا ہے مثلاً صوبہ بھر میں ١٢-١٣ اورینٹل کالج سررشتہ تعلیم کے ماتحت کام کر رہے ہیں ان میں ۱۹۱۵ء سے ٣٢ تعلیمی وظیفے بھی جاری ہیں

السنہ مشرقیہ | سال گزشتہ میں ٣١ ہندوؤں کو سرومنی اور ٢٠ کو ودوان کی ڈگریاں ملیں تخمیناً ٢٥ ہزار روپیہ سالانہ مصارف پبلک کے محاصل سے ادا کیا گیا ان کے علاوہ ثانوی اور ابتدائی درجہ کے کم سے کم ٢٥١ مدارس مردانہ اور زنانہ کھلے ہوئے ہیں اور کل سالانہ خرچ ٣٤٢٠٣٧ روپیہ ہے مگر تعجب ہی کہ یہ سارا نظام ہندوؤں کے لیے ہی مسلمانوں کو کبھی اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ یونیورسٹی یا سررشتہ تعلیم ایک مجلس علمیہ ہے جس کی شان فیاضانہ علم پروری ہے مگر مدراس میں محض سنسکرت پروری کے معنی پرورش علوم ہیں اورینٹل

مسلمانوں کی حق تلفی | تعلیم سے ایک مردہ زبان کی تعلیم مراد لینا اور فارسی و عربی کو جو کروڑوں افراد کی حکمراں قوموں کی زندہ زبانیں اور مسلمانوں کی مذہبی اور ملی ذخائر کی محافظ ہیں بزم علم سے یک قلم خارج کر دینا علم پروری کی دلیل نہیں۔ مدراس کے مسلمانوں کو ان دونوں زبانوں سے اور تیسری اردو سے اتنی محبت ہے جتنی تلیگو اور تامل یا اردو سے ہے چنانچہ صوبہ بھر میں اس وقت ١٢٤ عربی و فارسی کے وہ مدرسے ہیں جن میں بہت سے سنسکرت کے مسلمہ کالجوں سے

اسلامیہ مدارس | اور باقی مالوی سکولوں کے ہم پلہ ہیں اور ٥١٧ ابتدائی تعلیم اور قرآن مجید کے مدرسے کھلے ہوئے ہیں جن کا سالانہ خرچ تقریباً ایک لاکھ روپیہ وہ اپنی جیب خاص سے ادا

کرتے ہیں ۳۶ زنانہ مدرسے معہ ۱۴۳ طالبات اور دیسی زبان کی مکتبیں اس سے الگ ہیں، اکیلے مالابار میں ۹۳ اعلیٰ اور ۳۲۹ ابتدائی مدرسے ہیں یونانی اور ویلور کے مدارس دینیات اور ایک انجمن بہت زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں جن میں تخمیناً سولہ سترہ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں، سنہ ۱۹۱۷ء میں ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس خاص نظام تعلیم سے مسلمانان مدراس کی مذہبی اور علمی و ادبی ضرورتیں بلاشک پوری ہوتی ہیں مگر اعلیٰ اورینٹل ڈگریاں نہ ملنے سے یہ نقص ہے کہ عربی، فارسی کے اعلیٰ مدارس کا اُفق دنیاوی لحاظ سے وسیع نہیں ہوتا۔ نہ طلبہ کی تحصیل پر مہر قبول ثبت ہوتی ہے وہ صرف مولوی اور ملّاں بن کر رہ جاتے ہیں، چوب مسجد و اوراق مصحف نہ قابل سوختن نہ قابل فروختن۔

مالابار اور نظام تعلیم مشرقیہ

مہر قبول

بہرحال مدراس کی ذمہ دار مجالس علمیہ نے عربی و فارسی کے ساتھ گزشتہ ۳۲ برس میں کوئی خاص حسن سلوک نہیں کیا بلکہ اُردو کو جو مسلمانان مدراس کی ملی زبان ہے ترقی دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بجز اس کے کہ بلاری اور اُدونی جیسے کوردہ مقامات میں جہاں مسلمانوں کا تعلیمی مذاق صوبہ بھر میں سب سے کم درجہ پر ہے اُردو کو برائے نام مدارس میں داخل کیا ہے اور تیراپیوڑ کے ہائی اسکول میں بھی ایک ٹوٹا پھوٹا اُردو کا منشی مقرر ہوا ہے، پندرہ ۱۵ وظائف تین تین روپیہ کے اور ۲۸ چھ چھ روپیہ کے کل ۴۳ وظائف ثانوی مدارس میں اُردو خواں طلبہ کے لئے منظور ہوئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابتدائی مدارج کو بالکل کورا چھوڑ کر ثانوی سے اُردو کی تعلیم شروع کرنا مفید ہوگا یا نہیں، وجہ یہ کہ صوبہ مدراس میں حسب روداد مردم شماری سنہ ۱۹۱۱ء تخمیناً ۹۷،۵۰۶۴ اُردو بولنے والے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ دس لاکھ سمجھ لو۔ اس لئے اُردو بھی مسلمانان مدراس کے لئے السنۂ مکسوبہ میں داخل ہے اور متوسط اور اعلیٰ گھرانے اُردو دانی کو اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں۔

اُردو کا نظام تعلیم

بلاری، ادونی، تیراپیوڑ

وظائف خاص

معلوم ہوتا ہے کہ سررشتہ تعلیم مدراس کو مساوات کے اصول پر حق رسانی کا خیال تو ہے مگر اکثر سہو و نسیان واقع ہو جاتا ہے چنانچہ برسوں بعد سنہ ۱۹۲۲ء میں سررشتہ کو یاد آیا

اُردو داں مدراسی سررشتہ تعلیم کی بیداری

تحقیقاتی کمیشن

اور ایک تحقیقاتی کمیشن اس مقصد کے لئے جاری کی گئی کہ علوم مشرقیہ میں عربی فارسی کو بھی کیوں نہ شامل کیا جاسے اور یونیورسٹی میں اس شعبہ کا اضافہ کرکے آیندہ سنسکرت کے ساتھ عربی وفارسی کے کاملین کو بھی کیوں اعلیٰ ڈگریاں نہ دی جائیں۔ مگر سوء اتفاقی سے سرشتہ کو کمیشن کی روئداد پر اطمینان نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک اسکی وجہ ۹۹ فیصدی ضرور یہ ہوگی کہ کمیشن میں باذاق مسلمانوں کی کافی تعداد نہ ہوگی، نااہل عنصر کا فیصلہ امور تنقیح طلب کے متعلق تسلی بخش نہیں، با ایں ہمہ مایوسی ایک قسم کی بدگمانی ہے، ایک مجلس علمیہ کی شان سے یہ امر بعید ہے کہ وہ عربی، فارسی زبانوں کو ان کے اپنے گھوارہ (یونیورسٹی) میں بھی پناہ نہ لینے دیگی۔ چنانچہ روئداد سے واضح ہوتا ہے کہ کرنول کے مدرسہ اسلامیہ نے الحاق کی درخواست دیکر اپنے نصاب میں منشی فاضل اور فضل العلماء کے درجوں تک نظام درس ترتیب دیدیا ہے اسکے بعد خاص مدراس کے چار عربی مدارس اور تنجور کے سولہ عربی، فارسی کے مدرسوں میں بعض پُر رونق اور ممتاز ہیں ان کا الحاق ہونا قرین قیاس ہے۔ مالابار میں تو اکثر مدارس عربیہ کالج بننے کے قابل ہیں۔ موپلے جو ابھی زمانہ کو ایک سخت امتحان دیکر بیٹھے ہیں اس قابل نہیں کہ سرشتہ تعلیم ان کے حقوق کو نظرانداز کردے اور ان کی تعلیم گاہوں میں مغربی علوم کی روح نہ پھونکے۔

عربی فارسی کا داخلہ

مجلس علمیہ کی شان

الحاق کا سلسلہ

اہل اسلام توجہ کریں

ہم مسلمانان مدراس کو خاص توجہ دلاتے ہیں کہ اگر کسی قوم کی قومی یا مذہبی زبان جیتے جی مرجائے تو وہ قوم بہ لحاظ خصائص وعقائد ضرور اپنے مرکز سے گر جائیگی۔ چنانچہ اسپین کی موجودہ اسلامی نسلیں اس کی مجسم شہادت ہیں زبان کے مرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہی اور معقول وجہ ہے کہ دنیاوی اغراض کے حصول کے لئے الگ مدرسے ہوں اور دینی مقاصد کے لئے الگ، اسلام کا ہمیشہ سے یہی تقاضا رہا ہے کہ معاش اور معاد اور انکے حصول کے ذرائع کو ملا کر ایک کرلیا جائے، یہی تقاضا تھا کہ جس نے مسلمانوں کے ماہران تعلیم کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ حکومت اعلیٰ ہند سے مسلمانوں کے حق میں ایک خاص

ایک اصل

اسلام کا تقاضا

رزولیوشن تعلیم پاس کرائیں جس کا منشا ہر صوبہ میں کم و بیش پورا ہو رہا ہے۔ نیز ملک کی اکثر یونیورسٹیوں نے شروع ہی سے عربی۔ فارسی اور سنسکرت تینوں کو السنۂ مشرقیہ کی فہرست میں جگہہ دی تھی۔ لیکن مدراس کے سررشتہ تعلیم اور یونیورسٹی نے ۱۸۵۷ء سے آج تک مسلمانوں کے قومی اور مذہبی حقوق کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور چونکہ علوم و فنون عموماً سلطنت کی پرورش بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور ان کے ساتھ قوموں کے خصائص و عقائد بھی مضمحل ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس میں اسلامی تہذیب ہندویت سے بہت کچھ متاثر ہو گئی، بجائے اسکے کہ مدراس کے مسلمان قومی زبان اردو سے عموماً آگاہ ہوتے اور انکے متوسط اور اعلیٰ طبقے فارسی و عربی سے واقف ہوتے اسلامی سوسائٹی پر ٹامل کا قبضہ ہو گیا، ٹامل۔ تیلیگو ملیالم۔ کناری۔ ٹوڈا۔ کوٹہ۔ یہ سب دراوڑی کی شاخیں ہیں اور دراوڑی زبان پر سنسکرت اور پراکرت کا بیحد اثر ہے۔ ٹامل یا اروہ ادھر میسور اور گھاٹ تک اور ادھر مدراس سے آگے تک اور نیچے سیلون کے شمالی حصہ تک تمام جنوبی ہند پر چھائی ہوئی ہے اس کا ذخیرہ الفاظ وسیع ہے قدیم زمانہ سے ترقی یافتہ ہے اس کا ادب مالا مال، طرز ادا کتابی اور تکلم الگ الگ ہے اور اہل مدراس کی تمام ضروریات زندگی کی بہت اچھی طرح کفالت کر سکتی ہے اس نے اندر ہی اندر مسلمانان مدراس کے خصائص اور عقائد کو ضرور صدمہ پہنچایا ہے چنانچہ مسٹر طوفی کمشنر مردم شماری ۱۹۱۱ء اپنی روداد میں اس قضیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ہندوؤں کے دھرم شاستر اور ویدانت کے دقیق مسائل کے سراسر برخلاف مذہب اسلام میں یقیناً سادگی کی صفت ہے۔ "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" اتنا آسان ضابطہ ہے کہ ہر ایک کی سمجھ میں آسکتا ہے اور اپنی وضع میں تقریباً ہمہ گیری اور جامعیت کی شان رکھتا ہے جن اشخاص کو اس کلمہ کے دوسرے رکن (یعنی رسالت) میں اعتراض ہے انہیں واضح ہو کہ اول تو رسول (عربی) نے خود کبھی یہ اعلان نہیں کیا کہ اس رکن کے ماننے پر نجات کا انحصار ہے پھر اگر اس قضیہ پر ٹھنڈے دل سے بغیر تعصب کے

غور کریں تو یہی کلمہ کا یہ رکن محض انسانی عقل کا ایک تقاضا اور حقیقی رکن (توحید) کا لازم و ملزوم ہے۔ فرض کرو کہ سچا خدا ایک اور صرف ایک ہی ہے اندریں صورت یہ بحث کرنا بہت مشکل ہے کہ جس شخص نے عرب کے بت پرستوں میں اس عقیدہ کی تبلیغ کر کے درجہ قبول حاصل کیا جس کے ملفوظات آج بارہ سو برس سے دنیا کے دو پونے دو ارب نفوس کی رہبری کرتے چلے آتے ہیں وہ شخص رسول خدا نہیں ہے۔ یہ ضد غالباً انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ ہر ایک مذہب میں جو ابتداءً عام صداقتوں کے اظہار کا مدعی ہوتا ہے اختلاف اور تفرقہ ڈالدے۔ یہ ہی ممکن ہے کہ جو مذہب محض اعتبار ہی پر قبول کر لیا جاے اور جس کے عقائد میں نہ کسی کو شک و شبہ ہو اور نہ آزادانہ مباحثوں کے ذریعہ سے اوس کی جڑ مضبوط ہو ایسا مذہب ضعف سے خود ہی متزلزل ہو جاے مذہب اسلام بھی کچھ اسی قسم کے اسباب سے مستثنیٰ نہیں معلوم ہوتا''

مسلمانوں کی تعداد میں ہندوؤں کے مقابلہ میں ۱۱ فیصدی زیادہ کی ترقی ہی غالباً اسلئے کہ ہندو دہرم کے مقابلہ میں یہ مذہب تبلیغ کو اپنا فرض جانتا ہے چنانچہ مالابار کے موپلوں میں تمام جنوبی ہندوستان سے زیادہ مذہبی ذوق و شوق ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تعداد میں ۴۹ فیصدی کی بیشی ہوئی اور گویا اب یہ قوم اس حصہ ملک کے تمام مسلمان اقوام میں ۳۰ فی صدی ہے''

مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب زمانہ ماضی کے واقعات ہیں پہلے تبلیغ کا نظام ہوگا مگر اب کہیں نہیں لہذا مسلمانوں کی تعداد میں ترقی دو طرح ہوئی ایک تو بذریعہ ترقی نسل دوسرے اسلئے تعداد بڑھی کہ اس مذہب میں جذب کرنے کی اندرونی قوت ہے یا یہ صفت ہے کہ جس حالت میں ہو اس میں یہ اپنے پیرووں کو بے تکلف آرام و آسائش بخشتا ہے۔

روحانی زور آزمائیوں کا تذکرہ مردم شماری کی روداد کے سلسلہ میں نازیبا ہے۔ رقیب اور متقابل مذاہب کی فضیلت یا ارذلیت سے ارکان و عقائد کی بنا پر بحث کرنا

مناسب نہ ہوگا لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ مدراس میں اسلام اور ہندو دھرم رفتہ رفتہ آپس میں ملتے جاتے ہیں، چاہے اس کا سبب کسی ایک فریق کا حسن تدبر ہو یا قدرتی واقعات کا نامعلوم اثر ہو، نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہندوانی رسوم زور کے ساتھ رائج ہیں، بیماری کے دیوتاؤں کی منتی۔ پیر پرستی۔ عام ہندو دیویوں کی پوجا۔ قدیم آثار و مظاہر کی پرستش۔ جادو ٹونے۔ غیب دانی اور پیشین گوئی کا شوق، ولادت اور بیاہ شادی میں ہندوؤں کی رسمیں عموماً جاری ہیں جس طرح ہندو دسہرہ پر اپنے اوزار پوجتے ہیں، مدراس کی بعض مسلمان قوموں میں بقرعید پر اپنے اوزار و ہتھیار کی پوجا کرتے ہیں، ہندوانی نام عام ہیں، مسجد میں نہیں جاتے، نہ احکام اسلامی کے مطابق نماز پڑھتے ہیں بلکہ دیوتاؤں اور پیروں کو نذر بھینٹ دیتے ہیں"

جدید خیالات اور جذبات حریت کی ترقی نے دینی پیشواؤں کی حکومت کو مٹا دیا ہے مگر اس کے قائم مقام اب تک کوئی قوت پیدا نہیں ہوئی۔ "جماعت" کے نام سے وہ پرانی محتسب انجمنیں اب باقی نہیں رہیں، جن کا اعلیٰ کارکن "پٹیل" اکا رعب آج کل کے سرکاری افسر سے زیادہ تھا۔ مسجدیں خراب و خستہ اسلامی اوقات کا مصرف بالکل غلط۔ عوام الناس یا فرائض منصبی سے ناواقف اور یا ان کی ادائیگی میں سست اور بے پروا ہیں، ضرورت ہے کہ کوئی جدید قوت پیدا ہو کر سست اور بہل انگاروں کو معزولی کے گڑھے سے نکالکر مشغول کار کرے۔ کسی ایسے امام وقت، مجدد و مصلح کا خروج ہو جو پرانی ہڈیوں میں نئی روح پھونکدے"

یہ ہیں زریں خیالات ایک انگریز کے جس نے ذمہ دارانہ حیثیت سے تحقیق و تدقیق کے بعد وسیع اور مفید نتائج نکالے۔ اگرچہ تبلیغ اور اسلام توام الفاظ ہیں اور ابتدا سے کبھی دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔ مزید بریں شمالی ہند کے بعض حصوں میں جس عجلت اور سراسیمگی کے ساتھ آج تبلیغ اسلام ہو رہی ہے اس کو پیش نظر رکھکر بھی تبلیغ سے زیادہ برگزیدہ اور کوئی فرض حاملان اسلام کا نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم اہل مدراس سے اس قدر اہم مطالبہ نہیں کرتے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ تلقین و اسلامی تعلیم کا ایک نظام بڑے پیمانہ

پر ضرور قایم کرلیں اور مسٹر ملونی نے جن اقوام کی بدعقیدگی کا ذکر کیا ہے ان کی خبر لینا مناسب ہوگا۔

مسلمانان مدراس سے ہماری دوسری استدعا یہ ہے کہ وہ اپنی خاص تمام درسگاہوں میں اُردو زبان کو لازمی قرار دیدیں، عام اس سے کہ وہ اعلیٰ عربی، فارسی کے مدارس یا قرآن خوانی کے مکاتب ہوں یا دیسی زبان کی تعلیم گاہیں خواہ وہ غیر مسلمہ و غیر امدادی ہوں یا محض مسلمہ ہوں جن کی کیفیت نقشہ ذیل سے واضح ہوتی ہے۔

	مردانہ		زنانہ		میزان	
	تعداد مکاتب	تعداد طلبہ	تعداد مکاتب	تعداد طلبہ	تعداد مکاتب	تعداد طلبہ
اعلیٰ و ثانوی	۱۳۴	۵۸۲۲	۰	۰	۱۳۴	۵۸۲۲
ابتدائی	۷۱۵	۲۷۶۶۹	۳۶	۱۴۳۷	۷۵۱	۲۹۱۰۶

محض امدادی اور بے ضابطہ نصاب کا ایک مدرسہ بھی نہیں مگر مسلمہ اور امدادی بارہ مدرسے [۱۲] اور ۸۱۲ لڑکے، لڑکیاں ہیں جو پرائمری اسکولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مگر انہیں ڈسٹرکٹ یا لوکل فنڈ سے کوئی مدد نہیں ملتی صرف پراونشیل فنڈ سے ۸۶۴ روپیہ سالانہ مقرر ہیں اور ۵۲۹ روپیہ کل مصارف کا مابقا حصہ انہیں اپنی جیب سے دینا پڑتا ہے اسکے علاوہ مفصلہ بالا مدارس خاص کا کل خرچ ۸۰۱۸۴ روپیہ بھی وہ خود ہی ادا کرتے ہیں، دوسری طرف جب ہم ٹول اور پاٹ شالاؤں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۵۴۶ درسگاہیں باضابطہ پرائمری اسکول میں شامل ہوکر انہیں پراونشیل۔ لوکل دونوں فنڈ سے ۱۸۵۷۸ روپیہ کی سالانہ امداد ملتی ہے جو ان کے کل خرچ ۳۸۷۱۸ روپیہ سے تقریباً آدھی ہے روداد کے صفحہ ۱۱۱ پر تسلیم کیا گیا ہے کہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں ۵۵۹ پاٹشالے بے قاعدہ مدرسوں کی مد میں تھے۔ جن میں سے اب ۳۳۱ کو لوکل اور میونسپل بورڈ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ سررشتہ تعلیم کی توجہ مسلمانوں کی تعلیم کی جانب کم ہے یا ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ کے ممبروں میں مسلمانوں کا کافی عنصر نہیں ہے کہ وہ ان دونوں مدوں سے مسلمانوں کی تعلیم میں ضرورت کے مطابق امداد دلائے مسلمانان مدراس سے استدعا ہے کہ وہ اس پنجسالہ کی روئداد کو غور سے پڑھکر دیکھیں کہ تعلیم میں ان کی حق تلفی کہاں تک ہوئی اور اس کی نسبت صوبہ کی حکومت کو متوجہ کریں پھر بھی ۱۹۲۲ء مسلمانان مدراس کے لئے مبارک ہونے سے خالی نہیں مثلاً مدراس میں ایک گورنمنٹ محمدن کالج اور وانیمباڑی میں اسلامیہ کالج اسی سال درجہ اعلیٰ پر پہنچے۔ گو یہ سلسلہ ۱۹-۱۹۱۸ء سے جاری تھا مگر مدراس کالج کو ابھی تک عمارت نصیب نہیں ہوئی۔ قدیم عمارت مدرسہ میں عارضی طور پر کام چل رہا ہے۔ ان کے علاوہ گنتور اور کرنول میں دو ثانوی اسکول اور ایک مدرسہ اسلامیہ ترچناپلی میں جاری ہوئے یعنی گورنمنٹ نے ان کا انتظام و مصارف عارضی طور پر اپنے ذمہ لے لیئے۔ ان کی بدولت اب مسلمان طلبہ کی تعداد ۷۰۰ سے ۸۲۳ تک پہنچ گئی ہے تعلیم نسواں کے لئے رویا پیٹا میں ایک ماڈل اسکول جاری ہے۔ ایک ایسا ہی مدرسہ ترچناپلی میں بھی ہے مدراس کے زنانہ ثانوی مدرسہ میں ۴ وظائف بھی دیئے جاتے ہیں لیکن موپلوں کی تعلیم میں ترقی نہیں۔ پچھلے دنوں مالابار میں جو ناگوار واقعات پیش آچکے ہیں اگر ان کے ہونے کا احتمال ایک دو سال پیشتر کیا جاتا تو شاید ذمہ دار جماعت اس کو ہذیان تصور کرتی۔ مگر اب تو یہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک زبردست واقعہ ہے جس کو کوئی مورخ قلم انداز نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں موپلوں کی تعلیم کے لئے ایک خاص اور موثر نظام قائم کرنا لازمی ہے۔

(حامد علی صدیقی)

داغ دگر (یادِ رفتگاں)

صاحبزادہ مولوی محمد داؤد خاں صاحب مرحوم نے کچھ عرصہ جانکاہ علالت کے بعد بالآخر ماہ گزشتہ میں بمقام دہرہ دون جناب آنریبل نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب خان بہادر ممبر کونسل وائسرائے ہند۔ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی۔ پریسیڈنٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی آغوش پدری سے جوار رحمت میں انتقال کرکے نواب صاحب کو دوسرا داغ جگر دیا۔ مرحوم اکلوتے فرزند تھے اور نہایت رنج و قلق ہے کہ عین عنفوان شباب میں بعمر ۱۵ سال خاندان بھر کی امیدوں کو ساتھ لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ نواب صاحب کے لیے اس پیرانہ سالی اور قومی کاموں کے ہجوم میں یہ حادثہ درحقیقت جانکاہ اور ناقابل برداشت تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جناب ممدوح نے استقلال اور صبر ایوب کے ساتھ مشیت ایزدی کے سامنے سر جھکا دیا ہے انکی غیر معمولی روحانی قوت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ خدا کی ایک نعمت سے محروم ہو کر عبادی الشکور زندگی کی باقی نعمتوں کو نہیں بھولتے۔ نواب صاحب کی ذات بابرکات قومی خدمات میں ضرب المثل ہے یہ وہ برگزیدہ ہستی ہے جس نے آج چالیس سال سے علیگڑھ کی تعلیمی تحریک میں قلم۔ قدم۔ درم سے ہمیشہ دریا دلی کے ساتھ امامت کی۔ ان کی اس کوفت سوخت سے صاحبدلان قوم کو تہ دل سے ہمدردی ہے امید ہے کہ وہ اپنے متقدم سرسید محسن الملک وقار الملک کی طرح نفس مطمئنہ کو ہاتھ سے نہ دینگے کہ مخدومان قوم کا یہی ایک نشان امتیاز ہے۔

(صدیقی)

الذین اذا اصابتهم مصیبة قالوا انا لله وانا الیه راجعون

ٹرکی کا نظام تعلیم

۲۱ اپریل کے ضمیمہ تعلیم میں ہمعصر لندن ٹائمز نے اس عنوان پر کسی قدر بیدلی کیساتھ قلم فرسائی کی ہے ہم اس کا صرف اقتباس لینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ علم مابعد الطبعیہ کی طرح دنیا میں ایک جدید شعبۂ حیات۔ مابعد الحرب خود بخود وضع ہو گیا ہے پچھلے جنگ نے کچھ اس قدر کایا پلٹ کی کہ دنیا کی ہر ایک قوم کو خواہ وہ میدان میں گری یا سخت مقام امتحان میں آئی خواہ وہ ضارب تھی یا مضروب۔ شریک جنگ تھی یا بے تعلق غرضکہ ہر ایک قوم کو اپنی ضعیف ہستی معلوم ہو گئی ضعف کے اسباب مختلف قوموں نے مختلف قرار دیے ہیں مگر ایک سبب کو تمام اقوام نے مشترکاً و منفرداً تسلیم کیا۔ یعنی تعلیم کا نقص اور اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر ایک قوم کو اس کے سوا اور کوئی دھن ہی نہیں۔ پچھلے مہینہ میں بالشوک کا جدید نظام تعلیم قارئین کرام کی نظر سے گزر چکا ہے جنکی ہستی بالکل زیر و زبر ہو گئی ہے۔ اس مرتبہ جمہوریہ ٹرکی نے جو کچھ اصلاحیں کی ہیں اسکا کسیقدر نامکمل حال ہمعصر لندن ٹائمز سے لیکر پیش کیا جاتا ہے۔ ترک بھی زیر و زبر ہونے سے نہیں بچے یہ بھی شکنجہ سے نکل کر بے تحاشہ تعلیم کے میدان میں دوڑ رہے ہیں۔ مگر بالشوک کیطرح ان کو بھی اقتصادی مشکلات درپیش ہیں۔ اسمٰعیل ظفر بے وزیر تعلیمات حکومت انگورہ نے سال آیندہ کے میزانیہ میں ایک رقم کثیر بغرض اصلاح و تجدید تعلیم طلب کی ہے اجرا میں یہ بھی ایک فرد مزید ہے جس نے فی الحقیقت نظام تعلیم کو تلپٹ کر دیا ہے ترقی کی وہ وہ راہیں نکالی ہیں اور طلبہ اور اساتذہ کے لئے وہ وہ سہولتیں پیدا کی ہیں کہ سلطان عبد الحمید خاں کے دور میں کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہونگی۔ اساتذہ کا مشاہرہ بڑھانے پر وزیر کو بے حد اصرار ہے۔ پچھلے دنوں ۲۵ فی صدی کا اضافہ دلا چکا ہے جسکی رو سے مدارس ابتدائی میں ۷۰ پونڈ سالانہ یعنی تخمیناً ۷۵ روپیہ ماہوار ہوتا ہے۔ پرائمری کے

اعلیٰ درجہ میں یہ مشاہرہ بڑھ کر ۱۱۰ پونڈ یعنی تخمیناً ۹۵ روپیہ ماہوار ہوجاتا ہے۔ ثانوی مدارس میں خاص ترکوں کی شرح ۱۷۴ سے ۱۹۶ پونڈ یعنی تخمیناً ۱۵۰ سے ۱۷۰ روپیہ ماہوار تک۔ مگر چونکہ انہیں حق شناسی کا مادہ بھی ہے اسلئے وہ آفاقی اساتذہ کو اس سے زیادہ مشاہرہ دیتے ہیں۔ اگر ٹائمز کی رائے پر چلیں تو بے تکلف مان لینا چاہیے کہ ترک ہم ہندوستانیوں سے بھی زیادہ مفلس ہیں لیکن ممکن ہے کہ ان کا معیار زندگی اور پیمانہ تمول ہم سے زیادہ ہو۔ شاید ہندوستان میں سب سے ادنیٰ سکہ ایک پائی یا ایک کوڑی کے مقابلہ میں ترکوں کا ادنیٰ سکہ اس سے زیادہ قیمتی ہو لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بھی ہم سے کم گرفتار افلاس نہیں ہیں تاہم ہندوستان کے پرائمری استادوں کے مقابلہ پر ترکی میں ہر رتبہ اساتذہ کا مشاہرہ بہت ہی زیادہ ہے۔ پنجاب میں ۸۰ سے ۱۰۰ ایک درجہ چہارم کے اساتذہ کا مشاہرہ ہے جو ثانوی مدارس کے اعلیٰ درجہ یعنی ہائی اسکول میں ادق مضامین پڑھاتے ہیں اور ۵۹ سے ۷۰ روپیہ تک درجہ پنجم کی شرح تنخواہ ہے جو سند یافتہ ہیں اونچی کلاسوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں اور ۱۴۰ سے ۱۹۰ روپیہ تک درجہ دوم کے ان سند یافتہ اشخاص کو ملتے ہیں جن میں اکثر انٹرنس میں جواب کالج کلاس ہو گیا ہے ہیڈ ماسٹر اور وائس پرنسپل ہیں۔ ظاہر ہے کہ کافی آمدنی ہو تو نفس مطمئنہ کی برکت شامل حال رہتی ہے اور جب یہ ہو تو تعلیمی نتائج بھی شاندار ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں تعلیم کی رفتار میں جو ایک حیرت انگیز تنزل بلکہ پسپائی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

مدارس

سب سے بڑا متن لور حاشیہ قسطنطنیہ کا ہی کافی سامان سے شاندار ترکی مدرسے بھی زیادہ تر اس خطہ میں ہیں جیسا کہ نقشہ ذیل سے واضح ہوگا ۱۴۴ سرکاری مدارس ابتدائی اور ۳۰ خاص مدرسے ہیں ثانوی درجہ کے ۴۵ مدرسے بلا دارالطلبہ ہیں اور ۱۱ مدرسوں کے ساتھ دارالطلبہ بھی ہیں۔ ان سب میں ۲۱۸ مرد اور ۱۴۵ استانیاں ہیں۔ انکے

علاوہ ۲۱۱ مدرسے ویسے اور ۱۲ معہ دار الطلبہ مدرسے خاص یونانیوں کے ہیں۔ ان میں ۳۶۲ استاد اور ۴۸ استانیاں پڑھاتی ہیں انکے بعد خاص ارمنوں کی جانب سے ۱۹۶ ویسے اور ۱۶ معہ دار الطلبہ مدارس الگ ہیں ان میں ۴۵۰ مرد اور ۱۶۰ عورتیں تعلیم دیتی ہیں۔ یہودیوں کے جانب سے بھی کچھ مدرسے ہیں جن کا اہتمام خاص اسرائیلیہ انجمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ ۹۱ ویسے مدرسے اور ایک مدرسہ معہ دار الطلبہ ہے جن میں ۳۷۸ مرد اور ۷۲ عورتیں معلم ہیں۔ ان میں بعض کے ساتھ ابتدائی مدارج تعلیم بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ترکوں کے پانچ دار الترتیب والتعلیم خاص اشخاص کی جانب سے جاری ہیں اور ۱۶ کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو لائسی کہتے ہیں۔ آخر الذکر میں ۲ مردانہ دار الطلبہ ہیں اور ۲ زنانہ ہیں۔ یہودیوں کی جانب سے بھی ایک دار الاقامت کھلا ہوا ہے جن کا انتظام ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان میں ۱۰ سے ۲۲ برس تک کے طلبہ لئے جاتے ہیں اگر کل میزان لگائی جائے تو حسب ذیل جدول مستخرج ہوتی ہے۔

	قسم مدارس	تعداد مدارس	تعداد اساتذہ	تعداد استانیاں
ترک	ابتدائی وثانوی	۲۷۸	۲۱۸	۱۴۵
〃	دار الترتیب	۲۱		
میزان ترک		۲۹۹	۲۱۸	۱۴۵
یونانی	ابتدائی	۲۲۳	۳۶۲	۴۸
ارمنی	〃	۲۱۲	۴۵۰	۱۶۰
یہودی	〃	۹۲	۳۷۸	۷۲
〃	دار الترتیب	۱		
میزان غیر ترک		۵۲۸	۱۱۹۰	۲۸۰

بادی النظر میں ترکوں کے ابتدائی اور ثانوی مدارس، دار الاقامت اور دار الترتیب

بہ لحاظ تعداد اور سامان اغیار سے بہت گرے ہوئے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ ترک ٹھوکر کھاکر ہی نہیں سنبھلے۔ لیکن قارئین کرام بھول نہیں کہ یہ اعداد و شمار عین اوس زمانہ کے مابعد فراہم کئے گئے ہیں۔ جبکہ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ تھا اور غیر ترک اقوام کے لئے ترقی کی راہیں معمول سے زیادہ کھلی ہوئی تھیں۔ اب وہ دور نہیں بلکہ اغیار کے مدارس حکومت کے نصاب اور ضابطہ کے پابند ہیں غلطہ سرائے کا قدیم کالج۔ جو کبھی سلطان محمود ثانی کے عہد میں قائم ہوا تھا، ایک اور شاندار تعلیم گاہ ہے جس میں ۸ سے ۲۰ برس کی عمر تک کے طلبہ داخل ہوتے ہیں اور تقریباً سب دارالاقامت ملحقہ میں سکونت رکھتے ہیں اس کالج کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ ممالک و اقوام غیر کی تاریخ فرانسیسی میں پڑھائی جاتی ہے، اور جس قدر مدارس ہیں اون سب میں ترکی زبان میں علم تاریخ و سیر کی تعلیم لازمی ہے، تجویز ہے کہ غلطہ سرائے کے نمونہ پر جابجا کالج قائم کئے جائیں۔ خصوصاً سمون، سمرنا، عدرنہ میں غلطہ کالج کی دوسری خصوصیت السنہ مغربیہ کی تعلیم ہے مثلاً فرانسیسی، انگریزی اور جرمن نیز بانونکی تعلیم جدید تجویز کا اہم جزو یہ ہے کہ کم سے کم ۶۰ کنڈر گارٹن وضع کی تعلیم گاہیں قسطنطنیہ کے حلقہ میں قائم کی جائیں۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ اناطولیہ کو ۵ حلقوں میں تقسیم کر کے ہر ایک میں ایک دارالاقامت معہ دارالترتیب و تعلیم گاہ (ایسی) قائم کی جائے جس میں ۵ یا ۶ سو طلبہ کی سکونت کا انتظام ہو سکے۔ ادھر ا نارمل سکول معہ دارالاقامت ایک مردانہ ایک زنانہ بھی قائم کیا جائیگا ان میں ۶۰ اساتذہ کام کرینگے۔ جامع قسطنطنیہ میں بھی بہت بڑا انقلاب واقعہ ہوا ہے، اس میں ادبیات، دینیات قانون، طب، علوم الطبیعہ پہلے سے تھے، اب تجارت کا شعبہ بڑھایا گیا ہے سنہ ۱۹۲۰ء سے ایل ایل ڈی کی سنہ ۱۹۲۳ء سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں صادر ہونے لگی ہیں۔ ایم ڈی پہلے سے دیجاتی تھی۔ دینیات، طبیعات، تجارت میں ہنوز کوئی درجہ فضیلت لیکر نہیں نکلا۔ (سید محمد زبیر)

فہرست انعامات خوش خطی صوبہ متحدہ

نام حلقہ	نام مقامات	درجہ معہ مدرسہ	نام طالب علم	نشانات امتیاز
بنارس	جام پور	جماعت نہم گورنمنٹ ہائی اسکول	ناصر حسین خاں	سند خوش خطی معہ مبلغ سے ر نقد
"	ڈیاہو	مڈل اسکول	منیر احمد	سند
"	مرزاپور	جماعت دوم گورنمنٹ ہائی اسکول	قدیر اعظم	سند
"	اسلامنڈھا	مڈل اسکول	رسول احمد	سند و مبلغ عا ر
"	جون پور	جماعت پنجم گورنمنٹ ہائی اسکول	اعزاز رستم	سند معہ مبلغ للعہ ر
لکھنؤ	لکھنؤ حسین آباد	ہائی اسکول	رحیم بخش	سند معہ مبلغ عا ر
"	حسین گنج شاہ آباد	درجہ دوم	حکمت اللہ خاں	سند معہ مبلغ عہ ر
"	لکھنؤ	انٹرنس کلاس سی-ایم ہائی اسکول	انوار حسین رضوی	سند معہ مبلغ سے ر
"	گوپامئو	ٹاؤن اسکول	ہرہر سنگھہ	سند معہ مبلغ عا ر

حیرت انگیز متبرک تحفہ

چاندی کی نہایت ہی خوش نما۔ دلفریب اور منقش انگوٹھی کے چھوٹے سے ہشت پہلو خوشنما، سرخ یا سبز یا آسمانی نگینہ پر حیرت انگیز صنعت سے خوش نما سنہری بیل کے درمیان پختہ سنہری سیدھے خوشنما حرفوں میں تمام سورہ قل ہو اللہ شریف ایسی خوش نما اور صاف کندہ ہے کہ دیکھکر طبیعت خوش ہو جاتی ہے فی انگوٹھی دو روپیہ اگر سورہ قل ہو اللہ کے نیچے اپنا نام بھی خوش نما سنہری سیدھے حرفوں میں کندہ کرائیں تو فی انگوٹھی دو روپیہ چار آنہ اسی قسم کی کلمہ طیبہ یا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ یا اَللّٰہُ اَکْبَر یا سُبْحَانَ اللّٰہِ یا حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل یا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ یا سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِیْم کندہ شدہ نگینے والی انگوٹھیوں میں سے ہر ایک کی قیمت عہ مع نام خریدار ۱۲ ہے آٹھ آنہ کے ٹکٹ بھیجکر نمونتاً ایک نگینہ منگالیں۔ رسالہ کا حوالہ ضرور دیں۔

وعدہ۔ اگر انگوٹھیاں خراب ہوں واپس کر کے اپنی قیمت مع محصول منگالیں۔

پتہ۔ منیجر کارخانہ متبرک انگوٹھی۔ گوجران اسٹریٹ پانی پت (ضلع کرنال)

جان صحت یعنی "کام شاستر"

ہر شخص اپنی زندگی راحت و تندرستی سے گذرانا چاہتا ہے اگر صحت نہو تو ایسی زندگی کو بے سود جان کر اس کو موت پر ترجیح دیتا ہے مگر آپ تندرستی کے کامل بھیدوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں اور ہمیشہ تندرست اور طاقتور اور نوجوان ہی رہنا چاہتے ہیں تو ہماری کتاب

"کام شاستر"

جو اٹھارہ زبانوں میں ترجمہ شدہ ہے اور آجتک ہم جسے رفاہ عام کے لئے تخمیناً ۱۲ لاکھ مفت تقسیم کر چکے ہیں ہم سے صرف ایک کارڈ بھیجکر مفت طلب کر کے ملاحظہ فرمائیں اسکا محصول بھی ہم ادا کرینگے

ویدشاستری منی شنکر گووندجی ہیڈ آفس جام نگر کاٹھیاواڑ

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپے گا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف (سے) مقرر ہے جو بنام چیف اکوٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھیجنا چاہیے اور منی آرڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کردی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لئے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین پر بشرط پسند نامہ نگاریوں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شائع ہوسکتے ہیں، اُجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ ہونا چاہیے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

سلسلہ جدید جلد ۱ | رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۲۸ | جون ۱۹۲۳ء
نمبر ۱۲ | ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ

کانفرنس گزٹ

یعنے

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

جس میں

مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصول تعلیم، نظام تعلیم مروجہ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر
بحث کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری کانفرنس

باہتمام منشی عبدالسلام

مطبع فیض عام علی گڑھ میں چھپا

فہرست مضامین

شذرات

شذرات - - - - - - - - - اڈیٹر
شاہی پیغام طلبہ مدارس ابتدائی کو - - - - - - ۱ — ۲
پولیس میں تعلیم کی رفتار - - - - - - - ۳ — ۵
ہمارا مایۂ ناز - - - - - - - - ۵ — ۶
نئی کشمکش - - - - - - - - - ۷ — ۸
جلالی میں عاجزانہ خدمت کا ثمرہ ۸ — ۰

مقالات

نطق و گویائی کو آواز سے کیا تعلق ہے - ابو الحسنات قریشی ۹ — ۲۲
اقوام عالم میں مسلمانوں کا درجہ - مولوی اکرام اللہ خاں ندوی

تنقید و تبصرہ

کورگ کی روداد تعلیم بابتہ ۱۹۲۱-۲۲ء مولوی حامد علی صدیقی - - ۲۳ — ۳۵

اصلاح تمدن

کوآپریٹو سوسائٹی اور اس کا نظام اساسی - مولوی حامد علی صدیقی - - ۳۱ — ۴۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

شاہی پیغام ۲۴ مئی کا دن قلمرو برطانیہ میں امپائرڈے یعنی یوم سلطنت قرار دیا گیا تھا جسے سوسائٹی کے ہر طبقہ نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق منایا مگر انگلستان کے ابتدائی مدارس میں بچوں نے جس طرح اس مبارک دن کی خوشی منائی شاید بڑوں کو بھی اس پر مدتوں رشک رہیگا۔ ع

کہ رشک آنے لگا میرے دنوں کو میری راتوں پر

ملک معظم اور ملکہ معظمہ نے سررشتہ تعلیم کی ایک نئی اور نرالی تجویز کو شرف قبول بخشکر اس دن ایک وقت مقررہ میں تمام ابتدائی مدرسوں کے بچوں کو عجیب و غریب طریقہ سے شاہی پیغام بھیجکر حوصلہ افزائی فرمائی یعنی اول کلام الملوک کو لفظ بہ لفظ شاہی زبان سے گراموفون کے ریکارڈ میں بھرا گیا تاکہ زیادہ پُراثر اور ولولہ انگیز ہوجائے پھر اس سے لاکھوں ریکارڈ بڑی احتیاط اور رازداری کے ساتھ تیار کرکے ۲۴ مئی کو عین وقت پر مدرسوں میں بھیجے گئے جہاں پہلے سے گراموفون مہیا تھے

چنانچہ ہر مدرسہ میں ایک وقت مقررہ پر شاہی پیغام بچوں کو سنایا گیا جس سے اسقدر جوش مسرت پیدا ہوا کہ بچوں کے دلوں سے سالہا سال یہ مبارک دن فراموش نہ ہوگا اور ان کی ہمت اور حوصلہ افزائی میں برقی قوت کا کام دیگا۔ افسوس ہے کہ شاہی پیغام اس پرچہ کے پریس میں جانے سے پہلے ہمیں میسر نہیں ہوا جولائی کی اشاعت میں ہدیہ ناظرین کیا جائیگا ہم ۲۴ مئی کے دن کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسلئے کہ وہ جذبہ جس نے اس دن دونوں طرف دلوں میں مشعلیں روشن کر دی تھیں یعنی ایک طرف قوم کی نوخیز اُمت میں شہ پرستی کا عقیدہ اور دوسری طرف دودمان فرماں روائی میں رعیت پرستی کا جوش پیدا کر دیا تھا وہ جذبہ مشرقی ممالک میں ناپید ہے حالانکہ یہی ایک جوہر ہے جو قوموں کی رفتار ترقی میں انتہا درجہ کی تیز قدمی پیدا کر دیتا ہے اسباب چاہے کچھ ہوں ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں مگر نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اگر ہم اس کی نقل بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے نہ خیالات وعقائد کا ایک مرکز ہے اور نہ کوئی ایک مسلّمہ قوت ہے جس کی ادنیٰ تحریک پر تمام افراد متحرک ہو کر۔ ایک خیال میں ڈوب جائیں فرض کرو کہ ہم بھی یوم تعلیم کے نام سے ایک دن منائیں اور ابتدائی مدارس میں پیغام بھیجکر ننھے بچوں میں تعلیم وتہذیب کا شوق پیدا کرنا چاہیں تو کونسی قوت کی طرف سے پیغام بھیجا جائیگا؟ جسکو سنکر سب سر تسلیم خم کرلیں گے اور سب کے دلوں میں تہ دل سے مطلوبہ جذبات امڈ آئینگے؟ مذہب کی مشعل ہاتھ میں لیکر دیکھئے تو شمار کرنا مشکل ہوگا جب سیاسی چراغ کی روشنی ہندوستانی پبلک پر پڑیگی تو بھی کئی درجن فرقے نظر آئیں گے خلاصہ یہ کہ حیات کے جس شعبہ کی بنا پر تلاش کرینگے ایک جامع الناس مرکز نہیں ملیگا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم تعلیم کے کٹھن میدان کو جس میں امتیاز و افتراق نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکتا ہے کیونکر طے کرینگے۔ اور کیونکر ایک ساتھ منزل مقصود پر پہونچکر کامیابی حاصل کرینگے ہندوستان زبان حال سے

فریاد کرتا ہے۔

لختے بردار از دل گذرو ہر کہ ز پیشم
من قماش فروش دل صد پارۂ خویشم

پولس میں تعلیم
جیسا کہ نقشہ ذیل سے واضح ہوگا گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں اس قدر جہل نہ ہوگا جس قدر پولیس میں ہے حالانکہ پولسمین کو اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے کم سے کم اتنا خواندہ ہونا کہ وہ موقع پر کسی اتفاقیہ واردات کو قلمبند کرے نہایت ضروری ہے اس ضرورت کو نظر انداز کر دیجئے کہ خواندہ اور تعلیم یافتہ اشخاص سے پیش آنے میں پولس کو اخلاق کی کس قدر ضرورت ہے اور پھر اس اخلاق پر تعلیم کا کیا اثر ہے۔

صوبہ	تعداد فی صدی	
	ناخواندہ	خواندہ
ممالک متحدہ آگرہ و اودھ	۸۶	۱۴
ممالک مغربی و شمالی سرحدی	۷۹	۲۱
آسام	۷۲	۲۸
پنجاب	۶۷	۳۳
بمبئی	۴۶	۵۴
بہار و اوڑیسہ	۳۶	۶۴
بنگال	۲۸	۷۲
برما	۱۶	۸۴
مدراس	۹	۹۱

نقشہ سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ برما اور مدراس میں خصوصیت کے

ساتھ جاہل ملازم نسبتاً کم ہیں اور صوبہ متحدہ جو کبھی علم و تہذیب کا گھر تھا اور اب بھی اس میں اگر خواندہ آبادی زیادہ نہیں تو تعلیم یافتہ آبادی بمقابلہ اکثر صوبوں کے زیادہ ہے مگر اس میں جاہل سپاہی سب سے زیادہ ہیں اس کی یہ وجہ نہیں کہ بنگال برما یا مدراس میں پولس کے لئے کوئی خاص نظام تعلیم جاری ہے جس سے صوبہ متحدہ یا سرحدی صوبہ۔ آسام یا پنجاب محروم ہے بلکہ اصلی وجہ غالباً یہ ہے کہ برما کی دیہقانی آبادی میں خاص مذہبی اور پاٹ شالے گاؤں گاؤں کھلے ہوے ہیں اور بودھ مذہب کے پیرو اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم کے پردہ میں کم سے کم خواندہ کرا لیتے ہیں۔ مدراس میں عام لوگ ۵۰ فی ہزار خواندہ ہیں جیسا کہ روداد مردم شماری چودہ دفتر کانفرنس سے واضح ہوتا ہے۔ ان میں اگر ۹۰ فی صدی پولس کے ملازم خواندہ ہوں تو کچھ تعجب نہیں یہ ایک کلیہ ہے کہ سواحل ملک کے باشندے بوجہ کاروبار تجارت وغیرہ کے۔ اندروں ملک کے باشندوں سے زیادہ خواندہ ہوتے ہیں اسی وجہ سے بمبئی، بہار واوڑیسہ اور بنگال کے صوبوں میں بھی خواندہ آدمیوں کی تعداد زیادہ ہے اور جاہل ملازمان پولس کی تعداد کم ہے۔

بنگال کا شمالی حصہ یعنی مشرقی بنگال و آسام بھی گو بنگال ہی ہے مگر اندرون ملک میں واقع ہونے کی وجہ سے اس میں خواندہ مردم شماری کم اور جاہل ملازمان پولس زیادہ ہیں۔ جنوبی حصے میں تعلیم کا شوق انگریزی اثر کے ساتھ شروع ہوا تھا جس کو اب ڈیڑھ دو سو برس ہوے۔ عام تعلیم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

بہر حال اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جس طرح افواج کے لئے ایک مستقل نظام تعلیم نہ صرف قائم ہے بلکہ نہایت عجلت سے اپنا کام کر رہا ہے فوج کے جاہل سپاہیوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اسی طرح ہندوستان کی پولس کے لئے بھی ایک سنجیدہ اور حقیقتاً کارآمد اور قابل عمل نظام قائم کر کے کم سے کم پولس مینوں سے

سے کام شروع کیا جائے جہاں سپاہیوں کو قواعد کے سوا زیادہ کام نہیں ہوتا اور وہ وقت کا بہت سا حصہ تعلیم میں بے تکلف صرف کر سکتے ہیں۔ پولس کا موجودہ نظام تعلیم بہت جلد منزل مقصود پر پہونچانے والا نہیں۔

ہمارا مایہ ناز

فن تعلیم میں علماء مغرب کی جدید تحقیقات کا تذکرہ ضمناً کئی مرتبہ ہو چکا ہے یہ محض حسن ظن نہیں جیسا کہ اکثر جدت پرستوں کا دستور ہے بلکہ ایک وسیع اور عمیق مطالعہ کتب کا نتیجہ ہے۔ کانفرنس کے کتب خانہ کی کئی الماریاں اُن بیش بہا کتابوں سے معمور ہیں جن میں تعلیم کو ایک وسیع علم و فن قرار دیکر بے شمار شعبوں پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ایک شعبہ میں یورپ اور امریکہ کے ممتاز ماہرین نے ہزارہا صفحوں کو زینت دی ہے۔ علوم طبعیہ کی جس جس شاخ کو اس فن سے نسبت ہے اس پر ابتدا سے اُنیسویں[۲۰] صدی کے عشرہ اول تک کی بلند پایہ تصانیف ہماری لائبریری میں موجود ہیں۔ اور کئی سو کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جو عشرہ دوم کی علمی تحقیقات کے نتائج سے مالا مال ہے ولایات غیر سے عنقریب آنے والا ہے۔

ابتدائی۔ ثانوی۔ اعلیٰ اور یونیورسٹی کی تعلیم کے اصول وضوابط اور ان کے متعلق تمام مواضیع پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ اور تنقید کی گئی ہے۔ بچوں کے ملاں اور میانجی سے لیکر پروفیسروں تک کے لئے اصول تعلیم و تدریس کا یہ ایک مایہ ناز ذخیرہ ہے جس پر کانفرنس اب تک ہزاروں روپیہ صرف کر چکی ہے۔

اس مواد کو متعدد حصّوں پر تقسیم کر کے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ تعلیم و تربیت کے تمام اصول اور فروع ابجد خوانی سے لیکر فارغ التحصیل تک الگ الگ مدوں میں مرتب کئے گئے ہیں۔ مثلاً الف (A) سے ز (G) تک سات بڑے مد ہیں۔ اس میں ا کو لو تو اسکے پانچ ذیلی مد ہیں اور ہر ایک ذیلی میں متعدد ضمن ہیں۔ مدا میں تمام تر فن تعلیم کی تاریخیں ہیں مثلاً (۱) میں یونانیوں۔ رومیوں اور اور قدیم اقوام کی طرز

تعلیم سے لیکر زمانہ حال تک کی تعلیمی تاریخیں موجود ہیں پھر مغرب کے ممتاز ماہران فن تعلیم کی سوانح عمریاں ہیں۔ اسی ضمن میں تصانیف پر تبصرہ یا تنقید کی گئی ہے۔ مثلاً پسٹالوزی (حکیم فسطالوز) کی تصانیف پر تنقید ہے۔ دوسرا مد اصول تعلیم بضابطہ تعلیم جن کے پھر الگ الگ ذیلی مداور ضمنی مد ہیں۔ اصول میں ایک نہایت شاندار مد بچوں کے علم النفس کا ہے جس پر یورپ کے محققین نے بیش بہا تصانیف پیش کی ہیں اور بچوں کی اصل وحقیقت اور بچپن کے خواص وعوارض سے بحث کر کے گویا ابتدائی تعلیم کا دور بدل دیا ہے۔

لائبریری کا دوسرا حصہ معلومات عامہ اور کتب جدولیہ سے متعلق ہے جس کی کئی المارئیں ہیں انیسویں صدی کے ربع آخر خصوصاً اس صدی کے شروع سے تمام ہندوستان کے تعلیمی اعداد وشمار نہایت ادنیٰ تفصیل کے ساتھ صوبہ وار اور قوم وار معلوم ہو سکتے ہیں۔ حکومت اعلیٰ اور حکومت ہائے صوبہ کے تقریباً ہر صیغہ خصوصاً تعلیمات مردم شماری۔ گزٹیر وغیرہ اور ان کے متعلق تمام جرائد وصحائف بلکہ اکثر دیسی ریاستوں کے تعلیمی مکتوبات بھی موجود ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملک بھر میں اس سے بہتر ذخیرہ شاید کسی اور جگہ ملے۔ قارئین کرام کو کانفرنس گزٹ کے مضامین کے مطالعہ سے خود واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ذرائع معلومات کہاں تک واقعاتی ہیں۔ گزٹ کے اکثر مضامین اس لائبریری سے مستخرج کیے جاتے ہیں۔

کشمکش بعض مقامات میں ہندو مسلمانوں میں ایک عجیب بنا پر خفیف کشمکش ہونے لگی ہے یعنی آریہ سماج بے خبر اور بے اختیار خود عام کنوؤں پر چماروں کے ڈول ڈلوا کر انہیں ہندو مسلمانوں کے ساتھ پانی بھرنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔ ہنود کو بوجہ لاعلمی یا مساحت اس سے تعرض نہیں ہوتا۔ مگر مسلمان سخت برافروختہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر انہوں نے بالاتفاق یہ تجویز کر لیا کہ اہل ہنود سے کوئی ترچیز نہ خریدی جائے نتیجہ

یہ ہوا کہ عین عید پر حلوائیوں کی دوکانیں بالکل بے رونق ہوگئیں بالآخر معافی مانگی گئی اور چماروں کا ڈول کنوے سے اُٹھ گیا۔ اس خفیف واقعہ سے دو اہم نتیجے نکلتے ہیں۔

تعلیم یعنی عام تعلیم اور اصلاح تمدن کی اشد ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آریوں کا یہ فعل محض جوش پر مبنی تھا اور عقل کے بازار میں جوش سے زیادہ کوئی جنس ناپائدار اور ارزاں نہیں ہے پیرایہ میں بھی ضروریات عقلی اور حقائق زندگی سب سے گراں بہا اور پائدار ہے۔ (یہ رائے واقعات حاضرہ کی بنا پر ہے) اگر آریہ سماج عقل سے کام لیتے اور اب کام لیں تو چاہیے کہ بے دریغ روپیہ خرچ کر کے چماروں کی تعلیم کے لئے خود آگے بڑھ کر مدرسے قائم کریں۔ جب یہ تعلیم یافتہ ہونگے تو اُن کی معاشرت کا درجہ بھی بلند ہوگا۔ ظاہری صفائی پاکیزگی اور اور اسی طرح کی معاشرتی صفات پیدا ہونگی۔ غذا و لباس چہرہ کے خد و خال اور عام طرز زیست برادران ہنود کے قریب پہنچکر چمار آریوں میں بآسانی پیوست ہو جائینگے۔ جب تک دو چیزوں میں کسی نہ کسی بنا پر مماثلت اور مساوات نہیں ہوتی اور قوت فاعلہ اور منفعلہ ایک سطح پر نہیں آجاتیں تب تک پیوستگی ایک بدنما پیوند معلوم ہوگی جسے نہ چشم بصارت قبول کرے گی نہ بصیرت۔ حقیقت میں دنیاوی طاقتوں میں صرف ایک علم ہے جس کی بارگاہ میں تمام اقوام و مذاہب پہلو بہ پہلو زانوے ادب تہ کر لیتے ہیں۔ یہاں ادنیٰ و اعلیٰ لفظ بے معنی ہیں۔ انسانوں کو متحد کرنے کی قوت علم سے زیادہ کوئی نہیں۔ چنانچہ ایجوکیشنل کانفرنس ۲۵ سال سے برادران وطن کو عموماً یہی تلقین کر رہی ہے۔ کسی ادنیٰ تہذیب و معاشرت کے آدمی کے ساتھ کھانے پینے سے برادران ہنود اپنی تعداد نہیں بڑھا سکتے۔ البتہ تعلیم کے ذریعہ سے وہ ایک بڑی قوت کے مالک ہو جائینگے۔

اصلاح تمدن مسلمانوں کو اس سے یہ سبق لینا چاہیے کہ ایسی تقریبوں پر مٹھائیاں خرید کر خصوصاً وہ اسراف کے ذریعہ سے اپنے افلاس کو نہ بڑھائیں۔ اور اگر ترک عادت

عداوت کی حد تک پہنچا ہے تو خدارا وہ اپنے مقام پر دودھ اور مٹھائی کی دوکانیں باہم ملکر کھلوائیں۔

جو واقعات آج کل ملک کے مختلف حصوں میں پیش آرہے ہیں اُن سے مسلمانوں کو عبرت وبصیرت حاصل کرنی چاہیے اور تجارت وکاروبار کے مختلف شعبوں میں داخل ہوکر اپنے کو دوسروں سے مستغنی اور بے نیاز بنالینا چاہیے، اس کے علاوہ قومی افلاس اور نکبت کے دور کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہوسکتا ہے تو وہ بھی یہی ہے کہ مسلمان کاروبار میں حصہ لیں جس سے نہ صرف اُن کی مالی حالت مضبوط ومستحکم ہوگی بلکہ بیکاری وکاہلی نے جو بہت سی اخلاقی کمزوریاں اُن میں پیدا کردی ہیں وہ آہستہ آہستہ دُور ہونگی اور اس طریقہ سے وہ ہندوستان میں اپنی ہستی کو عزت کے ساتھ قایم رکھ سکیں گے۔

معائنہ مدرسہ جلالی ضلع علی گڑھ

۱۰ و ۱۱ جون ۱۹۲۳ء کو آنریری جائنٹ سکرٹری وسپرنٹنڈنٹ دفتر کانفرنس نے بمعیت ماسٹر سعادت علی خاں صاحب مدرسہ جلالی کا سالانہ امتحان لیا اور طلبا کو ترقیاں دیں۔ نتیجہ امتحان بہت قابل اطمینان تھا۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ اس مدرسہ کی عمر کا پہلا سال بخیر وخوبی گذر گیا اور امید ہے کہ کانفرنس کا لگایا ہوا یہ پودا پروان چڑھیگا اور اہل جلالی بھی اُسکے ذریعہ سے ایک دن وہی فخر کرینگے جو مسلمانان قصبہ مارہرہ اب سے پچیس برس پیشتر کانفرنس کے لگائے ہوئے پودے مدرسہ اسلامیہ مڈل اسکول مارہرہ پر کرتے ہیں کہ اس کی بدولت قصبہ مارہرہ میں بیس سے زائد گریجوئیٹ اور بہتیرے انڈر گریجوئیٹ اور ہر قسم کے تعلیم یافتہ مسلمان موجود ہیں اور قصبہ میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی فیصدی تعداد غالباً ہندوستان کے ہر قصبہ وشہر سے زیادہ ہے۔

مقالات

نطق و گویائی کو آواز سے کیا تعلق ہے

نمبر ۱

آواز کی ماہیت

کلام کا ادنیٰ جز حروف ہیں۔ حرف کیا ہے محض اصوات بسیط کا مرکب ہے گویا تکلم میں حقیقی شے صوت یا آواز ہے۔ جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ حنجرہ کے منہ پر دو چھوٹے چھوٹے ہونٹ نصب ہیں جب سانس آواز کو لیکر اندر سے باہر آتا ہے تو یہ دونوں ہونٹ باہم متصل ہوکر سانس کو آزادانہ باہر نکلنے سے روکتے ہیں۔ لیکن سانس پھیپھڑوں کے بل پر حنجرہ کے متصلہ ہونٹوں کے بیچ سے ٹکر کھاتا ہوا باہر نکلتا ہے۔ ادھر ناک اور حلق اور سینے میں چھوٹے چھوٹے جوف یا گڑھے بنے ہوئے ہیں جن کی مدد سے سانس خارجی ہوا سے ٹکر کھا کر اس میں ایک تموجی حرکت پیدا کرتا ہے۔ یہی آواز ہے۔ لیکن آواز کی بلندی اور پستی پھیپھڑوں کے علاوہ عضلات ندائیہ یا آواز کے پٹھوں کی قوت پر منحصر ہے۔ شیریں۔ دلکش اور سریلی آواز کا حصر بھی ان ہی کی تربیت پر ہے یعنی ان پٹھوں میں یہ قابلیت ہے کہ تربیت پاکر انسان میں خوش آوازی، فصیح البیانی اور طلیق اللسانی کی صفتیں پیدا کردیں۔

عضلات ندائیہ

خوش الحانی

خوش الحانی اور گلوے داؤدی کچھ گانے ہی کا نام نہیں بلکہ گویائی اور بیان میں اس صفت کی نسبتاً بہت زیادہ ضرورت ہے تاکہ سامعین متکلم کی لچک دار آواز سنتے ہی فریفتہ ہوکر ہمہ تن گوش بن جاویں۔ محض قوت بیانیہ کافی نہیں۔ بلکہ خوش آوازی بھی سیکھنی چاہیے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کریں۔ تاکہ تعلیم کا ذمہ دار طبقہ آواز کی تربیت کو بھی نصاب کا جز قرار دے اور جن معصوم اور سادہ لوح بچوں کو والدین کے آغوش سے تعلیم کا بہانہ کرکے

لے لیتے ہیں۔ انہیں علم کے ساتھ بیان و گویائی کی تعلیم دینا بھی ضروری تصور کرنے ظاہر ہے کہ اگر آواز میں لمک اور گلے میں کھٹکا نہیں تو شوکت لفظی تشبیہات کی کثرت۔ مرادف لفظوں اور جملوں کی آدھی گز بیان میں مقناطیسی قوت پیدا نہیں کر سکتی۔ پارلیمنٹ میں برک اور شیریڈن کی تقریریں سنکر لیڈیاں کیوں بیہوش ہو جاتی ہیں۔ ولیم پٹ کا سحر آفرین بیان کیوں وزرا کو رائے بدلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ بہت کچھ اسلئے کہ یہ سب خوش الحان تھے۔ مخالف جماعت بھی ان کے کھڑے ہونے کا انتظار کیا کرتی تھی۔ انکی ہجو و نکتہ چینی کو خوش الحانی ہی کے لالچ میں برداشت کرتے تھے۔ برک شیریڈن

قدرت کی ودیعت جب ان کے حالات زندگی پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی آواز اور گلے کو بلا تربیت نہیں رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ اصلی مادہ قدرت خود ودیعت کرتی ہے لیکن قدرت کی فیاضیوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔ زمین کے چپہ چپہ میں خزائن مخفی ہیں۔ اسی طرح ہر ایک شے اور شخص میں قابلیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ فن اقتصاد کے ماہروں کا فرض ہے کہ زمین کے دفینوں کو کھود کر باہر نکالیں۔ اسی طرح فن تعلیم و تربیت کے ماہروں کا فرض ہے کہ بچوں کی قابلیتوں کو ٹٹولکر منکشف کریں۔ لیکن آج ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں مشکل ایک دو نوجوان ایسے نکلیں گے جن کا انداز گفتگو دلکش آواز شیریں اور گلا ترشا ہوا ہے۔ ورنہ عموماً سب کی آواز بھدی۔ لہجہ سخت اور گلا خاردار ہوتا ہے۔ ع

کی جس سے بات اسنے شکایت ضرور کی

ایک مثال روزمرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کسی خوش رو۔ بلند و بالا۔ فربہ جسم۔ گول بھرا ہوا چہرہ۔ گورے یا گندمی رنگ کے شخص سے ملاقات ہوتی ہے تو ہر شخص اسکے حسن ظاہری سے متاثر ہو جاتا ہے اور اگر اس کا لباس بھی ہمارے معیار کے مطابق فاخرہ اور وضعدار ہے تو تاثر دوچند ہو جاتا ہے لیکن ابھی ہم اس کا لوہا نہیں مانتے بلکہ

انتظار کرتے ہیں کہ دیکھیں اس کی گفتگو کیسی ہے؟ اور مبلغ علم و تہذیب کیا ہے؟ اگر یہ اجنبی شیریں آواز ہے انداز بیان دلکش رکھتا ہے۔ صاف صحیح اور پورے الفاظ ادا کر کے خندہ پیشانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے تو ہم اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اسکی مصاحبت کی آرزو کرتے ہیں۔ اور گویا اُس کے سامنے ہتھیار ڈالدیتے ہیں۔ اور اگر اُس نے بھدی آواز۔ بیٹھے ہوئے گلے سے رُک رُک کر لفظوں اور جملوں کے بے ترتیب ٹکڑے، غلط مخارج سے نکلے ہوئے حروف کے الفاظ مُنہ سے نکالنے شروع کئے تو ہمارے دل سے وہ سارا اثر جو حسن وصورت دیکھکر پیدا ہوا تھا ایک دفعہ ہی کافور ہو جاتا ہے اور ہم اُسے مختصر جواب دیکر جلد پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ پنبہ ام در گوش کن تا نشنوم۔

راکب و مرکب اس مختصر بیان سے واضح ہوگا کہ بولنے میں حقیقی شے آواز ہے۔ آواز مرکب ہے اور نطق اس کا راکب ہے۔ نطق کیا ہے؟ جذبات اور احساسات کے مظاہر کا مجموعہ ہے جس طرح گویے کے ذہن میں پہلے سے بول یا راگ محفوظ ہوتا ہے اور وہ جب چاہتا ہے آواز کی وساطت سے گا کر سنا دیتا ہے اسی طرح نطق و گویائی کے لئے بچے کے حافظے میں الفاظ کا ذخیرہ ہونا لازم ہے۔ مگر الفاظ بجائے خود کچھ نہیں بلکہ نطق کی تعریف اور مبدء محسوسات خارجی یا جذبات قلبی کے مبین ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اشیاء جن کو بچہ اپنے گرد و پیش محسوس کرتا ہے یا وہ جذبات جو ان محسوسات سے متاثر ہو کر اس کے قلب میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں وہی حقیقی نطق کا مبدء ہیں۔ نہ کہ کتاب میں لکھے ہوئے یا طوطے کی طرح پڑھائے ہوئے الفاظ ہیں۔

معلم فطرت حکمائے مشرق و مغرب کی متفق رائے ہے کہ بچہ کو بولنا یا بات کرنا سکھانا فضول ہے گویائی قطعاً تعلیم سے نہیں آتی بلکہ فطرت خود اس کی معلم ہے۔ اس مقدس فرض کو اس نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ اگر والدین یا اتالیق فطرت کو کچھ مدد دے سکتے

والدین اور اتالیق کا فرض

ہیں تو صرف اس قدر کہ بچے کی محسوسات اور مرئیات کی دنیا کو وسیع اور موجودات سے اس کے حواس خمسہ ظاہری کو آشنا کر دیں تاکہ وہ اپنے مدرکات اور مشاہدات کو حافظہ میں ذخیرہ کرتا رہے۔ گویائی جس طرح خود پیدا ہوتی ہے اسی طرح ترقی بھی خود ہی کرتی ہے۔ یعنی صحبت اور سوسائٹی سے مکالمہ اور مذاکرہ سے از خود ترقی پذیر ہوتی رہتی ہے۔ مگر خوش آوازی معمولاً ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ اکثر تربیت کی محتاج ہے جسطرح صحیح لفظ بولنے کے لیے لازم ہے کہ اُس لفظ کے ہر ایک حرف کو صحیح مخرج سے نکالیں اور یہ ملکہ بغیر تربیت و مشق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آوازیں بغیر اس کے شیریں

آواز کی تربیت

نہیں ہو سکتی کہ سینے سے لیکر دماغ تک جن جن مخرجوں اور رسدوں سے وہ فطرتاً نکلتی ہے ان سب کی با احتیاط تمام تربیت کی جائے۔ جن مدرسوں میں اس کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اس کے طلبا ءمردہ زبان۔ پژمردہ دل اور پنبہ دہن ہوتے ہیں۔ مجمع یا دو چار آدمیوں میں بات کرنا کجا۔ انہیں ایک نا آشنا آدمی سے بولنے میں ہول دلی ہو جاتی ہے۔

اُمنگ کیا ہے

ذخیرہ الفاظ کے بعد گویائی کے لیے اُمنگ کا ہونا دوسری شرط ہے لیکن گونگے اور مردہ مدرسوں میں طالبعلموں کے دل میں اُمنگ کی ایک لہر بھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ کون ہے جس کو قدرت نے زبان بیان عطا نہیں کی لیکن یہ فرض تعلیم گاہ کا ہے کہ قوت گویائی کو دوبالا کر دکھائے۔ اور بچوں کو طوطا مینا بنا دے۔

قوم کی زبان

زندہ قوم کی زبان ہر دم ہر لحظہ ترقی کرتی رہتی ہے یعنی الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا رہتا ہے لیکن یہ اضافہ کسی ضرب مفرد یا مرکب کے تابع نہیں کہ ہمیشہ ایک قاعدہ کے مطابق مخصوص نتائج پیدا کرتا رہے بلکہ جس قدر جدید اشیا ء و حقائق کا علم ہوگا جتنے جدید تحقیقات و ایجادات ہونگے تہذیب کی متعدد شعبوں میں نئی معلومات حاصل ہونگے اتنے ہی مفاہیم میں اضافہ ہوگا اور اتنے الفاظ لغات میں بڑھ جائینگے

بچے کی زبان — بچے کی زبان کیا ہے وہ بھی تو قوم کی زبان ہے۔ بعینہٖ یہی حال اس کا ہے اگر تم اُسے مقید۔ نظر بند۔ پابند رکھوگے۔ خارجی دنیا کے محسوسات سے آشنا نہونے دوگے۔ جدید اشیاء کے مطالعہ سے محروم رکھوگے تو اس کی معلومات اور مدرکات میں اضافہ کیسے ہوگا متصورہ اور خیال کہاں سے مالامال ہونگے اور جب یہ ذخائر خالی ہونگے تو وہ الفاظ کیسے فراہم کریگا اور بولنے بات کرنے میں مُرکب آوازکے لئے راکب کس دنیا سے لائیگا۔

فطرت کا منشا — فطرت الٰہی تو اپنی طرف سے بچے میں بڑی بڑی قابلیتیں ودیعت کرکے اور اس کو انسان کامل بناکے بھیجتی ہے۔ الاماشاءاللہ لیکن والدین اور اتالیق ان میں سے اکثر پر مٹی ڈالتے ہیں۔ ان کے ننھے ننھے حواس خمسہ میں نسبتاً بہت زیادہ تیزی طراری۔ انتقال ذہنی میں سرعت جذبات میں اُبھار ہوتا ہے کسی ایک خوش الحان پرند کا زمزمہ کسی دلفریب کرشمہ قدرت کا نظارہ انہیں فوراً بےخود کردیتا ہے اور وہ جذبہ شوق سے لبریز ہوکر ہر قدم پر پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ اور طرح طرح کے سوال کرتے ہیں جن کے جواب میں انہیں نہایت بےرحمی سے دھمکا کر کہا جاتا ہے کہ بکومت تم تو کان کھاگئے۔

بچوں کے بعض خواص چشم دید واقعہ — ہم نے بچشم خود دیکھا کہ ایک بچے میں جس کی عمر ۱۰ برس سے متجاوز نہ تھی شاعرانہ جذبات تھے۔ ہرے بھرے باغ اور پھلے پھولے مقام میں چہرہ فطرت کے مطالعہ سے اوس پر ایک غیرمعمولی جوش مسرت اور وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور اناشاد (غنغنا تا) کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا گویا بڑے ذوق شوق سے اس بات کا تقاضا کرتا ہی کہ مجھے چہرہ فطرت کا مطالعہ کرنے دو۔ بچوں میں جستجو کا ایک خاص مادّہ ہوتا ہے چاہیئے کہ انہیں اعجوبہ اشیاء نظر فریب مقامات۔ دلکش مناظر۔ حیرت انگیز روشنی اور تاریکی۔ مہیب بلندی دسیع اور ولولہ انگیز کیفیات کا مطالعہ کرائیں تاکہ اونکے دلیں

جذبات پیدا ہوں۔ ان کی زبان بیان کھلے اور وہ مافی الضمیر ادا کرنا سیکھیں۔

ذخیرہ الفاظ

ہم اشارۃً تذکرہ کرچکے ہیں کہ گھر کی چار دیواری میں مقید رہنے سے بچوں کا ذخیرہ الفاظ نہیں بڑھ سکتا نہ گویائی کی قوت ترقی پذیر ہوسکتی ہے۔ اسلئے صبح شام باہر بھیجدینا چاہیے اس سے ذہن اور ادراک میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہوتا ہے اس طرح پر کہ نئے نئے افعال و کیفیات دیکھکر اُن کے دل میں نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کو وہ کچھ خود اپنی طبیعت سے اور کچھ پوچھ کر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کی ننھی سی ڈکشنری میں جدید الفاظ کا معتدبہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کلموں سے کلام بنانا

ان میں کچھ اسم ہوتے ہیں۔ کچھ صفت اور کچھ فعل اُدھر معلم فطرت ہر وقت ساتھ ہے بچے خود ان کلموں سے کلام بنا لیتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ بچوں کے لیے مسمیٰ پہلے ہے اور اسم پیچھے۔ موصوف پہلے ہے اور صفت بعد میں جب تک مشاہدہ نہوگا تب تک نہ کوئی اسم وصفت یا فعل ذہن نشین ہوسکتا ہے اور نہ زبان بیان سے ادا ہوسکتا ہے فرض کرو کہ بچہ روز ہرے بھرے باغ میں ہر طرف کھلے ہوئے پھول دیکھتا ہے اور ان کی کیفیت سے متاثر ہوتا ہے تو وہ گھر میں اپنے چھوٹے بھائی کو کھل کھلا کر ہنستا ہوا دیکھکر بے تکلف کہہ سکتا ہے "اماجان دیکھنا! دولو میاں ذرا گدگدانے پر کس طرح گلاب کے پھول کی طرح ہنستے ہیں" یا کسی خادمہ کو پھرتی سے کام کرتا ہوا دیکھکر کہتا ہے "دیکھنا! گلزار کیسی ریل گاڑی یا موٹر کار کی طرح دوڑتی ہے!" یہی گویائی اور آغاز فصیح البیانی ہے۔

فطرتی حسن کے جلوہ گاہ

اصل میں گویائی کا مبدء فطرتی حسن کے وہ جلوہ گاہ ہیں جن کا مشاہدہ بچے کی قوت متصورہ پر زور ڈالکر اسکو حیرت زدہ کرکے اسکے دل میں جذبات بھر دے۔ یہ جذبات ہی زبان بیان کی قوت متحرکہ ہیں۔ بچے کچھ قدرتی طور پر جدت پسند۔ عجائب پرست

بچوں میں تحسین کیوں ہے۔ متجسس اور ہر اسرار کی پردہ دری کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ بوڑھوں کے لئے زندگی ایک رفیق دیرینہ ہے جس کی تمام تلخ و شیریں لذتیں وہ اچھی طرح چکھ چکے ہیں ان کے لئے کوئی بات نئی نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے اس کی پہلی مثالیں اون کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس ۶۰، ۷۰ برس کے دوست کے تمام اندازوں سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن بچے کے لئے زندگی ایک نیا دوست ہے اس کی ہر وضع نرالی۔ ہر انداز حیرت انگیز ہے۔ وہ ہر ایک چھپی ہوئی کیفیت کو کھولکر اور راز ہوری کو پورا کرکے مشاہدہ کرتا ہے۔ معلومات کو اول بے ترتیب جمع کرتا ہے اور پھر اس انبار سے بچپن کی سمجھ کے مطابق۔ ایک خیالی اسباب و نتائج کا سلسلہ مرتب کرتا ہے۔ اور اپنی ذہن میں طرح طرح کے نتائج نکالتا ہے۔ غرضیکہ سبق آموز، علم افزا اور نتیجہ خیز موقعوں کی جستجو میں بچہ کسی وقت نہیں تھکتا اس نئے دوست یعنی زندگی کی حسن آرائیاں اوس کے قلب کے ریشہ ریشہ میں سرایت کرلیتی ہیں جس سے جذبات اُبلتے ہیں۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے سحر بیانی۔ قادر الکلامی فصاحت اور بلاغت کے سوتیں پھوٹتی ہیں۔ اس لئے والدین اور اتالیق کا فرض ہے کہ بچوں کو فطرت کے جلوہ گاہوں کی دل کھولکر سیر کرائیں تاکہ ذخیرہ الفاظ بڑھے۔

مبدء جذبات کوئل کی کوک سے لیکر لوہار کے ہتوڑے کی ضرب تک اور گھر کی پوسی کی سیاہ مخملی بدن سے لیکر نیلگوں آسمان اور کالی بدلیوں تک ہر چیز سبق آموز ہے۔ حتی کہ وہ شراب طہور جو شہد کی حریص مکھی صحن چمن میں ساغر گل سے پیتی بھرتی ہے اسکی لذت سے بھی بچوں کی زبان اور دہن کو نا آشنا نہ رکھو۔ خالق اکبر نے بچہ کو ایک حنجرہ اور آواز ضرور بخشی ہے۔ مگر یہ محض ایک آلہ نطق ہے جب تک بچہ کے دماغ میں صورات حافظہ میں مشاہدات اور قلب میں جذبات کے ذخائر نہونگے تب تک یہ آلہ بیکار ہے جس طرح ستار کے تار جنکہ بولتا ہوا بھی مضراب کھائے بغیر ہوا میں توجی حرکت

پیدا کرنے اور بول دینے سے معذور ہے بعینہ اسی طرح آواز بھی جذبہ دل کی چوٹ کھائے بغیر ایک صوت مجہول اور بے معنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے شروع ہی میں بتا دیا ہے کہ بچے کو بولنا سکھانے کی کوشش بالکل فضول ہے جس مصور نے کبھی انسانی چہرہ ہی نہ دیکھا ہو وہ تصویر کیسے کھینچ سکتا ہے۔ جب تک بچہ کی چشم بصارت و بصیرت کے سامنے صورات ہی نہیں۔ اس کی زبان سے الفاظ کیسے نکلیں گے۔ زبان بیان، اصل میں محض مافی الضمیر کے اظہار کا نام ہے لیکن مافی الضمیر کا ایک بڑا حصہ اس طرح بھی ادا کر سکتے ہیں کہ سر، ہاتھ، پانوں اور اور اعضائے جسم سے اشارۃً کام لیں لیکن یہ زبان سکوت اس قدر وسیع نہیں کہ فصاحت کا مفہوم ادا کر دے اور نہ ہم اس پر بحث کرنا اپنے مقصد کے مطابق خیال کرتے ہیں۔

اگر بچے کو خود بخود اور آزادانہ بولنے دیں تو اس کی قوت گویائی میں تشبیہہ و استعارات کا رنگ خود پیدا ہوتا ہے اور اوسے طوطے کی طرح بولتا ہوا سن کر پیار آتا ہے۔ معلّم اور اتالیق اور ان سے زیادہ والدین متنبہ رہیں کہ بچے اپنے خیال میں بڑے پکے ہوتے ہیں۔ جو نقش ایک مرتبہ ان کے دل پر جم جائے پھر وہ مشکل سے مٹتا ہے۔ اگر دو چیزوں میں ذری سی مماثلت ہو تو وہ ان کو ایک سا سمجھ لیتے ہیں وجہ یہ کہ ان کی قوت متصورہ تکمیل کو نہیں پہنچی اور عقلی استدلال کا مادہ اُن میں بالکل خام ہوتا ہے۔ ایک امر خلاف واقعہ کو بوچ دلائل سن کر واقعہ تسلیم کر لیتے ہیں اگر ان کی کتابیں یا کھلونے یا لباس یا بیٹھنے کی جگہہ میلی اور غلیظ ہو تو ان کو اسی کی عادت ہو جائیگی۔ یا اگر فرضی اشیاء کا ڈر اُن کے دل میں بیٹھ جائیگا یا اور کوئی بے حقیقت اور مجہول سبب واقعہ کی صورت میں انہیں دکھایا جائیگا تو یہ خیال مرض کی طرح دل میں جاگزیں ہو کر آخر تک نہ نکلے گا۔

آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے۔ موجیں مار کر بہتا ہوا پانی۔ تیز تند اور طوفانخیز

ہوا۔ ہیبت ناک پہاڑ یا اُفق سے ملتے ہوئے وسیع میدان۔ بڑے بڑے درخت جنکی جڑیں سینکڑوں پیچ وخم کھاتی ہوئی زمین سے اوٹھی ہوئی ہوں۔ سر شام آسمان پر بادلوں کا مہیب ہجوم وغیرہ وہ کرشمے ہیں جن کے مشاہدہ سے بچوں کے دل میں جذبات اور قوت بیانیہ میں خود بخود اثر اور زور پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس قسم کے نظاروں کے بعد بچہ چپ رہے تو تم چھیڑ کر پوچھو۔ اور اپنے خیال کے مطابق اُسے اپنے محسوسات اور کیفیات قلب کو اپنے لفظوں میں بیان کرنے کا موقعہ دو لیکن اگر ضرورت ہو تو الفاظ کی اصلاح کردو۔ اشیاء کی تعلیم محض اسموں اور لفظوں سے کبھی سودمند نہیں ہوسکتی نہ بچے کو یاد رہیگی۔ فرض کرو کہ بچے کو نارنگی۔ پنسل۔ کتاب تین لفظ بتا کر کہا گیا کہ ان کا ایک یا الگ الگ تین جملے بنا دو تو اُس کو اپنے دماغ پر پورا زور ڈالنا پڑے گا پھر بھی شاید کامیاب ہو۔ لیکن ان تینوں چیزوں میں سے ہر ایک سے کام لیکر اسکو دکھاؤ اور پھر جملے بنواؤ تو وہ اپنی کیفیات قلب کو خود ظاہر کر دیگا۔

مہیب نظارے

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں نطق دگویائی کی استعداد پیدا کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔ فطرتی جلوہ گاہوں کا آزادانہ مشاہدہ کھیل کود اور جسمانی ورزش کے کام روزمرہ کے واقعات وحوادث سب سبق آموز ہیں لیکن والدین اور اتالیق کا فرض ہے کہ وہ اسی پر اکتفا نہ کریں کہ بچہ اس قسم کے واقعات اور کیفیات کو خالی نظر سے تکتا رہے یا اپنے محسوسات اور جذبات میں آپ اولجھا رہے بلکہ چاہیئے کہ اس قسم کے ہر ایک فعل اور کیفیت کو اوس کے ذہن کے لئے ایک مسئلہ بنا دیں اور اُسکے ظاہری اسباب ونتائج بتا کر اور ہلکے ہلکے سوال کرکے بچہ کو اوس واقعہ یا کیفیت کی حقیقت سمجھنے میں مدد دیں۔ مثلاً ایک تیز بہتے ہوئے دریا کے کنارے کھڑے ہوئے پانی کی وحشیانہ روانی اور موجوں کا تلاطم دیکھ رہے ہیں تو بچہ کو اس کرشمہ قدرت کو

قوت بیانیہ کس طرح پیدا ہوسکتی ہے

حیرت واستعجاب سے زیادہ دیر نہ ٹکنے دیں۔ بلکہ اوّل چند سادہ سوال اوس واقعہ
یا کیفیت کے متعلق کرکے اُسے چند موزوں الفاظ بتا دیں اور پھر پوچھیں کہ پانی اسقدر
تیزی سے کیوں ادھر سے اودھر بہتا ہے۔ اُدھر سے اِدھر کیوں نہیں بہتا۔ اور پھر
اوسے اونچان نیچان کا قانون اس طرح سمجھائیں کہ وہ خود بول اُٹھے کہ پانی اُودھر سے
ادھر اس لئے بہتا ہے اور چونکہ ڈھلان بہت زیادہ ہے اس لئے روانی میں تیزی
وتندی ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس۔

ایک عجیب مثال

جس طرح تم کسی عظیم الشان واقعہ کی یادگار قائم کرتے ہو کوئی بت یا مینا نصب
کرتے ہو اور وہ یادگار اپنے پیکر کے ہر جزو وکل سے اوس واقعہ کی تاریخ یاد دلاتا
ہے۔ مگر یہ سب کچھ محض اشاروں اور کنایوں اور علامتوں کے ذریعہ سے یا یوں کہو
کہ زبان حال سے یاد دلاتا ہے۔ الفاظ اور جملے تم خود ان علامتوں کو پہنا کر اس واقعہ
کی تاریخ سمجھ لیتے ہو یا اپنے رفیق کو سمجھا دیتے ہو۔ بعینہ یہی حال بچہ کا ہے وہ بھی
گویا اشارات وعلامات کا ایک بت ہے۔ وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ اتالیق کا یہ فرض
ہے کہ ان اشارات وعلامات کو سادہ لفظوں اور جملوں کا لباس اس ترکیب سے
پہنائے کہ بچہ کو یہ خیال نہ گزرے کہ تم اوسے سبق پڑھا رہے ہو بلکہ وہ کسی طرح سن لے
اس کا بہترین موقعہ وہ ہے جبکہ کسی کرشمہ قدرت یا منظر یا کیفیت یا واقعہ کو دیکھ دیکھکر
اس کے دل میں جذبات پیدا ہو رہے ہوں۔ طرح طرح کے سوالات دل میں اُمڈ کر
زبان بیان کا پہلو گدگدا رہے ہوں اور اوسے الفاظ کی جستجو ہو۔ اس وقت وہ
جو کچھ تم سے سُنیگا کبھی نہ بھولیگا۔

چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے چند ضوابط

چھوٹے بچوں کی تعلیم کا سب سے بڑا گر اور علم وعمل کے خزائن کی یہی کنجی ہی حافظہ کا بہترین ذخیرہ یہ ہے کہ قول کو فعل سے اور فعل کو قول سے کیفیت اور مشاہدہ کو الفاظ سے اور الفاظ کو کیفیت سے مطابق کر کے دکھا دیں ہم کوئی نصاب معین نہیں کر سکتے چہرۂ فطرت اور کرشمہ گاہ قدرت تو بجائے خود سرتاپا ایک ضخیم کتاب نصاب ہے۔ اس کے علاوہ انسانی مصنوعات میں بھی ایک بہت بڑا تعلیمی ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن انتخاب کے لئے دماغ کی ضرورت ہی۔ ذیل میں ہم پرتاثیر اور سبق آموز نصاب کے لئے چند ذرائع بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

تصویریں

(۱) بچوں کے لئے تصویریں ایک زبردست معلم ہیں۔ لیکن انتخاب مشکل ہے۔ اصول یہ ہے کہ حیرت انگیز اور سبق آموز واقعات وکیفیات کی سادہ تصویریں منتخب کریں۔ جن میں مصور نے اپنا کمال دکھایا ہو ان کو نظر انداز کریں۔ مختلف افعال وکیفیات کے مناظر ہوں تو زیادہ موزوں ہیں۔ مثلاً میدان جنگ کا منظر ایک فریق بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دوسرا شکست کھا کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ مقتول اور نیم جان لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ طرح طرح کے ہتیار اور آلات ٹوٹے پڑے ہیں ایک طرف یاس والم اور دوسری طرف جوش مسرت چہروں سے ٹپکتا ہے۔ وغیرہ جن کو دیکھتے ہی دل میں ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے عین مدیہ پہنچکر جب بچہ کی قوت مدرکہ اندر سے اور گویائی باہر سے زور کرنے لگے اور آواز کا مرکب الفاظ کے راکبوں کا تقاضا کرے تب اتالیق کو چاہیے کہ بچہ کو مدد دے یعنی تصویر یا مرقع کی کیفیات ومناظر کو بیان کا لباس پہنانے کے لئے آسان۔ مفرد۔ سادہ الفاظ۔ رفتہ رفتہ پیش کرے۔

کتاب فطرت

(۲) دوسری کتاب وہی کتاب فطرت ہے جس کا مفصل تذکرہ ہو چکا

ہے۔ پہاڑ، گھاٹیاں جنگل، میدان، باغات، دریا وغیرہ لیکن جو سبق بچے فطرتی جلوہ گاہوں کے نظارہ سے حاصل کریں، اُستاد کو چاہیئے کہ انہیں بچوں کی زبان سے سُن لیں اور اگر ضرورت ہو تو اصلاح کر دیں۔ بچوں میں یہ ایک طبعی خصوصیت ہے کہ اپنے محسوسات اور مشاہدات کی تصویر کھینچا کرتے ہیں کچھ پورے یا ادھورے لفظوں میں کچھ ہاتھ اور سر کے اشاروں سے، کچھ چہرہ بنا کر۔ کچھ پیشانی کے بل۔ آنکھوں کی گردش اور ہونٹوں کی جنبش سے اور کچھ آواز کے مدوجزر سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر تم مشاہدہ کے بعد ان کے جذبات کو متحرک کر دو تو وہ تمہارے روبرو ایک دلکش مرقع پیش کرینگے۔ اس مقصد کے لیئے (ریمبلنگ) گلگشت یا جنگل کی سیر بہت موزوں ہے۔ یہ طرز تعلیم اس سے ہزار درجے بہتر ہے کہ نصاب کی مطبوعہ کتابیں جو حکمت عملی یا قومی یا ملکی مصلحتوں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہیں ایک بھولے معصوم بچہ کے سامنے رکھکر اس بات کی کوشش کیجائے کہ الفاظ کی مردہ لاشیں جن میں حقیقت کی مطلقاً روح نہیں ہوتی۔ اسمائے محض جن کے مسمیٰ بالکل مجہول ہیں۔ افعال و کیفیات جو سوکھے ہوئے پھولوں کیطرح بوباس سے بالکل خالی ہیں بچوں کے دماغ میں بھر دیں۔ ہم معلموں کی خدمت میں بہ تعظیم مناسب التماس کرتے ہیں کہ وہ اس طرح بچوں کی عمریں کتابی تعلیم میں ضائع نہ کریں بلکہ بجائے اس کے انہیں لوہے کی پٹری پر دوڑتی ہوئی ٹرین اور بھک بھک کرتا ہوا انجن دکھا کر اس کے بالمقابل ایک دوسرا نظارہ دکھاؤ یعنی کچی سڑک پر کشاں کشاں چلتی ہوئی ایک بوجھل بیل گاڑی یا بارکش یا اسباب اور سواریوں سے بھری ہوئی شکرم۔ اس سلسلہ میں یہاں تک مشاہدہ کراؤ کہ دریچہ کے شیشہ پر مکھی کو پھسل پھسلکر چلتے ہوئے بھی غور سے دکھاؤ اور پھر پوچھو کہ تم نے کیا دیکھا اور جو کچھ دیکھا اس میں کیا فرق ہے۔ بچہ جواب میں اپنے

مشاہدات کو اس مزہ سے بیان کرے گا کہ تم کو اپنی ساری محنت وصول ہو جائیگی۔ الفاظ بے ساختہ اور سادہ مگر پُر معنی اور واقعیت سے بھرے ہوئے تفصیل ہی دل آویز ہونے سے خالی نہ ہوگی۔ تشبیہات اور مثالیں عام فہم۔ وجہ یہ ہے کہ بچّوں کی قوّت متصوّرہ اور حافظہ تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح بالکل تر و تازہ ہوتی ہے نہ زندگی کے دماغ سوز افکار سے گراں بار اور نہ گزشتہ کی دل دوز یاد سے بوجھل ہوتی ہے۔ ایک سادہ لوح پر مشاہدہ کے نقش و نگار بالکل صاف اور اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں ہمنے یہ پُر لطف تماشہ اکثر دیکھا ہے اور اس سے بیحد مسرور الوقت ہوئے ہیں۔

نقاشی (۳) اگر ممکن ہو تو بچوں سے ان مشاہدات کے نقشے اور تصویریں بورڈ پر کھچوائی جائیں۔ ہو بہو تصویریں۔ تمام خد و خال اور نوک پلک سمیت ضروری نہیں۔ یہ تفصیل بعض با مذاق بچّوں کو آگے چلکر خود بخود آجاتی ہے۔ شروع میں ایک بھدا سا نامکمل ڈھانچ ہی کافی ہے جس میں اصلی شے یا کیفیت معرّف ہو جائے اور بس۔ پھر تم اس تصویر کی چند خصوصیات اور اجمالی حالت اپنے ہاتھ سے لکھکر بچّہ کو دیدو اور کہو کہ اس تصویر یا خاکہ کے نیچے ان کی نقل کر دے۔ دس پانچ دفعہ کی مشق کے بعد وہ اور ویسی بہت سی خصوصیتیں خود لکھنے لگے گا۔

مثلاً فرض کرو کہ بچہ سے طوطے کی بھدّی سی تصویر بنوا کر اُسے ایک پرچہ پر طوطے کی چند خصوصیتیں لکھکر دی گئیں۔ مثلاً دم پتلی۔ اور معمول سے زیادہ لمبی۔ چونچ کے اوپر کا حصّہ نیچے کی جانب بہت مُڑا ہوا۔ پروں کی رنگت سبز۔ چونکہ طوطے کو بچہ کئی دفعہ دیکھ چکا ہے۔ اس لئے وہ چند خصوصیتیں اور ان میں اضافہ کر دیگا۔ مثلاً گلے میں سیاہ طوق۔ چونچ سُرخ اور نکیلی۔ آنکھیں کیری اور جلد جلد بدلتی رہتی ہیں۔ ہر چیز پنجہ میں پکڑ کر کھاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جیسے جیسے بچہ کو اس میں مشق ہوتی جائیگی، ویسے اس کا ذہن زیادہ کرشمے دکھاتا جائیگا۔

کتابی تعلیم (۴) بچوں کی کتابیں آسان اور عام فہم ہونی چاہییں جہانتک ممکن ہو مضمون سادہ اور آسان کہ اگر نقشہ کھچوائیں تو بچے بآسانی کھینچ دیں۔ مثلاً

"میں کل دریا کے کنارے سیر کو گیا۔ دریا بہت زیادہ چوڑا نہ تھا دیکھا کہ ایک ماہی گیر ایک چھوٹے سے ڈونگے میں بیٹھا ہوا بیچ دریا کے چلا جا رہا ہے۔ پانی زور پر نہ تھا وہ ایک چھوٹا سا چپو ہاتھ میں لئے ہوئے پانی میں چلا کر ڈونگے کو کھے رہا تھا اس کے کندھے پر ایک جال میں کچھ مچھلیاں بھی تھیں "

اب اگر بچہ کو تھوڑی سی مدد بھی دیدی جائے تو وہ بورڈ پر اس سرگذشت کی تصویر بآسانی کھینچ دیگا علیٰ ہذا القیاس۔

کتاب کو ہمیشہ آہستہ آہستہ صحیح تلفظ اور صاف آواز کے ساتھ پڑھوانا چاہیے کتاب کے الفاظ اور جملے۔ غرضے یہانتک کہ رفتہ رفتہ پورا سبق لکھانا بھی چاہیے اور اگر قلم میں صحیح الفاظ ادا کرنے کی کچھ استعداد پیدا ہو جائے (جسے اصطلاح میں املا کہتے ہیں اور جس میں مرکب اور مفرد الفاظ کی طرز تحریر میں باہم تمیز ہونی چاہیے) تو زبانی کہانی یا واقعہ یا سرگزشت سنا کر اور اس کے واقعات ذہن نشین کر کے بچہ سے لکھانی بھی چاہیے ان کو کہانیاں لکھکر محفوظ کرنے کا طبعاً شوق ہوتا ہے۔ نیز اس سے ذخیرۂ الفاظ بھی بڑھتا ہے۔

کہانی (۵) زبان سکھانے اور ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس قسم کی کہانیاں بچے سمجھ اور لکھ لیتے ہوں انہی کے مانند اور کہانیاں بورڈ پر لکھدی جائیں۔ لیکن ان میں دو چار نئے الفاظ بھی شامل کر دینے چاہییں اور پھر ہر ایک بچہ سے الگ الگ پڑھوا کر دیکھنا چاہیے کہ نئے الفاظ کو بچہ سیاق و سباق

اور ربط عبارت کے لحاظ سے ایک ذرا سے اشارہ پر خود بخود سمجھتا ہے یا اس کا ذہن معنی کے آس پاس ہے۔ بہرحال جیسی صورت ہو اس کے مطابق اتالیق کو بچہ کی رہنمائی کرنی چاہئے اور ان الفاظ کی ایک فہرست استاد کو اپنی کاپی میں رکھنی چاہئے تاکہ آیندہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ بچے ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔ نہ کریں تو انہیں یاد دلانا چاہئے۔

حروف شناسی

(۷) ہمیں اس میں بیحد اصرار ہے کہ بچہ کو حروف شناسی کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو حروف کی صحیح کشش اور وضع قطع کی جانب متوجہ کرنا چاہئے۔ اُردو۔ عربی۔ فارسی کی حالت میں یہ بھی بتانا لازمی ہے کہ حرف کا کونسا جز متروک ہو سکتا ہے اور کونسا غیر متروک یعنی لفظ کے سلسلہ میں بندھکر حرف کا کتنا حصہ باقی رہنا لازمی ہے پس جب بچہ دو حرفی۔ سہ حرفی تک پہنچے تو وہ بھی اسکے قلم سے نکلوانے کی کوشش کیجائے۔ شروع میں یہ کام بورڈ پر لینا چاہئے جیسے تصویر خاکہ یا نقشہ بورڈ پر کھینچتے ہیں۔ انگریزی حروف اور علامات پہچاننے میں اس طریقہ سے خاص مدد ملیگی اور بچہ کی آنکھ ہر نقش ونگار سے جلد آشنا ہو جائیگی اس کا بہترین وقت وہ ہے جب بچہ میں کہانیاں وضع کرنے کا مذاق پیدا ہونے لگے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ السنہ مشرقیہ کی صورت میں تو عبارت میں املا کی اغلاط بکثرت ہوتی ہیں۔ ہجا کی اغلاط تو شاید فارغ التحصیل ہونے کے بعد تک بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ نہ ز، ذ، ظ، ض، میں تمیز ہوتی ہے اور نہ ت، ط یا س، ص، ث میں۔ نسیم سحری کو اکثر صحری لکھتے ہیں اور بالکل کو نہ صرف بلکل ہی لکھتے ہیں بلکہ بل کل۔

انگریزی کی عبارت میں کوما۔ کولن وغیرہ کی تمیز نہیں ہوتی۔ بڑے ہو کر بھی یہ عادت نہیں چھوٹتی۔ نتیجہ یہ کہ کسی جملے کے معنی سمجھ میں نہیں آتے اور مطلب کی جستجو میں ذہن اس طرح بھٹکتا پھرتا ہے جس طرح کوئی شخص دروازے کی تلاش میں بھول بھلیاں کے

اندر حیران اور سرگردان پھرتا ہے۔

انتباہ

(ز) تاہم ہمارا اس سے یہ مطلب نہیں کہ انشا اور املا کا بارِ گران مکتب میں بیٹھتے ہی بچہ کے ناتوان کندھوں پر رکھ دیا جائے۔ نہیں جب اس کو زبان بیان پر اچھی طرح قابو ہو جائے اور وہ اپنے مافی الضمیر کو اپنی وضع پر ادا کرنے لگے تب اس کو کتابی تعلیم شروع کرائی جائے۔ زبان بیان کی تکمیل کتابی تعلیم کی جڑ ہے۔ اسکے بعد تحریر آتی ہے۔ لیکن ہر درجہ میں بچہ کے مشاہدات۔ محسوسات اور معلومات کا امتحان لیتے رہنا مناسب ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ مدرسہ کے راستہ میں ایک خوبصورت شاندار عمارت بن کر تیار ہوئی ہے یا زیرِ تعمیر ہے تو بچہ کو تشویق و ترغیب دلائی جائے کہ وہ اس عمارت میں بعض نمایاں اور دلچسپ خصوصیات کا اس طرح مشاہدہ کرکے مدرسہ میں آئے کہ اگر اس سے پوچھیں تو وہ اپنا مشاہدہ فرفر بیان کردے بچہ میں مافی الضمیر بیان کرنے کی قابلیت پیدا ہونا مقدم ہے۔ نیز وہ ہر واقعہ یا کیفیت کی نسبت ایک مکمل خیال رکھتا ہو یہ نہو کہ بیان مہمل ہو اور خیال پرزے پرزے ہو۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ لکھی ہوئی کتابیں پڑھانا اور پڑھے ہوئے الفاظ لکھانا ابتدا میں سب ہیچ ہے حقیقی شئے یہ ہے کہ دل میں جوش و ولولہ۔ ذوق و شوق اور اعتماد علی النفس پیدا کیا جائے۔ اور روزمرہ کی زندگی کی جلوہ آرائیاں اس کے حسن و زیبائش اور عجائبات سے پردہ اُٹھا کر بچہ کو دکھا دیں اس کی زبان بیان کے لئے سارا مواد یہیں موجود ہے کتابوں میں کیا دھرا ہے۔ بقول گولڈ اسمتھ۔ تمام علوم و عقول کے ذخائر صحیفۂ فطرت میں موجود ہیں، جتنا زیادہ غور سے اس کا مطالعہ کیا جائے گا اُتنا ہی بلند مقام فضیلت حاصل ہوگا۔

قریشی

اقوامِ عالم میں مسلمانوں کا درجہ

نمبر ۲

"ترقی" اور "عروج" ایسے الفاظ ہیں جو عام طور پر مستعمل ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ ان کے صحیح معنی متعین کرنا دشوار ہے اسلئے کہ ہر زمانہ میں ترقی کا معیار مختلف رہا ہے لہذا یہ بالکل ممکن ہے کہ جو قومیں کل تک ترقی یافتہ سمجھی جاتی تھیں معیار کے بلند ہو جانے سے آج ان کا شمار درماندہ اور کمزور قوموں میں ہو۔ اور باوجود اپنی حالت پر قائم رہنے کے دوسری قوموں کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی قوت و اقتدار خود بخود زائل ہو جائے۔

امتداد زمانہ اور تجربہ سے انسان کی عقل اور قوت مشاہدہ جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے وہ کائنات کے مخفی خزائن سے متمتع ہونے اور اپنے ابنائے جنس پر اقتدار قائم کرنے کے جدید ذرائع و وسائل تلاش کرتا ہے۔ اُسکا یہ نتیجہ ہے کہ علوم کو ترقی ہے اور حقائق اشیار کے انکشاف کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر ایجادات و اختراعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اقتدار پسندی کے جذبہ نے فن جدال و قتال اور ہلاکت آفرین آلات حرب کو بھی حیرت انگیز ترقی دی ہے لیکن یہ ترقی عام نہیں ہے اور گزشتہ زمانہ میں بھی دنیا کی مختلف اقوام نے دوش بدوش ترقی نہیں کی بلکہ یکے بعد دیگرے منصب حکومت اور جاہ و اقتدار مختلف قوموں کو حاصل ہوتا رہا۔ اور دوسری قومیں اُن ترقی یافتہ قوموں کی غلامانہ اطاعت میں مصروف رہیں۔ بعینہٖ یہی حالت آجکل ہے کہ ہر قسم کی مادی ترقی یورپ کو حاصل ہے۔ اور دنیا کی دوسری قومیں طوعاً یا کرہاً اُن کی اطاعت کر رہی ہیں بلکہ جو قومیں اُن کے دائرہ اطاعت سے باہر ہیں۔ وہ بھی اُن سے متاثر و مرعوب ہیں، اور اس کا سبب یہی ہے کہ یورپ کا معیار رفتہ رفتہ بلند

ہو گیا۔ اور دوسری قومیں اپنی جگہ پر رہیں اس لئے قدرتاً پست دکمزور ہو گئیں۔

مسلمانوں کی حیثیت

مسلمان بھی اُن قوموں میں سے ہیں جو زمانہ گزشتہ میں ترقی اور عروج حاصل کر چکی ہیں ایک خاص تہذیب وتمدن کے مالک ہیں اور ایک شاندار ماضی رکھتے ہیں لیکن آج اُن کی حالت برعکس ہے، اُن کی ترقی کا دَور گذر چکا ہے، اور ان کا زوال وانحطاط مسلم ہے، گویا دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف میں اُن کو وہ مرتبہ اور منصب حاصل نہیں ہے جس کے وہ اپنی تعداد اور گزشتہ عظمت وشوکت کے لحاظ سے مستحق ہیں۔

مسلمانوں کا جمود و سکون باعث انحطاط

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ترقی کا معیار ہر زمانہ میں مختلف رہا ہے چنانچہ جب تک جدید آلات حرب ایجاد نہیں ہوتے تھے۔ تیر و تلوار بہترین اسلحہ سمجھے جاتے تھے، ریلوے اور دخانی جہازوں سے پہلے معمولی بیل گاڑیاں اور بادبانی جہاز بھی غنیمت معلوم ہوتے تھے، برقی مشینوں سے پہلے معمولی دستی پریس ایک بڑی نعمت اور بہترین ایجاد تھے اسی طرح اور تمام چیزوں کا حال ہے۔ لیکن جدید ایجادات نے تمام پرانی چیزوں کے فائدہ اور درجہ کو گھٹا دیا اور اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم بھی اپنے کو زمانہ حال کے مطابق بنا کر موجودہ چیزوں سے فائدہ اُٹھائیں، اور اپنے درجہ کو موجودہ اقوام کی صف میں قائم رکھ سکیں، لیکن برخلاف اس کے ہماری، قدامت پسندی کی یہ حالت ہے کہ ہم کسی چیز میں تبدیلی کرنا نہیں چاہتے، اسی جمود وسکون کا یہ نتیجہ ہے کہ جو منصب و درجہ اس سے پہلے ہم کو حاصل تھا اس کو ہم نے ضائع کر دیا، اور اسکے تلخ نتائج اب بھگت رہے ہیں۔

مسلمان بحیثیت راعی و رعایا

مسلمان اس وقت دنیا کے مختلف حصّوں میں آباد ہیں کہیں وہ حکمراں ہیں اور کہیں محکوم، لیکن دونوں صورتوں میں اُن کی حالت

لائق افسوس اور نا قابل اطمینان ہے، جیسا کہ اُن مسلسل واقعات سے ظاہر ہوتا ہے جو قریباً تین صدی سے دنیا کے ہر حصہ میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں پیش آرہے ہیں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم کی ترقی اور عزت کا بڑا معیار یہ ہے کہ وہ صاحب تاج وتخت ہو اور بحر و بر کی مالک ہو۔ جو قوم دنیا کے جس قدر زیادہ حصہ پر قابض ہوگی، اسی قدر زیادہ معزز اور صاحب اقتدار سمجھی جائیگی، یہ ایسی حقیقت ہے جو ہمیشہ سے بلا اختلاف مُسلّم ہے، لہذا یہ خیال کہ کوئی قوم محکومی کی حالت میں بھی کامل ترقی حاصل کر سکتی ہے محض خوش آیند خیال ہے جس کو حقیقت سے کچھ تعلق نہیں، البتہ اس میں شک نہیں کہ محکومی کی حالت میں بھی مدارج کا اختلاف ہے بعض محکوم قومیں نہایت پست اور ابتر حالت میں ہیں اور افلاس و بے مائیگی اور جہالت کی وجہ سے روز بروز قعر مذلت میں گرتی جاتی ہیں۔ بعض ایک حد تک ترقی یافتہ اور دولتمند ہیں اور باہمی اتحاد و اخوت کی وجہ سے مضبوط و طاقتور بھی ہیں۔ اسلیٔے انکی حالت فی الجملہ قابل اطمینان ہے، اس بنا پر اُن کے متعلق آسانی سے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی آیندہ زمانہ میں موقع اور فرصت سے فائدہ اُٹھاکر ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچیں گی، اگرچہ اس وقت اُن کو وہ درجہ اور مرتبہ حاصل نہیں ہے، لیکن مسلمان اس وقت جہاں جہاں محکومی کی حالت میں ہیں اُن کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اُن سے یہ توقع کی جا سکے کہ وہ کسی موقع پر اپنی ہمعصر محکوم قوموں کے مقابلہ میں موقع سے فائدہ اُٹھائیں گے، کیونکہ نہ تو ان میں احساس ہے نہ انہوں نے اپنے کو اُس کے لیے تیار کیا ہے۔

غرض جب یہ امر مسلّم ہے کہ کسی قوم کی ترقی کا اعلیٰ معیار حکومت و سلطنت ہے اور اگر یہ میسر نہ ہو تو دوسرے درجہ پر محکومی کی وہ حالت ہے جبکہ محکوم قوم اُن تمام فوائد و منافع سے متمتع ہو جن سے وہ محکومی کی حالت میں حتی الامکان فائدہ اُٹھاسکتی

ہے تو اس لحاظ سے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ دونوں حیثیت کے لحاظ سے مسلمان اِس وقت کس حالت میں ہیں، اور بہ لحاظ حالت موجودہ ہم مستقبل میں اُن سے متعلق کیا توقع رکھ سکتے ہیں ؟

مسلمان اور حکومت ایک زمانہ تو وہ تھا کہ مسلمان دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکمراں تھے، اور اُن کی قوت و شوکت نے تمام دنیا کو مرعوب و حیرت زدہ کر دیا تھا، لیکن زمانہ کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا۔ اس لئے مطابق فرمان خداوندی وتلك الایام نداولها بین الناس، آخرکار مسلمانوں کو بھی روز بد دیکھنا نصیب ہوا، اور اُن کی کمزوری خانہ جنگی، اور غفلت شعاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام ممالک یکے بعد دیگرے اُن کے قبضہ سے نکلنے لگے، خصوصاً گزشتہ دو تین صدی میں تو دنیائے اسلام پر ایسی تباہی آئی کہ جس نے اُن کی قوت کو بالکل زائل کر دیا، اس بربادی کی داستان ایسی پرحسرت اور دردناک ہے کہ دنیا کی ہر آنے والی قوم اس سے عبرت و بصیرت حاصل کریگی۔

تنزل کا یہ قاعدہ ہے کہ جہاں وہ ایک دفعہ شروع ہوا تو پھر اپنی انتہا پر پہنچکر رُکتا ہے کیونکہ زوال پذیر قوم کا احساس اس قدر مردہ ہو جاتا ہے اور اس کا جذبہ غیرت و حمیت اس قدر دب جاتا ہے کہ جب تک وہ ذلت اور نکبت کے انتہائی درجہ پر نہیں پہنچتی بیدار نہیں ہوتی اسلئے انحطاط کا سلسلہ نہایت تیزی سے جاری رہتا ہے، اور اس زمانہ میں قوم کے بیدار کرنے اور اُبھارنے کی سعی عموماً ناکام رہتی ہے، یہانتک کہ زمانہ کا زبردست طمانچہ اُن کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے، لیکن ان خفتہ بخت مسافروں کی بیداری سے کیا حاصل جن کی کشتی گرداب مصیبت میں پھنس چکی ہو طوفانی موجوں نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے، ساحل نظر سے اوجھل ہے اور امید حیات منقطع۔

بس بعینہ یہی حالت مسلمانوں کی ہے کہ جب سے اُن کی سلطنتوں کو زوال شروع

ہوا تو حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی یہاں تک کہ اُن کی تمام مشہور سلطنتیں یا تو مٹ گئیں یا اس حالت پر پہنچ گئیں کہ اب اُن کی کوئی خاص عزت و حیثیت باقی نہیں ہے مراکش کا تو گویا خاتمہ ہوگیا، ایران باایں ہمہ وسعت و زرخیزی نیم جاں ہو رہا ہے اور اپنے سرسبز و شاداب ملک کا ایک بڑا حصہ گزشتہ صدی میں روس کے حوالہ کرچکا ہے۔ تاہم جو کچھ ملک اس کے پاس باقی ہے وہ بھی کچھ کم وسیع نہیں ہے۔ لیکن اس باقی ماندہ ملک کے قدرتی ذرائع سے فائدہ اُٹھانے کی بھی ایران میں صلاحیت نہیں۔ ملک میں عام طور پر جہالت پھیلی ہوئی ہے، صنعت، حرفت اور تجارت کا پتہ نہیں جنگی طاقت قریباً مفقود ہے، خصوصاً بحری طاقت کا تو وجود ہی نہیں۔ نقل و حرکت کے وسائل وہی کہنہ اور از کار رفتہ۔ تمام ملک میں صرف چند میل ریلوے لائن تیار کی گئی تھی، جس کا عدم وجود برابر ہے۔

خود بینی اور قدامت پسندی کی یہ حالت ہے کہ اصلاح کی بظاہر اُمید نہیں شخصی اغراض نے قومیت اور وطنیت کے جذبہ کو اس قدر مردہ کر دیا ہے اور اسراف و راحت پسندی نے زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے سے اس طرح عاجز بنا رکھا ہے کہ باوجود وسیع رقبہ کے دولت و حشمت علم و ہنر اور تجارت و حُسن انتظام کے لحاظ سے یورپ کی ایک چھوٹی سی سلطنت مثلاً بلجیم کے مقابلہ میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں۔

ترکی سلطنت، ایران سے بھی زیادہ وسیع اور طاقتور تھی، ایشیا کے علاوہ یورپ اور افریقہ میں بھی اس کے پاس بڑے بڑے وسیع صوبے تھے، اور دنیا کے اکثر مقدس اور تاریخی مقامات اس کے قبضہ میں تھے، لیکن اب حالت یہ ہے کہ سلطنت کا چوتھائی حصہ بھی باقی نہیں رہا۔ افریقہ میں ٹیونس پہلے ہی نکل چکا تھا۔ مصر پر برائے نام اقتدار تھا گزشتہ جنگ کے زمانہ سے وہ بھی نہ رہا، مرکز اسلام یعنی حجاز بھی ہاتھ سے جاتا رہا، شام کی مقدس سرزمین بلکہ بیت المقدس اور دمشق بھی ہاتھ سے نکل گیا، بغداد بھی گیا

گویا دمشق و بغداد جو خلفائے بنو امیہ و بنو عباس کے دار السلطنت تھے دونوں جاتے رہے یہاں تک کہ جو مقامات صحابہ کرام کے فتوحات میں داخل تھے ترکی اُن سے محروم ہوگئی یورپ کے تمام صوبے یکے بعد دیگرے نکل گئے اور اب اُن میں سے اکثر مستقل و آزاد حکومت رکھتے ہیں، مثلاً یونان، رومانیا، بلگیریا وغیرہ۔

ان حالات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں کس قدر ملک مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اقوام عالم کے درمیان اُن کی جو حیثیت تھی اور جو مرتبہ اُن کو پہلے حاصل تھا۔ وہ اب نہ رہا۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ اُن کی ہمعصر اور ہمسایہ قوموں نے جن اسباب سے ترقی کی مسلمانوں نے ان اسباب سے کام نہ لیا اور ملک کے قدرتی ذرائع اور پیداوار سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا۔ نہ صنعت و حرفت کو ترقی دی، نہ نقل و حرکت کے جدید وسائل سے ملکی تجارت کو فائدہ پہنچایا۔ نہ خام اجناس یا ملکی مصنوعات کے ذریعہ سے بیرونی ممالک سے دولت حاصل کی، دنیا میں اس وقت ہزاروں تجارتی جہاز چل رہے ہیں، ہزاروں کارخانے مختلف مصنوعات کی تیاری میں مصروف ہیں، جن میں اربوں روپیہ کا تجارتی مال تیار ہوتا ہے، لیکن کیا اس کاروبار میں مسلمانوں کا بھی کچھ حصہ ہے ! لہذا اگر مسلمان اپنی ہمعصر یا ہمسایہ اقوام سے پیچھے رہ گئے، اور جو منصب و اقتدار اُن کو حاصل تھا۔ اس کو اُنہوں نے ضائع کر دیا تو اس میں تعجب کیا ہے ؟ دنیا میں صرف وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں اور اغیار کے ظلم و ستم سے محفوظ رہتی ہیں جن کا دماغ ہمیشہ بیدار رہتا ہے، اور جو نہایت ہوشمندی اور غائر نظر کے ساتھ ہمعصر اقوام کی ادنیٰ نقل و حرکت کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں بلکہ اُن کی ترقی کے اسباب و علل پر غور کر کے اپنے کو ضرورت زمانہ کے مطابق تبدیل کرتی رہتی ہیں۔

مسلمان بحیثیت رعیت | جس طرح مسلمان بحیثیت ایک حکمراں قوم کے ابتر حالت

میں ہیں اسی طرح بحیثیت محکوم ہونے کے بھی اُن کی حالت ناقابل رشک ہے، اگرچہ دنیا میں اور قومیں بھی محکوم ہیں۔ لیکن مسلمان جہاں جہاں محکوم ہیں۔ یعنی اپنی ہمسایہ قوموں کی بہ نسبت پست حالت میں ہیں۔ اُن کا زیادہ حصہ یورپ کی مختلف سلطنتوں کا محکوم ہے۔ لیکن کسی جگہہ بھی اُن کو کسی قسم کا نفوذ یا اقتدار حاصل نہیں ہے، یہاں تک کہ جہاں اُن کی تعداد نہایت معقول ہے وہاں بھی ان کو قلیل التعداد اقوام پر کوئی فوقیت نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک محکوم قوم کے جو وسائل اُن کو میسر ہیں اور جس حد تک ترقی کا موقع اُن کو حاصل ہے اس سے بھی وہ متمتع نہیں ہوتے بلکہ اپنی غفلت سے ہمسایہ قوموں کو متمتع ہونے کا موقع دیتے اور اپنے حقوق کو خود ہی زائل کردیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہندوستان کی حالت پیش کی جاسکتی ہے، جہاں کم و بیش، کروڑ مسلمان آباد ہیں جو کم تعداد نہیں ہے لیکن با ایں ہمہ تعداد اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ علم دوست اور پولیٹکل اقتدار کے لحاظ سے ہندوستان کی ایک پس ماندہ قوم ہیں اور بحیثیت ایک محکوم قوم کے جو اہمیت ان کو اب سے پچاس سال پہلے حاصل تھی، اور ہندوستان کی قوموں میں اُن کا جو درجہ تھا وہ اب باقی نہیں رہا، اُن کی دولت ضائع ہورہی ہے افلاس بڑھ رہا ہے، جائداد برابر نکلتی چلی جارہی ہے اخلاقی اور تمدنی حالت کو روزافزوں انحطاط ہے، ہمسایہ اقوام کے دلوں سے ان کی عظمت بالکل زائل ہوگئی ہے جیسا کہ اُن واقعات سے ظاہر ہے جو آجکل جابجا ملک میں پیش آرہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مقامات پر اُن کی حالت نہایت خطرناک ہے، اور اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ وہ آیندہ اپنی ہندوستان میں ہستی اور عزت کو محفوظ رکھ بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

ہندوستان میں تمام مادی وسائل اور کاروبار کے تمام شعبے اس وقت غیر مسلم اقوام کے ہاتھ میں ہیں، اور مسلمان کسب معاش کے جملہ وسائل سے قریباً محروم ہیں

جس کا نتیجہ افلاس ہے اور افلاس کا نتیجہ اخلاقی کمزوریاں، اور شیرازہ قومی کا منتشر ہونا۔ غرض دولت ایک طاقت ہے اور ایک قوت ہے جس کے بل پر ہندوستان کی دوسری قوموں نے مسلمانوں پر پورا قابو حاصل کر لیا ہے، یہاں تک کہ لاکھوں مسلمان غیر اقوام کے سود خواروں کے پنجہ میں اس طرح گرفتار ہیں، کہ اُن کی زندگی تلخ ہو گئی ہے مگر نجات کا کوئی راستہ ان کو نظر نہیں آتا۔

مذکورہ بالا حالات سے صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلمان بحیثیت حاکم یا محکوم اس وقت جہاں جہاں ہیں اُن کی حالت نہایت زبوں اور قابل رحم ہے بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف میں اُن کو کوئی ممتاز جگہہ حاصل نہیں ہے، رہا یہ سوال کہ آیندہ زمانہ میں مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی تو یہ اُن کے طریق عمل پر منحصر ہے، کیونکہ قوموں کا عروج وزوال اُن کے نیک یا بد اعمال پر موقوف ہے۔

محمد اکرام اللہ خاں ندوی

تنقید و تبصرہ

کورگ مدراس میں چیف کمشنر کے ماتحت ایک چھوٹا ساحصہ صوبہ ہے جس میں کل ۳۱۳۹۹ مکانات سکونتی اور ۱۶۳۸۳۸ نفوس آباد ہیں ان میں برادران ہنود کی تعداد معہ بودھ ۔ جینی وغیرہ ۴۷۶۳۵ مسلمان کل ۱۳۰۲۱ اور عیسائی ۳۱۸۲ ہیں ۔ چونکہ کورگ میں پیشہ زراعتی سرزمین ہے لہذا زراعت پیشہ کی تعداد زیادہ ہے غیر زراعتی طلبا ء پورے ۲۵ فی صدی بھی نہیں ۔ بیشتر حصہ زراعتی خاندانوں کے بچوں کا ہی گو تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے کچھ حصہ کاروبار بھی کرتا ہے ۔ جنوبی ہند کی تقریباً تمام زبانیں مروج ہیں ۔ مگر وہ سب اُردو کے سوا ڈراوڈی کی شاخیں ہیں ۔ با ایں ہمہ سررشتہ تعلیم نے آج تک زراعت پیشہ آبادی کی تعلیم کا خاص نظام قائم نہیں کیا بارچہ بافی اور نجاری کے صرف دو خاص مدرسے ہیں ۔ اس قسم کے نظام تعلیم کو بھی سررشتہ تعلیم بعد غور نظر انداز کرچکا ہے کوئی اُمید نہیں کہ دستکاری یا ٹیکنیکل تعلیم کا انتظام جلد کیا جائیگا ۔ زراعتی مدارس کا ۔ کہیں نام و نشان نہیں نہ صوبہ مدراس ہی سے انتظامی تعلق ہے کہ وہاں کے وسیع نظام تعلیم صنعت و زراعت سے اہل کورگ مستفید ہوسکیں ۔ البتہ اسکول لیونگ کی تعلیم کی حد سے زیادہ توسیع ہے سمجھہ میں نہیں آتا کہ وہ تعلیم جس سے آبائی ، اجدائی پیشہ ہی فراموش ہوجائے طلبہ کو اسباب معیشت جمع کرنے میں کیا مدد دے سکتی ہے بجز اسکے کہ اس چھوٹے سے دور افتادہ سرزمین میں بھی غلط سیاسی خیالات پھیلیں جس سے وہ اب تک پاک و صاف رہا ہے ۔

کورگ میں صرف ابتدائی اور ثانوی کے مدارس ہیں ۔ گو اعلی تعلیم کے لئے تھوڑے سے وظیفے دیئے جاتے ہیں مگر ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور اشد ضرورت ہے کہ چند کالج قائم کئے جائیں ۔ کورگ کے مدارس میں ایک بات عجیب و غریب ہے

یعنی ابتدائی درجہ ہو یا ثانوی اگر کوئی طالب علم انگریزی پڑھے تو آدھے زائد فیس دینی چاہیئے اور اگرچہ لڑکیوں کی معمولی فیس ہی معاف ہے مسلمان طلبہ سے بھی آدھی فیس لی جاتی ہے لیکن یہ ایک معمہ ہے کہ انگریزی زبان جو مغربی تہذیب کے سکھانے میں ایک زبردست ذریعہ ہے اور مغربی تہذیب کی نسبت عام عقیدہ یہ ہے کہ اس سے صحیح سیاسی جذبات اور حکومت خود اختیاری کی قابلیت پیدا ہوتی ہے وہی انگریزی زبان اہل کورگ کو فیاضی کے ساتھ نہیں دیجاتی بلکہ اس کی تعلیم علانیہ زائد فیس ہے لیکر دیجاتی ہے۔

ماہران فن تعلیم طے کر چکے ہیں کہ ابتدائی تعلیم سنگ بنیاد ہے اندریں صورت بنیاد کے معمار بھی نسبتاً زیادہ قابل ہونے چاہئیں۔ مگر کورگ میں لوکل فنڈ ٹیچروں کی تنخواہ ۱۱ سے ۲۰ تک ہے اور لوئر پرائمری میں ۲۵، ۳۰ سے زیادہ نہیں ملتے

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّاں

کار طفلاں تمام خواہد شد

ملک بھر میں کل ۱۰۰ مدرسے ہیں ۲ ثانوی، ۹۴ ابتدائی، ایک مدرسہ معلمین کا ہے البتہ خاص مدارس میں ۹ مکتبیں اور ۱۰۵ طلبہ ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی ملاں مکتب یا مدرسہ ایک ہی نہیں۔

مسلمانوں کی تعلیم کی حالت نہایت ابتر اور خراب ہے۔ ہندوستان بھر میں کورگ کے بعد شاید ایک دو مقامات ایسے ملیں جہاں قرآن خوانی کے مکاتب تک بھی نہ ہوں اور جہاں بچے اور بڑے یکساں خدا اور بندہ کے حقوق و فرائض میں تمیز نہ کر سکیں باضابطہ مدارس میں کل ۸۰۳۰ لڑکے۔ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ ان میں مسلمان کل ۲۸۴ ہیں (۲۵۵ لڑکے اور ۲۹ لڑکیاں) رفتار ترقی کا یہ حال ہے کہ میٹرک یا اسکول لیونگ میں اُردو یا انگریزی مڈل میں یا پرائمری میں ۲۲-۱۹۲۱ء

کے اندر ایک بھی مسلمان پاس نہیں ہوا۔ نہ پنچامہ قوم کی طرح ان کی تعلیم کا کوئی خاص نظام ہے بلکہ بھیڑ بکریوں کا ایک بے پناہ گلہ ہے جو جہالت کے میدان میں سرگرداں ہے۔ ہم مدراس کے اکابر اور مخدومان قوم سے بہ منت التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی فیاضی کے دامن اور ربوبیت کے سایہ کو ہمسایہ مسلمانان کورگ تک بڑھائیں اور کم سے کم ابتدائی قرآن خوانی کے مکاتب کھلوانے کی کوشش کریں تاکہ یہ تعلیم گاہیں کسی نہ کسی طرح وسیع ہو کر باضابطہ مدارس کی صورت اختیار کرلیں سال گزشتہ کی رُوداد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سررشتہ تعلیمات نے ابتدائی مدارج کے لئے مسلمانوں کے لئے ۲۵ وظیفے مخصوص کئے اور ثانوی میں چھ وظیفے دیے مگر مسلمانوں نے ان سے مطلقاً استفادہ نہیں کیا۔ جیسا کہ مسٹر ملونی نے ۱۹۱۱ء کی رُوداد مردم شماری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "جب ہم مسلمانوں کے شاندار ماضی پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے تعلیمی نظام اور نتائج کو دیکھتے ہیں اور پھر موجودہ حالت میں ان کا تعلیمی تنزل سامنے آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اب مذہب اسلام اور تعلیم میں وہ اگلا سا گہرا تعلق کیوں نہیں رہا"، آگے چل کر اسی سلسلہ میں مسٹر ملونی نے لکھا ہے "مگر اسکے ساتھ ہی ہندو دھرم سے نسبتاً بہت زیادہ مذہب اسلام اپنے پیروں میں اب بھی اس قدر تشویق اور ترغیب پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اپنی کتاب مقدس اور مذہبی تحریرات کو بقدر ضرورت سمجھ لیں"۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کورگ کے مسلمانوں کو یہ بات بھی حاصل نہیں ہے نہ زراعت پیشہ آبادی میں ان کی تعداد زیادہ ہے نہ تعلیمی نقشوں میں ان کا کہیں پتہ ملتا ہے حالانکہ میٹرک میں منجملہ کل ۴۶ کے ۲۳ ہندو پاس ہوئے اور پرائمری میں ۲۲ میں سے ۱۲ ہندو پاس ہوئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کورگ کے مسلمان کہاں ہیں اور کس راستہ پر جا رہے ہیں۔

نہ ہندوام نہ مسلماں نہ کافرم نہ جہود　　　بحیرتم کہ سرانجام ماچہ خواہد بود۔ صدیقی

کواپریٹو   اصلاح تمدن   سوسائٹی

ہندوستان کا افلاس اب ضرب المثل ہوتا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ قومیں اہل ہند کو بے زری اور تنگدستی کی شکایت کرتا دیکھکر چاہے کسی قسم کے جذبات سے متاثر ہوتے ہوں۔ ترحم۔ ہمدردی۔ امداد دستگیری یا اور کوئی جذبہ انہیں از خود رفتہ کرتا ہوگا لیکن ایشیا کی قوموں میں میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے کوئی کابلی جب کسی ہندوستانی کو ناداری کا رونا روتے ہوئے سنتا ہے تو حیران بھی ہوتا ہے اور ہنستا بھی ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جس کی زر و دولت کے افسانے مشہور ہیں تنگ دستی کی شکایت کرنا کس قدر لغو ہے۔ خصوصاً جب اُسے تہوار یا تقریب کے موقعوں پر ہندوستانی زرق برق لباس پہنے اور بے دریغ پیسہ خرچ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو وہ انہیں مفلس کیونکر کہہ سکتا ہے۔ گو یہ حالت شہروں اور قصبوں میں نظر آتی ہے جہاں کے باشندے خود نمائی اور تصنع کے عادی ہوتے ہیں فاقہ کشی کی تکلیف برداشت کرکے بھی اُجلے پوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیہات میں حصول زر کے وسائل شہروں سے زیادہ آسان ہیں یعنی اراضی سے پیداوار حاصل کرنا۔ شہروں میں محنت و مشقت کرکے روزی حاصل کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ اس لئے کابلی اس افلاس کو ہندوستانیوں کی سستی اور کاہلی کی طرف منسوب کرتا ہے اس قضیہ پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔ تنگدستی

قلت غلہ اگر آنریبل پروفیسر کالی کا حساب غلط نہیں اور یقیناً نہیں تو ہندوستان میں اوسط آمدنی فی کس کل ۳۶ روپیہ سالانہ یا ۳ روپیہ ماہوار ہے ادھر پیداوار غلہ کے سالانہ نقشے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی زرخیز زمین ضرورت سے ۵۰ کروڑ من کم غلہ سالانہ پیدا کرتی ہے جس میں قیدیوں کی خوراک کا اوسط بھی پیدا نہیں ہوتا۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دیہات میں بچوں کو چھوڑ کر بڑے آدمیوں کو ۲۰ فی صدی ایک وقت کھانا نصیب ہوتا ہے حالانکہ ہندوستان میں دہقانوں کی آبادی زیادہ ہے شہروں میں کل آبادی کا دسواں حصہ ہے باقی نو حصوں میں سے پورے سات حصے دیہات کی وہ آبادی ہے جو سرتاپا زراعت پر بسر کرتی ہے ہندوستان اور انگلستان میں دونوں جگہ سب سے زیادہ پیداوار گیہوں اور جو کی ہے اگر دونوں ملکوں کی پیداوار کا فی ایکڑ مقابلہ کیا جائے تو حسب ذیل نقشہ مرتب ہوگا۔

	گیہوں	جو
ہندوستان	۸۱۴ پونڈ	۸۱۷ پونڈ
انگلستان	۱۹۱۹ پونڈ	۱۶۴۵ پونڈ

نوٹ - ہندوستان کی زمین انگلستان سے بہت زیادہ قابل ہے مگر تردد کاشت اور آلات کشاورزی اور علم زراعت میں انگلستان سے سینکڑوں فرسنگ پیچھے ہے۔

روئی کی پیداوار کا بھی یہی حال ہے یعنی فی ایکڑ زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ پونڈ حالانکہ امریکہ میں اوسط ۲۰۰ پونڈ اور ملک مصر میں ۴۵۰ پونڈ فی ایکڑ ہے۔ مصر میں اگر ایک رود نیل ہے جسے کہیں ابیض کہتے ہیں اور کہیں ازرق تو ہندوستان میں ہر قدم پر ایک نیل موجیں مار رہا ہے گنگا اور اس کی شاندار شاخیں سندھ اور برہمپتر وغیرہ وجیہ سرزمین ہند کو سیراب کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔

فلک یک جلوہ خورشید دارد با چنیں شوکت
ہزاراں ایں چنیں دارد گریبانے کہ من دارم

پھر یہ نہیں کہ (ورکر) عمال کی کثرت نہ ہو بلکہ ہندوستان کی اکتیس بتیس کروڑ آبادی میں حسب روداد مردم شماری حال ۷۰ فی صدی دن رات کشاورزی میں مصروف رہتے ہیں زراعت پیشہ کی صحیح تعداد کا اندازہ ۷ ۲۸۶۰۵ دیہات خالص کی تعداد

سے بخوبی ہوگا جن میں بہ حساب اوسطانی گاؤں ۳۶۴ کی آبادی ہے مگر باایں ہمہ اگر نوکر وڑ آدمی رات کو بھوکے سوتے ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ قدرت نے ہندوستانیوں کی طرف سے مُنہ پھیر لیا ہے بلکہ دو زبردست طاقتوں کی کمی ہے اور وہ دونوں انسانی ہیں یعنی ذرائع آبپاشی کی کمی اور زراعتی بنکوں یا کوآپریٹو سوسائٹیوں کی قلت ہے ان دونوں کی تہ میں تعلیم کی کمی ہے اگر تینوں کا ایک سلسلہ بنایا جاوے تو اوّل تعلیم ہے جس کی روشنی میں کاشتکاری زندگی کی اہم ضرورت یعنی بنک یا سوسائٹی نظر آویگی۔ اور جب ان دونوں کی محنت کے نتائج کا انبار سامنے ہوگا تو حکومت خود بخود ذرائع آبپاشی کو وسیع کرنے پر مجبور ہوگی چنانچہ مضمون کے اس حصہ میں ہم صرف بنکوں اور سوسائٹیوں کی ضرورت پر بحث کرینگے۔

اسباب قلت

علم الاقتصاد کے ماہر بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کسی قوم یا ملک میں افلاس و ناداری حد سے بڑھ جاوے تو اس کی اصلاح عوام الناس کی مالی حالت سے شروع کرنا چاہیئے۔ قوم کی ریڑھ کی ہڈی یہی طبقہ ہے ملک کی سیاست اور معاشرت کا بڑا بار کش اہل ملک کی جمیع ضروریات زندگی کا کفیل بھی یہی ہے۔ ایوان قومیت کی بنیاد ہمیشہ حزب العمال ہی نے رکھی ہے، انہی کے قوت بازو سے تعمیر مکمل ہوئی ہے۔ امراء دولتمند عمال ہی کے بل پر قوم و ملک کے صدر و بدر بنتے ہیں لیکن ہر ایک ملک میں عوام الناس یا طبقہ عمال ہمیشہ زراعت پیشہ نہیں ہوتا جہاں افراد کثیرہ کا بسر اوقات صنعت و دستکاری سے ہے مثلاً انگلستان یا امریکہ وہاں عوام الناس سے مراد صناع و دستکار اور کارخانوں کے قلی ہیں۔ ہندوستان زراعتی ملک ہے لہذا یہاں کی پبلک کاشتکار اُن کے متوسلین اور شرکائے محنت ہیں بلکہ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کو بھی کسی نہ کسی طرح اراضیات سے نسبت ہے اگر بمبئی یا کلکتہ میں اس

حزب العمال

سورت میں چند ملک التجار یا متوسط درجہ کے دولتمند تاجر موجود ہیں تو وہ کسی شمار و
طار میں نہیں ان کے مقابلہ پر والیان ریاست۔ تعلقہ دار۔ جاگیردار اور زمیندار ہیں۔
ان میں گو ایک بڑی تعداد خود مختار رؤسا کی ہے لیکن زمیندار ہونے سے کوئی
الی نہیں بخلاف امریکہ اور انگلستان کے جہاں لنکاشائر کے قارون صنعت کارخانہ دار
ض صنعت و دستکاری کی بدولت طبقہ اعلیٰ میں داخل ہیں۔ اور امرائے قوم
ہلاتے ہیں۔ تہذیب کی تو گویا تمام منازل پر قابض ہیں۔
قوم کا متوسط طبقہ درحقیقت سوسائٹی کے نظام میں کوئی ہستی نہیں رکھتا
ائض حیاتیہ کے لحاظ سے محنت کش اور دولتمند یا ادنیٰ و اعلیٰ کے درمیان ایک حد
وسط ہے جو دونوں کو تصادم سے بچاتا ہے اگر امرار کے عجب و نخوت کا اثر براہ راست
دنی طبقہ کے ان گھڑ اور ناتراشیدہ افراد تک پہنچے تو سوسائٹی میں ہر وقت ہلچل
ی رہے، اسی طرح اگر ادنیٰ طبقہ کے افراد اپنے جائز حقوق و مطالبوں کو ناتراشیدہ
ورت میں امرار تک براہ راست پہنچانے لگیں تو امرار کی نازک مزاجی کو سخت صدمہ
ہنچے جس سے نظام آسائش درہم برہم ہونے کا احتمال ہے مگر یہ متوسط طبقہ بیچ میں
ائل ہو کر دونوں کو متصادم ہونے سے بچاتا ہے۔ طبقہ اعلیٰ کے خصائص دولت و
دت اور نازک مزاجی ہے، ملک کی حکومت ہمیشہ اسی طبقہ کے چیدہ افراد کے
تھ میں ہوتی ہے۔ متوسط طبقہ کے خصائص ہیں مساحت و ترتیب۔ صلح جوئی اور تدبر
اخل ہیں۔ ادنیٰ طبقہ میں جفاکشی محنت و مشقت کی عادت جوش اور غیرت کا جز
یادہ ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے نظام میں یہی تین درجے شامل ہیں۔ ہندوستانیں
نوں طبقوں کے تقریباً تمام افراد زمین اور زمینداری سے نسبت رکھتے ہیں انکی
جہ معاش جیسا کہ مشاغل حیاتیہ بھی حقیقتاً زراعتی ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان
یں پبلک سے مراد فی الجملہ دہقانی اور دیہاتی آبادی ہے اور ملک کی اقتصادی

ہندوستانی پبلک

اصلاح ان ہی کاشتکاروں کی مالی حالت کی اصلاح پر منحصر ہے۔ کاشتکار کے افلاس ونکبت کا اثر اس کی ذات اور متعلقین پر محدود نہیں رہتا بلکہ تمام ملک کو مفلس اور سقیم الحال کرکے چھوڑتا ہے۔

کاشتکار کے حوائجِ زندگی

ہندوستان میں کاشتکار کی ضروریات زندگی اس قدر محدود ہیں کہ افلاس کا اس کی ذات پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ جفاکش محنتی کو قوت لایموت کی کہیں کمی نہیں جیساکہ اس کے سرمایہ محنت کو بھی کہیں زوال نہیں۔ اصل میں محنت کی عادت اور بارکشی کی قوت کا خزانہ اس کے جسم میں اس طرح محفوظ ومخفی ہے کہ نہ اُسے چرا سکتے ہیں نہ غصب نہ منتقل کرسکتے ہیں اگر فصل کی پیداوار کم ہے یا زیادہ ہے۔ پیداوار کو چور لیجائیں یا سود خوار بنیہ یا جابر زمیندار اُٹھالیجائے۔ کاشتکار کو اس قسم کی چیرہ دستی سے محض خیالی تکلیف ہوگی اس کی حقیقی ضرورت بند نہیں ہوگی۔ پس کاشتکار کے افلاس سے جس قدر نقصان پہنچتا ہے وہ محض قوم اور سوسائٹی کو پہنچتا ہے حقیقت میں کاشتکار قوم کے باغ کا پھلدار درخت اور سوسائٹی کے ہر فرد کا ان داتا ہے جس کے افلاس ونکبت سے ایوان شاہی اور امرا کے دولتکدے بدرونق تجارت کا بازار سرد اور عام کاروبار بند ہوجاتے ہیں۔

مہذب ممالک کا دستور

مہذب ملکوں میں جب افلاس محسوس ہوتا ہے تو اس کے اسباب کی ریشہ دوانی طبقہ ادنیٰ میں کرتے ہیں۔ ان کے سرمایہ محنت کو مصروف اور بارآور کرنے کے لیے ایسے مشاغل مخترع کرتے ہیں کہ زمین کے مخفی خزانے برآمد ہوکر سوسائٹی کے قابل استعمال ہوجائیں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی تھوڑی سی محنت اور وقت سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے اس مقصد کے لئے سائنس کی تقریباً تمام شاخوں سے مدد لی جاتی ہے۔ امرا اور متوسط الحال جماعتیں دن رات اس مسئلہ کی جانب اس طرح متوجہ ہوجاتی ہیں جس طرح کسی گاڑی کے پہیئے بگڑجانے

گاڑیاں اور سواریاں ہمہ تن اون کی درستی میں مصروف ہوجاتی ہیں۔

محض کفایت شعاری سے فراخدستی نہیں میسر ہوسکتی۔

ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ خرچ کم کرنے سے ناداری میں کمی ہوتی ہے مگر یہہ ایک خاص حد تک صحیح ہے یعنی اگر سوسائٹی کے معیار مصارف سے زیادہ خرچ کرکے اسراف کی نوبت پہنچ گئی ہو تو بلاشک اخراجات گھٹانے سے کسی قدر فراخدستی میسر ہوسکتی ہے۔ اس میں مصارف کا معیار معین کرنا بہت ہی مشکل ہے میونسپلٹی کے بائیلاز اور حکومت کے قوانین مجاریہ کی طرح کوئی ایسا دستور سوسائٹی میں نافذ نہیں ہے جس سے ترک یا فعل کا اندازہ ہوسکے۔ انفرادی رائے پر انحصار ہے ایک شخص ذیعقل اور مدبر ہے وہ حقیقی اور مجازی ضرورتوں میں تمیز کرسکتا ہے دوسرا بدعقل ہے ایسی حالت میں مصارف جائز اور اسراف بیجا میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

ایشیا کی ایک رسم عام

پھر ایشیا میں خصوصاً ہندوستان میں یہ ایک انوکھی رسم معاشرت ہے کہ ایک آدمی کے دست و بازو کے سہارے کئی کئی آدمی جیتے ہیں اکثر صورتوں میں جوان اور متاہل اولاد اور اس کی اولاد باپ کی کمائی پر بے تکلف بسر اوقات کرتی ہے چنانچہ ۱۹۱۱ء کی رو داد مردم شماری پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ فی صدی ، ۴۵ آدمی محنت و مشقت سے روپیہ پیدا کرتے ہیں تو ۵۵ بالکل معطل الوجود ہوکر ان کے سہارے پر جیتے ہیں۔ پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ فراخدستی کے لئے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جو آج کل مہذب اور شائستہ ممالک میں معمول ہے یعنی وسائل آمد کو وسیع کرنا چاہئے اس طرح پر کہ اپنے جائز مصارف کا ایک ذہنی بجٹ بنا کر اس کے مقابلہ پر اس سے کم سے کم سوائی یا ڈیوڑھی آمدنی کے وسائل تلاش کرنے چاہئیں تاکہ انصراف اور پس انداز دونوں میں سے کوئی مد تشنہ نہ رہے اخراجات کو بہت زیادہ گھٹانے سے

ملہارن اقتصادی کی ندا

انسان کا حوصلہ پست ہوتا ہے اور دل و دماغ پر ایک طرح کی پژمردگی چھا جاتی ہے اور سوسائٹی کی عام ترقی کی راہیں بھی بند ہوجاتی ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر ملہارن اقتصادی

مستقل رائے ہے کہ نہ صرف اسراف اور تبذیری سے بچیں بلکہ تدبر اور جفاکشی سے آمدنی کو بڑہائیں اگر ذرائع آمد وسیع ہونگے تو اتفاقیہ اسراف کا عام فراخدستی پر کچھ اثر نہ ہوگا۔

اعداد شمار

ظاہر ہے کہ ہندوستان میں عوام الناس یعنی زراعت پیشہ جماعتوں کے وسائل آمد بڑہ جانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ زمین کی پیداوار کو سودخوار بنیوں کی دستبرد اور کاشتکار کے فضول خرچیوں سے بھی محفوظ رکھیں اور کواپریٹو سوسائٹیاں اور زراعتی بنک قائم کرکے انہیں حیثیت آراضی بڑہانے میں مدد دیجائے۔

یہاں تخمیناً ......۲۱۷ نفوس کے منجملہ ......۸ زمیندار اور تقریباً ...... منتظم کارکن اور ملازمین ہیں باقی ......۲۰۸ خالص کاشتکار باغبان یا مالی ہیں ان میں بہت بڑی تعداد ان کاشتکاروں کی ہے جن کی زیر کاشت بہت تہوڑی زمین ہے کم سے کم دس بارہ بیگہہ ان کی آمدنی بھی اسی قدر محدود ہے لہذا مالی قوت بھی نہایت ضعیف ہے صرف ایک خشک سالی سے یہ کاشتکار ازپا افتادہ ہوجاتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حیثیت اراضی کیونکر بڑہ سکتی ہے اور زمین کی پیداوار دوچند سہ چند کیسے ہوسکتی ہے جس سے کاشتکاروں میں فراخدستی اور قوت برداشت پیدا ہو۔

دیگر تدابیر اصلاح

ملک میں سب سے بڑی قوت حکومت ہے اگر وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے تو ضرور ہے کہ ایک جدید محکمہ قائم کرکے اس کی شاخیں جابجا قائم کی جائیں چھوٹے کاشتکاروں سے اراضی لیکر انہیں اجرت کی صورت میں معاوضہ دیا جاے اور محکمہ کے عمال کی مدد سے اراضی کی حیثیت بڑہائی جائے لیکن ایسا کرنے سے ملک میں بیچینی پھیلے گی اور نہ یہ ہندوستان کی حکومت کو زیبا ہے۔ دوسری تدبیر یہ ہی کہ گورنمنٹ کے بجائے ملک کا کوئی بہت بڑا دولتمند شخص اس کام کو کرے یہ بھی

بالعمل ناممکن ہے بلکہ اگر ہندوستان کے بڑے بڑے دولتمند ملکر ایک کمپنی بنائیں اور ہر شخص اپنے اپنے صوبہ کی ذمہ داری لے اور وہ اس مشترکہ سرمایہ سے جدید مشینیں منگوا کر اور کاشتکاروں سے اُجرت پر کام لیکر تاجرانہ حیثیت سے کشاورزی کرے تو بھی یہ کام چلنے والا نہیں۔ پس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ چند دیہات

کوآپریٹو کا ایک حلقہ بنا کر چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کی ایک سوسائٹی بنائی جائے اور وہ باہم ملکر مشترکاً اپنے مال کی نکاسی کریں۔ انہیں نیک نیتی اور ایمانداری کے فوائد کی تلقین کی جائے کہ وہ انفرادی نفع نقصان کو اجتماعی سود و زیاں پر نثار کردیں۔ ان کے ذمہ سود خوار بنیوں کا جس قدر قرضہ عاید ہوتا ہو اُسے کم سود پر لیکر چکا دیں اور اس قرضہ کو کاشت کی مشترک آمدنی سے ایک خاص مناسبت سے ادا کیا جائے اور اسی میں سے ایک حصّہ حیثیت اراضی بڑہانے پر صرف کیا جائے یہی کوآپریٹو سوسائٹی یا زراعتی بنک کا نظام ہے۔

نئے نکتہ چین ملک میں ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ کاشتکاروں کی سقیم الحالی کبھی دور نہیں ہوسکتی حیثیت اراضی اور پیداوار بڑہانے میں انہیں جس قدر مدد دیجائیگی بالکل بیکار رہیگی اس لئے کہ ہر تیس سال کے اختتام پر پیداوار کا بہترین حصّہ بندوبست کی نذر ہوجائیگا باقی حصّے پر زمیندار قبضہ کرلینگے سب سے اخیر پر کچھہ بھوسی۔ چانس کاشتکار کے پاس رہ جائیگا۔ مگر یہ ایک دوسری بحث ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حیثیت اراضی اور پیداوار کو ملک میں ترقی نہیں دینی چاہیے۔

بہرصورت کوئی گورنمنٹ مصارف سلطنت سے زیادہ روپیہ بذریعہ محاصل وصول نہیں کرتی۔ اگر کسی اتفاقیہ حادثہ یا ناگزیر ضرورت کی وجہ سے مصارف بڑھے تو ضرور ہے کہ محاصل بھی بڑھینگے اور مالگزاری یا لگان بھی ایک محصول ہے لیکن اس بحث کو نظر انداز کرکے دیکھنا چاہیے کہ کوآپریٹو سوسائٹی یا زراعتی وصنعتی بنک ایک چیز ہی دوسری

ہے جس کا منشا محض یہ ہے کہ صنعت کی حالت بہتر اور ذریعہ معاش وسیع تر کیے جائیں خواہ وہ کاشتکار ہو یا صناع و دستکار۔ لیکن یہ ایک بڑا کٹھن کام ہے جس میں خودغرضی اور نفسانیت کا ایک شمہ بھی ہوا تو کامیابی ممکن نہیں اصولی بحث کرنے سے بہتر یہ ہوگا کہ کواپریٹو سوسائٹی نے پنجاب میں جو کایا پلٹ کی ہے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرائیں۔

پنجاب کی کواپریٹو

مثلاً پنجاب میں رفتہ رفتہ ایک مرکزی کواپریٹو بنک بن گیا ہے جس سے متعدد مقامی سوسئیاں نہایت کم شرح سود پر روپیہ لیکر اپنے ممبروں کا بھاری سود کا قرضہ یکمشت یا بااقساط ادا کردیتی ہیں اور اسی میں سے کچھ ان کی حیثیت اراضی بڑھانیکا سامان مہیا کرتے ہیں مقامی سوسائٹی کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے یعنی ہر ایک ممبر مشترکاً و منفرداً تمام دیون کی ادائگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ہر سوسائٹی کی بنیاد حسب ذیل امور پر ہوتی ہے۔

اصول

(۱) وہ دار اشخاص جن کا تدین اور خوش معاملگی مسلمہ ہے سوسائٹی کی ممبر ہوسکتی ہیں

(۲) سوسائٹی کا حلقہ عمل محدود کرلیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آس پاس چار چھ دیہات ہیں پس ان کی کواپریٹو سوسائٹی ایک ہوگی اور اس میں ان ہی دیہات کے باشندے ممبر ہوسکیں گے۔

(۳) ممبران کی ذمہ داری غیر محدود ہوگی جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔

(۴) سوسائٹی فرضی قیمت کے حصے فروخت کریگی اور کوئی منافع تقسیم نہیں کریگی

(۵) قرضوں کی ادائگی اصل روپیہ سے کی جائیگی۔

(۶) اس روپیہ لگانے سے جو بشکل سود منافع ہوگا وہ بجائے اسکے کہ ممبروں کو دیا جائے محفوظ رکھا جائیگا یہاں تک کہ یہی رقم بڑھتے بڑھتے سوسائٹی کا ایک مستقل سرمایہ بن جائیگا اور اس کو مرکزی بنک سے سود پر روپیہ لینے سے مستغنی کردیگا۔

کبھی کبھی اس روپیہ کو نفع بخش کام میں لگا کر بڑہاتے بھی ہیں لیکن نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اسی وجہ سے ہر ممبر کی ذمہ داری معمول سے زیادہ ہے محفوظ مد کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک منصرف اور دوسرا غیر منصرف۔ منصرف مد سے سوسائٹی کے ناگزیر مصارف پورے کیئے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی چپراسی وغیرہ کی تنخواہ یا سامان نوشت وخواند کتب حساب وغیرہ۔ غیر منصرف کو مطلقاً خرچ نہیں کرتے اور گویا سوسائٹی کے حیات کا مدار اسی پر ہے مگر محفوظ مد خود بخود زمین سے نہیں نکل آتا بلکہ ممبروں کی سخت نفس کشی اور صبر آزما محنت ومشقت خاص مخلص تدابیر کفایت شعاری سے حاصل ہوتا ہے اگر انفساخ شراکت کی نوبت پہنچے تب بھی یہی مد دستگیری کرتا ہے۔ اصول

(۷) سوسائٹی کے ہر رکن اور عہدہ دار کو سارے کام بالکل مفت اور بلا معاوضہ کرنے لازم ہیں وجہ یہ کہ جب سوسائٹی کے پاس گھر کا سرمایہ کچھ نہیں بلکہ مرکزی بنک سے ایک رقم لیکر تھوڑے سود پر اس کو اپنا سرمایہ بناتی ہے اور اس سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ سود پر دیکر وہ اپنے حلقہ کے غریب کاشتکاروں یا دستکاروں کے بھاری سود کے قرضے ادا کرتی ہے اور ان کے ذرائع آمد بھی بڑھاتی ہے تو لازم ہے کہ ایسی سوسائٹی کا ہر رکن اپنا بہترین سرمایہ سوسائٹی کی مفت نذر کردے وہ کیا ہے؟ اپنے وقت اور محنت کا بہترین حصہ۔ ایثار اور قربانی بغیر ہم دنیا میں کسی از پا افتادہ کی دستگیری نہیں کر سکتے۔ بس یہی سات اصول ہیں جن پر کواپریٹو سوسائٹی کی بنیاد ہے۔

پنجاب کے کاشتکاروں کو اس نظام نے ابدی موت سے بچا دیا ہے اسوقت ان کی جماعت میں ۳ فیصدی کواپریٹو سوسائٹی کے ممبر ہیں اور تقریباً ہر گاؤں میں کم سے کم ایک اور اکثر مقامات میں کئی کئی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں پنجاب بھر میں کواپریٹو سوسائٹیوں کو ۲۶ لاکھ روپیہ کا نفع ہوا اور تخمیناً ۵۲ لاکھ روپیہ سے کم مقدار کے حصے نہیں نکلے۔ اس نظام کی بدولت پنجاب میں بحساب اوسط ۲۰ لاکھ روپیہ

سالانہ سود خوار بنیوں کے بھاری سود کے قرضوں میں ادا ہوا جس سے سینکڑوں کاشتکار
مہاجنوں کے آہنی پنجہ سے چھوٹ گئے۔

ترقی کی حد

پنجاب میں اب کواپریٹو سوسائٹی کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ مکفولہ اور مرہونہ جائداد
جائدادیں چھڑا کر اور اپنے قبضہ میں لیکر ان کی آمدنی سے قرضے ادا ہو رہے ہیں۔ لاہور
میں سندا کلاں کے نام سے ایک سوسائٹی ہے جو ۱۹۱۲ء سے قائم ہے جس کے ۱۱۳
ممبر ہیں اس نے ایک عام بنک سے ۹۰ ہزار روپیہ نسبتاً کم شرح سود پر قرض لیکر کام
شروع کیا تھا اور ۱۹۱۶ء تک اپنے تمام ممبروں کا مہاجنی قرضہ ادا کر دیا تھا یانتک
کہ اب سال گزشتہ کی روداد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۰ ہزار روپیہ اس کا ذاتی
سرمایہ ہے اور اب اس نے اپنی شرح سود گھٹا کر ۷½ فی صدی کر دی ہے۔

مہاجنوں کا جال

حقیقت میں پنجاب نہایت شاداب زرخیز خطہ اور زراعت کا گھر ہے یہی وجہ ہے
کہ کھتری سرمایہ داروں نے اس پر دربست قبضہ کر لیا تھا۔ قانون آراضیات کے
باوجود سودی قرضہ کا اس قدر گنجان جال پھیلایا تھا اور ان پڑھ کاشتکاروں اور زمینداروں
کو سود اور سود در سود کے پھیر میں اس طرح ڈالا تھا کہ سینکڑوں قدیم گھرانے تباہ ہو گئے
اکیلے پنجاب میں ہندوستان بھر سے تگنے سود خوار شب و روز بھیڑیوں کی طرح
خونخواری کرتے تھے۔ مگر کواپریٹو سوسائٹیوں نے دس بارہ برس میں ان کو بیکار کر دیا
اور اب سود خوار بنیوں کا زور خال خال علاقوں میں رہ گیا ہے۔

اصلی ریاضت

دنیاوی نقطہ نظر سے دیکھئے تو صاحب دل۔ ریاضت نفس۔ جاں کشی اور فقر و فاقہ
پر فخر کیا کرتے ہیں، ہمارے نزدیک کواپریٹو سوسائٹی کا ایک تجارکن ان سے بدرجہا
زیادہ قابل ستائش ہے اس لئے کہ وہ نہ صرف اپنی کشتی لیکر دریا سے نکل آتا ہے بلکہ
سینکڑوں ڈوبتے ہوؤں کو اپنے ساتھ بچالاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت اور تلخ حقیقت ہے
کہ ہم ہندوستانیوں میں خلوص اور ایثار کا جزو بہت کم باقی رہ گیا ہے شاید ہزاروں

ہماری نفسانیت
لاکھوں میں بہ مشکل چند افراد ایسے ملیں گے کہ اپنے وقت اور قوی کا کچھ حصہ سرمایہ
مشترکہ کی اصلاح و ترقی میں صرف کرنے کے عادی ہیں۔ حب قومی اور وطن
پرستی بالکل بے معنی یا زیادہ سے زیادہ اصطلاحی لفظ ہیں، ہم نے اب تک
اشتراک کا مفہوم ہی نہیں سمجھا۔ لفظ "اپنا" ہماری نگاہ میں اس قدر محدود
معنی رکھتا ہے کہ جسم پر سب سے نیچے کے سینہ بند کی محفوظ جیب یا گھر سے متصل
فولادی بکس کی اشیاء کے سوا کوئی شے لفظ اپنا کی حد میں داخل نہیں ہو سکتی
ایک دوسرے پر مطلقاً اعتماد نہیں جس کی ایک وجہ یہی ہے کہ سوء ظنی نے
دل و دماغ پر قبضہ کرلیا ہے مگر ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ کسی مشترکہ کام

ناکامی کے اسباب
کا نظام بنانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ قواعد و ضوابط ترتیب دینے اور قانون
وضع کرنے کی استعداد ہی ایک خاص جوہر ہے۔ رجسٹری کے دفتر میں جاکر
ان وثیقہ جات کو بالاستیعاب دیکھئے جو شراکت ناموں کی صورت میں
پیش ہوتے ہیں۔ ان کی تقریباً ہر ایک شرط میں بدظنی بے اعتمادی بھی
مضمر ہوتی ہے اور دوسری طرف اس مشترکہ کام کے اسباب زوال
بھی چھپے ہوئے ہوتے ہیں یہ زیادہ تر جہل عام اور بدعقلی کے نتائج ہیں۔ کام
کا ضابطہ حقیقت میں اس کام کی روز افزوں ترقی کا شاہراہ ہے۔ شرکاء
کے حقوق و فرائض کو نہایت دقیق النظری سے متعین کرنا اور زوال کے
اسباب کا انسداد وغیرہ ان وثیقوں میں مطلقاً نہیں ہوتا۔ ایک دوسری
شان یہ ہے کہ سرمایہ دار کا دخل مشترکہ کام کی کلیات و جزویات میں مطلقاً
نہیں ہوتا اُسے اپنا روپیہ اور زیادہ سے زیادہ نفع لینے سے بڑھکر کچھ زیادہ
واسطہ نہیں ہوتا ہے۔ اور ہر کارکن شرکا پر تمام کام کا بار بوجھ آپڑتا ہے
اور وہ نقصان سے بچنے کے لئے شروع ہی سے اپنی ہستی کو محفوظ کرنے کے

سعی کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہ کشمکش برس دو برس سے زیادہ نہیں چلتی اور
انفساخ شراکت کے مقدمے ہوا کرتے ہیں یہ حالت ان شراکتی کاموں کی ہے
جن میں شرکار محض انفرادی نفع ونقصان کے خیال سے شریک ہوتے ہیں
لیکن کوآپریٹو سوسائٹی جس میں منافع بطور سرمایہ مشترکہ ہمیشہ محفوظ رکھا جاتا ہے
وہ ہندوستانیوں کو مشکل سے موافق آسکتی ہے۔ پھر بھی اسباب چاہے کچھ ہی
ہوں مگر ہندوستانیوں کی حقیقی صلاح وتمدن کا آغاز اس وقت تک ناممکن ہے
جب تک ان میں باہم ملکر اخلاص وایثار کے ساتھ کام کرنے کی عادت نہ ہو۔
قارئین کرام میں سے اگر کسی کو خدمت قومی کا خیال ہو اور وہ ملک کے بد
نصیب کاشتکاروں کی اصلاح حال کرنا چاہئے تو ان کو دفتر کانفرنس سے بہت
مفصل نظام عمل اور سنین گزشتہ کے واقعات واعداد وشمار معلوم ہوسکتے ہیں
وما علینا الا البلاغ۔

صدیقی

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شایع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰×۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپے گا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف تین روپیہ مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھیجنا چاہیے اور منی آرڈر کوپن پر صاف طور پر سے اس کی تشریح کر دیجائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لئے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے۔ ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین پر بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شایع ہو سکتے ہیں، اجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ ہونا چاہیے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

سلسلہ جدید جلد ۲ — رجسٹرڈ نمبر اے ۱۲۸ — جولائی ۱۹۲۳ء
نمبر ۱ — ذالحجہ ۱۳۴۱ھ

کانفرنس گزٹ

یعنی

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

جس میں

مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصول تعلیم، نظام تعلیم مروّجہ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر
تنقید کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالی جناب نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام منشی عبد السلام

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

(اور صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ سے شائع ہوا)

فہرست مضامین

شذرات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایڈیٹر

اصل پیغامات شاہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۱ - ۳

تبصرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳ - ۴

"ملفوظات" کا جدید عنوان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴

ہندی لٹریری کانفرنس ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ - ۶

خیال آفرین قوت ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ - ۷

بچپن اور لڑکپن کی حد و تعریف ۔ ۔ ۔ ۷ - ۹

مقالات ۔ ۔ ۔ ۔

خرقۂ ہستی — حامد علی صدیقی ۔ ۱۰ - ۲۲

تربیت — جناب مرزا سلطان احمد صاحب ۔ ۲۳ - ۲۷

الحکمۃ الجوع (فلاسفی او ہنگری) — مولانا ابوالحسنات قریشی ۔ ۲۸ - ۳۲

تنقید و تبصرہ

نتائج امتحان اسکول لیونگ (صوبجات متحدہ) — حامد علی صدیقی ۔ ۔ ۳۳ - ۴۲

فن مناظرہ میں ایک ممتاز تصنیف — مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ۴۳ - ۴۵

ملفوظات

علم النفس کے چند مبادیات — حامد علی صدیقی ۴۶ - ۴۹

سادہ زندگی کا اخلاقی پہلو — مولوی طفیل احمد صاحب ۵۰ - ۵۱

متفرق

اصلاحی تجاویز — ایڈیٹر ۔ ۔ ۔ ۵۲ - ۵۵

روزنامہ "الامان دہلی" — مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ۵۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

پیغام شاہی گزشتہ ماہ کی اشاعت میں یہ خبر درج ہو چکی ہے کہ ۲۴ مئی کو برطانیہ کے تمام ابتدائی مدارس میں بچوں کو سربراہ سلطنت کی جانب سے ایک ہی وقت میں بذریعہ گراموفون پیغام سنایا گیا۔ اب اصل پیغام لفظ بہ لفظ ولایت سے موصول ہوا ہے محتشم الیہ کی جانب سے لڑکوں کو الگ اور محتشم الیہا کی طرف سے لڑکیوں کو الگ پیغام سنایا گیا۔ جو ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ملک معظم آج وہ دن ہے کہ ہماری رعایا تمام اکناف عالم میں اپنے اتحاد و یکجہتی کی خوشی منانے اور اپنے مشترکہ شیرازہ جمعیت کو زیادہ مضبوط کرنے میں باہم شریک ہیں۔ ہماری رعایا کے متعدد طبقوں میں سے گو ہر ایک کا طرز معاشرت جدا ہے اسی طرح فرائض و مشاغل زندگی بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن وہ سب ایک کنبے کے آدمیوں کے مانند ایک دوسرے کے شریک رنج و راحت ہیں۔ تم

پڑھ چکے ہو کہ گزشتہ زمانہ میں اس ایوان سلطنت کو قوم کے شجاع و دلیر۔ مدبر۔ دانشمند فرزانہ افراد نے کس طرح تعمیر کیا۔ آیندہ بھی افراد قوم ہی کے اخلاص اور ایثار و بے نفسی سے اس کی بنیادیں مستحکم ہونگی۔ یہ ایک عظیم الشان ورثہ ہے جو تمہارے آباو اجداد نے تمہیں ودیعت کیا ہے۔ اس کی بہبودی اور نیک نامی خدا کے فضل سے خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اس سلطنت کو اپنے سے غیر و بعید نہ سمجھو بلکہ تم میں سے ہر ایک اس کا ایک جزا اور منحصر علیہ ہے پس آج تم جو کچھ کروگے یا پڑھ لوگے اس سے فیصلہ ہو جائیگا کہ کل بڑے ہو کر تم اپنے فرائض کہانتک ادا کروگے۔

پڑھو۔ علم حاصل کرو۔ جسارت و مردانگی، عزت طلبی اور مہر و ملاطفت سیکھو۔ اور اپنے پیش رووں کو بھی یاد رکھو۔ اس تماشہ گاہ عالم میں ہمیشہ شریک عمل رہو۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تمہارے اندر وہ قابلیت پیدا ہو سکتی ہے کہ اس آزاد اقوام کی جمعیت مشترکہ کو مثل امانت کے اپنی اولاد اور اولاد در اولاد تک پہنچا دو۔ اس نیت سے کہ سلطنت عدل و انصاف۔ امن و صلح اور رضاجوئی حاصل کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ انہی صفات کی بدولت ابنائے جنس کی نگاہ میں عزت۔ قدر و منزلت حاصل کر سکتے ہیں۔

ملکہ معظمہ آج کا دن گزشتہ کی یاد اور آیندہ کی امید سے بھرا ہوا نیز نیک نہاد ملکہ وکٹوریہ کا یوم ولادت بھی ہے۔ اے ہمارے جگت کنبے کی بیٹیو! جس میں دنیا کی اکثر قومیں شامل ہیں۔ آج میں تمہیں یہ پیغام دیتی ہوں کہ تم ہمیشہ یہ سوچا کرو کہ تم اپنے گھروں کو شاد و آباد رکھنے میں کیا کر سکتی ہو۔ اور وہ کونسے طریقے ہیں جنکی مدد سے تم اپنے اخلاف کے لئے اپنے گھروں کو بہشت کا کونہ بنا سکتی ہو۔ ہماری وسیع مملکت میں قسم قسم کے گھرانے آباد ہیں اور طرح طرح کے رسوم مروج ہیں لیکن جو گھرانہ روشن دماغوں اور مہربان دلوں کا گہوارہ ہے وہی خدا کا گھر ہے۔ گھر کی حقیقی روح

یہی ہے اور یہی دنیا کی بہترین نعمت ہے۔ خواہ امیر گھر ہو یا غریب۔

تم مدرسہ میں بہت سی باتیں سیکھ سکتی ہو جو تمہیں برطانوی جمہوریت کی دانشمند اور مفید باشندہ بننے میں مدد دینگی۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ تمہارے اور عظیم الشان برطانوی عشیرہ کے تمام اراکین کے لئے اس سے بہتر کوئی علم و عمل نہیں کہ محبت۔ مہربانی۔ ایثار و بے نفسی کا سبق حاصل کرو۔ کیونکہ اندھیرے۔ اُجالے میں ہر جگہہ یہی زندگی کا حُسن اور یہی قوت ہے۔

تبصرہ ہم نے ترجمہ کرنے میں حتی الوسع قلم کو اصلی الفاظ کے ساتھ پا بہ زنجیر رکھا لیکن حقیقت کے چہرے کا عکس بھی نہیں دکھا سکے۔ اِسلئے صحت کے ساتھ کوئی تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ مگر مقابلہ کرنے سے ملکہ معظمہ کا پیغام ملک معظم سے بہت زیادہ پُراثر ہے الفاظ معنی سے بھرے ہوئے ہیں اور معنی میں جوش و ولولہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ بیان کی سطح معصوم بچّوں کی صوری کیفیات کی طرح بالکل ساکت اور سادہ ہے لیکن تہہ میں سرتاپا موتی مرصع ہیں آخری جملے جس میں محتشم الیہا نے زندگی کے حسن کی قوت اور قوت کے حسن کو الگ الگ کر کے پھر یکجا کیا ہے بیحد ذوق سے بھرے ہوئے ہیں حسن و قوت حیات و ہستی کی جان اور اُس علم کی مصطلحات ہیں جسے اہل مغرب فلسفۂ حیات سے اور علمائے مشرق فلسفہ کبریٰ یا علم ربانی سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کی تعلیمات کی رو سے ہر ایک شئے خواہ مرئی ہے یا غیر مرئی یہی دو خصوصیتیں رکھتی ہے اگر ان میں سے ہر ایک کی تفرید کریں تو حسن اپنی ایک قوت الگ رکھتا ہے اور قوت اپنا ایک حسن الگ رکھتی ہے۔ حسن کی قوت سطح پر عمل کرتی ہے۔ مگر قوت کا حسن باطنی کیفیات کو متاثر کرتا ہے۔ ہمارے اکثر صوفی منش شعراء نے اپنے اپنے کلام میں روحانی حُسن کی قوت کو محض قوت کے حسن سے الگ کر کے دکھایا ہے۔ یورپ ابھی اس مقام اعلیٰ تک نہیں پہونچا۔ پھر بھی اسے اپنے مستشرقین کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے

صاحبوں نے دماغ سوزی سے ان اعلیٰ اور برگزیدہ مفاہیم کو اپنے لٹریچر میں داخل کیا اور مہذب سوسائٹی میں حسن و قوت کا صحیح استعمال شروع ہونے لگا۔

بہرحال ملکہ معظمہ نے اپنے طبقہ اناث کو زندگی کے حقیقی فرائض و واجبات کی جانب جس طرح توجہ دلائی ہے اس کے لفظوں سے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ انگلستان کے بچو! تمہیں یہ پیغام مبارک ہو۔ خدا اس لئے، تمہاری نسل سے وہ انگریز پیدا ہوں جو دنیا میں عدل، نفاست اور حسن فطرت کو زندہ کریں۔ بنی آدم کی دلجوئی کو حقیقی فرائض میں شمار کریں۔ خدایا ملکہ معظمہ کی ملکوت پسندی کی نصیحتیں وہ ماں شاہی کے ارکین اور قوم کے اشخاص دونوں پر یکساں کارگر ہوں۔

بسا عشرت نازک اجاں دارد آرامے
بہ پژمردہ گل ہرگز آوازے نمی داند

ملفوظات

کئی مرتبہ اشارۃً بیان ہو چکا ہے کہ جدید تحقیقات سے فن تعلیم کے تمام مدارج خصوصاً ابتدائی میں کس قدر حیرت انگیز انقلاب برپا ہوا ہے۔ انگریزی محققین تو انیسویں صدی کے ربع آخر سے اس بزم میں آئے لیکن وسط یورپ میں سولھویں سترہویں صدی سے غلغلہ شروع ہو گیا تھا جرمنی۔ آسٹریا ہنگری اور سوئزرلینڈ اور فرانس نے جلیل القدر عالم پیدا کئے جن کے اقوال اور ملفوظات آج تک سنداً پیش کئے جاتے ہیں حقیقت میں علم النفس کا مواد انہی نامور افراد نے مہیا کیا اور اس شاخ علم کی تدوین انہی کی دماغ سوزی کی بدولت ہوئی۔ قارئین کرام کے لئے اب سے ہم ملفوظات کے نام سے ایک جدید عنوان اضافہ کرتے ہیں جس کے ذیل میں وقتاً فوقتاً ان علمائے مغرب کے چیدہ اقوال پیش کئے جائینگے۔ ہمیں امید واثق ہے کہ بچوں کے اتالیق اور معلمین ابتدائی مدارس کے اساتذہ اور بامذاق والدین و مربی اس ذخیرہ سے مستفید ہونگے۔ یہ علمائے مغرب تقریباً وہی ہیں جن کے مختصر حالات اور اصول تعلیم کانفرنس گزٹ ۱۹۱۸ء میں

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہ (پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کے قلم سے ناظرین کرام سے ان کا تعارف کرا چکے ہیں تاہم اس سلسلہ میں بعض کے ذات وصفات کے متعلق مختصر نوٹ جابجا دیے گئے ہیں۔

ہندی لٹریری کانفرنس

اس مقدس اور پرجوش جماعت کا سالانہ اجلاس سال رواں میں بمقام کانپور یکم اپریل تک منعقد ہوا بہت زور کی تجویزیں منظور ہوئیں۔ سب سے زیادہ اہم یہ تجویز تھی کہ کارکن مجلس کے اکابر کا ایک وفد ان دیسی ریاستوں میں بھیجا جائے جہاں ہندی زبان بولی جاتی ہے۔ یہاں استدعا کہ ہر ریاست میں اس قومی زبان کو عزت کا درجہ اور ہندی کانفرنس کو اس کی ربوبیت وسرپرستی کا حق دیا جائے۔ زبان خصائص قومی میں داخل ہے۔ کون روشن ضمیر ہے جو اس تجویز سے اختلاف کرے لیکن سوال یہ ہے کہ قومی زبان کہاں ہے اور کہاں ہندی زبان ہے زبان کے عموماً دو رخ ہوتے ہیں اپنے لفظ بولنا اور اپنے لفظ لکھنا غیریت کا کہیں دخل نہ ہو جیسے انگریزی، عربی، سنسکرت، ہندی زبان کو بولیئے تو وہ اردو بن جاتی ہے اگر لکھیں تو بغیر اس کے کہ ماہیت بدلے ناگری کے حروف میں چھپ جاتی ہے، حروف کی کشش اور عام وضع کا یہ حال ہے کہ مرہٹی الگ، تامل ٹیلیگو الگ ملیالم کناری الگ۔ بنگلہ الگ۔ سندھی الگ۔ مصرعہ

سر یکطرف تن یکطرف دل یکطرف جاں یکطرف

ناگری میں لکھا ہوا ایک صفحہ ہاتھ میں لیجئے اگر اس کے متن سے چند الفاظ پراکرت یا بھاشا کے اٹھا لیجئے اور مروجہ الفاظ مرادف داخل کر دیجئے تو وہ صفحہ ناگری حروف میں لکھا ہوا اردو کا بنجائیگا۔ اگر چند عربی۔ فارسی کے الفاظ داخل کیجئے گا تو اعلیٰ طبقہ کی اردو ہو جائیگی گو تلفظ غلط مخارج سے ادا ہوگا۔ ہم مخرج حروف میں کچھ تمیز نہ ہوگی پھر اگر ان تینوں سے ہر ایک کو اردو حروف میں لکھ دیجئے تو ہندی غائب۔ فارسی حاضر

غرض کہ ہمارے برادران گرامی قدر کی ہندی زبان کسی عیّار مداری کی جھولی کا بُتّا ہے ذری سی تغیر پر کچھ سے کچھ بن جاتا ہے اس سے تو ہزار درجہ بہتر یہ ہوتا کہ اس مقدس کانفرنس کا نام سنسکرت لٹریری کانفرنس ہوتا اور اُردو یا انگریزی یا عربی و فارسی لٹریچر سے بعض کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کرنے سے کوئی مترجم اپنا حق ادا کر سکتا، کیا یہ ترجمہ ہے کہ الف لیلہ کو ناگری حروف میں لکھکر اور فی صفحہ دس بارہ غیر مانوس الفاظ بدلکر داخل کردیں اور پھر بازار علم میں کسی اونچی جگہہ سے آواز لگائیں کہ چلو ہندی کے پڑھنے والو!

ذی اختیار ریاست بھی ایک جمہوریہ حکومت ہے۔ رئیس کو کیا حق ہے کہ اُردو بولنے مگر ناگری حروف لکھنے والوں کو خواہ مخواہ ہندی کا چیلا بنائے۔ البتہ یہ ایک رئیس کے لئے شاندار کام ہوگا کہ سنسکرت زبان کی تعلیم کو زیادہ وسیع اور مقبول بنائے اور سنسکرت یونیورسٹی یا کالج قائم کرکے خلوص نیتی سے علمی خدمات انجام دے۔ یہ سری مہاراج گائیکواڑ بڑودہ یا اعلیٰ حضرت شہریار دکن کا اصول ہے۔

خیال آفریں قوت

اگر ہماری یہ آرزو ہے کہ ہندوستان کا اصلی حُسن و شباب پلٹ آئے تو چاہیے کہ اس مغربی عروج و بلوغ کی حُسن آرائیوں کو تہ دل سے خیرباد کہیں۔ وجاہت پرستی اور محض مادی کامیابی جو چشم بصارت کو خیرہ کرتی ہے۔ قوموں کو کورباطن بنا کے چھوڑتی ہے۔ روح کی حسن و پاکیزگی اور نفس کی رفعت کو صدیوں کے لئے مُردہ کرڈالتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسانی قربانی کی بھینٹ لیکے پیچھا چھوڑتی ہے تو نازیبا نہیں۔ ملک اور قوم کے نوجوان تسلی رکھیں کہ ظاہری زیب و زینت اور لباسی آرایش کو ترک کرنے سے۔ عقول و ذہنیات میں ہرگز تنزل نہ ہوگا۔ ذہنیات کیا ہیں؟ عروس جذبات کا مشاطہ ہے۔ قلب اور دماغ میں مولیٰ اور بندہ یا مخدوم اور خادم کی نسبت ہے۔ ایک متبوع ہے اور دوسرا تابع۔ علوم و تہذیب کی ہر منزل میں دماغ کی

ترقی، قلب کے جذبات کے تابع ہے۔اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ علوم و فنون کی فضا میں تم جتنی چاہو بلند پروازی اور مرصع خیالی دکھاؤ سادہ زندگی کا اوس پر کچھ بھی اثر نہیں نہ یہ اسی طرح مزاحم ترقی ہے۔بلکہ لطف زندگی اسی میں ہے کہ

تصوّر عرش پر ہو اور سر ہو پائے ساقی میں

نظام معاشرت چاہے کیسا ہی سادہ ہو۔اگر اوس پر صحیح اور سچے جذبات کا تسلّط ہے۔تو وہ حجابات جو چشم بصیرت کی پرواز کو روکتے ہیں۔یک بیک اٹھ جاتے ہیں اور روح و نفس کو الائشات ظاہری سے پاک و صاف کرکے ہر چیز کی اصل و حقیقت کو آشکارا کر دیتے ہیں اُس زبردست قوت کا یہی مبدء ہے جسے القا اور خیال آفرینی سے موسوم کرتے ہیں۔ علوم و فنون۔فلسفہ اور طبعیات میں۔ہر قسم کی تحقیق و تدقیق اور ایجاد واختراع۔اسی قوت کے تابع ہیں۔

بچپن بچپن اور لڑکپن میں مستقل طور پر حد فاصل قائم کرنا بہت مشکل ہے پھر بھی جہاں تک تحقیق جدیدہ کا فیصلہ ہے۔عمر کا پہلا دَور جسے طور تمیز بھی کہتے ہیں ساتویں سال کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔اور دَور دوم یا طور تعقل آٹھویں برس سے شروع ہوتا ہے۔گویا اس وقت سے ان میں استدلال یا اسباب و نتائج کا سلسلہ ترتیب دینے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔مشرق و مغرب کے ماہران فن تعلیم متفق الرائے ہیں کہ دَور اوّل محض جسم کی پرورش اور دل و دماغ کی تربیت یا تربیت کے پیرائے میں تعلیم کے لئے مخصّص ہے سنجیدہ تعلیم دلانا۔یا باضابطہ مدرسے و مکتب میں داخل کرنا مضر ہی اس سے دل و دماغ قبل از وقت گرانبار ہو کر نشو و نما کی ترقی رک جاتی ہے۔حالانکہ جسمانی قوا کا عمر کے ہر ایک دَور یہاں تک آخر عمر میں بھی خاص لحاظ ہونا چاہیے البتہ مادری زبان سکھانے کا پورا موقعہ ہے۔اس کی تعلیم سیر و تماشہ اور کھیل کود کے دلکش پیرایوں میں بچے کو دَور اوّل ہی کے اندر ختم کر دینی چاہیے۔تاکہ قوت گویائی سے بچے

کو دل بستگی پیدا ہو جائے۔

اس مسئلہ پر "کانفرنس گزٹ" میں متعدد عنوانوں سے بحث کی گئی ہے اور آیندہ بھی کی جائیگی۔ بعض حکما کا خیال ہے کہ ارکان مذہبی کی تلقین کا وقت بھی بچپن ہی میں ہے لیکن توحید و رسالت کے مسائل نہیں بلکہ محض عام طہارت اور پاکیزگی کے اصول۔ اور اگر بسہولت ممکن ہو تو کلمے بعض آسان آیات یا سورتیں، دعائیں (یا اشلوک) حفظ کرا دیں اور ان کے موٹے موٹے مطالب سمجھا دیں۔ جس سے صرف اس قدر مقصود ہے کہ بچے کے دل و دماغ پر عقائد کی افشاچینی جائے نہ کہ مذہب کا پورا رنگ چڑھ جائے بس بچپن کا تقاضا اسی قدر ہے۔

لیکن اگر ساتویں سال مادری زبان کی حروف شناسی نقش و نگار، اور مصوری کے ساتھ دیگر سہل کہانی پڑھ لینے کی قابلیت پیدا کیجائے تو از یں چہ بہتر۔

لڑکپن عمر کا یہ دوسرا دور خاص اہمیت رکھتا ہے اگر ہمارا بس چلے تو مروجہ ابتدائی نصاب کو درہم برہم کر دیں۔ ریاضیات میں حساب کا اتنا علم کہ کارآمد ہو، جیومیٹری اور الجبرے کے چند ابتدائی قاعدے جن سے حساب میں مدد ملے۔ ذہنی حساب اور مساحت اور عملی جیومیٹری۔ نقشے اور تصویریں کھینچنا۔ یہ سب ابتدائی نصاب کے اجزائے ترکیبیہ ہیں اور انگریزی کی چند آسان پرائمروں کے ساتھ ملکر اپر پرائمری جماعت تک کے لئے کافی ہے۔ مگر نصاب مادری زبان میں ہونا چاہیے۔ غیر زبان دل و دماغ کو غلام بناتی ہے اور فطری حریت خیال کو پابہ زنجیر کرلیتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ۔ سب سے بڑا لحاظ جسمانی صحت کا ہے۔ تعلیم میں کوئی جز صحت اور نشوونمو کے مزاحم نہ ہو، یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ وجہ یہ کہ ۲۰ برس کی عمر تک جسم کی بالیدگی کا سلسلہ تیزی سے جاری رہتا ہے صرف آخری ۴ سال ۱۷ تا ۲۰ میں فطرت کی رفتار سست ہوتی ہے۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ فطرت کے احکام سے سرتابی نکریں

بلکہ انہیں بے روک نافذ ہونے دیں۔ یعنی ۹ سے ۱۶ برس تک لڑکوں کے دل و دماغ کو زیادہ گراں بار نہ کریں۔ بجائے اسکے جسم کی بالیدگی میں کھیل اور ورزش جسمانی کے ذریعہ سے مدد دیں، ۱۷ تا ۲۰ سال کی مدت میں اگر فطرت کی توجہ جسمانی نمو کی طرف سے کم ہو جاتی ہے تو اس کی بھی ایک معقول وجہ ہے غالباً یہ کہ اس زمانے میں مادہ تعقل اور قوائے دماغیہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر آخری چار سال میں لڑکے کے دل و دماغ پر نسبتاً زیادہ بار محنت پڑے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن ورزش اور جسمانی کھیل کو دیں برابر کا حصہ وقت صرف کرنا چاہیئے تاکہ تلافی مافات کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہے، اکیسویں سال کے بعد جسمانی نشو و نمو کا زیادہ لحاظ نہیں ہوتا۔ اب دماغی قوا ر اپنے کرشمے دکھانا شروع کرتے ہیں۔ علوم و فنون کے کسی شعبے میں مہارت، امامت، حاصل کرنے کا یہی زمانہ ہے بڑے بڑے عالم و علامہ۔ اسی حصے میں بنتے ہیں۔ اونیں حیرت انگیز نظریے اور فیصلہ کن سیکلیے قائم کرنے کی قابلیت اس وقت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک تاریخی شہادت ہے کہ ریاضیات اور علوم الطبعیہ کے اکثر محقق اور امام فن اسی حصہ عمر میں نکلے ہیں۔

مقالات

خرقۂ ہستی

(بچہ کی اصل حقیقت اور بچپن کے خواص وعوارض وغیرہ)

جب دنیا میں تہذیب و تمدن کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو اس کے ساتھ ایک غلام خانہ بھی خود بخود قائم ہو گیا جس میں ہزاروں لاکھوں اشراف مخلوق تشدد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دم توڑنے لگے۔ دنیا کا گوشہ گوشہ ظلمکدۂ مصر کا نمونہ تھا لاکھوں مجبور انسان بنی اسرائیل کی طرح ایک ایک فرعون کے شکنجۂ حکومت میں گرفتار تھے۔ ایوان کسریٰ سے لیکر ادنیٰ گھرانہ تک ہر مقام ایک زبردست کے پنجۂ استبداد میں آکر زیردستوں کے لئے غلام گردش بنگیا۔ اس سلسلہ میں مرد نے فطرت کے منشا کے خلاف عورت کو ضعیف الجثہ اور ناقص العقل فرض کرکے لونڈی بنا لیا حالانکہ فطرت اللہ نے دونوں کو ایک سا دل و دماغ بخش کر پہلے کو دوسرے پر صرف "الرجال قوامون علی النساء" کا خفیف حق دیا تھا۔ دوسری طرف بڑے نے بچہ کو بندۂ بے درم اور غلام حلقہ بگوش بنا لیا ابتدائی معاشرت کا قانون اپنے استحکام کے زعم باطل میں ہزارہا صدی تک یہ ناگوار منظر پیش کرتا رہا آخر کار غیرت حق کو حرکت ہوئی اور صدیوں بعد یہ نقشہ بدلنے لگا، ہر ایک دور اور ہر ایک زمانہ میں فرد فرید اُٹھ اُٹھکر تہذیب کے غلام خانہ کو خالی کرنے لگے، یہاں تک کہ صرف بچہ اس بند غلامی میں باقی رہ گیا، دنیا کی تاریخ تمدن و معاشرت کے ہزاروں صفحے اُلٹنے کے بعد قارئین کرام کو ہمارے اس دعوی کا ثبوت ملیگا۔ ہم اس مختصر ماہوار رسالے کے محدود صفحوں میں بجز اس کے کہ سمندر کو کوزہ میں بھر کر پیش کردیں اور کچھ نہیں کرسکتے۔

تہذیب کا آخری غلام

دنیا کی تاریخ التعلیم کا بالاستیعاب اور بلا تعصب مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ سترہویں، اٹھارویں صدی سے کچھ ایسے وحید العصر پیدا ہونے لگے کہ انہوں نے قبول عام اور ہر دلعزیزی کے رتبہ سے اُتر کر کمال خلوص نیتی سے بچہ کے حق میں جد و جہد شروع کی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس ننھی سی جان کو بھی عذاب الیم سے نجات ملنے لگی یہی وجہ ہے کہ حکما بچہ کو غلام خانہ تہذیب کا آخری حلقہ بگوش کہتے ہیں۔

اصلیت یہ ہے کہ بچہ بذات خود بھولا معصوم۔ بے خبر۔ احتیاج مند اور تحفظ خود اختیاری کے ذرائع سے قدرتاً محروم تھا۔ اس لئے فطرت نے اس کی حفاظت کے لیئے یکے بعد دیگرے دو نگہبان نازل کئے۔ اوّل رحم جس کا مبدء عام جذبہ محبت ہے اور دوسرا سائنس یعنی علوم طبعیہ۔

قدرت کے نگہبان

ظاہر ہے کہ بچہ ماں کی سنسان اور کالی راتوں کے صبح، باپ کے پہاڑ سے ذول کی پتہ مار محنت کا پھل۔ قوم کی امیدوں کا مرکز اور ایک عام صلہ رحم پیدا کیا گیا تھا۔ ہر ایک انسان کے دل میں بچہ کی محبت کو فطرت نے مصلحتاً ودیعت کیا تھا یہی وہ پہلا نگہبان فرشتہ تھا۔ عقل حیوانی بھی اس کی متابعت کرتی چلی آتی تھی جانور اپنے بچوں پر کس بے جگری سے جان فدا کرتے ہیں۔ لیکن انسان کی سوسائٹی نے اس فطری جذبہ کو کماحقہ تسلیم نہ کیا اور بچہ کو حقیر۔ ذلیل مخلوق سمجھکر اکثر حقوق زندگی سے محروم رکھا۔ یہاں تک کہ دوسرا نگہبان نازل کیا گیا یعنی سائنس جس نے فطرت کے گنجینہ اسرار سے نکلکر نہ صرف انسان کی جسمانی محنت کو مختصر کیا بلکہ ہر ایک مخلوق کو نظام تمدن و معاشرت میں موزوں درجہ دلانا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں بچہ کو بھی کچھ کچھ حریت اور رتبہ عالی نصیب ہوتا جاتا ہے۔

جیسا کہ التماس کیا گیا ہے اس دعوے کے ثبوت میں تاریخ عالم بے شمار شواہد پیش کرتی ہے۔ جن کا اجمالی تذکرہ بھی بے موقع ہے خلاصہ یہ ہے کہ دَورِ حریت سے

پہلے دنیا کے ہر حصے میں اس ضعیف اور بے بس کا مقابلہ ہمیشہ موت اور زحمت سے ہوا ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں بچہ کشی ایک مقبول رسم تھی اور کوئی آبادی و ویرانہ دنیا میں ایسا نہ تھا جہاں اس کے کمزور بازو محنت و مشقت کے پہاڑ ڈھانے پر مجبور نہ کئے جاتے ہوں جس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ مشرقی ممالک میں اب تک ایسے منحوس خطے موجود ہیں جہاں بچوں کے حقوق فطری بے رحمی سے پامال کئے جاتے ہیں۔

مغرب کا دامن اس ہیبت ناک جرم کے دھبوں سے شروع ہی سے آلودہ تھا حاملان شرح مسیحی نے بچہ کو کبھی صلہ رحم تسلیم نہیں کیا۔ آل عمران کی کتاب مقدس میں صاف حکم تھا کہ نافرمان بچہ کو سنگسار کر دو۔ شاید یہ کہا جائے کہ عہد عتیق کے بعض خاص جانگداز تاریخی سانحے بطور نظیر پیش نہیں ہو سکتے نہ ان کی بنا پر کوئی کلیہ یا فتویٰ عام قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ عہد جدید میں بھی یہ فتویٰ منسوخ نہ ہوا نہ اس میں کوئی نمایاں اصلاح ہوئی بلکہ یہ ظلم آفرینی بدستور جاری رہی۔ البتہ طفل تسلی کے طور پر بچوں کی نسبت کچھ شرعی احکام کسی قدر نرم ہو گئے لیکن حاملان شریعت نے بچے کے فطری حقوق کو بالاتفاق تسلیم نہیں کیا چنانچہ سینٹ آگسٹن کے عہد سے لیکر جاناتھن ایڈورڈ کے زمانہ
تک فقہائے نصرانیت کا پکا عقیدہ یہی رہا کہ بچہ ایک ذلیل اور ناپاک ہستی ہے۔ زمانہ مابعد عتیق کے فتوے
کے ائمۃ الشریعت نے یہاں تک کہ لوتھر جیسے روشن ضمیر مجدد اور اس کے تبع تابعین نے بھی اس فتوے میں اصلاح نہ کی اور پھر جب کونسل آف ریفارم (مجلس مجددین شریعت) اور کالون کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنے اپنے دور میں شرع مسیحی کے صدہا رخنے بند کئے لیکن اس حد شرعی کو برقرار رکھا۔ فرقہ پیورٹین اگرچہ زہد خشک اور عدل کامل میں خاص شہرت رکھتا تھا مگر اس عقیدہ کا حامی تھا کہ بچہ نجس و ناپاک اور مرکز انسانیت سے گرا ہوا ہے۔ الغرض یہ حکم اور اس کی اور بہت سی شاخیں جابرانہ رسوم کی صورت میں صدہا برس

بچے کے لئے فتوہ نجاست

عقائد میں داخل رہیں اور مغربی دنیا کو گمراہ کرتی رہیں۔ حاملان شرع نے انہیں اپنے زمانے کی صداقتوں میں داخل کرکے عوام الناس کو ان کی تعلیم پر مجبور کیا۔ ممکن ہے کہ بعض قدامت پرست ان تاریخی شواہد کو اس شان کے ساتھ تسلیم نہ کریں اور جواب میں کہیں کہ مسیحی محتسب بچے کو سنگساری کرنے اور نجس الاصل ماننے میں رواداری سے کام لیتے تھے لیکن اس سے جبر و تشدد کی نفی نہیں ہوتی۔ نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ فتوے برائے بیت تھے جن کی تعمیل کی نوبت نہیں پہنچی تھی۔ یہ کہنا محض ایک عذر لنگ ہوگا وجہ یہ کہ عمل کی بنیاد ہمیشہ علم پر اور ضابطہ کی بنیاد اصول پر ہوتی ہے اگر علم و اصول نہ ہوگا تو عمل و ضابطہ بھی نافذ نہ ہوگا۔ جب یہ ایک شرعی فتویٰ تھا تو بچہ حد شرعی سے کیونکر بچ سکتا تھا مثلاً حکم تھا کہ

عذر لنگ

"بچہ کی اصل در حقیقت اور خلقت سرتا پا نجس و ناپاک ہے"

"بچہ گناہ و جرم میں ڈوبا ہوا دنیا میں آتا ہے اور دوزخ کا کندہ ہے"

اگر اس اصول کی بنا پر مغربی سوسائٹی کے اکابر نے بچہ پر طرح طرح کے ظلم توڑے ہوں گھر سے لیکر مکتب تک اسکے لئے قیدخانہ بن گیا ہو تو کیا تعجب ہے۔ فرقہ پیوریٹین کو دیکھئے جو یہاں تک کور عقیدہ تھے کہ بچپن کی شوخیوں کو بھی معاف نہ کرتے تھے بلکہ ان کو بھی عمل الشیاطین کہکر ایک شدید جرم سمجھتے تھے اور بچوں کو سخت سزائیں دیتے تھے۔ خیر اس بحث کو تو نظر انداز کیجئے۔ اور زاویہ نظر بدلکر دیکھئے۔

معیار تہذیب

کسی متمدن قوم کا معیار تہذیب دریافت کرنے کے متعدد طریقے ہیں، کوئی کہتا ہے ان کا لٹریچر پڑھو، کوئی کہتا ہے نظام حکومت کا مطالعہ کرو۔ ہمارے نزدیک یہ دیکھنا چاہئے کہ اس قوم میں بچہ کا کیا رتبہ ہے اور سوسائٹی اس کی کہاں تک توقیر اور حق شناسی کرتی ہے اس سے بہتر اور سہل ترین طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس حیثیت سے دیکھیں تو دور جدید فی الحقیقت دور حریت ہے، تہذیب کے دو پرانے غلام حلقہ بگوش یعنی عورت اور بچے کو یکے بعد دیگرے اسی مبارک زمانہ میں مخلصی ملی اور وہ ہزاروں صدیوں کے غلام خانہ

تعلیم کی روشنی

بالکل خالی ہو گیا۔ اوّل جہالت کے بادل پھٹ کر تعلیم کی روشنی نمودار ہوئی اور پھر حریت کے آب نیساں نے حیات انسانی کے تمام شعبوں کی آبیاری کرکے دنیا کو بہشت بریں بنا دیا۔ اس جہاد میں بڑے بڑے نامور، مرد میدان، دنیا کے ہر ایک حصّہ سے اُٹھ اُٹھکر شریک ہوئے۔ فطرت کا گوشہ خاطر خود حریت کی جانب تھا اسلئے اُس نے ان سب کی مدد کی۔

لسان الغیب

سب سے اوّل جزیرہ نمائے عرب سے ایک لسان الغیب نے تنبیہ کی۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق۔ نحن نرزقھم وایاکم۔ ان قتلھم کان خطأً کبیرا۔	(ترجمہ) تم لوگ اپنے بچوں کو مفلسی (کم رزقی) سے ڈر کر نہ مار ڈالا کرو۔ رزق تو انہیں ہم ہو پہنچاتے ہیں (نہ کہ تم)، بلکہ تمہیں بھی ہم رزق دیتے ہیں (اور جبکہ تم سب ہمارے محتاج ہو تو انکی رزق رسانی کا تمہیں کیا فکر۔ ایسی حالت میں) ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے۔

اس حکم کو بار بار ضمناً دوہرایا گیا۔ مدنی العربی بارگاہ سے بھی متواتر تاکیدیں ہوئیں

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم توقیر کبیرنا۔	(ترجمہ) جو شخص چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا وہ ہماری جماعت (مسلمانوں) میں نہیں ہے۔

آواز بازگشت

فطرت کی آواز کسی محدود قطعہ زمین یا خاص گروہ انسانی میں گونج کر نہیں رہ جاتی بلکہ ایک آواز بازگشت ہے کہ اکناف عالم میں پہونچ کر پہاڑ کی سلوں سے لیکر انسانی دلوں تک پر صدیوں کے لئے منقش ہو جاتی ہے چنانچہ معصوم بچوں کی حمایت میں عرب کی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچی۔ ایک طرف دمشق و بغداد اور دوسری طرف قرطبہ اور اشبیلیہ کے درسگاہ صدیوں مغرب میں تبلیغ کرتے رہے یہاں وہ سرچشمۂ علوم تھے،

مشرقی تعلیم کا اثر

جنہوں نے پوپ جیرلڈ جیسے تلامیذ تیار کئے حقیقت میں یہ واقعات علم استشراق اور مستشرقین مغرب کی تاریخ سے متعلق ہیں جب کبھی اردو میں اس موضوع پر ضخیم جلدیں شائع ہونگی تو اس امر کا فیصلہ ہو جائیگا کہ لوتھر اور وکلف نے عقائد کی حریت کہاں سے سیکھی تھی۔ اور اس سلسلہ میں عام حریت پروری کی شاخیں کیونکر ہوئیں۔

اہل مغرب کی بدنیوی

لیکن اہل مغرب کو حاملان شریعت نے بیدار نہ ہونے دیا اور ازمنہ متوسطہ کے تقریباً تمامتر حصے میں عہد عتیق کے فتووں کی بنا پر بچہ اسی طرح حقیر و ذلیل۔ ناپاک نجس العین اور فطری حقوق سے قطعاً محروم رہا یہاں تک کہ دَور جدید کا آغاز ہوا۔ دوسری طرف اگرچہ تہذیب انسانی کی تقریباً تمام منازل میں اہل مشرق نے یورپ کو بیدار کیا مگر خود سو گئے۔ بچہ کی اصل حقیقت اور بچپن کے خواص و عوارض کے متعلق قرون وسطیٰ یا زمانہ مابعد میں مشرق سے کوئی مجدد یا محقق نہیں اٹھا اور نہ ان اصول پر جو قرآن کریم یا احادیث نبوی کے احکام میں مضمر تھے کوئی جداگانہ شاخ علم مدوّن ہوئی۔

اہل مشرق کی غفلت

مشرق کے اکثر ممالک میں بچے کے حقوق حیاتیہ آج تک اسی طرح پامال ہیں۔ موت سے بیشک نجات ملگئی مگر زحمت میں کمی نہیں ہوئی۔ البتہ اہل مغرب نے اٹھارہویں صدی کے قبل ہی بیدار ہوکر بڑے استقلال کے ساتھ تحقیق و تدقیق کے منازل طے کرنے شروع کر دیے اور گو اس جدوجہد کے ابتدائی مدارج میں مغرب کے محققین نے بچے اور بچپن کو ایک مستقل اور جداگانہ موضوع نہیں بنایا بلکہ علوم طبعیہ کے تحقیق عام کے سلسلہ میں اس مسئلہ کی تدقیق ضمیمہ کے طور پر ہوتی رہی مگر انیسویں صدی کے وسط سے بچے اور بچپن کے خصائص علوم جدیدہ کا ایک مستقل شعبہ قرار پا گیا جس پر آج تک ہزاروں کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں ان میں اکثر اس قدر بلند پایہ ہیں کہ ان سے بچپن کی دنیا کی تاریخ بدل گئی ہے۔

جذبہ رحم

بہرحال دَور جدید سے پہلے بچے کو جذبہ رحم کے سوا اور کہیں پناہ نہ ملتی تھی وجہ یہ کہ

مشرق میں تو تقریباً اب تک سناٹا ہے مغرب میں جب قدیم دورِ تہذیب کا خاتمہ ہوا تو اسکے ساتھ علوم کا پہلا دور بھی ختم ہو گیا اور وہ علمی تحقیقات کا سلسلہ جو پرانے اصول پر کم و بیش جاری تھا منقطع ہو کر تمام مجالس علمیہ درہم برہم ہو گئیں۔ خصوصاً اجسام کی تشریحات اور دل و دماغ کے افعال و اعمال کے متعلق کوئی جدید تحقیق نہیں ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ علم الحیات یا فلسفہ حیات کی تدوین کا عرصہ دراز تک کوئی سامان فراہم نہ ہوا۔ وہی جالینوس اور اور ارسطو کے کہنہ اصول صحیح یا غلط رہنمائی کرتے رہے یعنی عمل و مشاہدے کے بجاے تخیل اور عقیدہ امامت کرتے تھے۔ ہمارے موضوع پر اس کا یہ اثر ہوا کہ بچے کی ہستی اور بچپن کے خصائص اسی طرح رازِ سربستہ رہے نہ یہ معلوم ہوا کہ اس کی ذاتیات کیا ہیں اور کیا خواص و لوازم ہیں یہ دور آگے چلکر علوم جدیدہ کے ساتھ انیسویں صدی میں شروع ہوا اس میں بھی پوری آب و تاب ۱۸۵۹ء سے آئی جبکہ علامہ ڈارون نے ایک مبسوط کتاب "انواع مخلوقات کی اصلیت" کے نام سے لکھکر وہ حیرت انگیز اور معرکۃ الآرا مسائل پیش کئے کہ دنیا میں دھوم مچ گئی۔

دورِ اول کا اختتام

جالینوس اور ارسطو کے کلیے

ڈارون کا نظریہ

اس انقلاب انگیز دور سے قبل بعض حکما اور ماہران فن تعلیم نے رحم اور محبت کی بنا پر بچوں کی حمایت میں وقتاً فوقتاً آواز بلند کی مثلاً جان آمس کومینس آسٹریا ہنگری کا ممتاز ماہر فن تعلیم (۱۵۹۲ء سے ۱۶۷۰ء تک) فسطالوز سوئٹزرلینڈ (۱۷۴۶ء سے ۱۸۲۷ء تک) اور کارل فان رومر جرمنی (۱۷۸۳ء سے ۱۸۶۵ء تک) ان میں جو شہرت پسٹالوزی یا فسطالوز کو ہے وہ اور کسی کو حاصل نہیں۔

حکمائے مغرب کی ابتدائی سعی

اس کے بعد اگر بچوں کی حمایت میں کسی کے دل و دماغ نے کام کیا تو وہ ڈکنس تھا اس نے افسانے کے پیرایے میں بچوں کی زبوں حالت کا اس قدر دردناک خاکہ کھینچا ہے کہ پڑھ کر دل کانپ جاتا ہے۔ کہانیاں گو فرضی ہیں مگر بچے کی مجبور زندگی کے واقعات بالکل سچے ہیں۔ ان دونوں کے حالات مختصر طور پر بیان کرنا بے موقعہ نہ ہوگا۔

حکیم فسطالوزر

نام جان ہینری پسٹالوزی۔ اطالوی الاصل پیدائش ۱۷۴۶ء مولد زیورچ (سوئٹزرلینڈ) وفات ۱۸۲۷ء تصانیف (۱) لیونارڈ اینڈ جرٹرود ڈ ایک فرضی افسانہ (۲) ہرمٹس ایوننگ آورس یعنی ایک عزلت نشین کی شام غریباں (۳) ایجوکیشن اف پوئر کنٹری چلڈرین یعنی غریب دہقان زادوں کی تعلیم۔ انکے علاوہ متعدد رسالے اور مقالات ان سب میں بچوں کے تعلیمی جذبات کو فطری تقاضوں کے مطابق کر کے اس نظام تعلیم کا مواد پیش کیا گیا ہے جس پر آج تمام یورپ میں عمل درآمد ہو رہا ہے غریب زادوں کا فسطالوزبے انتہا حامی تھا اس کی حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ترسی اور ترحم کے جذبات کو خاص وجہ سے تحریک ہوئی۔

یتامیٰ سے بدسلوکی

اس زمانہ میں سوئٹزرلینڈ میں جابجا یتیم خانے تھے مگر عشرت پسند پادریوں کا ان پر قبضہ تھا جن میں نہ صرف یتیم بلکہ نادار مفلس اور لاوارث بچے بھی شامل تھے جن سے نہایت بے رحمی کے ساتھ کام لیا جاتا تھا یعنی گرد و نواح کے دیہات سے مستطیع کاشتکار و زمیندار دس پانچ بچوں کو یتیم خانہ سے جانوروں کی طرح مانگ لاتے تھے اور ان کو بہت تھوڑی خوراک دیکر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے زراعت کے کام پر لگاتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بدنصیب بچے اس زبوں حالت میں بڑے ہو کر نہایت بداخلاق خصوصاً لڑکیاں بد وضع ہو جاتی تھیں جن سے شہر اور قصبوں کے آدمی پناہ مانگتے تھے۔ اسی قسم کے اور حالات سے متاثر ہو کر فسطالوز نے اپنے سکونت کے مکان نیوہاف کو غریب اور یتیم بچوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا تھا اس بڑے حکیم کی سوانح عمری کے اکثر باب اور اس کی تصانیف کے اکثر حصے اس قابل ہیں کہ جن اصحاب کو بچہ کی تعلیم و تربیت سے مذاق ہے وہ کچھ تصرف کے بعد تراجم و اقتباسات اردو میں لیں۔ لیکن افسوس کہ ملک میں اب تک کسی جماعت نے اس اہم تعلیمی ضرورت کی طرف غلط انداز نظر سے بھی نہیں دیکھا۔

ڈکینز نام چارلس ڈکینز ولادت ۱۸۱۲ء وفات ۱۸۷۰ء انگلستان کا مشہور افسانہ نگار جس کا موضوع ہر ایک تصنیف اور طبعزاد میں مفلس۔ لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کی طرح یہ حسن و عشق کے مخرب اخلاق اور رذائم آموز قصے نہیں گڑھتا تھا اور نہ یہ مغرب میں دستور ہے بلکہ وہ سوسائٹی کا کمزور پہلو پیش نظر رکھکر اس کے تمام رُخ اور زبوں نتائج ایک طرف اور ان معائب کے متضاد (محاسن و خوبیاں) دوسری طرف رکھکر ترازو میں تولدیتے تھے لیکن انگلستان میں یہ جماعت اُنیسویں صدی کے ساتھ ختم ہوگئی آجکل کے افسانہ نگار ایک ٹڈی دل ہے جن کی تصانیف سے زباندانی کے سوا اور کوئی سبق نہیں ملتا۔ الا ماشاء اللہ۔

تصانیف ڈکینز کی تصانیف کا شمار میں آنا مشکل ہے۔ ان میں دو نہایت بلند پایہ ہیں یعنی ہوس ہولڈ ورڈس (ملفوظات خانہ داری) جو ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا اس میں کنڈرگارٹن کے طریقہ تعلیم کے نکات کو اس قابلیت سے حل کیا ہے کہ اگر باذاق والدین چاہیں تو سات برس کی عمر تک اپنے بچوں کے لئے اپنے گھر کو تربیت خانہ اور ابتدائی مکتب بنا سکتے ہیں۔ ہارڈ ٹائمز (روز بد) بلیک ہوس (افسردہ دل) وغیرہ تصانیف میں بچوں کے نفسیات پر نہایت قابلیت سے بحث ہے۔ حاملان شرع مسیحی کے فتووں کی بنا پر معصوم بچوں پر جو مصیبتیں نازل تھیں ان کا خاکہ کھینچنے میں اس سحر نگار نے وہ زور دکھایا ہے کہ پڑھکر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں بچوں پر ایک عذاب الیم نازل تھا۔ مرد کا جبر و استبداد اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ ادنیٰ خطا پر اپنی بیوی کی پیٹھ چابکوں سے کھال اڑا دیتا تھا۔ بلی جوتنے کے گھوڑے اور بچے میں مطلقاً تمیز نکرتا تھا یتیم فاتر العقل اور لاوارث بچوں کو بھیڑوں کے گلے کی طرح ایک کلبہ تنگ تاریک میں بند کر دیتے تھے۔ مکتبوں کے ملانوں کا یہ حال تھا کہ ان کی چیرہ دستی سے قصائی بھی پناہ مانگتے تھے۔ بد اخلاقیوں کی تشریح کرنے سے

قلم شرماتا ہے۔

نئے غلام خانے ایک اور بڑی مصیبت یہ نازل ہوئی کہ جرثقیل وغیرہ شاخہائے علوم کی ترقی سے مغربی ممالک کی صنعت وحرفت میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوا جس میں بچوں کے لئے وہ پرانا غلام خانہ بند ہوکے ایک نئی صورت میں کھل گیا۔ یعنی انگلستان کے حریص اور یہودی منش کارخانہ داروں نے بچپن اور لڑکپن دونوں کو غارت کرنا شروع کیا۔ ہزاروں لاکھوں بے پناہ لڑکے لڑکیاں ان کے پھندے میں گرفتار ہوکر سولہ سولہ گھنٹے مشینوں کے ساتھ محنت ومشقت کرتے تھے اور نہ صرف جسمانی نشوونما اور دماغی تربیت سے محروم رہتے تھے بلکہ (کونوقردۃ خاسئین) بندر کی صورت اور حیوانوں کی سیرت اختیار کر لیتے تھے۔

ہولناک سزا بقول سودی "قدیم قرطاجنہ (کارتیج) میں بعض سنگین مجرموں کو اس طرح سزائے موت دیجاتی تھی کہ پیتل کا ایک بڑا بھاری اور مہیب بت نصب تھا جس کے ایک بغل اور بازو میں شکنجہ بنا ہوا تھا مجرم کو بغل میں دباکر آہستہ آہستہ پیچ گھماتے تھے جس سے اس کے جسم کا تمام خون اور رطوبت نچڑتے نچڑتے اخیر پر ہڈیوں کا چورا رہ جاتا تھا۔ لیکن جب ہم بچوں کو صنعت کے کارخانوں اور آہنی پنجہ کلوں کی گرفت میں آکر نچڑتا ہوا دیکھتے ہیں تو قرطاجنہ کا بت رومیں تن بھی فراموش ہوجاتا ہے"!

اس قسم کے وحشت انگیز اور ہولناک نظارے دیکھکر اگر فسطالوزنے یورپ کے وسطا میں اور ڈیکنز نے شمال مغرب میں ایک بے پناہ مخلوق کی حمایت میں شور وغوغا مچایا ہو تو کیا تعجب ہے۔ اگرچہ محض ان کے شور سے بچوں کو کامل حریت نصیب نہیں ہوئی لیکن سائنس کی ان شعبوں کے دروازے ضرور کھل گئے جن میں بچے کی ہستی کے راز ہزارہا برس سے مخفی تھے۔ پھر بھی بچوں کو صلۂ رحم سمجھنا اہل مغرب کے مزاج کا ایک عنصر بن گیا ہے کسی بڑے شہر لیورپول۔ مانچسٹر۔ برلن کی ڈائرکٹری اٹھا کر دیکھئے اس میں

بیسیوں چھوٹی بڑی خیراتی انجمنیں درج ہونگی جن کے قواعد پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اب وہ بڑے جو کبھی بچوں کے حق میں ضحاک اور فرعون تھے آج وہ ایسے ہیں کہ جیسے کہ شمع کے گرد پروانے۔ اسی طرح بچوں پر ظلم و تشدد روکنے کے لئے مجلسیں بھی قائم ہوتی جاتی ہیں۔

سائنس کا دور

قارئین کرام یہ خیال نہ فرمائیں کہ بچے کو سوسائٹی میں محض جذبۂ رحم کی وجہ سے ایک دامن حمایت اور درجہ قبول نصیب ہوا بلکہ وہ علوم جدیدہ کا شرمندۂ احسان ہے۔ علوم الطبعیہ کی تقریباً ہر ایک شاخ کو مغرب کے علمائے محققین نے اس درجہ تک پہونچایا کہ ہستی کے راز کھل گئے انہی میں بچے کی اصل اور حقیقت کا راز بھی تھا۔

جیسا کہ اشارۃً ذکر ہو چکا ہے۔ قدیم دور تہذیب کے ساتھ اس کا سائنس بھی ختم ہو گیا اور پھر کئی صدی تک یہ سلسلہ ترقی مسدود رہا۔ خصوصاً اجسام اور نفسیات کے متعلق کسی نے ایک قدم بھی جدت کی طرف نہ بڑھایا۔ بچے کی ہستی کا علم بھی اسی زمرہ میں تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ حیات اور فلسفہ حیات بدستور سابق راز سربستہ رہا۔ قدیم اصولی فلسفہ کے مسائل کے سوا جن میں محض تخیل کی بنا پر مباحث قائم کئے گئے تھے۔ کوئی جدید تحقیق نہیں ہوئی۔ مشاہدہ یا تجربہ لفظ بے معنی تھا علمی معتقدات اور مظنونات پر دار مدار تھا بلکہ اگر سوء ادبی نہ سمجھی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشرق و مغرب دونوں خطوں کے علما راس کورانہ عقیدت میں مبتلا تھے کہ فطرت اللہ نے اپنے اسرار و رموز پر دیدہ و دانستہ ایک گہرا پردہ ڈالا ہے۔ پردہ دری کی جرأت کرنا کفر و زندقہ ہے۔

قدیم مسائل فلسفہ

قرون متوسطہ میں علم طب۔ خواص الاعضاء اور علم النفس کی نسبت جس قدر مسلمات قائم ہوئے اور جتنے کلیے اور اکثر یئے بنے یا جن اصول پر حیات انسانی کی یہ شاندار عمارات قائم ہوئیں۔ وہ اکثر اغلاط اور مفروضات

سے بھرے ہوئے تھے۔ شاذونادر کوئی مقدمہ یا امر مسلمہ ہوگا جو تجربہ سے حقیقت کے مطابق ثابت ہوا۔

سب سے زیادہ جالینوس اور ارسطو کے مسائل تھے جن کو سنداً پیش کیا جاتا تھا یعنی علوم الطبعیہ اور ما بعد الطبعیہ۔ نیز اجسام و نفسیات کے متعلق تمام مسائل۔ لیکن یہ بھی اسقدر قابل اعتماد نہ تھے کہ کورانہ عقیدت کے ساتھ تسلیم کر لئے جاتے۔ ہر ایک مسئلہ کے اصول کو مشاہدہ کے مطابق کرکے دیکھنا ضروری تھا۔ مثلاً ارسطو کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ روح تمام جسم میں بھری ہوئی ہے نظام عصبانی کی ماہیت اور مصرف کا روح کو کچھ علم نہیں دماغ کا بڑا منصب یہ ہے کہ جذبات کو جن کا مبدء قلب ہے بھڑکنے نہ دے، اور اگر بھڑکیں تو ان کو ٹھنڈا کرکے درجہ اعتدال پر لے آئے، گویا دماغ انجماد اور تبرید کا ایک آلہ تھا، جالینوس کا عقیدہ تھا کہ خون رگوں میں تموجی حرکت سے اوپر چڑھکر دماغ میں پہونچتا ہے اور یہاں تکمیل پاکر ارواح حیوانیہ میں بدل جاتا ہے۔ اور یہ ارواح اعصاب کے ذریعہ سے تمام جسم میں پھیلکر حرکت وغیرہ پیدا کرتی ہیں۔ کیفیات قلبی۔ جوش و جذبات، رحم و غضب کے متعلق بھی اسی قسم کے بے بنیاد عقیدے قائم تھے۔ چنانچہ رابرٹ برٹن (۱۵۷۷ء تا ۱۶۴۰ء اکسفورڈ) نے فلسفہ غم (انیوٹومی آف میلن کلی) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اسپرٹ یا روح۔ ایک نہایت لطیف بخار کا نام ہے جو خون سے پیدا ہوتا ہے۔ تمام جسم کا آلہ عمل یہی ہے۔ جگر محبت کا مبدء ہے۔ طحال عقل کا۔ دماغ ہر قمری مہینہ میں چاند کے ساتھ ترقی و تنزل کرتا رہتا ہے حس و حرکت کی قوتیں دماغ کے بطن اول میں مخفی ہیں اور قوائے متصورہ و فکریہ بطن سوم میں ہیں۔

علوم الطبعیہ

ظاہر ہے کہ فن طب کی بنیاد محض علوم طبعیہ پر ہے یہی حال فن تعلیم کا ہے دونوں خالص علمی شاخیں ہیں۔ جن میں مظنونات اور قیاسات کو مطلقاً دخل نہیں، اگر اس زمانہ میں طب کی کیا وقعت تھی۔ افسانے اور ناولیں پڑھنے سے اصلی

حال کھلتا ہے کہ داو درمن کو عموماً نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ خفظان صحت کے اصول داخل توہمات تھے۔ امراض کو ارواح خبیثہ کا عتاب سمجھکر ٹونوں اور ٹوٹکوں سے رفع کرتے تھے یا مریض کو دہکتے ہوئے لوہے کا داغ یا اور کوئی جسمانی عقوبت دیکرا چھا کرتے تھے۔ ہزاروں، لاکھوں مریض مرد عورت بچوں کو شیطان کا معمول تصور کر کے طرح طرح کی اذیتوں سے مار ڈالتے تھے، حالانکہ یہ دل و دماغ کے امراض میں مبتلا ہو کر مختل الحواس یا مجنوں ہوگئے تھے اور بس۔

کہنے کے لئے یہ سب علوم جدیدہ کی تاریخ کے واقعات یا زمانہ جاہلیت کی سرگزشت ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ سب خود فطرت ہی کے ہتکنڈے تھے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

قدرت کے لطائف الحیل ہزاروں صدیوں کے مخفی اسرار کو خود قدرت ہی کچھ زمانہ اور انسان سے چھپانا چاہتی تھی، ذی عقل انسان کو خود قدرت ہی بدعقل بنا دیتی تھی اور اس قسم کے لطائف الحیل سے بہکا کر وہ اسے اپنے رازہائے سربستہ کے گنجینہ تک نہیں پہونچنے دیتی تھی یہاں تک کہ دَور جدید شروع ہوا۔

اس سلسلہ میں بچے کی اصل حقیقت اس کے جسم اور نفس کے خواص و عوارض پر بھی گہرا پردہ پڑا رہا۔ مبادیات پر بھی کسی صاحب بصیرت اور محقق کی نظر نہ پڑی اور اگر ایک طبقہ نے نظر ڈالی تو برعکس نتائج پیدا کئے یعنی حاملان شرع مسیحی نے ایک پاک اور عزیز الوجود ہستی کو نجس العین اور حقیر و ذلیل قرار دیا۔ حقیقت حال نہ کسی نے معلوم کی اور نہ اس طرف کسی کو توجہ ہوئی۔ کسی عالم و علامہ نے مشاہدات اور عملیات کی بنا پر اتنی تحقیق بھی نہ کی کہ بچہ کی کمر میں کتنی پسلیاں ہیں اور منہ میں کے دانت ہیں۔

(باقی آیندہ)

تربیت

تعلیم اگرچہ ماں کی گود ہی سے شروع ہو کر مدرسوں اور کالجوں میں تکمیل کو پہونچتی ہے لیکن تربیت ماں کی گود میں شروع ہو کر گھر کی چار دیواری میں اور اپنے ارد گرد کے ماحول میں ہی ختم ہو جاتی ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ ہی تربیت جاری رہتی ہے مگر تربیت اور تعلیم کے طریقے اور نتیجے میں گونہ فرق ہے تعلیم انسان کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے مگر تربیت انسان کو انسان بناتی ہے، تعلیم اور تعلیمی ہدایات انسان کو چند مختلف راہوں اور مرحلوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ لیکن تربیت اور تربیت کے قوانین اور مراحل انسان کو ان مختلف راستوں پر خوبصورتی سے چلاتے ہیں جن پر چلنے سے انسان انسانیت کی عملی ضروریات سے واقفیت پیدا کرتا ہے۔

ایک تربیت یافتہ انسان بہ مقابلہ ایک تعلیم یافتہ انسان کے زیادہ تر سمجھدار اور فہیم ہوتا ہے تربیت انسان کو باضابطہ انسان اور مکمل ہستی بناتی ہے تعلیم یافتہ انسان اگر تربیت یافتہ نہ ہو تو تعلیم ادھوری اور ناقص رہتی ہے لیکن ایک تربیت یافتہ انسان باوجود ادھوری تعلیم کے بھی مکمل ہوتا یا خود کو مکمل اور ایک باضابطہ انسان ثابت کر سکتا ہے، تعلیم اگرچہ چند قوانین کے تحت دی جاتی ہے تو تربیت اُن مختلف قوانین کے تحت عمل کرتی ہے جن کو فطرت نے وضع کیا ہے۔

فرق ایک تعلیم یافتہ طالب علم اور ایک تربیت یافتہ انسان کی روش اور طریق عمل میں فرق کرنا کچھ مشکل نہیں ہے، تعلیم یافتہ انسان یہ تو بتلا سکتا ہے کہ معلومات کی مقدار اور کیفیت ایسی اور ایسی ہے لیکن خلاف اس کے ایک تربیت یافتہ انسان عملی پہلو سے بھی ہمیں نشان دے سکتا ہے کہ یوں اور یوں ہو سکتا ہے یا یوں اور یوں کرنا چاہئے تعلیم ہمیں صرف یہ بتلاتی ہے کہ ہمارے ارد گرد جو کچھ پایا جاتا ہے وہ ایسا اور ایسا ہے، لیکن

تربیت اور تربیت کے قوانین یہ بتاتے ہیں کہ ایسی سب معلومات کو یوں اور یوں عمل میں لایا جا سکتا ہے تعلیم صرف سکھاتی اور دکھاتی ہے اور تربیت کر کے ہی دکھاتی ہے تعلیم اپنے قوانین کے ماتحت ضروریات اور معلومات کا نشان دیتی ہے اور تربیت ان ضروریات اور معلومات کی بابت دعوت عمل دیکر انسان کو آمادہ کرتی ہے، ایک تعلیم یافتہ انسان جو مواد تربیت سے خالی ہے محض تعلیم یافتہ اور چند اعداد کو جاننے والا ہے لیکن ایک تربیت یافتہ انسان باوجود کمی اور نقص تعلیم کے ہی تعلیم یافتہ کے مقابلہ پر نمایاں عمل کے پیرایہ میں خود کو پیش کر سکتا ہے، جو شخص صرف یہ جانتا ہے بندوق ایسی اور ایسی ہوتی ہے اس میں فلاں فلاں پرزہ ہوتا ہے اور وہ یوں چلتی ہے یا یوں چلائی جاتی ہے اور اس کی مار اتنی ہوتی ہے لیکن چلانا نہیں جانتا محض چند معلومات ہی بندوق کے بارہ میں رکھتا ہے لیکن ایک تربیت یافتہ چلا کر ہی دکھاتا ہے ان دونوں حالتوں میں جو کچھ فرق ہے وہ بھی ظاہر ہے۔

زیادہ تر ضرورت کس کی ہے

انسان کو ہر رنگ میں تعلیم کی بھی ضرورت ہے کیونکہ جب تک انسان کی معلومات میں اضافہ نہ ہو تب تک وہ زندگی کے کاروبار اور ضروریات میں پورا نہیں اتر سکتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی جب تک وہ ایک حد تک عملی پہلو بھی نہ رکھتا ہو اور پورا انسان ہی تعلیم کی ضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور یہ بھی کہ تعلیم بھی ایسی ہو جو ہر رنگ میں ضروریات انسانی زندگی کی ایک اچھی حد تک کفیل بھی ہو سکے، تعلیم خواہ وہ کسی رنگ کی ہو اس وقت تک عموماً مفید نہیں ہو سکتی جب تک تربیت کا پہلو نہ رکھتی ہو چونکہ عموماً بعض قوموں میں والدین اور دیگر مربی ضروریات تربیت سے ناواقف ہوتے ہیں اس واسطے بعض اوقات تعلیم چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی۔

اسکول سے نکل کر خضر راہ تربیت ہی ہو سکتی ہے، اگر رہنما ہی رہنمائی نہ کرے

تو محض سادی تعلیم زیادہ سود مند نہیں ہو سکتی یہ جدا بات ہے کہ رفتہ رفتہ انسان اسکول سے نکل کر اپنے اردگرد کے حالات دیکھ دا کھ کر چند مراحل تربیت سے واقفیت پیدا کر کے ان سے کام لینے کے قابل ہو جائے۔

یورپ اور انگلستان میں

جب لڑکے اور لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں تو چونکہ ان کی شروع ہی سے تربیت اچھی ہوتی ہے اسواسطے مزید معلومات ساتھ لیکر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ان کی عملی زندگی کا آغاز کیسا ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ملک میں اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہی ایک قسم کی مایوسی لاحق ہو جاتی ہے معدودے چند پیش پا اُفتادہ راہوں تک نہیں پہونچ سکتے اور سرگردان رہتے ہیں، یہ نقص اس لئے سدراہ ہوتا ہے کہ تربیتی ضروریات سے واقفیت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک ہندو طالب علم چونکہ ہر وقت اپنے کنبے اور اپنے گھر میں تربیتی پہلو سے دیکھتا اور سنتا ہے کہ کفایت شعاری کی ضرورت اس واسطے ہے اور یوں روزمرّہ حساب کتاب اور برآمد و درآمد رکھی جاتی ہے اس واسطے وہ بمقابلہ اس مسلمان طالب علم کے جو اپنے گھر اور کنبہ میں شاذونادر ہی اس قسم کی باتیں سنتا ہے زیادہ تر ہوشیار ہوگا اور یہ کہا جائیگا کہ اسکی مشعل راہ وہی تربیت تھی جو ہر روز اور ہر گھڑی اس کے گھر اور کنبے میں جاری اور ساری تھی۔

سلیقہ مند ماں

اپنے لڑکوں کو اسکول کے جانے سے پہلے وقت پر بستر خواب سے اوٹھاتی، نہلاتی اور نہلا دُہلا کر کپڑے پہناتی اور ایک سلیقہ کے ساتھ اسکول میں بھیجتی ہے، یہ بہ نسبت اس لڑکے کے زیادہ تر تربیت یافتہ ثابت ہوگا جسکی ماں کوئی بھی تردد اور فکر نہیں کرتی، خود لڑکا ہی اپنی طبیعت سے کام لیکر تیاری کرتا ہے پہلی کیفیت ہمیں اچھی طرح بتا دیگی، کہ تربیت اور نا تربیتی میں کیا فرق ہے، پہلا لڑکا انضباط سے چلکر کام کرتا اور تعلیم پاتا ہے اور دوسرا لڑکا اندھا دُھند چل رہا ہے۔

آغاز تربیت لڑکپن اور طفولیت ہی سے ہوتا ہے، بعض والدین کا عقیدہ ہے کہ خود بخود ہوش سنبھال کر اولاد تربیت پالیگی، یہ خام خیالی اولاد کو فی صدی ۹۵ نالائق اور ناتربیت یافتہ رکھتی ہے، ٹہنی جب پرورش پا چکی ہو تو اس کی لچک ماری جاتی ہے، جس صورت میں اس کو بڑہنا ہوتا ہے بڑھ چکتی ہے پھر اس کا مڑنا مشکل ہو جاتا ہے بیشک گھر کی چاردیواری سے باہر نکل کر بھی تربیت کے سامان میسر آتے یا کر سکتے ہیں اور اسکولوں میں بھی کچھ نہ کچھ ان کا تہیہ ہو سکتا ہے، لیکن شروع کی تربیت پھر بھی لازمی ہے۔

مدرسہ کی مشکلات اسکولوں میں اگر قابل اور فرزانہ اساتذہ چاہیں تو سلسلہ تعلیم میں ہی بہت کچھ یا کسی حد تک تربیت اور سلیقہ مندی کی تعلیم دے سکتے ہیں مگر موجودہ نصاب تعلیم اس قدر ٹیڑھا واقعہ ہوا ہے کہ نہ تو اس کے بوجھ میں دب کر خود لڑکے ہی تربیت پا سکتے ہیں اور نہ اساتذہ ہی اس کا تہیہ کر سکتے ہیں نصاب موجودہ میں نمائش اور بھڑک تو بہت کچھ ہے مگر چند عناصر کی بھرتی تقریباً اساتذہ اور خود طلاب دونوں کو قدم قدم پر مشکلات میں ڈالتی ہے، بعض مضامین امتحان تقریباً زائد ہیں پھر ان میں سے کسی ایک میں بھی فیل ہوں تو نئے سرے سے سب مضامین میں بار بار امتحان دینا پڑتا ہے، یہ وہ طریق عمل ہے جس کی عدم افادت اور دشواری مخفی نہیں ہے، مضامین اس قدر رکھے گئے ہیں کہ عموماً رٹ کر ہی پورے ہو سکتے ہیں، کاروباری زندگی کے انصرام کے واسطے بیشک مفید مضامین کا رکھنا ضروری ہے، لیکن اگر کوئی کمیشن تحقیقات مقرر کرکے یہ رائے لی جائے کہ اس بھرتی میں سے کس قدر مضامین واجبی ہیں تو فیصلہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت الامر کیا ہے۔

اخلاقی سبق بیشک اسکولوں اور کالجوں میں کسی نہ کسی حد تک اخلاقی تعلیم بھی ہوتی ہے اور یہی ایک قسم کی تربیت ہے، لیکن میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں

کہ باوجود اس کے کہ اخلاق میں بھی تربیت ہی کا مواد بھرا ہوتا ہے پھر بھی اسے محض ایک تعلیمی رنگ میں پڑھاتے ہیں، کیا خاص طور پر یہ تجربہ کیا جاتا ہے کہ تربیتی نقطۂ نظر سے طلبہ کہاں تک ان پر عامل ہوتے ہیں، کیا یہ بھی کبھی دیکھا جاتا ہے کہ عملی پہلو سے لڑکے ان کا لحاظ رکھتے ہیں یا دن رات مضامین امتحان کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں، اور اخلاقی اسباق پر عمل کرنے کی فرصت ہی نہیں رکھتے۔ ڈرائنگ ماسٹر سامان نقشہ نویسی تو میز پر رکھکر لڑکوں کو نشان دیدیتا ہے کہ یہ پرزے نقشہ نویسی کے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتا کہ بالعمل نقشہ نویسی کیا چیز ہے، جب تک ڈرائنگ ماسٹر خود کرکے نہیں دکھائیگا اور نقص نہیں نکالیگا، تب تک طالب علم کیونکر عملاً واقفیت پیدا کر سکتے ہیں اخلاق ناصری یا اور کسی اخلاقی کتاب کے صرف چند احکام ازبر کرا دینے سے عملی تربیت میسر نہیں آسکتی۔ جب تک دونوں حلقوں یعنی گھر اور اسکول دونوں جگہہ اچھی تربیت کا باب نہ کھلا ہو تب تک تعلیم صحیح پہلو سے مفید اور کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی اس کے کہ ہم بلاشک امتحانات میں سرخرو ہوں اور اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کرکے خوش بھی ہوں اور اساتذہ اور والدین کے فخر ہوں ہمیں تربیتی مراحل سے بھی گزرنے کی تمنا ہونی چاہیئے، کیونکہ اس کشتی میں بیٹھکر علم و عمل حاصل ہوسکتے ہیں اور انہی کی مدد سے ہی ساحل مقصود پر پہونچ سکتے ہیں۔ تعلیم محض ایک راہ ہے اور تربیت راہ پر چلنا اور خوبی کے ساتھ منزل کا طے کرنا۔

اے باستدلال بستہ ماندم از مقصود دور
نزدباں کردم تصوّر راہ ناہموار را

سلطان احمد

مقالات

الحکمۃ الجوع

(فلاسفی اور ہنگر)

کچھ عرصہ سے ملک میں خصوصاً تعلیمی حلقوں میں ہر طرف ایک شور برپا ہے کہ کسی طرح تن پیٹ کی ضرورتوں کو پورا کیا جاوے۔ مرض افلاس کی شدت ہے۔ فاقہ کشی کو روزبروز ترقی ہے کہ کروڑوں بندگان خدارات کو بھوکے سوتے ہیں۔ حزب العمال یا محنت کش جماعت۔ تن دہی اور جانفشانی سے عاری و معذور نہیں، مگر ملک میں مشاغل کی قلت ہی کسب معاش کے جو کچھ ذرائع موجود ہیں، وہ حوائج روزمرہ کے مطابق بار آور نہیں ادہر روپیہ کی قیمت اس قدر گرگئی ہے کہ چار آنہ بھی نہیں رہی۔ افلاس کا بڑا زور متوسط طبقے پر ہے، ادنی درجہ کے محنت کش اور مزدور زیادہ انگھر ہونے کی وجہ سے ہر چھوٹے موٹے کام میں ہاتھ ڈالکر آڑے ترچھے بسراوقات کر لیتے ہیں، امرار کی مالی پشت اس قدر مضبوط ہے کہ اس عام قلت اور گرانی کے بارگراں سے لچک ہی نہیں سکتی۔ انہیں اس سے محض خیالی تکلیف ہے۔ درحقیقت یہی متوسط یا اجلا پوش طبقہ "کفاف اندک وعیال بسیار" کا مصداق ہے کہ پس پسکر اپنی ہستی کو فنا کر رہا ہے۔ معاشرت ملی اور حیات منزلی کا نظام منقلب ہونے کو ہے زیادہ دن نہ گذرینگے کہ ادنے طبقے سے افراد کثیرہ بلند ہو کر متوسط کی جگہوں پر قبضہ کرلینگے اور اگرچہ اس قسم کے تغیرات متمدن ممالک کی سوسائٹیوں میں ہمیشہ برپا رہتے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ فطری اسباب اور فطری قانون ارتقا کی بنا پر رفتہ رفتہ ہوتے ہیں، ہندوستان میں یہ قبل از وقت اور اسباب مفاجاتیہ کی بنا پر ہیں جس سے ملک میں بدامنی کا اندیشہ ہے۔

تعلیم اگر حسب حال ہو اور معقول نظام رکھتی ہو تو بلا شک قوم و ملک کے ہر مرض کی دوا ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی تشخیص ہوئی اور نسخہ میں ٹیکنیکل تعلیم کا جزا اضافہ کیا گیا۔ جیسا کہ قارئین کرام کو خود معلوم ہے۔ قوم کی دولت کا مفہوم دنیا کے ہر حصے میں خواہ کم متمدن۔ آباد اور پر رونق ہو یا زیادہ ہو۔ محض ایک نتیجہ ہے جو ہمیشہ دو اور صرف دو سببوں کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ فطرت اللہ نے ایک سبب غیر ذی روح مخلوقات کو ودیعت کیا ہے اور دوسرا ذی روح کو۔ یعنی اپنی دولت کے لاتعداد خزانے۔ زمین کے سپرد کر کے اس حکمت سے مٹی میں ملائے ہیں کہ چشم بصارت یا بصیرت سے چھپے ہوئے ہی نہیں اور آشکارا بھی نہیں۔ کچھ دولت سطح پر خاک میں ملی ہوئی۔ کچھ ایک یا دو بالشت ہاتھ یا گز پر اور کچھ بہت نیچے مٹی یا پانی کی تہہ میں بکری پڑی ہے۔ ایک سبب تو یہ ہے، جسے پیداوار اراضی کہتے ہیں اور جس میں آزوقہ اور اشیائے استعمالی دونوں شامل ہیں، آسمان اور ہوا کی بخشائشیں بھی براہ راست زمین ہی کے لئے نازل ہوتی ہیں اور زمین کی دولت کا جز ہیں، دوسرا سبب کسب و محنت کی قابلیت ہے جو ذی روح کے سپرد کی گئی ہے۔ جن ملکوں میں حسن اتفاق سے یہ دونوں اسباب باہم ملکر فعل و انفعال کی حد تک پہونچ جاتے ہیں وہ ملک دولتمند منعم ہو جاتے ہیں۔ اگر حکومت بھی سلیقہ مند اور فرزانہ ہے تو اس دولت کو سوسائٹی کے تمام مدارج میں علی قدر حاجات تقسیم کر کے ملک کو بہشت بریں بنا دیتی ہے ورنہ قوم کا ایک طبقہ طرح طرح کی حکمت عملیوں سے حزب العمال کے حقوق و ثمرات محنت کے بیشتر حصے کو غصب کر کے امرائے قوم بن بیٹھا ہے۔ اور فرانس جیسے انقلاب عظیم کا بیج بوتا رہتا ہے۔

اب قوم کی دولت کی دو قسمیں ہیں۔ زراعتی اور صنعتی۔ کسی ملک کو قسم اول میں زیادہ حصہ ملا ہے۔ اور کسی کو قسم دوم میں۔ خال خال ایسے ملک ہیں کہ دونوں میں خوش قسمت ہیں مثلاً۔ امریکہ۔ ہندوستان، کہ زمین میں دونوں قسم کا مال و دولت پیدا کرنے کی

سعداد اور افراد کثیرہ میں جسمانی اور دماغی محنت کی قابلیت موجود ہے۔ فرق یہ ہے
کہ ہندوستان کے اعضا و جوارح بوجوہ چند در چند مفلوج ہیں۔ مگر امریکہ کے نہیں ہیں
زراعت اور صنعت کی کمی بیشی کے پورا کرنے کے لئے ایک خاص قانون مبادلہ جاری
و ساری ہے جس کا ذریعہ عام تجارت ہے یعنی جن ممالک میں خوردنی اشیا کی کافی پیداوار
یا مصنوعات کے لئے خام، مال مسالا کافی نہیں وہ ان ملکوں سے لیتے ہیں جہاں یہ سب
کچھ ہے مگر صنعت و دستکاری کے ذرایع نہیں لیکن خوش نصیب وہی ملک ہیں جہاں خوردنی
اور استعمالی اشیا کی پیداوار بھی باشندوں کی ضرورت کے مطابق ہے۔ اور باشندوں میں
صنعت و حرفت کی لیاقت بھی ہے وہ کسی غیر ملک و قوم کے محتاج نہیں ہیں۔ ہندوستان
میں یہ قابلیت درجۂ ادنےٰ موجود ہے مگر بیدار نہیں، کئی صدی سے گہری نیند سو رہے
ہیں، اسی بخت خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے ٹیکنیکل تعلیم کا صور پھونکا جا رہا ہے۔

عقیدہ یہ ہے کہ ٹیکنیکل تعلیم علی اصول کے لحاظ سے فلاحت، زراعت، صنعت و
دستکاری، تجارت، غرض تمام پیشوں پر حاوی ہوگی، اور اس کے گریجویٹ ہندوستان
کی موجودہ صنعت و حرفت میں کایا پلٹ کر دینگے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو۔ سارا دارمدار
نصاب کی ترتیب اور تعلیم کے نظام پر ہے ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جسمانی محنت کی تربیت
کرنا تعلیم کا جزو اعظم ہے جس کی بدولت صنعت و حرفت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس کا اصلی
مقصد یہ ہے کہ قوم و ملک میں جو بیکاری اور بے شغلی کو روز افزوں ترقی ہے یہ مسدود
ہو جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ مغربی اصول و ضوابط پر کاربند ہو کر ٹیکنیکل تعلیم دینے سے بجائے
فائدے کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے گریجویٹ اس شہ زور
انجن یا موٹر پر سوار ہو کر محض اسی کی بانکی چال اور تیز رفتاری کے خیال میں اس قدر ڈوب
جائیں کہ وہ پرانی وضع کی بیل گاڑیاں اور بارکش جو قدیم سے صنعت و حرفت کی شاہ راہ
پر بے ڈھنگی چال اور تھکے ہوے قدموں کے ساتھ چلی آرہی ہیں ان کی جھپٹ میں آجائیں

یہ کوٹیج انڈسٹری ہے یعنی وہ بڑا ای وضع کے دستکار جو پھونس کے جھونپڑوں اور کچی کوٹھریوں میں بیٹھکر دیسی صنعت کی آبرو تھامے ہوئے ہیں۔ مغربی وضع کے کالج سے ضرور مغربی اصول صنعت سیکھکر ہمارے علیا ر بڑے بڑے قاروں صنعت سرمایہ داروں کی جستجو کرینگے، نیز عملیات میں مشق حاصل کرنے کے لئے انہیں مغربی صنعت گھروں کی تلاش ہوگی۔ بہرصورت آخرالذکر طبقہ کی غلامی ضرور کرنی پڑے گی۔ اور وہ اپنے ملک کی کوٹیج انڈسٹری کو بالکل بھول جائینگے بلکہ ہمیں تو یہاں تک بدگمانی ہے کہ دونوں باتیں حاصل ہونے پر بھی وہ اپنی علمی قابلیت دکھانے کے لئے ممالک غیر کی جماعتوں میں شریک ہو کر دیسی صناعوں کے مقابلہ پر کام کرینگے۔

واضح ہو کہ مغرب میں ٹیکنیکل کی شاخ علم اب انیسویں صدی کے اخیر میں آکر مدون ہوئی ہے۔ وہاں بھی کوٹیج انڈسٹری سے آغاز ہوا بلکہ انہی جھونپڑی نشین کاریگروں نے تدوین کیلئے مواد جمع کیا۔ زبان پہلے بن جاتی ہے اور قواعد صرف و نحو بعد میں مدون ہوتے ہیں اسی طرح صنعت و حرفت کے عملیات مقدم ہیں اور علمی اصول موخر۔ علاوہ ازیں مغرب کا نظام تعلیم اور ترتیب نصاب۔ مغرب کے مالی و ملکی خصوصیات پر مدون ہوا ہے انکے پیراہن کی قطع انکے جسم پر ہے اس صورت میں بھی ہندوستان کی کوٹیج انڈسٹری سے آغاز کار کرنا قرین مصلحت ہے۔ ہمیں یہ بھی امید نہیں کہ ہمارے گریجویٹ پرتکلف، اور فیشن ایبل لباس پہن کر آگرہ کی شوفیکٹری میں موچیوں کے ساتھ شریک عمل ہونگے یا خورجہ کے اچار۔ چٹنی اور مربے کے اگھڑ کاریگروں کے ساتھ ملکر انہیں بالعمل اصول کی تعلیم دینگے تاکہ جس طرح شیفیلڈ آج دنیا میں دہاردار آلات آہنی کے لئے مشہور ہے اسی طرح خورجہ اس امیرانہ دسترخوان کی زیب و زینت کے لئے مشہور ہو جائے۔

ایسی حالت میں کامیابی کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں یا تو اس نظام تعلیم کو قطعًا نظرانداز کیا جائے اور ہندوستان کی موجودہ صنعت و دستکاری کو خود در‌ِ نگاہ

کی طرح بے پناہ چھوڑ دیا جائے، یا طلبہ کے لئے سادہ اور بے تکلف زندگی عجز و انکساری کے اخلاق کی تعلیم اور حب قومی کی تلقین لازمی کی جائے۔ مگر کیا یہ ممکن ہوگا۔ یا اہل ہند کے قبض و اختیار میں یہ بات ہے کہ جدید نظام اور نصاب تعلیم اس طرح مرتب کر کے جاری کر دیں کہ اس میں مغربی خاصیت کے بجائے خاص ہندوستان کی خصوصیتیں زیادہ ہوں اگر ان نقائص کو پیش نظر نہ رکھا گیا۔ تو ہم پیشینگوئی کرتے ہیں کہ جس طرح اس عام تعلیم کے نظام میں تقریباً ۵۰ برس بجز سرکاری ملازمت کے امیدوار تیار کرنیکے اور کوئی کام نہیں ہوا اسی طرح مجوزہ ٹیکنیکل کالج ایک آدھ صدی اور مغربی کارخانوں اور کمپنیوں کے لئے ہرکارے اور کامدار پیش کریگی۔

اس خاص معاملہ میں ہمیں اپنے قومی اہلی درسگاہوں سے یا حامی تعلیم جماعتوں سے ذرہ برابر بھی امید نہیں، بلکہ برعکس پھر اسی قوت سے امید بہبودی ہے جو انگریزی حکومت سے موسوم ہے۔ اگر بقول تارک موالات یہ ہمارا دشمن ہے تو دانا دشمن ہے اور اگر اس کے برخلاف دوست ہے تو مآل اندیش ہے۔ اس وقت جبکہ ملک میں ہر ایک سیاسی، مذہبی فرقہ ٹیکنیکل تعلیم کے عملی راگ گا رہا ہے ہماری فرزانہ حکومت نہایت قابلیت کے ساتھ اس تحقیق میں مصروف ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک خطہ اور مقام کی کوٹیج انڈسٹری کس حالت میں ہے اور کن شرائط سے ترقی کر سکتی ہے چنانچہ ہر ایک صوبہ کی حکومت نے اپنے قلمرو کی ضلع وار جلدیں شائع کی ہیں جن سے اس ضلعے کے مختلف دستکاریوں کے مفصل حالات آمد و برآمد کی حالت اچھی طرح معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کسی خاص مقامی پیداوار یا صنعت کو موجودہ حالت میں کس طرح ترقی دیجا سکتی ہے۔ اب اس کے بعد ضلع کی بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کا فرض ہے کہ اس کام کو لیکر چلیں۔ جس کے متعلق ہم آیندہ مفصل بحث کرینگے۔

قریشی

تنقید و تبصرہ

اسکول لیونگ

(تکمیل تعلیم مدرسہ کے نتائج)

سال گزشتہ (سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء) کے نتائج امتحان پر رجسٹرار الہ آباد یونیورسٹی نے ایک مختصر اور جامع روداد شائع کی ہے جس کے ساتھ طلبہ کی عام قابلیت علمیہ پر ممتحنین کا شعبہ وار تبصرہ بھی شامل ہے۔ یہ دونوں دستاویزات اس قدر دلچسپ ہیں کہ بے اختیار تنقید کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عام تبصرہ ۵۲۹۴ طلبہ میں سے ۲۶۲۸ کامیاب ہوئے یہ ۲۱٫۳۲ کی نسبت ہے اور سال گزشتہ سے بقدر ڈیڑھ کے زیادہ ہے۔ طالبات کی ہمت قابل تحسین ہے یہ ۱۷ میں سے ۱۴ پاس ہوئیں۔ یعنی ان میں ۲ مسلمان اور ۱۲ عیسائی طالبات ہیں مسلمان طلبہ کا تناسب حسب ذیل جدول سے واضح ہوگا۔

کل امیدوار اور کامیاب طلبہ کی میزانیں مندرجہ روداد سررشتہ تعلیمات و روداد رجسٹرار میں کچھ تفاوت ہے مگر یہ زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ تبصرہ عام نتائج پر ہوتا ہے تعداد شمار میں کسور اعشاریہ تک کی صحت ضروری نہیں۔

(اس میں طالبات کی تعداد شامل نہیں ہے)

مدارج	مسلمان	ہنود	عیسائی	میزان کامیاب طلبہ	میزان کل امیدواران	کیفیت
اسکول لیونگ	۴۷۲	۲۱۰۹	۳۳	۲۶۱۳	۵۲۷۷	بحوالہ رجسٹرار
میٹرک	۶۳	۲۳۷	۳	۳۰۳	۶۹۴	

میٹرک کی تعداد شمار اس لئے بالمقابل دکھائی گئی ہے کہ اسکول لیونگ کے درجہ نے قائم ہوکر یونیورسٹی کے دروازہ پر شائقین علوم کا ہجوم کس قدر کم کر دیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے تعلیمی عقائد کس قدر ادنیٰ ہیں۔ انکی دنیاوی نجات بیس پچیس روپیہ ماہوار کی ملازمت سے ہوجاتی ہے مسلمان اور ہنود میں تقریباً ایک اور پانچ کی نسبت ہے۔ اس کا ایک اور زیادہ بیّن ثبوت اکثر سرکاری دفتروں کے رجسٹرہائے امیدواران میں ہی ملیگا۔ جہاں مسلمان امیدواران ملازمت خال خال ہوتے ہیں۔ میٹرک کے کامیاب طلبہ کی قلیل تعداد کو کالج کلاسوں میں جاکر دیکھئے کہ مسلمان طلبہ ڈہونڈے نہیں ملتے۔ الّا ماشاء اللہ۔

خلاصہ یہ کہ یہ خوش نصیب قوم نہ ادھر ہے اور نہ ادھر ہے اور لطف یہ کہ بچے سے لیکر بڑے تک ہر ایک کی زبان پر کم رزقی اور بے روزگاری کی شکایت ہی۔

زباندانی کا تنزل ناکام طلبار کی شاندار تعداد میں ۱۹۷۵ انگریزی میں ۲۸۱۵ تواریخ و جغرافیہ میں اسکے علاوہ سنسکرت، عربی فارسی اور دیگر السنہ میں تقریباً ۹۰۰ ناکام شامل ہیں، یہ سب فنون یا زباندانی کی مدمیں ہیں۔ ریاضیات میں ۱۲۷۹ اور سائنس کی دو اور شاخوں میں تقریباً ۶۰۰ فیل ہوئے یہ علوم یا سائنس کا مد ہے، علوم اور فنون یا زباندانی کو الگ کرکے دیکھیں تو آخرالذکر میں نسبتاً زیادہ طلبہ ناکام ہوئے اور یہ نہایت عبرت خیز اور ہیبت ناک نتائج ہیں خصوصاً جب طلبہ کی عام قابلیت زباندانی پر ممتحنین کا تبصرہ پڑھتے ہیں تو دلپر چوٹ لگتی ہے تقریباً ایک صدی سے اہل ہند مغربی تعلیم کے میدان میں رہنوردی کر رہے ہیں ان کا اور ذمہ داران تعلیم کا مقصود حقیقی سیاسی بنا پر یا اور کسی وجہ سے ہمیشہ زباندانی رہا ہے علوم و سائنس کی جانب گزشتہ چند سال سے کبھی کبھی صرف غلط انداز نظریں پڑی ہیں عملی زندگی میں بھی طلبہ کو زباندانی ہی مدد دیتی ہے اور پھر یہ درجہ تعلیم (اسکول لیونگ)

محض اسی مقصد کے لئے ایجاد ہوا تھا کہ نوجوان ایک سند فضیلت حاصل کر کے جلد سرکاری یا غیر سرکاری دفاتر میں گھس کر تن پیٹ کی ضرورتیں پوری کر سکیں گویا ان کے لئے مشعل راہ اخیر تک زباندانی ہی ہے، مگر با ایں ہمہ اس قابلیت سے وہ اس بری طرح محروم رہے کہ بے اختیار رحم آتا ہے۔

ممتحنین کی تقریظ بقول ممتحنین عبارت پڑھکر سنائیں تو اکثر لفظ ان کی سمجھ میں نہیں آتے اور نہ صحیح لکھ سکتے ہیں۔ کوما اور سمی کولن کا یہ عالم ہے کہ گویا لکھے ہوئے صفحہ پر کسی نے سیاہی کا چھینٹا دیدیا ہے۔ زبانی گفتگو کی جائے تو غائب ہو جاتے ہیں۔ ابلہ فریبی سے باربار پوچھتے ہیں کہ کیا کہا ہمیں تسلیم ہے کہ انگریز جیسے صحیح تلفظ سے بولے ہوئے الفاظ فطرتاً ان کی قابلیت سے بالاتر ہیں اہل زبان پھر اہل زبان ہی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہندوستانی انگریزی ہی نہیں سمجھتے۔ بھدی آواز اور ناتراشیدہ گلے کی بھی ہمیں کچھ شکایت نہیں اسلئے کہ ہمارے مدارس میں اس فن کی تعلیم ہی نہیں ہوتی۔ مگر انداز بیان اتنا برا ہوتا ہے کہ کانوں میں انگلیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔ حرف علت کی آواز کبھی صحیح نہیں نکال سکتے۔ املا اور انشا کا یہ حال ہے کہ انگریزی محاورات اور ضرب المثل کا صحیح استعمال تو بہت اونچا مقام ہے الفاظ کے ہجا صحیح نہیں کر سکتے معلومات عامہ میں ان کی ناقابلیت حد سے بڑھ جاتی ہے۔ انگلستان کے مشہور ضلعوں کو امریکہ میں بتاتے ہیں۔ سہراب اور رستم کو اٹھارہویں صدی کا پہلوان شیکسپیر کو شکنتلا کا مترجم اور جوپیٹر (مشتری) دیوتا کو عیسائیوں کا خدا لکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ بعض طلبہ نے پرنس آف ویلز کا نام سرہارکورٹ بٹلر (گورنر صوبہ متحدہ) بتلایا۔

ترجمہ کی شان ترجمہ درحقیقت ہندوستانیوں کی انگریزی دانی کا دوسرا نام ہے یعنی جہانتک ہم سمجھتے ہیں کسی غیر زبان خصوصاً انگریزی زبان کا

علم حاصل کرنے سے کوئی ہندوستانی خواہ وہ بی، ایچ، ڈی۔ ہی کیوں نہ ہو اس زبان کا عالم ہرگز نہیں بن سکتا۔ بلکہ اس کے علم کی اصلی حقیقت یہ ہو جاتی ہے کہ گویا اس زبان سے اس کا جہل علیٰ قدر مراتب کم ہو گیا ہے۔ اس سے بلند مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ خواب و خیال تک اسی زبان میں آنے لگیں اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ انگریزی سوسائٹی میں پیدایش ہو یا آنکھ کھلے۔ الا ماشاء اللہ۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انگریزی زبان کا ہندوستانی عالم یا زباندان حقیقت میں زبان کا مترجم ہے۔ کثرت مشق اور وسعت نظر سے اُسے یہ بات حاصل ہو جاتی ہے کہ مادری زبان میں پیدا شدہ خیالات کو برجستہ انگریزی الفاظ کا لباس پہنا کر غلط یا صحیح تلفظ کے ساتھ مسلسل ادا کرتا چلا جائے۔ مگر اس میں یہ لازمی بات ہے کہ مادری زبان کے جن الفاظ میں وہ اپنا مافی الضمیر بامحاورہ اور بے تکلف ادا کر سکتا ہے اُسے ان پر بھی عبور ہو اور ان کے بالمقابل اُسے انگریزی کے الفاظ بھی کم و بیش معلوم ہوں، اب قارئین کرام خود خیال کریں کہ ہندوستان کی کسی مروجہ اور عام بول چال کی زبان میں ذخیرہ الفاظ اور لغات اس قدر کافی ہے؟ ادھر انگریزی کے اکثر ادبی (علمی مصطلحات کو نظر انداز کر دیجئے) الفاظ کے صحیح مفاہیم اور محل استعمال پر ہندوستانیوں کو اس قدر عبور ہو سکتا ہے کہ وہ بآسانی اپنے ہندوستانی مافی الضمیر کو انگریزی الفاظ میں اور انگریزی مفاہیم کو مادری زبان میں بے تکلف اور بامحاورہ ادا کر دیں اور عربی فارسی یا سنسکرت کے غیر معروف، غیر مروجہ الفاظ سے مطلقاً مدد نہ لیں، اس کا جواب ظاہر ہے۔ مگر با ایں ہمہ ممتحنین کو سخت شکایت ہے کہ طلبہ ترجمہ کے میدان میں نہ صرف بے ڈھنگی چال اور بہکے بہکے قدموں سے چلتے ہیں بلکہ کہیں کے کہیں جا نکلتے ہیں اگر سو رادبی نہ سمجھی جائے تو اس درجہ تعلیم کے طلبہ ایک طرف۔ خود حلقہ اساتذہ میں بھی خال خال اس قابلیت کے ہونگے کہ اپنے اُردو کے مافی الضمیر کو پورے حسن و قوت کے

ساتھ انگریزی الفاظ کے پیراہن میں پیش کر سکیں یا کسی انگریزی کی اوسط درجے کی تصنیف کا با محاورہ ترجمہ اُردو میں بے تکلف لکھدیں۔

انشاپردازی کے پرچے میں ممتحنین کو شکایت ہے کہ موضوع کے مطابق بہت کم طلبہ نے مختصر اور مدلل مضمون لکھے۔ بکثرت ایسے تھے کہ اُنہوں نے مفہوم ہی نہیں سمجھا اور اگر سمجھا تو مضمون کو الف لیلہ بنا دیا حالانکہ موضوع کو سمجھنا، اس کو متعدد حصص پر تقسیم کر کے ترتیب وانضباط کے ساتھ ادا کرنا واقعات غیر متعلقہ کو نظرانداز کرنا۔ وہ شرطیں ہیں جن پر اساتذہ کی نظر ہی نہیں پڑتی۔ طلبہ کی سمجھ میں کیا آتا انگریزی مرادفات اور الفاظ کا ذخیرہ بھی نہایت ہی محدود تھا۔ کتاب نصاب میں سے چند سطور کا ایک ٹکڑا اُس مقصد کے لئے دیا گیا تھا کہ طلبہ اُسے اپنے لفظوں میں تحریر کریں اور دس سطروں سے زیادہ نہ لکھیں مگر اس میں بھی ناکام رہے۔ اکثر طلبہ نے وہی کتاب کے لفظ طوالت دیکر دوہرا دیے یا غلط مرادفات استعمال کئے۔ خلاصہ یہ کہ ممتحنین کا تبصرہ سرتاپا شکایت سے لبریز ہے۔

دَورِ جدید کی تاریخ تعلیم کے اس درجہ کو جیسا کہ بعض اور مدارج کو قوم یا ملک کی حقیقی تعلیمی ضرورت نے ایجاد نہیں کیا بلکہ اُس طول طویل سلسلہ لطائف الحیل نے کیا جو ہندوستان میں جدید دَور تعلیم پر محیط ہے حسن اتفاق سے قدیم دَور تعلیم جس قدر آسان۔ سادہ اور بیساختہ تھا۔ دَور جدید اسی قدر مشکل اور پُرپیچ واقع ہوا ہے بلکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی فرد فرید تعلیم الہند کا مورخ ہونے کی حیثیت سے جب کبھی آیندہ اس عنوان پر قلم اوٹھائیگا تو دَور جدید میں داخل ہو کر سخت بدحواس اور پریشان ہوگا۔ دیکھنے میں اُسے تعلیمی ترقی اور تنزل کے اندر وہی حسب معمول نسبت صحیح نظر آئے گی لیکن درحقیقت نسبت معکوس ہو گی یعنی سررشتہ تعلیمات کے کسی پنج سالہ رپورٹ کے پڑھنے سے اُسے گو بظاہر یہ واضح ہوگا کہ ہندوستان ترقی کر رہا ہے مگر اس میں درحقیقت

تعلیمی تنزل کا نقشہ مخفی ہوگا۔ تعلیم کے اصول اور ضوابط میں اختلاف۔ نصاب تعلیم کے مطالبوں میں اور طلبہ کے علم النفس کے تقاضوں میں اختلاف۔ غرض کہ ہر طرف نظر فریب سین پیش ہونگے۔ اور مورخ کے لئے حقیقت کا پتہ لگانا دشوار ہو جائیگا۔

جدید دَور کا آغاز اگرچہ ۱۸۵۷ء سے سمجھا جاتا ہے جبکہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں لیکن حقیقت میں مدرسہ عربیہ کلکتہ ۱۷۸۲ء میں قائم ہونے کے وقت سے آغاز ہوا جس کی دوسری شاخ شاید ۱۷۹۱ء میں بہ شکل مدرسہ سنسکرت بنارس میں قائم ہوئی اور ان کے ساتھ تینوں پریسیڈنسیوں میں جا بجا انگریزی مدرسے اور کالج قائم ہوئے اس وقت سے لیکر اختتام انیسویں صدی تک ذمہ دار طبقہ کا تعلیمی مقصود محض زباندانی تھا انگریزی زبان کے ساتھ السنہ مشرقیہ کی بھی ٹھوس تعلیم دیجاتی تھی۔ جیسا کہ تمام مدارج کے نصابات دیکھنے سے واضح ہوتا ہے۔

اُنیسویں صدی کے ربع آخر کے سند یافتہ آجکل کے کالجوں سے زباندانی میں بدرجہا ممتاز ہوتے تھے جس کے اسباب اس دَور کے نصاب ہائے تعلیم اور ضوابط و آئین تعلیم میں مخفی ہیں۔ لیکن بعض سیاسی وجوہ سے اختتام صدی کے قریب نقشہ بدلنے لگا مضامین تعلیم کے تعداد اور تنوع سے تنزل کی رفتار اس قدر تیز ہوئی کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ سید اصغر علی محمد علی کی عطر مجموعہ کی شیشیوں کو شرمانے لگے۔ ہمہ دانی کی ہوس میں ہیچدانی کی ارزاں جنس تیار ہونے لگی۔ پھر بھی کچھ آثار زباندانی باقی رہے، لیکن اس صدی کے شروع میں لارڈ کرزن کی مآل اندیشانہ تدابیر استحکام سلطنت نے میکالے کے تعلیمی نقشے اور تعمیر دونوں کو زیر و زبر کر دیا۔ حکومت کے سنجیدہ فیصلوں کی تعمیل بہت جلد نہیں ہوا کرتی بلکہ رفتہ رفتہ اور نامعلوم طریقوں سے کئی کئی جگہ میں ہوتی ہے چنانچہ تکمیل مدرسہ کا درجہ یونیورسٹی کے انٹرنس سے مثل ایک نئی شاخ کے نکلا، جس کے افسوسناک نتائج تعلیم پر خود ممتحن اور رجسٹرار نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ لیکن ع

اے باد صبا این ہمہ آوردۂ تست

جب نصاب تعلیم مرکز سے گریگا تو نتائج بہتر کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ محض تخیل نہیں بلکہ ملک کی متعدد یونیورسٹیوں کے اکثر مدارج تعلیم کے نصابات کو ابتدائے دَور جدید سے بالاستیعاب پڑھکر سنجیدہ نتائج نکالے گئے ہیں۔

اسکول لیونگ کی علت غائی

کہا جاتا ہے کہ اسکول لیونگ (تکمیل تعلیم مدرسہ) کا قلم اسلئے لگایا گیا تھا کہ ہندوستانی نوجوان بچیس چھبیس برس کی عمر تک مسلسل دماغ سوز محنت۔ والدین کی صبر آزما کلفت کے بعد مدارج اعلیٰ پر پہونچکر بجز اس کے کہ سرکاری محکموں کے افسران اعلیٰ کو ستاتے تھے اور کسی طرح کسب معاش نہ کرتے تھے۔ ان پر ترس کھاکر یہ نسبتاً زیادہ سہل درجہ تعلیم ایجاد کیا گیا تاکہ جو سرکاری ملازمت کے قشقے سے محروم رہیں وہ اور ذریعہ بسر اوقات تلاش کرلیں ہم بذات خود اس توجیہہ کو بالکل معقول اور امر واقعہ تسلیم کرتے ہیں لیکن نکتہ چین گروہ جن کی رائے کا خلاصہ اوپر درج کیا گیا ہے یہ جواب الجواب دیتے ہیں کہ اسکول لیونگ کا درجہ درحقیقت موجودہ نظام انٹرمیڈیٹ کالج کا پیش خیمہ تھا جس کا ہندوستان کی تعلیمی ترقی پر ایک بھاری قفل ہونا مسلمات میں سے ہے۔ اس کی تشریح کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے بارہا کی جاچکی ہے۔ آخر کار بنگالہ کی ایک زبردست ہستی سر اشوتاش کو وائس چانسلر کا نشان معروف اس قضیئے کی نذر کرنا پڑا۔ کچھہ ہی ہو مگر نکتہ چین جماعت کی ایک حجت بڑی قوی ہے یعنی یہ کہ اگر حکومت ہند نیک نیتی کے ساتھہ محض اہل ہند کے مفاد کے لئے اس جدید شاخ کو لگانا چاہتی ہتی تو بقول خود ایک دو صوبوں میں تجربہ کرنا کافی تھا کیا ضرورت تھی کہ ایک تپ دلرزہ کی سی سرعت نبض اور اختلاج قلب کے ساتھ تمام قلمروے ہند میں پبلک کو آڑے ترچھے اسکول لیونگ اور انٹرمیڈیٹ کی گھٹی پلائی جائے

جدید ارتقائی منزل

اسکول لیونگ (تکمیل تعلیم مدرسہ) کا درجہ اب کوئی دن کا

مہمان ہے یا یوں سمجھو کہ ڈارون کی تھیوری کے بموجب یا اصول تناسخ کے بنا پر اب یہ دوجہ ترقی کرکے درجہ انسانیت تک پہونچ گیا ہے اور انٹرمیڈیٹ کالج کی صورت میں نمودار ہونے والا ہے۔ اسلئے یہ مشورہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ جب تک کم سے کم دو اصلاحیں نہ کی جاویں گی تب تک یہ ایک امید موہوم ہوگی کہ انٹرمیڈیٹ کالج سے طلبہ کم ازکم زباندانی میں اسکول لیونگ کے طلبہ سے بہتر ہوکر نکلیں۔

اوّل ادبیات کا نصاب مرتب کرنے میں مذہب، قومیت اور نسلی معتقدات اور خصوصیات کو ایک طرف اور سیاسی حکمتوں کو دوسری طرف قطعاً نظرانداز کیا جائے، نصاب کی اصلاح پرائمری درجہ سے کی جائے، یہ نہ ہو کہ پرائمری کی آخری ایک دو جماعتوں میں انگریزی کی ہلکی ہلکی ایک دو کتابیں داخل کرکے مڈل میں دوگنے، تگنے صفحات کی زیادہ ادق زبان اور دورازکار مواضیع کی کتابیں طالب علم کے سامنے رکھدی جائیں اور فطرت اللہ کے اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی کی جائے۔ کہ آٹھویں برس سے سولہویں برس تک طبیعت کی توجہ زیادہ تر تعمیر جسم کی جانب ہوتی ہے اس دَور میں دماغی محنت کا بار ڈالنے سے نہ صرف جسمانی نشو ونما کو بلکہ دماغی قوی کو سخت صدمہ پہونچتا ہے۔ مڈل درجہ کا امتحان بالضرور سررشتہ تعلیمات کے سپرد ہونا چاہیۓ ورنہ کالج کی پہلی جماعت افسردہ گان خام سے پُر ہوگی۔ ٹھوس قابلیت کے طلبہ خال خال نظر آئیں گے۔ افسوس ہے کہ ہم اس مختصر مقالہ میں انٹرمیڈیٹ کالج کے ادبی نصاب پر کوئی تنقید نہیں کرسکتے۔ لیکن ہمیں عین الیقین ہے کہ نصاب کی کتابیں طلبہ کو منزل مقصود پر پہونچانے والی نہیں ہیں۔

دوم۔ السنہ مشرقیہ کو زیادہ دخل دیئے بغیر انگریزی کے قابل مترجم (عالم) پیدا نہیں ہوسکتے اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں اس درجہ میں نہ صرف یونیورسٹی کے داخلہ کے لئے ایسے طلبہ تیار کیۓ جاتے ہیں جنہیں علوم و سائنس کے مبادیات سے مس و مذاق پیدا ہونا چاہیۓ

بلکہ زباندان تیار کرنا ہی مقصود ہے کہ وہ اسی درجہ سے تعلیم کو خیرباد کہکر سرکاری وغیر سرکاری دفاتر یا دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بہ آسانی کسب معاش کرسکیں۔ اُردو اور ہندی کے موازنہ کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ اُردو بغیر عربی، فارسی کی مدد کے اگر لنگڑی ہے تو ہندی سنسکرت بغیر بالکل بے دست و پا ہے تاہم السنہ مشرقیہ میں یہ تینوں داخل ہیں اور ہم ان تینوں کی تعلیم پر زور دیتے ہیں اسلئے نہیں کہ یہ ان کی اور وہ اُن کی قدیم ملّی اور مذہبی زبان ہے بلکہ محض اس لئے کہ تینوں زبانوں کے عالم ان کے الفاظ و لغات سے اپنی اپنی زبان کو مالا مال کریں گے۔ جیسے فرانسیسی زبان یونانی اور لاطینی زبان سے مالا مال ہوئی۔ انقلاب عظیم سے بیشتر ملک میں ان دونوں زبانوں کے جاننے والوں کی وہ کثرت تھی کہ خیال ہوتا تھا کہ فرانسیسی زبان مٹ جائیگی، مگر ایسا نہیں ہوا انقلاب کے قبل صدیوں تک یونانی اور لاطینی کا ذخیرۂ الفاظ و مفاہیم بڑھتا رہا۔ پھر یک بیک بند ٹوٹ گیا اور فرانسیسی زبان ایک قلزم کی صورت میں موجیں مارنے لگی۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کو سنسکرت پڑھنے سے ذرا بھی عار نہیں ہونا چاہیئے۔ ہنود اگر عربی فارسی سے پہلو تہی کرینگے تو وہ اچھا نہیں کرینگے۔ علم و زبان کا تعصب بدترین صفت ہے۔ سنسکرت کے اکثر الفاظ بہت جامع اور پیارے ہیں۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے الفاظ بھی ادبیات کی زیب و زینت بننے کے قابل ہیں۔ خیر یہ جداگانہ بحث ہے السنہ مشرقیہ کو حقیر کرکے مغربی تعلیم کی درسگاہوں نے ہندوستان کو کچھ فائدہ نہیں پہونچایا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی کو انگریزی میں پڑھانے سے مرادفات کا ذخیرہ بڑھ جاتا ہے۔ مگر وہ جہل مفرد سے مرکب بھی ہو جاتا ہے انگریزی لفظ کے محض مفہوم سمجھ لینے سے کچھ فائدہ نہیں بلکہ اپنی مادری زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے سے فائدہ ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اُردو تحریر و تقریر اسی وجہ سے بہت کم مؤثر ہوتی ہے، انگریزی سے اُردو ترجمے اکثر پھیکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ انگریزی

زبان میں تبحر حاصل نہ کریں البتہ تبحر کے ساتھ خود فائدہ اُٹھانا اور دوسروں کو فائدہ پہونچانے کا بھی خیال ہونا چاہیئے۔ اور یہ اپنی زبان میں قادر الکلام ہوئے بغیر ممکن نہیں محض انگریزی کے علم سے مادی فیشن اور تکلف کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

دیدہ مست ترا از پئے غیرت دادند
شوخ چشما نہ بدنبال تماشہ مفروش

کیا اس درجہ تعلیم کے طلبہ ترجمے میں ید طولیٰ دکھا سکتے ہیں جس میں ہزاروں کی تعداد سے صرف ایک نے انگریزی میں ؟ ۲۸ ہا نے السنہ مشرقیہ میں امتیاز حاصل کیا۔ جن نوجوانوں کو اپنے ہی گھر کی خبر نہیں وہ غیر گھر کے رازوں سے کیا واقف ہو سکتے ہیں۔

نقشہ نتائج امتحان السنہ مشرقیہ

زبان	تعداد امیدواران		تعداد کامیاب طلبہ	تعداد ممتاز طلبہ
سنسکرت	۱۱۷۳		۶۷۲	۱۲
عربی	۷۰		۶۲	۲
فارسی	۱۵۶۸		۱۱۷۸	
ہندی	۲۸۶۱			۲۳
اُردو	۲۳۵۳	۵۲۹۰	۴۹۳۲	۱۱
بنگالی	۷۶			

صدیقی

فن مناظرہ میں ایک ممتاز تصنیف

اگرچہ دنیا میں سینکڑوں مذاہب ہیں لیکن جس قدر اسلام کے متعلق مخالفانہ یا موافقانہ حیثیت سے لکھا گیا ہے کسی مذہب کے متعلق نہیں لکھا گیا، چونکہ اسلام نے شرک اور اوہام باطلہ کے برخلاف دلائل کی پوری قوت سے جہاد کیا ہے اور اپنے فضائل و محاسن اور حقانیت کو علی الاعلان ظاہر کر کے اپنی دعوت عامہ کو تمام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اسلئے تمام اہل مذاہب اسلام کو اپنا ایک خطرناک حریف سمجھتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا رجحان اسلام کی طرف بڑھتا جاتا ہے اور مختلف مذاہب کے متبعین اپنی رغبت و رضا سے اسلام قبول کرتے جاتے ہیں، اسلئے مخالفین یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو دنیا کے سامنے ایسی بدنما صورت میں پیش کریں کہ کسی کو اس کے قبول کرنے کی طرف رغبت نہ ہو

مخالفین اسلام کی روش

مخالفین کا عام رویّہ اس وقت یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کی خوبیاں نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی نکتہ چینی اور معاندانہ اعتراضات سے اسلام کو مجروح کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کو اپنے مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں، وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اسلام کو مغلوب کر لیا اور اسکی ترقی و اشاعت کو روک دیا تو میدان ہمارے لئے صاف ہے کیونکہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا حریف اور مدمقابل اُن کا نہیں ہے مسیحی مبلغین کا عمل بھی مدت سے اسی پر ہے، اُنہوں نے مذہب پر ہزاروں کتابیں لکھی ہیں، لیکن کیا ان میں مسیحی مذہب کے محاسن اور خوبیاں بیان کی گئی ہیں؟ نہیں! بلکہ زیادہ تر اسلام پر نکتہ چینی کی گئی ہے، آریہ مذہب نے بھی ہندوستان میں اسی طریقے کو اختیار کیا ہے۔ اُن کا تمام لٹریچر پڑھ جاؤ اُس کا بڑا حصّہ اسلام کے متعلق ہوگا۔

سرستی کا نصب العین

خود اس مذہب کے بانی پنڈت دیانند سرستی کا بڑا مقصد

اسلام کے برخلاف تعصب و نفرت پھیلانا تھا جیسا کہ ستیارتھ پرکاش کے مطالعہ سے ظاہر ہے، چنانچہ جب اسلام پر نامہذب حملے اور نکتہ چینی کی جاتی ہے، تو عام مسلمان برافروختہ ہوتے ہیں لیکن یہ اُن کی غلطی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ نکتہ چینیاں اسلام کے لئے ہمیشہ نہایت مفید ثابت ہوئی ہیں، اور جو کتابیں اسلام کے خلاف لکھی گئی ہیں اُنھوں نے ہمیشہ اسلام کی ترقی کے لئے کھاد کا کام دیا ہے، ہر حملہ اور نکتہ چینی کے موقعہ پر علما جواب دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور اس طریقے سے اسلام کے متعلق جدید حقائق و معارف کا اظہار ہوتا رہتا ہے، چنانچہ علماء اسلام کی تصنیف سے آج ہزاروں کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا اور اُن کے حملوں کی مدافعت کی گئی ہے، ان کتابوں کے ذریعے سے اسلام کے بہت سے مسائل کی تحقیقات عمل میں آئی اور شریعت کے ہزاروں رموز و اسرار منظر عام پر آگئے،

ہمکو مخالفین کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اُن کے اعتراضات کی بدولت علما کو اسلام کی حقانیت ظاہر کرنے کا موقعہ ملا اور ایک ایک کتاب کے مقابلہ میں متعدد کتابیں لکھی گئیں جن سے اسلام کے مذہبی ذخیرہ میں معقول اضافہ ہوا۔

مخالفین نے جو کتابیں اسلام کے متعلق لکھی ہیں اُن میں ایک رسالہ "ترک اسلام" بھی ہے جو ایک[1] نو آریہ نے ۱۹۰۳ء میں لکھا تھا۔ اُس زمانے میں مخالفین نے اس کتاب کو بہت کچھ شہرت دی اور اُس کی ہزاروں جلدیں چھاپ کر شائع کیں، علمائے اسلام نے اس رسالے کے جواب میں متعدد کتابیں لکھیں جو اُسی زمانہ میں عام طور پر شائع ہوگئیں، منجملہ ان تصنیفات کے ایک کتاب "مصباح الاسلام" اس وقت ہمارے سامنے ہے

[1] بفضلہ "ترک اسلام" کا مؤلف اب مسلمان ہے اور نہایت جوش اور دلیری سے اسلام کی خدمت کر رہا ہے اور متعدد کتابیں اسلام کی تائید و حمایت میں لکھ چکا ہے۔

(اکرام اللہ خاں ندوی)

جو بغرض ریویو موصول ہوئی ہے، دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی تھی۔ لیکن بعض موانع کی وجہ سے شائع نہ ہو سکی، اس کے مصنف مولوی حکیم محمد ذکی صاحب کامل فتح پوری اکبر آبادی ہیں۔ جن کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوگیا، اب مصنف مرحوم کے بھائی منشی سراج احمد صاحب صبا نے اس کتاب کو شائع کیا ہے، اور جا بجا اس پر مفید نوٹ اضافہ کئے ہیں۔

"مصباح الاسلام" میں "ترک اسلام" کے اہم اعتراضات کا جو زیادہ تر قرآن مجید کے متعلق ہیں جواب دیا گیا ہے، کتاب ۱۹ عنوانات پر مشتمل ہے جن کے ماتحت مختلف مباحث پر اجمالاً یا تفصیلاً بحث کی گئی ہے، مثلاً (۱) طوفان نوح (۲) شیطان (۳) جنات (۴) شہاب ثاقب (۵) نبی و معجزات (۶) معراج (۷) حشر و نشر و تناسخ (۸) تعدد ازواج (۹) طلاق (۱۰) گوشت خواری وغیرہ ذلک۔

جن آیات کے معانی و مطالب پر مؤلف "ترک اسلام" نے اعتراض کیا تھا۔ ان کی تفسیر ایسے اچھے پیرایئے میں بیان کی ہے کہ اعتراضات خود بخود اُٹھ جاتے ہیں، ہم کو اُمید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے لئے مفید ہوگا۔

تقطیع کلاں، لکھائی، چھپائی متوسط، مجموعی ضخامت مع فہرست مضامین ۱۰۰ صفحہ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ :- شیخ ریاض احمد صاحب چشتی، فتح پور سیکری ضلع آگرہ۔

اکرام اللہ خاں ندوی

ملفوظات

علم النفس کے چند مبادیات

اگر اتالیق یا ابتدائی مدارس کے اساتذہ کبھی فرصت میں خالی الذہن اور بے تعلق ہو کے طلبہ کا علم النفس کی نظر سے مطالعہ کریں تو انہیں گلدستہ کے پھولوں کی طرح سب کے رنگ و بو صاف الگ الگ محسوس ہونگے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آج ان خصوصیات علمائے مغرب کے الفاظ میں بجنسہٖ ہدیہ ناظرین کریں۔

سب سے اول ایک سلافی عالم کو لیجئے یعنی جان اَمس کومینس۔ پیدائش ۱۵۹۲ء وفات ۱۶۷۰ء مولد مرادیہ (اسٹریا ہنگری) تصانیف متعدد اور بلند پایہ۔ سب سے زیادہ ممتاز و مقبول دی گیٹ آف ٹنگ اَن لوکڈ یعنی مفتاح الالسنہ ہے جس کا ترجمہ یورپ کی ہر ایک زبان میں یہاں تک کہ مشرق میں عربی، ترکی، روسی اور منگولی زبان میں بھی ہوا۔ اُردو میں ترجمہ کرنا ابھی باقی ہے۔ اس عالم کی ہسٹری آف ایجوکیشن یا تاریخ التعلیم فی المغارب بھی کچھ کم بلند پایہ تصنیف نہیں۔

قول - بعض بچے طبعًا تیز طرار۔ بعض بظاہر سست۔ لدھڑ ہوتے ہیں پھر بعض سلیم الطبع ملائم اور متابعت پسند۔ بعض درشت خو اڑیل اور دیدہ دلیر۔ پھر بعض طبعًا مطالعہ کے شائق۔ بعض انکے خلاف جسمانی محنت کے کاموں کے دلدادہ ہوتے ہیں اگر ان مختلف الاجزا مرکبہ کو سامنے رکھکر الگ الگ ترتیب دیں تو بچوں کی چھ قسمیں حاصل ہوتی ہیں یعنی

(۱) وہ جن میں ایک خداداد غیر معمولی قابلیت و شوق اور جذب و قبول کی قوت ہوتی ہے۔ تعلیم کے لئے یہی سب سے زیادہ موزوں ہیں اور ایسے لڑکے اساتذہ کے

محبوب ہوتے ہیں۔ انہیں تادیب و تنبیہ کی ضرورت نہیں۔ انہیں علم کی پیاس ہوتی تعلیم سے سیر ہو جاتے ہیں۔ اور اعجوبہ پودے کی طرح خود نشو و نما پاکر خود پھولتے پھلتے ہیں۔ اُستاد یا اتالیق کو چاہیئے کہ ان پر زیادہ محنت کا بوجھ نہ ڈالے، ورنہ ان کی طبیعت پر اضمحلال اور تنفر کی کیفیت طاری ہوکر ذوق و شوق کم ہو جائیگا۔

(۲) دوسری قسم ان بچوں کی ہے جو ذہین اور نکتہ رس تو ہیں مگر کسی قدر سست ہیں پھر بھی قابل تربیت ہیں مگر سستی کا مبدء ان کی فطری متانت اور سنجیدگی ہے نہ کہ کند ذہنی۔ یہ چلانے سے چلتے ہیں اور فی الجملہ قابل تربیت ہیں۔ البتہ انہیں ہر وقت بیدار اور مصروف کار رکھنے کی ضرورت ہے۔

(۳) بعض بچے ذکی اور طباع بھی ہوتے ہیں، ذوق و شوق بھی رکھتے ہیں لیکن دیدہ دلیری۔ ضدی۔ سخت مزاجی کی وجہ سے ہمچشموں میں حقیر اور نامقبول ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اساتذہ ان سے بیزار و مایوس رہتے ہیں مگر یہ غلط فہمی ہے۔ اس طبقہ سے اکثر ایسے ایسے وحید العصر نکلے ہیں کہ اُنہوں نے دنیا کی تاریخ بدل دی ہے انہیں انکے حال پر نہیں چھوڑنا چاہیے خلق و استقلال کے ساتھ ان کی نیک اصلاح اور استعمال بالغیر کرنا مناسب ہے۔

(۴) بعض سلیم الطبع۔ مطیع۔ مطالعہ پسند۔ محنتی سب کچھ ہوتے ہیں لیکن سخت بلید۔ کند ذہن اور سندہ عقل، حتے کہ اُستاد کا جی چھوٹ جاتا ہے، بات کو مشکل سے سمجھتے ہیں یہ بھی قابل تربیت ہیں بشرطیکہ انکے ساتھ قسم سوم کا سا برتاؤ کیا جائے۔ اور اُستاد اپنی بلند سطح سے نیچے اُتر کر اور ان کے ہم خیال بنکر تعلیم و تربیت کرے۔ ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالے، نہ تشدد سے کام لے، بلکہ انہی کے ساتھ ہوکر خراماں خراماں چلے۔ اگر وہ گریں تو اُٹھائے، ٹھوکر لیں تو سنبھالے۔ بددل ہوں تو ہمت افزائی کرے، یہ بھی ضرور منزل پر پہونچیں گے مگر دیر میں۔ تاہم زیادہ بارکشی کے عادی اور

پختہ کار ہوجائینگے۔ جیسے بعض درخت کہ دیر میں پھل دیتے ہیں مگر ان کا پھل زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔

(۵) بعض سخت کھٹل تکلیف دہ۔ اور بار زمین ہوتے ہیں۔ کسی طرح آگے قدم نہیں رکھتے پھر بھی اگر ان میں ہٹ اور شوخ چشمی نہیں تو استاد کی صبر آزما محنت اور استقلال سے یہ بھی درست ہوجاتے ہیں۔

(۶) سب سے ادنیٰ قسم ان بچوں کی ہے جو سست بھی ہیں اور طبعاً بدمزاج اور بدعقل وارفتہ ممسوخ اور شورپشت ہم اساتذہ سے التماس کرینگے کہ وہ ان سے بدظن نہ ہوں بلکہ تحمل سے کام لیکر تدبیر و ترکیب سے اول ان کی اصلاح و تربیت میں کوشش کریں اور جب کچھ نہ بن پڑے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں مگر ایسا نہ ہو کہ اُستاد کی سوء تدبیری سے یہ اور زیادہ بگڑ کر سوسائٹی کے لئے خطرناک بن جائیں۔

۲۔ ایک اور مغربی عالم فلیتچ نے علم النفس کی بنا پر بچوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ یعنی وہ لکھتا ہے کہ جس طرح کاشت اور زراعت کے لئے زمین کی مختلف قسمیں ہیں اسی طرح انسان کے دل و دماغ کے مختلف اقسام ہیں۔

(۱) بعض قطعہ زمین سطح پر بہت اچھا مگر سطح کے نیچے ناقص ہوتا ہے۔

(۲) بعض کی سطح ناقص مگر سطح کے نیچے کی زمین زرخیز اور بارآور ہوتی ہے۔

(۳) بعض مبارک قطعہ سطح کے اوپر اور نیچے دونوں جگہ اعلیٰ درجے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(۴) بعض کمبخت زمین سطح کے اوپر نیچے دونوں جگہ تخم سوز خواص رکھتی ہے۔

بعینہ یہی حال طلبہ کا ہے قسم اول کی طرح شروع میں وہ خوب تعلیمی ترقی کرتے ہیں مگر آگے چلکر بگڑ جاتے ہیں گویا ترقی کا مادہ ان میں سوخت ہوجاتا ہے۔ اُستاد اور والدین کو چاہئے کہ انہیں جغرافیہ۔ تاریخ۔ السنہ دزبان دانی کے دلچسپ شعبوں میں تعلیم دیں دوسری قسم کے طلبہ غور و خوض کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ گہرے علمی مسئلوں اور پیچیدہ

قیموں سے انہیں خاص مناسبت ہوتی ہے کیونکہ یہ تعلیمی میدان کو شروع میں تو بڑی طرح اُفتاں خیزاں طے کرتے ہیں مگر آگے چلکر ان کی ترقی کی رفتار بڑھ جاتی ہے اور ذہن و ذکاوت دوبالا ہو جاتی ہے۔ جیسے اراضی قسم دوم کا حال ہے۔ تیسری قسم کے طلبہ گویا ہر ایک شعبہ علمیہ کے لئے موزوں ہیں۔ یہ جس طرف چلیں گے۔ تیز رفتاری سے ترقی کا میدان طے کرتے چلے جائیں گے۔ ان کو نوادر عجائبات میں سمجھنا چاہیئے جو بھی قسم کے طلبہ بالکل بیکار ہیں ان کی اصلاح کے لئے جتنی کوشش کی جائیگی اکارت ہوگی۔

۳۔ ایک تیسرا عالم۔ جرمن۔ ان مطالب کو اور طرح بیان کرتا ہے

کارل جارج فان رامر۔ پیدائش ۱۷۸۳ء اور وفات ۱۸۶۵ء تعلیم برلن یونیورسٹی صاحب تصانیف خصوصاً ہسٹری آف پیڈاگوگی یعنی تاریخ طرز تعلیم و تعلم چار جلد زیادہ ممتاز اور مقبول ہے۔

قول ۔ بعض طلبہ ذہین۔ طباع ہوتے ہیں ایک ذرا اشارہ سے تمام مطلب سمجھ جاتے ہیں کچھ پوچھئے تو برجستہ اور فیصلہ کن جواب اس طرح دیتے ہیں کہ گویا ان کو صحت بیانی پر پختہ اعتماد ہے۔ بعض خوب سوچ سمجھ کر اور غور کر کے جواب دیتے ہیں۔ کچھ آہستہ آہستہ غنغناتے ہی ہیں اور سوال سنکر کچھ مستغرق ہو جاتے ہیں گویا صحیح جواب کی تلاش میں بحر خیال میں غوطہ لگاتے ہیں۔ سوال کے ہر پہلو کو آہستہ آہستہ سمجھتے ہیں اور کسی قدر تذبذب کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ پھر بعض طلبہ ہر قسم کے شعبہ ہائے علوم کی تحصیل کے لئے موزوں ہیں اور بعض کا مذاق کسی خاص شعبہ کی جانب ہوتا ہے۔ بعض پڑھنے سے اس قدر جی چراتے ہیں کہ والدین اور اساتذہ کو قطعاً مایوسی ہوتی ہے۔ لیکن بالآخر یہ سب ماہر فن استاد کی محنت سے کم و بیش درست ہو جاتے ہیں۔

صدیقی

سادہ زندگی کا اخلاقی پہلو

۱- اچھی زندگی وہ ہے جو اون سب لوگوں نے بسر کی جو سب کے نزدیک اچھے سمجھے جاتے تھے

۲- جتنے پیغمبر اور مصلح گزرے ہیں اونہوں نے غربت کی اور سادگی کی زندگی بسر کی۔ حتیٰ کہ جو لوگ تاجدار تھے یا دولتمند امراء وہ اس وقت تک عمدہ کام نہ کر سکے جب تک کہ اونہوں نے غربت کی زندگی اختیار نہ کی۔

۳- اگر سادہ زندگی اخلاق کے لئے عمدہ نہ ہوئی اور بنی نوع انسان کے لئے بہتر اور مفید نہ ہوتی تو پیغمبروں اور مصلحوں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ خود تکلیف اٹھاتے اور قوم کے لئے تکلیف اوٹھانے کا نمونہ قائم کرتے۔

۴- پُر تکلف زندگی کیوں بُری ہے۔ سادہ زندگی کیوں اچھی ہے۔ اسلئے کہ پُر تکلف زندگی مرکب ہے بہت سے انسانوں کی خدمت اور محنت پر۔ سادہ زندگی نتیجہ ہے صرف اپنی ذاتی محنت کا۔

۵- اسلام میں خود سادہ زندگی اور مساوات کا نمونہ موجود ہے کونٹ ٹالسٹائی جو آج کہہ رہے ہیں وہ مسلمانوں کا عمل تھا۔ غلاموں سے مساوات تھی، جو آقا کھاتا تھا وہی غلام کھاتا پہنتا تھا۔ حتیٰ کہ غلاموں کو بادشاہت ملی۔

۶- لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ بغیر اپنی ضرورتوں کو کم کئے ہوئے اپنی خواہشوں کو مغلوب کئے ہوئے وہ انسانوں کی خدمت کر سکتے ہیں، یا نیک کام کر سکتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ سردار قوم اصلی معنوں میں خادم ہوتا ہے۔ وہ اوس وقت خادم ہو سکتا ہے جبکہ اپنی ضروریات کو محدود اور طریقہ زندگی خادموں کا سا رکھے نہ کہ نام تو خادم ہو اور عیش کی زندگی بسر کرے۔

۷- حضرت عمر کی مثال موجود ہے راتوں پاسبانی کرتے تھے۔ بیوہ عورتوں کا بوجھ اٹھاتے

تھے۔ اونہیں غلہ وغیرہ بازار سے لادیتے تھے۔

۸۔ جسکے دلمیں نیکی کرنیکی اُمنگ یا ولولہ ہے وہ اصلی معنوںمیں نوکر بنجائے، ظاہر اور باطن دونوں میں

۹۔ جو شخص دوسروں سے اپنی ذات کے لئے کام لینے کا عادی ہے وہ دراصل اپنی خواہشوں کا غلام ہے

۱۰۔ جو لوگ جبر سے یا روپیہ دیکر دوسروں سے خدمت لیتے ہیں وہ دراصل اپنی نفرت نوکروں کے دلوں میں جاگزیں کرتے ہیں۔ وہ دلمیں اس سے جلتے ہیں۔ اُسپر رشک کرتے ہیں۔

۱۱۔ عیش پرستی تہذیب کی علامات میں سمجھی جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ زنانہ پن کو عمدہ صفت سمجھتے ہیں۔ اون کا منتہائے نظر یہ ہے کہ ہزاروں انسانوں کی محنت کو بغیر کسی معاوضہ یا بدل کے یا بغیر خود کام کئے صرف کریں۔ یہ بالکل غلط اصول زندگی ہے

۱۲۔ جبتک کہ عیش پرستی کی زندگی ترک نکرے انسان نیک کام نہیں کرسکتا۔

۱۳۔ اچھے انسان کی تعریف یہ ہے کہ دوسروں کو زیادہ دے اور اون سے خود کم لے اسکے برعکس بڑے لوگ ہیں۔

۱۴۔ آجکل کی تہذیب میں لوگوں کا مقصد زندگی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح کھائیں۔ کیا کھائیں۔ کہاں کھائیں۔ کب کھائیں اور کتنا کھائیں۔

۱۵۔ اگر مسلمان تہ دل سے یہ سمجھیں کہ وہ ایک مفلس قوم کے افراد ہیں تو وہ ایک دولتمند قوم کے افراد کی ریس کر کے اسراف کر ہی نہیں سکتے۔ نہ پُر تکلف کھانے کھا سکتے ہیں۔ نہ آرائش کی چیزیں استعمال کرسکتے ہیں۔

۱۶۔ مسلمانوں کی عام حالت یہ ہے کہ جہاں چند احباب ہوتے ہیں وہ دعوت بازی اور پارٹیوں میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ایک قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ اگر کسی جاہل شخص کو کتاب خرید کر دینے اور اوسے سبق دینے یا کسی مریض کی خدمت کرنے میں اُنکا ایک منٹ بھی صرف ہو تو وہ جلسہ بازیوں سے بدرجہا زیادہ مفید ہے۔

اقتباس از فرسٹ اسٹیپ (طفیل احمد)

اصلاحی تجاویز

ذکر میرا مجھسے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

خوشی کی بات ہے کہ اس رسالہ کی ناچیز خدمات پر تنقیدی نگاہیں پڑنے لگیں، قومی خدمت کی یہ بھی ایک زریں سند ہے بعض معزز کرم فرما اور بامذاق معاونین کانفرنس گزٹ کی اصلاح و ترقی کے لئے اکثر تجویزیں تحریراً بھیجتے رہتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے ایک ایک دو دو تجویزوں کا خلاصہ ہر ایک اشاعت میں نکالا جائے تاکہ احباب میں باہم تبادلہ خیالات بھی ہو اور دیگر کرم فرماؤں کو بھی اپنی زریں رائے لکھنے کا موقعہ ملے۔ اخیر پر کثرت رائے سے تجاویز کا فیصلہ ہو جائیگا۔ بجائے اسمائے گرامی لکھنے کے ہم صرف شمارہ لکھیں گے۔

ا۔ (۱) مضامین میں جہاں تک ممکن ہو اختصار نویسی سے کام لیا جائے۔ طویل مضامین کے پڑھنے والے زیادہ نہیں ہوتے۔

(۲) گزٹ کو متعدد حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک حصہ میں مسلمانوں کو عام مسائل تعلیم کی جانب متوجہ کریں۔ ایک میں خالص فن تعلیم پر مختصر مضامین ہوں۔ ایک حصہ میں اسلامیہ مدارس اور کانفرنس کے عملی کاموں کے متعلق اطلاعات شائع ہونی چاہئیں اور یہ کہ سفیر کہاں کہاں اور کیا کام کر رہے ہیں۔

(۳) صغیر سن بچوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے، مغربی ممالک میں بے انتہا کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں کے دلوں۔ دماغوں اور عادتوں وغیرہ کی نشو و نما صحیح اصول پر ہونی چاہئے۔ یہ ایک شاندار نظام ہے۔ گزٹ میں اس پر بھی سنجیدہ مضمون شائع کرنا چاہئیں۔

(۴) ٹائمز کا تعلیمی ضمیمہ اور (ایجوکیشن) یعنی تعلیم نام کا ایک ماہوار رسالہ جو ولایت

سے نکلتے ہیں نیز ہندوستان میں بھی انگریزی میں اکثر تعلیمی رسائل شائع ہوتے ہیں جو اکثر مفید معلومات سے پُر ہوتے ہیں۔ ان میں سے گزٹ کے لئے انتخاب اور اقتباس کرنا چاہیئے۔ مثلاً ڈالٹن پلین وغیرہ (طلبہ سے کام لینے کا ایک خاص طرز ہے کہ جماعت میں سے ہر ایک طالب علم کو اس کی خواہش کے مطابق ایک یا متعدد مضامین کو متعدد حصّوں میں تقسیم کرکے ہر ایک حصّہ کے لئے مدت معین کر دیتے ہیں اور طالب علم ان مضامین کو خود تیار کرکے اُستاد کو مطلع کر دیتا ہے۔ یہ طریقہ مقبول عام نہیں ہے بلکہ چیف کالج لاہور جیسی تعلیم گاہوں میں رائج ہو سکتا ہے چنانچہ رائج ہے۔ بہر حال اس سے اونچے طبقہ کے طلبہ زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اڈیٹر)

۲۔ آپ کے مشن کی تکمیل کے لئے مہینے میں دوبارہ اشاعت ہونی چاہیئے۔ ایسا ماہانہ رسالہ کافی نہیں ہے جس میں آپ ایک ایسے اصول پیش کرتے رہتے ہیں جو بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ جو اصول تعلیم آپ پیش کرتے ہیں ان پر کہیں ہندوستان میں عمل درآمد ہوتا ہے۔ ہماری تعلیم دراصل گورنمنٹ کی پالیسی کے تابع ہے۔ آزاد تعلیم کی ہنوز قدر نہیں۔ رپورٹوں سے اعداد شمار پیش کرکے ان پر نوحہ خوانی بھی کچھ کارآمد نہیں کانفرنس گزٹ اس شان کا ہونا چاہیئے۔ کہ

(۱) ہندوستان کی تمام تعلیمی خبریں اس میں ہوں۔

(۲) چند مختصر نوٹ اور ایک دو عمدہ مضامین بھی درج ہوتے ہیں۔

(۳) مصر۔ ٹرکی اور دیگر بلاد اسلامیہ میں جو تعلیمی مساعی ہوں ان کو آب و تاب کے ساتھ شائع کیا جائے۔

(۴) مختصر صنعتی و حرفتی اسکولوں اور کالجوں کے حالات داخلہ کے قواعد اور اُن کی تعلیم کے فوائد درج ہوں۔

(۵) یورپ کی تعلیمی ترقیات اور علمی تحقیقات کا بھی تذکرہ ہو۔

(۶) ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نتائج شائع ہونے سے دو تین ماہ قبل کالجوں کے حالات وغیرہ لکھے جائیں تاکہ والدین کو اس فیصلہ میں آسانی ہو کہ ہمارا لڑکا کس کالج میں جائے کیا کورس لے اور اس کورس سے اس کی آیندہ زندگی میں کیا فوائد پہونچیں گے۔

(۷) گورنمنٹ سے میونسپلٹیوں میں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے کس طرح امداد حاصل کیجاسکتی ہے۔ مسلمانوں کے کیا خاص رعایتیں ہیں۔

(۸) یونیورسٹیوں اور سررشتہ تعلیم کے جو سرکلر جاری ہوں انکو شائع کیا جائے۔

(۹) کبھی ان لوگوں کی جنھوں نے تعلیم کے متعلق کوئی عملی کام کیا ہو یا کوئی فیاضی کی ہو مختصر سوانح عمری ہو۔

(۱۰) نئی نئی کتابوں پر جو ملک میں شائع ہوتی ہیں ریویو کیا جائے۔ اس طرح ایک عمدہ ذخیرہ کانفرنس آفس میں کتابوں کا ہو جائیگا۔

(۱۱) ۱۲ صفحے کا اخبار قدیم تہذیب الاخلاق کے سائز کا ہو۔ اخبار کسی مشین پریس پر طبع کرائیے یقیناً سستا طبع ہوگا۔ تمام قومی مدارس اور تعلیمی انجمنوں کو مفت دیجئے۔ حامیان تعلیم اس کو بقیمت خریدینگے۔ زیادہ تعداد میں طبع کرائیے اور ایک حصہ مفت تقسیم فرمائیے۔

نوٹ مجوز نمبر۲ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ہم گورنمنٹ کے نظام تعلیم کے موافق نہیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے جس قدر مضمون نکلتے ہیں وہ سب اوّل سے آخر تک سات برس تک کی عمر کے لئے ہیں۔ ہماری مستقل رائے ہے ہے کہ مدرسہ کی باضابطہ تعلیم سات۔ آٹھ برس سے پہلے شروع نہیں کرانی چاہیئے اس وقت تک کی تعلیم و تربیت پر حکومت کا قبضہ نہیں بلکہ والدین کا قابو ہے۔ چنانچہ ان مضامین میں ہمارے مخاطب وہی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مدارس کے اساتذہ کی جانب

روئے سخن ہوتا ہے۔ مگر زیادہ تر گھر کے اتالیق اور ذمہ داران تربیت کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اس رائے سے اتفاق کرنے میں تامل ہے کہ تعلیمی اعداد و شمار پر تبصرہ کرنا لاحاصل ہے جب تک کسی قوم کو یہ نہ بتا دیا جائے کہ ان کی گزشتہ کوششوں کے کیا نتائج ہیں تب تک آئندہ کا نظام عمل صحیح مرتب کرنا ان کے لئے مشکل ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر ایک صوبہ کی تعلیمی کانفرنس اپنے صوبہ کے اعداد و شمار دیکھ کر بعض ایسی اصلاحات کی طرف متوجہ ہو جو ان کے ذہن میں نہیں۔ یہ اس کانفرنس کے مقصد اولین مین داخل ہے۔ کہ اگر ممکن ہو تو ہر ضلع کی اسلامی مکتب کمیٹیوں کو اس ضلع کے تعلیمی نتائج سے آگاہ کر کے اعمال و تجاویز کی ایک کتاب منشوران کو دیجائے۔
اقرأ کتابک۔ کفیٰ بنفسک الیوم حسیبا۔

ایڈیٹر

روزنامہ الامان دہلی

دہلی اگرچہ ہندوستان کا دارالسلطنت اور اُردو زبان کا مرکز ہے، لیکن افسوس کہ اُردو اخبارات و رسائل کی حیثیت سے دہلی کو کبھی مرکزی حیثیت نصیب نہیں ہوئی بلکہ اگر کبھی کوئی عمدہ اخبار وہاں سے جاری ہوا بھی تو چند روز سے زیادہ نہ چل سکا، برخلاف اسکے لاہور کو کثرت اخبارات کے لحاظ سے مدت سے ایک ممتاز درجہ حاصل ہے، لیکن بدقسمتی سے وہاں کے اخبارات زیادہ تر اپنا وقت ذاتی منافشات میں برباد کرتے اور باہم دست وگریباں رہتے ہیں۔

اس بنا پر مدت سے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ دہلی سے ایک مہذب روزانہ اسلامی اخبار جاری ہو، جو دہلی اور پنجاب کے غیر مسلم روزانہ اخبارات کے حملوں کا جواب دیتا رہے اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کے لئے سعی کرے۔

ہم کو یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ اخبار "الامان" نے اس ضرورت کو پورا کر دیا یہ اخبار ہفتہ میں دوبار دہلی سے شائع ہوتا تھا اب جولائی سے روزانہ ہو گیا، اسکے ایڈیٹر دیوبند کے ایک فارغ التحصیل فاضل مولوی مظہر الدین صاحب ہیں، جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے ایک خاص ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ الامان میں علاوہ دوسرے مفید مضامین کے زیادہ تر فتنۂ ارتداد کے متعلق بحث کی جاتی ہے، اور آریہ اخبارات کے حملوں کا مہذب و مدلل طریقے سے جواب دیا جاتا ہے۔

تقطیع شاندار، طرز تحریر مہذب، لیکن لطیف ظرافت اور انشا پردازی سے خالی نہیں لکھائی۔ چھپائی صاف قیمت ۱۲ سالانہ جو نہایت مناسب ہے، امید ہے کہ اخبار کو حسن قبول نصیب ہوگا۔

اکرام اللہ خاں ندوی

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰×۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپے گا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف تین روپیہ مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھیجنا چاہیے اور منی آرڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کر دیجائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے۔ ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین پر بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شایع ہوسکتے ہیں، اجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ ہونا چاہیے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

جلد [illegible] — رجسٹرڈ نمبر اے ۲۸ — اگست سنہ ۱۹۲۳ء
نمبر ۸ — محرم سنہ ۱۳۴۲ھ

کانفرنس گزٹ

یعنے

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

جس میں

مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصول تعلیم، نظام تعلیم مروجہ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر تنقید کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبد السلام
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہو کر
صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ سے شائع ہوا

فہرست مضامین

عنوان	محرر	صفحات
۱- شذرات	اڈیٹوریل	۱ - ۸
قوم کو مبارک -		۱ - ۲
جوانان سعادتمند		۲ - ۳
ٹریننگ کا نصاب اور سرسری نظر -		۳ - ۴
مشورہ		۴ - ۵
مغربی تعلیم کا مقصد اور اخلاقی تنزل -		۵ - ۷
عجیب منطق -		۷
خورش امریکہ -		۸
۲- مقالات		۹-۵۲
ہندوستانی زبان اور رسم الخط -	مولانا ابوالحسنات قریشی	۹-۲۵
جسمانی پیمائش	مولوی حامد علی صدیقی	۲۶-۳۰
مسئلہ تعلیم پر تنقیحات	سید شہنشاہ حسین رضوی بی اے (علیگ)	۳۱-۳۵
ابتدائی تعلیم اور مشکلات عظیم	خادم التعلیم	۳۶ - ۴۱
ڈسپلن کی لفظی اور معنوی تاریخ -	مولوی حامد علی صدیقی	۴۲-۵۱
معائنہ والتماس	از جائنٹ سکرٹری	۵۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

قوم کو مبارک! کہ اُسے اپنے جہاد بالمال کا اجر ملنے لگا اور اس کی حسن سعی روز بروز مشکور ہونے لگی۔ بحمد اللہ کہ امسال مسلم یونیورسٹی میں تیسرے کالج کا اضافہ ہوا یعنی علوم وفنون اور قانون کے ساتھ ٹریننگ کالج اور بڑھا ہیں پکی امید ہے کہ ٹکنکل کالج کے افتتاح کی خوشخبری بھی عنقریب دیجائیگی۔

اس جدید اضافہ کی خبر شائع ہوتے ہی ملک کے اطراف سے نوجوان ٹوٹ پڑے کونے کونے سے بیشمار درخواستیں موصول ہوئیں جن میں ایک بہت بڑی تعداد میں امیدوار خود آپہنچے۔ مگر افسوس ہے کہ امدادی وظائف اور مکانیت کی قلت سے اکثر دور دور کے طلبہ کو ناکام واپس جانا پڑا۔ حالانکہ دھرڈیوٹی نے اپنے مقدور سے بہت زیادہ کے اور کانفرنس نے بموجب منظوری تین ہزار روپیہ کے وظائف دیے۔ نیز دیگر ذرائع سے بھی بہت سی قوم کی امداد ملی۔

اُدھر یونیورسٹی کے قرب وجوار میں ایک بھی غیر عمارت مکان یا بنگلہ خالی نہیں چھوڑا

گیا پھر بھی جدید کالج میں دلی خواہش کم طلبہ کا داخلہ ممکن ہوا۔ اس کے علاوہ دونوں اسکولوں میں جن میں ایک یونیورسٹی سے ایک دوسرا کالج سے ملحق ہے۔ پھر خود یونیورسٹی اور قانونی اور انٹرسیڈیٹ کالج میں بمقابلہ سال گذشتہ کثیر التعداد نئے طلبہ داخل ہوئے اس کثرت سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں یہ کہ قوم کو تعلیم کی کسقدر احتیاج ہے۔ پھر یہ کہ مفید پیشوں کی تعلیم کی خواہش روز بروز کتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے پھر یہ کہ قوم کو اپنی تعلیم گاہ میں جو جائز حقوق و مراعات اور آسائش و سہولت حاصل ہے وہ اور کہیں میسر نہیں۔ حقیقت میں یہ گویا مسلم یونیورسٹی کی حسن خدمات کا اعتراف ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کو ترعلوم کے متقدم اور متواخر بانیوں نے قوم سے شروع میں جو وعدے کیے تھے وہ اب پورے ہوتے جاتے ہیں۔

جوانان سعادتمند ٹریننگ کالج کے طلبہ سے ہماری التجا ہے کہ آج جس فن کو سیکھنے کے لیے اُنھوں نے مسلم یونیورسٹی سے رجوع کیا ہے وہ ایک خالص اسلامی فن اور مسلمانی خدمت ہے یعنی تبلیغ علم۔ علم الابدان ہو یا علم الادیان۔ سب علوم ہیں۔ اور علوم کیا ہیں! فطرت اللہ کی نشانیاں ہیں۔ انمول موتی ہیں جو عام جوہری بازار میں نہیں ملتے۔ اصل میں دنیا کی متاع ان کی بہت تھوڑی قیمت ہے۔

ولا تشتروا بآیت اللہ ثمنا قلیلا

(خدا کی نشانیوں کو سستا نہ بیچو۔)

یہ حکم بیع اور شریٰ دونوں پر حاوی ہے۔ فن تعلیم و تبلیغ کو سستا بیچنے کی نیت سے حاصل کرنا اچھا نہیں۔ اس جنس کا معاوضہ عظمت ہے۔ قبول عام ہے۔ نفس مطمئنہ ہے۔ فنون و علوم عامہ کے سند یافتہ کی نظر بھاری مشاہروں پر ہے۔ انجنیرنگ کے کاملین کو بیش بہا معاوضوں کی توقع ہے قانون کے فاضل کثیر محنتانوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ لیکن ٹریننگ کے گریجویٹ کے تمام اکتسابات قوم و ملت کے لیے خالصتہ اللہ ہیں۔ ہندوستان

بھر کی قوموں میں ان کی قوم تعلیم میں سب سے پیچھے ہے اور کم استطاعی میں سب سے آگے ہے۔ پھر کیا یہ زیبا ہوگا کہ اس قوم کے نوجوان جہاد بالنفس سے بجکر روپیہ پیدا کرنے کے لیے فن تبلیغ سیکھیں جبکہ ان کے لاکھوں برادران ملت جہالت کی تیرگی و تاریکی میں سرگرداں ہوں۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند جوانان سعادتمند پند پیر دانا را

ٹریننگ کا نصاب

جدید ٹریننگ کالج کا نصاب مرتب کرنے میں ذمہ دار جماعت کو مشورہ دینا گو فن صحافت کی حد سے باہر نہیں مگر کسی قدر قبل از وقت ضرور ہے۔ ابھی سکوت سے دیکھنا مناسب ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں کیا خصوصیت ہے پھر بھی ہم اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اگر اس مہم میں ملک کی اور ہمچشم اور ہمسر یونیورسٹیوں کی مثلاً الہ آباد۔ بنارس وغیرہ کی خواہ مخواہ تقلید نہ کی جائے تو اچھا ہے۔ تقلید ہمیشہ نا قابلیت کا انجام ہے اور ذہنی غلامی کا آغاز ہے جسے قومی جذبات کی ابدی موت کہیں تو زیبا ہے۔ کانفرنس کے تعلیمی کتب خانہ کی الماریاں فن تعلیم کی بیش بہا کتابوں سے معمور ہیں ایک سے ایک اعلیٰ تصنیف ہے۔ پھر ایک جدید ذخیرہ کتب جو اس صدی کے ربع اول کی تحقیقات پر محیط ہے عنقریب ولایت سے آنیوالا ہے۔ کیوں نہ اس ذخیرہ سے نصاب کے لیے انتخاب کیا جائے۔ الہ آباد کا مطمح نظر اور اصول معیار اور ہے اور مسلم یونیورسٹی کے کلیات و مسلمات دوسرے ہیں۔ موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود بیدرست کہ اغیار کے نصاب پر ہمیں تنقیدی نگاہ ضرور ڈالنی چاہیے مگر تقلیدی نظر سے قطعاً نہیں دیکھنا چاہیے۔ اقتدا میں وہ شان نہیں جو امامت میں ہے جس جماعت نے کلکتہ اور الہ آباد کے نصابات مرتب کیے کیا ہم اُن جیسا دماغ نہیں رکھتے؟

سرسری نظر

ایف۔ پی گریوز کی ممتاز تصنیف گریٹ ایجوکیٹرز آف تھری سینچریز (تین صدی کے ممتاز ماہران تعلیم) ایک موزوں انتخاب ہے

مگر کتاب میں بجائے خود یہ کمی ہے کہ جان جاک روسو کو ماہرین کے زمرہ میں شمار کرنا اور الفونس اسکروز کو چھوڑ دینا وسعت نظری پر دلالت نہیں کرتا دونوں فرانسیسی عالم تھے۔ دونوں نے "امیل" کے نام سے کتابیں لکھکر اس فن میں نفیس اضافہ کیا پہلے نے اٹھارہویں صدی کا امیل اور دوسرے نے "انیسویں صدی کا امیل" لکھا ہر ایک نے امیل نامی ایک فرضی بچہ کی تربیت وتعلیم کے پیرایہ میں اپنے اپنے زمانہ کے تعلیمی اصول وضوابط پیش کیے ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ انیسویں صدی کا امیل پہلے سے زیادہ مکمل تصنیف ہے۔ اس میں جدید تعلیمی ضرورتوں کا کوئی باب نہیں چھوڑا گیا۔

مشورہ اسی طرح نصاب کی اور کتابیں بھی حسن انتخاب کے خط سے باہر نہیں مگر فی الجملہ ان کتابوں سے زیادہ سے زیادہ صرف اتنا سبق ملتا ہے کہ طلبہ کو کیا کیا پڑھائیں کس کس طرح اور کتنا کتنا اور کہاں کہاں پڑھائیں۔ پہلے اساتذہ کی کیا روش تھی اور اب کیا ہونی چاہیے۔ حالانکہ اصلی نکتہ یہ ہے کہ جنکو پڑھایا جائے وہ کیا ہیں۔ ان کی اصل وحقیقت خواص وعوارض اور لوازم کیا ہیں فطرۃ اللہ نے انھیں ارتقائے عالم میں کونسا درجہ دیا ہے؟ اور دنیا کی ہستیوں کے سلسلہ کے لحاظ سے ان کے ماضی کی تاریخ کیا ہے؟ انکے جسم اور دماغ کے نشو ونما میں کیا نقائص ہیں؟ اور وہ نقائص کس طرح رفتہ رفتہ دور ہو کر بچے وحوش کے درجہ سے نکل کر انسان کے درجہ میں داخل ہوتے ہیں؟ حقیقت میں بچوں کے نفسیات کے تمام مباحث ومسائل اسی پر مبنی ہیں۔ جہانتک ہمیں علم ہے ایسی کتابیں موجود ہیں کہ اگر طلبہ کو ان میں سے کسی ایک پر عبور ہو جائے اور وہ عملی زندگی میں بھی اس صنف کے مطالعہ کے ذریعہ سے اپنی معلومات کو تازہ اور وسیع کرتے رہیں تو یقیناً ان کے زمرہ سے بعض اسقدر بلند پایہ اور ممتاز افراد نکلیں گے کہ گریو۔ ایڈ منز اور رن کی طرح خود کتابیں لکھ کر اس فن کے ائمہ میں شمار ہوں۔ مگر اس عظمت کی بنیاد

کالج کے اساتذہ کو آج قائم کرنی چاہیے۔ نیک آغاز۔ نیک انجام

مغربی تعلیم کا مقصد

جہانتک پرانی تعلیمی دستاویزات دیکھنے سے واضح ہوتا ہے جدید تعلیم سے یہ غرض تھی کہ ہندستانیوں میں جو بعض نہایت ادنیٰ درجہ کے اخلاقی ذمائم پیدا ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں چنانچہ سر چارلس وُڈ نے جو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ہندوستان میں بورڈ اف کنٹرول کے پریزیڈنٹ تھے سب سے پہلے تعلیمی مراسلہ میں اسی بنا پر زیادہ زور دیا تھا۔ ان اخلاقی ذمائم کو مسٹر گرانٹ نامی ایک صاحبِ دل انگریز نے جو کورٹ اف ڈائرکٹرز کے ممتاز اراکین میں سے تھے ۱۷۹۲ء میں ایک مفصل اور مبسوط رسالہ کی صورت میں لکھ کر کورٹ میں پیش کیا تھا۔ بعدہٗ ۱۸۳۲ء میں یہ چھپکر شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شکایت کی گئی ہے کہ "ہندوستان کے لوگوں میں اخلاقی فرض کا بہت ہی کم احساس ہے وہ حق الامر کی کچھ پرواہ نہیں کرتے بلکہ وحشیانہ جذبات کے محکوم ہیں" اس سلسلہ کے اختتام پر لکھا ہے کہ یہ "دراصل اخلاقی برائیوں کے نتائج ہیں جن کی اصلاح ممکن ہے" (فٹ نوٹ دیکھو سید محمود مرحوم کا لکچر متعلقہ روداد کانفرنس دسمبر ۱۸۹۲ء) یہ غالباً اسی تحریر کا نتیجہ تھا کہ سر چارلس نے اپنے مراسلہ میں اور پارلیمنٹ نے آخری فیصلہ میں مغربی تعلیم کو ہندوستانیوں کا ذریعہ اصلاح قرار دیا۔ مسٹر گرانٹ کی تحریر کا ایک فقرہ حسب ذیل ہے۔

"جو چیز اہل ہند کو اول سکھانی چاہیے اور جو باقی اور چیزوں کے سکھانے کا ذریعہ ہو گی وہ یقیناً انگریزی زبان ہے۔ یہی وہ کنجی ہے جو اُن پر دُنیا بھر کے نئے خیالات کے دروازے کھول دیگی اور صرف مصلحت ملکی نے ہم کو اسوقت تک انکے ہاتھ میں یہ کنجی دینے سے روکا تھا۔ مگر اب اُس کے دینے کا وقت آگیا ہے"

مسٹر گرانٹ اور ان کے معاصرین کے خیالات میں کہانتک واقعیت تھی ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں نہ اس سے کچھ سروکار ہے کہ اس خیال کا مبدء حقیقت میں جذبہ ترحم

تھا یا سیاسی مصلحت۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ تعلیم جدید کا مقصد اولین اخلاقی اصلاح تھی۔ جہاں تک کلکتہ یونیورسٹی کا ابتدائی نصاب دیکھا جاتا ہے اور ثانوی و اعلیٰ مدارج تعلیم کے ذخیرہ پر نظر ڈالی جاتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کے غالباً چھٹے ساتویں عشرہ تک یہ وعدہ پورا ہوا۔ گاری بالڈی اور واشنگٹن جیسے ممتاز افراد کی سوانح عمریاں سیمول وغیرہ ماہران علم الاخلاق کی تصانیف۔ نصاب میں جا بجا چمکتی ہیں۔ مگر بدنصیبی سے یہ نیت زیادہ دنوں قائم نہ رہی اور ہندوستانیوں کی تعلیم کی مسل رفاہ عام کی الماری سے نکل کر ڈپلومیسی کے بکس میں بند ہو گئی۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اخلاقی ذمائم کی تفصیل میں جو کچھ مسٹر گرانٹ کے قلم سے رہ گیا تھا وہ اب آتشیں حروف میں ابھر آیا ہے۔ یعنی جس طرح اب سے ہزارہا برس پہلے پیغمبر دانیال نے اہل بابل و نینوا کی زبون اخلاقی حالت دیکھ کر عبرانی زبان میں تنبیہ کی تھی کہ "مینی مینی ٹیکل یو فرسین" اسی طرح آج زمانہ اہل ہند کو اس کا ترجمہ اُردو میں سُنا رہا ہے کہ "تم بار بار ترازو میں تولے گئے مگر کم وزن پائے گئے"۔

اخلاقی تنزل

آج بیسویں صدی کے ربع اول پر پہونچ کر جب ہم زمانہ کی بلندی سے نظر ڈالتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی مقاصد مرکز سے اتنا گر گئے کہ زندگی کی چند ادنیٰ اور حقیر ضرورتوں کے سوا تمام اعلیٰ برگزیدہ صفات قطعاً نظر انداز ہیں۔ نہ وسعت نظری پیدا ہوتی ہے۔ نہ احساس فرض اور نہ دل میں اصلی ذمہ داری اور جوابدہی کی لگن ہے۔ آج اعلیٰ تعلیم و تربیت کا مطمح نظر کیا ہے؟ محض ایسے نوجوان طیار کرنا جنکے "دل خالی۔ دماغ خالی۔ پیٹ کے بیچ میں ایک نقطہ" اس مقصد کے لیے انہیں کچھ ایجاد بندہ افسوں۔ عزیمت اور کچھ منتر از بر کرا دیے جاتے ہیں کہ انکے زور سے سائنس کے جنات اور چند مادی ہستیوں اور قوتوں کے موکل ان کے تابع ہو جائیں پھر وہ الف لیلیٰ کا الہ دین بنجائیں۔ پھر تن آسانی اور عیش پرستی کا سامان فراہم کرلیں گویا علم الحیات کا یہی تمغہ ہے اور دنیاوی زندگی کا مقصد اولین بھی یہی ہے۔ ممکن ہے

یہ عقائد صحیح ہوں لیکن اس علمی تعلیم سے دماغ میں متصورہ اور متخیلہ کبھی نہیں اُبھرتے۔ نہ وہ ملکوتی طاقت پیدا ہوتی ہے جو عقیدہ باطنی سے موسوم ہے۔ غور سے دیکھیے تو اعلیٰ اخلاقی صفات بھی اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے علوم و معارف کی تبلیغ کا مرکزی کام عقائد آفرینی۔ عقائد پروری اور اس اعلیٰ خیال کو زندہ کرنا ہے جس نے وحید العصر افراد میں حلول کرکے دنیا کی تاریخ کے تقریباً ہر دور کو بدل دیا ہے۔ مگر ادنیٰ سے اعلیٰ مدارج تک کے نصابات کو دقیق نظر سے دیکھنے پر بھی کوئی کتاب ایسی نہ ملیگی جس سے اخلاقی اصلاح مقصود بالذات ہو۔ اور اگر کہیں ضمناً ایسے اسباق ہونگے تو طوطے کی طرح از بر کرائے جاتے ہیں۔ اس پست تعلیم کا نتیجہ صاف ظاہر ہے ہم احساس فرض سے بہت ہی کم لذت آشنا ہیں۔ کاروبار کے کسی مرکز پر جاکر بغور مطالعہ کیجیے بمشکل کہیں ایسے کام کرنیوالے ملیں گے جن کے اعمال قول کے مطابق اور قول عقائد کے مطابق ہونگے یا اپنے خدمات مفوضہ کو امور معہودہ سمجھ کر تہ دل سے انجام دیتے ہیں ایک استبدادی قوت کے بجائے اپنے فرض کی غلامی کرتے ہیں یا خشک اور بیجان ضابطہ کے بجائے اپنے ضمیر کے مطابق متابعت کرتے ہیں۔ قومی مرکز ہوں یا سرکاری وغیر سرکاری ہوں جہاں کہیں تنقیدی نظر ڈالتے ہیں کام کرنے والوں کو ادنیٰ ہی قسم کے جذبات سے متاثر پاتے ہیں۔ کہیں ایک رب دنیاوی کو خوش کرنے کے لیے یا سزا و جزا کی بیم و امید میں کام ہوتا ہے کہیں نام و نمود اور ذکر خیر کرانے کے لیے سرگرمی دکھائی جاتی ہے۔ گردوں میں خال خال ایسے افراد نظر آئینگے جن کے دل میں یہ جذبہ نسبتاً کم ہوگا۔ یا وہ بھلائی برائی سے مستغنی ہوکر سکوت کے ساتھ اپنا کام کرتے ہونگے۔

عجیب منطق

قاعدہ ہے کہ زندگی کے عام حالات اور شرائط کے ساتھ قواعد و ضوابط بھی ترقی کرتے جاتے ہیں۔ مگر صوبہ متحدہ کے سررشتہ تعلیم نے اپنے کوڈ (قواعد) کی ترمیم امسال عجب شان سے کی ہے یعنی مدارس میں جسمانی ورزش کے اوقات

گھٹا دیا ہے بعض مدارج کے نقشہ ضبط اوقات میں جسمانی ورزش کے لیے روزانہ وقت دینے کے بجائے ہفتہ وار وقت دیا گیا ہے۔ ہم اس کا صغریٰ وکبریٰ سمجھنے سے بالکل معذور ہیں۔ ورزش کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ دماغی محنت سے جس قدر رطوبت تحلیل ہو وہ ورزش سے پوری ہو جائے یہاں اس طول بحث کا موقع نہیں کہ قوائے ذہنیہ اور جسمانی طاقت میں کیا تعلق ہے؟ لیکن اس مسلہ کو بغیر چون وچرا مان لینا چاہیے کہ زندگی کا کوئی شغل وعمل جسمانی قوت کے مدد بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ کیا کوڈ کی ترمیم کا یہ منشا ہے کہ ہفتہ بھر تک دماغ کی تحلیل شدہ طاقتیں اس انتظار میں کسی نامعلوم مقام کے اندر جمع رہیں گی کہ آٹھویں دن طلبہ کھیل کود کر اس کمی کو جسمانی ورزش سے پورا کریں۔ عجب منطق ہے!

خواتین امریکہ نے چالیس لاکھ روپیہ بذریعہ چندہ اس مقصد کے لیے فراہم کیا ہے کہ اس سے مشرق میں زنانہ کالج کھولکر خواتین مشرق کو جہالت کی تاریکی سے نکالیں۔ اس سے سات کالج قائم کیے جائینگے جن میں سے تین ہندوستان میں ہونگے۔ کیا دنیا کی اور کوئی قوم اس گہرے خلوص اور بے لوث خدمت انسانی کی مثال پیش کر سکتی ہے۔ یہ علم کی سچی پرورش اور پرستش۔ جہالت ہی کی وسیع اور عمیق خلیج ہے جو مشرق کو مغرب سے جدا کرتی ہے۔ اسی نے روح انسانی کو کشمکش میں ڈال رکھا ہے۔ یہی اپنے دونوں جانب خون کے ندی نالے بہاتی ہے! درعقول عزیزیہ کو حیوانی جذبات میں مبدل کر کے سرسبز اور آباد سرزمینوں کو وحشت انگیز بیابان بنا دیتی ہے۔ امریکہ نے یہ سبق پچھلے جنگ سے لیا ہے اور اب وہ یہ سبق بیجان لفظوں میں نہیں بلکہ اعمال کی جیتی جاگتی تصویروں میں دنیا کو اس طرح پڑھانا چاہتا ہے کہ وہ پھر اسے کبھی نہ بھولے ایک ہم ہیں کہ مذہبی اکھاڑے اور قومی دنگل جما کر دن رات وحشیانہ جذبات کو لڑاتے رہتے ہیں۔ کہنے کو تو ہم اپنے اپنے ابنائے ملت کو ترور عقیدت دکھاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ دنیا کو اپنا تماشہ آپ دکھاتے ہیں۔ کبھی چھپکر دیکھیے تو معلوم ہو کہ اہل ہزل ومسخریت پر اغیار اپنے ڈرائنگ روم میں کس زور کے قہقہے لگاتے ہیں۔

حزیں افسانہ ام آید بہ طبع زاہدان سنگین ؂ بگوشِ کعبہ جویان نالۂ ناقوس رہا نم

مقالات

ہندوستانی زبان

اور

رسم الخط

علمی تحقیق و تدقیق کا شوق و شغب کچھ تو پہلے ہی سے ملک میں نہ ہونے کے برابر تھا اب سیاسی ہیجان کی وجہ سے جو کچھ تھا وہ بھی نہیں رہا۔ دنیائے خیال ہی بدل گئی۔ عقل کے بجائے جوش کا غلبہ ہے السنہ مشرقیہ کی تحقیق و تدقیق کے لئے ہندوستان سے بہتر تمام ایشیا میں کوئی خطہ نہیں ہے۔ طرح طرح کی زبانیں بولی جاتی ہیں اور سینکڑوں لب و لہجے مروج ہیں ایک حدود ارضی کو قدرت محدود نہیں کرتی مگر سرحد کے قریب ہو کر اس کی زبان بدلنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ملحقہ علاقہ کی بولی شروع ہو جاتی ہے جو لب و لہجہ میں اس سے مختلف اور دوسری زبان سمجھی جاتی ہے حالانکہ یہ علم الالسنہ کے مسلمات کے خلاف ہے۔ جیسا کہ آیندہ واضح ہوگا۔ بہرحال ہندوستان اس شاخ علم کی تحقیق و تدوین کے لئے خاص میدان ہے یہی یہ بھی ہے کہ یہاں کے علما کی شہرت قدیم صرفیوں اور نحویوں کے ذریعہ سے کبھی قائم ہوئی تھی۔ سنسکرت کی گریمر کے بعض مسائل ایک خاص شان رکھتے ہیں جو اور السنہ قدیمہ میں نہیں

انگریز عالم کی رائے

مگر جیسا کہ سر ہربرٹ رزلی۔ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک موقع پر لکھا ہے در آج اس قدر پژمردگی چھائی ہوئی ہے کہ اچھے تعلیم یافتہ کو بھی زبان لب و لہجے اور طرز ادا میں تمیز نہیں۔ یعنی ویسے تو لب و لہجہ کو وہ خوب سمجھتے ہیں تلفظ یا آواز میں بال برابر فرق بھی ہو تو فوراً بتا دینگے کہ یہ اُردو نہیں بلکہ ہندی ہے لیکن ان میں یہ قابلیت نہیں کہ ایک ہی زبان کے مختلف لہجوں کو انداز بیان اور طرز ادا کو

سمجھیں انکے الفاظ ومعانی کی باہم مشارکت کو دیکھکر نتیجہ نکالیں کہ یہ ایک ہی زبان کے متعدد لب ولہجے ہیں۔ خود انگریزی زبان کے ہی دو الگ الگ ولہجے ہیں۔ سومرسٹ شائر اور یورک شائر لہجہ مگر زبان انگریزی ہی ہے۔ انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ علم الالسنہ کی حدود و تعریفات کی رو سے ہندوستان میں کل پانچ جڑ کی زبانیں مانی جاتی ہیں انہی میں ایک ہندوستانی زبان بھی ہے جس کو مسلمان اُردو اور ہندو ہندی کہتے ہیں۔ یہ فرق بھی صرف رسم الخط کی وجہ سے ہے ورنہ دونوں ایک ہی ہیں صرف لب ولہجہ یا زیادہ سے زیادہ طرز ادا الگ الگ ہیں۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو اہل ہند میں کوئی علمی احساس نہیں۔ البتہ انگریزوں کو بہت شوق ہے السنہ ہند کی تحقیق پر انہوں نے ہزاروں صفحے لکھ ڈالے اور اخیر پر برطانیہ اور ہندوستان کی حکومتوں نے باہم ملکر ایک ممتاز عالم سر جارج گریرسن کی معرفت ہندوستان کی زبانوں کی تحقیق اس شان سے کرائی کہ دس گیارہ جلدیں لائبریری میں موجود ہیں۔

ہندوستانی زبان ہندوستان کی دو مستقل حیثیتیں ہیں یعنی ایک خاص حدود ارضی کے باشندوں کی عام بول چال کی زبان بھی ہے اور مقامی زبان بھی۔ حدود ارضی سے مراد شمالی ہند ہے۔ جہاں سرحد سے لیکر حدود بنگالہ تک یہی زبان عام اور خاص طور پر بولی جاتی ہے ان حدود سے نکلکر بنگالہ سے برما تک اور راودھر سندھ اور ٹراونکور تک جس قدر خطے ہیں اُسی قدر مقامی زبانیں ہیں۔ مگر ہندوستانی اور اسکی جا مکی ہندی وغیرہ شاخوں کے بطور زبان ثانی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ملک کے تمامتر شمالی حصہ میں اسکے مختلف لب ولہجے ہیں۔ لہٰذا معہ جاٹکی۔ ہندکی وغیرہ شاخوں کے پنجابی۔ شرقی ہندی۔ غربی ہندی جسکی راج شاہی۔ نماری۔ مالوی شاخیں ہیں اسی طرح بہاری زبان اور اس کی شاخیں ماگہی میتھلی۔ بھوجپوری اسکے علاوہ برج بھاشا۔ بریانی یا بانگرو۔ قنوجی بندیلی۔ اودھی بگھیلی وغیرہ سب محض لب ولہجے ہیں۔ مگر علم الالسنہ کی اصطلاح میں زبان

وہی ایک ہے یعنی ہندوستانی۔

علم الالسنہ کے مسلمات

اس قضیہ میں علم الالسنہ کے حسب ذیل اصول و مسلمات قابل لحاظ ہیں اور یقیناً انہی مسلمات کے عمل سے ہندوستانی زبان وضع ہوئی۔

(۱) اگر چند اشخاص مختلف زبانیں بولنے والے ایک جگہ باہم ملکر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی دردگی دوا اور ضروریات کے کفیل ہیں تو امتداد زمانہ کے ساتھ انکی مختلف زبانوں سے ایک مشترک زبان نکل آئیگی۔

(۲) اگر کسی خطے کی حد بندی قدرت نے نمایاں طور پر کردی ہے تو اس خطے کے باشندوں کی ایک زبان ہوگی جو بیرون حدود کے باشندوں سے مختلف ہوگی۔

(۳) اگر کسی ملک یا حصہ ملک میں مختلف فرقے آباد اور الگ الگ زبانیں بولتے ہوں مگر سیاسی اغراض اور دل و دماغ کی نوعیت میں مشترک ہوں تو ان کا اختلاف زبانی معدوم ہوکر خود بخود بول چال کی ایک زبان پیدا ہو جائیگی۔

(۴) اگر کسی سرزمین کے باشندوں کا طرز خیال مساوی ہو تو اظہار خیال و مافی الضمیر کا طریقہ بھی ایک ہوگا۔ لہذا زبان بھی مشترک ہوگی۔

(۵) ایک نظام حکومت کے ماتحت تمام اقوام و ملل کی زبان ایک ہوگی۔

مثلاً برطانیہ کا موجودہ نظام حکومت قائم ہونے سے پہلے ملک میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ اینگلوسیکسن۔ ولندیزی۔ ویلزی۔ برطانوی۔ گالی۔ ارسی۔ نارمن۔ فرانسیسی مگر موجودہ نظام حکومت کے ماتحت ہوکر رفتہ رفتہ سب ایک زبان انگریزی بولنے لگے یہاں ایک یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ آئرلینڈ۔ ویلز۔ اسکاٹ لینڈ میں قدیم مقامی زبانیں اب تک کیوں شدت سے رائج ہیں اس کی وجہ صاف ہے انگلستان اور ان ممالک کے باشندوں کے نفسیات اور سیاسیات ایک نہیں۔ ملک کی طبعی خصوصیات بھی

مختلف ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اُنکے عادات وخصائل۔ طرزِ خیال اور ذہنی معتقدات انگریزوں سے الگ ہیں۔ آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ نے انگریزی نظام حکومت کو کبھی تہ دل سے پسند نہیں کیا ہمیشہ کشمکش رہی جسکا نتیجہ آج آئرلینڈ میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اسکاٹ لینڈ اور ویلز میں بھی اپنے اپنے وقت پر ہوگا اور برطانیہ کے موجودہ نظام حکومت پر لامرزیت کا قانون جاری ہوکے رہیگا۔ اختلاف کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ آئرلینڈ اور انگلستان کے بیچ میں قدرت نے ایک نمایاں حد یعنی آبی فصیل قائم کردی ہے اسی طرح اسکاٹلینڈ اور ویلز کو اونچے اونچے پہاڑوں نے بیچ میں حائل ہوکر انگلستان سے جدا کردیا ہے۔ پھر اگر ان ملکوں کے باشندوں نے انگریزی زبان کو اپنے گھروں میں نہیں گھسنے دیا تو کچھہ تعجب نہیں۔ مگر شمالی ہند میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کی تفصیل نمبر ۱ تا ۵ مندرجہ بالا میں کی گئی ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اس خطے میں دو دو زبانیں رائج کرنا مسلمات علمیہ اور وضع فطرت کے سراسر خلاف ہے۔

(۶) اسکے علاوہ چند اور مسلمات بھی زبان کی حمایت کرتے ہیں۔ مثلاً جب چند مختلف زبانوں کا یا ایک زبان کے متعدد لب ولہجوں کا میلان اتحاد کی جانب ہو تو لٹریچر ہمیشہ بہت بڑی مدد دیتا ہے۔ جدید زبان کو جو ان زبانوں سے مشتق ہوئی ہے۔ خوشنما قالب میں ڈھالتا ہے۔ ایک عام معیار انشا پردازی قائم کرکے ممتاز اہل قلم کو اس کی متابعت پر مجبور کرتا ہے۔ ساتھ ساتھ زبان بھی شستہ ہوتی جاتی ہے۔ قواعد صرف و نحو کی تکمیل بھی اسی سے ہوتی ہے۔ ذخیرہ الفاظ اور زبان کی توسیع کو بھی مدد ملتی ہے پرانے لفظ متروک اور نئے وضع ہوتے جاتے ہیں۔ کچھہ غیر زبانوں سے الفاظ اور مثال بجنسہ یا ترمیم کے بعد داخل ہوتے ہیں غیر زبانوں کے مفاہیم کے لیے نئے الفاظ اپنی زبان میں وضع کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی کو دیکھیے کہ گو لاطینی اور یونانی سے پہلے ہی سے بہت مالامال تھی پھر بھی آجکل انگریزی الفاظ اس کثرت سے جذب کررہی ہے

کہ اندازہ کرنا مشکل ہے۔ با ایں ہمہ لٹریچر کی حکومت محض قلم پر ہوتی ہے عام تلفظ زبان اس سے بہت کم متاثر ہوتا ہے۔ بجز اس کے کہ نظم تلفظ پر وزن اور قافیہ کے ذریعہ سے کچھ اثر ڈالتی ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تلفظ کے اختلاف سے زبان بہت سے لب و لہجوں پر منقسم ہو جاتی ہے جیسے کہ ہندوستانی زبان کا حال ہے کہ تمام شمالی حصے میں وضع وضع پر بولی جاتی ہے۔

(۷) لٹریچر میں ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اپنا معیار ہمیشہ کے لئے ایک ہی دفعہ قائم نہیں کرتا بلکہ اس میں وقتاً فوقتاً تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اور گو فی الاصل کوئی انقلاب نہیں ہوتا مگر فروع میں جلد جلد نمایاں اصلاحیں ہمیشہ ہوا کرتی ہیں جیسے کوئی دریا راستے میں جا بجا پیچ و خم کھاتا ہے، کہیں سست اور کہیں تیز بہتا ہے مگر عام روانی اپنا رُخ نہیں بدلتی۔

ہندی کے خدمات

اگر ہندوستانی زبان کو قومیت اور مذہب کی بندشوں سے آزاد کر کے دیکھیں تو اُن میں تمام خصوصیات مندرجہ بالا موجود ہیں اور پھر یہ دیکھیں کہ ہندی اُردو نے باہم ملکر ہندوستانی لٹریچر کو کس بلندی پر پہونچایا تو یہ قضیہ بہت آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ ہندی کے کسی لب و لہجہ میں یا شاخ میں۔ شرقی ہو یا غربی یا اور کوئی نثر کا ذخیرہ اس قدر کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے حسن کلام بہت کم ہے۔ نہ کلام میں زور ہے صرف ایک ہرشچندر اس درجہ کی تصنیف ہے کہ اُس پر ادیبوں کی نظریں ٹھیرتی ہیں۔ دوسری طرف نظم کو دیکھیے اگر اوزان و قوافی وغیرہ کے نکتوں کو قطعاً نظر انداز کر دیں اور علم عروض کا نام تک نہ لیں تو اس صنف میں کافی ذخیرہ ملیگا۔ مگر اس کا دامن بھی قدیم لٹریچر سے بندھا ہوا ہے۔ جدت طرازی کہیں نہیں ترجمانی ہے مثلاً تلسی داس (باندہ کا ایک برہمن) نے بالمیک کا ترجمہ کر کے بھاشا میں نفیس رامائن لکھی۔ ملک محمد نے سولھویں صدی میں پدماوت شرقی ہندی میں لکھی۔

سورداس اور وشنا کا کلام برج بھاشا میں "کرشن جی" کے نام سے ایک عمدہ اضافہ ہے کچھ کلام بھگیلی لب و لہجے میں بھی پایا جاتا ہے۔ نیز بیسویں صدی کے آغاز تک مشرقی ہندی اور برج میں ایسی چند اور کتابیں پیش ہوئی ہیں جنکو ہندی میں چوٹی کا کلام کہنا نازیبا نہ ہوگا۔ مگر حق یہ ہے کہ لٹریچر پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں اگر ہے تو جیسے ماش پر سفیدی۔

ایک تمثیل

برن اور والٹر جیسے مشہور افسانہ نگاروں کی تصانیف پڑھکر دیکھیے کہ انہوں نے انگریزی کی طرز ادا کے بدلنے میں کس قدر زور مارا ہزاروں صفحے سیاہ کر دیے لیکن آج انگلستان کے مسلمہ اساتذہ کا کلام پڑھیے تو موازنہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزی طرز ادا کچھ بھی متاثر نہ ہوا۔ بلکہ برعکس اس کی ادبی محاسن اور خصوصیات اور زیادہ ہوتی گئیں۔ اسی طرح ہندوستانی زبان کے لٹریچر پر ان چند ہندی کی کتابوں کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔

اُردو کے حسن خدمات

اُردو کے راستہ سے لٹریچر میں امتداد زمانہ کے زیادہ اضافہ ہوا خصوصاً نظم کے ذریعہ سے ان دونوں جماعتوں نے جو آج حامیان اُردو اور حامیان ہندی بن کر ایک دوسرے کے مقابل ڈٹ رہے ہیں برابر کی مدد دی۔ صاحب گلزار نسیم جیسے نازک خیال شعراء کے کلام کی تفصیل خم خانہ جاوید میں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ہندوستانی زبان کو اہل ہند کی مشترکہ زبان سمجھکر لکھا کسی خاص بادشاہ کی یادگار یا خاص قوم کی بول چال کی زبان نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی کا لٹریچر اُردو کی بدولت لفظی اور معنوی خوبیوں سے معمور ہو گیا۔ شاعرانہ تخیل اسقدر بلند رتبہ پر ہو نچا کہ حقیقت نگاری کا دامن بھی چھوٹ گیا اگر ۱۸۳۲ء میں ہندوستانی زبان کو دربار اور دفاتر شاہی میں فارسی کی جگہہ نملتی تو شاید یہ محض شاعروں کی زبان ہوتی۔ حقائق و معارف کے مضمون مشکل سے ادا ہو سکتے

جذب و قبول کا مادہ

ہندوستانی زبان میں جذب و قبول کا مادہ ویسے ہی بہت زیادہ ہے۔ ہر ایک زبان کا لفظ بہ آسانی کھپ جاتا ہے

اگر زبان کو درخت سے تشبیہ دیجائے تو الفاظ ولغات اس کے تنے اور شاخیں ہیں حروف مثل اوپر کی جڑوں کے۔ اور اصوات بسیط وہ باریک جڑیں ہیں جو زمین کے نیچے چھپی ہوئی ہیں۔ درخت کی ہستی انہی سے ہے جسقدر زیادہ اصوات بسیط زیادہ ہونگی اسیقدر کثیر حروف ہونگے۔ اور جس قدر ہم مخرج یا قریب المخرج حروف ہونگے اسی قدر الفاظ ہونگے۔ اصوات کیا ہیں۔ آواز کی ٹھوکریں ہیں جب سانس آواز کی صورت میں مُنہ یا ناک کی راہ باہر نکلتا ہے تو انتہائے حلق سے نتھنوں اور ہونٹوں کے خارجی حصّوں تک پہونچتے پہونچتے زبان کی مزاحمت سے جابجا ٹھوکریں کھاتا ہے یہی اصوات بسیط ہیں۔ یہی حروف صحیحہ کی ترکیب کا مواد مہیا کرتے ہیں۔ آواز جسقدر زیادہ ٹھوکریں کھائے گی اصوات بسیط زیادہ پیدا ہونگی۔ اور جس طرح علم موسیقی کا ہر ایک سُر تیور اور کومل ہوتا ہے اسی طرح ہر ایک حرف کا مخرج بھی اُترا اور چڑھا ہوا ہوتا ہے مثلاً ز، ژ یا ر، ڑ ظاہر ہے کہ ہندوستانی میں جسقدر اصوات بسیط ہیں اتنے اور کسی زبان میں نہیں۔ بعض احباب کا تقاضا ہے کہ ہندوستانی کے ہم مخرج یا قریب المخرج حروف کو ایک جگہہ کھرل کرکے ایک حرف بنالیا جائے جو۔

نہ شرقیم نہ عنبر بیم نہ بحریم نہ برّیم
نہ از ملک سلیمانم نہ از تاج خراسانم

کا مصداق ہو لیکن اگر وہ علم الالسنہ کی دس بیس ہزار مستند صفحات روشن دماغی اور صاف دلی سے پڑھ لیں تو شاید اپنی تجویز پر خود ہی شرمندہ ہوں۔ ہندوستانی بولنے والے کی زبان اس قدر ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے کہ کسی زبان کا لفظ ہو بے تکلف ادا کریگا سنسکرت میں سب سے مشکل حرف نون غنہ اور ڑ ملے ہوئے ہیں جیسے برہمنڑ (برہمن)

یا کانڑا (یک چشم) کوئی فرنگی اسکو ادا نہیں کر سکتا۔ پشتو کے نغ کو کوئی سنسکرت کا عالم ادا نہیں کر سکتا۔ ترکی زبان کا گ جس کا تلفظ غ اور گ کے بیچ میں ہی اسکو کبھی کوئی عرب ادا نہیں کر سکتا۔ مگر ہندوستانی زبان بولنے والا ان سب کو بے تکلف یا ذرا مشق سے ادا کر سکتا ہی۔

اُردو کا احسان یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے اخیر تک ملک کی تقریباً ہر قوم و ملت میں ہندوستانی زبان مقبول تھی۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں سر این ٹونی میکڈانل کے ایک گشتی حکم کی وجہ سے پھوٹ پڑگئی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ عدالتی کاغذات۔ فارسی اور ناگری دونوں خطوں میں تحریر ہوا کریں۔ دوسرے سال شاید ابتدائی مدارس کے نصاب کی بحث چھڑ گئی۔ اس تمام سلسلہ کشمکش کی تفصیل بیان کرنے سے جی متلاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرجوش شمار کنندوں کی عنایت سے ۱۹۰۱ء پھر ۱۹۱۱ء اور پھر ۱۹۲۱ء کی مسلسل تین روداد ہائے مردم شماری ایک دفتر بے معنی ہوگئیں گویا حکومت کے تین قیمتی دستاویزیں جعلی وثیقے بن گئے۔

تاریخی شواہد مسٹر بلنٹ آئی سی ایس کمشنر مردم شماری یو پی نے کیا خوب لکھا ہی "بول چال کی زبان کو قومیت اور مذہب کے دامن سے باندھنا سخت مضر ہے اس سے ادبیات کی ترقی اور علمی تحقیق و تدقیق میں خلل پڑتا ہے قومیت یا مذہب نسبتاً زیادہ مستقل اور پائدار صفات ہیں زبان ناپائدار ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ادلتی بدلتی رہتی ہے کبھی اس میں اس قدر کایا پلٹ ہوتی ہے کہ اصلیت کا پتہ نہیں چلتا۔ خصوصاً جو زبان ضبط تحریر میں نہیں آتی وہ سخت بے ثبات ہے، خود اسی ملک میں اس کا بین ثبوت موجود ہے۔ ایک منڈا زبان ہے جو کبھی قدیم زمانہ میں بولی جاتی تھی اسکے تمام لب و لہجے آریہ زبان کی قوت کی تاب نہ لاسکے اور مٹ سے گئے۔ اسی طرح ہندوستان کے انتہائے مشرق میں پہلے کبھی کسی زمانہ میں مونکھمیر زبان کی شاخیں

مروج نہیں مگر اب بہت بڑی زبان کو غلبہ ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ مغلوب قوم کی زبان مغلوب، اور غالب قوم کی زبان غالب ہو جاتی ہے مگر مغلوب زبان کے کچھ آثار باقی رہتے ہیں، اس خاص حدود ارضی میں کہیں کہیں اس کا ادھورا رواج ہوتا ہے صرف اس قدر کہ علم الالسنہ کے ماہر تحقیق و تدقیق سے اس زبان کی خصوصیات کو کسی قدر معلوم کر سکتے ہیں۔

فطرت کی وضع

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کا قانون انسان کی کوششوں سے زیادہ قوت رکھتا ہے جس کی ایک دفعہ یہ ہی ہے کہ ہستیاں جو پرانے اوضاع و قوالب کو چھوڑ کر جدید وضع میں نمودار ہو چکی ہیں وہ پھر اپنا پرانا قالب اختیار نہیں کر سکتیں۔ کسی مردے کی ہڈیوں کی راکھ اکھٹی کرنے کے لئے اگر عمر بھر دریا کا کیچڑ چھانتے رہیں تو اس کا از سر نو زندہ ہونا ناممکن ہے۔ سنسکرت السنہ قدیمہ کی مجلس سے پلٹ کر السنہ جدیدہ کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتی اور نہ اب ہندوستان کے بزم علوم میں فارسی کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ آب جو رفتہ باز نیاید۔

اسلاف اور اخلاف کے درمیان ایک فطری حد فاصل قائم ہے۔ یہ کچھ سنسکرت ہی کی قسمت نہیں جیسے آج ایک جماعت ہندی زبان اور ناگری حروف کے پردہ میں زندہ کرنا چاہتی ہے، بلکہ دنیا کی بہت پرانی زبانوں کا بھی یہی حشر ہوا۔

قدیم مصر کی مثال

آج سے ہزار ہا برس پیشتر مصر میں ایک قدیم زبان رائج تھی جو تقریباً سوا چار ہزار برس تک زندہ رہی (۴۴۰۰ تا ۲۰۰ قبل مسیح) ایوان حکومت سے لیکر تجارت کی منڈیوں تک کی یہی زبان تحریری و تقریری تھی۔ دیوتا اور مذہبی پیشواؤں میں یہی مقبول تھی۔ تحریر میں اسکے حروف تصاویر اور نقش و نگار سے ملتے تھے۔ یعنی ابتدائی صورت میں تھے۔ مگر چونکہ عوام الناس حسن کلام یا حسن خط کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے اور محض مافی الضمیر کو مختصر طریقہ سے ظاہر کر دینے کو

کافی سمجھتے ہیں۔ اسلئے اس حور غلافی (ہیروگلافی) زبان اور تحریر کا سکہ صرف دو پونے دو ہزار برس سے زیادہ نہ چلا اور ایک اور سہل زبان اور رسم الخط خود بخود ایجاد ہوگئی جو (ہیرٹیک) حوری زبان سے موسوم ہوتی تھی۔ بولنے میں بمقابلہ پہلی زبان کے اس میں ایک طرح کی سادگی اور عامیانہ پن تھا اور لکھنے میں پورے تصویری حروف کے بجائے مختصر علامات ایجاد ہوگئیں۔ چنانچہ معبدوں اور دفتروں پر تو حورغلافی کا قبضہ رہا۔ اور باقی منازل تہذیب اس جدید زبان کے اثر میں آگئے۔ لیکن انسان متلون المزاج واقع ہوا ہے خصوصاً شعرا وادیب کسی زبان کو ایک حالت پر نہیں ٹھیرنے دیتے۔ چنانچہ اس پر بھی قرار نہ ہوا اور زبان نے تیسرا پلٹا کھایا۔ بولنے اور لکھنے میں اور زیادہ اختصار ہوکر دیماطی زبان مشتق ہوئی۔ اب گویا تصویر اور نقش ونگار بالکل اُڑ گئے اور یہی معمولی علامات حروف کی صورتیں ایجاد ہوگئے۔ جونا گری کی طرح ایک لفظ میں الگ الگ مگر فارسی کی طرح داہنے سے بائیں ہاتھ کو تحریر ہوتے تھے یہ رومیوں کا عہد حکومت تھا بعدہٗ جب یونانیوں نے اہل مصر کو نصرانیت کی دعوت دی تو ملک میں قبطی زبان رائج ہوگئی۔ اس شدت سے کہ مصر کے دونوں طبقے یعنی عیسائی اور غیر عیسائی قبطی ہی کو اپنی قومی ومذہبی زبان تصور کرتے تھے اور دیماطی اور یونانی حروف میں لکھتے تھے۔ پھر اسکو بھی زوال شروع ہوا اور اخیر پر یہ نوبت پہونچی کہ اتوار یا کسی عرس و تہوار کی تقریب پر جب قبطی زبان میں خطبے پڑھے جاتے تو مصری انکو اس طرح خالی الذہن سنتے جس طرح آج ہندوستان کے مسلمان جمعہ اور عیدین کے خطبوں کو آنکھوں سے تک تک کر سنتے ہیں قبطی کے زوال کا ایک سبب وہی وضع فطرت تھی یعنی زبان چار لب ولہجوں میں تقسیم ہوکر اول کمزور ہوئی اور پھر السنہ قدیمہ کی فہرست میں داخل ہوگئی چنانچہ قبطی زبان اب صرف انجیلوں میں باقی رہ گئی ہے پھر بھی تقریباً بارہویں صدی تک مصر میں کچھ کچھ اسکے آثار باقی رہے اسکے بعد قبطی مصر کی

سو سائٹی سے بالکل ہی غائب ہو گئی۔ آج عربی کو وہ رتبہ عالی میسر ہے کہ مصری ادبیات کو خاص حجاز اور یثرب بطحیٰ کے فرزند بھی رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

زبان کی حقیقت

اس مختصر بیان سے کیا ثابت ہوتا ہے کسی قوم یا اہل ملک کی زبان قومیت یا مذہب کی یا حسب و نسب کی پابند نہیں ہوتی۔ افراد کے مذاہب چاہے کچھ ہوں مگر تبادلہ خیالات اور اظہار مافی الضمیر کا ذریعہ مشترک ہوتا ہے۔ کتب مقدسہ یا دینیات الگ الگ زبانوں میں ہوں مگر دنیاوی ضروریات کی کفیل صرف ایک روزمرہ کی بول چال کی عام فہم زبان ایک ہو گی جس میں بچے بولنا سیکھتے ہیں۔ جوان خواب دیکھتے ہیں، بوڑھے غور و فکر کرتے ہیں، قومی لٹریچر بھی اسی زبان میں ہونا چاہیے۔ جو قوم اس زبان کا دامن مذہب کے ساتھ باندھتی ہے وہ اپنے علمی ادبی ترقی کی راہ میں بھاری بھاری سلیں ڈال لیتی ہے، اردو کے حامی روزمرہ کی خط و کتابت میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ داخل کر کے سادا ہندوستانی زبان کو علمی اور کتابی زبان بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح ہندی کے حامی اس میں سنسکرت کے ناہموار الفاظ داخل کر کے رگ وید اور مِتاکشرا کی زبان بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک صاحب کسی دوست سے ملنے گئے، وہ مکان پر نہ تھے یہ رقعہ لکھکر دے آئے، اتفاقاً اسی دن شام کو دونوں کی سرراہ ملاقات ہو گئی۔ یہ انکو دیکھکر بولے "کل میں آپ سے ملنے کے لئے آپ کے گھر پر گیا تھا۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ آپ سے بھینٹ نہیں ہوئی لاچار ہو کر لوٹ آیا" دوست نے انکا رقعہ جیب سے نکالکر اور پڑھکر سنایا۔ اس میں لکھا تھا "آپ کے سماگم ارتھ میں گتا دیو میں آپ کے دہام پر پدہارا گرہ کا کپاٹ مدرب تھا۔ آپ سے بھینٹ نہ ہوئی۔ ہتش ہوکر پراورتیتھ ہوا" اور ہنس کر بولا کہ "شاید قلم ہاتھ میں لیکر آپ کو سنسکرت کا نشہ چڑھ گیا۔ اب آپ ہوش میں ہیں تو اصلی زبان میں بات کر رہے ہیں۔"

زبان اور طرز ادا

پھر بھی یہ ہندوستانی زبان کی متعدد طرز ادا ہیں۔ کہیں سنسکرت بھاشا کا رنگ غالب ہے اور کہیں عربی، فارسی کی رنگت ہے۔ انگریزی انشا پردازوں کی بھی کبھی دو طرز ادا تھیں۔ ایک گروہ جانسن کا دلدادہ تھا اور دوسرا اینگلو سیکسن کے پرانے الفاظ کو کلام میں جابجا داخل کرکے سادہ زبان کو ادق بنا دیتا تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ دن قائم نہ رہی اور نہ رہ سکتی تھی۔

ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستانی زبان کے تمام لب و لہجے ملکر ایک نہ ہو جائینگے تب تک نہ ایوان سیاست پر قبضہ ملیگا اور نہ کوئی قومی لٹریچر نصیب ہوگا۔ ترکی زبان کی تاریخ پڑھئے۔

ترکی کی مثال

تاریخی شواہد کے مطالعہ سے قانون فطرت کا پتہ ملتا ہے۔ جبتک ترکی دو بڑے لب و لہجوں پر منقسم رہی یعنی جرمانلی اور قرمانلی (مشرقی ترکی اور غربی ترکی) تب تک ترکوں کے جذبات و مدرکات فضول ضائع ہوتے رہے آخرکار پندرہویں صدی کے وسط میں حکومت نے اس دہمی فرق کو مٹا کر دونوں کو ایک کردیا تو ترکی لٹریچر برقی تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ چنانچہ آج بیسویں صدی کا ادبیات گویا آل عثمان کی جذبات اور احساسات اور عقلیات کی ہو بہو تصویروں کا ایک مرقعہ ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ترکوں نے اپنے آپ کو زبان کا پابند نہیں کیا بلکہ زبان کو اپنے تابع رکھا، فارسی اور چغتائی کی تقلید کے بجائے اونہوں نے خاص اپنی قومی اور ملکی تاثیرات اور خصوصیات کا اتباع کیا۔ یورپ کے جس قدر اقوام و مذاہب سیاسی طور پر ترکوں کے ظل حمایت میں ہیں نہ اونہوں نے حروف کی نوعیت پر ضد کی اور نہ ترکوں نے انکے قومی جذبات اور احساسات کو لٹریچر میں نظرانداز کیا۔ بلکہ اُسکو ترکی بولنے والی اقوام و ملل کا ایک آئینہ بنا دیا جس میں مشرق قریب کی تہذیب و معاشرت کی روح صاف جھلملاتی ہے سرزمین وطن

کے نشان ہائے معروف دلکش نظارے۔ دریا پہاڑ، میدان تمام جغرافیائی خصوصیات ہی نہیں بلکہ لٹریچر ملک بھر کے جذبات قلوب کا دیباچہ ہے۔ ان کی عادات و خصائل اوضاع و اطوار زندگی کے اعلیٰ مقاصد۔ اخلاقی معائب اور محاسن۔ غرضکہ تہذیب کے چہرے کے تمام خدوخال ترکی لٹریچر کے آئینہ میں نظر آتے ہیں۔ مگر یہ خصوصیات تقلید سے پیدا نہیں ہوتیں۔ رامائن یا پدماوت کا ترجمہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ جس تہذیب کے آئینے ہیں وہ تہذیب ارتقائے عالم میں سے انسانی معاشرت کے ابتدائی مدارج اور اسی زمانہ کے دلی مطالب ظاہر کرسکتی ہے آج ہم اس سے مستفید ہوسکتے ہیں مگر اپنا ذریعہ اظہار مافی الضمیر نہیں بنا سکتے۔ جب جسم بڑھتا ہے تو آغاز عمر کا پیراہن بدن پر نہیں آتا۔

ہندوستانی لٹریچر اہل ہند کی موجودہ حیات اونکی قومی اور منزلی ضرورتیں ایک نظام ہی جداگانہ ہے۔ دل و دماغ اور نفسیات ہی بدلا ہوا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مردہ ہستی کو زندہ کرنے سے کیا حاصل۔ یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہے کہ ہندوستان کا حقیقی لٹریچر کس نوعیت کا ہوگا حقیقت میں وہ کسی آنے والی نسل کے دل و دماغ سے خود اُبلیگا اور اُس وقت اُبلیگا جبکہ ہندوستان کے نوجوان خواہ کسی مذہب و ملت کے ہوں تقلید سے اُکتا جائیں گے غیر اساتذہ کے مسلمات اور کلیے اور انکے ادبی معتقدات کو تقویم پارینہ سمجھکر پھاڑ کر پھینک دینگے۔ جب ان پر وہ وقت آئیگا جو انقلاب عظیم کے بعد فرانس پر آچکا ہے تو یہ بھی اہل فرانس کی طرح تمام مذہبی اور ملی تعصبات کو پاؤں میں ملکر ہندوستانی لٹریچر کی کتاب کھول لینگے اسوقت فارسی اور ناگری حروف کی بحث مطلقاً نہ ہوگی بلکہ قانون ارتقا کا منشا فطرت کا تقاضا اور اختصار و سہولت کا اصول پیش نظر ہوگا۔ اسوقت کے نوجوان بغیر سمجھائے سمجھ لینگے کہ چیزیں جب ترقی کرتی ہیں تو اُن کی

ابتدائی صورت بدل جاتی ہے یعنی جسامت کم ہوتی ہے۔ ادہر روحانیت ترقی کرتی ہے اسی قانون کے ماتحت فارسی کے حروف الفاظ میں گندھکر سالم نہیں رہتے مگر اپنا مصرف بہترین طریقہ سے پورا کرتے ہیں۔ فارسی رسم الخط کو اختصار نویسی کی احتیاج نہیں بلکہ خود ایک ترقی یافتہ رسم الخط ہے جو انگریزی یا ناگری کی طرح شورٹ ہینڈ کا محتاج نہیں، شارٹ ہینڈ خود ایک پیش خیمہ ہے۔ جو رسم الخط میں آیندہ ایک زبردست انقلاب کی خبر دیتا ہے۔ زر نقد کی رقوم کو دیکھیے کہ اُنہوں نے اپنی صورت بدلتے بدلتے اور مختصر ہوتے ہوتے صرف ایک علامت اختیار کرلی ہے۔

	دور اوّل	دوم	سوم	چہارم
ایک روپیہ	عدد	عدہ	عصہ	عـ عـہ ر
دو روپیہ	عددان	عدہن	عصا	عا
تین روپیہ	ثلثہ	ثلہ	ثلے	سے ر
چار روپیہ	اربعہ	ابلعہ	اللعہ	للعہ ر
پانچ روپیہ	خمسہ	خمہ	صمہ	صہ ر
چھ روپیہ	ستہ	ستے	سے	سے ر
سات روپیہ	سبعہ	سبعہ	معہ	
آٹھ روپیہ	ثمن	ثمہ	مہ	سے
نو روپیہ	تسعہ	تعہ		لعہ ر
دس روپیہ	عشرہ	عشرہ	ع	عـ٥
سو روپیہ	ماہ	ماعہ		
ہزار روپیہ	الف	الـ		

رقوم ہوں یا حروف۔ الفاظ ہوں یا معانی و مفاہیم۔ سہولت و اختصار پسندی کا

قانون جو انسان کی فطرت میں ہے کبھی ان کو دقیانوسی صورت میں قائم نہیں رہنے دیتا زبانوں کا بھی یہی حال ہے اگر ایک زبان سے دوسری زبان پیدا ہو تو کیا لازم ہے کہ جدید زبان قدیم کا دامن عمر بھر نہ چھوڑے۔

فارسی کی مثال فارسی کو دیکھیے کہ اسکے ابتدائی لٹریچر میں رجز کے سوا اور کیا تھا یا تہذیب انسانی کی ابتدائی منزلوں کی اور آتشکدوں کی تصویریں ملتی تھیں جنکو فردوسی اور اسکے معاصرین نے اپنے کلام کے پردہ میں دکھلایا ہی لیکن مسلمانوں نے اپنے ہاتھ میں لیکر فارسی کے جسم و روح دونوں کو بدل دیا۔ پھر رومی نظامی۔ جامی جیسے دلق پوش سخنوروں نے اُسے میدان ہو کی سیر کراکر کچھ اور ہی چیز بنادیا اسکے بعد کئی دَور آئے اور فارسی نے کئی پلٹے کھائے، یہاں تک کہ آجکل کی زبان وہ فارسی ہی نہیں رہی۔ اسی طرح اگر اُردو لٹریچر نے فارسی و عربی سے خروج کیا ہے یا ہندی نے سنسکرت سے جنم لیا۔ تو کیا ضرورت ہے کہ دونوں کا طرز اداا اپنے اپنے قدیم خواجہ کا غلام رہے، یہ تو اس زبان کے بولنے والوں کے جذبات پر منحصر ہے اگر طبائع تقلید پسند۔ دل و دماغ غلام ہیں حقیقی آزادی کے جذبات سے بالکل خالی ہیں۔ ملک کی یونیورسٹیاں انہیں اور غلامی کی تعلیم دیتی ہیں تو یقیناً ہندوستانی لٹریچر نہ صرف تین خداؤں کا بندہ (عربی۔ فارسی اور سنسکرت) رہیگا۔ بلکہ چوتھا خدا انگریزی کا اور شریک ہو جائیگا۔ آجکل کے حامیان ہندی کو دیکھیے کہ گو انہیں منو جی کے زمانہ کا ایک شمہ بھی نہیں۔ یعنی دھرم شاستر کی صورت میں وہ نظام معاشرت تو موجود ہے مگر نمونہ کے لحاظ سے نہ جسم ہے نہ روح۔ تقلید کی ایک ہوس ہی ہوس ہے، یہی حال حامیان اُردو کا ہے۔ فریقین کو چاہیے کہ اپنی اپنی حد سے پیچھے ہٹیں۔ اور آیندہ ہندوستانی لٹریچر کے لئے ابتدائی تعلیم کے نصاب میں سادہ زبان کا آغاز کریں وہ سنہ ۱۹۰۳ء کی ضد کہ ایک فریق ادق اُردو اور دوسرا غیر مانوس سنسکرت الفاظ کو کتب درسیہ

میں بھرنے پر اڑا ہوا تھا، قطعاً چھوڑ دیں۔ شاید ان بچوں میں سے ایک دو نسل کے اندر وہ فرد فرید نکل آئیں جو ہندوستانی لٹریچر کو نیا لباس پہنا دیں۔

ہندی کو تنزل کیوں ہوا۔

ہندوستانی میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت اور بھاشا کی قلت خود اُسی فریق کی غفلت اور بد مذاقی کا نتیجہ ہے جو آج ہندی کا جھنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے۔ اول تو اس بھرتی تک کے جواب وہ کاسیتھ ہیں۔ جیسا کہ سر جارج گریرسن نے تحقیق السنہ ہند کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ عہد مغلیہ میں انہوں نے ہندوستانی کو۔ فارسی الفاظ سے سخت گرانبار کیا۔ پھر یہ کہ تقریباً سو سوا سو برس برادران وطن، نمک سنجی اور رہی دانی میں ایسے مصروف رہے کہ ہندوستانی زبان اور لٹریچر سے انہیں کچھ سروکار ہی نہ رہا۔ ادھر فریق ثانی نے دماغ سوزی کر کے زبان کو عربی فارسی اور وسط ایشیا کی زبانوں سے خوب مالا مال کیا۔ ہزار ہا کتابیں ہر صنف و شعبہ میں پیش کر کے۔ زبان پر قبضہ کر لیا، ہندی والے ۱۹۰۱ء میں سر اینٹونی میکڈانل کے جگانے سے جاگے۔ پھر بھی صحیح جذبات سے متاثر نہیں۔ بلکہ وہی قومی مذہبی جوش جو ہندوستانیوں کا خاصہ ہے اور جو علم کی بارگاہ میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا۔ ابھی تک اون کی رہبری کر رہا ہے۔ سنسکرت اور بھاشا کے غیر مانوس الفاظ کو ناگری کے غیر مانوس حروف میں ہندوستانی زبان کے اندر داخل کر کے۔ عربی، فارسی وغیرہ کے مانوس اور مروّج الفاظ کو زبردستی خارج کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سخت بدعقلی اور گرم دماغ کے فکر کا نتیجہ ہے، عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ سنسکرت اور بھاشا کے غیر مانوس مگر آسان الفاظ کو مانوس عربی فارسی مرادفات کے ساتھ ملا کر اور فارسی حروف میں لکھکر پیش کریں۔ فارسی اساتذہ کی تصانیف کے ترجمے اور قدیم حکایات و روایات جو پہلے سے اُردو میں مروّج ہیں۔ ہندی شان سے پیش کریں تو ممکن ہے کہ ہندوستانی بولنے والے ایک دو نسلوں میں عربی فارسی الفاظ کے محتاج نہ رہیں۔ یہ بھی خلوص نیت بغیر ممکن نہیں لیکن اگر ہندی

کے حامیوں نے موجودہ روش جاری رکھی تو یہ ادن کے اور وہ ان کے نہ ہم خیال رہینگے اور نہ ہم زبان، نہ کبھی اتحاد عمل ہوگا نہ کبھی ایک قومیت متحدہ، ایک شیرازہ جمعیت، ایک نظام حکومت نصیب ہوگا۔ ہندوستان کی جمیع اقوام و ملل کا پہلا فرض یہ ہے کہ علم کی بارگاہ میں برابر، برابر زانوے ادب تہہ کریں، یہاں زبردستی یا ابلہ فریبی نہیں چلتی بلکہ علم کی مخلصانہ پرورش اور پرستش سے رتبہ بڑھتا ہے۔

دَرِ فیض است منشیں از کشائش نا اُمید اینجا
برنگ دانہ از ھر قفل میروید کلید اینجا

قریشی

جسمانی پیمائش

نمبر ۱

جیساکہ پچھلے مہینہ شذرات کے ذیل میں اشارۃً بیان ہو چکا ہے، سولہ برس کی عمر تک جسمانی ورزش کی ازحد ضرورت ہے۔ بغیر اس کے کوئی قوم تندرست نہیں رہ سکتی پانچ سات برس کی عمر کے چھوٹے چھوٹے بچے جنہیں آج تم حقیر اور بے بساط سمجھتے ہو اور ان کی صحت تندرستی کی پروا نہیں کرتے وہی کل ہماری قومی محفلوں کے شمع ہو کر چمکینگے۔

اہل مغرب کو دیکھئے کہ جب وہ بچوں کو ابتدائی مدارس میں داخل کرتے ہیں تو ان کی جسمانی اور ذہنی پیمائش کرتے ہیں۔ یعنی انکے قد اور جسم کو ناپ تول کر دیکھتے ہیں کہ ان کی صحت کس درجہ پر ہے، اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً دیکھتے رہتے ہیں کہ پیمائش اور وزن فطرت کی منشا کے مطابق ترقی کر رہا ہے یا تنزل۔ اس مقصد کے لئے ہر ملک کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے ایک تا بائیس سال تک کا نقشہ بنا دیا ہے جس سے اس قانون فطرت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جوانی تک قد اور وزن سالانہ کیونکر بڑھتا رہتا ہے واضح ہو کہ یہ ہماری قومی انجمنوں کے حساب اور سرکاری دفتروں کے نقشے نہیں کہ اشخاص متعلقہ اناپ شناپ خانے اور رد بدل کر بطور حقائق پیش کر دیتے ہیں بلکہ جسمانی اور ذہنی پیمائش کی جدولیں بڑی کد و کاوش سے تیار کی جاتی ہیں یعنی ایک عمر کے ہزارہا تن ومند اور صحیح الجثہ بچوں کو منتخب کرتے ہیں پھر یہ نہیں کہ سب ایک ہی حیثیت کے ہوں بلکہ اناث الگ ذکور الگ، شہری الگ اور دیہاتی الگ پھر شہریوں میں تجارت، ملازمت، صنعت و حرفت ہر شغل کی جماعتوں کے بچوں کو الگ الگ لیتے ہیں اور ایک وقت میں ان کی پیمائش کر کے اوسط نکالتے ہیں کہ سال اول کے اختتام پر لڑکے کا کتنا اور لڑکی کا کتنا قد

اور وزن ہوتا ہے۔ اسی طرح بائیس برس تک ہر درجہ اور ہر عمر کے بچوں کی پیمائش کر کے ایک نقشہ مرتب کرتے ہیں۔ ابتدائی مدارس و مکاتب میں اس نقشہ کے اعداد و شمار سے ہر بچے کی جسمانی صحت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

دقیق نظر سے دیکھیں تو یہ پیمائش ہی صحیح نہیں ہے۔ البتہ اگر انسان کا جسم مچھلی کی وضع قطع کا ہوتا تو صحیح پیمائش آسانی سے ہو جاتی۔ جسم میں کسی مقام پر اقلیدس کا ایک نقطہ فرض کر کے مخروطی جسم کی پیمائش کے قاعدے سے انسان کی جسامت بہ آسانی معلوم ہو جاتی۔ مگر اسکے اعضا و جوارح بھی ہیں۔ اسکے علاوہ جسم کی بالیدگی پر قومی اور ملکی خصوصیات ضرور عامل ہوتی ہیں۔ پھر تمدن اور معاشرت کو بہت بڑا دخل ہے۔ اسی قسم کے اور بہت سے اسباب ہیں اور ہو سکتے ہیں جنکی وجہ سے جسمانی نشو و نما کی ترقی کا کوئی صحیح اور جامع الناس پیمانہ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ جسمانی پیمائش کی جدول چاہے کسی قوم و ملک سے متعلق ہو کم از کم اس سے عادت الٰہی اور وضع فطری ضرور معلوم ہو جائیگی یعنی عمر کے کس کس حصہ میں انسان کا قد اور وزن کس نسبت سے بڑھتا ہے، دونوں ایک ساتھ بڑھتے ہیں یا آگے پیچھے ہو کر۔ چنانچہ یورپ کے ایک جماعت محققین کا مرتب کیا ہوا نقشہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

لڑکوں کا پیمانہ بالیدگی جسم

عمر	اوسط قد بحساب انچہ	اوسط وزن بحساب پونڈ	افزائش: قد	افزائش: وزن
۱	۲۹/۵	۱۸/۵	۰	۰
۲	۳۱/۱	۲۴/۲۵	۱/۶	۵/۷۵
۳	۳۶/۳	۳۲/۷۵	۵/۲	۸/۵

عمر	اوسط قد بحساب انچ	اوسط وزن بحساب پونڈ	افزائش	
			قد	وزن
۴	۳۸ر۶	۳۵ر۹۱	۲ر۳	۳ر۱۶
۵	۴۱ر۰۳	۳۹ر۹	۲ر۵۷	۲ر۶
۶	۴۴	۴۴ر۴	۲ر۹۷	۴ر۵
۷	۴۵ر۹۷	۴۹ر۷	۱ر۹۷	۵ر۳
۸	۴۷ر۰۵	۵۴ر۹	۱ر۰۸	۵ر۲
۹	۴۹ر۷	۶۰ر۴	۲ر۶۵	۵ر۵
۱۰	۵۱ر۸۴	۶۷ر۵	۲ر۱۴	۷ر۱
۱۱	۵۳ر۵	۷۲	۱ر۶۶	۴ر۵
۱۲	۵۴ر۹۹	۷۶ر۷	۱ر۴۹	۴ر۷
۱۳	۵۶ر۹۱	۸۲ر۶	۱ر۹۲	۵ر۹
۱۴	۵۹ر۳۳	۹۲	۲ر۴۲	۹ر۴
۱۵	۶۲ر۲۴	۱۰۲ر۷	۲ر۹۱	۱۰ر۷
۱۶	۶۴ر۳۱	۱۱۹	۲ر۰۷	۱۶ر۳
۱۷	۶۶ر۲۴	۱۳۰ر۹	۱ر۹۳	۱۱ر۹
۱۸	۶۶ر۹۶	۱۳۷ر۴	ر۷۲	۶ر۵
۱۹	۶۷ر۲۹	۱۳۹ر۶	ر۳۳	۲ر۲
۲۰	۶۷ر۵۲	۱۴۳ر۳	ر۲۳	۳ر۷
۲۱	۶۷ر۶۳	۱۴۵ر۲	ر۱۱	۱ر۹
۲۲	۶۷ر۶۸	۱۴۶ر۲	ر۰۵	۱

اس جدول سے عادت الٰہی کا اندازہ ہوتا ہے، تین برس تک قد کے مقابلہ پر بچے کے جسم کا وزن تیزی سے بڑھتا ہے۔ اسکے بعد کبھی قد کی رفتار زیادہ ہے اور کبھی وزن کی، وجہ یہ اگر کوئی جسم موٹا نہ ہو مگر زیادہ لمبا ہو جائے تو وہ کمزور ہو جائیگا۔ چھ سے دس برس تک وزن کی رفتار میں زیادتی اور قد میں کمی ہوتی ہے، چودہ سے سولہ تک پھر وزن کی رفتار بڑھتی ہے اور قد بھی اپنے قرینہ سے ترقی کرتا ہے۔ مگر تاہم ہمارا پیش کردہ مسلمہ غلط نہیں ہوتا یہ کہ شروع سے سولہ برس کی عمر تک فطرت کا رجحان جسم کی تعمیر کی جانب خصوصیت کے ساتھ رہتا ہے اور اگرچہ مادہ تعقل آٹھویں، نویں سال سے نمایاں ترقی کرکے فطرت کو ذہنیات کی طرف متوجہ کرلیتا ہے مگر پھر بھی عمر کے سترہویں سال سے بیس سال تک قد اور وزن کی ترقی صریحاً کم ہونی شروع ہوجاتی ہے یہاں تک کہ بائیسویں سال میں جو عین عنفوان شباب ہی جسمانی ترقی تقریباً مسدود ہو جاتی ہی اسلئے کہ فطرت اللہ ذہنیات کی تکمیل میں مصروف ہوجاتی ہے۔ یہ سلسلہ کم و بیش ۴۰ برس کی عمر تک جاری رہتا ہے۔

انہی حقائق اور اعداد کی بنا پر اور عادت الٰہی کو دیکھتے ہوئے ہم اس کو سخت مضر سمجھتے ہیں کہ سات، آٹھ برس کی عمر سے پہلے بچوں کو باقاعدہ مدرسوں میں جھونک دیا جائے وہ مدرسے جن میں نہ جسمانی پیمائش کے مستند جدول ہیں نہ ذہنی کے، نہ بچوں کو کوئی ناپتا تولتا ہے، بلکہ بھیڑ بکریوں کے گلہ کی طرح گھنٹوں انہیں بید سے ہانکتے رہتے ہیں جس قوم کی جسمانی صحت کی بنیاد ہل جائے وہ ہرگز ذہنی ترقی نہیں کرسکتی۔ پچھلے اجلاس کانفرنس کے اختتام پر جناب آنریبل میاں فضل حسین صاحب بالقابہ صدر نے وداعی تقریر کے سلسلہ میں جب علیگڑھ کالج کے طلبہ کی صحت جسمانی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "علی گڑھ میں وہ اگلا سا ظاہری رُعب اور جسمانی قابلیت اب کم ہوتی جاتی ہے۔ شاید یہ طلبہ کے لڑنے کا قصور ہے یا والدین کا یا کس کا؟" تو اس وقت بعض اہل بصیرت

متاخرین کے طریقہ تعلیم و تربیت میں بہت سی ترقیاں بہم پہونچائی گئی ہیں لیکن موجودہ زمانہ کے آدمیوں کے دماغ میں ایک مسموم خیال پیدا ہوگیا ہے، بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تعلیم کو بغرض تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یا تو یہ ہوتا ہے کہ وہ دولت حاصل کریں یا تن پروری کی کوئی سبیل نکالیں۔ ان کا مقصد یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ تعلیم کو اپنی اخلاقی اور روحانی نشو و نما کا ذریعہ اور اصلاح کا آلہ بنا دیں۔ جہاں تک تاریخ کے اوراق پارینہ سے پتہ چلتا ہے زمانہ قدیم کی قوموں میں یہ خامیاں نہ تھیں اور یہی سبب ہے کہ ارسطو۔ افلاطون۔ سیسر و ایسی بیشمار ہستیاں ان میں پیدا ہوئیں۔

تعلیم اوستاد یا کتابوں کے ذریعہ سے دیجاتی ہے جس قوم کی تعلیم کمزور ہے اس کے حق میں کیمبرج اور آکسفورڈ کی شہرۂ آفاق و مہتم بالشان تعلیم گاہوں کا تتبع کرنا بہت مناسب ہوگا۔ کالج میں طالب علمی کے زمانہ میں طلبا مثالوں کے ذریعہ سے اچھی سوسائٹی سے اور اپنی ساتھیوں پر سبقت لے جانے کے خیال سے بہت کچھ سبق حاصل کرتے ہیں اور انکی اخلاق و عادات کی بہترین اصول پر نشو و نما ہو جاتی ہے۔ طالب علمی کی صورت میں طلبا ان نمونوں کے مطابق اتفاق و اتحاد سے رہنا سیکھ جاتے ہیں اور انہیں اس امر کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اتفاق کی طاقت کیا ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص کے لئے جسکو کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے موقع نصیب نہ ہو سکیں، بہترین مشورہ یہ ہے کہ وہ مسٹر کارلائل کی صلاح پر عمل پیرا ہو۔ کارلائل لکھتا ہے ”آجکل اچھے اور مفید لٹریچر کا مجموعہ سچی یونیورسٹی ہے“۔

ابتدائی مدارس اور ہائی اسکول موجودہ تعلیم کی خون پہونچانے والی رگیں ہیں، ان اسکولوںمیں ایک ہی قسم کی تعلیم ہوتی ہے۔ سوائے اُن بڑے اسکولونکے جہاں یونیورسٹی اور پیشہ کے متعلق تعلیم ہوتی ہے بہت سے ملکوںمیں ابتدائی اسکولوں میں مفت تعلیم ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر متمدن ملکوں میں چھ سال کے لڑکوں کے لیے

ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔

موجودہ محققین و مبصرین تعلیم نے اس امر کی تحقیق کی ہے کہ بچہ کا دماغ ہر طرح کی تعلیم حاصل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے اور جبکہ وہ آزادی کے ساتھ مائل بہ ترقی ہے تو اس کو کسی بات میں اولجھانا نہ چاہیئے۔ بلکہ چند سال کے واسطے اسکو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے ایک خیال جس کی بنا پر "کنڈر گارٹن سسٹم" بچوں کے واسطے قائم ہوا ہے یہ ہر استاد کا فرض باغبان کے فرض سے ملتا جلتا ہے۔

مالی پودوں کی تربیت و نشو و نما کرتا ہے۔ اس قسم کی تعلیم کی بنا بچوں کے ساتھ ہمدردی کرنے پر ہے اور اسکو استاد کی زد و کوب سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بچہ کا دماغ بغیر کسی روک ٹوک کے ترقی کرے۔ اسکا ثمر ہمکو یہ ملتا ہے کہ وہ بچے جن کی تعلیم ان اصول پر کی جاتی ہے وہ نہایت ذہین اور سمجھدار ہوتے ہیں، انہیں خودداری کا احساس ہوتا ہے اور سوسائٹی کے لئے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

مشرقی طریقۂ تعلیم

زمانہ قدیم سے مشرقی ممالک کا طریقۂ تعلیم بالعموم یکساں رہا ہے اس میں اور مغربی ممالک میں اگر فرق ہو سکتا ہے تو صرف اسقدر یہ بہت ارزاں ہے۔ سولھویں صدی میں مغرب میں بچوں کی تعلیم انہیں اصول پر ہوتی تھی جن اصول پر مشرق میں ہوتی چلی آئی تھی۔ اس کے بعد فرانس اور انگلستان میں غریب نادار بچوں کی تعلیم کیلئے سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ اور ان طلبا کے واسطے جو بوجہ ناداری کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے سے قاصر تھے "سنڈے اسکول" اور "نائٹ اسکول" قائم کئے گئے۔ انعامات اور اسناد کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دلائی گئی۔ دولتمند لوگوں نے خیراتی درسگاہوں کے واسطے اپنی جائدادیں وقف کر دیں۔ خود حکومت نے غریبوں اور مفلسوں کی تعلیم کی طرف اپنا دست امداد بڑھانے میں تساہل نہ کیا بلکہ بڑے بڑے رقمیں بطور سالانہ امدادی وظائف کے ان تعلیم گاہوں کے واسطے مقرر کردیں

اس جد و جہد کا ثمر مغرب کو ملکر رہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب تعلیم کی بدولت اقوام عالم پر فوقیت رکھتے ہیں۔

لیکن جب یورپ اپنے تیئں نئے طریقہ سے آراستہ کر رہا تھا مشرقی تعلیم ہی اپنے "حد" تک پہونچ گئی تھی۔ سولھویں صدی سے جس قدر اقوام مغرب نے ترقی کرنا شروع کی اسی قدر اہل مشرق جہالت کے سمندر میں زیادہ گہرے ڈوبتے گئے۔ اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ مشرق کی حالت زبوں قابل اصلاح نہیں، ہنوز روشنی کی ایک ایسی شعاع موجود ہے، مشرقی اقوام کو صبح امید کی ایک جھلک دکھلا رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے طریقہ تعلیم کی از سرنو بنیاد رکھیں اور اپنی درسگاہوں کو جدید اصول پر یعنی مغربی تعلیم گاہوں کے نمونوں پر قائم کریں۔

اب ہم کیا کر رہے ہیں؟

ایسے وقت میں جبکہ ہماری تمام کوششیں قوتیں اور وسائل بچوں کی تعلیم پر صرف ہونا چاہئیں، ہم ان کی تعلیم کیطرف نظر التفات نہیں کرتے۔ یہ خیال نہایت تکلیف دہ ہے کہ ہنوز مشرق میں حقیقی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔

بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہمارے لئے بہت مہتم بالشان ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر ہماری آیندہ نسلوں کی ترقیوں کا انحصار ہے۔ نہیں بلکہ ہست و نیست کا انحصار۔ کیا ہمنے کبھی اُن غریب ہستیوں کا خیال ہے جو اب تعلیم کے تشنہ کام ہیں اور جن کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع حاصل نہیں۔ صاحب استطاعت لوگوں کو غریب طلبا کی مدد کرکے موجودہ اور آیندہ نسلوں کے شکریہ کا مستحق بننا چاہیئے۔ دولتمند خواہشمند ہے کہ وہ اپنے بعد ایک کبھی نہ فنا ہونے والی یادگار چھوڑ جائے، لیکن وہ شخص جسکی فیاضی کے صلہ میں احساس شکرگزاری کے نقش غریبوں کے لوح دل پر کندہ ہوجاتے ہیں کیا اس سے بہتر کوئی یادگار بھی چھوڑ سکتا ہے؟

مسلمانوں کی تعلیمی پستی

عام طور سے مسلمانوں کو تعلیم سے نفرت نہیں ہے تعلیم میں جو آسانیاں مسلمانوں کے واسطے موجود ہیں اُن سے فائدہ نہ اوٹھانا یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر کسی قدر غور کی ضرورت ہے غالباً ہماری تعلیمی پستی کا سبب یہ ہے کہ ہماری تمام تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی اسکول میں جانے سے پہلے ایک مسلمان لڑکے کو اس خامی کے پورا کرنے کے واسطے کسی مکتب میں یا گھر پر اپنی زندگی کے تین یا چار بیش بہا سال اصول مذہب کی تعلیم پر صرف کرنا پڑتے ہیں اس طرح اس کی زندگی کا اس قدر حصّہ ضائع ہو جاتا ہے فرض کرو کہ پانچ پانچ سال کی عمر میں اسکول بھیجے جاتے ہیں لیکن ایسی حالت میں ایک مسلمان بچے کو تین چار سال انگریزی اسکول کے باہر صرف کرنا ہوتے ہیں اور وہ آٹھ یا نو برس کی عمر میں اسکول میں داخل ہوتا ہے حالانکہ اُس کے ہم عمر اتنی عمر میں اس سے کوئے سبقت لیجاتے ہیں اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے تین چار سال ضائع ہو جاتے ہیں اور اس طرح اکثر مسلمان بچّوں کی تعلیم پوری نہیں ہوتی اور اسکول میں تاخیر سے داخل ہونے کے سبب سے وہ جلد اسکول سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انگریزی اسکولوں میں مسلمان طلبا کی تعداد بہ لحاظ اُن کی آبادی کے اقل قلیل نظر آتی ہے

شہنشاہ حسین رضوی (بی اے، علیگ)

(ترجمہ) از مسلم سنگاپور

ابتدائی تعلیم کی جدید اسکیم میں مشکلات عظیم

"ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لئے جہاد کی ضرورت ہے" (ایک دردمند سکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ)

"انتہائی مشکلات کا مقابلہ ہے، سخت جد و جہد کا شدید تقاضہ ہے" (ایک شکیل ڈپٹی انسپکٹر مدارس اسلامیہ)

"عجب دردانگیز بلکہ لائق شرم و افسوس کیفیت لاحق ہے، اکثر پیچیدگیاں اور رخنہ اندازیاں پیش آتی ہیں"

(ایک غیور سب انسپکٹر مدارس عمومیہ)

فغاں میں آہ میں شیون میں نالے میں ۔۔۔ سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں
ایک درد ہو تو دوا کیجئے ۔۔۔ ہمہ تن درد ہو تو کیا کیجئے

(۱) خدا کا شکر اور لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آنریبل مسٹر گوکھیل مرگباشی کا بویا ہوا تخم بیکار نہیں گیا، تقریباً تمام اہل الرائے ابتدائی تعلیم کی اہمیت کے قائل ہو گئے اور ایک جماعت مدت سے خواہش مند ہے کہ جلد سے جلد اس کی نشو و نما کو پروان چڑھتا ہوا دیکھے۔ ملکی خواہشات و سیاسی مطالبات کا ملک کے طول و عرض میں ایک عرصہ سے تلاطم بپا ہے لیکن کاش! وطن و ملت کا کوئی طبقہ ایسا بھی ہوتا جو ایثار و انہماک کی زبان سے سچی خواہش کا عملی استحقاق پیش کرتا اور مشکلات کے دور کرنے میں سبیل اعانت سے فتوحات کا راستہ نکالتا۔

(۲) شاید گورنمنٹ پر الزام لگانا صحیح ہو، کیونکہ بغیر اس کی مربیانہ پرورش کے غریب رعایا اپنی فلاح کے لئے فی الواقع کچھ نہیں کر سکتی۔ ہمیں سزاوار ہے کہ ہم لگاتار اپنی خواہشات کا اظہار اور اصرار مگر ادب کے ساتھ بالتکرار اپنے مطالبات پیش کرتے رہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ من کل الوجوہ گورنمنٹ پر تکیہ کر لینا سخت خطرناک غلطی اور مہلک بے وقوفی ہوگی یہ گورنمنٹ کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ہماری ضروریات کو خاطر خواہ سمجھے اور کما حقہٗ بندوبست کر سکے۔ پس گورنمنٹ سے مادی مطالبہ، اعلیٰ دستور العمل اور عمال میں ہمدردانہ

فرض شناسی کا مادہ پیدا کرنے کے وسائل کی التجا کے ساتھ ساتھ ہم بھی اپنے فرائض کا احساس کریں خلوص و استقلال سے مشارکت و معاونت کی اعلیٰ مثال دکھلائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان جنت نشان نہ بن جائے۔

(۳) گورنمنٹ نے بہت کچھ کیا ہے اور کر رہی ہے اور غالباً نہیں، یقیناً کریگی لیکن ملک وملت نے آج تک غریب رعیت کی منفعت کے لئے ابتدائی تعلیم پر کوئی نمایاں عملی توجہ نہیں کی، اگر ہر قسم کی ترقی کی حقیقی بنا تعلیم ہے، تو ابتدائی تعلیم یقیناً ہماری صلاح وفلاح کی اصلی اور صحیح سنگ بنیاد ہونی چاہیئے۔

"ابتدائی تعلیم کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے تعلیمی مسئلہ اورخاصکر ابتدائی تعلیم کا مسئلہ ہر ملک میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے، برخلاف اسکے ہم ہندوستان میں اس مسئلہ کو تمام مسئلوں سے آسان سمجھتے ہیں اس میں نہ کسی قسم کی غور کی ضرورت ہے اور نہ کسی پیچیدگی کو حل کرنا ہے سیدھا راستہ بنا ہوا ہے ہم کو کوئی تعلق نہیں کہ ہم کو یہ راستہ خندق میں لیجا کر پھینکے یا کسی بڑی چٹان سے ٹکرا دے" (پرفیسر ضیاء الدین احمد)

(۴) اپنے ایک سابق بیدار مغز و تیز لفٹنٹ گورنر ہز آنر سر جیمس مسٹن صاحب بہادر بالقابہ کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہیئے کہ گورنمنٹ نے اپنی فیاضی اور مہربانی سے ہمارے درد کو محسوس کیا ہماری گزارش کو سمجھکر اپنی نوازش کا اظہار فرمایا اور بالآخر ہماری محترم و مقتدر کانفرنس کی مساعی جمیلہ مشکور ہوئیں لیکن ہماری قسمت کی شومی و بدبختی دیکھئے ہماری کیفیت ہنوز روز اوّل میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا۔

(۵) میرے خیال میں بمصداق اس کہاوت کے، جو بولے وہی تیل کو جائے، تعمیل و تکمیل کا تمامتر بار کانفرنس پر پڑگیا اور غالباً اس سلسلہ میں جو کچھ بھی قابل قدر کام ہوا وہ زیادہ تر صرف کانفرنس کی بدولت ظہور میں آیا ہے، حق یہ ہے جو کچھ اس کے امکان میں تھا

اپنے محدود وسائل کے مطابق اس نے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ لیکن مستعدی و سرگرمی تو درکنار اور کسی طبقہ میں غالباً ہنوز مطلق احساس ہی نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سرسری و سطحی ہے حالانکہ ایسی اہم ضرورت کے لئے عارضی و انفرادی کوششیں بیکار محض ہیں۔

(۶) یہ حقیقت بالبداہت عیاں ہے کہ تعلیم کا دریائے رحمت مدت سے موجزن ہے گھر کے پاس اور دروازے کے سامنے نہریں اور نالیاں چل رہی ہیں مگر فائدہ اوٹھانے کی توفیق شاذونادر ہی ہوتی ہے شاید یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عوام بے تاب ہیں اور ترسیل درخواست سے تمام مراحل طے ہوجائینگے حالانکہ خیریت سے جمہور میں ترسیل درخواست کی بھی اہلیت نہیں ہے بقول ایک سربرآوردہ افسر تعلیم کے دیہات میں توسیع تعلیم کے سلسلہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا صحیح تصور محال ہے کسی ہمدرد کی مہربانی سے مدرسہ منظور اور جاری بھی ہوجائے تو دودھاری نہیں مثلث تلوار بیکرامید کو ہر وقت قطع کرنے کیلئے تیار ہے۔ ایک جان سو جوکھوں

(۷) بظاہر عوام کو تعلیم سے سخت متنفر پایا جائیگا، لیکن یہ تنفر حقیقی و دائمی نہیں بلکہ غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو ہم معقول وجوہ پر احتراز کی صحیح بنیاد رکھتا ہے بے شبہ افلاس مانع ترقی ہے مگر فی الواقع بے پروائی سب سے زیادہ سدراہ ہے، تقریباً ہر شخص خیر خیرات، رسم و رواج شادی بیاہ میں کم و بیش بدرجہا زائد اسراف کرتا ہے، مگر تعلیمی مصارف کا حقیر بار بھی ناگوار گذرتا ہے "گنوار گنا نہ دے بھیلی دے" ایک مشہور اور بالکل صحیح مثل ہے۔

(۸) بے پروائی کو زیادہ قوت نتائج کی بے ثمری سے ملتی ہے۔ بقول مولوی محمد دین صاحب جج بہاولپور "ابتدائی تعلیم کا موجودہ نظام ناکام ثابت ہوا ہے، ہرگز موافق نہیں ہے اور بالکل جدید و مفید اصول پر وضع ہونا چاہیئے" آج تک بالعموم مآل اور اعمال کے لحاظ

سے تعلیم کا مدعا و منتہا ملازمت مانا اور سمجھا گیا ہے اور یہی سد سکندری درمیان میں حائل ہے۔ پس بامعان نظر و انصاف دیکھا جائے تو جمہور کی یہ مہیب نفرت بے اصل اور غیر معقول نہیں ہے۔

(۹) مگر تعلیم کی ضرورت و منفعت ایسی ظاہر و باہر ہے کہ انسانی فطرت انکار نہیں کر سکتی ممکن نہیں مستقل مخلصانہ ترغیب و تحریص بالکل بے اثر رہے۔ ایمان کا شائبہ اور قبولیت تعلیم کا مادہ تقریباً ہر جگہ موجود ہے اور اس کو خوبی خوش اسلوبی کے ساتھ بکار آمد بنا کر کامیاب اور حیرت انگیز نتائج کا پائدار ذریعہ بنایا جا سکتا ہے الاشرط یہ ہے کہ دانائی ہمدردی مہربانی کے ساتھ مستقل رہنمائی، نگرانی و دستگیری درکار رہے، سخت مشکل یہ ہے کہ عوام کو بدقت تمام راغب کیا جاتا ہے انہیں سہولت و منفعت کی توقع دلائی جاتی ہے لیکن جب نتیجہ امید و آرزو کے خلاف نکلتا ہے تو افسردگی کے ساتھ ناکامی لازمی ہے۔ مزید حسرت و افسوس یہ ہے کہ بجائے دلچسپی و گرویدگی کے احتراز و اجتناب کا مادہ پرورش کیا جاتا ہے۔ ابتدا کا انتہا سے مقابلہ صرف ایک شکل نہیں۔ خود اہل مقام میں امیر و غریب، شائق و بدشوق، نیک نفس و خود غرض، دانشمند و جاہل، ہمدرد و بدباطن کے مختلف و متخالف مقاصد و اعمال کی کشمکش میں نہال تعلیم بالکل ہی افسردہ و پژمردہ ہو جاتا ہے بعض باوضع و مقتدر اصحاب کی انتہائی رقیق القلبی و کریم النفسی اور خود غرضی و بے پروائی ترقی تعلیم کے حق میں زہر ہلاہل ثابت ہوئی ہے۔

(۱۰) عوام کی غفلت مسلم اور جمہور کی جہالت آشکارا، پس معلمین ہی ہمارا جزو ہیں اور جب ان کی انہیں تربیت و اہلیت ہی نہیں، اس کی شکایت فضول ہے۔ مدرسین کی اصلی اور انتہائی غرض ملازمت بغرض ذاتی منفعت ہے تو انسانی محبت و قومی حمیت کے فقدان کا گلہ محض بیجا ہے۔ تاہم یہ واقعہ نفس الامر غور طلب ہے کہ مدرسین کی کاہلانہ خواہش طبعی اور مطلق العنانی بے راہ روی دائرہ تعلیم کو تنگ و مضر بنانے میں برقی اثر دکھلا رہی ہے،

(۱۱) ابتدائی تعلیم کی جدید سکیم فی نفسہ نہایت مفید و اہم ہے۔ کیا یہ سکیم ہادیان ملک و قت کے لئے محل امتحان نہیں؟ کیا برادران وطن کا فرض نہیں تھا کہ وہ آنریبل مسٹر گوکھیل سرگباشی کی زرین نصیحت کو آویزہ گوش بناتے اور کمزور ہمسایہ کی بیش از بیش مدد کرتے، لیکن ہم کس منہ سے غیروں کو الزام دے سکتے ہیں جبکہ یگانوں کا رویہ بیگانوں سے بدتر ہے۔ مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میدان تخیلات کو چھوڑکر دردانگیز و سبق آموز خارستان واقعات کا مشاہدہ کیا جائے عوام سے لیکر حکام تک کے برتاؤ کے متعلق تفصیلی حالت بیان کی جاسکتی ہے مگر خوف طوالت مانع ہے، فی الجملہ واقعات و حالات سے مجبور ہوکر اہل نظر یہ ہدایت کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں کہ۔

(۱۲) "اب ضرورت اس امر کی ہے کہ صوبہ کی مسلمان پبلک سکیم مذکورہ کی طرف متوجہ ہو، اور اسکے جس قدر مختلف حصے ہوں ان کو سمجھے اور اس بات کی برابر نگرانی کرے کہ جن عہدہ داروں کے سپرد اس کا نفاذ ہے وہ کہاں تک اپنے فرائض کو کامیابی سے انجام دے رہے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ نہ کی اور مشکلات کی اصلاح کے متعلق کوشش نہ کی، تو جو بے مثل موقع مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی توسیع کا اس سکیم کی بدولت پیدا ہوا ہے وہ قطعاً ہاتھ سے جاتا رہیگا اور آیندہ کے لئے مدتوں تک تعلیمی ترقی کا دروازہ مسدود ہو جائیگا۔

(۱۳) نصیحت کے ضروری اور مفید ہونے میں کلام نہیں، لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ عملی حیثیت سے یہ دلفریب مشورت گویا بیکار محض ہے۔ حکام کی کارروائیوں پر نظر رکھنا اور ان کا مقابلہ، ہاں آئینی و قانونی مقابلہ کرنا یہ ہر ایک کا حوصلہ نہیں، نہ ہما شما ایسی اہلیت رکھتے ہیں پس جب کہ اندرونی کیفیت مایوسی اور بیرونی حالت افسردگی لئے ہوئے ہو تو چار و ناچار ہماری امید بھری نگاہیں اس طرف اٹھتی ہیں جس کی مساعی جمیلہ سے اس تخم آرزو کی کاشت ہوئی، پودے کا در و مالی ہی کو ہوتا ہے۔ پس ہم توقع رکھتے ہیں کہ حالات حاضرہ سے متاثر ہوکر

اس کی پرورش و نگہداشت کے لئے "خاص طور پر"، کوشش عمل میں لائی جائیگی، بنابریں
(۱۴۱) ہم نہایت ادب گر نہایت اصرار کے ساتھ موقر اخبار "مساوات" مرحوم کے ہم آہنگ
ہو کر اس گزارش کی جرأت کرتے ہیں کہ شدید "ضرورت ہے" کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی
اشاعت کے لئے "خاص"، کوشش کیجائے، کانفرنس کی زیر نگرانی سرکاری سررشتہ
تعلیم کی طرح ایک محکمہ یا سررشتہ قائم کیا جائے جو ہر مقام پر مدارس و مکاتب کے قیام کا
انتظام کرے۔ معائنہ اور اصلاح و درستی کی فکر کرے۔ (ہر جگہ کمیٹی قائم ہو اور سچے خدام
قوم کے ہاتھوں میں ان کا انتظام رکھا جائے، جو تعلیمی حالات و ضروریات سے واقف ہوں
اور بے خوف جدوجہد کر سکیں مسلسل سعی و جدوجہد نیز - وقتاً فوقتاً نگرانی ہوتی رہے۔ مکاتب
و مدارس، تعلیمی مردم شماری، اصلاح تمدن، تعلیم نسواں کی اشاعت و ترویج وغیرہ وغیرہ یہ
کام کرنے کے ہیں۔ اگر عملی کام کرنا ہے تو جناب مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب کو ان امور
کی جانب جلد توجہ کرنی چاہیئے ورنہ رزولیوشن بہت پاس ہو چکے اور ہوتے رہیں گے،
لیکن محض رزولیوشن ہمارے درد کی دوا نہیں ہیں۔" واللہ یھدی من یشاء
الیٰ صراط مستقیم ط

"خادم التعلیم"

تنقید و تبصرہ

ڈسپلن

اصل و حقیقت اس مجہول المعنی لفظ نے جیسا کہ لائلٹی۔ پالیسی پرسٹیج وغیرہ اکثر مغربی الفاظ نے تقریباً نصف صدی سے ہندوستانی لڑیچر میں داخل ہو کر تعلیم یافتہ طبقہ کو سخت ہلکان کیا ہے۔ عرصہ تک فوجی ضابطہ کے معنوں میں مستعمل رہا پھر جبر و استبداد کا آلہ بنا۔ شدہ شدہ اب یہ نوبت پہونچ گئی ہے کہ جلال و جبروت کے علمبردار جب سیاسی بازی میں زچ یا بدرنگ ہوتے ہیں تو ڈسپلن کا عذر اس بیباکی سے پیش کر دیتے ہیں جیسے کوئی عیار کھلاڑی عین قیمت پر اپنے تاش سے ترپ کا پتہ نکال کر پھینک دیتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر آج ڈسپلن کا لفظی اور معنوی تجزیہ (پوسٹ مارٹم) کر کے دیکھیں اور قارئین کرام کو دکھائیں کہ اسکی پیدائش اصل و حقیقت اور محل استعمال کیا تھا اب کیا ہے اور کہاں تک اس میں تلمیع ہوئی ہے۔ چونکہ یہ لفظ فرنگی خمیر سے ہے۔ اُردو میں کوئی مرادف جو صحت کے ساتھ اس مفہوم کو ادا کرے ابھی معین نہیں ہوا اس لیے تحقیق و تدقیق بھی فرنگی زاویہ نظر سے کی جائے گی۔ اور تاریخی شواہد بھی فرنگی ہی پیش ہونگے۔

ل ڈسپلن لاطینی زبان سے مستخرج ہے جس کا مادہ ڈسولس بمعنی شاگردی ہے لاطینی لفظ ڈسپلینا بمعنی شاگردی اور ڈسائپل بمعنی شاگرد یا پیرو دونوں اسی سے مشتق ہیں۔ رومیوں کے دور میں اس کا مفہوم صرف تعلیم و تربیت تک محدود تھا یعنی ڈسپلینا سے وہ نظام مراد تھا جس کے ماتحت رہکر طلبہ اپنے اساتذہ سے علوم و فنون اخذ

تہذیب نفس حاصل کرتے تھے بظاہر یہ صرف شاگردوں کا قرینہ معین کرتا تھا مگر دراصل اساتذہ کا قرینہ بھی اسی میں مضمر تھا۔ جیسے معاہدہ میں گو صرف قبول ہی کی تصریح کی جائے مگر اس میں ایجاب بھی مخفی ہوتا ہے۔ ڈسپائیل اور ڈسیلن دونوں کے معانی میں تقلید بلاحجت کی سخت تاکید مضمر ہے۔ لہذا اس کا مفہوم بجنسہ ایسا تھا جیسے قدمائے مشرق میں کسی عالم یا امام وقت کے علمی اصول و معتقدات اور نظریوں کے پکے مقلد اور پیرو ہوتے تھے اور علوم و اخلاق کے میدان میں بھی قدم قدم پر انکا اتباع کرتے تھے۔ بہرحال قرن اول میں ڈسیلن کا استعمال بالکل صحیح اور اصلی معنوں میں ہوتا تھا رومیوں کے ادبیات کی تاریخ پڑھنے سے جابجا رومی علماء کے حلقہ درس ملتے ہیں اور ان میں لفظ ڈسیلن انہی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔

دور جب روما کا روز شمار آیا اور زمانہ نے رومیوں کے متروکات پر شرق و غرب میں احکام توریث جاری کئے تو لاطینی زبان اور لٹریچر بھی بٹا۔ فرانس اور برطانیہ دونوں صدہا برس محکوم رہنے کی وجہ سے ویسے ہی لاطینی کو اچھی طرح جذب کر چکے تھے۔ پھر بھی فرانس میں خصوصیت کے ساتھ پرورش علوم کی صفت یورپ بھر میں سب سے زیادہ اور قدیم سے ہے علم و حکمت کے جواہر ریزے جہاں کہیں دیکھتا ہے ذوق و شوق سے چن لیتا ہے۔ زمانہ مابعد میں یہ اندلس کے علمی متروکات کا بھی وارث ہوا۔ چنانچہ پیرس کے آٹھ دس لاکھ جلدوں کے کتب خانہ میں قرطبہ کے عربی ذخیرہ کا بہت سا حصہ آج تک موجود ہے اور فرانیسی نے عربی الفاظ بھی اپنے اندر بکثرت جذب کیے ہیں۔ جیسا کہ فرانس کی علمی و ادبی تاریخ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔ فرانسیسی زبان بالکل یونانی اور لاطینی بنی۔ نیولین گردی سے پیشتر اہل فرانس کا بسر اوقات انہی دو زبانوں پر تھا خصوصاً لاطینی گویا فرانسیسی کے لیے مدار حیات تھی۔ بہرحال اس تقریب سے ڈسیلینا کو فرانسیسی ڈکشنری میں ڈسیلن بنکر جگہ ملی۔ نیز اس کا مفہوم بھی پہلے سے زیادہ وسیع

ہوگیا۔ یعنی رومیوں کی طرح یہ محض گرو اور چیلے کے تعلقات ہی کو تعبیر نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے ساتھ عام ضابطہ تعلیم کی پابندی بھی مراد لی جاتی تھی۔ بلکہ کچھ زمانہ بعد اسکا مفہوم عام قوانین وضوابط کی پابندی پر حاوی ہوگیا۔ مگر یہ معنوی توسیع ڈسپلن کو کہیں دور جدید کے آغاز میں جاکے نصیب ہوئی۔ اس سے پہلے ڈسپلن سے عموماً وہ نظام مراد تھا جو طلبا اور اساتذہ کو اپنے اپنے فرائض وحقوق کی حد بتاتا تھا۔ یہ لفظ فرانسیسی سے پھر انگریزی میں داخل ہوا۔

دور۲ برطانیہ میں جیسا کہ فرانس میں رومیوں نے کبھی کسی دیسی زبان اور لٹریچر کو فروغ نہونے دیا ورنہ یہ زمانہ کا دستور ہے کہ کسی قوم کو دوسری کا حلقہ بگوش بنائے مگر اسکی زبان کو آزاد چھوڑدے پادری جو اسوقت انگلستان کے مجالس علمیہ پر قابض تھے سب لاطینی بولتے اور لکھتے تھے۔ خود اہل ملک کو علم وزباندانی کی تمیز ہی نہ تھی رومیوں کے پنجے سے مخلصی پانے کے صدیوں بعد بھی تمام ملک ایک وحشی خانہ رہا انگریزوں کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ لاطینی کو غیر زبان سمجھتے اور اس سے الفاظ لیکر ان کو اپنا بناتے۔ رفتہ رفتہ جب   فرانس کے ساتھ تعلقات ہمسائگی ہوئے تو چونکہ ہمسایہ قوموں میں قانون مبادلہ ہمیشہ شدت کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈسپلن انگریزی میں داخل ہوا مگر مفہوم میں بہت کچھ تغیر ہوگیا۔ یعنی سیاسی مصطلحات میں شامل ہوکر رفتہ رفتہ سخت گیری کے ساتھ قانون نافذ الوقت کی پابندی کرانے میں استعمال ہونے لگا۔ ڈسپلن میں یہ معنوی خصوصیت شاید اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوئی جبکہ انگلستان کے مضافات کی فہرست مرتب ہونے لگی اور بعض ممالک محروسہ کے باشندے حد سے زیادہ سلیم الطبع اور ضعیف القلب ہوکر سخت گیر ضابطہ بلکہ غیر معمولی جبر واستبداد کو عادتاً برداشت کرنے لگے۔

دورچ انگلستان کے واسطہ سے ڈسپلن کا لفظ ہندوستان میں وارد ہوا مگر اس

اس شان کے ساتھ تعلیمی پیراہن پر زرہ بکتر پہنے ہوئے تھا یہاں اس کے معنی اسقدر سخت ہوئے کہ اصلی رنگ پر تعزیری رنگ بالکل غالب ہوگیا۔ اور گویا ان تعلقات کو تعبیر کرنے لگا جو ایک ناراض، مجبور اور بے نیاز جابر کے درمیان خود بخود قایم ہو جایا کرتے ہیں۔

تاریخی شواہد ڈسپلن کی اس مختصر سوانح عمری سے واضح ہوگا کہ دور اول میں یہ محض حلقہ درس کی ایک اصطلاح تھی اور چونکہ رومی اساتذہ کو سقراط اور افلاطون جیسے یونانی معلموں سے میراث علم پہونچی تھی اس لیے یہ علوم واخلاق کا درس اسی اخلاصمندانہ شان سے طلبہ کو دیتے تھے ان کا ضابطہ بھی دیا سیدھا سادا اور ہر پہلو پر طلبہ کی تکمیل تعلیم کا معین تھا۔ چنانچہ اساتذہ اور طلبہ کے باہمی خلقات کا ضابطہ یعنی ڈسپلن حقیقت میں شاگردوں کے حق میں ایک وثیقۂ تہنیت اور اساتذہ کی جانب شاگردوں کا خط فرزندی تھا۔ بڑے بڑے پاٹنف (رومی گورنر) اور سینٹر (ممبر پارلیمنٹ) اپنی اولاد کو اسی مقدس ضابطہ کے ماتحت رکھکر تعلیم دلاتے تھے یعنی شاگرد اپنے اساتذہ کو مشرقی پیروں اور سالکوں کے درجہ میں سمجھتے تھے اور اگر انکے کسی ترک یا فعل کی مصلحت سمجھ میں نہ آتی تب بھی اتباع میں حجت نہ کرتے اس لیے کہ

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

فرانس میں بھی ڈسپلن صدیوں انہی معنوں میں مستعمل رہا۔ لنے۔ بی لرڈ کے حلقہ درس میں ڈسپلن کے وہی معنی تھے جو رومی لیتے تھے۔ قدیم انگریزی علم ادب کی تاریخ کی میں جابجا ان طلبہ کے قافلوں کا ذکر ملتا ہے جو علم کے شوق میں وطن سے پیدل نکلجاتے اور آبنائے ڈوور سے ڈوبتے تیرتے ہوئے گذر کر فرانس کے مقدس حلقوں میں شریک درس ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں رومیوں اور فرانسیسیوں میں ڈسپلن کی

ناگوار شکل نہیں اختیار کرسکتا تھا۔ البتہ انقلاب عظیم کے بعد فرانس میں اس لفظ کا مفہوم وسیع ہوا تاہم اس میں سیاسی رنگ شامل نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں شاگردی بھی غلامی ضرور تھی مگر اس کی ایک خاص وجہ ہے مطبوعات کا کہیں نشان نہ تھا۔ علمی اور اخلاقی کتابوں کے قلمی نسخے خال خال موجود تھے۔ درسی حلقوں اور اساتذہ کی کمی تھی مدرس کا سینہ ہی کتب خانہ تھا۔ خاص خاص شاخہائے علوم میں متن بھی اسی کا تھا اور حاشیہ بھی اسی کا۔ طلبہ کو از خود دماغی ترقی کرنیکے مواقع حاصل نہ تھے۔ یہ انتہا درجہ کی احتیاجمندی انہیں ایک طرح کی غلامانہ متابعت پر مجبور کرتی تھی۔ پھر بھی یہ متابعت محض دماغی تھی آجکل کی طرح طلبہ کو حریت کے جمیع مادی اور غیر مادی حقوق سے محروم نہ کرتی تھی۔

انگریزی میں داخل ہوکر ڈسپلن نے بار بار پلٹے کھائے جیسا کہ حسب ذیل انتخاب سے واضح ہوگا۔

نظائر

۱۔ انگلستان کے مشہور شاعر ایڈمنڈ اسپنسر (۱۵۲۷ء تا ۱۵۹۹ء) نے ایک موقع پہ اس لفظ کا استعمال سدھانے کے معنوں میں کیا ہے۔

"وہ نیکیوں میں خوب ڈسپلن کیے ہوئے (سدھے ہوئے) تھے"

۲۔ بیکن مشہور فلاسفر (۱۵۶۱ء تا ۱۶۲۶ء) نے معاشرتی ضابطہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک موقع پر لکھتا ہے۔

"بی بی بچے انسان کے لیے سراپا ڈسپلن (ضابطہ حیات) ہیں"

۳۔ روگر (۱۵۷۳ تا ۱۶۶۲) ایک موقع پر لکھتا ہے۔

"کامل انسان جو اپنی خواہشات کو بہترین طریقہ سے ڈسپلن (ضابطہ) میں۔ رکھ سکتے ہیں انھیں بھی ہر وقت ہوشیار خبردار رہنا پڑتا ہے۔"

یہاں ڈسپلن کے معنی ضبط نفس کے ہیں۔

سترھویں صدی سے معنی بدلنے شروع ہوئے

۴۔ بین جانسن افسانہ نگار المتوفی ۱۶۳۷ء نے ایک افسانہ میں ایک موقع پر ڈسپلن کو تعزیری معنوں میں استعمال کیا ہے یعنی سزا دینا۔

۵۔ جوزف اڈیسن (۱۶۷۲ تا ۱۷۱۹) لکھتا ہے۔

"اسے تسمہ یا چابک سے ڈسپلن (سزا) دینا مناسب ہے"

یہاں تک بھی ڈسپلن کا مفہوم گو وسیع ہوا مگر تعلیمی یا معاشرتی یا اخلاقی تادیب کی حد سے باہر نہ نکلا مگر انیسویں صدی کے ساتھ ڈسپلن بالکل سیاسی اصطلاح ہوگیا۔ غالباً اس لیے کہ فتراک روز بروز بوجھل ہوتا جاتا تھا اور ایک سخت گر ضابطہ کی ضرورت تھی تاکہ حزین کا فلسفہ باسانی ثابت ہو جائے۔

نمیگردم اگر گردسرت خاطر مریجانی
کہ بال مرغ بسمل کشتہ پروازے نمیداند

۶۔ چنانچہ لارڈ میکالے انگلستان کے ایک محکوم گروہ اور ماتحت رعایا کی نسبت رائے ظاہر کرتے ہوئے ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"انھیں آدھی صدی کی سخت ڈسپلن کافی ہوتی"۔

یعنی اگر پچاس برس اُن سے قانون اور ضابطہ کی پابندی خوب کسکے کرائی جاتی تو انکا دماغ صحیح ہوجاتا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی سخت گیر چابک سوار اپنے کسی ماتحت کو ان لفظوں میں سمجھائے "اگر تم اس گھوڑے کا زیر کرام اور قربُی ذرا کسکے تھام لیتے اور آسن سخت کرکے دو گھنٹہ سہ گام میں چکر دیدیتے تو اس کی ساری شوخیاں جاتی رہتیں"۔

ہم نے انگلستان کے چیدہ وحید العصر سخنوروں کو لیا ہے جنکی بلفظ و معنی آفرین قوت نے لٹریچر کی تاریخ میں دور دور بدل بدل دیئے ہیں۔ چنانچہ اس تشریح سے معلوم

ہوتا ہے کہ ڈسپلن نے انگریزی میں آکر کتنے پلٹے کھائے اور آخر کو اپنی اصلی معنی کھو دیئے۔ شدہ شدہ اب اسکا یہ مفہوم ہوگیا ہے کہ کسی جماعت یا قوم سے سخت قوانین کی پابندی بطور سزا کرادیں تاکہ اس کا پتہ مرجائے اس میں مطلقاً جان باقی نہ رہے بلکہ ایک آہنی پنجہ میں آکر کٹھپتلی کی طرح کام کرے۔ ڈسپلن کے معنی حکم اور اشارہ پر چلنے کی عادت ڈالنا غلامانہ فرمانبرداری میں سدھانا۔

اصلیت یہ ہے کہ رومیوں کے بعد کبھی اس لفظ کا استعمال بالتخیر نہ ہوا اور اگر ہوا یا ہوتا ہے تو فوجی طبقہ میں ہوتا ہے۔ یا اُس قوت میں جو فوج کے ہمپلہ ہو مثلاً پولس انگریزی نے جو نئے معنی ڈسپلن کو پہنائے ہیں اس موقعوں کے سوا وہ اور کہیں زیب نہیں دیتے خصوصاً تعلیم گاہوں میں تو قطعاً بدزیب ہیں۔ ہم اس پر ~~کسی قدر~~ تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے۔

فرض کیجیے کہ قدیم زمانہ میں روما اور فرانس میں بھی یہ لفظ اُنہی سیاسی معنوں میں تعزیر کو لیے ہوئے استعمال ہوتا تھا اونکے ہاں بھی ڈسپلنری فورس (تعزیری احتساب) کا نظام سخت تھا۔ تو بھی یہ ہمارے دعویٰ کے منافی نہیں۔ رومی یا فرانسیسی سوسائٹی کو اس سے مطلقاً تکلیف نہ تھی اس لیے کہ قوم وملک انکا۔ قانون وحکومت اُن کی۔ واضعان دقوانین ان کے محتسب اور عُمّال ان کے۔

نیند اس کی خواب اس کا اور راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

قانون اور ضابطہ کو ڈسپلن سے خاص نسبت ہے دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم اور منحصر علیہ ہیں اگر ضابطہ نہیں تو پابندی بے معنی ہے پھر ضابطہ جسقدر معقول ہوگا ڈسپلن کا عمل بھی سہل ہوگا۔ اور معقول قانون وضابطہ کی بڑی تعریف یہ ہی کہ جس سوسائٹی کے لیے نافذ اور وضع کیا جائے۔ اس کے نظام آسائش کو خواہ خصوصی ہو

یا عمومی مکمل کرنیوالا ہو یعنی نظام کے برقرار رکھنے والے اسباب کو بڑھائے اور مستحکم کرے اور منافی اسباب کا انسداد کرے اگر اُس کی صریح شان یہ نہیں تو وہ ضابطہ نہیں بلکہ شکنجہ جبر واستبداد ہے وہ قدیم قرطاجنہ کا تب رُوئین تن ہے جس کے آغوش میں آکر سنگین مجرم موت کی نیند سوجاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب واضعان قانون اپنی قوم اور سوسائٹی کے لیے قانون وضع کرتے ہیں تو اس میں اسی نظام آسائش کی تکمیل ہی خصوصیت کے ساتھ ملحوظ ہوتی ہے لیکن اگر حسن اتفاق سے کسی قوم وملک کا قانون غیر قوم کے افراد استحقاقاً وضع کرتے ہیں تو تقاضائے بشری یہ ہے کہ نظام آسائش کی تکمیل کی طرف وہ پوری توجہ نہ کریں۔ انکی نگاہ میں ایک اور نظام کی تکمیل مقدم ہے۔ یعنی تحفظ خود اختیاری کا نظام تاکہ اس ملک وقوم میں انکی ہستی اسی شان کے ساتھ قائم رہے ایسی حالت میں قانون وضابطہ نافذ الوقت اپنا مقصد اولین پورا نہیں کرسکتا یعنی نظام آسائش کی تکمیل نہ کریگا نہ وہ قانون مکمل ہوگا بلکہ ناقص ہوگا۔ اور جب یہ ناقص ہوگا تو تمام سلسلہ غلط ہوگا یعنی احتساب اور محتسب جرم وپاداش سب ناقص ہونگے یہ نوبت اُس وقت پہونچتی ہے جبکہ ڈسپلن کو۔ قدرتی جسے پر ایک مصنوعی سیاسی زرہ بکتر بھی پہنایا جائے۔ سیاست کے اس مقام اعلیٰ پر پہنچکر۔ جلال وجبروت کے علمبردار۔ ماتحت تہذیب کی ہر منزل پر یہانتک کہ بزم علیہ کے ہر ایک درجہ میں سیاسی ڈسپلن کی مطلق العنان حکومت قائم کردیتے ہیں۔ اور حفظ ماتقدم کے طور پر۔ جدید پیچگیر ضابطوں سے رخنہ بندیاں کرتے کرتے بالآخر مرکز جلال وجبروت کو شمشیر ڈسپلن کی نوک پر منطبق کردیتے ہیں لیکن دوسری طرف خود مختار ہستی کی حالت اس سے مختلف ہے

اسمعو وسلمو

یہاں فوج کا ڈسپلن یہ ہے کہ "سنو اور مانو حجت نہ کرو"۔ یہ حق بجانب ہے وجہ یہ کہ فوج پر تمام قوم کے نظام آسائش کا ملک کی آبرو کا اور حکومت کا انحصار ہے اور یہ بغیر اس کے محفوظ نہیں

کہ قلیل اپنے آپکو کثیر پر نثار کردے۔ پھر سالار فوج جو اسقدر جابرانہ حکم دیتا ہے وہ خود
بھی اپنی کسی غلط کاری کی پاداش میں اتنی ہی جابرانہ طریقہ سے کورٹ مارشل کے لیے
طیار رہتا ہی گویا امیر اور مامور سب ایک ڈسپلن کے نظام کے ماتحت ہیں مگر قوم کے
غیر مصافی طبقہ کی جماعت کے لیے ڈسپلن ایک جدا معنی رکھتا ہی تعزیرات میں ڈسپلن
کی اور صورت ہوتی ہی سول فرائض کے قاصر یا حقوق کے غاصب پر ڈسپلن اور طرح کا
حکم لگاتا ہے میونسپل جرائم کی پاداش میں کورٹ مارشل کی سزا نہیں مل سکتی۔ جب ڈسپلن
کے معنی ضابطہ کی پابندی کرانے کے ہیں تو حیات انسانی کی جس منزل کا وہ ضابطہ
ہے اسی کے مطابق احتساب اور پاداش وغیرہ ہونگی۔ اگر کوئی ضابطہ ڈسپلن کے قابو
کا نہوگا تو واضعان قوانین اس کو اس بے تکلفی سے منسوخ کر دینگے کہ گویا ایک باکمال
خیاط ہے کہ ڈھیلے یا تنگ پیراہن کو مقراض اصلاح اور سوزن تدبیر سے کھڑے کھڑے
درست کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی رومیوں میں بھی سخت و کرخت ضابطے وضع ہو جاتے
تھے۔ اگر ان کا حشر دیکھنا منظور ہو تو رومیوں کے نظام حکومت کی مفصل تاریخ پڑھیے
ہو بہو سین نظر آئینگے نامقبول قانون کی تنسیخ کا مسئلہ سنیٹ ہوس (دار المبعوثین)
میں کس طرح پیش ہو رہا ہے۔ ہوس کو جو ہر طرف سے تیغہ ہے ناراض پبلک گھبری ہوئے
نتیجہ آخر کی منتظر ہے۔ سب کی آنکھیں ہوس کی بلندی چمنی (دودکش) پر بیتابی سے لگی
ہوئی ہیں۔ اتنے میں چمنی سے دھوئیں کی ایک لپٹ نکل کر فضا میں پھیل جاتی ہے اور
اُس کے ساتھ ہی پبلک کی خوشی کے نعروں سے ہوا گونجنے لگتی ہی۔ یہ گویا اس بات
کا اعلان ہے کہ اُس نامقبول قانون کے تمام کاغذات جلا دیئے گئے۔ روم کی تاریخ
میں اس قسم کے نظارے جابجا دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ خود مختار قوموں کی
خصوصیات ہیں جن سے ہیں دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر تک
ہندوستانی زبان لفظ ڈسپلن سے آشنا نہیں ہوئی اس لیے کہ ڈسپلن کے حدود اختیار

صرف فوجی طبقہ میں تھے۔ یا کسی قدر پولس میں ہونگے۔ تعلیمگاہوں میں اس کا ورود دسمبر ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ کالج سے ہوا جبکہ طلبہ کے جذبات و احساسات کو حقیقی یا غیر حقیقی اسباب سے صدمہ پہونچا اور کئی مہینے تک ایک تلاطم برپا رہا اسوقت سے لیکر آج تک جس کو تقریباً آدھی صدی گذری ڈسپلن کی قوت برابر بڑھتی رہی یہانتک کہ اب ہندوستانی حیات کی کوئی منزل اور منزل کا کونہ کھدرا اس کی شدید گرفت سے بچا ہوا نہیں۔ خصوصًا تعلیمگاہوں پر اس کا مل تسلط ہے حقیقی تعلیم و تربیت کی ترقی میں یہ بہت بری طرح سنگ راہ

یہ ہمیں تسلیم ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک ضابطہ کی ضرورت ہے لیکن یہ کہ وہ ضابطہ کیسا ہو سیاسی رنگ سے خالی ہو یا اخلاص کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو یہی امر بحث طلب ہے اس پر ہم آیندہ مفصل بحث کرینگے۔ نفس ضابطہ میں نہ کبھی قدمائے مشرق و مغرب کو اختلاف ہوا اور نہ متاخرین یا زمانہ حال کے ذمہ دار طبقے کو اس سے انکار ہو سکتا ہے

گر مہر فلک گردی سر بر خط فرمان نہ
ور گوئے زمیں باشی وقف خم چوگان شو

صدیقی

حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور

جوائنٹ سکریٹری کانفرنس نے یہ اسکول ۹ اگست ۱۹۲۳ء کو دیکھا۔ خان بہادر حافظ محمد حلیم صاحب سوداگر کانپور کی فیاضی سے یہ اسکول قائم ہوا۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں صاحب موصوف کے روپیہ سے بیس ہزار کی لاگت سے حلیم ہوسٹل کے نام سے ایک وسیع بورڈنگ ہوس قایم ہے۔ رڑکی سے پیران کلیر شریف تک ایک پختہ سڑک جو چند سال ہوئے کہ بنی ہے وہ بھی آپ کی فیاضی کی شہادت دے رہی ہے۔

حلیم ہائی اسکول کانپور اب تک اپنی پرانی عمارت میں ہے مگر امید ہے کہ عنقریب وہ جدید عظیم الشان عمارت میں جو ڈیڑھ لاکھ کی لاگت سے تیار ہو رہی ہے منتقل ہو جائیگا۔ اس جدید عمارت میں اس وقت دس کمرے بالکل تیار ہیں۔ کمرے نہایت وسیع ہوادار اور شاندار ہیں

اسکول میں اس وقت تیسری سے دسویں تک دس کلاسیں ہیں انکے لئے معہ ڈرل ماسٹر کے چودہ اُستاد ہیں جنمیں سے تین گریجویٹ ایل۔ ٹی اور پانچ انٹرمیڈیٹ یا ٹرینڈ انٹرمیڈیٹ ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ تین سو روپیہ ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے اوستادوں کی تنخواہیں اسقدر ہیں کہ بالعموم اسلامیہ اسکولوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ ذرائع آمدنی سرکاری امداد۔ اعلیٰحضرت نظام دکن کی امداد۔ اور تاجران کانپور کا چندہ ہے۔ سالانہ آمد و خرچ اکیس ہزار سالانہ کے قریب ہے جو اسلامیہ اسکولوں کے لئے ایک غیر معمولی رقم ہے۔ البتہ تعداد طلبہ صرف اکیانوے ہے جو بایوس کن ہے اوسط مصارف تعلیم مدرسہ ۲۳۱ سالانہ یا ۱۹ ماہوار فی طالبعلم ایک ہیبت ناک رقم ہے مسلم یونیورسٹی معہ مضافات و ملحقات کے مصارف تعلیم اعلیٰ مدارج تک بھی بہت سخت ہیں۔ مگر یہ اوسط اس سے بھی زیادہ ہے۔ امید کہ جدید عمارت میں پہونچنے کے تعداد طلبہ بڑھ جائیگی۔ مولوی فضل الرحمٰن صاحب اسکول کے سکرٹری ہیں جو عرصہ سے اسکول کی مسلسل خدمت کر رہے ہیں اور اہل کانپور مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ امید کہ صاحب موصوف اپنے وسیع اور سابقہ تجربہ سے اسکول کو زیادہ مفید اور ہر دلعزیز بنائینگے۔ (طفیل احمد)

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپے گا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف [illegible] مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھیجنا چاہیے اور منی آرڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کردی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے ورنہ درخواست [illegible] اول پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین پر بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شائع ہو سکتے ہیں اجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ ہونا چاہیے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علیگڑھ

سلسلہ جدید جلد ۲
نمبر ۴

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۲۸

ستمبر ۱۹۲۳ء
صفر ۱۳۴۲ھ

کانفرنس گزٹ

یعنی

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

مرتبہ حامد علی صدیقی

جسمیں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصول تعلیم، نظام تعلیم مروجہ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر
تنقید کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولنا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبد السلام

مطبع فیض عام علی گڑھ مین طبع ہوا

(اور دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ سے شائع ہوا)

فہرست مضامین

عنوان	محرر	صفحات
ا۔ شذرات	اڈیٹوریل	۱ - ۵
تعلیم کا تنزل	حامد علی صدیقی	۱
بیکاری کی ترقی	- - -	۲
تعلیم کی عادت	- - -	۳
انگلستان میں مقصود تعلیم	- - -	۴
انگلستان کی تقلید	- - -	۵
مقام متنازعہ	- - -	۶ - ۱۵
ب۔ انعامی مضمون	مولوی نذیر احمد بی اے ہیڈ ماسٹر ڈی۔ بی سکول ظفروال سیالکوٹ	۶ - ۱۵
مقالات		
آواز اور اسکے نقائص	مولانا ابو الحسنات قرشی	۶ - ۲۱
قلمرو سخن	حامد علی صدیقی	۲۲-۲۵
عام تعلیم	مسلم	۲۶-۳۳
یکسوئی	مولوی سلطان احمد صاحب بالقابہ	۳۴-۳۹
ج۔ مسلم قدرت سکول	مولوی طفیل احمد صاحب جائنٹ سکرٹری	۴۰-
ملفوظات		۴۱-۴۷
اصلاح تمدن	حامد علی صدیقی	۴۸-۵۲
د۔ بندۂ شکم)	- - -	
خرقہ ہستی ۲	حامد علی صدیقی	۵۳-۶۰
تنقید و تبصرہ	مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی	۶۱ - ۶۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

تعلیم کا تنزل

آغاز عشرہ سوم (۲۱-۱۹۲۰) سے ملک میں تعلیم کا شوق برابر آگے بڑھتا گیا ہے۔ جس کا تقاضا ہے کہ ہر طرف سے بڑھ چلنے کا تقاضا ہے۔ تعلیم گاہوں اور طلبہ کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہے۔ کہنے کو مصارف عظیم ہی سرعت سے بڑھ رہے ہیں اگرچہ حقیقی مصارف اور واقعی ضرورتیں قرضہ کی گراں باری کی وجہ سے بالکل تشنہ ہیں۔ مثلاً انٹرمیڈیٹ کالج جن کو یونیورسٹیوں سے یک بیک کاٹ کر جدا کر دیا گیا ہے قطعاً بے سروسامان ہیں لیبوریٹری (معمل طبیعات) کا سامان لاکھوں روپیہ مانگتا ہے۔ خزانہ عامرہ کا یہ حال ہے کہ اس عشرہ میں حکومت کی میزانیہ کے دونوں پلے کبھی برابر ہی نہیں ہوئے ۱۹۲۰ء میں دو ارب بتیس کروڑ سے بھی زیادہ کا خرچ تھا حالانکہ پانچ سال پیشتر ۱۶-۱۹۱۵ء میں تقریباً سوا ارب کا خرچ تھا۔ آمدنی اس سے کہیں کم ہے دنیا کی سیاسی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ اس تفاوت کی وجہ سے ملکوں میں بڑے بڑے سانحے ہو گزرے ہیں قوموں کی مادی اور ذہنی ترقیاں بالکل مسدود ہو گئی ہیں۔ افلاس ام الجرائم ہے۔ مقامی حکام سب کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر ہندوستان کا دیوالیہ پن کچھ کرنے نہیں دیتا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی میدان میں اس

دکھاوے کی رستاخیز ہے اہل ہند حقیقی ترقی کا ایک قدم ہی نہیں بڑھا سکے۔

بیکاری کی ترقی

صوبوں کے سررشتہ ہائے تعلیمات کی سالانہ روداد یں شطرنجی نقشوں کے ذریعہ سے چاہے کیسے ہی سبز باغ دکھائیں لیکن ہمیں مستقبل کے میدان میں بہی بہتر امید کی جھلک نہیں دکھائی دیتی ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے اور اس تیرگی میں جا بجا زیادہ گہری تاریک اور بھیانک تصویریں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں! یہ کون اور کیا ہیں؟ یہ بیکار تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو ملکی اور منزلی زندگی کے ہر درجہ میں بھوکے پرندوں کی طرح منڈلاتے پھرتے ہیں اگر ہندوستان کی یونیورسٹیاں اپنے قلمرو میں ایک شاخ سبیل روزگار کی کھولکر بیکاروں کو دعوت دیں تو غالبا تعلیم کے ذمہ دار طبقہ کی آنکھیں کھلینگی اور انہیں کچھ اندازہ ہوگا کہ ملک میں بیکار نوجوانوں کی کس قدر کثرت ہے۔ خصوصاً مسلمانوں میں تو کچھ انتہا نہیں۔ مگر آج اس اہم مسئلہ کی طرف کوئی بہی التفات نہیں کرتا۔ حکومت سے لیکر اس سلسلہ میں ادنی امیر تک کی ضمیر اور عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ولایت میں امپلائمنٹ ایکسچینج کے نام سے مستقل محکمہ قائم ہے اودھر حکومت کے ذمہ دار افسر وقتاً فوقتاً نظر غائر سے دیکھتے رہتے ہیں کہ ابتدائی مدارس سے چودہ پندرہ برس تک کی عمر کے لڑکے کس تعداد میں ترک تعلیم کر کے چلے گئے اور اس طرح بیکار جماعت میں کتنا اضافہ ہوا۔ جس وقت یہ تعداد ایک خاص حد سے بڑھتی ہے تو تمام انگلستان میں شور مچ جاتا ہے سررشتہ تعلیمات اور وزارت حرفتکاری بیچین ہو جاتے ہیں اور جس طرح آڑے ترچھے ہو سکتا ہے اس تارک التعلیم گروہ کو بیکار جماعت میں شامل ہونے سے باز رکھتے ہیں۔ اگر کچھ بہی بن نہیں پڑتا تو ضمنی مدارس کی تعداد بڑھا دیتے ہیں تاکہ صباحیہ۔ نیمروزہ اور شبینہ مدرسوں میں جہاں کوئی مصارف تعلیم وغیرہ نہیں لئے جاتے ان لڑکوں کو مصروف کرلیا جائے۔ وجہ یہ کہ بیکاری کا بدترین عیب یہ ہے کہ قوم میں بداخلاقی اور شیطانی عادات پھیلا دیتی ہے۔ اور ملک کو کئی گئی تنلو سنکے

لئے قعرِ ذلت میں لا ڈالتی ہے۔

کیا ہم اپنے ممتاز برادرانِ ملت سے۔ ملکی ترقی کی دلدادہ جماعت اور ذمہ داران تعلیم سے بہ تعظیم مناسب پوچھ سکتے ہیں کہ کبھی ہفتہ کے سات دن یا برس کے بارہ مہینے میں ان میں سے کسی ایک کو ایک لمحہ کے لئے بھی ان ہولناک اسبابِ تنزل کا خیال پیدا ہوتا ہے؟ کیا بیکاری نے کبھی کسی قوم کی دولت زر یا دولت علم میں اضافہ کیا ہے؟ از دست تہی چہ آید و زشکم تہی چہ زاید،

تعلیم کی عادت

یورپ کے اہل قیاس نظام تعلیم کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں" ایک وہ جو ملک کا ذمہ دار طبقہ اہل ملک کے لئے وضع کر کے حکماً نافذ کرے اور دوسرا وہ نظام جو اہل ملک کی ضرورت رفتہ رفتہ خود بخود ایجاد کر دے۔ مگر ان کا خیال ہے کہ دونوں نظام ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ نہ پہلا نظام تعلیم اہل ملک کی خواہشات سے غیر متاثر ہے اور نہ دوسرا نظام ذمہ دار طبقہ کی مصالح ملکی کے خلاف واقع ہو سکتا ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ عموماً اہل ملک کا مطالبہ مقدم ہے جسکے سامنے اربابِ حل وعقد کی کچھ نہیں چلتی"

یہ محض ایک تخیل اور منطق ہے۔ میدان عمل اس سے مختلف منظر پیش کرتا ہے اہل ملک کو تعلیم کی خواہش ہو بھی نہیں سکتی جب تک ان میں علم اور جہل کے نتائج کا احساس پیدا نہ ہو۔ لیکن یہ احساس بھی ایک طرح کی تعلیم سے ہی پیدا ہوتا ہے خواہ وہ تعلیم باضابطہ نظام درسیہ کے تحت میں دیجائے یا اہل ملک تعلیم یافتہ طبقہ کی صحبت سے اور تعلیم کے مادی نتائج کے مشاہدے سے حاصل کریں۔ البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اربابِ حکومت قانون کے ذریعہ سے تعلیم کو لازمی کریں اور پھر کئی نسلوں کے بعد قوم کو تعلیم کی عادت ہو جائے۔ بغیر اسکے تعلیم کا مطالبہ جاہل قوم کی جانب سے قطعاً مجہول مطالبہ ہوگا اسلئے کہ وہ اس سے لذت آشنا ہی نہیں۔

انگلستان میں مقصود تعلیم

ولایت میں تعلیم عام کا مقصود الیکٹر یا رائے دہندگان کو تیار کرنا ہے جیسا کہ ہیر لویٹ نے "انگلینڈ سنس واٹرلو" صفحہ ۳۹ میں دعویٰ کیا ہے لیکن حکومت کی نوعیت کے متعلق ولایت کے تعلیمی نصاب میں ایک کتاب بھی نہیں اگر یہ جواب دیا جائے کہ تواریخ اسی مقصد کے لئے داخل نصاب کی گئی ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ گزشتہ تاریخ پڑھنے سے اس زمانہ کی سیاست کا حال معلوم نہیں ہو سکتا نہ مسائل حاضرہ پر عبور ہو سکتا ہے۔ اور جب یہ نہیں تو تعلیم سے حاصل کیا جب تک کوئی مسئلہ کتب نصاب کے ذریعہ سے طلبہ کے ذہن نشین نہ کیا جائے تب تک انکے عقائد بدل نہیں سکتے۔ یہ امر لازمی ہے کہ سیاست کی تعلیم نصاب میں مقصود بالذات ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی نظام مرتب کرتے وقت یا تعلیم کے آغاز تک نہ اہل ملک کا کوئی معین مقصد ہوتا ہے اور نہ ذمہ دار طبقہ کا۔ دونوں بغیر کسی منزل مقصود کے چل پڑتے ہیں اور برسوں راستہ ٹٹولتے ہوئے چلتے رہتے ہیں۔ پھر کہیں جا کے زمانہ اپنی ضرورتوں کو پیش کر کے تعلیم کا مقصد معین کرانا ہے۔

انگلستان کی تقلید

ہندوستان میں بھی ترقی کے دلدادہ جماعت انگلستان کے اصول پر اپنے برادران ملت کو دیہات میں اسی طریقہ سے خواندہ بنانا چاہتی ہے یعنی ہر ایک شخص سے فرداً فرداً پوچھتے ہیں کہ تمہیں کوئی گیت یاد ہے پھر اسی گیت کو ناگری میں لکھکر اُسے حرف شناس کر دیتے ہیں یونہی رفتہ رفتہ وہ شخص نوشت و خواند میں شد بد حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ وہ بہت جلد ووٹر بنجائیگا۔ لیکن حسن اتفاق سے ووٹر بننا اور بہت سی جزئیات پر مشروط ہے جو ووٹ کے پرچہ پر محض نام لکھ دینے سے بہت ہی زیادہ مشکل ہیں۔ بہر حال اس طرز تعلیم کے موجدوں کا یہ خیال صحیح ہے کہ جبری تعلیم ملک میں اس قدر جوں کی چال سے ترقی کر رہی ہے کہ برسوں بعد کوئی معتد بہ نتیجہ نکل سکتا ہے اور اس تدبیر سے اگلے انتخاب تک کثیر التعداد ووٹر پیدا ہو جائینگے۔ مگر

لطف یہ ہے کہ انگلستان میں تو پروفیسر اور لیکچرار مسائل مندرجہ نصاب کی تشریح کرتے ہوئے سیاسی نکات ضمناً بیان بھی کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مدارس میں یہ گناہ کبیرہ یا جرم سنگین ہے۔ یہاں مدارس میں تعلیم کا کچھ منشا ہی نہیں ہے۔ امراء کے لئے تعلیم کا مقصد ہے دماغی عیاشی۔ در دربار تک رسائی پیدا کرنا یا اپنی سطوت و جبروت کو قائم کرنا متوسط طبقہ کی تعلیم زیادہ تر ملازمت حاصل کرنیکے لئے ہے یا شاید خود حکومت کے لئے ان کو تعلیم دینا مقصود ہو۔ تاکہ اپنے دفتروں کو اس طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد سے آراستہ کر سکے۔

مقام متنازعہ

اب رہا عوام الناس کا طبقہ جس کی تعداد ملک میں نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ حکومت اور احرار کے درمیان میں یہی متنازعہ فیہ ہیں۔ اگر یہ قلعہ جبری تعلیم کے نظام جدید کے ذریعہ سے حکومت کے ہاتھ آگیا تو گویا احرار ایک دو صدی کیلئے میدان دے بیٹھے، وجہ یہ کہ تعلیم کا نصاب بالکل حکومت کے اختیار میں ہے خصوصاً ابتدائی تعلیم کی کتابوں میں ہر صفحہ پر سیاسی پولیسی کی مہر لگی ہوئی ہے اور یہ فرزانہ حکومتوں کا دستور بھی ہے کہ جب اپنی ہستی کو محل خطر میں دیکھتی ہیں تو تعلیم خاصکر ابتدائی اور ثانوی مدارج کو سخت گرفت میں لیکر نصاب کے ذریعہ سے نوخیز نسلوں کو اپنا عقیدت گزیں بناتی ہیں اور اگر احرار نے قومی مدارس کے ذریعہ سے عوام الناس کے قلعہ پر قبضہ کرلیا تو موجودہ نظام حکومت کا اللہ حافظ ہے۔ عوام الناس کے جوش و جذبات کو جب کبھی بے محابا حرکت ہوئی ہے تو زمین کی کوئی قوت اسکے سامنے نہیں ٹھیری۔ اس سلسلہ میں چیف جسٹس بمبئی ہائیکورٹ کا فیصلہ بہت ہی معنی خیز ہے اور آئندہ کی ہوا کا رخ بتاتا ہے اسکی روسے کوئی والدین جبری قانون کی حد میں مجرم نہیں گو کہ وہ اپنے بچہ کو سرکاری مدرسہ کے بجائے کسی قومی درسگاہ میں تعلیم دلاتے ہیں۔ عالی مقام جج نے قومی درسگاہ کی تعلیم کو سرکاری پرائمری اسکول کے ہمرتبہ و ہم پلہ تسلیم کیا ہی کیا اور صوبونکی عدالتوں میں یہ نظیر پیش نہیں ہوسکتی۔ یہ درست ہے کہ نظائر میں اکثر ہائیکورٹ مختلف الرائے ہوتے ہیں، ایکدوسرے کا اتباع کرنے پر مجبور نہیں لیکن اس نظیر سے

انعامی مضمون

بچوں میں حصول علم کا شوق اور عمدہ اخلاق انعام کے لالچ سے پیدا کرنا بہتر ہے یا بغیر انعام کے اور بہتر صورت کیا ہے۔

اس حقیقت سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بچوں کو تعلیم دیتے وقت ایک قابل استاد کا پہلا فرض یہ ہے کہ ان کی مختلف طبائع کا خیال رکھے۔ یعنی استاد کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو اپنے شاگردوں میں سے ہر فرد کے مزاج کے مطابق بنائے یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ بچے اپنے ہر فعل کے ساتھ ایک نہ ایک فوری مقصد بھی ضرور رکھتے ہیں جسکو وہ بہت جلد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ابتدائی جماعتوں میں جب استاد بچوں کو تعلیم دیتا ہے تو ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو ایک دو دفعہ کا کہلایا ہوا سبق یاد رہتا ہے بعض کو پانچ چھ دفعہ سبق کہلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر بعض کو دس بارہ دفعہ سبق کہلانا پڑتا ہے۔ بعض بچے ایسے ہوتے ہیں۔ جن کو سبق بہت جلد یاد ہو جاتا ہے لیکن بھول بھی ویسی ہی جلد جاتے ہیں بعض کو سبق دیر میں یاد ہوتا ہے لیکن پھر بھولتے ہی نہیں یا بہت دیر کے بعد بھولتے ہیں پھر بعض کو یاد بھی جلدی ہو جاتا ہے اور بھولتا ہی نہیں یا بہت دیر کے بعد بھولتا ہے بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے اکثر ہم جماعتوں سے سبق لیکر جلد یاد کر لیتے ہیں استاد کو سبق کہلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تعلیمی ترقی کرتے ہیں لیکن جب ان کا طریقہ تعلیم بدل دیا جاتا ہے تو بہتر نتائج کا ظہور ہوتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک استاد اپنے دلچسپ طریقہ تعلیم کے ذریعہ سے ہر قسم کے بچوں میں تحصیل علم کی قابلیت اور شوق بہت جلد پیدا کر کے روز افزوں تعلیمی ترقی دکھاتا ہے۔

جب کوئی استاد پہلی جماعت کے بچوں کو حروف تہجی کے طریقہ سے تعلیم دیتا ہے تو

ان کا فوری مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یا یوں کہو انہیں تسکین نہیں ہوتی۔ ان کے لئے حروف بالکل اشیائے مجہول ہیں۔ جن میں قطعاً دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو رٹ رٹ کر تھک جاتے ہیں اور ساتھ ہی بددل بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب ایک قابل اُستاد بچوں کی تعلیم "بین و گو"، یعنی مشاہدہ و عمل کے طریقہ سے شروع کراتا ہے تو بچے بخوشی متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ اس طریقہ سے ان کو وہی الفاظ اور فقرے شروع کرائے جاتے ہیں جو وہ روزمرّہ سُنتے اور بولتے ہیں۔ ان حروف کا بولنا اور سُننا اُن کے لئے اشیائے مجہول کے بجائے اشیائے معروف کا علم تھا جن کا صرف پڑھنا نامعلوم تھا۔ الغرض جب طریقہ تعلیم بدل دیا جاتا ہے اور پہلے حروف تہجّا کی تعلیم کے بجائے جو ان کے لئے اجنبی اشیا رہیں، بین و گو طریقہ سے الفاظ اور فقرے پڑھنا سکھایا جاتا ہے تو وہ شوق سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں فوری مقصد پورا ہو جاتا ہے اور وہ انہی الفاظ و فقرات کا پڑھنا سیکھتے ہیں جو ان کو پہلے سے معلوم ہوتے ہیں یہ تجربے میں آیا ہے کہ جو طالبعلم حروف تہجی کے طریقہ سے پڑھتے ہیں بہت کم ترقی کرتے ہیں لیکن بین و گو طریقہ سے اسقدر اچھے نتائج ظہور میں آئے ہیں کہ دیکھنے اور سُننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔

چونکہ "حروف تہجی" کا طریقہ "نامعلوم" سے "نامعلوم" کی طرف لیجاتا ہے اسلئے وہ وضع فطرت کے مطابق نہیں ہے بچونکے لئے گویا نئے الفاظ اور فقرات کا پڑھنا "نامعلوم" ہوتا ہے جس کی بنیاد حروف کے "نامعلوم"، ذخیرہ پر قائم ہوتی ہے لہذا تعلیمی میدان میں گویا بچوں کو مجہول سے مجہول کی طرف سفر کرنا پڑتا ہے۔ جس سے کچھ بھی ترقی نہیں ہوتی اگر اس طریقہ کا دوسرا پہلو دیکھا جائے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے ہم طلبا کو "نامعلوم"، حروف سے پڑھانا شروع کراتے ہیں اور پھر ان الفاظ کا پڑھنا سکھاتے ہیں جو باوجودیکہ بحیثیت تحریری الفاظ کے تو نامعلوم ہی ہیں لیکن ان اشیاء کے ضرور قائم مقام ہیں۔ جن سے وہ پہلے آشنا ہیں اور جن کو وہ پہلے بول اور سُن چکے ہیں

لیکن "نامعلوم" سے "معلوم" کی طرف جانا کوئی تعلیمی اصول نہیں ہے تعلیمی اصول "معلوم" سے "نامعلوم" کی طرف بڑھنا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ طریق "بین وگو" کو طریق "حروف تہجی" پر ترجیح دیجائے۔ کیونکہ "بین وگو" طریقہ میں "معلوم" سے "نامعلوم" کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ یہ بچوں کے عام مزاج کے مطابق ہے۔ قدرتی ہے۔ دلچسپ ہی اس سے بچوں کا فوری مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

"طریق تہجی" روکھا طریقہ تعلیم ہے۔ اس میں "علم کو علم کی خاطر حاصل کرنے" کے اصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اور اگرچہ یہ ایک سنہرا اصول ہے مگر بچوں کے لئے اس سے کسی استفادے کا خیال غلط فہمی ہے۔ اس طریقہ میں یہ لازم آتا ہے کہ حصول علم کا شوق بچوں میں انعامات کا لالچ دیکر پیدا کریں۔ طریق "بین وگو" جس کے نتائج مسلمہ طور پر "طریق تہجی" سے کہیں بہتر ہیں بچوں کو ان کے مزاج کے مطابق ہونے ان کے لئے دلچسپی مہیا کرنے اور ان کا فوری مقصد پورا کرنے کی متعدد شکلوں میں انعام عطا کیا کرتا ہی جس سے بچوں کو تحصیل علم کا شوق نسبتاً بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ اس حقیقی انعام کی خوشی میں زمانہ مابعد میں "علم کو علم کی خاطر حاصل کرنے" کے لایق ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ انہیں حصول علم کا شوق بغیر رسمی انعام کے پیدا ہوجاتا ہے۔

یہ کچھ خلاف فطرت نہیں کہ جب بڑے آدمی اپنی بعید اغراض پورا کرنے کے لئے کام کرتے ہیں تو بچے فوری مقاصد حاصل کرنے کے لئے کام کریں۔ بہرصورت بڑا ہو کہ بچہ ہر فرد بغیر غرض کام نہیں کرتا۔ وہ غرض ہی گویا ایک انعام ہے۔ چھوٹے بڑے سب ہی لالچ سے کام کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو بغیر انعام کے لالچ کے کوئی کام کریں اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ایک قانون قدرت ہے کہ انعام کے لالچ سے لوگ کام کیا کریں اور اگر ایسی تحریک نہ ہو تو بہت کم کام کرتے ہیں۔

جو لوگ بعید اغراض کے لئے کام کرتے ہیں ان کے افعال بظاہر لالچ بغیر سرزد

ہوتے معلوم ہوتے ہیں لیکن درصل ان کی تہہ میں بھی لالچ کا ہاتھ اسی طرح زبردست کام کرتا ہے جس طرح ان لوگوں کے افعال کی تہہ میں کام کرتا ہے جو صاف طور پر انعام کے لالچ سے مصروف کار رہتے ہیں۔

انسان کی نماز اور بندگی بھی بغیر انعام کے لالچ کے نہیں ہوتی۔ اور نہ کبھی کوئی نیکی محض نیکی کی غرض سے واقع ہوتی ہے جو شخص علم کو علم کی خاطر حاصل کرتا ہے وہ صرف اس حد تک ایسا کرتا ہے کہ اسے اپنے کسی فوری مقصد کے پورا ہونے کی امید نہیں ہوتی پھر بھی وہ اس خیال سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اس حصول علم کی تہہ میں علم جیسی زبردست طاقت پر قابو حاصل کرنا مقصود ہے۔ پس اگر وہ یہ خیال بھی رکھتا ہے تو بھی وہ گویا حصول علم کی مشقت کو انعام ہی کے لالچ سے دن رات برداشت کرتا ہے۔ کیونکہ علمی طاقت کو قابو میں لانا بھی ایک انعام ہے۔

ایک شخص اپنے بچوں کو انعام کے لالچ سے گیت زبانی یاد کرایا کرتا تھا۔ اور ہر گیت کے لئے فی کس ایک آنہ انعام دیا کرتا تھا۔ نیچے اس ترغیب سے خود بخود صحیح صحیح گیت زبانی یاد کر کے خوب سناتے تھے۔ اسی طرح اور والدین بھی مفید تعلیمی نتائج ظاہر ہوتے دیکھکر اپنے بچوں کو انعام کا لالچ دیکر تعلیم میں بڑھا سکتے ہیں۔ اسکول کی زندگی میں تو انعام جیسی قوت متحرکہ بہت ہی ضروری ہے اسکول کا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول ترقی یہ ہے کہ طلبا احساس فرض کے جذبہ سے تعلیم حاصل اور حسن اور نیک افعال ظاہر کریں۔ مگر فطرتاً احساس فرض بہت ہی کم ہوتا ہے اور تربیت و استقلال کے لئے سعی بلیغ کا محتاج ہوتا ہے بچوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جن کے قوٰی ابھی نشو و نما کی پہلی ہی منزل میں ہوتے ہیں بڑے آدمی بھی فرض کے احساس سے بہت کم کام کرتے ہیں۔ کام کو کام کے لئے کرنا اگر دنیا میں مفقود نہیں ہے تو خال خال ضرور ہے۔ اکا دکا کوئی فرد ہوگا جو ظاہر میں اپنے کاموں کو فرض شناسی کی بنا پر انجام دیتا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ایسے شاذ و نادر افراد کے

لئے بھی باطن میں کوئی قوت محرکہ انعام کے ہم پلہ موجود ہو۔ خلاصہ یہ کہ بچے ضرور انعام کے لالچ سے کام کرتے ہیں پس چاہیے کہ ہم بھی انعام کے لالچ سے بچوں میں حصول علم کا شوق اور عمدہ اخلاق پیدا کرنے سے گریز نہ کریں۔ انعام کے لالچ کے بغیر بچے فطرتاً کام نہیں کر سکتے۔ کیونکہ "کام کو کام کے لئے کرنے" کا میلان تب پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اخلاقی احساس کی کچھ تربیت ہو چکی ہو اور حالانکہ اخلاقی حس کی نشوونما کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں۔ مانا کہ "کام کو کام کے لئے کرنے" کا میلان بچوں میں پیدا کرنا ہمارا ہی سب سے پہلا فرض ہونا چاہیے جس کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے مگر اس کی تہہ میں بھی انعام کے لالچ کے ہم پلہ کوئی جذبہ مخفی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اعلیٰ سے اعلیٰ جذبہ یا قوت محرکہ موجود ہو تو عقلمندی اس میں ہے کہ ہم کسی اور ہم پلہ محرک قوت سے بچوں کے اخلاق کی تربیت کریں۔ ورنہ ان کے جوہر یا تو گل سڑ جائینگے یا ضلالت کے راستہ کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ پس یہ دوسرے درجہ کا محرک جو اس وقت بچوں کے لئے مشعل راہ ہوتا ہے "انعام کا لالچ ہے"۔

"انعام کا لالچ" کی اہمیت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سے ہر روز دعا میں کہلاتے ہیں کہ "اے پاک پروردگار ہمیں ان لوگوں کا رستہ دکھائیو جن پر آپ نے انعام کیا" ظاہر میں ہم جو عبادت کرتے ہیں اس سے فوری مقصد بہت کم پورا ہوتا ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مطلقاً نہیں ہوتا۔ ایسے بہت لوگ ہیں جو یہ نتیجہ بھی نکال لیتے ہیں کہ عبادت کرنے والے "عبادت کے لئے" عبادت کرتے ہیں لیکن ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ جب خدائے پاک خود فرماتے ہیں کہ ہمیں ہماری عبادتوں کا اجر ملیگا تو عبادت کرنے والے بھی ضرور انعام کی ہوس سے عبادت کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عموماً بڑے آدمی تو دور کی اور نزدیک کی دونوں غرضوں سے کام کرتے ہیں لیکن بچے عموماً نزدیک کی غرض سے کام کرتے ہیں۔ اس سے لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ بڑے تو "کام کو کام کی

غرض سے " کرتے ہیں اور چھوٹے کسی خاص انعام کی غرض سے کام کرتے ہیں۔ دراصل سب غرض ہی کے بندے ہوتے ہیں اور "انعام کے لالچ " کے آدمیوں کا راج عالمگیر ہے۔

کم سے کم اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ بچے طبعاً " انعام کے لالچ " سے کام کرتے ہیں اور ان میں حصول علم کا شوق اور عمدہ اخلاق انعام کے لالچ سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

جو کام بچے بغیر انعام کے لالچ کے کرتے ہیں وہ کھیل کود ہے جو نہ تو عمدہ اخلاق ہے اور نہ حصول علم کا شوق ہے۔ گو بالواسطہ ان دونوں کے لئے مفید ہی۔

بچے کا ذہن پیدا ہوتے ہی طبعی میلان ظاہر کرتا ہے جسکی مقدار شروع میں تو بہت قلیل ہوتی ہے لیکن بعد میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک بچہ کی زندگی میں سب سے پہلی طبعی رغبت چھاتی کو چوسنا ہے جس وقت اُسے دودھ پلاتے ہیں وہ بہت خوش ہوتا ہی لیکن جس وقت دودھ اس کے مُنہ سے ہٹایا جاتا ہے وہ بہت رنجیدہ معلوم ہوتا ہی۔ اس وقت صاف طور پر دودھ کو دوبارہ حاصل کرنے کا میلان بچے میں دکھائی دیتا ہی۔ جوں جوں بچے بڑھتے جاتے ہیں ان کی طبعی رغبت بڑھتی رہتی ہے بعض رغبتیں ہم پسند کرتے ہیں اور بعض کو ناپسند۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی اور اخلاقی معیار کے مطابق ان رغبتوں کو ڈھال لیں۔ تاکہ جو افعال بچوں سے وقوع میں آئیں وہ ایسے ہوں جن میں حصول علم کا شوق اور پسندیدہ اخلاق کے اعمال پائے جائیں، دیکھنا یہ ہے کہ کیا ناپسندیدہ میلان کو پسندیدہ میلان میں تبدیل کر سکتے ہیں؟ کیا قدرت اس معاملہ میں ہماری معاون ہے یا مانع؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم بچوں کی نیک رغبتوں کو ہمیشہ نیکی کی جانب ترقی کرتے ہوئے دیکھیں، اور کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جب ہم بچوں کے ایک ناپسندیدہ رغبت کو بدل چکیں تو وہ پھر دوبارہ وہ راستہ اختیار نہ کرنے پائے رنج و راحت کے قانون کی مدد سے بچوں کی طبعی رغبت میں بہت کچھ تغیر ہو سکتا

ہے۔ جب ایک ناپسندیدہ فعل کے ارتکاب پر ایک باپ اپنے بچے کو مناسب سزا دیتا ہے تو وہ اس غرض سے ایسا کرتا ہے کہ بچے کی ناپسندیدہ رغبت مفقود ہو جائے اور اس کی بجائے اس کے بالمقابل پسندیدہ رغبت اس میں پیدا ہو جائے۔ گھوڑوں کا سدھانیوالا جب ایک گھوڑے کو ایک قسم کل کرتب دکھانے کے بعد ایک کھانڈ کی ڈلی دیتا ہے۔ تو وہ اس لئے ایسا کرتا ہے کہ گھوڑے کو اس بات کا شوق پیدا ہو کہ ہمیشہ ایسا کام کیا جائے کہ جس کا نتیجہ انعام ہو۔ بچپن میں ذہن مڑ تڑ سکتا ہے۔ ایک ناپسندیدہ میلان انعام کے لالچ سے پسندیدہ میلان میں تبدیل ہو جاتا ہے زمانہ مابعد میں وہ عمل کثرت مشق سے پختہ عادت کی شکل سہولت سے اختیار کر لیتا ہے۔ اور عادت دوسری طبیعت ہوتی ہے فعل مذموم ہمیشہ کے لئے فعل محمود میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بعد میں اگر انعام کا سلسلہ بند بھی کر دیا جائے تو بھی فعل محمود وقوع میں آتا ہے اور ایک عادت بن کر سہولت کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں میں حصول علم کا شوق اور پسندیدہ اخلاق انعام کے لالچ سے پیدا کرنے کی کوشش کرنا قدرت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے لیکن اس سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ یہ معاملہ ہر طرح سے سادہ نہیں ہے۔ اس اصول کے استعمال میں بہت سمجھ کی ضرورت ہے۔ فرض کرو کہ ایک بچہ میں ایک بُری عادت ہے اس کا بہتر تدارک یہ ہے کہ اُسے عمل شنیع کے بدلہ میں تکلیف بھگتنے دیں۔ بچہ پھر اس کا ارتکاب نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب میں ایسا کرنے سے باز رہونگا تو میرا یہ انعام ہوگا کہ تکلیف سے بچا رہونگا۔ لیکن ممکن ہے کہ بچے کو بعض ایسے موقعے ملیں کہ وہ اپنی بُری عادات کو بے کھٹکے عمل میں لا سکے۔ یعنی جب نہ کوئی انعام دینے والا سر پر ہے اور نہ اُس کی بُری عادت کے بجائے نیک عادت پختہ ہوئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک کام کی رغبت مسلسل بیکار اور معطل رہنے کے سبب سے مردہ ہو جاتی ہے اور اس کے بالمقابل میلان جو اسکی بجائے

پیدا کیا گیا ہے کثرت استعمال سے عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انعام مناسب ہونا چاہیئے اور جب تک پسندیدہ میلان اچھی طرح جاگزیں ہو جائے تب تک بری رغبتوں کی تبدیلی کے درپے رہنا چاہیئے۔ بعد میں نیک میلان محکم طور سے جگہ پکڑ لیں گے اور بغیر انعام کے اپنے کرشمے دکھاتے رہیں گے اور بد میلان ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جائینگے۔

پھر بھی بعض کا یہ خیال ہے کہ ہمارے ضبط سے اگرچہ بچوں کے افعال شنیعہ کچھ عرصہ کے لئے رُک جاتے ہیں۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناپسندیدہ میلان کی بیخ کنی بھی ساتھ ہی ہو جائے، اور اگرچہ انعام کے لالچ سے نیک اعمال کا اظہار بچوں میں پیدا کیا جا سکتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اُن میں پسندیدہ میلان بھی پیدا کر سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بری عادتیں بعض اوقات بچوں میں دوبارہ ظاہر ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ان میں اس قسم کی رغبتوں کا تخم موجود ہے یہ اعتراض ایک حد تک درست ہی۔ ایک باپ اپنے بیٹے کی سگریٹ نوشی کی عادت چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ جب اسکو سگریٹ پیتے دیکھتا ہے تو اسے سزا دیتا ہے بیٹا یہ خیال کر کے کہ اگر میں سگریٹ نہ پیوں تو یہ میرا انعام ہوگا کہ میں سزا سے بچ جاؤنگا۔ وہ سگریٹ پینا بند کر دیتا ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سگریٹ نوشی کا شوق قطعاً مفقود ہو گیا ہے بلکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے باپ سے دُور ہو کر سگریٹ پہلے سے بھی زیادہ شوق کے ساتھ نوش کرے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی بات وجہ تسلی ہے تو صرف یہ ہے کہ "فعل کے ترک سے اس فعل کی رغبت بھی مردہ ہو جاتی ہے" ممکن ہے کہ سگریٹ پینے کی مشق کے کم ہو جانے سے سگریٹ پینے کا میلان بھی کم ہو جاتا ہے اور پھر اس مشق کے کچھ مدت چھٹ جانے سے برا میلان بھی بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جزا سزا میلان کے مطابق ہونی چاہیئے۔ وہ نہ صرف یقینی ہونی چاہیئے۔ بلکہ ماحول اور حالات گرد و پیش ایسا پیدا کرنا چاہیئے کہ کچھ عرصہ کے لئے بچوں کو برائیوں کی جانب دوبارہ مائل ہونے کا ہرگز موقعہ نہ ملے

یونہی شدہ راہ راست پر چلنا آسان ہو جائیگا۔ بچے پھر کبھی نہیں ڈگمگائینگے۔ نئی نیک عادتیں ایسی پختہ ہو جائینگی جیسی کہ پرانی بد عادتیں تھیں۔ طبعی میلان اور اکتسابی میلانیں بالکل کوئی تمیز نہ رہیگی۔ کہا جاتا ہے کہ عادت طبیعت ثانی ہوتی ہے۔ نقل اور اصل میں کچھ فرق نہیں رہتا۔

حسن ظن سے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ یہ ہر بچے کا میلان ہوتا ہے کہ اُسے نیک کہا جائے اور جو کام وہ کرے اس کی داد دیجائے۔ جب ایک بچہ ایک نیک رغبت ظاہر کرتا ہے خواہ وہ میلان حصول علم سے متعلق ہو یا عمدہ اخلاق سے بہرصورت ہمیں چاہیے کہ ہم اس کی تعریف کریں۔ اس سے اس کا نیک میلان خاطر بہت زیادہ پختہ ہو جاتا ہی جب شروع شروع میں ہم بچے کو مائل بہ نکوئی خیال کرکے اسکو ہر حسن عمل پر مناسب طریقے سے آفرین کہتے ہیں تو وہ ہمارے حسن ظن کے مطابق کام کرنے کی کوشش کرکے ہمیشہ کیلیے مبدر افعال حمیدہ بن جاتا ہے، ہماری اس ترغیب سے نہایت خوشگوار نتائج نکلتے ہیں۔ گویا بچے ہمارے مشورہ سے ہماری مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ انکے نیک افعال ایک بڑی حد تک آزادانہ واقعہ ہوتے ہیں۔ مگر اس حالت میں بھی جو تعریف ہماری طرف سے ہوتی ہے انعام ہی کی ایک صورت ہے جو زمانہ مابعد میں گو کم ہوتے ہوتے کالعدم ہو جاتی ہے مگر بچے پھر بھی نیک افعال ظاہر کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کا میلان خاطر نیکی کی جانب مستقل طور پر قائم ہو جاتا ہے۔ سچ ہے کہ مشق سے ہر ایک قسم کی رغبت نشو و نما پاتی اور بڑھتی ہے۔

ایک بد عادت عمل کی کمی سے بہت بڑی حد تک رُک سکتی ہے اور آخر کو وہ وقت آ پہونچتا ہے کہ رغبت بد بالکل مردہ ہو جائے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ صحبت کا اثر بہت ہوتا ہے۔ لیکن اس اصول سے کام لینا آسان نہیں ہے۔ اپنی سادہ صورت میں یہ اصول یہ مطلب ظاہر کرتا ہے کہ اگر ہم ایک بد شخص کو ایک نیک شخص کے پاس زندگی بسر کرائینگے تو بد شخص نیک ہو جائیگا۔ لیکن چونکہ اس کی ایک دوسری صورت بھی ہے کہ جس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ

ایک نیک شخص ایک بدشخص کی صحبت میں رہ کر بد ہو جائے اسلئے ضرورت ہے کہ اس بچے کو جس میں حصول علم کا شوق نہیں ہے یا جس کا اخلاق اچھا نہیں ہے۔ ایسے نیک بچے کی صحبت میں رہنے کی ہدایت کریں جس کی عادتیں مستقل طور پر نیک ہو چکی ہیں۔ پھر بھی معاملہ اس جگہ نہیں ٹھیر جاتا بلکہ ہمیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ بدخلق اور نالائق بچے سے اس حد تک قبیح افعال نہ سرزد ہوتے ہوں کہ اُن سے یہ بات ثابت ہو کہ ان افعال شنیعہ کا مادہ یعنی رغبت بدستقل طور پر جڑ پکڑ چکی ہو۔ سچ پوچھیئے تو "الصحبت موثر" کے اصول پر حقیقی معنوں میں اس وقت کاربند ہو سکتے ہیں جب ہم مندرجہ بالا تدابیر سے بچے کو ایسے بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے دیں جو اس سے زیادہ مستحکم نیک عادات رکھتے ہیں جب ہم اس طرح سے اس کے لئے نیک صحبت کے اسباب پیدا کر دیں گے تو گویا یہ اس کے لئے ایک لحاظ سے انعام ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے نیک اعمال سے خوشی حاصل کرکے آزادی سے خود بخود ایسے رفیقوں کی تلاش میں ہوگا کہ جو اسکے نیک اعمال کے سرزد ہونے میں مدد دیں۔ ہماری نصیحت کارگر نہیں ہوتی اسلئے کہ ہم نصیحت لینے والوں کے حالات سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ پہلے ہمیں نصیحت حاصل کرنے کا میلان دوسروں میں پیدا کرنا چاہیئے بعد میں انکو نصیحت کرنی چاہیئے

خاکسار

نذیر احمد بی اے، ہیڈ ماسٹر ڈی بی اسکول
ظفروال۔ ضلع سیالکوٹ

مقالات

آواز اور اُس کے نقائص

بعض نظارے اور مشاہدے اسقدر تلخ ہوتے ہیں کہ نہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور نہ لکھنے کو قلم اٹھتا ہے۔ مثلاً چالیس پچاس بھولے معصوم بچوں کی جماعت سامنے لیکر بعض رعب اور سیاست کے دلدادہ اُستاد اسقدر کھردری اور وحشیانہ آوازیں نکالتے ہیں کہ گویا ایک بگڑا ہوا چیتا ہے کہ بھیڑوں کے گلہ پر غراتا ہے۔ حالانکہ بچوں کی تعلیم کا مؤثر ذریعہ جس قدر کان ہیں اس قدر آنکھیں نہیں۔ بچوں پر لچک دار آواز اور میٹھی زبان سے بہت زیادہ اثر ڈال سکتے ہیں۔ غضبناک لہجہ سے انکے آئے ہوش گم ہوجاتے ہیں اور ان کو بھی دریدہ دہنی سے بولنے کی عادت ہوجاتی ہے۔

خوش آوازی بھری ہوئی آواز اور صاف لب ولہجہ میں صحت کو بہت بڑا دخل ہے مضمحل ضعیف الجثہ اور دائم المریض کی آواز بھی ناقص ہوتی ہی صحت کے بعد دوسرا درجہ سانس پر قابو رکھنے کا ہے پھر جذبات کی بیٹری بھی زوردار ہونی چاہیئے پھر سیکھنے اور نقل اُتارنے کی اُمنگ بھی ہونی چاہیئے۔ نیز نطق وزبان کی قوت جن جن آلات سے اُبلتی ہے وہ بھی فطرتی جوہر سے مالامال ہونے چاہئیں۔ با ایں ہمہ تربیت وتعلیم اور صحبت بغیر آواز کا اصلی جوہر نہیں نکلتا اور یہ تمام صفات ایک قیمتی دفینہ کی طرح مٹی میں دبی ہوئی پڑی رہتی ہیں۔ یا جنگل کی خودرو گھاس کی طرح بے قرینہ اُگتی ہیں۔

ہمارے زمانہ کے ماہران تعلیم وتربیت کو اب بلاحجت تسلیم کرلینا چاہیئے کہ کسی درجہ تعلیم میں آواز کے نشوونما اور اصلاح بھی داخل نصاب کی جائیں تو عیاشی نہ ہوگی بلکہ ایک شدید ضرورت پوری ہوگی۔ اس فن کے ماہر طلبہ کو سکھائینگے کہ گہرا سانس لینے کی

قوت کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ زبان۔ جبڑے اور ہونٹ اور گلے کا نظام کس طرح قابو میں آکر آواز کو لچک دار بنا دیتے ہیں پھر منہ سے صاف اور ٹکسالی آواز نکلتی ہے اور انکی مدد سے صحیح تلفظ کے مسلسل جملے بن کر باتیں سننے والوں کے لئے ایک جادو پیدا کر دیتے ہیں۔

حروف

حروف کی دو قسمیں ہیں۔ علت اور صحیح جسکو سب جانتے ہیں۔ زبان خواہ انگریزی ہو یا اردو، فارسی، دونوں کے حروف علت اسی ایک ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں یعنی سانس یا آواز پر۔ صحیح اور علت کے ادا کرنے میں فرق یہ ہے کہ حرف علت کا مرکب ٹھیرے ہوئے قدموں سے بے روک چلا جاتا ہے۔ لہذا حروف علت کو ادا کرنے میں سانس پر پورا قابو ہونا لازمی ہے۔ اسکے خلاف حرف صحیح ادا کرنے میں سانس کا مرکب جا بجا ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مثلاً کبھی دانتوں سے ٹکر کھاتا ہے۔ کبھی ہونٹ اور کبھی زبان سے۔ گویا حنجرہ سے لیکر ہونٹوں تک دہن میں جس قدر مقامات جن جن حروف صحیحہ کے مخارج تصور کئے جاتے ہیں وہ حروف ان ان مقامات سے ٹکر کھا کر ختم ہوتے ہیں۔ حروف علت کی طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار بے روک نہیں چلے جاتے ہیں۔ آ آو۔ ای۔ سب میں آواز کو جتنا چاہو دراز کر لو۔

مدارج آواز

گانے کے گلے اور آواز کا بھی یہی حال ہے آواز کا مدوجزر تین بڑے درجوں پر منقسم ہے جنہیں سُر کہتے ہیں۔ آ۔ کھرج۔ ناف سے نکلکر پھیپھڑوں کی مدد سے حنجرہ کے ہونٹوں کے بیچ سے بہ آسانی گزر کر مسلسل نکلتا چلا جاتا ہی آ۔ پنچم۔ سینہ سے نکلکر اور حنجرہ کے ہونٹوں سے کسی قدر زیادہ زور سے نکلتا ہی۔ آ۔ دیوت سب سے باریک اور اونچا درجہ جو دماغ سے ناک کی مدد سے نکلتا ہے۔ اور حنجرہ کے ہونٹوں سے بمشکل تمام گزرتا ہے آواز کے ان تینوں درجوں کے ملانے کے لئے پندرہ شبد کم سے کم اور وضع کئے گئے ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ ان درجوں کی کوئی انتہا نہیں۔ کم سے کم کل بائیس درجے تو ضرور ہی ہیں۔

تقریر کرنے میں عموماً آواز کو کھرج درجہ پر رکھتے ہیں اور اگر پھیپھڑے طاقتور اور مجمع کثیر ہے تو بعض صحیح الجثہ بہت بہت دیر تک پنچم درجہ پر آواز کو رکھ سکتے ہیں۔ اس سے تقریر مؤثر اور دلکش ہو جاتی ہے۔

کمزور آواز

نطق اور گویائی کے آلات میں ایک وجہ کمزوری کی یہ بھی ہے کہ بولنے والا طبعاً جوش و جذبہ سے خالی ہوتا ہے۔ یہ کچھ عمر پہ منحصر نہیں۔ نہ بہت زیادہ قوائے جسمانیہ پر منحصر ہے۔ ایک بوڑھے نحیف و لاغر شخص کے پہلو میں پُراثر دل اور پر جذبات قلب ہو سکتا ہے۔ اور قوی ہیکل نوجوان مردہ و پژمردہ دل ہو سکتا ہے یہ ایک کلیہ ہے جس میں مستثنیات کا دخل ہی نہیں کہ انسان کی آواز جسقدر فطری جذبات اور جوش دل کی متابعت کریگی اسی قدر اس میں لٹکا اور لچک ہوگی۔ مردہ دل بھیس اور ردی صورت آدمی اپنے محسوسات اور مشاہدات کو بھی ہانپ ہانپ کر اس بے لطفی سے بیان کریگا کہ گویا کاغذ کے خوشرنگ پھول بکھیر رہا ہے۔ ع

خوش رنگ و خوش جمال ولے بو نمی دہند

اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ گانے اور تقریر کرنے میں صرف نظم و نثر کا فرق ہے ورنہ دونوں جگہہ سارا کھیل گلے کا ہے۔ گویئے کی آواز علم موسیقی کے قواعد کے مطابق غایت اونچائی سے غایت نیچائی تک لہرا لہرا کے اُترتی چڑھتی چلی جاتی ہے۔ جادو بیان مقرر کی زوردار آواز اس کے پُرمعنی جملے اور معقول سنجیدہ استدلال و احتجاج سے بھرے ہوئے فقرے کبھی اونچے اور کبھی نیچے درجوں میں مدوجزر کا تماشہ دکھاتے ہیں اور سامعین کو از خود رفتہ کر دیتے ہیں یہی تال کلام ہے مگر سوال یہ ہے کہ تعلیم بغیر اس قدر مہارت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے زبان بیان بیشک فطری عطیہ ہے مگر سحر بیانی تو اکتسابی ہے۔ چاہیئے کہ ابتدائی تعلیم کے ساتھ اصلاح آواز کا خیال بھی رکھیں۔ حروف کے صحیح مخارج اور صحیح تلفظ ادا کرنے کی مشق ہوگی تو زیادہ تر بچے خوش بیان نکلیں گے۔ اس کی تعلیم

بچپن میں اسلئے بھی موزوں ہے کہ بچوں کو آواز کے ساتھ خود بخود ایک گہرا انس ہوتا ہے۔ اکیلے میں وہ طرح طرح کی مہمل آوازیں نکالکر خوش ہوا کرتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ان کی آواز کا تازہ دم مرکب اپنی نوخیزی کی ترنگ میں راکب کا تقاضا کیا کرتا ہے - مگر افسوس کہ مدارس میں سناٹا ہے اور بے حسی کی کیفیت ہے اور گھر پر جہالت کا قبضہ ہے اس لئے بچہ کی کہیں حوصلہ افزائی نہیں ہوتی - بلکہ دونوں جگہ اُسے بے رحمی سے دھمکا کر ان پُر معنی مہملات سے باز رکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ آواز کے نقائص محسوس نہیں ہوتے روز کی دال روٹی بن جاتے ہیں اور آخر کار لاکھوں بڑے چھوٹے افراد زبان بیان کے عیوب میں مبتلا ہیں۔

نقائص کی تفصیل

آواز کے نقائص کی تفصیل اور چارہ کار فن ڈاکٹری سے متعلق ہے مجمل طور پر دو تین نقص آواز میں ہوتے ہیں۔ مثلاً آلات گویائی کے عصبوں کی قوت حد سے بڑھ جاتی ہے۔ یا حد سے کم ہوتی ہے۔ یا خود آلات گویائی ہی میں نقص ہوتا ہے -

تعجب ہے کہ تعلیم کے ذمہ دار آواز کے نقائص دُور کرنے کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے۔ اس سے ان پر بہت بڑی جوابدہی عاید ہوتی ہے -

مدرسہ میں کسی جماعت کے کمرہ میں داخل ہو کر سب سے پہلی چیز جو محسوس ہوگی وہ طلبہ کی سخت کرخت آواز اور سنگلاخ گلہ ہوگا - اساتذہ بھی فیصدی ۵۰ اسی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کہنے کو ہر شخص اعتراف کرتا ہے کہ صاف اور لذت دار آواز بڑی نعمت ہے جس سے شخصیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ مگر تعلیم گاہوں سے ہمیشہ کریہہ الصوت طلبہ برآمد ہوتے ہیں۔ انسان اور وحشی میں زبان بیان ہی کا تو فرق ہے اور ارتقا کے سلسلہ میں انسانیت کو وحشت پر سب سے اوّل اسوقت فضیلت حاصل ہوئی جب فطرت نے گویائی کے مخفی خزانہ کو آشکارا کیا یعنی دماغ کے عصبانی نظام میں ان اعصاب کی تکمیل کی جن سے

گویائی متعلق ہے۔ اور بہت سی بخشائشوں کی طرح گویائی بھی ایک فطری بخشش ہے۔ مگر افسوس کہ والدین اور اساتذہ کو نطق و گویائی کے سب سے بڑے منحصر علیہ یعنی آوازکیجانب کچھ بھی توجہ نہیں اس بات کا بڑا شوق ہے کہ بچہ مدرسہ میں قدم دہرتے ہی تختی اور سلیٹ پر حروف کی شکلیں بنانی سیکھ جائے حالانکہ اس وقت تک انگلیوں کے اعصاب و عضلات کی گرفت اور حرکت کی قوت پورے طور پر منکشف نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ اس ہنر یا دستکاری کے سکھانے کا وقت ہی بہت دیر میں آتا ہے۔ مگر گویائی پر جو عمر کے تیسرے چوتھے سال تک مکمل ہوجاتی ہے کسی کو توجہ نہیں بچپن میں قوائے دماغیہ جس حد تک پختہ ہو جائیں انہیں اسی حد تک مصروف کرلینا چاہیے۔ لکھنا پڑھنا کوئی ہفت خوان رستم او جہات ہرقل نہیں ہیں کہ ابھی سے آغاز کی جائیں، ہزاروں لاکھوں آدمی بڑی عمر میں آکر بلا امداد مدرسہ اس فن کو سیکھ لیتے ہیں لیکن صحیح تلفظ اور خوش آوازی سکھانے کا وقت بچپن ہی میں ہوتا ہے۔ قوت ناطقہ صرف ابتدائی عمر میں زور پر ہوتی ہے۔ لہذا جس قدر قوائے دماغیہ اور جسمانیہ ناطقہ کی مدد سے مصروف ہوسکتے ہیں ان پر اسی عمر میں توجہ کرنی چاہیے۔

ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ اصل چیز جذبہ ہے جذبات سے خیال پیدا ہوتا ہے اور خیال کو قلم یا زبان سے ادا کرتے ہیں۔ یہ جذبات ہی کا کرشمہ ہے کہ ہر ایک خیال مقفیٰ ہو کر ادا ہوتا ہے حسن اتفاق سے بچے مقفیٰ عبارت کے بہت شائق ہوتے ہیں۔ پس چاہیے کہ آواز کی تربیت اور نطق و گویائی کے آغاز تعلیم میں آسان و عام فہم فقروں کو مقفیٰ بنا کر بچوں کو سنائیں اور اس طرح ان کی زبان کھولنے کی کوشش کریں۔ جو نقائص اس وقت رہ جائینگے وہ بڑے ہو کر ہرگز رفع نہیں ہونگے۔ قوت بیانیہ کچھ وکیلوں اور واعظوں کا ہی زیور نہیں ہے۔ نہ سیاسی مقرروں کا نشان امتیاز ہے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ہر ایک پیشہ اور کام میں اپنے مافی الضمیر کو صحیح صاف لفظوں میں اور پرزور لہجہ اور دلکش و شیریں آواز میں ظاہر کرنا کامیابی کی دلیل ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آلات ندائیہ میں حنجرہ اوسکے دونوں ہونٹ۔ پھیپھڑے سینہ۔ حلق اور ناک اوران دونوں کے نظام عصباتی ہیں۔ ان سب کی انفرادی اور اجتماعی قوت کبھی حد سے زیادہ ہوجاتی ہے تو سانس گھبرا کر باہر نکلیگا۔ اور الفاظ زبان سے جلد جلد ادا ہونگے۔ جس کا علاج معمولاً یہ ہے کہ سانس کو قابو میں رکھا جائے۔ اکثر لکنت کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے۔ یہ نقص بہت کم رفع ہوتا ہے۔ پھر بھی آواز کے ماہر ڈاکٹروں سے رجوع کرنا چاہئے۔ دوسرا عیب یعنی آلات گویائی کی قوت کا حد سے کم ہونا لڑکوں میں عالمگیر ہے۔ جس کا نتیجہ ہے پنبہ دہن اور کریہ الصوت ہونا۔ یہ عیب رفع ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی میں تیسرا عیب یعنی آلات گویائی ہی ناقص ہیں تو اس کا علاج سکوت پسندی ہی ہے۔ سانس پر قابو رکھنے کی مشق متعدد طریقوں سے کراتے ہیں تم نے اکثر بچوں کو دیکھا ہوگا کہ کسی پرند کا پر ہوا میں اڑا کر اسے پھونکوں کے زور سے نیچے نہیں اترنے دیتے اور اوسکے پیچھے بھاگتے پھرا کرتے ہیں یہ پرانے زمانہ کا کھیل عین حکمت ہی اور چاہیئے کہ اسکو لغو سمجھکر بچوں کو باز نہ رکھیں آجکل یورپ کے تربیت خانوں میں بچوں کو اسکی ایک اور طرح مشق کراتے ہیں یعنی استانی ایک بتی کا لیمپ جلا کر اور اوسے ہاتھ میں لیکر بیچ میں کھڑی ہوجاتی ہے اور بچوں کو اردگرد جمع کرکے دعوت دیتی ہے کہ جو مسلسل ایک پھونک میں چراغ گل کردیگا اوسے سب سے زیادہ نمبر ملینگے۔ چراغ کو مناسب فاصلہ پر بلند رکھتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پیٹ میں پورا سانس ایک دفعہ بھر کر اُسے آہستہ آہستہ خارج کریں اور ساتھ ساتھ چلتے بھی جائیں تا کہ قدموں سے سانس خارج کردینے کے وقت کا اندازہ ہو سکے۔ فصیح البیان مقرر کی بڑی تعریف یہ ہے کہ ایک سانس میں معمول سے بہت زیادہ بیان کر جائے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پورا سانس پیٹ میں بھر کر اُسے ہانپ ہانپ کر باہر نکالیں اس دوران میں سانس لیتے بھی جائیں اور خارج بھی کرتے جائیں۔ یہانتک کہ سانس کا پہلا ذخیرہ ختم ہوجائے۔

قریشی

قلمروئے سخن

زندہ دلان پنجاب کا خیال ہے۔ کہ

"پنجاب کو دہلی اور لکھنو کے اہل زبان کی نام نہاد سیادت سے آزاد
کیا جائے جن کی پیروی صرف اس دَور تک محدود تھی جو اسیر و داغ پر
ختم ہو گیا"

ہمیں امید ہے کہ روئے سخن کسی خاص خطے یا طبقے کی جانب نہیں بلکہ یہ ایک اعلان عام
یا اس صدی کے بقیہ حصّہ کا ادبی پروگرام (نقشۂ عمل) ہے۔ وجہ یہ کہ اُردو کی۔ جیسے کہ
ہر زبان کی انشاپردازی کبھی کسی کی حکومت تسلیم نہیں کرتی۔ حقیقت میں لٹریچر ایک مطلق
العنان فرمانروا ہے۔ اقلیم سخن پر خود سلطانی کرتا ہے امتداد زمانہ کے ساتھ زبان میں خود
بخود ایک خانہ زاد قوت پیدا ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ مستحکم ہو کر اس قدر خود مختار
بن جاتی ہے کہ اہل قلم اور انشاپرداز جماعت کی معنی آفرین اور لفظ آفرین دماغوں کی کچھ
بھی پرواہ نہیں کرتی۔ سینکڑوں ہزاروں الفاظ کو بلا وجہ مسترد یا مقبول کر لیتی ہے۔ بہتر سے
بہتر محاورات اور الفاظ جامۂ فصاحت سے محروم رہ جاتے ہیں اور اسکے خلاف غلط
بازاری لفظ زبان پر چڑھ جاتے ہیں "انشاپردازی" کو دہلی۔ لکھنؤ۔ لاہور۔ امرتسر کے
ادیبوں کا ذرا بھی پاس نہیں۔ نہ ممتاز خطّوں اور طبقوں کے اہل قلم کی خیال آفرینیاں
اپنے فیصلوں سے منحرف کر سکتی ہیں۔ انشاپردازی نے الفاظ و معانی اور مفاہیم کا تجزیہ
اور تعمیہ اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ یہ ہر دَور میں حُسن کلام کا ایک معیار قائم کرکے اہل قلم
کو اسکے اتباع پر مجبور کرتی ہے۔ اور اگرچہ اس معیار کے قائم کرنے میں زمانہ کے تقاضوں کو
اور حیات انسانی کی حاجات کو بہت بڑا دخل ہے پھر بھی اس قوت اعلیٰ کے اختیارات تمیزی
میں جسکو ہمنے انشاپردازی سے موسوم کیا ہے کوئی فرق نہیں آتا۔ الفاظ و محاورات

کے ردّ و قبول کا یہ حال ہے کہ نہ قبول عام کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ دہلی۔ لکھنؤ وغیرہ خطّوں کے سوا اور کسی کی وہاں تک رسائی نہ ہو۔ اور نہ وہ اس قدر پست مقام ہے کہ ہرکس و ناکس انفرادی یا اجتماعی کوشش سے بے تکلف وہاں تک پہونچ سکے۔ اصل میں قلمرو ے سخن میں قلم کی زبان سے احکام نافذ ہو سکتے ہیں اسمیں کسی خاص ملک یا خطہ کی قید نہیں بلکہ انشا پردازی کی قوت یہ دیکھتی ہے کہ لٹریچر کے ہر صنف اور علم کی ہر ایک شاخ میں کس خطّے کے اہل قلم نے کس قدر اور کس درجہ کی تصانیف دربار میں پیش کیں - اور انکو کس قدر قبول عام میسر ہوا۔ اسکے خلاف اس قلمرو ے میں زبان بیان کے احکام نہیں چلتے۔ مثال کے طور پر مصر و بیروت اور شام کو دیکھئے کبھی اس تمام سرزمین میں اعرابیوں کی عربی کی حکومت تھی۔ اٹھارہویں صدی سے اہل مغرب کی تہذیب نے حلول کرنا شروع کیا اسکے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی تخرجہ اور تعمیہ شروع ہوا جس کی رفتار اتنی بڑھی کہ کہ اُنیسوی صدی کے شروع میں اعرابیوں کی عربی اور یہاں کی عربی میں بیّن فرق نظر آنے لگا۔ سینکڑوں ہزاروں لفظ متروک ہو گئے یا بگڑ گئے۔ ہزاروں نئے الفاظ وضع ہو گئے۔ یہاں تک کہ اب عرب کا صحرا نشین بدوی کسی مصری کی زبان کو مشکل سے فصیح تسلیم کریگا۔ لیکن مصری انشا پردازی بدّوں کے فیصلہ کی کچھ بھی پرواہ نہ کریگی۔ باایںہمہ اس سو ڈیڑھ سو برس کے دَور انقلاب میں کسی مصری یا شامی نے انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے نہ توسیع زبان کا کبھی کوئی پروگرام بنایا اور نہ داغ و اسیر کے بجائے صاحب مقامات حریری یا سبعہ معلقہ کے زبان کو محدود کیا اگر وہ ایسا کرتے تو اس میں نمایش زیادہ ہوتی اور ارادہ کم۔ ادب اور انشا پردازی کے تغیرات زیادہ تر سکوت کے تابع ہیں نہ کہ ادّعا یا اعلان کے۔

گویائم و خاموشم چوں خط بہ کتاب اندر

زندہ دلان پنجاب کو کچھ جتلانا سورج کو چراغ دکھلانا ہے پھر بھی ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اس تجویز کے سلسلہ میں جو اُنھوں نے ایک ماہوار رسالہ جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے

اگر یہ کسی دار التصانیف و التراجم کی محض ایک زبان ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اصل چیز مجلس علمیہ ہونی چاہیے اور وہ ادبائے پنجاب جو اس نمایشی رسالہ کے لئے دماغ سوزی کریں گے وہ ترجمے اور تصانیف لکھکر مجلس کی امداد کریں تو زیبا ہے۔

ایک اور نظر سے دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اہل پنجاب نے ملکی زبان کو مدوّن کرنے میں پہلا قدم اُٹھانیکا ارادہ کیا ہے۔ وہ زبان نہ اُردو ہوگی نہ ہندی نہ ان زبانوں کی بہت سی شاخوں میں سے کوئی ایک ہوگی نہ ان کا لب ولہجہ یا طرز ادا ہوگا۔ بلکہ وہ وہی عام ہندوستانی زبان ہوگی جس پر ہم پچھلے پرچہ میں اجمالی نظر ڈال چکے ہیں۔ اگر زندہ دلان پنجاب نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنا کر ایک پیکر حسن کی صورت میں کھڑا کر لیا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں بھی وہ مبارک دَور آگیا جو فرانس پر انیسویں صدی کے ربع دوم میں آیا تھا اور جس نے فرانسیسی لٹریچر کو تہ و بالا کر دیا۔ جہاں تک یاد ہے لوئس فلپ کے عہد حکومت میں یہ لٹریری انقلاب پورے مدبر ہو چکا تھا۔ وکٹر ہوگو نے بعینہٖ اسی طرح آغاز کیا جس طرح آج زندہ دلان پنجاب ارادہ کر رہے ہیں۔ بشرطیکہ وہ کر لیں اور لکھکر نہ رہ جائیں۔ فرانس میں یہ کشمکش اُنیسویں صدی کے وسط کے بعد تک رہی جس میں ایک طرف یونانی اور لاطینی زبان کی انشا پردازی اور طرز ادا کے حامی تھے اور دوسری طرف اس جدید طرز ادا اور شوکت لفظی کے طرفدار تھے جو فرانس کے سیاسی انقلاب کے بعد پرانی بندشیں توڑ کر خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔ فرانس کی ادبی تاریخ کا یہ باب اس قدر دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی۔ نمک چشی کے طور پر قارئین کرام کو اتنا بتائے دیتے ہیں کہ جس طرح آج ہماری ادیب اور انشا پرداز قیس و فرہاد۔ شیریں خسرو۔ یوسف زلیخا یا شکنتلا۔ اور میگدوت یا پدماوت کی قدیم خیال آفرینیوں پر فریفتہ ہیں اور انہی کے طرز ادا اور ادبی مسلمات کی تقلید کرتے کرتے مرے مٹے جاتے ہیں اسی طرح فرانس کے سیاسی انقلاب تک فرانسیسی اہل قلم یوریپڈیز اور یونانی اَئمۃ الشعرا پر مرتے تھے انکے تشبیہات و استعارات

پر جان فدا کرتے تھے۔ چنانچہ ورلٹائر اور راسین اُنیسویں صدی سے پہلے یونانی شعرا کی اتباع میں وہ زورِ قلم دکھا چکے ہیں کہ تاریخ کے صفحوں سے صدیوں نہیں مٹے گا۔ فرانس کے جدید اہلِ قلم جن کے پیش امام ہوگو۔ لمرٹین۔ وگنی جیسے ممتاز سخنور تھے یونانیوں کی تقلید کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مسلمات اور کلئے آپ قائم کئے اور اپنے ملک و ملت کی موجودہ خصائص کی بنا پر الفاظ و تشبیہات وضع کئے۔ اور اگرچہ آغاز انشا پردازی ناٹکوں سے یا مفروضات سے کی۔ لیکن اخیر پر وقائع نگاری اور حقائق نویسی نے اسی سے جنم لیا۔

اس دَور انقلاب کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے اور غالباً یہی اتنے جلد کامیابی کا باعث ہوئی ہوگی یعنی ہوگو اور اوسکے معاصرین نے جو ڈراما۔ نظم۔ شاعرانہ نثر یا مقالہ لکھا (مثلاً گراموِل)، اوسکے دیباچے میں قدما خصوصاً یونانی اساتذہ کی تقلید کو ہر ہر پہلو پر ذلیل و خوار ثابت کیا بعض دیباچے متن کتاب سے بڑھ جاتے تھے۔ ان میں فرانسیسی لٹریچر کی خوبیوں کو فرانس کی قدرتی بخشائشوں کو فطری جلوہ گاہوں اور انسانی کرشمہ گاہوں کی خوبیوں کو خاص فرانسیسی دھن میں کھول کھولکر دکھاتے تھے اس طرح کہ عبارت اور انداز بیان میں یونانی طرزادا کی جھلک تک نہ ہو۔ اودھر سے قدما پرست بالمقابل جواب دیتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اس مناظرہ نے تقریباً آدھی صدی خوب طول کھینچا اور زمانہ کی عدالت میں فریقین کی شہادتیں اثبات و نفی میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش ہوتی رہیں بالآخر انیسویں صدی کے ربع چہارم تک فرانس کی انشا پردازی نے یونانی قرغل اُتار کر پھینک دیا اور بڑے آب و تاب سے اپنے ملکی پیرایہ میں نمودار ہوئی۔

اگر حقیقت میں ہندوستان پر یہ مبارک دَور آپہنچا ہے اور اہلِ پنجاب کے ہاتھوں اُسکا آغاز ہونیوالا ہے تو اُنکا یہ اعلان سچا اور برحق ورنہ اس قسم کے سینکڑوں تجویزیں منظور ہوکر اور ایسے ایسے بیسیوں نقارے بج بجکر غائب ہو گئے۔

چوں گل ہرزہ درا دفترِ دل بادمدہ   خاطر جمع بیک خندۂ بیجا مفروش
غنی (؟)

عام تعلیم

"دو باتیں بے محل ہیں انہیں گوارا کرو، دانائی کی بات جو نادان کہے اسے قبول کرو، اور نادانی کی بات جو دانا کہے اُسے بخش دو۔"

(حدیث محمد صلعم)

"کبھی کسی بڑے کام میں کامیابی نہیں ہوتی جب تک کہ اُسکے کرنے والے بڑی قربانی نہ کریں، ہماری محنت کا صلہ ہماری قربانی کی نسبت سے ہوگا۔"

(سر آغا خاں)

جوش و حرکت، جد و جہد امنگ و دو، مسلمانان ہند کو تقریباً نصف صدی سے متلاطم کئے ہوئے ہے، وہ بظاہر دل فریب اور کم از کم صوبہ متحدہ کے لئے کافی معلوم ہوتی ہے اور کسی نئی تدبیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن "جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب" کو ہماری ملکی اور قومی بیداری میں بہت شبہ ہے اور افسوس یہ ہے کہ امعان کی نظر، اور انصاف کی عینک سے ان کا شبہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کا سوال ہے اور بجا سوال ہے

"ہم ملکی مصلحوں سے دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے کثیر آبادی کی اصلاح کی کیا کیا تدابیر اختیار کیں؟ ان کی تربیت کے واسطے کتنی انجمنیں بنائی ہیں؟ کتنے دیہاتی فری اسکول جاری کئے ہیں کیا کیا ایسی تدابیر سوچی ہیں جن سے ان لوگوں کو نوشت و خواند کی جانب رغبت ہو۔"

"ہماری آبادی کا یہ ادنیٰ ترین حصہ جن کی طرف سے ہم اس درجہ غافل ہیں اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو ملک کا تمام دارومدار اور انتظام اسی ادنیٰ آبادی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں نیم برہنہ کاشتکار اپنے خون پانی کی محنت سے زمین سے پیداوار کی کوشش کرتے ہیں اور اسی ذریعہ سے سلطنت کے خزانے میں کروڑہا روپیہ داخل ہوتا ہے۔"

"جب تک کہ نیچے کے درجہ کے لوگوں کی اصلاح کی جانب ملک کی توجہ مائل نہ ہوگی اس وقت تک یہ دعوی کرنا کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے، بہت قبل از وقت ہے"

تمام تدابیر کا اگر استقصا کیا جائے تو بنیادی ذریعہ قومی ترقی کا اعلیٰ تعلیم سمجھا گیا ہے۔ بے شبہ انیسویں صدی کے تعلیمی رہبر کا یہ فتویٰ آج بھی ویسا ہی صحیح ہے جیسا کہ بیس سال قبل تھا کہ "ہماری قسمت کا فیصلہ اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہے" ہر کہ شک آرد کافر گردد لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم اپنے محسوس فوائد کو نمایاں رکھتے ہوئے بھی ہمارے درد کی شافی دوا ثابت نہیں ہوئی۔ مسلسل تجربہ سے مجبور ہو کر ہندو غیر مطمئن ہیں مسلمان محض ناکافی بلکہ ناقص خیال کرتے ہیں اور خود گورنمنٹ بھی وقتاً فوقتاً اپنے نظام تعلیم کے بدیہی نقائص کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو ہی جاتی ہے مگر اصلاح کی طرف چنداں خیال نہیں ہے، اور اگر وہ کچھ تکلیف اٹھانے کے لئے مستعد بھی ہو تو حق یہ ہے کہ کماحقہ اس امر کا انصرام اسکے دست اختیار و خط اقتدار سے خارج ہے، جیسا کہ سرسید فرماتے ہیں۔

"ہم کو اپنے تمام مقاصد کے انجام کو صرف گورنمنٹ ہی پر منحصر رکھنا نہ چاہئے بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ ان تمام مقاصد کا گورنمنٹ سے حاصل ہونا غیر ممکن اور مانند ممتنع بالذات کے ہے۔ کسی قوم کو یہ سب مقاصد جب تک کہ وہ خود ان مقاصد کے حاصل کرنے پر مستعد نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتے"

آنریبل سید محمود کا قول ہے۔

"جو طرز تعلیم کہ گورنمنٹ نے اختیار کیا ہے وہ ہرگز ہماری حاجات اور ضروریات کے موافق نہیں"

علاوہ ازیں دوسری نظر سے دیکھئے۔ کوئی قوم من حیث القوم اور کوئی ملک من حیث الملک شاہراہ ترقی پر گام زن ہو کر اقوام عالم میں نمایاں درجہ حاصل نہیں کر سکتا جب تک

کہ ادنیٰ سے ادنیٰ طبقات کے اکثر افراد میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہو کہ اپنی اصلی حالت سے خبردار، دنیا سے واقف اور اعلیٰ و صحیح اصول پر اتحاد و انتظام کے ساتھ اجتماعی طاقت سے گوہرِ مقصود کے حصول میں جویاں و پویاں ہوں۔ اور یہ آرزو اس وقت تک بر آنی محال ہے جب تک کہ تعلیم عام نہ ہو۔

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمہ کی ہدایت اسلام نے کی تھی لیکن شریعت کے پیمان جو ہم نے توڑے، وہ لیجا کے سب اہل مغرب نے جوڑے، مغرب کا تو کہنا ہی کیا، وہاں تو علم کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے لیکن اب بیدار بخت اور اولوالعزم ہمسایہ قوم، اس اہم ضرورت سے بے خبر نہیں ہے عجب نہیں وہ عام تعلیم کے میدان میں بھی ہم سے بازی لیجائے، آنریبل مسٹر گوکھلے سرگباشی کا بل اگرچہ کل مسترد ہو گیا۔ لیکن کل ضرور مکمل طور پر پاس ہو کر رہیگا، ان کا قدم اٹھ چکا، رائے کو وسیع اور زبردست بنانے کے لئے عملی کارروائی شروع ہو گئی ہے اور درماندہ اقوام کی افواج کو اپنے حصار میں لانیکا تہیہ کر لیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا شجرِ محنت مثمر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ غرضکہ ان کے استقلال کی فتح یقینی ہے، لیکن قابل غور یہ امر ہے کہ ان کی رفتار کا نتیجہ ہمارے حق میں کیا ثمرہ ہمیں چکھائیگا ؟

ارباب نظر ہی معلوم کر سکتے ہیں کہ سید محمود کی پیشین گوئی کس حد تک صحیح ثابت ہو چکی اور زمانہ استقبال کے متعلق ہماری صورت اعمال اہل فراست پر کیا منکشف کر رہی ہے؟

”پچاس برس کے عرصے میں مسلمان نہایت بے تربیت یافتہ ذلیل و خوار اور مفلس ہو جائیں گے اور خدانخواستہ یہ بات بھی ممکن ہے کہ تھوڑے اور زمانہ میں ان کا ہندوستان میں وہ حال ہو جائے جو کہ ذلیل ترین اقوام ہندوستان کا اب ہے۔ میں اپنی اس رائے کو اس بات سے سہارا دیتا ہوں کہ محمد تغلق کی اولاد اب دہلی کے قریب پرانے قلعہ میں (جس کا نام تغلق آباد ہے) بستی ہے، اور ان میں سے کسی کو پڑھنا۔ لکھنا نہیں آتا، اور وہ

گھاس کھود کر اپنی روٹی کماتے ہیں اور کسی کو کسی قسم کا علم نہیں اور یہ بھی کہ شاہزادگان خاندان تیمور یہ نہایت ذلیل طرز پر روٹی کماتے ہیں اور کسی کو کسی قسم کا علم نہیں"

اسکے بعد نامور باپ کا نامور بیٹا خود ہی اسکے دفعیہ کی تدبیر تبلاتا ہی اور کہتا ہی

"سوال یہ ہی کہ کیا علاج ؟ اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ "تعلیم" مگر اسکے ساتھ ہی ہم یہ کہتے ہیں کہ جو طرز تعلیم گورنمنٹ نے اختیار کیا ہے وہ ہرگز ہماری حاجات اور ضروریات کے موافق نہیں"

"ہماری غرض یہ ہے کہ مسلمان اپنی تعلیم خود سب سے بہتر کر سکتے ہیں اور اگر کوشش وسعی کریں تو نہایت آسانی سے وہ کام کر سکتے ہیں جو گورنمنٹ مشکل سے بھی نہیں کر سکتی"

"غرض یہ ہی کہ مسلمان حسب خواہش تعلیم پا سکیں اور اپنے دین کی تعلیم بھی شامل رکھیں، اصل یہ ہی کہ سب سے زیادہ دل کی سعی چاہیے مسلمان کس قدر شوق سے مسجدیں بناتے ہیں مگر اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ جب علم دن بدن گھٹا جاتا ہے تو مدرسہ بنانے میں دس گنا زیادہ ثواب ہوتا ہے، اگر مسلمانوں کا علم دین خدانخواستہ جاتا رہا تو مسجدیں کس کام آئینگی اور کیا فائدہ ہوگا ؟"

تعلیم بے شبہ ترقی پذیر ہے، اور یہ دائرہ طوعاً وکرہاً ارادۃً یا فطرۃً وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور روز بروز ہوتا جائیگا۔ لیکن جب ایک طویل اور مدت کے تجربہ نے اس دوا کو بہت کچھ بے سود اور غالباً مضر ثابت کیا ہے (کیونکہ بقول آنریبل نواب ذوالفقار علیخانصاحب "موجودہ تعلیم ہیں صراط مستقیم سے دور لئے جا رہی ہے" اس کی توسیع میں حد سے زیادہ کوشش، عقلا کی نظر میں دانائی نہ سمجھی جائیگی) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ نسخہ میں بعد نظر ثانی ایسی ترمیم کی جائے کہ حصول صحت کی اُمید تو ہو جائے بعدہٗ ایسے وسائل مہیا کئے جائیں کہ کوئی مریض محروم نہ رہنے پائے۔

علاوہ ازیں حکومت کی ضرورت سے، اعلیٰ تعلیم کا شایق اور قدردان ایک ممتاز

طبقہ پیدا ہوچکا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا سیلاب کسی طرح بھی کسی سے رُکنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا انجن ایسی قوت رکھتا ہے کہ خود بخود بغیر کسی خارجی طاقت کے مدت تک حرکت میں رہیگا سب سے زیادہ ضرورت عام تعلیم کی ہے تاوقتیکہ عوام کی بہبودی مدنظر نہ ہوگی۔ ہماری تمام کوششیں مہذب خود غرضی کے وسیع دائرہ میں محصور رہینگی اور قوم من حیث القوم بدستور جامد و ساکن رہیگی۔

ہر کارے و ہر مردے کا اصول بیشک صحیح ہے لیکن درد آشنا دل، دردمند طبائع اور ذی ہوش انسان کبھی ادنیٰ ترین ضروریات سے جو ہمارے قومی و ملی اعمال و اخلاق کی بنیاد اساس ہوں چشم پوشی روا نہیں رکھ سکتے، قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی کی آرزوے دلی اس لایق تھی اور ہے کہ کوئی جماعت اُسے اپنا آویزۂ گوش بنالے قاری صاحب فرماتے ہیں۔

"سب سے زیادہ امتیاز کی بات جو میں جاپان سے سیکھکر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں غریب مسلمانوں کی خدمت پر کمربستہ ہونا چاہیئے"

حضرات! قوم سے مراد یہی غریب ہیں۔ اگر قوم کو قوم بنانا منظور رہو، تو ان غریب مسلمانوں کی خدمت کرو، ان سے ملو، ان کی مدد کرو، ان میں عام تعلیم اور صنعت و حرفت کو زیادہ رواج دو، ابتدائی تعلیم کے مدرسے کثرت سے کھولو اور غریبوں کو تراؤ۔

یہ اللہ کا کنبہ ہیں اور ان ہی کی عزت سے ہماری عزت ہے میں تو غریب مسلمانوں کا وکیل بن کر عرض کرتا ہوں کہ جہاں تک ہوسکے ان بے زبانوں کو مہلک اثرات سے بچاؤ جی ڈھونڈتا ہے کہ ہم میں ایک جماعت شادمان قوم کی ایسی ہو کہ غریبوں میں فوج کی طرح گھل مل کر کام کریں۔

اگر ہماری حیات و ممات مسلم یونیورسٹی کی عظیم الشان تحریک کی تکمیل پر منحصر ہے تو بے شبہ اس سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ محرکین یونیورسٹی کی دیگر نصائح پر

بھی غور و فکر ہو۔

"ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو کامیاب بنانے اور تسلی بخش و دیرپا نتائج حاصل کرنے کے لئے علمی عمارت کو ایک ٹھوس بنیاد پر کھڑا کرنا چاہیے تاکہ اعلیٰ تعلیم کے بوجھ سے ہماری علمی عمارت گر نہ پڑے"

"پرائمری تعلیم کے عمدہ نظام کا مسئلہ اشد ضروری ہے کوئی سنگین عمارت نرم مٹی کی بنیاد پر قایم نہیں رہ سکتی۔ اس غرض سے کہ ہم اپنی قوم کو طاقت رسوخ و قابلیت کے جائز حصہ سے بہرہ اندوز ہونے کے قابل بنائیں۔ پس عوام کے فائدہ کے لئے ہمیں تعلیم عام کا ایک عملی اور وسیع نظام قائم کرنا چاہیے۔ عوام کی یہی عالمگیر جہالت ہے جو مسلمانوں کو اس قدیم روحانی اتحاد و اخوت کے سلسلہ میں منسلک ہونے سے روکتی ہے جو ہمارا اصل مقصد و آرزو ہونی چاہیے" (سر آغا خاں)

یہ مشورہ کوئی نئی نصیحت اور جدید ہدایت نہیں ہے، بارہا درد مندان قوم پیش کر چکے ہیں اور ہماری نامور و مقتدر تعلیمی کانفرنس بھی ایک سے زائد مرتبہ اس پر غور و بحث کر چکی ہے، فی الحقیقت یہ ہدایت ہمارے مسلمہ تعلیمی رہنما کی صدائے بازگشت ہے سرسیدؒ فرماتے ہیں۔

"ہر گاؤں اور قصبہ میں جہاں جہاں ہو سکے مکتب قائم ہونے چاہئیں، ان میں قرآن شریف بھی پڑھایا جائے اور اردو میں کچھ کتابیں اور حساب وغیرہ سکھایا جائے اور اردو میں لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جائے، کسی قدر فارسی اور کسی قدر انگریزی سکنڈ لنگویج ہو۔ فارسی صرف اس قدر ہو جس سے اردو کو مدد پہونچے اور انگریزی نہایت قلیل"

نماز پڑھنا بھی بتایا جاوے اور چھوٹی چھوٹی اردو کی کتابیں مسئلوں کی بھی۔

چھ برس سے دس برس تک چاہیے کہ لڑکا قرآن مجید پڑھ لے۔ اور کچھ اردو کتابیں اور مسائل کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی۔ کچھ کچا پکا لکھنا بھی سیکھ لے۔ اس قدر استعداد ہو جائے

کہ اُردو عبارت بآسانی پڑھ لکھ سکے اور انگریزی حرفوں اور ہندسوں کو پہچاننا اور نام پڑھنا سیکھ لے۔

گیارہ سے تیرہ تک اس عمر میں اس قدر پڑھ لینا چاہیے جو روزمرہ کے کاموں میں اور امورات زندگی اور معاش کے کام میں درکار ہیں۔ سیدھے سادھے مسائل مذہبی و عقائد مذہبی سے بھی واقفیت ہو۔ اگر اہل پیشہ و غربا کے لڑکے اس قدر تعلیم پاجائیں اور ہمارے ملک میں عموماً اس درجہ تک تعلیم پھیل جائے، تو ہندوستان ہندوستان نہیں رہیگا بلکہ قطعہ جنت ہوجائے،، اور ٹھیک ٹھیک ہندوستان جنت نشان کا لقب اسپر صادق آئیگا

ہمارا فرض عمل پر ختم ہوجاتا ہے، نیکی فی نفسہ اپنا انعام آپ ہے باقی نتیجہ پیدا کرنا اسی مقلب القلوب کے اختیار میں ہے جس کے قبضہ اختیار میں کل کائنات ہے ہمارے دست اختیار میں عمل ہے اور بس۔

علی المرء ان یسعی الی الخیر جهدًا ولیس علیه ان یتم الرغائب

ہماری روز افزوں مشکلات اور مستقبل کے خطرات ملتجی ہیں کہ سر آغاخاں کی مشورت اور سر سیدؒ کی ہدایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ابتدائی تعلیم عمومی کا ایسا مرکزی شعبہ قائم کیا جائے، جسکا دائرہ تمام ملک پر محیط ہو کوئی محلہ اسلامی مکتب سے خالی کوئی فرد بشر نعمت اسلام سے بے بہرہ اور کوئی مسلمان دولت ایمان سے محروم نہ رہے، عزم بالجزم کے ساتھ ہماری ہمیشہ یہی خواہش و کوشش ہو کہ کوئی انسان نور اسلام سے مہجور ہوکر تاریکی میں آسمانی زندگی سے محروم نہ ہو اور کوئی مسلمان جاہل و کاہل نہ رہنے پائے۔

ایک مدت مدید اور عرصہ بعید سے زمانہ کا تازیانہ ہمیں بیدار کر رہا ہے اب صورت حاضرہ اور کیفیت حالیہ سے متاثر ہوکر ہماری مایہ ناز و ممتاز انجمن آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا اولین فرض ہے کہ اپنے دیرینہ ارادہ اور دلیرانہ وعدہ کو فوراً اپنا

دستور العمل بنائے یقیناً

بس "اب وقت آگیا ہے کہ اللہ جل جلالہ کا نام لیکر ہماری تعلیمی تحریک کی جو شان وعظمت ہے اس کے اقتضا کے موافق سعی کا پیمانہ وسیع اور بلند کر کے پورے عزم کے ساتھ شروع کیا جائے"!!

قومی زندگی اور اقبال کا آغاز اسی وقت ہوگا جبکہ ہم اپنی تعلیمی تحریک کے پیمانہ کو اپنے قومی مقصد کے شایان شان قرار دینگے اور اس کی کامیابی کے لئے اپنی جمہوری کوشش کا ایسا نظام قائم کرینگے جو مجرب اصول پر مبنی ہو اور جس کے ذریعہ سے تمام منتشر قوتیں اور تحریکیں ایک سلسلہ میں جکڑ جائیں۔ واللہ ولی التوفیق وھو نعم الرفیق۔

"مسلم"

نوٹ۔ لفٹنٹ کرنیل لیسلز کی تقریر اسی موضوع پر گزشتہ اجلاس کانفرنس میں ہو چکی تھی جو روداد میں صفحہ ۵۳ تا صفحہ ۵۹ درج ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک ریزولیوشن بھی پاس کیا گیا تھا مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ ناداری اور بے بضاعتی کے خشک ریگستان میں اکیلی کانفرنس قوم کی کشتی بانی کیسے کرے۔ دنیا میں دو طرح کام ہو سکتے ہیں غرض سے یا دروسے۔ اغراض ہمیشہ روپیہ سے پوری ہوتی ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ اب باقی رہا درد۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری قوم میں دل ہی نہیں رہے درد کہاں سے آئے۔ حق یہ ہے کہ کرنل لیلیز کی تقریر ایک یکتا نظام عمل ہے جسے صرف جامہ عمل پہنانے کی دیر ہے لیکن کانفرنس دیکھتی ہے اسلئے کہ اوس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ سُنتی بھی ہے لیکن قوم کی بے توجہی اور سرد مہری سے مفلوج ہی کچھ کر نہیں سکتی کانفرنس کا میزانیہ صاف بتا دیگا کہ اس صدی کے پچھلے عشرہ بھر میں قوم کے افراد نے قلم۔ درم یا قدم سے اوسکی کیا امداد کی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ چند فیاض دل امرا کی توجہ سے کانفرنس کا دم اٹکا رہا۔ ورنہ شاید مسلم کو مخاطب تلاش کرنے کی نوبت پیش آتی۔

(صدیقی)

یک سوئی

زندگی میں استقامت اور ہمت چاہیے

جو نہ بھولے راہ میں وہ رہنما پیدا کرو

ڈاکٹر سر اقبال نے ایک دفعہ لکھا کہ انسان کہاں تک مدنی الطبع ہو کر بھی تنہائی پسند ہے یہ سوال اس پر بھی حاوی ہے کہ انسان کو کہاں تک یکسوئی کی ضرورت ہے، ڈاکٹر صاحب کے سوال کو تو ہم کسی دوسرے وقت زیر بحث لائیں گے اس قسط تحریر میں یہ دیکھتے ہیں کہ انسان کے واسطے یکسوئی کہاں تک ضروری اور مفید ہے اور آیا انسان طبعاً ہی یکسوئی کا طالب اور خواہاں ہے یا نہیں۔

یکسوئی کی قسمیں

یکسوئی کی تین قسمیں ہیں، خیالی یکسوئی، افعالی یکسوئی، اور رعایتی یکسوئی، خیالی یکسوئی سے مراد یہ ہے کہ خیالات کا تموج اور نشو و نما خصوصی مراحل میں کامیابی تک ایک ہی نوعیت سے وابستہ رہے یا یہ کہ ایک ہی نصب العین کے تحت میں ایک ہی قسم کی کوشش اور جد و جہد مزعوم ہے اور خیالات کی تکمیل میں اس قسم کی مشابہت اور سلسلہ نظام ہو کہ زندگی کے دوسرے خیالات اصلی محور سے دور و بعید نہ کر سکیں بس اسی قدر خیالی یکسوئی کی ضرورت ہے اس سے زیادہ ہو نہیں سکتی، کیونکہ سلسلہ تخیل باوجود خصوصیت تخیل اور جداگانہ نصب العین کے بھی تنوع اور انتشار سے باز نہیں رہ سکتا تحدید مشکل ہے لیکن اور تنہا ہو کر بھی سلسلہ خیالات کے انتشار اور تنوع سے خلاصی نہیں جو لوگ ایک خصوصیت سے یکسوئی خیالات اور تقید تخیل میں منہمک رہتے ہیں وہ بھی اس درجہ تک کامیاب ہوتے ہیں کہ ایک قسم یا ایک نوع کے خیالات کا غلبہ رہا یہ لکھنا کہ ایسے لوگ دوسرے خیالات سے محض بیگانہ ہو چکے تھے، ایک مبالغہ ہے فرض کرو کوئی

مرتاض، عابد، اور فلاسفر ایک ہی قسم کے خیالات میں منہمک رہنے کی صورت میں دوسرے قسم کے خیالات کے حدوث اور تنوع سے محفوظ رہتا ہے۔

ہم جس دنیا میں پیدا کئے گئے ہیں اور جس ماحول میں ہم رہتے ہیں وہ شروع سے لیکر اخیر تک خیالات ہی کی ایک پُر رونق منڈی ہے زندگی نام ہے تنوع اور تمدنی خیالات کا ہے جب خیالات کی مشین کام دینے سے بند ہو جاتی ہے تو زندگی کے پرزے بھی رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں کیونکہ تخیل ہی کا نام زندگی ہے۔

خیالی یک سوئی صرف اسی حد تک ہو سکتی ہے کہ انسان مشق کرتے کرتے خصوصیت سے ایک خاص قسم کے خیالات کا مرکز بن جائے باوجود دوسرے خیالات کے پیدا ہونے اور تنوع کے بھی اس خاص مرکز سے نہ ہٹے یا یہ کہ اسی دھن میں لگا رہے

افعالی یک سوئی بمقابلہ خیالی یک سوئی کے سہل ہے، افعالی یکسوئی سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی نصب العین کے تحت میں خود کو اپنے مذاق اور ضروریات کے اقتضا سے ایک خاص قسم کے خیالات کا عادی بنالے اور عملی پہلو سے ان سے کام لے اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی انسان ساری عمر صرف ایک قسم کے خیالات کا پابند اور عادی رہے مگر یہ خیال وضع داری ہر انسان خود کو خاص خیالات اور ایک مخصوص نصب العین کا عادی بنا سکتا ہے، اگر ہم انسانی جماعتوں کے مختلف انسانوں کی زندگیوں پر نظر کرینگے تو ہمیں اعتراف کرنا ہوگا کہ ہر جماعت انسانی میں بعض انسان اس قماش کے بھی گزرے ہیں کہ اُن کی زندگیاں بڑی حد تک افعالی یکسوئی کا نمونہ رہی ہیں۔

غایتی یک سوئی سے یہ مراد ہے کہ کوئی انسان باعتبار غایت اغراض زندگی کے ایک ہی قسم کے خیالات اور افعال میں خصوصیت سے منہمک رہے، یہاں تک کہ اس انہماک سے اوس کی نسبت لوگ یہ کہنے لگ جائیں کہ اس کی زندگی کا مشن ہی یہ ہے۔

غایئ یکسوئی گو باعتبار غایت اور فیصلہ کے کسی حد تک سہل ہے مگر کچھ نہ کچھ مشکلات رکھتی ہے ایک شخص کسی خاص معنی یا کسی خاص شئے کا طالب ہے، رات دن اسی لئے اور اسی دھن میں مگن رہتا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہ اس کی زندگی کی غرض وغایت وہی ایک مسئلہ ہے بایں حالات ایسا شخص ایک اس قسم کی یک سوئی رکھتا ہے کہ گو وہ دوسرے خیالات کے نشوونما کو تو بند نہیں کرسکتی لیکن غلبہ یک سوئی نما خیالات ہی کا رہتا ہے۔

یکسوئی کی ضرورت

سوچو اور مزید غور کرنے کے بعد کہو یا فیصلہ کرو کہ معادی۔ معاشرتی، روحانی اور تمدنی ضروریات کے ہوتے یا اور صورتیں انسان کو یک سوئی کی کہاں تک ضرورت ہے، ہماری رائے میں اکثر حالات میں تو ہم یک سوئی کے عامل نہیں ہوسکتے۔ لیکن بعض حالات میں لازمی اور سخت ضروری ہے۔ اگر یک سوئی سے مراد یہ ہے کہ کوئی انسان یا کوئی انسانی جماعت ضروریات زندگی کو جواب دیکر یونان کے بعض فلاسفروں کے نقش قدم پر عام کاروباری فرائض سے سبک دوش ہوجائے تو یہ طریق عمل صرف اسکے واسطے ہی ہیں۔ بلکہ اسی کی ملت اور قوم کے لئے بھی ایک قسم کی خودکشی ہے انسان کی فطرت بھی ایک حد تک اسی کی مخالف ہے۔ یہ مان کر بھی یہ کہنا کہ یکسوئی کی کوئی قیمت ہی نہیں اور سرے سے انسان کو یا بعض انسانوں کو بعض مراحل میں اس کی ضرورت ہی نہیں جب تک یکسوئی نہ ہو تب تک انسان بعض فضائل حاصل ہی نہیں کرسکتا اگر مختلف اقوام کے مشاہیر، فلاسفر اور مرتاضان ملت و مذہب یکسوئی کا پردہ نہ لیتے تو آج وہ برکات اور وہ فضیلتیں جو ان کی بدولت ہمیں حاصل ہیں کیونکر حاصل ہوسکیں۔

علم اخلاق اور تزکیہ نفوس اور ادراک علوم وفنون میں ہمیں سب سے زیادہ تر یکسوئی ہی کی ضرورت پڑتی ہے اور یک سوئی ہی کے طفیل انسان باریاب برکات ہوتا ہے اگر کوئی طالب علم یا کسی دفتر کا کلارک، اسکول اور دفتر میں بیٹھے بیٹھے یکسوئی سے

کام نہ لے، اور یکسو ہو کر کام نہ کرے تو اس کی ہمت اور قوت رفتہ رفتہ بودی پڑتی جائیگی اور اسکے نصب العین میں زور نہیں رہیگا۔

قومی کاموں میں بھی گونہ یکسوئی کی ضرورت ہے جب تک قوم یا قوم کا کوئی فرد یکسو ہو کر قومی کاموں میں حصّہ نہ لے، تب تک تکمیل اور کامرانی کیونکر ہو سکتی ہے جو قوم اور جس قوم کے افراد یکسو ہو کر کام نہیں کرتے وہ اپنی راہ میں بہت کچھ مشکلات اور روکیں رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے کاموں میں چونکہ صحیح یکسوئی سے کام نہیں لیا جاتا اسی واسطے ہمیشہ ان کا شیرازہ بکھرا ہی رہتا ہے، کہتے ہیں مسلمان طالب علم ہمیشہ حساب اور ہندسہ میں کمزور نکلتے ہیں کیا اسی کی یہ وجہ ہے کہ مسلمان طلبا ایسا ذہن نہیں رکھتے یا سچ مچ ان کی طبیعتیں لڑتی ہی نہیں ہیں اگر ہم ایسا خیال کرتے ہیں تو یہ ایک غلطی ہے دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ مسلمانی کنبوں میں گھروں کے اندر بھی حسابی طریق عمل سے سروکار نہیں رہتا اور یہ ضرورت کسی یکسوئی کے تحت انصرام نہیں پاتی۔ اس واسطے اسکولوں، کالجوں میں بھی جا کر مسلمانی نسلوں کے ان تمام سے اس پر یکسوئی سے کاربند ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہ اور مشاغل میں یہ راہ ہی بھول جاتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سرزمین ہند میں رہ کر اور اس پڑے ہوا پر پل کر اور جوان ہو کر اس شاخ علمی سے محروم رہیں۔

تجارت اور بیوپار میں بھی ہم چونکہ جم کر کام کرنے کے عادی نہیں ہیں اسواسطے ہم عموماً اس میں بھی بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ جغرافیہ اور تاریخ یا چند فلسفیانہ تھیوریوں کا یاد کر لینا تو چنداں مشکل نہیں ہے لیکن عملی رنگ میں کام کرنا اور اس میں انہماک آجانا کچھ اور بات ہے لوگ کہتے ہیں جب دوسرے کام میں سرپر ہیں تو کیونکر صرف ایک دو کاموں میں یکسوئی ہو سکتی ہے ہم شروع میں ظاہر کر چکے ہیں کہ یکسوئی سے یہ مراد نہیں ہے کہ دوسرے رنگ میں خیالات کا تنوع اور نشو و نما ہی نہ ہو۔ یکسوئی کیا ہے

باوجود دوسرے قسم کے خیالات کے تنوع اور نشوونما کے بھی ہم خصوصیت سے کسی خاص طریق عمل کے ساعی اور داعی رہیں اور یہ کچھ بھی مشکل نہیں جو لوگ لشکروں اور فوجوں یا دفتروں میں بسلسلہ ملازمت اور ذمہ داری کے کام کاج کرتے ہیں کیا ان میں یکسوئی نہیں ہوتی اور وہ دوسرے خیالات میں نہیں رکھتے ہیں۔

یکسوئی کا مفہوم دوسرے الفاظ میں کیا ہے، کسی کام کو کافی توجہ، کافی ہمت، استقامت خودداری اور استقلال سے کرنا۔ اگر تھیٹر میں کوئی ایکٹر پوری توجہ اور خوب یکسوئی سے ایکٹ نہ کرے اور پورے طور پر ایکٹ کے وقت منہمک نہ ہو تو تماشائی اسکے ایکٹ میں ذرہ بھر بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ وہی گواہ عدالت میں مدعی یا مدعا علیہ کے حق میں سلامت روی سے گواہی دیسکتا ہے کہ جو یکسو ہو کر گواہی دے۔ ایک مذبذب الخیال گواہ عدالت کو بھی تکلیف میں ڈالتا ہے اور اپنے فریق کے واسطے بھی مفید نہیں ہوسکتا۔

جس دنیا اور جس ماحول میں ہم رہتے ہیں وہ ہر کام میں استقلال ہمت اور تدبر چاہتی ہے سب سے زیادہ تر وہ یہ چاہتی ہے کہ قومی کاموں اور ملی مراحل میں اس یکسوئی سے کام لیا جائے جو اجتماعی رنگ رکھتا ہو، ہر فرد ہر قوم میں سے کامیاب اور سرفراز ہوسکتا ہے لیکن اجتماعی اور قومی رنگ میں بہت سے افراد کا کامل اور یکسو ہونا ایک خاص مرحلہ ہے افراد کی مفید یکسوئی اقوام کی اجتماعی یک سوئی کا پیش خیمہ ہوئی ہے وہ قطرہ جو بطن صدف میں رہ کر نشوونما پاتا ہے اگر طریق عمل یک سوئی سے کام نہ لیتا اور سمندر کے دوسرے قطرات میں مختلط رہتا تو وہ کس طرح موتی کی آب و تاب پیدا کرسکتا اور کیونکر ایک قیمتی لڑی میں پرو دیا جاتا ہم بھی دنیا کے کاروباری سمندر میں رہ کر اور یک سوئی سے کام لیکر اپنی قومی اور ملی ملک میں پروئے جاکر درخشاں اور تاباں ہوسکتے ہیں جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تاوقتیکہ ہم کاروباری زندگی کا بستہ تہہ

نہ کر رکھیں تب تک مسلک یک سوئی پر سالک ہی نہیں ہو سکتے یہ ایک غلطی ہے
دنیا میں رہنا اور کاروباری زندگی کی مصروفیت سے مُنہ نہ موڑنا اور پھر بعض جہات
میں یک سوئی رکھنا اور یک سوئی سے کام لینا ہی کامیاب زندگیوں کی نشانی اور
شروع ہے -

گلشن حسن را تماشا کن
کہ دمد سبزہ در خزاں انجا

سلطان احمدؒ

مسلم قدرت اسکول

سیوہارہ ضلع بجنور

یہ اسکول شیخ قدرت اللہ صاحب مرحوم رئیس سیوہارہ کے وقف سے قائم ہے۔ صاحب موصوف کے بھتیجے شیخ رحمت اللہ صاحب اس وقف کے متولی اور اسکول کے سکرٹری ہیں۔ یہ اسکول یکم جنوری ۱۹۲۳ء سے از سرنو جاری ہوا ہے۔ اس تھوڑے عرصہ میں طلبہ کی تعداد ۶۲ ہو گئی ہے۔ جس میں ابتدائی جماعتوں کے بچے بھی شامل ہیں۔ اسٹاف میں اسوقت دو صاحب اسکول لیونگ پاس ایک میٹرک پاس اور دو استاد میٹرک فیل ہیں۔ انکے علاوہ ایک مولوی عربی اور دینیات کے لئے، ایک پنڈت ہندی کی تعلیم کے لئے اور ایک استاد ابتدائی جماعتوں کے لئے ہیں۔ یہ تعداد بہت کافی ہے۔ اسکول کے جملہ رجسٹر نہایت عمدہ حالت میں ہیں اور مکمل ہیں شیخ رحمت اللہ صاحب سکرٹری اسکول نے اپنا دفتر خوب مرتب کیا ہے اور وہ روزانہ اپنا وقت اسکول کا کام کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ نو عمری میں اس قدر پابندی اور انہماک کے ساتھ ایسے مقام پر تعلیمی کام انجام دینا جہاں کہ ان امور کا چرچا نہیں ہے تعجبات سے ہے۔ سکرٹری صاحب اسکول نے اس امر کی خواہش کی ہے کہ اسکی اوپر کی جماعتوں کا امتحان کانفرنس کی طرف سے لیا جائے۔ امید ہے کہ یہ اسکول ریکگنائز ہو کر جلد ترقی کریگا۔ اس قصبہ میں ایک عمدہ اسکول کی بیحد ضرورت ہے۔

طفیل احمد

ملفوظات

جین جاک روسیو ۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء

تمدن کی حقیقت

جس شخص نے سب سے پہلے (خدا کی) زمین سے ایک قطعہ گھیر کر یہ خیال باندھا کہ "یہ میرا ہے" اور سادہ لوح انسانوں کو اس (ملکیت) کا یقین دلایا۔ اسی نے دنیا میں تمدن کی پہلی بنیاد رکھی۔ اے کاش! اس وقت کوئی اور (بالمقابل کھڑے ہوکر اور اخلاقی جرأت سے کام لیکر) حد بندی کے نشانات مٹا کر ابنائے جنس کو بآواز بلند آگاہ کر دیتا کہ "خبردار اس حیلہ باز اور جھوٹے دعویدار کے فقروں میں نہ آنا حقیقت یہی ہے اور اس کو کبھی نہ بھولنا ورنہ تم سب تباہ و برباد ہو جاؤ گے کہ (خدا کی) سرزمین کسی ایک کی ملک نہیں اسکی پیداوار میں سب کا حق برابر ہے" اگر یہ (اعلان اُسی وقت) ہو جاتا تو انسانی نسل کیسے کیسے سنگین جرموں اور خونریز لڑائیوں سے مصائب و آلام اور ہیبت ناک حادثوں سے بچ جاتی، اگر ابتدائی زمانہ کے اَن گھڑ انسان کی زندگی کا مقابلہ آج کل کے مصنوعی زندگی سے کیا جائے جسے شائستہ اور مہذب کہا جاتا ہے تو معلوم ہوگا کہ ہماری تہذیب اور تمدن کی تہ میں کیسی بے رحمی مکر و فریب اور عجب و نخوت چھپے ہوئے ہیں۔

تہذیب کا اثر

قدیم انسانوں میں جسمانی اور ذہنی تفاوت کچھ ایسا زیادہ نہ تھا لیکن تہذیب و تمدن کی ترقی نے وہ ظالمانہ امتیاز پیدا کئے ہیں کہ انسانی سوسائٹی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ یہ سب علوم و فنون کی بدولت ہے۔ اسی نے مقبوضات دنیاوی اور املاک شخصی کا نظام ایجاد کیا جسکی وجہ سے دنیا میں لوٹ مار شروع ہوئی اور اسکے انسداد کے لئے قانونی حکومت کے نظام قائم ہوئے مگر افسوس

کہ اس نظام نے نقد وجنس کے ذخیروں کے مالکوں کی قوت کو اور زیادہ مستحکم کیا۔ اور
اوسط غربا کو کھلے میدان میں بالکل بے پناہ چھوڑ دیا۔

فطرت کی وضع اور انسان کی خو

یہ قدرت سے ہر شئے بن سنور کر نکلتی ہے لیکن انسان کے پنجہ میں آکر بگڑ جاتی ہے۔ یہ ہاتھ نہیں بلکہ جبر واستبداد کا شکنجہ ہے۔ یہ ایک ملک کی سرزمین سے غیر ملک کی پیداوار جبراً اوگاتا ہے۔ ایک قسم کے درخت کو دوسرے قسم کا پھل دینے پر مجبور کرتا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں ہے بلکہ انسان کا ہاتھ مختلف الطبائع اقلیموں کی آب وہوا اور عناصر کو مختلف موسموں اور فصلوں کو خلط ملط کرڈالتا ہے یہ اپنے مملوک اور مقبوض کو بھی طبعی حالت پر نہیں چھوڑتا اپنے کتے کی دم اور کان کاٹ ڈالتا ہے گھوڑے کی حجامت کر دیتا ہے حتیٰ کہ خادم اور غلام کی ناک اور کان چھید کر اسے کوڑیالا بنالیتا ہے۔ الغرض جو شئے اس کے پنجے میں گرفتار ہوتی ہے اُسے حسن فطرت سے محروم اور تہ وبالا اور بھدا بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ کیا انسان کو زشت روئی اور بدصورتی ہی بھاتی ہے؟ بدشکل ہیبت ناک عفریت ہی پسند ہے کیسی شئے کو فطرت کی بنائی ہوئی وضع وصورت پر نہیں دیکھنا چاہتا حتیٰ کہ اپنے ہمرتبہ اور برابر کے بھائی انسان کو بھی فطرت کے پیراہن میں نہیں دیکھ سکتا۔ کیا یہ ناگزیر ہے کہ گھوڑے کی طرح انسان کو بھی خود انسان کی خدمت وبندگی کے لئے نہیں۔ بلکہ غلامی کے لئے سدھائیں؟ عماری نشین کے بجائے بارکش ومحمل بنائیں گویا یہ بھی اوس کے مقبوضہ باغ کا ایک درخت ہے کہ اُسے جس طرح اور جہاں چاہے اُگائے۔ یاد رکھو کہ انسانی مسکن اور شاہی باغ میں بڑا فرق ہے۔ جس طرح پودوں کو علم فلاحت کی زور سے کچھ سے کچھ بنالیتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو ایک خانہ ساز علم التعلیم کے زور سے اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنانا چاہیئے بلکہ اوس کی فطرت پر چھوڑ دینا انصاف ہی۔

تعلیم کا مقصد

انسان دنیا میں ضعیف ونحیف آتا ہے اور قوت کا محتاج ہے۔ بالکل

بے برگ و نوا ہے اور ساز و سامان کا ضرورت مند ہے۔ نادان ہے اور اُسے دانائی کی حاجت ہے۔ یہ صفتیں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں جس کے تین بڑے مآخذ ہیں۔ فطرت الٰہی کرشمۂ انسانی اور اشیا و موجودات۔ یہ فطرت کی تعلیم ہے کہ انسان کی اندرونی استعدادیں اور نظام خود بخود ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ اس نظام سے مستفید ہونے کی قابلیت انسانی کرشمہ سے پیدا ہوتی ہے وہ متمسکات اور مدرکات جن سے منفعل ہو کر انسان مشاہدہ اور تجربہ حاصل کرتا ہے تعلیم کا تیسرا ماخذ ہے ان میں فطرت کو معلم اول سے، اشیا کو معلم ثانی سے اور انسان کو معلم ثالث سے موسوم کریں تو مناسب ہو گا۔ غور سے دیکھئے تو معلم اوّل باقی دونوں سے مستغنی ہے۔ معلم ثانی بعض خاص صورتوں میں ہماری مرضی کے تابع ہے۔ البتہ معلم ثالث یعنی کرشمہائے انسانی پر ہمیں ایک طرح کی قدرت حاصل ہے۔ مگر یہ بھی اصولاً ہے بالفعل نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں صاف ظاہر ہے کہ اگر کسی بچے کی تعلیم و تربیت میں تینوں معلم متفق الرائے اور مشترک بالعمل ہیں تو اوس کی تعلیم صحیح ہو گی اور اگر ان میں اختلاف ہے تو بچہ اور اوس کی تعلیم و تربیت سب اکارت جائینگی۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ تعلیم و تربیت میں انسان کے افعال و اقوال اشیا و موجودات کے مطابق ہونے چاہئیں اور یہ دونوں باہم ملکر وضع فطرت کے مطابق کام کرینگے تو صحیح تعلیم ہوگی۔ ورنہ دوعملی اور سہ عملی میں بچہ کا وقت اور قوا ضائع ہو گئے۔

اصلی اور نقلی انسان

قدرتی انسان اپنی ذات میں فرد مکمل ہے۔ احدیت کی شان رکھتا ہے گویا صحیح عدد ہے کسر نہیں۔ کل ہے نہ کہ کل کا ایک جزو۔ جس طرح کلیہ کے اجزا کو باہم ایک دوسرے سے نسبت ہوتی ہے اسی طرح انسان کو تکمیل کے لئے اور کسی ہستی سے کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ قائم بالذات ہے اور اپنے ابنائے جنس کی جانب بطور ایک ذات کاملہ منسوب ہے۔ اسکے خلاف تہذیب یافتہ آدمی مصنوعی انسان ہے۔ جس طرح کسور عام میں صحیح عدد کی کسریں ہوتی ہیں اور انہیں سے

ہر ایک کسر بطور ایک شمار کنندہ ہے مگر اپنی ہستی کو نسب نما سے مستغنی ہو کر ظاہر نہیں کر سکتی بلکہ اُسکی قدر و قیمت کا انحصار نسب نما کی ہستی سے وابستہ ہے اسی طرح تہذیب یافتہ انسان نظام معاشرت یا ہیئت اجتماعی کا ایک جزہے اس سے جدا ہو کر اس کی کوئی ہستی نہیں۔ سب سے اعلیٰ ہیئت اجتماعی وہ سمجھا جاتا ہے جو انسان کو سب سے زیادہ خلاف وضع فطرت بنا دے اوسکو ہستی مطلق سے محروم کر کے ایک منسوب ہستی کا جامہ پہنا دے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایک ذات ایک ہی وقت میں دو متضاد حیثیتیں کیونکر اختیار کر سکتی ہے یعنی ایک مستقل اور مکمل اور قائم بذاتہا حیثیت بھی قائم رکھے اور نظام معاشرت کا ایک جز بن کر ایک ناقص اور منحصر علیہ ہستی کو بھی تعبیر کرتا رہے۔ کوئی کلمہ ایک ہی وقت میں مصدر اور مشتق نہیں بن سکتا۔ نہ انسان کل اور جز ہو سکتا ہے۔ روسیو

الفینسو اسکیروس (انیسویں صدی کا امیل)

روسیو کے تمام مباحث تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ بچوں کی تربیت تعلیم میں قدم بقدم فطرت کا اتباع کرنا چاہیئے مگر مشکل یہ ہے کہ اگر ہر امر میں وضع فطرت کی پیروی کریں تو پھر وہی دور وحشت پلٹ آئیگا جسے قانون ارتقا نے رفتہ رفتہ معدوم کیا ہے بچے انسانوں کے زمرہ سے نکلکر وحشیوں کے غول میں داخل ہو جائینگے مثلاً انصاف اور آزادی دو ایسی زبردست فطری طاقتیں ہیں کہ اگر ان سے کام لیا جائے تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں کایا پلٹ کا نقشہ سامنے آجائیگا۔ لیکن طلبہ کے مقابلہ میں عدل و حرّیت کا سلوک کرنے سے کچھ اچھا پھل نہیں ملیگا۔ با این ہمہ روسیو کے نزدیک تربیت کا سدرۃ المنتہی ہی دور وحشت ہے۔ روسیو وحی اور الہام کا معتقد نہ تھا مگر یہ مانتا تھا کہ معیار کمال خود فطرت ہی میں موجود ہے اسلئے وحی والہام کی ضرورت نہیں۔ روسیو کا یہ خیال بھی تھا کہ بچوں کے ساتھ داناؤں جیسا برتاؤ کرنا چاہیئے مگر تعجب یہ ہے کہ بچپن میں عقل و دانش کا

مادہ مکمل نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اون سے اس طرح سلوک کریں کہ گویا وہ دانا و بینا ہیں اور اونکی عقل پختگی کو پہونچکر اکثر حالتوں میں رہنمائی کر سکتی ہے۔

اصل میں روسیو نے اصول تعلیم اس وقت کے بعد مرتب کیے جن کے انقلاب فرانس کا خاتمہ ہوکر حکام نے اپنی تعلیم کا جال بچھا دیا تھا۔ کیونکہ روسیو نے بیجا آزادی کی تلقین کی ہے۔ بیشک آزاد اشخاص حکومت کے نظام عمل سے پیدا نہیں ہوسکتے تھے یہ بھی سچ ہے کہ جہالت سب سے زیادہ آزادی کی مزاحم ہے لیکن اگر کوئی حکومت تعلیم کو مفت اور جبری کردے اور دعوی کرے کہ اس سے حریت کی صفت پیدا ہو جائیگی تو یہ بالکل غلط دعوی ہے۔ چین میں ہر کس وناکس خواندہ ہے ابتدائی وثانوی مدارس کی نہایت کثرت ہے بااین ہمہ حریت کا کہیں نشان نہیں بلکہ برعکس آثار غلامی کی کثرت ہے۔ وجہ یہ کہ جس قوم میں تعلیم وتربیت کا مقصد اوّلین یہ ہوگا کہ رعایا کو حکومت کے مفاد کے لیے ایک خاص سانچے میں ڈھالا جائے اوسکا یہ حشر ہوگا کہ سوسائٹی کی بندشیں اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائینگی اور ہر فرد پر جامہ زیست تنگ ہو جائیگا۔ تعلیم کے جدید نظام اور سامان کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ عمارت سے لیکر نصاب۔ ضابطہ اور رہائش کے طریقہ تک سب ملکر ایک قید خانہ ہے جس میں نوجوانوں کا جسم اور عقل دونوں ناکردہ گناہ محبوس ہیں مصر کے مرغ چوزے کی طرح ان میں طالب علم اُبل اُبل کر یا سِنک سِنک کر پختہ و پزہ ہوتے ہیں خصوصاً ان کی قوت حافظہ اور قوت تقلید سب سے بہتر بنا کر تیار کی جاتی ہیں حالانکہ علم الاعضا کے ماہرین متفق الرائے ہیں کہ ملکات صحیحہ کے اظہار کے لیے انسے ادنی طاقت اور کوئی نہیں۔

حامد علی صدیقی

علامہ ابن خلدون

(مقدمہ ص ۱۴۱/۲/۶)

شریعت اور قانون کا فرق۔

جب قانونی احکام نے عوام کی فطری حریت میں رکاوٹیں پیدا کیں اور مذہب کے احکام ضعیف ہوئے تو شریعت کا نظام بالکل دکھلاوے کا رہ گیا تعلیم و تعلم کا جال بچھا۔ تہذیب و تمدن نے سادہ زندگی کے دامن پر رنگ آمیزی شروع کی۔ شاہی احکام نے زور دکھایا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے رُک کر شجاعانہ جذبات جو فطرت کا خاص عطیہ تھا۔ رفتہ رفتہ فنا ہوگئے۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ ہر ایک اجنبی قوت جو عطیات فطرت کی حد میں داخل نہ ہوسکے اور جس کو قوت خانہ زاد نہ کہہ سکیں شجاعت کے منافی ہوگی تعلیمی احکام کا نظام۔ شاہی نظام قانون کا اہم جز ہے اس لئے لازم آتا ہے کہ ہر ملک اور قوم میں سررشتہ تعلیم کا عمل۔ افراد قوم کی روح کو ضعیف کر کے اون کی قومی شان و شوکت کو مٹا دے۔ بدلگام اور خلاف قانون جماعتیں جن کو بدراہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ زندگی کے کسی شعبے میں احکام شاہی کی پرواہ نہیں کرتیں۔ اس لئے مردانہ جسارت و شجاعت کے جذبات سے اون کے دل مملو رہتے ہیں۔ بچوں کو زمانہ تعلیم و تربیت میں اسی وجہ سے جسمانی سزا کی سخت ممانعت ہے جیسا کہ علامہ محمد بن زید نے ”احکام المعلمین والمتعلمین“ میں مفصل بحث کی ہے۔ طلبا کو عموماً اور بچوں کو خصوصاً سختی اور عقوبت جسمانی سے تعلیم دینا سخت درجہ مضر ہے۔ جس متعلم کی تعلیم اس اصول پر کی جائیگی اوس کے دل و دماغ کی نشو و نما مسدود ہو کر شگفتگی جاتی رہیگی۔ اور ان کے بجائے مردہ دلی اور پژمردگی اور کاہلی غلبہ کریگی اور اس کی خصلت بدل کر جھوٹ۔ مکر و فریب اور مرض نفاق پیدا ہو جائیگا اور پھر یہ بدعادت رفتہ رفتہ

طبیعت ثانی بن کر رگ و پے میں دوڑ جائیگی۔ اس میں انسانی فضائل خصوصاً غیرت حمیت اور قوت مدافعت باقی نہ رہیگی اور وہ ہر بات میں دوسروں کا دست نگر ہو جائیگا۔ قومیں جو جبر و تشدد کے شکنجہ میں بسر کرتی ہیں۔ ان میں اخلاقی ذمائم پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہارون رشید نے اپنے چہیتے بیٹے امین الرشید کو معلم کے سپرد کر کے اُسے اُس پر تمام اختیارات مثل اپنے دیے تھے مگر اس کے ساتھ یہ تنبیہ کی تھی کہ "جہاں تک ممکن ہو اسے کبیدہ خاطر نہ کرنا ورنہ اس کا دل پژمردہ ہو کر ذہانت مفقود ہو جائے گی"۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

(احیاء العلوم)

طلبا کو اخلاقی ذمائم سے روکنے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں اشارہ کنایہ سے تنبیہ کریں بدعادت کو کھول کر نہ بیان کریں۔ یہ تنبیہ بھی لطف و مہربانی سے کرنی چاہیئے نہ کہ زجر و توبیخ سے۔ گناہوں کی تصریح کرنے سے گنہگار کی حیا کا پردہ چاک ہو کر ضد اور حرص بڑھ جاتی ہے لیکن اگر اعراض کیا جائے تو اکثر طباع اور نیک نفس بچے یا بڑے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔

اصلاح تمدن

(اقتباس واستفادہ از کاونٹ لیوٹالسٹائی)

ضبط نفس جب تک ضبط نفس کی مشق نہ ہو تب تک انسان دنیا میں کوئی فضیلت حاصل نہیں کرسکتا۔ مشق شروع سے درجہ بدرجہ بڑھ سکتی ہے۔ بعض نفسانی خواہشات میں کچھ اصلی ہیں اور کچھ اون کے شاخیں ہیں۔ جیسے درخت کی جڑ سے کئی تنے نکل کر ہرایک شاخ در شاخ ہوکر پھیلتا ہے مثلاً بسیار خواری کی عادت معطل اور بیکار رہنا شہوات پرستی یہ سب اصلی ذمائم ہیں اوران کے شاخسانے۔ آرائش جسمانی بناؤ سنگار۔ دل بہلاؤ کے کھیل۔ تماشے۔ زیادہ گوئی۔ فضول بکواس۔ دخل درمعقولات وغیرہ جن کی جڑ کاٹنی چاہیئے نہ کہ ان کی شاخوں کو تراشنا۔ جو شخص زیادہ کھاتا ہے وہ کبھی عطل اور بیکاری کو چھوڑ نہیں سکتا اور ایک بندہ شکم اور بیکار محض سے کبھی ممکن نہیں کہ دماغ میں شہوانی خیالات پیدا نہ ہونے دے۔ اسکا آسان علاج فاقہ کشی ہے۔ مگر افسوس کہ فی زمانہ نیک زندگی حاصل کرنے کے ذرائع قطعاً مفقود ہیں۔ ہرچند کہ ضبط نفس کی عادت بغیر کوئی نیکی میسر نہیں ہوسکتی۔ مگر اس صفت کو عام طور پر لغو سمجھا جاتا ہے اوراس کے حاصل کرنے کے مبادیات کو حماقت سے تعبیر کرتے ہیں فاقہ کش اور روزہ دار شخص کو متعصب ملا نا خیال کرتے ہیں۔ تم نیک بننے کی عمر بھر آرزو کرتے رہو، جب تک فاقہ کشی نہ سیکھو گے تب تک نیکی ارمان دل رہیگا فاقہ کشی بغیر ضبط نفس کی عادت پیدا کرنا ایسا ہے جیسا کہ ٹانگوں کی مدد بغیر کھڑا ہونا۔

بندہ شکم ذرا ہمارے زمانہ اور ہماری جماعت کی صورتیں تو دیکھیے۔ کیا لال لال گلے پھلائے ہیں۔ غریب ٹھوڑی کو بھی نمایاں ہونے کی گنجائش

نہیں رہی۔ ان کا جبڑہ کلّہ تو دیکھئے تو ان جوع البقر کی بلانوشی ملاحظہ فرمائیے جس نے سنگ دانہ مرغ کو مات دی ہے۔ گویا ان کے جسم کے چپہ چپہ پر ایک تباہ و برباد زندگی کی مُہر لگی ہے۔ ذرا ہماری روزمرہ زندگی پر غور کیجئے۔ ان اغراض و مقاصد کو دیکھئے جن سے ہماری صحبت کا ہر ایک فرد ہر وقت متاثر رہتا ہے اور پھر پوچھئے کہ ان بھلے آدمیوں کی زندگی کا مقصد کیا ہے، کیا یہ ہے کہ

"خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است"

افسوس کہ یہ نہیں۔ ہیں کہ ہم اپنے اصلی ذوق کو چھپانے کے عادی اور بناوٹی شوق ظاہر کرنے کے مشاق ہیں صاف معلوم ہوگا کہ یہ سب بندۂ شکم ہیں زبان کے چسکے پر مرتے ہیں گویا ان کا زرّین اصول ہے۔

"تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن است"

ادنیٰ غریب سے لیکر اعلیٰ دولتمند تک زبان کے مزے کے سوا اور کسی چیز کا شائق نہیں۔ محنتی مزدور گو اس سے مستثنیٰ ہیں مگر وہ بھی اس حد تک کہ ناداری کی وجہ سے بالکل پیٹ کے کتّے نہیں بن گئے پھر بھی جب موقع ملتا ہے۔ وہ بھی امیروں کی تقلید کرنے سے نہیں چوکتے حتیٰ المقدور سب سے لذیذ اور میٹھی چیز حاصل کر کے خوب مزے اڑاتے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ لوگ جتنا زیادہ کھاتے ہیں اتنا ہی اپنے آپ کو خوش نصیب قوی اور تنومند سمجھتے ہیں۔ اس عقیدہ میں اعلیٰ طبقہ اون کی اور بھی زیادہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلئے کہ خود اسی مرض میں مبتلا ہے تعلیم یافتہ جماعتیں ڈاکٹروں کے بھرّے میں آکر سمجھتی ہیں کہ سب سے زیادہ قیمتی کھانے۔ گوشت۔ شرابیں۔ سب سے زیادہ صحت بخش مقوی غذائیں ہیں۔ یہ سادہ لوح بھی پختہ یقین رکھتے ہیں کہ عیش و راحت کا دارومدار مزہ دار جسم پرور اور سریع الہضم غذا پر ہے۔

ذرا امراء کی زندگی دیکھئے اون کی باتیں سنئے اور سوچئے کہ وہ کن بلند خیالیوں میں

مصروف ہیں؟ فلسفہ اور سائنس میں یا علوم و فنون میں؟ نظم و نثر کے کسی چوٹی کے کلام میں مصروف ہیں؟ کیا انہیں غذا کی دولت کی تقسیم کرنے کی فکر ہے؟ یا رفاہ عام کا خیال یا بچوں کی تعلیم و تربیت کا غم ہے؟ افسوس یہ سب اکثر افراد کے ضمنی خیالات ہیں جو اصلی مشاغل کے سلسلے میں بطور ضمن و ضمیمہ طے ہوا کرتے ہیں۔ وہ اصلی اور دل چاہتا شغل کیا ہے؟ لنچ اور ڈنر۔ حالانکہ اس وقت ان کے معدے ممتلی اور پیٹ ناک تک پُر ہوتے ہیں۔ سانس کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ مرد اور عورتیں یکسر خصوصاً جوانی کی مدہم ہو چکر زبان کے چٹخارے پہ مرتے ہیں کوئی کتنا ہی ذلیل و خوار کرے مگر چند ترلقمے کھانیکو دیدے۔ کوئی رسم و تقریب تعزیت کی ہو یا تہنیت کی۔ مرنا ہو یا جینا۔ مذہب کی طرف سے دعوت ہو یا جلسہ افتتاحی ہو۔ ہمارے بندگان شکم پرتکلف کھانوں کے لالچ میں آستین چڑھا کر لپکتے ہیں۔ سفر میں بھی ان کی جیب نہیں تھمتی۔ گھر سے خوب کھا پی کر چلتے ہیں مگر ریل کے درجے میں بیٹھتے ہیں پہلا کام یہ ہے کہ کسی بڑھیا خونچے والے کو آواز دیں، عجائب گھر ہوں کہ کتب خانے۔ دار المعوثین ہو کہ ایوان حکومت۔ اگر وہاں کچھ کھانے کو ملنے کی امید ہو تو بڑے شوق سے قدم بڑھاتے ہیں اور چلنے سے پہلے ہی یہ پوچھ لیتے ہیں کہ کھانا کہاں ملیگا۔ سب سے زیادہ ترلقمہ ان میں سے کس مقام پر ملیگا؟

ذرا ان بیٹو کلب کے ممبروں کو دیکھئے تو سہی کیسے زرق برق لباس اور پُر تکلف پیراہن میں اپنے آپ کو ملبس کرکے اور طرح طرح کی خوشبوئیں بسا کر میز کی طرف خراماں خراماں بڑھتے ہیں جو گلدستوں کی کثرت سے باغ ارم کی کیاری معلوم ہوتی ہے کیسے خوشی خوشی میز کے گرد بیٹھتے ہیں بار بار ہاتھ ملتے ہیں۔ مسکراتے ہیں اور کھانوں کی خوشبوؤں کے سونگھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے ان احباب کے دل میں گھسکر تلاش کیجئے سب سے اندر کی تہ میں کھانے کی آرزو کے سوا کچھ نہیں ملیگا۔ انکے لئے سخت ترین سزا یہ ہے کہ سادہ پانی اور روکھی

روٹی کھانیکو دیدیجئے۔ آپ غور سے دیکھیں کہ اپنے گروہ میں باورچی سے زیادہ اور کس کو بھاری مشاہرہ ملتا ہے؟ شریف گھرانوں میں صاحبہ خانہ کا بڑا مشغلہ کیا ہے؟ متوسط جماعت نہیں عام گھر کی بیبیوں کا روئے سخن اکثر کس جانب رہتا ہے؟ باورچی خانہ کھانا۔ اور بس اور اگر اعلیٰ طبقہ میں ادہر توجہ نہیں ہوتی تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ کسی اعلیٰ اور برگزیدہ مقاصد میں مصروف ہوتے ہیں۔ نہیں بلکہ محض اسلیئے وہ ادھر سے بے توجہ ہیں کہ انکے ہاں ایک میرساماں ایک مطبخ دار۔ ایک داروغہ۔ ایک آبدار۔ بھاری تنخواہ پر اس کام کو انجام دے رہا ہے اگر کوئی اس طرف ہاتھ بٹانے والا نہیں ہے تو پھر اونکی اضطراب و پریشانی دیکھیئے۔ الغرض اسکے سوا اور کچھ فکر نہیں کہ عمدہ چاۓ کیونکر دم ہوتی ہے۔ کافی کس طرح بنتی ہے۔ ہلکی میٹھی ٹکیاں جو حلق سے اُترتے ہی فوراً ہضم ہوجائیں کس طرح تیار ہوتی ہیں۔ خواہ کسی قسم کی تقریب ہو۔ اذان و بسم اللہ ہو یا بپتسمہ کی رسم۔ تجہیز و تکفین ہو کہ بیاہ شادی۔ عبادت گاہ میں جمع ہوں یا خوش آمدید یا الوداع کہنے کے لیے کسی دوست کے مکان پر جمع ہوں۔ کسی مبارک دن کی یادگار ہو یا رزمی تقریب ہو۔ کسی عالم فاضل اُستاد زمانہ مشہور معلم الاخلاق۔ معلم اول کی سالگرہ ہو۔ اصلی کام کے لئے کوئی بہی نہیں آتا۔ دیکھنے کو تو ہر شخص کے چہرہ سے سنجیدگی اور بڑائی ٹپکتی ہے اور زبان سے کہتا بھی یہی ہے۔ مگر یہ سب بہانہ ہے انکے دل میں وہی سب سے پہلی چیز یعنی کھانا پینا ہے۔ مزہ دار قاب اور جام و صراحی سب سے بڑی مقناطیسی قوت ہے۔ یہ نہ ہو تو مجلسوں کا کورم ہی پورا نہیں ہوتا۔ صدر جلسہ خود غائب ہوجاتے ہیں اور سچ بہی ہے کہ جہاں چاۓ کی پیالی تک ملنے کی امید نہ ہو وہاں کوئی آکے کیوں وقت ضائع کرے۔ تنور شکم دمبدم تافتن۔

مذہبی رسم کی ادائیگی کے لئے یا اہم قومی جلسہ کی تیاری میں پہلے سے پانچ منٹ صرف کرنے بہی دشوار ہیں۔ لیکن ضیافت کے لئے ہفتوں پہلے سے سازو سامان جمع ہوتا ہے پرند و چرند ذبح ہوتے ہیں۔ مشہور دکانوں سے خورو نوش کا سامان خریدنے میں بیدریغ

روپیہ خرچ کرتے ہیں دور دور سے کاریگر باورچیوں کو بھاری مشاہروں پر بلاتے ہیں خانساماں
بیروں کی فوج بھرتی کی جاتی ہے۔ جن کی اعلٰی نفیس وردیوں پر دل کھولکر لاگت لگاتے ہیں
اس پر بھی صبر نہیں آتا تو بھاری بھاری تنخواہ کے افسر خانساماں بلائے جاتے ہیں۔ کہیں
مرغ مسلم۔ سیخ کباب سنک رہے ہیں تو کہیں فرعفر متنجن تیار ہو رہے ہیں۔ کہیں فیرنی کو داغ
لگ رہا ہے۔ جناب میر سامان صاحب بڑی غور و فکر سے مصروف ہیں۔ تمام باورچیخانوں
میں گھبرائے گھبرائے پھرتے ہیں اور کسی بڑے عالم و نقاد سخن کی طرح بال کی کھال نکالتے
ہیں۔ اودھر ایک کاریگر باغبان بہت سے مالیوں سمیت مہمانوں کے لئے پھول بٹن اور
گلدستے تیار کر رہا ہے۔ میز کی نباتی آرایش اور کمرہ کی دیواروں کی گلکاری پر لگا ہوا ہے
مہینوں کی محنت کے ثمرات اب کوئی دم میں نگلے جانے کو ہیں۔ اس تمام عیاشی پر پردہ
ڈالنے کے لئے ہمارے احباب اپنے نفس کو اس طرح دھوکا دیتے ہیں کہ یہ جلسہ فلاں عالم
کی یادگار میں ہے۔ کبھی اسکو ولیمہ قرار دیا جاتا ہے اور کبھی دعائی جلسہ۔

الغرض ہر ایک تہوار اور تقریب نفس الامر میں زبان کی لذت کے لئے ہے مقصود
اصلی یہ ہے۔ البتہ اس پر طرح طرح کے پردے ڈالے جاتے ہیں۔ ادنٰی درجہ کے لوگ اسکو
کم چھپاتے ہیں۔ متوسط زیادہ پردہ داری کرتے ہیں سب سے گہرا اور دانشمندی کا پردہ امرا
اور دولتمند ڈالتے ہیں۔ گویا کہ کھانا پینا ایک معمولی بات ہے اصلی مقصد اعلٰی اور برگزیدہ ہے
کھانا تو ایک طرح کا بار گراں ہے۔ مگر یہ سب جھوٹ۔ فریب اور مکر ہے اگر ایک وقت ان کو
کم لذیذ کھانا ملے۔ سادہ پانی درکنار۔ شوربہ چپاتی یا ان کے ہم پلہ کوئی غذا دیجائے تو
یہ غصہ کے مارے جامہ سے باہر ہو جاتے ہیں اور ان کا وہ گہرا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

(باقی آیندہ)

حامد علی صدیقی

خرفہ ہستی

نمبر ۲

(سلسلہ کے لئے دیکھو جولائی کا پرچہ)

بچہ گویا دور وحشت اور دور انسانیت کے بیچ میں واقع ہے۔ اسکے ماضی کی تاریخ جریدہ روزگار میں داخل ہو چکی ہے۔ مگر مستقبل فیصلہ کے لئے زمانہ کے روبرو پیش ہے ہمیں افسوس ہے کہ اکثر معلمین اور اساتذہ اس حقیقت سے نابلد ہوتے ہیں۔ فی الاصل یہ کم علمی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے ہے حالانکہ سب سے اول انہیں ہی جاننا چاہیے اور ٹریننگ کالجوں میں سب سے پہلا لکچر اسی موضوع پر مناسب ہوگا۔ کہ بچہ اپنی اصل حقیقت میں کیونکر وحشت اور انسانیت کے درمیان ایک حرف مشدد ہے۔ یہ بہت بڑے طباع پروفیسر یا امام فن اور بلند پایہ اساتذہ کا کام ہے جن میں انتہائی درجہ کی وسعت نظری اور قوت القائے باہم ملکر یہ قابلیت پیدا کر دی ہو کہ بچے کے ماضی و مستقبل دو متضاد میدانوں کا دو رخی نظر سے ایک ہی وقت میں مشاہدہ کرتے چلے جائیں۔ مگر آج مدرسوں میں جس ذلیل اور حقیر درجہ کی سرگرمی دکھائی جاتی ہے اس سے گویا بچپن برباد اور اسکے ساتھ جوانی بھی غارت ہو رہی ہے۔ اوسکی اصل حقیقت کو مطلقاً نہیں سمجھا جاتا۔ زجر و توبیخ کے قانون اور غلامانہ ڈسپلن کے عمل نے ایک سرسبز اور بار آور خیابان فطرت کو جلا ڈالا ہے۔ ہم والدین کو اس جرم سے بری نہیں کرتے۔ لیکن مدرسہ کے اساتذہ کا مبلغ علم اور ذہنی سطح ہی بہت بری طرح پست ہے۔ بلند خیالی اور عالی دماغی نے انہیں مس بھی نہیں کیا۔ پھر کیا تعجب ہے کہ ایسے حلقہ درس و صحبت میں انسان بچپن کا میدان طے کر کے جب جوانی میں داخل ہوتا ہے تو غالب کے اس تخیل کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

شخص واحد ہو خاندان و نسل ہو یا ملت و قوم ہو انسان کی ہیئت انفرادی و اجتماعی میں بہر صورت اس کا زمانہ حال حقیقی حیات کا ایک دَور ما بعد ہے اور بڑے بڑے محققین مغرب آج تک نہیں بتا سکے کہ حیات کے اس سلسلہ نامتناہی میں ایسے ایسے اور کتنے دَور باقی ہیں بلکہ اگر اس موضوع پر مشرق و مغرب کے علما کی دماغ سوزی کے نتائج کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کائنات میں فطرت کا قانونِ تکمیل ابتدا سے آج تک ہستی کو کتنے قالب طے کرا چکا ہے۔ قدمائے مشرق کا یہ محض ایک نظریہ ہے کہ

سی صد و ہفتاد قالب دیدہ ام
ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام

لینس نے انواع مخلوق ...۴ ہم مگر تحقیق جدیدہ کا آخری حکم ایک لاکھ تعداد معین کرتا ہے جس میں موجود و نابود نیز طوفان نوح کے ماقبل اور ما بعد کے تمام انواع شامل ہیں۔ مولانا روم نے اسی فلسفہ ارتقا کو اپنی مثنوی میں جابجا دوہرایا ہے مثلاً ایک مقام پر کائنات کی تاریخ میں نامیات کے وہ ابواب مجملاً دکھاتے ہیں جن میں ہستی میدان ارتقا کے جمادی اور نباتی و حیوانی مراحل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے پھر موجودہ درجہ انسانیت کو دکھایا ہے اور پھر مستقبل میں انسان کو ملکوتی درجے تک ترقی کرا کے اس رتبہ سے آگے بڑھا دیا ہے اور سدرۃ المنتہیٰ سے تجاوز کر کے لامکان و لاہوت تک پہونچایا ہے۔

بار دیگر از ملک قربان شوم
آنچہ اندر وہم ناید آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنون
گویدم انا الیہ راجعون

یہ مسائل اس قدر ہیبت ناک اور دشوار ہیں کہ زمانہ حال کو دیکھکر ہم کسی طرح بھی مستقبل کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر کچھ مدد ملتی ہے تو ماضی کے شیون کا بغور مطالعہ کرنے سے ملتی ہے بچپن کو منطق کا مسئلہ نہ سمجھئے کہ لفظی دلیلوں سے اس کا اثبات و نفی ممکن ہو بلکہ سچ یہ ہے کہ ہستی کے میدان میں بچپن کی منزل بجائے خود ایک مکمل صغریٰ و کبریٰ ہے یہ مجسم شواہد کا ایک مرقع تصاویر ہے جسکی نشو و نما اور جسمی اور ذہنی ترقی کے سلسلہ میں وہ شواہد ہر شخص خصوصاً والدین کے مشاہدہ میں دن رات اس طرح آتے رہتے ہیں جیسے کسی شاندار تھیٹر میں تماشائیوں کے سامنے رنگین پردے کھل کھل کرنئے جلوے پیش ہوا کرتے ہیں۔ ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معمولی شجرہ انساب کے علاوہ جسکو انسان کی فضولی نے خود گڑھ لیا ہے بچہ ایک فطری شجرہ بھی رکھتا ہے جسے محقق دانشمند کے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اس شجرے میں انساب کے بجائے ارتقا کے طبقے معین کئے گئے ہیں جنہیں کائنات کی ارتقائی سلسلے کی کڑیا ں کہیں مرتو زیبا ہے۔ ان میں بعض مراحل علم الحیوانات کی قلمرو کی حد میں واقع ہوتے ہیں۔ اور بعض علم فطرت انسانی کی اقلیم میں ہیں لہذا پروفیسروں اور اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ جب بچے کو اس نظر سے دیکھیں کہ یہ انسانیت کا ایک ننھا منا سا نمونہ ہے تو اسکے ساتھ تاریخ تکوین موجودات پر بھی ایک نگاہ بازگشت ڈال لیا کریں۔

نگاہ بازگشت سے ہماری یہ مراد ہے کہ وہ اوّل ایک عالم خیال پیدا کریں پھر اپنے آپ کو ہستی کے میدان میں فرض کریں جو اگرچہ فی الحقیقت نامتناہی ہے مگر تحقیق جدید نے ضروریات عقلی کی بنا پر اس میدان کا ایک آغاز فرض کر لیا ہے۔ پھر وہ اس میدان کا نظارہ اس روشن ضمیری سے کریں کہ انکی نظر تعصب اور کورانہ تقلید کی جھاڑیوں میں نہ اُلجھے بلکہ میدان کی تمام منزلوں کی سیر کرتی ہوئی چلی جائے اسی میدان میں وہ قوت جو حیات و ہستی سے موسوم کی گئی ہے مختلف قوالب سلسلہ وار طے کرتی ہوئی نظر آئیگی۔ انہی میں ایک قالب بچپن کا بھی ملیگا یہ جمادات اور نباتات سے بذریعہ حس و حرکت اور وحوش سے بذریعہ عقول بلند ہوگا۔ مگر کامل انسان کے مقابلے

میں اس کا درجہ پشت ہوگا۔

ہستی کو اس تکمیل کے درجہ تک ترقی کرنے میں ہزارہا صدیاں طے کرنی پڑیں جن کا شمار ناممکن ہے۔ فرض کرو کہ ابتدائے آفرینش سے آجتک جسقدر زمانہ گذرا ہے اگر اسے ہزار ہزار برس کے قروں پر تقسیم کریں تو ایک قرن ہماری جیبی گھڑی کی سکنڈ ہینڈ کی ایک حرکت بلکہ چشم زدن کی برابر بھی نہیں ہوتا ہے۔ جرمن حکیم ہیکل کا قول ہے کہ اگر کائنات کی عمر کا حساب لگانے کیلئے دس کروڑ برس کا ایک شبانہ روز فرض کریں تو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے اب تک پورے پانچ سکنڈ بھی نہیں ہوتے۔ ایک اور محقق اسٹانلی ہال نے اس سے بھی زیادہ بلند پروازی دکھائی۔ وہ کہتا ہے کہ ایک نامتناہی زمانہ کو متناہی حصوں پر تقسیم کرنا صرف اسلئے کہ ابتدائے آفرینش سے آجتک مدت معلوم ہوجائے بالکل فضول ہے۔ البتہ سلسلہ ارتقا کی کوئی کڑی معلوم کرنے کے لئے زمانہ کا تعین کرنا کسی قدر کارآمد ہوگا مثلاً علم النفس اور علم الطبعیات کے مسلمات میں سے بعض ایسے ہیں جو انسان کی محدود نظر کے احاطہ میں آسکتے ہیں انکے دور تکمیل کا زمانہ متعین کرنا سود مند ہے ورنہ یہ عالم مرئیات لاتعداد اوضاع و اطوار کا ایک مرقع ہے جس کی تکوین میں مادہ تولید اور قوت نمو نے کچھ خبر نہیں کب سے عمل شروع کیا ہے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ موجودات میں سب سے پہلے کس چیز کی تکوین ہوئی۔ بعض قدیم اشیاء جو اس عالم مرئیات کے کونوں میں چھپی ہوئی پڑی ہونگی ان میں چند پر محققین کی نظر پڑی ہے انہی کو تحقیقات کے میدان میں یہ جماعت تو اور قدرت اور اسرار الٰہی سمجھتی ہے اور یہی انسان کی کسیقدر رہنمائی کررہی ہیں۔ کائنات کی تاریخ ماضی۔ انہی کی بیان کی ہوئی داستان ہو ہے۔ بچے کی اصل وحقیقت کا پتہ لگنے سے یہ فائدہ ہوا کہ بچپن کے خواص وعوارض معلوم ہوگئے اور اس سے بچوں کی تعلیم وتربیت کا دور بالکل بدل گیا وہ اگلا سا زجر و توبیخ کا طریقہ ظلم و تہدید کی حد میں داخل کیا گیا اور اوسکے بجائے مہر و ملاطفت کے سلوک کا آغاز ہوا۔ اب یہانتک نوبت پہنچی ہے کہ پروفیسر مانٹیسری جو اس فن کی مسلم امام سمجھی جاتی ہیں معلمین کو حقیقی خادموں کی طرح بچوں کو تربیت وتعلیم دینے کی ہدایت کرتی ہیں۔ انکا قول ہے

سکے جس طرح ایک فرمانبردار اور وفاشعار خادم طرح طرح کے دلچسپ اداؤں سے اپنے آقا کو ہر وقت خوش کرتا رہتا ہے اسی طرح اساتذہ کو چاہئے کہ بچّوں کی علمی اور اخلاقی خدمت میں ہر وقت کمربستہ رہیں۔ لیکن بچپن کے خواص وعوارض شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کے اس سلسلہ تحقیقات کو مجملاً ہدیہ ناظرین کریں جسکی بدولت علماء مغرب بچّے کی اصل وحقیقت تک پہونچے۔ یہ درحقیقت ایک نہایت طول طویل بحث علوم الطبعیہ کی تمام شاخوں پر محیط ہے۔ اسلئے جس اختصار کیساتھ ہمنے جولائی کے پرچہ میں آغاز کیا ہے اسی طرح ان مباحث پر سرسری نظر ڈالی جائیگی۔

یوں تو مجہول کو معلوم کرنیکا شوق انسان کی جبلّت میں ہے۔ یہ مادہ تعقل کا ایک نمایاں خدوخال ہے۔ جو ایک نوع مخلوق کو دوسرے سے متمیز کرتا ہے۔ پھر بھی مغرب میں اس مادہ کو جغرافیائی تحقیق سے ہیجان ہوا۔ اور سب سے پہلے واسکوڈی گاما اور کولمبس نے آگ لگائی جنکے نام اور کام سے مدرسہ کا بچہ بچّہ واقف ہے سرزمین امریکہ کی تحقیق پر یورپ میں اسقدر تہلکہ مچا کہ گویا کہ ہر ملک میں سوتے ہوئے فتنے بیدار ہو گئے۔ انگوٹھے کی برابر بلجیم بھی جسے یورپ کا کوردہ کہنا چاہئے سوتے سے اچانک جاگ اٹھا۔ ڈاکٹر ویسالیس (بصالیس) جو دور اوّل کی تحقیق کی مطابق تشریحات کا بڑا ماہر تھا یونانیوں کے مسلمات سے بدظن ہو گیا۔ اور انکے دعوؤں کو حقیقت اور مشاہدہ سے مطابق کرنے کے لئے ایک ہاتھ میں جالینوس کا زائچہ تشریحات اور دوسرے میں نشترجراحی لیکر اٹھا۔ اس زبردست حکیم کی سوانح عمری ہمیں سرسید کی حیات جاوید یاد دلاتی ہے۔ دونوں کو سخت متعصب پبلک سے مقابلہ کرنا پڑا۔ بصالیس کے سر پر تحقیق کا جنون اسقدر سوار تھا کے بڑے اور بچے اینٹیں پھینکتے تھے۔ اسے مارتے تھے۔ اسکے مکان کے دریچوں کے شیشوں کو توڑ ڈالتے تھے۔ لیکن اس طوفان کے باوجود وہ چھپ چھپ کر پھانسی گھروںمیں پہونچتا اور لاشیں چیر چیر کر جالینوس کے مقالات کا موازنہ کرتا تھا۔ مردار ہڈیوں کے ذخیرہ خانوں میں پہونچتا اور ہڈیوں کا مشاہدہ اور پیمایش کرتا۔ ڈاکٹر وہائٹ کی تاریخ "مجادلہ علم الطبعیہ والمذاہب" کے صفحے اس بڑے محقق کے صبر آزما ساکحوں سے بھرے ہوئے ہیں

تہنیں پڑھکر رستم کی ہفتخوان اور ہرقل کے مہمات چڑے چڑیا کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ مصنف نے اسکے ذیل میں ایک مرقع دیا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ بصالیس کس طرح عملیات جراحی کے اپنے کمرہ میں بند ہے ہرطرف تیز تند ہوائیں بند دروازوں پر سر ٹکرا رہی ہیں۔ ایک طرف کونے میں کوچ پر ایک انسانی پیکر طاعون میں دم توڑ توڑ کر ابھی ٹھنڈا ہوا ہے جس کے سینہ پر بصالیس کا داہنا ہاتھ دھرا ہے۔ یہ گویا اس حکیم کے دلیرانہ عزم کا مجسمہ اور مہم تحقیق کا پیکر ہے جس کو اس نے اپنی استقلال سے مغلوب کر لیا ہے۔ دوسرے کونے میں ایک صلیب آویزاں ہے جسکو یہ مستمندانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے گویا اس تحقیق میں اسکی نیت بخیر ہے ایک اشرف المخلوق کی لاش کی بے توقیری مقصود نہیں بلکہ خلق اللہ کی مخلصانہ خدمت منظور ہے۔ بصالیس کے دوسرے ہاتھ میں ایک نشتر اور ایک کتاب ہے یہ اوس کی تحقیقات کے ذخیرہ کو تعبیر کرتی ہے۔ جو آجتک تشریح جدید کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اسنے بلاشک علوم الطبیعہ کے قدیم اصول کو زیروزبر کر کے دور بدل دیا اور اس میدان میں وہ ممتاز نشان معروف قایم کیا ہے کہ زمانہ اوسکو کبھی مٹا نہیں سکتا۔ بصالیس نے ذی روح اجسام پر عملیات کر کے حقیقی مسلمات قایم کئے اور تمام اندرونی و بیرونی اعضائے بدن کو نقوش و تصاویر سے ہو بہو کتاب میں دکھایا ہے اور ہر ایک عضو کے افعال وخواص سے مشاہدہ کی بنا پر مجتہدانہ بحث کی ہے۔

شاید قارئین کرام حیران ہونگے کہ ایسے مجتہد عصر کے برخلاف بلجیم میں تعصب کا طوفان کیوں اٹھا لیکن حق وباطل کی کشمکش کوئی نئی بات نہیں یہ تاریخ عالم کے تقریباً ہر صفحے پر منقش ہے باطل میں فی نفسہ تاب مقابلہ مطلقاً نہیں لیکن یہ ایک جاہل پبلک کو پشت پر لیکر حق کا مقابلہ کیا کرتا ہے جسکی اصلیت یہ ہے کہ ہر ایک قوم کو حیات ملی میں ایک ایسا وقت پیش آتا ہے کہ اوسکے برتر افراد اور ائمہ کے دل و دماغ سے تحلیقی اور اجتہادی قوت مفقود ہو کر اسکے بجائے غلامانہ تقلید جاگزین ہوجاتی ہے وہ آیۃ محکمۃ وایۃ متشبہۃ کے مسائل میں پھنسکر رہجاتے ہیں اور عقل عزیزی سے محروم ہو کر سلیٹے کو پیکر حقیقت سمجھنے لگتے ہیں لسان الغیب نے بھی اسکی

جانب اشارہ کیا ہے۔ امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا یہی خصائص رفتہ رفتہ عامیانہ طبقہ تک پہونچکر ایک عام باطل پرستی۔ کورعقیدگی اور گہرے تعصب کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ اور باطل کی پشت پر ہوکر حق کا مقابلہ کیا کرتے ہیں۔ یہی حال اسوقت اہل علم کا تہا۔ ہندوستان میں بھی یہی طوفان دومرتبہ بڑی شدت سے آیا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب سرسید مرحوم نے علوم جدیدہ کی تبلیغ شروع کی۔ تو ابنائے ملت نے کیسی شدت سے مقابلہ کیا اسی طرح علامہ شبلی مرحوم نے جب ۱۹۰۷ء میں ارتقائے عالم کے پرانے نظریہ کو پیش کیا تو متعصب مولویوں نے جنکا علم شریعت اونکے جہل سے بدتر تہا کس زور سے مخالفت کی۔ اس قسم کے حادثے دنیا میں ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔

بصالیس کی تحقیق پر ابھی پورے سوبرس نہ گذرے تھے کہ سائنس کے اسٹیج پر دو اور زبردست اشخاص نمودار ہوئے۔ یعنی انگلستان میں ہاروے اور سوئٹزرلینڈ میں البرٹ ھالر۔ اوّل الذکر نے دوران خون کے متعلق جدید تحقیقات کرکے جالینوس کے پرانے مسئلہ کو باطل کیا۔ اور گویا علم الحیات کا سنگ بنیاد رکہا۔ جس سے زمانہ مابعد میں بہت سی علمی شاخیں پھوٹیں۔ مثلاً علم الحیوانات۔ علم الانسان۔ اور اسکے سلسلہ میں بچہ کی اصل وحقیقت کا پتہ ملا۔ آخرالذکر یعنی البرٹ نے روح حیوانی کی تحقیق میں کمال دماغ سوزی کی اور تجربہ ومشاہدہ کی بناپر چند کلیات قایم کئے جنکا ماحصل یہ ہے کہ اعصاب وعضلات کے نظامات اپنے اپنے فعل میں کسی روح حیوانی کے تابع نہیں ہیں اور نہ کوئی روح حیوانی موجود ہے۔ بلکہ اعصاب وعضلات میں حس وحرکت کی استعداد بالذات اور خانہ زاد ہے۔ بالکل فطری ہے کسی غیر قوت کا عطیہ نہیں ان دونوں حکیموں کی تحقیقات کا ماحصل ایک دوسرے کا تتمہ اور موجودہ فزیالوجی کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ سب اٹھارھویں صدی کا کرشمہ ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز سے تحقیق وتدقیق کا زور دوچند ہوگیا۔ اور گویا علم کے دیوانوں نے۔ اسرار خانہ فطرت کو ہر طرف سے گھیر لیا محققین نئے نئے روپ میں اٹھکھڑے ہوئے ۱۸۱۰ء میں سرچارلس بیل نے عصباتی نظام میں ریشہ دوانی کرکے ثابت کیا ہے کہ حس وحرکت کے اعصاب الگ الگ ہیں۔ چنانچہ انقباض وانبساط

کا کلیہ اسی سے مستخرج ہوا۔ اور وہ پرانا عقیدہ باطل ہو گیا کہ اجزات لطیفہ کیلئے دماغ گویا قرمبیق کا ڈھکن ہے۔ ایک فرانسیسی عالم ڈاکٹر بروقہ نے ۱۸۶۱ء میں دماغ کے بطون میں اس مقام کا پتہ لگایا جس سے قوت نطق و گویائی متعلق ہے۔ اس تحقیق نے بچہ کی قوت گویائی کا راز بالکل فاش کر دیا۔ انسان نما بندر اور بچہ کے نطق کے اعصاب کا مقابلہ کرنے سے سلسلہ ارتقا کی نئی کڑیاں قائم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

ان محققین کے دماغسوزی سے تشریح لابدان کے مسائل تو حل ہو گئے مگر علم الحیات کے دقایق پر اسی طرح پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ اسوقت پوری طرح اٹھا جبکہ انیسویں صدی میں خوردبین کی قوت نے تکمیل کو پہونچکر اجسام پر عمل شروع کیا اور تشریحات دقیقہ کی بنیاد پڑی۔ اس سے باطنی اعصاب کا نظام جو دماغ کا اصلی کارکن اور خفیہ پرچہ نویس ہے دریافت کیا گیا۔ ان مہمات میں مغرب کے قریب قریب ہر ایک قوم نے اپنے اپنے طرف سے مجتہد العصر پیش کئے انگلستان۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ۔ جرمنی۔ بوہمیا۔ ناروے۔ امریکہ۔ اسپین ہر خطے سے مدد ملی جسکا ماحصل یہ ہے کہ حیات کا ظاہری سنگ بنیاد یا مبدء ایک مصنفہ اولی ہے جو انواع حیوانی کے تمام سلسلہ میں ہر جگہ مشترک ہے۔ ہر ایک حیوان کے بچّہ کا مادہ تولید یہی ہے۔ انسان ہو یا حیوان یا کوئی نباتی ہستی ہو ہر ایک جسم کی بسم اللہ اسی سے ہے اور نہ کہ مسالمات جو ہر عضو جسم کے اجزائے ترکیبیہ ہیں اور جنکی گنتی تک ہو چکی ہے اگرچہ انکی کیفیت دکمیت میں شکل و صورت میں مساوات نہیں لیکن اگر قابلیت کے لحاظ سے انکو ترتیب دیا جائے تو جو سالمات اعصاب کے اجزاء ترکیبیہ ہیں گویا قوم کا اعلیٰ طبقہ ہے۔ تمام جس کی سلطانی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ملک جسم کے ایوان حکومت کے امرا یہی ہیں۔ پلک جھپکنے کے فعل سے لیکر ایک معرکۃ الآرا تقریر تک تمام افعال انہی کے قبضہ میں ہیں۔ اگر ہم بچہ اور بچپن کی نازک اور لطیف مشین کو سمجھنا اور جو قانون اس مشین پر عامل ہے اسے عبور کرنا چاہتے ہیں تو اول ان عصباتی سالمات کی کنہ دریافت کرنی چاہئے۔

حامد علی صدیقی

تنقید و تبصرہ

دعوت عامہ

من المجلس الشرعی الاسلامی الاعلیٰ فی فلسطین لعمارۃ الحرم القدسی الشریف

مندرجہ بالا نام ایک مصور عربی رسالہ کا ہے جو گذشتہ ہفتہ کی ولائتی ڈاک سے وصول ہوا ہے" رسالہ بیت المقدس میں چھپا ہے اور مفتی محمد امین الحسینی رئیس المجلس الاسلامی الاعلیٰ نے شائع کیا ہے۔ اس رسالہ کے ابتدائی حصہ میں تمام دنیائے اسلام سے بیت المقدس کے حرم شریف کی تعمیر کے لئے (جو مسجد اقصیٰ و صخرہ شریفہ پر مشتمل ہے) مالی اعانت کی اپیل کی گئی ہے۔ بیت المقدس درحقیقت دنیا کا ایک ایسا بابرکت مقام ہے جسکو یہودی، مسیحی، اور مسلمان سب یکساں مقدس سمجھتے ہیں، وہ انبیا علیہم السلام کا مدفن اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ ہے، اسکی تاریخ عجیب شاندار اور انقلاب انگیز ہے، دنیا کی بڑی بڑی زبردست قوموں نے اس کے لئے اپنا خون بہایا ہے، خصوصاً صلیبی جنگ نے اسکی اہمیت کو تمام دنیا پر ظاہر کر دیا ہے، چنانچہ سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس اور رچرڈ شاہ انگلستان کی معرکہ آرائیوں کے واقعات آجتک افسانہ ہر بزم و انجمن ہیں، گذشتہ جنگ یورپ نے بیت المقدس کی عظیم الشان تاریخ میں ایک اور حسرت انگیز باب کا اضافہ کر دیا ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسکی تاریخ کا آخری باب ہے ع یا ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لیگی۔

بہر حال بیت المقدس کا آیندہ انجام جو کچھ بھی ہو بالفعل اسپر بحث کی ضرورت نہیں، البتہ اسکی تعمیر و تجدید کے متعلق جو درخواست مسلمانان عالم سے کی گئی ہے وہ بجائے خود ایک غور طلب مسئلہ ہے، رسالہ میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے کہ عمارت کمزور اور بوسیدہ ہو گئی ہے اور اگر

جلد توجہ نہ کی گئی تو شہید ہو جانے کا اندیشہ ہے اسی سلسلہ میں مصارف کے تخمینہ کے متعلق لکھا ہے کہ جنگ یورپ سے پہلے ماہرین فن نے ۳۵ ہزار پونڈ تخمینہ کیا تھا۔ لیکن موانع کی وجہ سے اُسوقت کام شروع نہ ہوسکا" اس کے بعد دوبارہ زمانہ جنگ میں ۷۵ ہزار پونڈ تخمینہ کیا گیا" اور اب ایک لاکھ بچاس ہزار پونڈ تجویز کیا جاتا ہے۔ ماہرین فن کی ایک جماعت اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے مرتب کر لی گئی ہے اور کام کا آغاز ہو چکا ہے۔

رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اوقاف کی آمدنی اس کام کے لئے مطلقاً ناکافی ہے اسلئے جو مجلس اس مقصد کے لئے قایم ہوئی ہے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے اس مقدس مقام کی حفاظت کے لئے اپیل کرتی ہے جس سے ۳۰۰ ملین انسان یکساں عقیدت رکھتے ہیں۔

مگر مذکورہ بالا واقعات صحیح ہیں تو چندہ کی اپیل ناموزوں نہیں، لیکن اخبار مدینہ کا ایک ہندوستانی نامہ نگار فلسطین سے ہے "اب پوری تحقیق کر چکنے کے بعد میں کل حالات پر روشنی ڈالنے کا بحیثیت ایک ہندوستانی مسلم ہونے کے فرض سمجھتا ہوں واضح رہے کہ یہاں کے جملہ مقدس مقامات کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی ہے، اور ترکوں نے خدا انکو جزائے خیر دے انکی اس خدمت کے معاوضہ کے واسطے اور ان مقامات کی ترمیم و مرمت کے واسطے پہلے ہی اس کمیٹی کو کسی دیگر اسلامی انسٹی ٹیوشن کا محتاج نہیں چھوڑا ہے انہوں نے بہت سی جائداد غیر منقولہ ان مقامات کے نام وقف کر دی ہے، اور اس وقف کی اسوقت سالانہ آمدنی انسی اور نوّے ہزار پونڈ کے درمیان ہے، گورنمنٹ برطانیہ نے بھی اس وقف میں ہرگز کسی قسم کا دخل نہیں دیا ہے۔ سوائے اسکے کہ اس کے کارکنان کی نامزدگی و تقرر گورنمنٹ کی طرف سے ہوتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے معقول وقف کے باوجود تمام دنیائے اسلام سے چندہ طلب کرنے کا کیا مقصد ہے؟

نامہ نگار مذکور کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عام عادت کے مطابق اس معاملہ میں بھی اسراف سے کام لیا جا رہا چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"خیال کرنے کی بات کہ اس سالانہ آمدنی سے یہ حضرات کچھ بھی نہیں بچاتے اور پھر خرچ بھی کسی جگہ نہیں کرتے، اگر جب سے ان کی توجہ اس پاک مقام کی طرف ہوئی تھی تھوڑا بہت سالانہ بچانے کی کوشش کرتے اور اپنی جیبیں نہ بھرتے تو اسوقت کسی دوسرے ملک کی اعانت کی ضرورت ہرگز نہ پڑتی، اب ذرا ان کے بے دریغ اخراجات کا حال سنئے کہ علاوہ صدر صاحب اور اُن کے عملہ مستقل کے ایک انجینئر صاحب بمشاہرہ ۳ سو پونڈ ماہوار بیت المقدس کی زیارت کرنے تشریف لائے ہوئے ہیں، تین اور اصحاب انجینئر بمشاہرہ ڈیڑھ سو پونڈ ماہوار فی کس بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہیں، اور وہ حضرات بعوض ستر ستر پونڈ ماہوار تضیع اوقات و زر میں مشغول ہیں، عرصہ سے اس خانہ خدا کی مرمت کی تجویزیں کر رہے ہیں اور آج تک سوائے اسٹیمٹ اخراجات لگانے کے اور کوئی نمایاں کام نہیں کیا ہے"

ہم نہیں خیال کر سکتے کہ ان حالات کے معلوم ہو جانے کے بعد مسلمانان ہند کہاں تک اس کام میں مدد کرنے کیلئے تیار ہونگے، اخبار مدینہ کے نامہ نگار کے بیان کی تصدیق اڈیٹر صاحب الناظر لکھنؤ کی ایک تحریر سے بھی ہوتی ہے، جو انہوں نے حجاز سے بعض اسلامی اخبارات کے نام بھیجی ہے،

صاحب موصوف کے مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین کا وفد مسلمانان ہند سے مالی اعانت حاصل کرنے کے لئے ہندوستان آنے والا ہے مگر انہوں نے اس وفد پر بے اطمینانی ظاہر کر کے مسلمانوں کو احتیاط کی تاکید کی ہے،

بے شبہ بیت المقدس کی تعمیر و تجدید کے لئے چندہ دینا حصول ثواب اور خیر و برکت کا باعث ہے، "مسجد اقصیٰ" وہ متبرک مقام ہے جس کے متعلق اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں "بارکنا حولہ" ارشاد فرمایا ہے، لیکن بالفعل بیت المقدس جن حالات کے ماتحت ہے، اور بیرونی چندوں کے متعلق جو گوارا واقعات پیش آچکے ہیں، اوسکو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی شخص قطعی طور پر کہہ سکتا ہے کہ جو چندہ اس مقصد کے لئے دیا جائیگا وہ ٹھیک اسی مقصد

ت ہو، مسلمانانِ ہندوستان کوئی ذریعہ ایسا نہیں رکھتے کہ اس قدر دور دراز فاصلہ سے اس معاملے متعلق اطمینان حاصل کر سکیں، اور جبکہ مشتبہ روایات بیان کی جا رہی ہیں تو اعتماد کی کوئی وجہ بھی نہیں،

گذشتہ دس پندرہ سال کے اندر مسلمانوں نے بہت کچھ چندہ دیا ہے، اور اپنے دور افتادہ بھائیوں کیلئے مالی قربانیاں کی ہیں، یہ فیاضی قابلِ تحسین و ستائش ہے، ہماری دعا ہے کہ خدا مسلمانوں کو اس سے زیادہ توفیق دے، لیکن موجودہ حالت میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ اپنی اندرونی اصلاح و تنظیم کی ضرورت ہے، اسوقت ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے جو خطرات در پیش ہیں، ان سے چشم پوشی کرنا مہلک غلطی ہے، قوم کا شیرازہ پراگندہ ہو رہا ہے، اور اختلافِ افکار و اعمال نے مسلمانوں کو بہت کچھ کمزور کر دیا ہے - ضرورت ہے کہ ان اجزائے پریشان کو جمع کیا جائے اور ملتِ اسلامیہ کی تنظیم کیلئے جد و جہد کی جائے، مسلمانوں کا بڑا حصہ اب تک جاہل، نا تربیت یافتہ اور سمجھ سے ناآشنا ہے، ضرورت ہے کہ تعلیم کی توسیع و اشاعت کے وسائل اختیار کئے جائیں -

اسوقت دنیا کے کسی ملک میں اسقدر مسلمان آباد نہیں ہیں جسقدر ہندوستان میں، اس عظیم الشان تعداد کے مفاد و اغراض کو نظر انداز کر دینا خطرناک غلطی ہے، غرض اندرونی اصلاح و تنظیم کا کام اسقدر اہم، ضروری اور وسیع ہے کہ ہم سب ملکر اس کیلئے جد و جہد کریں جب بھی مدتوں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، یہ بھی ظاہر ہے کہ ان سب کاموں کے لئے کافی روپیہ درکار ہے لہذا ہمارا فرض ہے کہ سب سے پہلے ان مفید مقاصد پر روپیہ صرف کریں، اور جو مفید تحریکیں اور قومی کام قلتِ آمدنی کی وجہ سے نامکمل اور نیم مردہ حالت میں ہیں، ان کے لئے زندگی کے اسباب مہیا کریں -

بالفعل بفضلہ تعالٰے باقی ماندہ اسلامی ممالک کو کوئی خاص خطرہ در پیش نہیں ہے اور نہ کسی فوری اعانت کی شدید حاجت ہے لہذا اس فرصت میں ہمکو اپنی تمام تر جد و جہد مسلمانانِ ہند کی اصلاح و فلاح کے لئے محدود رکھنا چاہئے، اور انکو مضبوط و منتظم بنانے کیلئے سعی کرنا چاہئے -

محمد اکرام اللہ خاں ندوی

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سے شایع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰×۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپے گا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف (عـــه) مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجنا چاہیے اور منی آرڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کر دی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین پر بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شائع ہو سکتے ہیں، اجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ ہونا چاہیے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

سلسلہ جدید جلد ۲ | رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۲۸ | اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء
نمبر ۴ | ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ

کانفرنس گزٹ

یعنے

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

مرتبہ حامد علی صدیقی

جس میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصول تعلیم، نظام تعلیم مروجہ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر
تنقید کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبد السلام

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہو

(اور صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ سے شائع ہوا)

فہرست مضامین

عنوان	محرر	صفحات
شذرات	ایڈیٹوریل	۱ - ۸
پند پیرداناد	"	۹ - ۱۴
نظام عمل آیندہ اجلاس کانفرنس	"	۱۵ - ۱۸
ممالک غیر میں تعلیمی انقلاب	"	۱۹ - ۲۲
تنقید و تبصرہ	مولوی عبدالکریم صاحب	۲۳ - ۲۷
علوم القرآن پر ایک نظر	"	۲۸ - ۴۵
اصلاح تمدن	مولوی طفیل احمد صاحب جائنٹ سکرٹری کانفرنس	۴۶ - ۴۹
مراسلات		
عہد قدیم کا طریقہ تعلیم		۵۰ - ۵۶
پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس		۵۷ - ۶۱
آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کی تعلیمی نمایش	طفیل احمد	۶۲ - ۶۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

انشا پردازی

گزشتہ اشاعت میں انشا پردازی کی قوت پر کچھ اجمالی بحث سلسلہ بیان میں آگئی تھی دعویٰ یہ تھا کہ قلمرو سخن پر انشا پردازی کی قوت یک مطلق العنان فرمانروا ہے اور اس بارگاہ میں جس سخنور کو ایک مرتبہ درجہ قبول ملگیا وہ نہ سرف اپنے دور میں بلکہ مابعد زمانہ میں بھی تاجور ہی مانا گیا مشرق میں بزم علوم کے تقریباً ر دور کا نقشہ با مذاق اصحاب کو دکھلانا لاحاصل ہے۔ وہ خود جانتے ہیں کہ حافظ کا دیوان، بامی کی مثنوی یوسف زلیخا، نظامی کا سکندر نامہ۔ اور خدا جانے کس کس کا کیا کیا کلام نہ صرف شرق بلکہ مغرب کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو کر کس درجہ مقبول ہوا ۔ اساتذہ مغرب کا بھی ہی حال ہے، یہاں شیکسپیر ملک سخن کا بادشاہ تھا اُس نے اپنے زمانہ کی صداقتوں اور سوسائٹی ی خصوصیتوں کے سوا کوئی عالم بالا کے مضامین یا خارق عادت مسائل اپنے کلام میں نہیں اندھے، صرف طرز ادا میں انوکھا پن ہے اور لطف یہ ہے کہ شیکسپیر کے جیتے جی اُسکے کلام کو شرف قبول میسر نہیں ہوا۔ تاہم پچھلے دنوں برٹش میوزیم لندن سے اس موضوع

پر ایک رسالہ شائع ہوا جس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کے بلند پایہ انشا پردازوں نے رہ رہ کر شیکسپیر کے ترجمے کئے اور اب تک برابر کر رہے ہیں۔ انگریزی میں چالیس[40] بار اور غیر زبانوں میں سو بار رہر بار نئے پیراہن میں اس مصور فطرت کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ بوہیما۔ ترد شیا۔ ولندیز۔ ڈنمارک۔ فلینڈ۔ فرانس۔ جرمنی۔ ہنگری اطالیہ۔ پولینڈ۔ روس۔ اسپین۔ سویڈن وغیرہ ممالک کی زبانوں میں بکثرت ترجمے ہوئے۔ السنہ مشرقیہ میں ایک سو ستاسی[187] مرتبہ اس کے کلام کا ترجمہ یا تضمین و تتبع ہو چکا ہے۔ چنانچہ تیس[30] ہندوستانی بھاشا اور پچیس[25] تلگو میں چوبیس[24] مرہٹی میں اکیس[21] تامل میں بیس[20] اُردو میں اونیس[19] بنگلہ میں دس گجراتی میں نو[9] کنادی میں سات سنہالی پانچ سندھی میں تین[3] عبرانی زبان میں دو[2] ترکی زبان میں اور آسامی، پنجابی، اڑیا، سنسکرت میں ایک ایک مرتبہ ترجمہ ہوا۔ جاپان میں صرف ہملیٹ کا ترجمہ ہوا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی بھول بھلیاں

ہم ابھی تک اوسی پرانی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے خبط میں مبتلا ہیں۔ جس انجمن سوسائٹی، جس مدرسہ اور مکتب کو جا کر دیکھئے وہ ایڑیاں اوٹھا اوٹھا کر اعلیٰ تعلیم پر شوق مندانہ نگاہیں ڈالتا ہے اور بھولا ہوا ہے کہ سنگ بنیاد ابتدائی تعلیم و تربیت ہے جب سر سید نے اعلیٰ تعلیم پر زور دیا تو وہ اور وقت تھا۔ مسلمانان ہند پر زوال سلطنت کے ساتھ زوال انسانیت کی ہمت ہی تھی۔ جدید حکومت سخت خوردہ گیری کے ساتھ اقوام ہند میں سے اُن جماعتوں کو منتخب کر رہی تھی جو نظم و نسق میں شریک ہو کر زندگی کا ثبوت دیں۔ سر سید کو اوس وقت اسکے سوا اور کیا چارہ تھا کہ جلدی میں ادہر اُدہر سے کچھ کچی اینٹیں اور پھونس کے تنکے سمیٹ کر چند جھونپڑے ڈال لیں اور متمول گھرانوں سے کچھ نوجوان لیکر ان کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کر کے اور علم و تہذیب مغربی کے رنگ میں رنگ کر بطور نمونہ بارگاہ حکومت میں پیش کریں اور زبان حال سے یہ ثابت کریں کہ ہم مردہ نہیں

ہیں۔ چنانچہ یہ جادو چل گیا اور اونیسویں صدی کے نصف آخر میں بجائے اسکے کہ ہندوستان
کی سول لسٹ میں ایک ازپا افتادہ قوم کا نام ڈھونڈا نہ ملتا لسٹ کے تقریباً ہر صفحہ پر
مسلمان اعلیٰ افسروں کے نام جگمگانے لگے، دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کہیں ایسی مثال
ملیگی کہ قوم ایوان حکومت سے یکقلم نکلکر پھر شریک حکومت ہوجاے۔ مگر یہ محض ایک فوری
تسکین اور برجستہ علاج تھا۔ قوم کی تعلیم کا مسئلہ اور چیز ہے۔ وہ ایک سنگین عمارت
ہے جو جڑسے پھلگی تک سنگلاخ و لوہالاٹ ہونی چاہیے۔ ہم خود جس قوم کے شاگرد ہیں
اونہیں دیکھیے کہ آج تعلیمی عقائد میں کہاں سے کہاں پہونچ گئے ہیں۔ عرصہ ہوا کہ وہ اعلیٰ
اور ثانوی تعلیم کے میدانوں کو چھوڑکر قطعی فیصلہ کرچکے ہیں کہ یہ دونوں محض نتائج ہیں، جو
ابتدائی تعلیم سے بیشتر ازخود پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر اس پچھلے عشرے کی تعلیمی رستخیز کا
بالاستعاب مطالعہ کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل مغرب نے ابتدائی تعلیم کے میدان
کے بیشتر حصہ کو بھی نادان قوموں کے لئے خالی کردیا ہے اور اوس حصہ پر آجمے ہیں جسے
حقیقت میں ناکہ کہنا لازم ہے۔ وہاں جدید تغیرات کا رخ بالکل پس ماندہ اور ناقص الخلقت
عیبی اور کمزور بچوں کی جانب ہے۔ صحیح الجثہ اور تنومند بچے اس سے خود بخود مستفید ہوتے
ہیں۔ وجہ یہ کہ اوّل الذکر جماعت کی تعلیم اور تربیت میں جن شرائط کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت
ہے وہ صحیح سالم بچوں کی تعلیم و تربیت کے منافی نہیں بلکہ بیحد معاون ہیں۔ یہ اس کا نتیجہ
ہے کہ قدیم مسلمات کے برخلاف اب حامیان تعلیم کی تمامتر توجہ تعلیمی ترقی کے بجائے
جسم اور دماغ کی تربیت کی جانب ہے۔ اس صدی کے عشرۂ اول میں جتنی کانفرنسیں
منعقد ہوئیں اونکی روداد ین بچوں کی صحت جسمانی کے مباحث سے قطعاً خالی نہیں۔ مگر
آج یہ حال ہے کہ ہر ایک مدرسہ اور تربیت گاہ میں ماہران طب کا عمل دخل ہے۔ آخر یہ
کیوں ہے۔ محض اسلئے کہ علم الحیوانات کی جدید انکشافات نے قدیم طرز تعلیم کے حامیوں
کی آنکھیں کھولدیں اور ثابت کردیا ہے کہ محض علوم و فنون کی تحصیل اور السنہ اور ادبیات

کی تعلیم سے حق اور ناحق میں تمیز نہیں ہو سکتی اور جب تک یہ نہو حق رسانی اور ترحم کے جذبات بے سود ہیں جو قدیم یونیورسٹی تعلیم کا کئی صدی سے مطمح نظر چلا آتا ہے بلاشک سائنس کا اس حد تک بڑا احسان ہے کہ اوس نے افراد انسانی کے طبقوں میں حدود قائم کر کے فطری حق کو مصنوعی حق سے الگ کر دیا ہے۔ حق شناسی اور حق رسانی کے ضابطہ کی بنیاد اسی پر ہے۔ صحیح اور ناقص بچوں کے حقوق الگ الگ ہونے سے سوسائٹی کے نظام آسائش میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو گیا۔ کل تک بچوں کی صحت ایک کہنے کی بات تھی لیکن آج وہ اک عظیم الشان نظام عمل کی صورت میں ذمہ داران تعلیم و تربیت کے زیر نظر ہے

سنگین بنیاد تعلیم

سنگین بنیاد تعلیم یہ ہے جو سر سید مرحوم کی تعلیم کی گویا پختہ صورت ہے ہم خوش ہیں کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے سر سید مرحوم کی ودیعت کو ادا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ وہ کانفرنس کو ساتھ لیکر اس امر کی تیاری کر رہے ہیں کہ اپنے برادران ملت و وطن کا مونٹیسا ری سسٹم کے مطابق ابتدائی تعلیم کا شوق پیدا کریں اور اگر ممکن ہو تو ایک مونہ بھی پیش کریں۔ لیکن یہ ضروری بات نہیں کہ اگر کائنات کو منور کرنے کے لئے آسمان پر صرف ایک آفتاب کافی ہے تو اس تیرہ خاکدان ہند میں علم کی صحیح روشنی پہونچانے کے لئے بھی ایک ہی آفتاب کافی ہو گا جب تک ملک کے ہر ایک صوبہ سے ایک ایک آفتاب بلند ہو کر اپنی تنویر سے تحریک عمل نہ ہو تب تک یہ تیرگی دور نہیں ہو سکتی۔ ہماری قوم میں یہ عیب ہے کہ کسی محب قوم کو اپنی محبت کے جرم میں گرفتار کر لیتی ہے اور بجائے اسکے دست و بازو بن کر اوس کا بوجھ بٹائے اوسے اپنا بارکش بنا لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہو کہ ممتاز ہستیاں انکار کے بارگراں میں دب کر بغیر اسکے کہ کوئی نشان معروف چھوڑیں یونہی مٹ جاتی ہیں۔ اور ہم جہل و تعصب کے جس مقام پر ہیں وہیں رہتے ہیں۔

بچوں کے ابتدائی مراحل تربیت

یہ بھی ایک پیچیدہ مگر پرمعنی سوال ہے کہ

والدین یا ولی اپنے بچوں کی ابتدائی نشو ونمو کا ہر سال کے اختتام پر کس لحاظ سے
اندازہ کریں۔ اصل میں اس کا جواب جدولوں اور نقشوں کی صورت میں بدلنا بہت ہی مشکل
ہے، بغیر اس کے تعلیم کی بنیاد سنگین نہیں ہو سکتی۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ باضابطہ تعلیم
کے آغاز سے پہلے خصوصًا دو تین برس سے سات آٹھ برس کی عمر کا زمانہ بہت ہی نازک
ہے اور یہی اس بُری طرح برباد ہوتا ہے کہ نہ صرف تعلیمی بلکہ تمام عملی زندگی کی بنیاد ڈیڑھ
ہو جاتی ہے۔ والدین اور مربی اس زمانہ پر غفلت کی خاک ڈال دیتے ہیں۔ بہتر ہو کہ
بچہ کی فطری قوتوں کا عمیق مطالعہ کر کے سنجیدہ نتائج کی صورت میں فیصلہ کر لیں کہ اس عمر میں
اوس سے کیا توقع کیجا سکتی ہے یہ نظر اور سماعت کی تربیت کا وقت ہے۔ قوت سامعہ
ذائقہ۔ لامسہ۔ اور حرکت و سکون کی قابلیتوں کی اب صحیح تربیت ہو سکتی ہے۔ واضح ہو
کہ صحیح الجثہ اور معتدل مزاج بچہ جب تک جاگتا رہتا ہے نفس اوسے کبھی معطل نہیں رکھتا
بلکہ اوسکے رگ و پے کو متحرک کر کے ہر وقت مصروف رکھتا ہے اسکے ساتھ خیال کی قوت
ہی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اب اگر والدین و مربی مستطیع ہوں اور کچھ عقل بھی رکھتے ہوں
تو بچہ کا ماحول اوسکے فطری ضرورتوں کے مطابق مرتب رکھیں گے ورنہ بالکل غلط اور گم
گشتہ کرنے والے سامان اوسکے اردگرد ہونگے۔ وہ جیسا چاہیں گے بچہ کو بنا دینگے
حواس خمسہ میں پختہ۔ خوش و خرم چاق چوبند اور خوش حرکات بنالیں یا زحمتی۔ گھٹل۔ یا
زمین اور کاہل بنالیں۔ اصل میں یہی دو تین برس سے لیکر سات آٹھ برس کی عمر تک کا زمانہ
ہے جو بچہ کی دامن ہستی پر بھلے یا بُرے نقش و نگار منقش کر دیتا ہے۔ تم اوسے کمرہ یا گھر کی
چہار دیواری میں بند رکھو تو وہ ایسا ہی ہو جائیگا اور اگر خارجی دنیا کی سیر کراؤ تو وہ ولیسا
بن جائیگا۔ بچہ کے لئے ستہ ضرور یہ ہی کی نگرانی ضروری نہیں بلکہ کھیل کود اور
بھاگ دوڑ میں بھی اوس پر خاص نظر رکھنی چاہیئے۔ مگر یہ محاسن انفرادی کوشش سے
پیدا نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اجتماعی کوشش سے نرسری اسکول یا تربیت گاہیں قائم کرنی ہونگی

جیسا کہ ہم کئی مرتبہ اشارۃً کہہ چکے ہیں کہ سات آٹھ برس کی عمر تک کے بچوں کو باضابطہ تعلیم کے مدرسوں میں ہرگز داخل نہیں کرنا چاہیئے۔

جدید کفر و زندقہ زندگی کے ہر میدان میں امرائی کا طبقہ پیش قدمی کرتا ہے لیکن ہمارے امراء بچوں کی صحیح تربیت کو بالعمل کفر و زندقہ سمجھتے ہیں وہ ان کی بسم اللہ اور گھوڑ چڑھی میں ہزار ہا روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر کسی ماہر فن اتالیق کو ایک پیسہ بھی دینا نہیں چاہتے شاید ان کو یہ زعم ہے کہ جسمانی اور ذہنی بخشائشیں ان کا موروثی حق ہے۔ تعلیم ذریعہ اکتساب نہیں اور اگر اتفاقاً وہ تعلیم و تربیت کا سامان بلا ارادہ خریدتے بھی ہیں (اس میں اتالیق بھی شامل ہے) تو وہ بچہ کی فطری قویٰ کے لئے ایک شکنجۂ استبداد ہوتا ہے۔ فطرت الٰہی کچھ سبق دینا چاہتی ہے اور یہ بچہ کو نادان دوستوں کی طرح اور کچھ پڑھانا چاہتے ہیں۔ یہ خود ایک غلط اتالیق کے تختۂ مشق رہ چکے ہیں جس نے بچہ کے زندگی کے حقائق پر ہمیشہ ایک گہرا پردہ ڈالے رکھا۔ وہی کوتہ نظری اپنے بچوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ خارجی جلوہ آرائیوں کے شیدا اور ایک ہیئت غلامی کے عاشق بن کر اپنے والدین کی جھوٹی اور دھوکا دینے والی آرزوں کو پورا کر دیتے ہیں۔ یہ اپنے خیال کے مطابق بچوں کو قیمتی کھلونے اور مورتیں زیبا رنگ تحفہ اور بہت سی اسی قسم کی نظر فریب چیزیں دیکر خوش ہوتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس عمر میں فطرت کی نظر تھکا دینے والی ورزشوں اور جسمانی قویٰ کو ترقی دینے والی کاموں کی جانب ہوتی ہے ہمیں حیرت ہے کہ تعلیم یافتہ عقیل و فہیم اصحاب تک اس غلطی میں کیوں مبتلا ہیں کہ بچہ کا زاویہ نظر اور اُن کا نقطہ نگاہ مساوی ہیں اوس کی ہستی مٹا کر اوس پر اپنی ہستی کو کیوں غالب کرنا چاہتے ہیں۔

طوق غلامی بچوں کی گردن میں غلامی کا طوق ہزاروں برس سے چلا آتا ہے جس سے تعلیم و تربیت کے نظامات ایک ظلم اور استبداد کا شکنجہ بن گئے ہیں۔ حیات انسانی کی کسی اور ہیئت اجتماعی یا انفرادی پر اس غلامی کا کچھ بھی اثر ہو لیکن ابتدائی

تربیت وتعلیم کی بربادی ضرور ہوئی ہے۔ اہل مغرب نے بیدار ہوکر معصوم بچہ کے گلے سے یہ طوق نکالنا شروع کر دیا ہے۔ مگر اہل مشرق ابھی اپنی غلطی کے معترف ہی نہیں ہیں ہم والدین سے بہ تعظیم واجب التماس کرتے ہیں کہ وہ اس اجبار و اکراہ اور تحکم کو چھوڑ دیں اور بچوں کو تعلیم وتربیت کے ابتدائی مراحل طے کرانے میں فطرت کا منشا دریافت کیا کریں۔ مشرق میں اس تحکم نے وہ جہاں آشوب طوفان برپا کیا ہے کہ تہذیب وتمدن کانپ رہے ہیں۔ استداد کے فرعون نے ایک صحیح نظام معاشرت کی صورت بگاڑ دی ہے عجب نہیں کہ پھر ہیولانی کیفیت طاری ہو جائے۔ تحکم اور فرعونیت کے شیون حسب ذیل ہیں۔

(۱) دیکھو جی ہمیں یہ کام اچھا اور صحیح معلوم ہوتا ہے لازم ہے کہ تم بھی اسے اچھا سمجھو اور پیروی کرو۔

(۲) ہماری دانست میں یہ بات سچ ہے تم بھی اسکو سچ سمجھو اور عملاً مان لو۔

(۳) ہمیں یہ چیز خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ تم بھی اسے خوبصورت تسلیم کرو اور دل سے اس کی تعریف کرو۔

(۴) آج ہمارا دل اس بات کو چاہتا ہے۔ تم بھی یہی چاہو اور کوشش کرکے اس کو حاصل کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ تحکم اور انانیت کا جنون جس سر پر سوار ہوتا ہے۔ اوسکے منہ سے وہ بڑے بول بلواتا ہے کبرت کلمۃ تخرج بافواھھم (انکے منہ سے کیسے بڑے بول نکلتے ہیں) جن سے ثابت ہوتا ہے کہ گویا قانون وضع کرنا اور احکام وہدایات نافذ کرنا اسکا حصہ ہے اور اس کا اتباع وتعمیل دوسروں کا فرض۔ کبھی تحکم انفرادی ہستیوں میں حلول کرتا ہے اور کبھی اجتماعی میں۔ کبھی پورے ملک اور قوم پر تسلط کرلیتا ہے۔ ایشیا اور خصوصاً ہندوستان میں کوئی گوشہ اس سے بچا ہوا نہیں۔ سوسائٹی ہو کہ انجمن۔ دار الشریعت ہو کہ تجارتی جماعت ہر جگہ ایک فرعون تمام افراد پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ جو افراد

مسکین الطبع اور اخلاقاً کمزور ہیں وہ اس فرعونیت کے سامنے اس طرح سر جھکا دیتے ہیں
جس طرح ضعیف نادان اور معصوم بچہ ایک عاقل بالغ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے
گذر کن چوں صبا بر بنفشہ زار و بہ بیں   کہ از تطاول زلفش چہ سوگوار آنند

یہ ان پر تین طرح عمل کرتا ہے۔

(۱) اپنے مجبور کی اغراض و فوائد کو ظاہرداری کا رنگ دیکر اور اوس میں مادیت پرستی کا رجحان پیدا کر کے روحانیت کو مٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ایک تن بے جان رہ جاتا ہے۔

(۲) اپنے ماموریں اعلیٰ اخلاق و فضائل کی استعداد کو بڑھنے نہیں دیتا۔ اوسکی زندگی کا دائرہ محدود کر کے اوس میں عامیانہ پن پیدا کرتا ہے اور اوسے ایک حقیر، خامکار اور غلام بنا کے ہی نہیں چھوڑتا۔

(۳) ضبط نفس کی فطری قابلیت سوخت کر کے اوسکی بجاے اوسے اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے اور اوس کی زندگی کو اخلاقی ذمائم سے معمور کر دیتا ہے۔

درحقیقت ان تینوں آلات کا یکساں عمل ہے یعنی نشو و نما کی ترقی کو مسدود اور سرگرمی عمل کے چشمہ کو یخ بستہ کرنا۔ عرصہ زیست کو تنگ اور حقیقی مقاصد حیات کو محدود کرنا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر اگلے پرچہ میں ایک تفصیلی نظر ڈالیں اور کرید کرید کر دکھائیں کہ ننھے بچوں کے حق میں یہ استبداد کہاں تک زہر قاتل ہے۔ ایک سنگین چٹان کے نیچے آرے ہوے پودے کی طرح اونکا جسم اور روح اونکا زور اور اُمنگ فنا ہو کر غلامیت پیدا ہو جاتی ہے جسمانی قوا ر میں عزم   اور برداشت اور دل و دماغ میں تخلیقی قوت باقی نہیں رہتی عملی زندگی میں مدارج اعلیٰ پر پہونچکر بھی علو ہمتی اور فضیلت آخر معد کی طرح پرورش نہیں آتی۔

صدیقی

کانفرنس

پند پیر دانا

اکتوبر کے پہلے ہفتے میں جناب آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب نے جو پچھلے مہینہ میں ولایت سے مع الخیر واپس آئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے طلبہ کو سلطان جہاں منزل میں دعوت دیکر کانفرنس اور اوس کے مقاصد سے تعارف کرایا مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کا یہ جدید شعبہ ہے اور طلبا بھی بالکل نئے تھے۔ اس لئے تعارف بالکل بجا اور درست تھا۔ صدر جلسہ اس وقت جناب مسٹر مکرجی صاحب پروفیسر اول ٹریننگ کالج منتخب ہوئے صاحبزادہ صاحب نے تقریر کے افتتاح میں فرمایا کہ ملک میں اور بھی بہت سی یونیورسٹیاں ہیں جن میں مسلم یونیورسٹی کی طرح تعلیم کے متعدد شعبے ہیں اور طلبار کے مقاصد بھی الگ الگ ہیں مگر مسلم یونیورسٹی اور اوسکے شعبۂ تعلیم المعلمین کا مقصد اولین سب سے مختلف ہے۔ یہاں معمولی معلم یا ٹیچر تیار کرنے منظور نہیں بلکہ ہم اپنے ایوان قومیت کے لئے معمار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس شعبہ کے طلبار کو جاننا چاہیئے کہ انجینری۔ وکالت یا اور شعبہ ہائے تعلیم کے طلبار کی ناکامی اونہیں کی ذات تک محدود ہے لیکن اس کے برعکس ٹریننگ کے طلبار کی ناکامی قوم کی مستقبل نسلوں پر اثر ڈالیگی۔ طلبار کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آپ صاحبان کو اپنے مشن کی عظمت اور اہمیت کو دلنشین کرنا چاہیئے۔ معلم القوم بننا بہت بڑا پاک مقصد ہے مسلمانونکو جاننا چاہیئے کہ اون کے معلم یعنی علما نائب رسول کیوں کہلاتے تھے۔ محض اسواسطے کہ اُنھوں نے علوم کی ہمیشہ تبلیغ کی اور معلم القوم کہلائے۔ حضور سرور کائنات فداہ روحی بھی معلم اول ہی تھے۔ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے اونکی ذمہ داریاں تعلیمی اور تبلیغی تھیں اور یہی پیغامبری ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے علما اب اپنی نیابت کے فرائض بھول

گئے اس آیۂ کریمہ یتلوا علیھم ایاتہٖ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمتہ ۱۰م

"انکو خدا کی آیات پڑھکر سناتے ہیں" اور انکا تزکیہ کرتے ہیں و انکو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں

کا منشا نظر انداز ہوگیا - آیات کتاب اور حکمت میں تمام علوم الابدان اور علوم الادیان شامل ہیں - حکمت میں فلسفہ کی تمام شاخیں - فلسفہ کبریٰ - طبیعات اور ما بعد الطبیعہ تک سب داخل ہیں مگر جامعیت کی شان پیدا کرنے کی غرض سے ایک وسیع المعنی لفظ یعنی یزکّی کا استعمال کیا گیا ہے اور گو ذہنی علوم اور حکمتہ اور آیات یا نشانیاں یعنی تمام عالم مرئیات پہلے سے شامل تھے - تاہم - اسکے بعد بھی جو کچھ باقی رہا تھا وہ لفظ یزکی میں داخل ہے یعنی خدا کے بندوں کو تمام علوم ذہنیہ اور حقائق الاشیا اور الموجودات عالم کی نہ صرف تعلیم دو بلکہ اون کے ذہن نشین کردو اس طرح پر کہ اون کا علم علم الیقین کی حد تک پہونچ جائے - پس اے برادران ملّت یہ آپ کا فرض ہوگا کہ جب آپ یہاں سے کامیابی کا سہرا باندھ کر نکلیں تو فلسفہ حیات اور اوس کی بے شمار صداقتوں سے نوجوانوں کے قلوب کو معمور کردیں - یعنی نہ صرف اپنے شاگردوں ہی کو تعلیم و تبلیغ سے بہرہ مند کرو بلکہ قوم کے تمام افراد کو محتاج علم سے بہرہ مند کرو - تب ہی نیابت کا حق ادا ہوسکتا ہے -

مجھے فن تعلیم کے ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کہ میں اون تمام اصول و فروع پر بحث کرسکوں جن سے نیابت کے فرائض اور واجبات مستخرج ہوتے ہیں - یہ نہایت وسیع مضمون ہے اور میں اس وقت صرف اوسکے نمایاں پہلوؤں کی جانب اشارہ کرسکتا ہوں -

مدّت تعلیم کم و بیش اٹھارہ برس کی عمر تک محدود ہے یعنی پانچ چھ برس کی عمر سے شروع ہوکر دس گیارہ تک پرائمری، چودہ پندرہ تک ثانوی اور باقی حصّے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں - ولایت میں چودہ برس کی عمر تک قانوناً علوم و فنون یا علوم عامّہ کی تعلیم دیجاتی ہے - پیشہ کی تعلیم اس سے قبل شروع کرنا جرم ہے - سائنس اور صنعت

دوستکاری کی تعلیم کے حامیوں نے ابتداہی سے قوم کے بچوں پر قبضہ کرنا چاہا تھا
لیکن قدیم طرز تعلیم کی دلدادہ جماعت نے آکسفورڈ و کیمبرج وغیرہ یونیورسٹیوں کو
پشت پر لیکر سخت مخالفت کی اور فریق اوّل کو ناکامی ہوئی۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا
جو سلسلہ بیان میں آگیا۔ علوم عامہ اور سائنس کی اس کشمکش کی سرگذشت ایک بڑی
داستان ہے جس پر ولایت میں گذشتہ پانچ سال کے اندر بے شمار کتابیں ہر فریق
کی تائید میں اور بے شمار محاکمہ شائع ہو چکے ہیں۔

آمدم بر سر مطلب ہندوستان میں کسی مدرسہ میں جاکر دیکھو تو معمولاً چار اقسام کی تعلیم
دیجاتی ہے ذہنی۔ اخلاقی۔ مذہبی اور جسمانی۔ ان میں بچوں کے لئے مقدم تعلیم آخرالذکر ہے
جس کی مختلف صورتیں ہیں۔ ہر ایک صورت پر ولایت میں صدہا کتابیں شائع ہوئی ہیں
ان میں سے میں اکثر ساتھ لایا ہوں جو کانفرنس کی لائبریری میں موجود ہیں۔ مختصر یہ ہے
کہ ذہنیات پر تندرستی کا بہت بڑا اثر ہے۔ ولایت میں ڈاکٹری معائنہ بار بار ہوتا ہے
بچوں کے قواے عقلیہ کا اندازہ کیا جاتا ہے ناقص الخلقت بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص
انتظام ہے۔ اندھے گونگے بچے خاص تعلیم گاہوں میں رکھے جاتے ہیں۔ جن بچوں میں کوئی
حس کمزور ہوتی ہے اون میں اوس حس کو مختلف عملیات اور آلات سے مدپر لانے کی
کوشش کی جاتی ہے۔ ناک، کان، ہاتھ وغیرہ اعضاء ظاہری کا استعمال بالخیر۔ عملاً
سکھلاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو حواس کا اثر انسان کی تمام مشین پر ہے اسلئے کہ حواس
درست نہیں تو ذہنیات ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ صفائی و طہارت و پاکیزگی بھی تعلیم کا اہم
جزو ہے اور صحت کا بڑا منحصر علیہ۔ اس لئے کلام پاک میں طہارت کی بار بار تاکید ہے۔ اسلام
میں طہارت و پاکیزگی ایک خاص امتیازی صفت ہے۔ نماز اور تمام عبادات کلی غرارہ کے
بعد مسنون ہیں غسل پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن پاک کو بغیر طہارت ہاتھ لگانا منع ہے
لا یمسہٗ الا المطہرون۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے نابان رسول پانی میں ڈال کر تعلیم

تبلیغ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے ایک مولانا صاحب کو حدیث کا درس دیتے ہوے دیکھا کہ اون کے مُنہ سے پان کی چھینٹیں آرہی ہیں یہ بڑی کراہیت کی بات ہے اور نہایت خلاف شان ہے۔ آپ صاحبان کا فرض ہے کہ جس مدرسہ میں جائیں بچوں کو طاہر و مطاہر بناویں مگر یہ بات اوس وقت حاصل ہوگی جب آپ خود طہارت کا نمونہ بنکر دکھلا دینگے۔ بچے حسن سلوک سے بہت جلد سیکھتے ہیں۔ میری دانست میں جب تک آپ اپنے مدرسہ میں بچوں کے اندر تندرستی اور طہارت کا خیال دل نشین نہ کرینگے اوس وقت تک آپ اصل امتحان میں پاس نہیں ہو سکتے۔ میں نے ولایت کے پروفیسروں اور لیکچراروں کو دیکھا کہ اس قدر صاف ستھرے اور با تمیز اور با سلیقہ رہتے ہیں کہ گویا کلام پاک کے اصلی عامل وہی ہیں۔ میں بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ ایک کلاس روم کا اعلیٰ ترین ساز و سامان اور سب سے قیمتی زیب و زینت صرف ایک چیز ہے یعنی اوس کلاس کلاس کا ٹیچر یا پروفیسر۔ یہ جس قدر اخلاق اور حسن ظاہری اور باطنی میں آراستہ اور پیراستہ ہوگا اوسی قدر اوسکے طلبار کی قیمت دنیا کے بازار میں بڑھیگی۔

اخلاق ہی تعلیم کا ایک نشان معروف ہے مگر محض جلوت کا اخلاق کافی نہیں ہے بلکہ خلوت کا اخلاق مقدم ہے اگر یہ نہیں تو ظاہری خلق اور تپاک محض ایک مکر و ریا ہے مسلم یونیورسٹی کے طلبار ملک بھر میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اوسکی یہی وجہ ہے کہ یہاں کی روزانہ زندگی اور نظام رہائش نسبتاً بہتر ہے پھر بھی مجھے بورڈنگ کی اندرونی صحبتوں کا حال معلوم نہیں ہے۔ کئی سال بعد آیا ہوں۔ اسلئے خصوصیت سے توجہ دلاتا ہوں کہ اخلاق کی نشو و نما اور کیریکٹر کی تعمیر ہی انسانیت کی اور اسکی آیندہ کامیابیوں کی جڑ بنیاد ہے۔ جب تک آپ خود پسندیدہ شعار نہ ہونگے تب تک طلبار کو کیسے خوش خصال بنا سکتے ہیں۔ پنکچوالیٹی یعنی ہر کام کو معینہ وقت اور موقعہ پر کرنا گویا کیریکٹر کی عمارت کی اینٹیں ہیں۔ آپ صاحبان کو یہ سب باتیں اپنے شاگردوں کو اور متعارفوں کو زندہ

مثال بنکر سکھانی چاہیں حقیقی زندگی کے تمام رُخ اسی کی روشنی میں نظر آئینگے ۔

مجھے افسوس ہے کہ میری تمہید میرے اصل مقصد سے بڑھ گئی، مقصد یہ تھا کہ آپ صاحبان کو کانفرنس سے متعارف کروں جس کا فرض اولین یہ ہے کہ ہر قسم کے ذرائع تعلیم کے سامان کو طلبار کی دسترس میں رکھے۔ چنانچہ یہاں کی لائبریری فن تعلیم کے مواد سے اس قدر مالامال ہے کہ ملک بھر میں مشکل سے کہیں نظیر ملیگی۔ سنہ رواں تک تمام ممتاز تصانیف ہر شاخ و شعبہ کی مہیا کی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ صاحبان عمیق مطالعہ سے کانفرنس کو ممنون کرینگے اس سال کانفرنس کا اجلاس یہیں ہوگا اور اسکے ساتھ ایک بالکل نئی نرالی تقریب یعنی تعلیمی نمایش بھی منعقد کی جائیگی۔ ولایت میں تو اکثر ہوتی رہتی ہے مگر اس ملک میں آج تک کبھی نہیں ہوئی۔ اسکے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) ملک کے دور اور نزدیک حصے سے مدرسین کو دعوت دیکر فن تعلیم کی جدید تحقیقات کے نتائج دکھانا۔ ملک اور قوم کی ترقی کی پوری مشین ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ میں نے ولایت میں دیکھا وہاں یہی طبقہ سررشتہ تعلیم کا ذمہ دار اور اس کے زیر و بالا پر قابض ہے۔ یہی تعلیمی مسائل حل کرتے ہیں تعلیمی مسلمات قائم کرنے میں پیشقدمی یہی کرتے ہیں، لہذا ہم بھی اپنے ملک کے معلمین و مدرسین کو وسیع النظر ہونے میں مدد دینگے۔

(۲) ولایت میں طرز تعلیم بدلتے رہتے ہیں۔ یعنی جس ماہر فن نے طرز میں جدت پیدا کی اور درجہ قبول حاصل کیا اوسی کا طریقہ رائج ہو جاتا ہے۔ آجکل ابتدائی مدارج میں جو تعلیم کا سنگ بنیاد ہے۔ مانٹیساری سسٹم (پروفیسر مانٹی ساری کا طرز تعلیم و تربیت اطفال) رائج ہے چنانچہ نمائش میں ہم اسکے آلات او راشیا رمتعلقہ معلمین کو دکھلائینگے تاکہ مدرسوں کو نئی باتیں معلوم ہوں۔

(۳) نصاب کے مختلف مضامین بچوں کو کیونکر پڑھانے چاہئیں، مثلاً تاریخ۔ جغرافیہ انگریزی۔ حساب وغیرہ کی تعلیم کس طرح دیجائے کہ ہر مضمون کم وقت اور محنت میں زیادہ ذہن نشین

ہو سکے نیز کلاس ٹیچنگ کا پورا خاکہ دکھایا جائیگا جس سے معلوم ہو گا کہ یورپ اور امریکہ کے مدرسوں میں بچّوں کو کس طرح پڑھاتے ہیں کانفرنس میں متعدد مضامین پر لیکچر ہونگے جس کی تفصیل پروگرام کی صورت میں الگ شائع کی جائیگی - الغرض کہ آپ کی کانفرنس

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

نہ محض مسلمانوں کے لئے بلکہ سب کے لئے یکساں ہے - ہمارے برادران ہنود اس میدان میں بہت پہلے سے گام زن اور ہماری رہنمائی سے بے نیاز ہیں مگر فن تعلیم ہر شخص کیلئے گو کہ وہ مینؔ سے ساٹھ برس تک کی عمر کا ہو ایک ناگزیر ضرورت ہے - اڈلٹ ایجوکیشن یعنی بڑے آدمیوں کی تعلیم ہی کانفرنس کا ایک موضوع ہے - اس کے متعلق بھی پورے انکشافات کئے جائیں گے - اصل میں کسی ملک کی تہذیب کا دارومدار انہی کی تعلیم پر ہے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں اس میں لاکھوں روپیہ خرچ کرتی ہیں - انکے فارغ التحصیل طلبا ذکمی فوج کی طرف دیہاتوں کو تعلیم دیتے پھرتے ہیں جن کی حالت بوجہ جہل نہایت زبوں ہے - میں چاہتا ہوں کہ ہم بھی اس سے سبق لیں -

صاحبزادہ صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا -

آج آپ صاحبان کو مخاطب کرنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ آپ اس میں شریک کار ہوں - آپ کو والنٹیر بننا چاہیئے - آج میں نے جو کچھ کہا وہ ایک افتتاح ہے اصل تقریر عنقریب جلد کی جائیگی - جو صاحب اس دشوار کام میں شریک ہوں اور ان سخت فرائض کا بوجھ اپنے ذمہ لیں وہ اپنے نام لکھدیں - اس تمام مہم میں - مانٹیساری سسٹم اصل چیز ہے جس کی تمام رودادیں اور آلات اور سازوسامان ولایت سے لایا ہوں - میں چاہتا ہوں کہ آپ صاحبان ان کو پڑھیں اور دیکھیں اور وقت پر کام کرنے کے لئے تیار رہوں -

السعی منی والاتمام من اللہ -

پروگرام (نظام عمل) اجلاس کانفرنس آئندہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں

یہ نقشہ ابھی زیر غور ہے۔ اصلاح و ترمیم ممکن ہے

کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اس سال کے اجلاس کے موقع پر مفصلہ ذیل کام ہونے چاہئیں۔

(۱) تعلیم کا مفہوم یعنی تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے۔ ہم کیوں پڑھیں۔

(۲) تعلیم کا اصول یعنی علوم عامہ اور سائنس یا علوم الطبیعہ دونوں قوتوں نے باہم ملکر تعلیم میں کس طرح اضافہ کیا۔

(۳) تعلیم کے طریقے یعنی

(الف) دور جدید میں اس مضمون کے متعلق جس قدر مسائل زیر غور اور زیر تحقیق ہیں ان پر ایک عام ریویو کیا جاوے۔

(ب) مختلف مضامین کو پڑھانے کے طریقے الگ الگ بتائے جائیں۔ مثلاً جغرافیہ۔ تاریخ۔ السنہ۔ حساب وغیرہ کس کس طرح پڑھانا سہل اور جلد ذہن نشین ہوگا۔

(۴) پیدائش کے وقت سے تعلیمی زمانہ کے آخر تک جو عموماً چوبیس برس کی عمر پر محدود ہے جتنے تعلیمی مدارج واقع ہوتے ہیں ان میں سے الگ الگ ہر ایک پر سلیس اردو میں لیکچر دیے جائیں یعنی

(الف) زمانہ شیر خواری یا انفینسی ایک تا پانچ سال میں کس کس طرح تعلیم و تربیت دیجائے

(ب) چھ تا گیارہ سال یعنی چائلڈہڈ یا بچپن کے زمانہ کے لئے تعلیم تربیت کے لئے کیا اسباب و شرائط ہیں۔

(ج) بوائے ہڈ یا لڑکپن بارہ تا اٹھارہ سال تک کے زمانہ تعلیم کی کیا

خصوصیات ہیں اور یہ کہ جنرل ایجوکیشن چودہ سال تک ختم ہونی چاہیے۔

(د) یوتھ یا جوانی کا زمانہ جو انیس سے چوبیس برس تک محدود ہے کیا خصوصیات رکھتا ہے اور اسکے کیا لوازم ہیں۔

(ہ) آڈلٹ یا معمر اشخاص کی تعلیم جو چوبیس یا پچیس سال سے اوپر ہوں کیا خصوصیات رکھتی ہے۔

(۵) بچوں کی صحت جسمانی و دماغی کا معائنہ انکی سنہ ضروریہ کا اہتمام۔

(الف) بچہ کی جسمانی نشو و نما کی پیمائش کے فوائد اور جسم کی سالانہ ناپ تول کرنے کے منافع۔

(ب) بچہ کی ذہنی پیمائش کیونکر ہوسکتی ہے اور اس سے کیا فائدے ہیں۔

(۶) ناقص الخلقت اور ناقص العقل بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دَورِ جدید میں کیا کیا سامان۔ اشیا رو آلات ایجاد ہوئے۔

(الف) کس درجہ کی کتب نصاب موزوں ہیں۔

(ب) جسمانی ورزش کس حد تک مناسب ہے۔

(ج) ان بچوں کی سنہ ضروریہ کے تحفظ و نگرانی میں کیا خصوصیات ہیں۔

(۷) انگلستان میں تعلیمی تحریک کے مختلف شعبوں کی تکمیل میں کس قدر انجمنیں مصروف کار رہتی ہیں۔

(الف) ڈے نرسریز یا دن کے تربیت خانے۔

(ب) ... ... یا کنڈر گارٹن کی حامی سوسائٹیاں۔

(ج) بچون کی ماہران علم النفس کی انجمنیں۔

(د) ناقص بچوں کی میڈیکل یا طبی جماعتیں۔

(ہ) کھلے میدان کے مدرسے۔

(۷) اسکول نرس۔ معالج۔ ڈاکٹر۔ بچوں کے کلب۔ قصہ گو انجمنیں۔ بچوں کے تھیٹر کھیل کود کی سوسائٹیں۔ کتب خانے وغیرہ وغیرہ

نوٹ ۔ ان انجمنوں کی مطبوعات و رسائل نمائش میں دکھائے جائینگے۔

(۸) اسلامی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کا اردو اور انگریزی میں تقریر کرنے میں مقابلہ یعنی

(الف) پرائمری کے طلبہ کے لئے ریسائی ٹیشن یعنی قرأت۔

(ب) ثانوی درجہ کے طلبا کو اردو میں تقریر کرنی ہوگی۔

(ج) انٹرمیڈیٹ کالج کے طلبا کو اردو میں تقریر کرنی ہوگی۔

(د) یونیورسٹی کے طلبا انگریزی اور اردو دونوں میں تقریر کر کے اپنی طلاقت اور بیانیہ قوت کا مقابلہ کرینگے۔

(۹) لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق رپورٹ اور لکچر ہونگے خصوصاً تعلیم نسواں کی جو حالت ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے۔ اسپر اسباب اور نتائج کے ساتھ ایک مبسوط نظر ڈالی جائیگی۔

(۱۰) ایک بڑے پیمانہ میں ایک تعلیمی نمایش کی جائیگی۔

(الف) تعلیمی آلات۔ }
(ب) کتب نصاب۔ } اسکا پروگرام الگ شائع کیا جائیگا
(ج) مختلف نقشے اور جدول }

(۱۱) ہندوستان کے مختلف صوبوں کی تعلیمی ضرورتوں پر لکچر اور ریزولیوشن پیش کئے جائیں گے۔

(۱۲) کوآپریٹو سوسائٹی کے فوائد اور اس نظام کے اصول و ضوابط پر لکچر۔

(الف) اس نظام کی تاریخ۔

(ب) دنیا کے اکثر حصوں میں اس نے کیا فائدہ پہونچایا۔

(ج) ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس نظام کی بدولت عمال کے طبقہ کو کیا فائدہ پہونچا۔

(د) کواپریٹو قائم کرنے کے موٹے موٹے قاعدے۔

(۱۳) اصلاح تمدن پر ایک جنرل ریویو۔

(الف) کواپریٹو (یہ اوپر آچکا ہے)

(ب) تعلیمی بیمہ۔ اوس کے قواعد اور طریقے۔

(ج) طلبار میں کفایت شعاری کی عادت کس طرح پیدا کی جائے۔

(د) بڑی عمر کے اشخاص میں کفایت شعاری۔ تجارت بینک۔ اصلاح رسوم

نوٹ۔ کانفرنس کے ہر ایک شعبہ کی کمیٹی اور جلسہ کا صدر الگ ہوگا جو خطبہ صدارت لکھیگا اور بڑے بڑے مضامین پر تمام لکچر پہلے سے چھاپ کر تیار کرلئے جائیں۔ اور جلسے کے وقت صدر یا کوئی لکچرار اپنی تقریر پڑھکر نہیں سنائیگا۔ بلکہ نشر کا جلسہ میں تقسیم کردی جائینگی اور ہر مقرر اپنے اپنے موضوع کے اہم پہلوؤں پر ایک مختصر تقریر بطور تعارف کرے گا۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ زیادہ وقت خرچ نہو۔

ممالک غیر میں تعلیمی انقلابات

جرمنی میں ابتدائی تعلیم کا نصاب تقریباً بدل گیا ہے۔ جدید اضافہ یہ ہے کہ فاؤنڈیشن اسکول یا بنیادی مدارس کے نام سے بچوں کے لئے۔ نئی تعلیم گاہیں ایجاد ہوئی ہیں۔ جن میں چھ سے دس برس تک چار سال کی تعلیم لازمی ہے اُدھر اعلیٰ مدارس کے تحت پریپیریٹری یا ابتدائی جماعتیں جن میں تین سال کا کورس تھا بند ہوگئیں ثانوی تعلیم کے مدارس بدستور قائم ہیں۔ مگر ان کا نصاب بدل گیا۔ پہلے انہیں انگریزی زبان لازمی تھی اب اسکے بجائے فرانسیسی ہوگئی ہے۔ زبان ثانی کی تعلیم اوّل کے تین سال میں دیجاتی ہے۔ ان کا کورس غالباً پانچ سال کا قرار پایا ہے تعلیم کی مدّت اب کل نو سال رکھی گئی ہے۔ اُدھر اعلیٰ تعلیم کے مدارس کو توڑ کر ثانوی مدارس میں تبدیل کر دیا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے مصارف دینے سے گورنمنٹ نے انکار کردیا معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوگا۔ ثانوی مدارس کی تعلیم میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تعلیم معلمین کا سلسلہ انہیں مدارج سے شروع ہو جاتا ہے اور ٹریننگ کے ادنیٰ طلبار کو یہاں داخل ہونا لازمی ہے جو ابتدائی مدارج میں معلمی کا کام کرینگے۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ کتابیں ازبر کرنے یا لکچرار کی تقریر کو سن لینے ہی پر طلبار کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ بلکہ عملی مدارس میں جنہیں کارگاہ کہنا زیبا ہوگا۔ طلبار کو خود کام کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔ نصاب کے تقریباً ہر ایک مضمون کو کسی نہ کسی طرح بالعمل یاد کرنا لازمی ہے۔ سائنس کی تعلیم ہی انگریزی طریقہ پر لیبریٹری میں دیجاتی ہے۔ اس کا ایک زبردست نتیجہ آسٹریا میں تو یہ ہوا ہے کہ کتب نصاب عنقا ہوگئیں نہ ان کی مانگ ہے اور نہ زیادہ اشاعت اسکے بجائے کارگاہوں اور کارخانوں میں طلبار کا اژدہام اور گلی کوچوں میں انہیں آیندہ روندگان کی کثرت رہتی ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بچے ان گلے سے شکنجۂ جبر و استبداد سے صاف

نکل گئے۔ اب وہ اپنی فطری جذبات کے مطابق پوری آزادی سے تعلیم حاصل کرتے ہیں گویا بجائے خوف کے اب شوق اون کی رہبری کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں کیڈٹ مدارس کا تذکرہ بے موقعہ نہ ہوگا جس میں اب بالکل کایا پلٹ کا نقشہ ہے۔ جرمنی اور آسٹریا دونوں جگہہ پہلے ان میں فوجی افسر تیار کرتے تھے اور مصارف تعلیم و سکونت وغیرہ بہت ہی کم تھے گر اشترا کی خیال کے طبقہ کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ اعلیٰ اور ذی رتبہ افسرونکے بچے کوڑیوں میں تعلیم پاکر اور افسر بن کر نکلیں اور باقی قوم محروم رہے۔ سیاسی شورش کے بانی یہی ہوتے تھے اور بڑی بڑی بدلگامیاں ان ہی سے سرزد ہوتی تھیں۔ مگر آسٹریا نے اخلاقی جرأت سے کام لیکر یہ پرانا چولا یک بیک بدل ڈالا، اب ان مدارس میں قوم اور ملک کے ہر طبقہ اور درجہ سے طلبا منتخب کرکے لئے جاتے ہیں۔ معیار انتخاب قابلیت ہے نہ کہ خاندانی و شخصی وجاہت۔ اس وقت چار لڑکوں کے اور دو لڑکیونکے مدارس جاری ہیں جن میں پندرہ سو طلبا پڑھتے ہیں۔ داخلہ کی عمر دس سال ہے۔ تہائی بلا فیس اور باقی اپنے اپنے والدین کی مالی حیثیت کے مطابق کم و بیش فیس دیتے ہیں۔ مگر اصل مصارف تعلیم فی کس فیس سے زیادہ ہیں۔ اگر درجہ وار جائزہ لیا جائے تو چوتھائی طلبہ طبقہ عمال سے ہیں۔ کچھہ مستطیع جماعتوں سے۔ باقی کل متوسط طبقہ سے ہیں۔ جو اس گزشتہ طوفان جنگ میں تباہی کے کنارے پہونچ گیا۔ نصاب اور معاشرت میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی طلبا میں حقیقی مذاق اور تخلیقی قوت پیدا کی جاتی ہے۔ جسمانی ورزش اور تفریحی کھیل سے لیکر بڑھئی کا کام۔ دہات کی چیزیں بنانا۔ باغبانی۔ جلد سازی قسم قسم کے نئے نمونے تیار کرنا تک نہ صرف سکھایا جاتا ہے بلکہ مدرسوں میں ان اشیاء کا کافی ساز و سامان موجود ہے۔ ورکشاپ یا کارخانے ہی ساتھ ساتھ کھلے ہیں۔ مدرسہ کا سامان یا اوسکی مرمت طلبا کے ذمہ ہے اور سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ نقاشی اور مصوری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ہر اسکول کے متعلق ایک ذخیرہ آرائشات یا نگار خانہ بھی

ہے طلبا رہیاں سے آرائشی اشیا رلیکر اپنے کمروں کو آراستہ کرتے ہیں اور ڈرامے دکھلانے کی تیاری کرتے ہیں۔ پروفیسر کے علاوہ ایک ایک معلم خاص تیس تیس لڑکوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ان ہی کے ساتھ رہتا اور ہر قسم کے کھیل۔ سیر و تفریح اور گلگشت میں شریک رہتا ہے۔ یہ گویا اون کا رفیق و ہمدم بھی ہے اور رہنما بھی۔

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ جس قوم کی تہذیب کی تمام منزلوں کو ایوان حکومت سے لیکر تجارت کی منڈی تک ایک طوفان بے تمیزی نے زیر و زبر کر دیا ہو اور جسکی مالی پشت کا ٹوٹ کر چورا چورا ہو گیا ہو اب وہ اپنے بچوں کو اس قدر گرانبہا تعلیم و تربیت کیوں کر دیسکتی ہے۔ مگر ہمیں جاننا اور سیکھنا چاہیئے کہ اہل آسٹریا ارباب ہمم ہیں۔ ع

ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

محنت کش جماعت برباد ہے۔ متوسط کا حال ابتر۔ لیکن یہ سب جسمانی تغیرات ہیں اونکا دماغ اوسی طرح عرش معلّٰی پر ہے وہ ذہنی ترقی کے میدان میں کسی قوم سے پیچھے رہنا نہیں چاہتے اور اپنے خیال میں پکے ہیں۔ گورنمنٹ بلا شک نادار اور مالی اعانت سے معذور ہے گورنمنٹ کی اعانت بغیر علما اور اساتذہ کا طبقہ جو قوم کے دل و دماغ کو ستون بنکر تھامے رہتا ہے اپنا مقصد پورا نہیں کرسکتا۔ اعلی تعلیم کا دامن چھوٹنے کا اندیشہ ہے۔ اودھر محاصل کی گرانباری سے پبلک میں شور مچا ہے کہ کفایت شعاری سے کام لیا جاے جسکا لازمی نتیجہ ان مدارس کی ہستی مٹانا ہے۔ ان کا یہ مطالبہ ہے کہ آج ملک میں یہ مقدرت نہیں ہے کہ ایسے ایسے مشکل مہمات پر ہاتھ ڈالے۔ ادھر طبقہ علما اپنے آپ کو اپنے ہی ملک میں بے یار و مددگار دیکھکر غیر ممالک کے ہم جنسوں سے فریاد کر رہا ہے کہ تعلیم کے اس نظام کو قائم رکھنے کے لئے پبلک کی ہمت بڑھائیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذہنیات میں آسٹریا کا گرنا دنیاے تعلیم میں ایک بڑی اُفتاد ہوگی۔ حکومت کو چاہیئے کہ ان نفیس تعلیم گاہوں کو جن میں سے ہر ایک زر و جواہر کا خزانہ ہے اور ایک نئی قوم کا مولد اور مہد

ہی جس طرح ممکن ہو قائم رکھے۔

جرمنی اور آسٹریا کی تعلیم میں ایک اور خصوصیت یہ ہی کہ (کنیٹوشن) ضمنی مدارس برابر اسیطرح جاری ہیں اور انمیں تعلیم بھی ویسی ہی لازمی ہی تخفیف مصارف کے دستور العمل کا ان پر کچھ اثر نہیں مگر انکی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہی کہ مدرسہ کا وقت بڑھ گیا ہی۔ ہم ہندوستانی اس قسم کے مدارس سے لذت آشنا نہیں اور نہ ابھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی مدارس کی کمی ہی۔ پڑھنے والے ہی نہیں۔ نہ پڑھوانے والونکو شوق۔ جب اہل ہند اس میدان کو طے کرلیں تو ضمنی مدارس کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

ہمنے اسی رسالہ میں کہیں بتایا ہے کہ انگلستان میں ناقص الخلقت اور کمزور دماغ بچونکی تعلیم کا خاص اہتمام ہے۔ جرمنی میں اسکے برعکس ان بچونکی تعلیم کا خاص نظام قائم کیا گیا ہی۔ جنکے جسمانی اور دماغی قوی معمول سے زیادہ مضبوط ہیں۔ درحقیقت اس پیرایے میں جرمنی نے دنیا کی اقوام کو ایک سبق دیا ہے۔ عدل اور حریت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک اپنی قوت برداشت کے مطابق بوجھ اوٹھائے اس سے کمی ہو یا زیادتی۔ ہر صورت عدل و حریت کے خلاف ہے۔ اگر کوئی طالب علم دو سال کا کورس بآسانی ایک سال میں ختم کر سکتا ہی بغیر اسکے کہ طبی شہادت سے اوسکی جسمانی اور دماغی قوی کو کسی قسم کا صدمہ پہونچے تو کوئی وجہ نہیں کہ کیوں اوسکی ہمت افزائی نہ کی جائے۔ علاوہ ازیں اعتدال مزاج کا پیمانہ انسان کی گھڑی ہوئی چیز ہے افراد انسانی میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں فطرت اللہ غیر معمولی ذہانت ودیعت کرتی ہے۔ وہ پیمانہ ان پر صادق نہیں آسکتا اسلیئے جو اصول ایک ہیئت اجتماعی کے لیئے وضع ہوتے ہیں اون میں ہمیشہ مستثنیات کی گرہیں بھی لگتی ہیں۔ وہ ہیئت انفرادی پر نافذ نہیں ہو سکتے۔ اسی واسطے کلام مجید میں حمل و زمہ داری کا فیصلہ حیثیت انفرادی پر کیا گیا ہے نہ کہ اجتماعی پر جیسا کہ متواتر آیات سے ثابت ہے۔ تعلیم کا یہ نیا رخ اس قوم کے لیئے زیادہ مفید ہے جو ہندوستانیوں کی طرح تعلیم میں پس ماندہ ہوں تاکہ غیر معمولی قابلیت کے طلبا رجلد فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی شروع کردیں

تنقید و تبصرہ

نمبر ۱ ”زبان“

ہندوستان میں آج نہیں مدت ہائے دراز سے عام تعلیمی نظام کی بنیاد چند خاص اغراض پر قائم ہے۔ بے شبہ قدیم تعلیم بالخصوص اعلیٰ تعلیم میں پاکیزہ مقاصد پنہاں نہیں بلکہ عیاں ہوتے تھے، لیکن موجودہ ترقی کے روشن زمانہ میں ”علم التعلیم“ کے تمام امتیازی خصائص روز بروز کمزور اور تاریک تر ہوتے جاتے ہیں بعض طالع نصیب مبدء فیاض سے علمی قابلیت کا وہی مادہ لاتے بھی ہیں۔ تو شکم پروری کی دھن یعنی انہماک ملازمت میں قدرتی اہلیت کے عطیہ کو بہت کچھ معطل اور برباد کر دیا جاتا ہے۔ فضا سیاست میں جب سے ٹھروبنگ مچی ہے تب سے تو بہت ہی بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ جہاں دیگر قومی ضروریات سے استغنا ہے، وہیں اعلیٰ علمی انوار کی پُر تنویر ضیا باری سے بھی وطن و ملت کو محرومی ہو رہی ہے۔ بلند پایہ تصانیف کے فقدان پر غریب اردو پہلے ہی سے مرثیہ خواں ہے، رہی سہی توقعات جن سے وابستہ ہو سکتی تھیں وہ خود کو سیاسی کج ادائیوں پر قربان کر رہے ہیں غرض علمی نظر النادر کالمعدوم کے مصداق گویا گوہر نایاب ہے مگر موجودہ بے حسی اور مایوسی کے زمانہ میں ”سلطان القلم“ ”مرزا سلطان احمد خاں صاحب“ کا ملکی زبان پر عظیم احسان ہے، جنھوں نے ایک ضخیم کتاب ”زبان“ پر اپنے مایۂ ناز فلسفیانہ انداز میں تحریر فرمائی ہے۔ ہر چند یہ کوئی نیا اور اچھوتا مضمون نہیں ہے بعض علماء کی مہربانی سے دنیائے اردو ایک عرصہ قبل روشناس ہو چکی ہے، لیکن جس شرح و بسط کے ساتھ فاضل مصنف نے موشگافی اور باریک بینی سے کام لیا ہے وہ ان کا خاص حصہ ہے۔ بعض ابواب نہایت نفیس اور لطیف ہیں بادی النظر میں قابل مصنف نے علم اللسان کا کوئی اہم مسئلہ

نظر انداز نہیں کیا ہے اور اپنے قادر الکلام طرز بیان میں پوری توضیح اور تشریح سے کام لیا ہے، الا کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ ایجاز و اختصار بلکہ اشارہ و کنایہ پر اکتفا، کھٹکتا اور شوق تجسس و تحقیق کو گراں گذرتا ہے۔ حالانکہ شرح و تفصیل سے مضمون نہ صرف دلچسپ بلکہ مدلل ہو جانا یقینی تھا شاید اس کوتاہی کا باعث یہ ہے کہ ایک خالص علمی کتاب کو ایسے مضمون سے ملوث کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا جن میں مذہبی مباحثات کی رنگ آمیزی کا امکان ہو۔ بالخصوص اس وجہ سے زیادہ طول مقال کو فضول خیال کیا گیا کہ "ام الالسنہ" کے متعلق بعض "براہین نیرہ" قادیانی مشن کی طرف سے جداگانہ شائع ہو چکی ہیں لیکن ہمارے خیال میں اس مضمون کی تحقیق کے متعلق جس قدر تدقیق سے کام لیا جائے علم و مذہب دونوں کے لئے سودمند ہے۔ بہرحال فاضل مصنف کے علمی شوق کا یہ جدید و مفید نادر ثمرہ بالیقین اُردو زبان میں قیمتی اور قابل قدر اضافہ ہے نفیس کتابت اعلیٰ طباعت کا عمدہ نمونہ ہے یہ ۸ اجزو کی کتاب غالباً مرغوب ایجنسی لاہور سے ۸؍ میں مل سکتی ہے۔

(۲) اصول تعلیم

دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر　　نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں

تعلیم کی عظمت بالخصوص مہذب دنیا میں کم و بیش تسلیم کی گئی اور ہر قسم کی ترقی کا بنیادی سر چشمہ تعین کی گئی ہے دَورِ حاضرہ کو اگر آزادی کی کشمکش کا زمانہ کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ گزشتہ مہیب و عالمگیر جنگ عظیم نے ہر کہہ و مہ کی آنکھیں کھولدی ہیں اور ہر ایک قوم تمنائے حریت کے نشہ میں مخمور نظر آرہی ہے۔ پھر ہندوستان اس بلا خیز طوفان میں جو تمام دنیا کو متحرک و متلاطم کئے ہوئے ہے کیونکر ساکن و خاموش رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنے اور اقوام عالم کی مجلس میں اپنا جائز حصہ پانے کے لئے مضطرب یعنی سیاسی آرزو کی خواہش تکمیل میں وارفتہ ہو رہا ہے

پس جب کہ ہم کارزارِ ہستی میں نمایاں فتح کی تمنا در کنار اپنی زندگی برقرار رکھنے کی غرض سے حصہ لینے کے لئے مجبور ہیں تو یہ مہلک غلطی ہوگی کہ ترقی کے کسی مرحلہ بالخصوص سیاسی غلغلہ میں تعلیم کی واجبی قدر و قیمت کو فراموش کرجائیں تعلیم کی منزلت آج گزرے ہوئے کل سے زیادہ ہے اور یقیناً فردا ٔ مستقبل میں اس کی روز افزوں اہمیت دن بدن بڑھتی جائیگی۔

ہماری سیاہ بختی اور بدقسمتی کی اس سے زیادہ کیا واضح دلیل ہوگی کہ اپنے گراں مایہ اندوختہ کو بھی ہم نے ضائع کیا اور غیروں سے قیمتی سرمایہ سے بھی ہنوز کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اپنے بہترین ورثہ مذہب و اخلاق کو ہم نے فراموش کر دیا ہے اور مغرب کے بزرگ ترین عطیہ سائنس و صنائع کو ہم بالکل نظرانداز کر رہے ہیں۔ اخلاقی ارتقا اور اقتصادی احیا تو بڑا مرحلہ ہے ذہنی نشو و نما کا درجہ بھی ہم نے کما حقہ طے نہیں کیا بلکہ بعض اہل نظر کے نزدیک اس لحاظ سے بھی ہمارے مدارس مسلخ کہے جائیں تو بے جا نہیں۔ فی الواقع نفس الامر میں حق یہ ہے کہ غلامی کا دائرہ وسیع کرنے کے سوا ہم نے ہنوز کوئی تعلیمی نصب العین ہی معین نہیں کیا۔ ہماری وہی مثل ہوئی دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ازیں شور آمدہ وزاں شور ماندہ

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　　　　نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

بے شبہ مغربی تعلیم کا صور تقریباً نصف صدی سے پھونکا جا رہا ہے اور انتہائی کوشش پر ایک دل دادہ طبقہ پیدا بھی ہو گیا ہے۔ لیکن خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے 'ہنوز دہلی دور' اور بحیثیت مجموعی قومی مطمح نظر کے لحاظ سے 'ہنوز روز اول' کہنا بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ نہ صرف جمہور کی ہی لکھی ڈکشنری بلکہ رعایا و راعی دونوں کے اعتقاد میں تعلیم و ملازمت مرادف الفاظ ہیں۔ حتیٰ کہ فدائیان تعلیم کا خاص الخاص مدعا بھی اب تک صرف یہ رہا ہے کہ ملازمت کے دائرہ میں آسانی اور فراوانی کے ساتھ حتیٰ الوسع گنجائش پیدا کی جائے۔ ہمارے بہترین دل و دماغ نے اس بدیہی صداقت کو بارہا محسوس و تسلیم کیا ہے کہ صحیح تعلیم کے متعلق

کوئی قدم اُٹھانا تو درکنار ہم نے اب تک اپنے فرض کا کماحقہ احساس بھی نہیں کیا ہے۔
اس پستی اور پست ہمتی کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بیشتر ابنا ملت بلکہ حوائین
تعلیم کا گروہ کثیر ہی اصول تعلیم سے لاعلم و بے خبر ہے۔ ہندوستان میں غرض خاص سے
تعلیم کا محکمہ قائم کیا گیا ہے، اور احمق حریص چڑیاں اس دام میں اسیری ہی کو اپنی پر فخر
کامیابی اور انتہائی ترقی سمجھ رہی ہیں لیکن جلد یا بدیر وہ زمانہ آیا چاہتا ہے جب کہ
الدہر افصح المودبین کا تازیانۂ عبرت خیز ہمیں نظام تعلیم پر نظر ثانی کے لئے مجبور کریگا
اور ترمیم و اصلاح کے بعد جداگانہ راستہ اختیار کرنا ناگزیر ہو جائیگا۔

تعلیم بے شبہ ایک نعمت اور رحمت ہے الا جب کہ صحیح اُصول پر مبنی ہو ورنہ زحمت و
آفت ہے جبکہ موجودہ ناقص تعلیم اپنے بدترین عیوب کے باوجود بیداری کا آلہ اور ولولہ
آزادی کا سرچشمہ ثابت ہوئی ہے، اگر صحیح اُصول پر ہماری رہنمائی کا مکمل انتظام کیا جائے
تو لازوال خیر و برکت کے دروازے ہم پر کیوں نہ کھل جائیں۔ جب کبھی اصلاح تعلیم کا مبارک
وقت آئے ایسے رسائل کا مطالعہ یقیناً بہت نفع بخش ہو گا جن میں اصول تعلیم پر سچی روشنی
ڈالی گئی ہو تعین راہ کے وقت نامور مجتہدان تعلیم کے روشن خیالات کی واقفیت نہایت
ضروری امر ہے مگر مشکل یہ ہے مثل ہمارے ہماری زبان بھی مفلس و تہی دست ہے۔ پس وہ
مبارک اصحاب ملک و ملت کے محسن خیال کئے جانے چاہئیں جو دل ربا اور بیش قیمت جواہرات
سے دامن اُردو کو مالا مال اور مزین کریں۔

تمام محبان تعلیم کو ممنون ہونا چاہئے اُردو زبان کے نامور ادیب مولانا اشہری مرحوم
کے لائق خلف الرشید مولوی سید منظر علی صاحب اشہر جائنٹ اڈیٹر رسالہ "لسان الملک"
کا جنھوں نے قومی ملکی ضروریات سے متاثر ہو کر ایک عرصہ بعید و مدت مدید کی دیدہ ریزی
اور سعی کے بعد اصول تعلیم کے اہم موضوع پر ایک بلند پایہ اور گراں مایہ کتاب تالیف کی ہے
یہ عالمانہ کتاب اُردو میں قابل قدر اضافہ اور ہادیاں تعلیم کے لئے بہترین رہنما ہے۔ نازک اور

دقیق مسائل شستہ و شائستہ پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ زبان نہایت صاف سلیس اور طریق بیان نہایت دلچسپ و دل نشین ہے شیریں اور شگفتہ طرز ادا نے ادائے مطلب کو آسان عام فہم بنا دیا ہے۔ قابل مؤلف نے خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ توضیح مطلب میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یورپ کے نامور مجتہدان تعلیم نے وقتاً فوقتاً جو نمایاں اصلاحیں کی ہیں ان کا ایک دلآویز مرقع ہے ہمیں معلوم ہے کہ ہماری زبان ان قیمتی مضامین سے ناآشنا محض نہیں ہے لیکن کتاب زیر نظر ایجاز مخل اور اطناب لاطائل سے بری ہے اگرچہ تاریخی رنگ میں پوری تفصیل نہیں کی گئی لیکن عمل سودمندی کو مدنظر رکھتے ہوئے اساسی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ بظاہر بعض تعلیمی اصولوں کا بیان ہی لیکن فلسفہ زندگی کے متعلق بہترین اخلاقی نصائح سے لبریز ہے۔ زیر نظر "اصول تعلیم" کے نقش ثانی کو پروفیسر ضیاء الدین احمد کے نقش اوّل پر کوئی فوقیت ہو یا نہ ہو مگر یہ تو ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست"

تمام کتاب کا نتیجہ اس کا آخری حصہ ہے۔ ضرور نہیں کہ اس سے اتفاق کلی کیا جائے مگر اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ تعلیم کے ارباب بست وکشاد، تنقیح و تحقیق کے بعد تجربہ کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ اگر سرزمین دکن کا لائق فرماں روا اس مشورہ کو درجہ قبولیت سے مفتخر کرے تو لائق مؤلف پر احسان سے زیادہ حضور پرنور کی یہ ایک عظیم الشان ملکی خدمت ہوگی اور قوم کے لئے یہ تجربہ جامعہ عثمانیہ سے زیادہ نتیجہ خیز اور شمع راہ ثابت ہوگا۔

اس مفید کتاب کی تالیف پر سرکار عالی شہریار دکن سے مؤلف کو تاحیات وظیفہ سرفراز ہوا ہے امید ہے کہ ملک بھی اس کے مطالعہ سے فائز المرام ہوگا۔ ضخامت ۵۲ صفحہ نفیس کتابت، عمدہ طباعت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ دو روپیہ قیمت پر منیجر "لسان الملک" دلاور گنج حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

(۳) "علوم قرآن" پر ایک نظر

جمیع العلم فی القرآن لکن   تقاصر عنه افهام الرجال

خواب دیدم کز نہال علم می چینم ثمر   چوں شدم بیدار قرآں را بداماں یافتم

(۱)

معرکہ سائنس و مذہب

سائنس و مذہب کی باہمی نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی کوئی جدید واقعہ نہیں بلکہ داستان کہن کا غیر مختتم سلسلہ ہے۔ لیکن یہ بدیہی اور یقینی ہے کہ مغرب میں سائنس کو نمایاں کامیابی حاصل ہو چکی ہے، اس کی فتوحات کا سیلاب جاپان تک پہنچ گیا ہے۔ بقول سید راس مسعود صاحب ڈائرکٹر تعلیمات سرکار نظام (مغرب کے شاگرد رشید) جاپان کے وزیر اعظم کا فرمان ہے "خدا کبھی اس ملک میں نہیں آیا نہ ہم اس کو اس ملک میں گھسنے دینگے"۔ ہر چند جاپان ایشیا کا حصہ ہے مگر مغرب کے اثر نے اس کو مذہب یعنی خدا سے منکر بنا دیا ہے۔ بقیہ مشرق میں ہنوز کشمکش جاری ہے۔ مگر باوجود روز افزوں اختیار و اقتدار کے سائنس اب تک مذہب کے بالمقابل بظاہر عاجز دلاچار ہے۔ بہر حال کوئی زمانہ تھا جبکہ ارض و سما پر مذہب ہی کا مقدس ڈنکہ بجتا تھا، یا اب تقریباً تمام دنیا پر سائنس کا پھریرا لہرا رہا ہے، علم کا دَور دَورہ ہے اور اس حد تک اس کا غلبہ ہو چکا ہے حتے کہ بعض کے خیال میں مہذب (؟) دنیا روحانی جذبہ سے عاری ہو کر مذہب کے حلقہ اسیری سے رہائی کو اپنی پُر فخر کامیابی اور شاندار ترقی کا گمان کرتی جاتی ہے بعض دل دادگان سائنس کی نظر میں مذہبی جذبہ مضمحل اور منہزم ہو چکا ہے اور وہ اپنے نشہ میں سرشار ہو کر علانیہ و فخریہ مذہب کو مردہ تصور کرتے ہوئے اس کی فاتحہ خیر پڑھنے لگے ہیں چنانچہ یورپ کے ایک نامور عالم کا قول ہے۔

"علم کو پوری آزادی حاصل ہو چکی اور یہ خطرہ باقی نہیں رہا کہ علم پر مذہب کو پھر کبھی غلبہ

حاصل ہو سکے، مذہب کا کوئی اصول و قاعدہ ایسا نہیں ہے جس کو زنگ نہ کھا چکا ہو، چونکہ یہ اصول علم کے منافی ہیں اس لئے یہ امر یقینی ہے کہ تمام مذاہب اور ادیان ضرور بالضرور صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جائینگے ''

اس کے برعکس مذہب (؟) کی بھی خواہش، کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ جہانتک ممکن ہو اپنے فتوی کی تاریک سیاہی کے مہیب بادلوں سے آفتاب سائنس کی روشنی کو روکا جائے۔

علم دین فقہ است تفسیر و حدیث ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

اگرچہ بالکل اس تزاع کا خاتمہ ہو کر کسی ایک کا کامل غلبہ نہیں ہوا اور نہیں معلوم اس قضیہ کا فیصلہ ہو گا یا کبھی نہیں ہو گا۔

سائنس و مذہب کا باہمی تعلق

اب تحقیق طلب امر یہ ہے کیا مذہب و سائنس فی الواقع دو مختلف و متخالف حریف قوتیں ہیں جو باہم آب و آتش کا تعلق رکھتی ہیں ؟۔ مذہب خدا کا قولی الہام ہے اور کائنات عملی۔ مظاہر طبعی کے علم کا نام سائنس ہے جب ایک ہی سرچشمہ سے دونوں کا ظہور ہے تب ورڈ آف گاڈ اور ورک آف گاڈ میں مخالفت چہ معنی دارد ؟ گمان و قیاس کا انکار ممکن ہے، تجربہ و مشاہدہ کا ابطال کیونکر ہو سکتا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ سائنس و مذہب ایک نہیں ہیں لیکن دونوں میں خصومت کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ الاجمود و تعصب کو اگر مذہب کا مایہ ناز جوہر سمجھا جائے اور انانیت و نفسانیت کو سائنس کا ممتاز تمغہ گمان کیا جائے تب بے شبہ دونوں کا توافق محال اور نتیجہ واحد یعنی ضلالت ہو گا۔

اس قضیہ نامرضیہ کے متعلق نامور انگریز فلاسفر ہربرٹ سپنسر کا قول فیصل بالکل صحیح ہے

'' بیشک سائنس ان توہمات کا دشمن ہے جو مذہب کے نام سے مشہور ہیں نہ کہ اصلی و حقیقی مذہب کا جن کو یہ توہمات محض پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ سچا سائنس اور سچا مذہب توام

ہیں۔ باہمی جدائی یقیناً دونوں کی موت ہے۔ سائنس میں جس قدر مذہبی روح ہوگی ٹھیک اسی مناسبت سے وہ ترقی کریگا۔ جہاں تک سائنس کی گہرائی اور مضبوطی پر مذہب کی بنیاد قائم ہوگی ٹھیک اسی مناسبت سے مذہب ترقی کریگا۔"

(۲)

اسلام پر الزام

اس وقت دیگر مذاہب سے ہمیں بحث نہیں۔ لیکن مذہب کی آخری اور مکمل شکل اسلام کو سائنس کا مخالف و معاند قرار دینا ایک لیسا رکیک الزام اور ذلیل اتہام ہے جس کی جرأت کوئی بد باطن متعصب ہی کر سکتا ہے۔ تعجب و تأسف ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مہذب دنیا کے بعض مدعیان تحقیق (؟) "برعکس نہند نام زنگی کافور" ہنوز گمراہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں یا دیدہ و دانستہ اپنی خبث باطنی پر باصرار قائم ہیں چنانچہ ایک صاحب فرماتے ہیں۔

"قرآن کی جامد تعلیم، موجودہ اصول تعلیم و تربیت، علوم و فنون، تمدن و معاشرت غرضیکہ جو چیز ترقی اور فلاح و بہبودی کی طرف لے جانے والی ہے سخت مخالف ہے"

(سر ہنری جانسین)

چشمہ اسلام یعنی قرآن پر الزام رکھنا انتہائی خرمغزی یا خبث باطنی کی دلیل ہے البتہ عوام مدعیان اسلام کو متہم کیا جائے تو دوسری بات ہے اور کچھ نہ کچھ سچائی بھی لئے ہوئے ہے چنانچہ

تعصب اہل اسلام

پریزیڈنٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۸ء کی رائے میں مسلمانان ہند کی تعلیمی پس ماندگی اور علوم جدیدہ سے ناآشنائی کا خاص سبب تعصب مذہبی ہے "سالہاسال سے میرے سننے میں یہ بات آرہی ہے کہ اکثر اشخاص کا اعتقاد ہے کہ اجنبی زبانوں میں تعلیم دینا درحقیقت مذہب اسلام کے منافی ہے۔ ان ہی وجوہ پر ان کے قول کے مطابق کچھ ملاؤں نے انگریزی علوم کے

مطالعہ کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ابھی بہت سے لوگ اس عقیدے پر اڑے ہوئے ہیں" یہ الزام بحالات موجودہ پُر مبالغہ ہو مگر سچائی سے خالی نہیں ہے اس کی وجہ سے خواہ کچھ ہی ہو مگر یہ حال سے زیادہ زمانہ ماضی کا ایک واقعہ نفس الامری ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ترقی اہل اسلام

اللہ اللہ کوئی زمانہ تھا کہ ہمارے اسلاف ہر ایک شعبۂ زندگی میں "عدیم المثال کمال کے وارث تھے" اور تمام دنیا معلومہ ان کے زیر نگیں یا زیر اثر تھی مگر یہ صرف قرآن کا طفیل تھا کہ سیاسی، تمدنی، اخلاقی، علمی ہر حیثیت سے ہمارا آفتاب اقبال آسمان ترقی کے نصف النہار پر تاباں تھا لیکن اب کیا کیفیت ہے؟

تنزل اہل اسلام

"ہماری نحوست اور ہماری ذلت تمام نحوستوں اور تمام ذلتوں سے بڑھ گئی ہم خود اس نحوست و ذلت کی نگاہوں میں بھی ذلیل ہیں ہم بہ ہیئت مجموعی اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی کرتوتوں سے دن بدن گھٹ رہے ہیں اب ہمیں خدا ہی بچائے تو بچ سکتے ہیں اور کوئی سبیل نہیں۔

در باغ دہر نیست بحرمان ما کسے   چوں فصل گل گزشت تماشا بما رسید

سبب تنزل

موجودہ نکبت و ذلت کی وجہ کیا ہے؟ کرنل الکاٹ کے خیال میں اصلی اور حقیقی علت یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید کی تعلیم کو پس پشت ڈال دیا اگر قرآن مجید سے ہمارا جو شغف ہے وہ بظاہر اس دعوی کو باطل کرتا ہے لیکن فی الواقع غور و انصاف سے دیکھا جائے تو "ہمارے زمانہ میں قرآن مجید کا سوائے اسکے اور کیا مصرف ہے کہ

علماء کرام باہمی مناقشوں کا اسے ایک ذریعہ بنائیں۔

امرائے قوم و ملت اسے طاق نسیان میں رکھ چھوڑیں۔

عوام عدالتوں میں جھوٹی قسمیں کھائیں۔

کبھی کبھی معتبروں پر پڑ ہوائیں۔

زکفرِ عمل تو تاریک گشت روئے زمیں　　　فغاں کہ رونقِ قرآں بہر طرف شد و رفت

بریت قرآن ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ اسلام و اہل اسلام کی جا و بیجا حمایت میں اپنی طاقت کو صرف کیا جائے لیکن یورپ کے ایک محقق کے قول کے موافق تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ "اب تک روئے زمین پر مسلمانوں سے بڑھ کر علم دوست اور روادار کوئی دوسری قوم نہیں ہوئی"، بالفرض مسلمانوں نے کما حقہ یا مطلقاً کوئی توجہ نہ کی ہو اس سے سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن پر کیا حرف آسکتا ہے؟ اگر کوئی تریاق کو کام میں نہ لائے اور نوش دارو کو زہر ہی خیال کئے جائے تو کس کی خطا ہے؟ اگر صدیوں سے مسلمان تعلیم قرآن کو عملاً پس پشت ڈالے ہوئے ہیں یا بلند اقبال اقوام کے متعصب و ناشکر گزار افراد بھی اس کی قدر نہیں جانتے تو اس میں قرآن کا کیا قصور ہے؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(۳)

تذکرہ "علوم القرآن" تمام شیدائیان سائنس و فدائیان اسلام کو ممنون و شکر گزار ہونا چاہیے اردو زبان کے نامور فلسفی انشا پرداز "سلطان القلم" مرزا سلطان احمد "خاں صاحب" کا جنھوں نے شستہ زبان، شائستہ طرز بیان میں مفصل و مدلل، ایک عالمانہ کتاب علوم قرآن کے متعلق کچھ عرصہ گزرا ہی حال ہی میں شایع کی ہے۔ گو بعض دیگر جلیل القدر علما نے بھی اس موضوع پر توجہ فرمائی ہے لیکن "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست" کے علاوہ اس وضاحت اور ایسی جامعیت کے ساتھ کوئی اور کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔ ممکن ہے اپنے رنگ خاص میں نقش اول ہونے کے باعث یہ کتاب ہنوز ناکافی خیال کی جائے یا استدلال میں کہیں خامی پائی جائے

لیکن فی الجملہ اس جدید کتاب سے اُردو زبان میں مفید اور قابل قدر اضافہ ہی نہیں ہوا
بلکہ سائنس و مذہب دونوں کی وقیع خدمت کی گئی ہے اور قدیم و جدید ہر دو طبقہ کے
طلبا بلکہ حق کے انکشاف اور اضافہ معلومات کا ذریعہ ہونے کے باعث ہر مذہب کے علما
کے لئے اس نادر کتاب کا مطالعہ یقیناً فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ گوناگوں اور بوقلموں
تفسیر قرآن کے نامتناہی سلسلہ کو دیکھتے ہوئے بمشکل کسی اور گنجائش کا گمان کیا جا سکتا ہے
لیکن بالغ نظر اور نکتہ رس مصنف نے قیامت تک قرآن مجید کے عجائب ختم نہ ہونے کی
ایک نئی اور زندہ صداقت بہم پہنچائی ہے اور اس ضمن میں علم کی اور قوم کی ایک اہم ضرورت
پوری کی گئی ہے۔ قابل اور فاضل مصنف نے معقول اور منقول ہر حیثیت سے مفصل و مکمل
طور پر بحث کرتے ہوئے اپنے مقصد میں نمایاں اور عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے ممکن
نہیں کوئی صحیح العقل اور منصف مزاج اس اعلیٰ اور بلند پایہ کتاب کو پڑھے اور متاثر ہو کر
اس کا دل صداقت کا قائل نہو۔ چند اشارات نہایت لطیف اور بعض مقامات بغایت لذیذ
ہیں غیب، رطب و یابس، الدنیا جیفہ کی عجیب اور مفید توجیہ کی گئی ہے مگر یہ تعجب ہے کہ
کماحقہ بحث تو درکنار پالٹکس کو نمایاں جگہہ بھی نہیں دی گئی۔ حالانکہ موجودہ سیاسی سخت
کے پریشان کن متلاطم زمانہ میں اس مضمون پر غور کرنے کے خاص طور پر شدید ضرورت ہے
رسول صلعم کی مبارک زندگی میں مظلومانہ محکومی اور آزادانہ شہنشاہی ہر قسم کی سیاسی حالت
راعی و رعایا دونوں کے لئے علمی اور عملی ہر رنگ میں کافی ہدایت موجود ہے۔

شعائر اسلام یہ نفیس کتاب کیسی ہی مبنی بر معقولیت اور پر منفعت ہو ہمیں اس کی
عام مقبولیت میں بہت شبہ ہے کیونکہ بدقسمتی سے ہماری قوم کا
ذلیل رویہ اور پست مذاق اعتدال کا سیدھا سچا راستہ چھوڑ کر افراط و تفریط کا مہلک راستہ
اختیار کئے ہوئے ہے۔ لایق مصنف نے جابجا افتومنون ببعض الکتٰب و تکفرون
ببعض، کی تہدید کے نقطۂ نظر سے اسلام کو نماز روزہ اور جنت و دوزخ میں محدود کر دینے

پر سچی ملامت کی ہے جس سے خام عقل عجب نہیں تحقیر و تنقیص کا پہلو نکال کر خواہ مخواہ چین بہ جبیں ہوں حالانکہ اصل منشا صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔

وسعت عبادت

"نعوذ باللہ میرا یہ منشا نہیں کہ نماز کی ضرورت یا روزہ کی حقیقت کچھ نہیں، یہ دونوں شعائر اسلام اور سید الفرائض ہیں۔ جو شخص نماز روزہ کا منکر ہے وہ اسلام کا منکر ہے" مگر "عبادت نماز روزہ ہی نہیں انکشاف قدرت بھی ہے۔ اس سے اس کی عظمت و قدرت کا عملی رنگ میں علم ہوتا ہے جس کے بغیر انسان کا ایمان و یقین کامل نہیں ہوتا نہ وہ آسائش روحانی و جسمانی حاصل کر سکتا ہے جو اس کا مدعا زیست ہے محض عابد و زاہد ہونا ہی کمال انسانیت نہیں، دنیا سے واقفیت بھی ایک واجبی امر اور مشروع مسلک ہے" جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے بعض وقت ایک ساعت کا منکر تمام شب کی عبادت سے افضل ہوتا ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ سنن متروکہ اور دیگر احکام مفوضہ پر بھی توجہ اس رنگ میں دلائی گئی ہے۔

انکشاف قدرت یعنی علمی ترقی کی جانب ہی توجہ دلانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ جابجا معاملات کی درستی یعنی اخلاقی اصلاح پر بھی بہت کچھ زور دیا گیا ہے اور واجبی نکتہ چینی کے پیرایہ میں علمائے کرام کے فرائض منصبی کے احساس کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارا اخلاقی تنزل

"یہ بھی کبھی سوچا مسلمانوں میں لا تکتموا الشہادۃ کی کہاں تک تعمیل ہوتی ہے؟ کس قدر مسلمان جھوٹی گواہی میں قید ہوتے ہیں؟ کس قدر بیجا مقدمہ بازی ہو رہی ہے؟ مسلمان عہود و مواثیق میں کیا کیفیت رکھتے ہیں؟ اور ان العہد کان مسئولا کی آیت کس طرح دائرہ عمل سے نکلی جاتی ہے؟ کبھی ان فرد گزاشتوں پر کسی پیشوائے امت نے غور کیا؟ کبھی یہ حالات دیکھکر بھی ہماری مذہبی رگیں پھڑکنے لگیں مسلمانوں کا شیرازہ کس طرح دن بدن ٹوٹ رہا ہے اور کس قسم کی خرابیاں موجب ذلت ہو رہی ہیں؟ پیشوایان امت رہنمایان ملت کا

فرضِ اولین تو یہ تھا کہ ان باتوں کی طرف توجہ کرتے۔ فی صدی ۹۹ مسلمان معاملاتی پہلو اور غیورانہ مسلک چھوڑتے جاتے ہیں۔ اُسوہ حسنہ رسول کی کوئی پروا نہیں۔ آمین رفع یدین پر ہتھم ہتھا ہو رہا ہے۔ جب ہمارے معاملات درست نہیں جب ہم عزت کھو چکے، تو یہ نماز روزے کس کام کے! جو نماز روزے، جو مراقبے و مجاہدے ہمارے معاملات کا دامن پاک نہیں کر سکتے ان کی قیمت کیا ہے؟ اگر نماز تنہا عن الفحشاء والمنکر کا اثر نہیں رکھتی تو پھر اس کا فائدہ ہی کیا؟

مغربی تقلید عجب نہیں مذہبی گروہ میں سائنس کی سرگرم تائید سے یہ بھی گمان کیا جائے کہ مغربی تقلید کے لئے شرعی رنگ میں مؤثر پیرایہ تلاش کیا جا رہا ہے لیکن مقلدین یورپ علما سے زیادہ اسکے مطالعہ سے برافروختہ ہونگے ان کو بھی اس کتاب سے مایوسی ہوگی اور مشرقی حلقہ بگوشی کی ہدایت میں انہیں دقیانوسی جھلک صاف نظر آئیگی۔

"دین و معاد جان و روح ہے اور دیگر مواد بطور قالب اور وسائل زندگی کے، اہل مغرب نے علوم و فنون میں بہت کچھ ترقی کی لیکن مادیت اس قدر غالب آگئی کہ اب مغرب میں سوائے مادیت کے گویا اور کچھ رہا ہی نہیں۔ مغرب میں نہ تو صبر و سکون ہے نہ طمانیت و تسلی۔ ہر زندگی مختلف خود غرضیوں کے تحت شب و روز ایک تکلیف دہ مخمصہ میں رہتی ہے جو تکبر و رعونت مغربی زندگی میں مقابلۃً پائی جاتی ہے مشرق میں اسکی نظیر مشکل سے ملیگی۔ اسلام و قرآن کا کبھی یہ منشا نہیں ہوا کہ دنیاوی علوم و فنون کی ترقی سے ضمیری، روحانی، و دینی مراحل چھوڑ دیے جائیں۔"

صراط المستقیم جب مشرق و مغرب دونوں جگہ "شد مشرق و مغرب خراب" کی ہولناک سیاہی چھائی ہوئی ہے تو اس مہیب تاریکی میں سیدھی راہ کہاں تلاش کی جائے؟ یہ سوال جس قدر اہم اور ضروری ہے ویسا ہی اس کا جواب

آسان اور صاف دیا گیا ہے۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید　　ہرگز بمنزل نخواہد رسید

مپندار سعدی کہ راہِ صفا　　تواں برد جز در پئے مصطفٰے

"مچھلی کرۂ آب سے باہر نکل کر کب تک زندہ رہ سکتی ہے؟ سراب فریب آب میں نہ تو مچھلی زندہ رہ سکتی ہے اور نہ سراب اسکے واسطے دریا کا کام دے سکتا ہے۔ قدرت نے مسلمانوں کا کرہ قرآن مجید بنایا تھا ہم اس میں رہ کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں کسی دوسرے رنگ کی کوئی زندگی زندگی نہیں بلکہ ایک موت ہے"

"قل متاع الدنیا قلیل، والآخرۃ خیر لمن اتقیٰ پر عمل ہونا چاہئے۔ مغربی علوم و فنون حاصل کرکے بھی دینی اور مشرقی دوائر میں رہو۔ یہی طرز عمل حقیقی انسانیت اور شرف ہے۔ میزان قرآن مجید کے دونوں پلڑے اپنی اپنی جگہ رکھو۔ دینی پلڑا بہرحال جھکتا ہی رہے۔

باتفاق بیا، عاشقی کنیم ای دل　　خدا مراد ترا ہر کار ساختہ است"

گمان غالب بلکہ یقین کامل ہے کہ معتدل الخیال (وقلیل من عبادی الشکور) طبقہ اس مفید کتاب کو مایۂ ایمان سمجھ کر اپنا حرز بیان بنائیگا۔ پسندیدگی سے دیکھے گا۔ خوشی سے پڑھیگا۔ اور اس دُرِّ یگانہ کو اپنا آویزۂ گوش بنائیگا۔

(۴)

ترقی کا یقینی ذریعہ

"قرآن مجید سب سے ضروری اہم سب سے قیمتی ذریعہ ہماری بہتری بہبودی اور کامرانی کا ہے۔ جب تک ہم قرآن مجید سے تمسک نہ کریں جب تک ہم قرآنی کرہ میں رہ کر کوشش نہ کریں تب تک ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہماری ذلت اور درگت اسی واسطے ہو رہی ہے کہ ہم نے قرآن مجید چھوڑ دیا۔ معاملات کا پہلو درست نہ رہا۔ علوم و فنون سے بالکل بیگانہ ہو گئے۔ دائرہ قرآن مجید

صرف (رسمی) عبادت اور جنت دوزخ تک ہی محدود کر دیا۔ حالانکہ اس میں دنیا بھر کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں بعض آیات مدنظر رہیں بعض ترک کی گئیں۔ ساری دنیا کے اسباب ترقی ایک طرف اور قرآن مجید ایک طرف بار بار پڑھو پھر کھو کیا کچھ وسعت رکھتا ہے اور اس کا منشا کیا ہے قرآن الحکیم اور رسول کریم کی شان میں یہی کہتے بنتی ہے۔

زفرق تا بقدم ھر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

لیکن ہمارے اعمال و افعال کیسے ہی صحیح اعتقاد اور اعلیٰ خیال پر مبنی ہوں، توسط و اعتدال کا لحاظ ہر حال میں واجب و لازم ہے " البتہ اسی متاع قلیل کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھکر اس میں ایسے طور سے منہمک ہو جانا کہ الہیات کا پہلو ہی چھوڑ دیا جائے اور دین کا خیال ہی نہ رہے ایک سخت غلطی ہے۔ قرآن مجید علوم و فنون، حکمت و سائیس، فلسفہ صحیحہ سے روکتا نہیں بلکہ اصولی اور اجمالی رنگ میں تحریک کرتا ہے کہ ایسے حاصل کئے جائیں، بشرطیکہ غلط تعلیم و غلط تعبیر سے صحیح تہذیب و واجبی تدین پر زد نہ پڑے اور ایسے علوم کی تحصیل نمائشی اور فریب دہ نہ ہو۔ جو دنیا یا دنیوی وسائل اور ترقیات علوم و فنون رہ دین سے بے راہ کرتی ہیں وہ خسر الدنیا و الآخرہ ہیں ان سے بہتر ہے کہ انسان جاہل ہی رہے

قرآنی ہدایت متعلق مناظر قدرت

" قرآن شریف کا اہم مدعا توحید ہے مگر استدلال توحید کا اہم حصہ طبیعات ہی ہیں۔ مناظر قدرت و مظاہر فطرت کیا ہیں؟ وہی سلسلہ طبیعات جو سراسر حکمت ہے خداوند کریم اپنی وحدت و قدرت پر غور کرنے کے لئے جن دلائل سے کام لیتا ہے یہ تمام وہی ہیں جن کی طبیعات میں بحث ہوتی ہے۔ یہ تمام اشیاء وہی ہیں جو طبیعات کا موضوع ہیں "

جو مناظر قدرت و مظاہر فطرت قرآن مجید ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ کیا ہیں؟ مختلف علوم و فنون کا ایک دلآویز مجموعہ ہمارے چاروں طرف علوم ہی علوم، فنون ہی فنون ہیں جدھر دیکھو نکات ہی نکات، غوامض ہی غوامض۔ ایک کنکر سے

پہاڑ تک ، چشمہ سے سمندر تک ذرہ سے سورج تک سب ہستیاں اپنے اپنے رنگ میں منادی کر رہی ہیں کہ یہ مختلف معارف کا خزینہ اور بوقلموں مطالب کا گنجینہ ہیں۔

علوم وفنون کیا ہیں؟ علوم وفنون ان حقائق واسرار کا نام ہے جو ہمارے ارد گرد یمین و یسار فوق وتحت مختلف خلقت کی صورت میں پائے جاتے ہیں یہ تمام رفعا اور تمام کائنات علوم وفنون ہی ہیں جو ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں ان کی واقفیت ہمیں دونوں رنگوں مادی اور معادی میں نفع رساں ہے خداوند کریم خود کو قرآن مجید کو "حکیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے کیا یہ قیاس صحیح ہوگا کہ حکمت اس کے خلاف ہے یا اسلام و قرآن اس کی اجازت نہیں دیتے هٰذا بہتان عظیم"۔

فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ ایک پرانا اور سچا مقولہ ہے "کیا نعوذ باللہ خدا کی کائنات حکمت سے خالی یا محض عبث اور باطل ہے؟ خدائی کائنات عبث و باطل نہیں حق ہے ربنا ما خلقت هٰذا باطلا یعنی وہ حکمتوں اور اسرار سے پر ہے جب ہم یہ یقین کرتے اور ایمان لاتے ہیں کہ خدائی کائنات ہزاروں اسرار اور حکمتیں رکھتی ہے ایسے ایمان کی تصدیق و تکمیل یوں ہوگی کہ ان اسرار کی نسبت علمی و عملی رنگ میں تحقیق کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان سے کام لیا جائے اور اس رنگ میں مخلوق خدا کو فائدہ پہونچایا جائے"۔

حکم تدبر فی القرآن

"سائنس کیا چیز ہے؟ اشیاء کے باہمی تعلقات، تاثرات، تدبر و تفکر اور اُن کے آثار و نتائج ہی کا تو نام ہے خدا نے ایک طرف ہمیں مختلف قوتیں دیں دوسری طرف ہمارے ارد گرد بساط کائنات بچھا دی، پھر ہمیں آگاہ بھی کر دیا کہ میری نشانیوں اور قدرتوں کی بابت تدبر و تفکر سے کام لو تو بیسیوں آیتوں میں تدبر و تفکر کی بابت زور دیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے حقائق و اسرار ایسے بیان ہوئے ہیں جو تدبر و تفکر کے بغیر

واضح نہیں ہوسکتے۔ بار بار قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ آسمان و زمین ہوا پانی، دریا پہاڑ نباتات وحیوانات کی نسبت غور و فکر کرو تو مدعا یہی ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ سرسری اور عامیانہ نہیں بلکہ گہری نظر سے اور اپنی علم و عقل کے موافق محققانہ کرو۔ قرآن کا خطاب اس قوم سے ہے جو یقین و ایمان کے ساتھ ذکر و فکر اور علم و عقل بھی رکھتی ہو"

ممکن ہے موافق و مخالف طبقات میں یہ گمان و سوال کیا جائے کہ قرآن مجید میں سائنس کی تفصیل کسی موقعہ پر کی گئی ہے بے شبہ پروفیسر علامہ عبدالعزیز شاوِش مصری کا یہ ریمارک ایک حد تک صحیح اور معنی خیز ہے "کوئی علم ایسا نہیں جو قرآن میں نہ ہو گویا قرآن میں جغرافیہ، تاریخ، طبعی، ریاضی، ہیئت، کیمیا وغیرہ سب کچھ موجود ہے! کہاں تو دل قرآن کی اغراض اور کہاں یہ رطب و یابس غیر ضروری مباحث!" لیکن لائق مصنف کا یہ دعوی نہیں کہ فلاں فلاں علم و فنون کی قرآن مجید میں تفصیل کی گئی ہے یا علوم و فنون کا کوئی نقشہ اور جدول کھینچی گئی ہے بلکہ یہ کہ قرآن مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلاں فلاں (عملی اور مفید) علوم و فنون کی بابت اجمالاً اشارہ کرتا یا ان پر غور کرنے کی اصولی رنگ میں اجازت دیتا ہے۔"

وسعت قرآن قرآن مجید اصولی و اجمالی رنگ میں ایک ایسا بے نظیر مجموعہ ہے جو اپنے ماننے اور چاہنے والوں کے لئے ہر قسم کا مادہ دینی و دنیوی بطور احسن مہیا کرنے کا کفیل ہوتا ہے رطب و یابس یعنی روحانیات و مادیات بالفاظ دیگر دینی و دنیوی ضروریات کا اصولاً و اجمالاً صحیفہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔"

مختلف و متعدد آیات سے ثابت ہے کہ "قرآن مجید علاوہ روحانیات و دینیات کے بہ رنگ اصولی و پیرایہ اجمالی ان امور و اغراض کی جانب بھی توجہ دلاتا ہے، جو انسان کی مادی زندگی کے واسطے لازمی اور جن پر انسانی تمدن انسانی بہبود اور اقتصادیات کا بہت کچھ مدار ہے جن کے بغیر انسان مادی رنگ میں ان فضائل تک نہیں پہنچ سکتا جو

صرف اس کی زندگی ہی کا نہیں بلکہ انسانیت کا بھی زیور و جوہر ہیں!!

قرآن مجید فلسفہ صحیحہ حکمت و سائنس علوم و فنون سے روکتا نہیں بلکہ اصولی و اجمالی رنگ میں تمام ضروری اور سود مند علوم کے حصوں کی موکد طور پر تحریک و تائید کرتا ہے علم مطلق اور علوم مفیدہ کی ترغیب و تحریص سے اس کی تعلیم لبریز ہے اور ایسا کیونکر نہ ہو علم کی اہمیت کا تقاضہ ہی یہ تھا علم کی عظمت و منفعت ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے۔

ترا علم در دین و دنیا تمام　　　که کار تو از علم گیرد نظام

(۵)

مدعاء قرآن لاریب قرآن مجید عرفی معنوں میں سائنس کا "مخزن" یعنی کورس نہیں ہے نہ اس کو عین فلسفہ ہونے کا فخر حاصل ہے بلکہ وہ تزکیہ نفس اور معادی اصلاح کا مکمل لاثانی دستور العمل ہے لیکن وہ آدم زاد کو فرشتہ نہیں بنانا چاہتا بلکہ ان سے بڑھ کر بہترین مخلوق انسان بنانا چاہتا ہے دنیا سے کنارہ کشی او بے تعلقی کو اس نے جائز نہیں رکھا لا رھبانیت فی الاسلام دنیا ہی کو مزرعة الآ قرار دیا ہے اور ربنا آتنا فی الدنیا حسنہ کو مقدم رکھا ہے جب کہ ایک وقت خاص تک ہمیں اس دنیا میں رہنا ضرور ہے ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین اور صرف یہی ایک موقعہ اور مقام ہے جہاں ہم توشۂ عاقبت اور زاد آخرت حاصل کر سکتے ہیں تو ہم جیتے جی اس زندگی میں دنیا سے کیونکر بے تعلق رہ سکتے ہیں۔

دین و دنیا عام طور پر دنیا سے بے تعلقی، تقدس کی انتہائی چار دیواری سمجھی جاتی ہے "لیکن واقعہ یہ ہے دنیا کو مکروہ و مغضوب سمجھنے پر بھی ہم دنیا سے نکل سکے نہ ہمیں رہائی ملی۔ اگر مختلف وسائل زندگی سے کام لینے اور مختلف تعلقات کے نباہنے کا نام دنیا ہے تو ہمیں باوجود کراہت و نفرت کے بھی کوئی ایسی سبیل نہیں دکھائی دیتی کہ ہم اس مخمصہ سے رہائی پا سکیں۔ مگر اس سے زیادہ کیا شکر گزاری ہوگی

کہ ہم ہیں اس دنیا میں۔ وہی ہمارا اوڑھنا بچھونا بھی ہو، اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہ گذرے اور ساتھ ہی ساتھ مذمت بھی کرتے جاویں۔ قرآن کی تعلیم ہمیں حسن دنیا وحسن آخرت دونوں کی تعلیم دیتی ہے کہ عابدین وصالحین کو وراثت زمین وخلافت ارض کا وعدہ کرتی ہے مذمت جس کی کی گئی ہے وہ صرف یہ دنیا ہے ع

چیست دنیا از خدا غافل بُدن؟

پس خودداری اور غیرت ملی کے ساتھ دنیا میں رہنا اور دنیا کا طالب ہونا نہ تو ممنوع ہے اور نہ غیر مشروع "بلکہ عین دینداری ہے یہ تو مسلمہ ہے کہ حقوق العباد دین کا اہم جزو اور مقدم حصہ ہے اور عباد سے رابطہ دنیا ہی سے واسطہ ہے۔

"جس طرح روح اور جسم میں ایک وابستگی ہے، اسی طرح دین و دنیا میں ایک نسبت ہے۔ اگر بدن کے بغیر روح اس زندگی میں کام کر سکتی ہے، تو دین بھی مادیات کے بغیر چل سکتا ہے۔ اگر روح بدن کے بغیر نہیں ٹھیر سکتی تو دین بھی نہیں چل سکتا۔ قرآن ایک عظیم الشان انسان کی معرفت ان انسانوں کے لئے نازل ہوا ہے جو اسی دنیا اور ماحول میں رہتے ہیں لا رھبانیۃ فی الاسلام اور الدنیا مزرعۃ الاخرہ سنا کر تقدس مآب نے فیصلہ کر دیا کہ مسلمانوں کے واسطے جس طرح معاد کی ضرورت ہے ایسے ہی مادیات کی ضرورت ہے۔ جب کبھی آنحضرت صلعم کو مدافعت کی ضرورت پڑی تو ادعیہ اور صبر کے ساتھ وہ تدابیر اور اسباب بھی اختیار کئے گئے جو محض مادی تھے اسی طرح اصحاب کبار کا بھی یہی طرز عمل رہا۔"

انسانی بزرگی و ذمہ وری

کرمت انسانی کا خاص سبب خلافت الٰہی کی تاجپوشی ہے" اس کائنات میں ہر ایک ہستی اپنی فطرت وطاقت رکھتی ہے لیکن ان سب میں صرف ہم ہی ایک ایسی ہستی ہیں جو خود اپنے اثر سے بھی کام لیتے ہیں اور تمام ہستیوں سے بھی علی قدر مراتب کام لے سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں

توہم کفران نعمت کے ملزم ہیں۔ ہمیں جو مختلف قوتیں دی گئی ہیں ان کا منشا ہی یہ ہے کہ ہم خدا کی رنگا رنگ مخلوق سے کام لیں اور خدا کی حکمت کے اسرار پر روشنی ڈالیں۔ تھوڑا تفکر و تدبر بڑی عبادت سے بھی زیادہ افضل و بابرکت ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف دنیوی فوائد ہی حاصل ہوتے ہیں بلکہ خالق اکبر اور قادر کامل کی ہستی پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور انسان علمی رنگ میں وجود باری وحدانیت الٰہی اور قدرت خداوندی پر گواہی دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب زمین و آسمان ہمارے ہی لئے پیدا کئے گئے ہیں، انکی خوبیوں سے غافل رہنا اور درجہ بدرجہ دینی و مادی پہلو سے کام میں نہ لانا سخت لاپروائی و ناشکر گزاری ہے۔ مناظر قدرت مظاہر فطرت کی تحریک و تبلیغ اصولی و اجمالی ہے۔ انسان کو ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی انہی قوتوں سے کام لے کر اسرار مکتومہ و امور مستترہ پر روشنی ڈالے اور حتی الوسع انہیں کام میں لائے۔"

(۶)

طبقہ علما و علوم جدیدہ علوم جدیدہ کے متعلق علما کرام کی وحشت و نفرت کی شکایت و شکوہ ایک مسلمہ واقعہ ہے مگر بظاہر ان پر الزام عائد نہیں ہوتا کیونکہ نائبان رسول اپنے منصبی فرائض کے اقتضا سے ہر ایسے امر کی مخالفت کرنے کے لئے مجبور ہیں جو دین کو کمزور یا مضمحل کرنے والا ہو۔ لایق مصنف کو یورپ کی مادیت اور جدید تعلیم کے ملحدانہ نتائج سے انکار نہیں ہے۔ اگر اس صداقت کا اعتراف نہ بھی کیا جائے تب بھی عیاں را چہ بیاں کا ابطال کب ممکن ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ راس الحکما ہربرٹ سپنسر کی تصدیق موجود ہے "اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سا سائنس جو رائج ہے اس میں لامذہبی کی روح غالب ہے مگر نہ اس سچے سائنس میں جو سطح سے گزر کر تہ تک پہنچ گیا ہے" سچا سائنس تو درکنار، ہندوستان میں ہنوز علمی اصطلاحات کی واقفیت نے بھی عمومیت و قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کیا۔

علوم قدیمہ کے متعلق علما کا دیرینہ شغف ظاہر ہے وہ بھی اجنبی اور کافروں کے علوم ہیں مگر اصل وجہ اس کی یہ ہے "چونکہ شق معادی مقدم تھی اس واسطے اسلامی دنیا کا پہلا اور مقدم مطمح نظر بھی شق رہی اور اسی پر زور دیا جاتا ہے اور اسے مقدم رکھکر دوسری شق اسکے تحت کر دی گئی اور ایسی تقسیم کچھ بیجا نہ تھی کیونکہ وجدانیات بہر صورت افضل و مقدم ہیں معاد مقدم ہے اور معاشی امور موخر" یہ تو گزشتہ کیفیت ہی اب موجودہ حالت کیا ہے ؟ گزشتہ تعلیم صرف زبان و علم کے اکتساب کا وسیلہ تھی موجودہ تعلیم بالعموم تمدن و معاشرت حتی کہ زندگی اور سیرت ہی کی قلب ماہیت کر دیتی ہے۔

بے شبہ یہ مان لیا جائیگا کہ اس میں "سائنس و فلسفہ کا کچھ قصور نہیں یہ تو تربیت اور نصاب تعلیم کا قصور ہے۔ اگر غذاؤں کا صحیح و معتدل استعمال نہ کیا جائے تو یہ چیزیں بھی مضر ثابت ہوتی ہیں اگر کوئی برے استعمال سے ماؤف ہو جائے تو کیا میوہ جات یا اغذیہ کو چھوڑ دیا جائیگا۔ حکمت ہر حالت میں حکمت ہے۔ موتی بعض کے پاس عزت پاکر آویزہ گوش ہوتا ہے اور بعض کے گھروں میں بے قدری کی وجہ سے بے آب ہو جاتا ہے" یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ طریق تربیت اور نصاب تعلیم اس مضر اثر کا زیادہ تر ذمہ دار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس نقص کی اصلاح بھی تو ہمارے حیطۂ اقتدار اور دائرہ اختیار سے بہت کچھ خارج ہی الصحبت موثر کا علاج ہم سے ممکن نہیں پس کیا ایسی حالت میں لائق مصنف کے الفاظ میں یہ کہنا صحیح نہ ہوگا "جو دنیا یا دنیوی وسائل اور ترقیات علوم و فنون رہ دین سے بے راہ کرتی ہیں وہ خسر الدنیا والآخرہ ہیں ان سے بہتر ہے کہ انسان جاہل ہی رہے" پس ایسی صورت میں مقدس علمائے کرام پر کیونکر کوئی حرف آسکتا ہے اگر وہ بہر گش بگیرتا بہ تپ راضی شود کی عاقلانہ تدبیر کو عمل میں لانا روا رکھتے ہیں یا ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس دانائی میں ایک غلطی مضمر ہے بصیرت سے بہرہ ور اہل نظر کو اس کے تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوگا۔

علما کے فرائض

سائنس ضروری ہے اور اس کا اکتساب واجب بعینہٖ جیسے غذا لازمی ہے اور اس سے اجتناب ناممکن لیکن جب بیمار کی حالت نازک ہو اور نقصان جان کا اندیشہ قوی تب طبیب کا فرض ہے کہ صرف نسخہ بنا کر الگ نہ ہو جائے بلکہ انہماک کے ساتھ اپنے خاص اہتمام سے کام لے۔ مخلص علما کا برگزیدہ طبقہ پیشہ ور اطبا کی مانند نہ ہونا چاہیئے مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ کوئی مرے یا جیئے۔ روحانی علاج کے مہتمم و منتظم ہونے کی حیثیت میں وہ مخلصانہ نگرانی اور شفیقانہ تیمارداری کے کافی وسائل مہیا کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں۔ بالفاظ دیگر جدید تعلیم کا طوفان خواہ سودمندی کا اثر لئے ہوئے ہو یا بربادی کا ثمرہ رکھتا ہو کسی کے روکے رُکنے والا نہیں ہے الناس علیٰ دین ملوکھم اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو منہ چھپا کر حجرہ شریف میں لعنت اللہ پڑھا کیجیے اور قوم کو موت کے بھنور میں جانیکا تماشہ دیکھیے ورنہ میدان میں آ کر کوئی چارہ کار سوچیے اور تدبیر مناسب کو عمل میں لائیے اگر "خشت اول" کے وقت یہ احساس ہوتا تو آج رنگ ہی دوسرا ہوتا علمائے کرام نے تعلیم کو کما حقہ اور من کل الوجوہ اپنے مبارک ہاتھ میں لیا ہوتا تو ہمارا یہ نقشہ نہ ہوتا مضیٰ ما مضیٰ گزشتہ نصف صدی کا کارنامہ اہل بصیرت کی سبق آموزی کے لئے کافی تجربہ ہے۔

سبق آموز پیشین گوئی

ڈاکٹر سیزنگر مشہور مستشرق نے جو پیشین گوئی ۴۰ سال قبل کی تھی وہ حرف بحرف سے زیادہ پوری ہو چکی "میں اس امر کے دُہرانے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اگر خرابیوں کو رفع نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ وہ وقت آ جائے جب ان کی نسبت ضربت علیھم الذلت والمسکنۃ کہنا پڑے۔ آپ یقین رکھئے اگر اسلام کے بہی خواہ متحد نہ ہونگے اور اصلاحات جاری نہ کرینگے تو ایشیا اور افریقہ میں سوائے صحرائے عرب کے کوئی ملک ایسا نہ رہیگا جسے مسلمان اپنا ملک کہہ سکیں چپہ چپہ زمین پر انگریز روسی اور فرانسیسی قابض ہو جائیں گے

اور مسلمانوں کی حیثیت مثل اہل الذمہ کی رہ جائیگی" مقدس علمائے کرام کے لیے کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ وہ ایک مخلص فاضل کی زرین نصیحت کو اپنا آویزۂ گوش بنائیں۔

علما کا اوّلین فرض

"علمائے اسلام کے تدین وخلوص کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ ان خرابیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور کفار پر لعنت اللہ علی الکافرین بھیج کر چپ ہو رہیں عالم اسلامی میں جس قدر خرابیاں ہیں وہ سب تعلیم کے بے ڈھنگے طریقہ کی وجہ سے ہیں مسلمان علما کو بہت سخت محنت کرنی چاہیئے اور لازم ہے کہ وہ تقریباً ساری عمر اس میں صرف کردیں کہ وہ امتیاز و وقعت حاصل کریں کیونکہ دنیا میں بمقابلہ کسی اور کے وہ زیادہ تر ملح الارض ہیں عام لوگ انہی کی ہدایت پر چلتے ہیں" (سپیر نگر)

لکھائی، چھپائی، بہت عمدہ۔ یہ ضخیم وجحیم کتاب لائق مصنف سے قادیان پنجاب کے پتہ سے مل سکتی ہے قیمت معلوم نہیں۔

اصلاح تمدن

نمبر ۲

بندہ شکم کسی شہر میں گھوم کر بغور دیکھیے کہ انسانوں کا جھگٹا کہاں زیادہ ہوتا ہے
میوہ اور سبزی فروشوں کی دکانوں پر دیکھیے کیا بھیڑ لگی ہے گوشت اور مٹھائی کے نخاسوں میں
وہ ہجوم ہے کہ مکھیاں بھی شرماتی ہیں۔ سبزی کی منڈی میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے آرائشیات
و تکلفات کے بازاروں میں پیدل اور سوار دریا کی طرح بہ رہے ہیں۔ غرضکہ جہاں خوردنی
اور نفسانی لذت کی چیزیں ملتی ہیں وہیں یہ بندگان شکم ٹوٹ کے گرتے ہیں۔ وجہ صاف
ظاہر۔ حیوانوں کی طرح ہر وقت علف زار کے پیچھے رہنا اور نفس کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ
ڈالنا ایسی عادتیں نہیں جو چھوٹ نہ جائیں بشرطیکہ انسان صرف فطری تقاضا پورا کرنے کا
عادی ہو۔ یعنی جب بھوک لگی روٹی کھالی اور جب پیٹ بھر گیا تو کھانے کا خیال چھوڑ دیا
لیکن اگر اس کے خلاف کوئی شخص کھانے کا عاشق بن جائے تو ظاہر ہے کہ نہ کبھی کھانا
ختم ہوگا اور نہ پیٹ بھریگا جیسے کہ ہمارے زمانہ کا حال کہ عالم۔ جاہل۔ شائستہ اور کودن
سب کے سب ہر وقت ہاتھ دہو کر کھانے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اشتہا اور سیری
دونوں کی ایک حد ہے مگر عیاشی کی کوئی حد نہیں۔ اگر پیٹ خالی ہے تو روٹی شوربا دال
چاول سے حسب ضرورت بھر جائیگا لیکن اگر کھانے کا شوق ہے تو کبھی سیری حاصل نہیں ہوسکتی
بھوک کے لیے معمولاً روٹی ایک ناگزیر ضرورت اور کافی خوراک ہے لاکھوں کروڑوں
آدمی اسی پر بسر کرتے ہیں اور ہمارے بندہ شکم سے زیادہ قوی ہیکل اور تنومند ہیں انکی
سرخ۔ سپید رنگت دیکھکر رشک آتا ہے اون کی محنت مشقت کا یہ حال ہے کہ اٹھارہ اٹھارہ
گھنٹہ کوہ کنی کرتے ہیں اور رات کو جس وقت ہم نیند کی آرزو میں گدگدے بچھونے پر
کروٹیں بدلا کرتے ہیں وہ کھری چارپائی پر خراٹے لیا کرتے ہیں۔ یہ سب معمولاً دال روٹی

یا شوربہ سے پیٹ بھرتے ہیں مگر ہم زبان کا چٹخارہ ڈھونڈھتے ہیں اور اپنی حد سے اس
طرح بڑھنا شروع کرتے ہیں کہ روٹی کے ساتھ کوئی چٹ پٹی چیز بھی ہو تو اچھا ہے۔ تھوڑا
سا گوشت کا آب جوش ہو۔ کسی خوشبودار چیز میں بگھری ہوئی یخنی ہو تو خوب مزا آئیگا
اس میں تھوڑی سی دہی بھی ملجانی چاہیئے۔ سادہ گوشت میں مزا نہیں آتا کوئی ترکاری
ضرور ہونی چاہیئے اور پھر ایک کیا کئی ترکاریاں ہوں تو اچھا ہے سب ملانے سے تو
خوگیر ہوجائیگا ترکاریاں الگ الگ ہونی چاہئیں۔ پھر اگر ایک قاب مچھلی کی بھی ہو تو
بڑا لطف ہوگا۔ مگر مچھلی پکی ہوئی نہ ہو بلکہ آگ پر سکی ہوئی ہو۔ خالی مچھلی میں کچھ بسا ند
آتی ہے تھوڑا سا مکھن لگا کر کباب کی طرح سکے تو خوشبودار ہوگی مچھلی بھی کئی قسم کی ہوتی
ہے جس میں صرف ایک کانٹا ہو وہ بہتر ہے گوشت کی ڈلیاں بھی پچپلی اچھی نہیں ہوتیں۔
سالم دست ہو تو کیا کہنا ہے۔ گردنا بھی ہو تو کچھ برا نہیں۔ اسکے ساتھ ہی ترکاری
ہونی چاہیئے شاید جلد ہضم نہو تھوڑی ولایتی رائی ڈالدیں تو اچھا ہے۔ سادہ پانی سے
گوشت ہضم نہیں ہوتا۔ کسی قسم کا کشیدہ آب ہو (لال لال رنگ ہو تو مضائقہ نہیں) تو
لطف دوبالا ہوجائیگا۔ اتنا کہکر بندۂ شکم فرمائش کی فہرست ختم کردیتا ہے گویا اسے
اب اور کچھ نہیں چاہیئے تمام لذتیں ختم ہوگئیں مگر پھر کچھ خیال آتا ہے اور چاہتا ہے کہ
ایک قاب میٹھے کی ضرور ہونی چاہیئے۔ گرمی میں بالائی کے برف کی فرمائشی قفلیاں
جاڑے میں مربے جن کی بیسیوں قسمیں ہیں۔ دسترخوان کی زیب زینت ہوتی ہیں۔ ظاہر
ہے کہ جب دسترخوان یہاں تک بڑھا تو اور بھی بڑھ سکتا ہے اور بڑھنے کی کوئی حد نہیں
کھانے سے پہلے قہوہ اور کافی کے دور پیپر منٹ، اجوائن وغیرہ ہاضم ادویہ کی میٹھی
ٹکیاں۔ بیچ میں طرح طرح کی لذیذ طشتریاں۔ تبدیل ذائقہ کے طور پر پیش ہوتی رہتی
ہیں۔ تمام میز دولھن کی طرح سجی ہے۔ کمرہ کے باہر قسم قسم کے باجے بجتے ہیں۔ کھانے
کے بعد ناچ شروع ہوتا ہے اور ہمارے ابلہ فریب احباب ناچ ناچ کر اون مقوی

غذاؤں کے ہضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ میزبان کا گھر چھوڑنے سے پہلے چند تر لقمے اور اڑاتے جائیں۔

معزز مہمانوں میں کم سے کم پچانوے فی صدی وہ بزرگ ہیں جو دنیا کو اخلاق حمیدہ کا سبق دیتے ہیں اپنے آپ کو اعلیٰ اخلاق کا نمونہ اور فضائل انسانیہ کا مجسمہ تصور کرتے ہیں۔ مگر دل کے پوشیدہ گوشوں میں اصلی عقائد سخت ترین عیوب کی طرح چھپائے ہوئے ہیں۔ جس کو ایک پادری صاحب نے ایک دفعہ فخراً ان لفظوں میں ظاہر کیا تھا۔ "ہم فقر و فاقہ کرنے اور بھوکے پیاسے مرنے کے عیسائی نہیں ہیں بلکہ بیف اور مٹن خور عیسائی ہیں" مگر ہماری سوسائٹی کا حال اس سے بدتر ہے وہ فقر فاقہ اور روزہ داری ہی سے متنفر نہیں بلکہ اس طرح کے نفس کش آدمی کو کمال نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حقیقت میں نیک بننا چاہتا ہے تو محض یہ خیال کر لینے سے کہ میں نیک ہوں نہیں ہو سکتا بلکہ نیکی کی بلندی تک پہونچنے کا ایک زینہ ہے اول اوس کو قدم بقدم طے کرنا چاہیئے پہلی سیڑھی ضبط نفس اور نفس کشی ہے مگر یہ ہی بجائے خود ایک بلند مقام ہے جہاں جانک نہیں پہونچ سکتے ہیں اکثر حاجات زندگی میں ضبط نفس کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ مثلاً اول زبان کے چٹخارہ ہی کو چھوڑنا چاہیئے۔ تیز نمک کھانے والے کو لازم ہے دو ہفتہ تک نمک کھانا بالکل ترک کردے اور پھر ذرا ذرا سا بڑھا کر درجہ اعتدال پر لائے۔ اسی طرح پیٹو آدمی کو چاہیئے کہ فاقہ کشی اختیار کرے اور سادہ غذا سے شروع کرکے آہستہ آہستہ بڑھے اس میں ترک لذات لازمی ہے یہ ضبط نفس کی بسم اللہ ہے۔ تمام اخلاقی ذمائم انہیں لذتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان ہی کے پیچھے لوگ سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

لذیذ اور مرغن کھانے انسان کو نیکی سے فرسنگوں دور رکھتے ہیں۔ جو شخص اپنے اور دوسرے کے دسترخوان پر بیٹھکر بیش بہا اور مرغن کھانوں کے ذریعہ سے سب کچھ خود

کھا ڈالے وہ غیروں سے کیا سلوک کر سکتا ہے۔ اور اگر ازپا اُفتادہ کی دستگیری اور درماندہ سے حسن سلوک کرنا نیکی نہیں تو اور نیکی کیا چیز ہے۔ بندۂ شکم شاید ابلہ فریبی سے نادان بنا چاہتا ہے مگر حقیقت میں خوب جانتا ہے کہ اوس کی بسیار خواری نے کس قدر مجبور آدمیوں کو پیٹ بھر روٹی سے محروم کیا۔ جو ایک فعل بد ہے نہ کہ نیک اگر انسان کی زندگی بالکل سادہ ہو اوسے جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی دلجمعی حاصل ہے۔ تکلفات اور آرائشات کا بار بالکل نہیں رہتا اور ہزارہا آدمی بارکشی سے بچ جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر وہ بھی محنت کاروں اور جفاکشوں کی سی زندگی بسر کرے تو اوس کی انسانیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی بلکہ برعکس وہ اس طبقہ میں مقبول عام ہو جائیگا۔ آہ اے عیش وعشرت سے زندگی بسر کرنے والو تم جو سیکڑوں محنت کشوں کی شبانہ روز محنت کا پھل ذراسی دیر میں کھا جاتے ہو اور نہیں جانتے کہ غربا نے تمہارے نفس کو خوش کرنے کے لئے کیا کیا مصیبتیں اوٹھائیں۔ یاس وناامیدی نکبت اور جہالت۔ تباہی۔ سیاہ کاری۔ وحشت نے اونہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے مگر وہ اپنے پیٹ کو نہایت موٹی غذا سے بھرنے کی غرض سے تمہاری بیجا خواہشات کو دن رات پورا کرتے رہتے ہیں۔

طفیل احمد

مراسلات

عہد قدیم کا طریقہ تعلیم

جس طرح فلسفہ، اخلاقیات، ہندسہ، نجوم اور ادب میں یونان دنیا کا سرتاج ہے، اسی طرح یہی وہ مردم خیز خطہ تھا جہاں باقاعدہ تعلیم و تربیت کی اولین جھلک نمودار ہوئی اُس زمانہ قدیم میں جب دنیا کا گوشہ گوشہ جہالت اور وحشت کا ذریعہ بنا ہوا تھا، اور ہر چہار اطراف عالم پر ادبار اور فلاکت کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں یونان ہی وہ مقدس سرزمین تھی جہاں علوم و فنون کا آفتاب چمکا، اور اقوام عالم کو خیرہ کرنے لگا، اس ارض مطہر کے چپہ چپہ پر مدنیت کے اعلیٰ نمونے موجود تھے، اور اس کے کوچہ و برزن میں شعرا اور فلسفیوں کا اژدہام رہا کرتا تھا، ایتھنز اسی شاداب اور سرسبز ملک کا ایک خوبصورت شہر تھا جس کے دلکش مرغزاروں میں تہذیب و تمدن کے چشمے بہتے تھے، کریٹ اسی خطہ کی آزاد ریاست تھی جس کی آب و ہوا میں علم و حکمت کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، اور دنیا کے اسی حصہ میں اسپارٹا واقع تھا جہاں شجاعت و بہادری، جرات و مردانگی کے مجسمے نظر آتے تھے اور جس کی دلیری اور جفاکشی کا لوہا کل دنیا نے مان لیا تھا۔

ان وجوہ کی بنا پر اور ان حالات کے اثر سے یہاں تعلیم و تربیت کے ایسے مستقل اور دیرپا نظام طیار کئے گئے جو مدتوں تک ممالک قریبہ کی راہبری کرتے رہے، فلسفی ان حقائق اور رموز کی جستجو میں مشغول رہتے جنکی بنا پر فطرت انسانی کمال حاصل کرتی اور مشیرانِ سلطنت اُن تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے جو

ترقی تعلیم و تربیت کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہیں۔

ایتھنز اور اسپارٹا گو متصل ہونے کی وجہ سے ایک ہی آئین حکومت اور ایک ہی طرز معاشرت پر کاربند تھیں، لیکن نظام تعلیم و تربیت میں زمین آسمان کا فرق تھا، گو ایتھنز میں جسمانی نشو و نما کو نظر انداز نہیں کرتے تھے لیکن دماغی اور ذہنی تکمیل پر خاص زور دیتے تھے، اور اسی کو زندگی کا مقصد اولین تصور کرتے تھے، تقریر کرنا، مباحثہ کرنا، اور ہر محفل اور ہر جلسہ میں رنگ جما لینا اس سرزمین کی اولین خصوصیت تھی، فصاحت و بلاغت کو اسی شہر کے ناخداؤں نے آسمان پر چڑھا یا تھا، اور اسی خطہ نے ادبیات، اخلاقیات اور فلسفی کے وہ بیش بہا اور گرانقدر جواہر پیدا کئے جو اب تک افق عالم پر نیر اعظم کی طرح روشن ہیں، اسکے برخلاف اسپارٹا کا نظام تعلیم اس سے بالکل مختلف تہا، وہاں "زبان دہن" کی بجائے "زبان شمشیر" کی سیوا ہوتی تھی، اور "نوک قلم" کے بجائے "نوک خنجر" کو پوجا جاتا تھا، ایتھینس میں منطقی دلائل و براہین کے گورکھ دھندوں سے عہدہ برآ ہونا ایک لائق فخر و نازش کارنامہ تصور کیا جاتا تھا لیکن اسپارٹا میں ہوا و ہوس کے جکڑ دینے والے پھندوں سے مردانہ وار رہائی حاصل کرنا تہذیب و تمدن کا جزو اعظم تہا

اسپارٹا اور کریٹ

اسپارٹا کے باشندے بالعموم نہایت اطمینان اور فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے، اور کسی ہنر یا پیشہ، یا کاروبار میں حصہ نہ لیتے تھے، انکو روپیہ پیدا کرنیکی مطلق ضرورت نہ تھی، اور نہ دیگر دنیاوی تردداث اور تفکرات میں مبتلا ہونیکی حاجت، غلاموں کی ایک فوج انکی خدمت کیلئے ہر وقت کمربستہ رہتی تھی، اور ایک مستقل آمدنی ان کے اخراجات کے لئے کافی ہوتی تھی، چنانچہ خالی وقت میں دنیا کے یہ خوش نصیب باشندے اپنے بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، اور اسپارٹا کی خصوصیات اور روایات کو ان کے ذہن نشین کرتے تہے تاکہ آئندہ چلکر وہ اپنی ریاست کے ایک مفید اور کارآمد فرد بن سکیں اور اور ان کے دماغ اور اخلاق ان خصوصیات سے بہی نہوں جو اسپارٹا کے باشندوں کا ایک محبوب خزانہ تھا۔

علاوہ ازیں ان کا وقت ورزش، فوجی کرتب، سیر، شکار میں صرف ہوتا تھا اور شام کو وہ مختلف کلبوں میں جایا کرتے تھے جہاں خوش گپی کے علاوہ اور کام کی بات کی مطلق اجازت نہ تھی، اسپارٹا کے باشندے بالعموم سنجیدہ اور متین ہوتے تھے۔ اور جدت اور ندرت کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اسپارٹا کا ہر باشندہ دراصل ایک مشین کا پرزہ تھا اور اپنے فرائض کو اسی صحت اور پابندی سے ادا کرتا تھا،

دنیا کی اس عجیب و غریب ریاست میں اس امر کی ضرورت تھی کہ اس کا ہر باشندہ اس سرزمین کے مخصوص روایات اور خصوصیات سے کماحقہ واقف ہو، اور حقیقی معنوں میں اسپارٹن ہو۔ اس لئے بچوں کی ابتدائی تعلیم نہایت اہم ضروری سمجھی جاتی تھی، اور سلطنت کی جانب سے اس شعبہ کا انتظام و انصرام ہوتا تھا، اسپارٹا میں ہر باشندے کے لئے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا ذلیل تعلیم کا نصاب ایک ہی تھا، حالانکہ ایتھنز میں امرا اور غربا میں امتیاز کیا جاتا تھا، بچے گھروں سے جدا کرکے بورڈنگ کی عمارتوں میں رکھے جاتے تھے تاکہ اُن کی ذاتی اور خاندانی خصوصیات اُن سے دور ہو جائیں اور اُنکی نگاہوں کے سامنے صرف اسپارٹا کا ایک ایسا آئیڈیل (بلند نمونہ) موجود ہو جس میں تمام ملکی خصوصیات پائی جائیں، یہ عام طور سے دیکھا جاتا تھا کہ بورڈنگ ہاؤس میں لڑکوں پر ایک ہی اثرات پڑتے ہیں، اس لئے ان کے اخلاق اور عادت میں بہت کچھ مشابہت موجود ہوتی تھی، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسپارٹا میں کمزور، لاغر اور ناتواں بچوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی جاتی تھی اور انکو نہایت بیدردی سے مرنے دیا جاتا تھا، "ہماری ریاست میں کمزور اور ناتواں افراد کی مطلق گنجایش نہیں ہے" یہ ایک مشہور اسپارٹن مدبر کا مقولہ ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ اس پر ہمیشہ سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا، اسپارٹا کی عورتیں بچے پالنے میں نہایت چابکدست اور کامیاب ثابت ہوئی ہیں، اور اس ملک کی نصف سے زائد فلاح و بہبودی کا انحصار صنف نازک پر تھا جو اپنے فرائض نہایت تندہی سے ادا کرتی تھیں۔

اس جگہ یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسپارٹا میں بالعموم اور مدرسوں میں بالخصوص ڈیسپلن کا خاص لحاظ کیا جاتا تھا، اور جن امور کی آج طلباء کو اجازت ہے وہ عہد قدیم میں اُس سے محروم تھے، اسکی خاص وجہ یہی ہے کہ وہاں سپاہیانہ عادات سوسائٹی کے ہر طبقہ میں موجود تھیں شہر کے ہر گلی اور کوچہ سے طلبا ننگے سر اور ننگے پاؤں نکل آتے، بارش یا برفباری کی مطلق پروا نکرتے، اور اپنی درسگاہ کی جانب ایک فوجی ترتیب کے ساتھ پیشقدمی کرنے لگتے، درجوں میں پہونچکر خاموشی اور عاجزی سے بیٹھ جاتے، ہر طرف گہری خاموشی طاری رہتی، اور کوئی طالب علم گستاخی کرنا تو درکنار کرخت آواز سے بھی نہ بول سکتا تھا۔

سات برس کی عمر تک بچے گھر پر رہتے تھے، گو یا وہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ شام کیوقت کلب میں چلے جایا کرتے تھے، لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ گھر ہی پر رہتیں اور اسی جگہ کھانا کھایا کرتی تھیں کیونکہ عورتوں کو کلب میں شرکت کی اجازت نہ تھی، اور نہ ان کے کلب علیحدہ ہوا کرتے تھے، یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ دراصل یہی کلب ان بچوں کے لئے اولین درسگاہ کا کام دیا کرتے تھے، کیونکہ یہاں وہ اپنے بزرگوں اور بڑوسیوں کے جنگی کارنامے اور جفاکشی کے افسانے سنتے تھے، اور اُن روایات اور خیالات سے بہرہ اندوز ہوتے تھے جو اہل اسپارٹا کی نمایاں خصوصیات تھیں،

سات برس کی عمر میں بچے مدارس اور بورڈنگ ہاؤس میں جاتے، اور وہاں اُن کو چند مرتب جماعتوں میں منقسیم کیا جاتا تھا ہر جماعت کے افراد ایک جگہہ کھاتے، ایک جگہہ سوتے، ایک جگہہ پڑہتے اور ایک جگہہ کھیلتے تھے، انکا لباس یکساں ہوتا تہا، اور اُنکی زندگی راہبانہ ہوتی تھی حتی کہ سونے کیلئے انکو گہاس پہوس کا بستر دیا جاتا تہا، جماعت کا سب سے ہوشمند اور دلیر لڑکا سردار بنایا جاتا تہا جو سب پر حکومت کرتا تہا، اور سزائیں دیتا تہا، لڑکونکی ہمت اور دلیری کا جائزہ لینے کے لئے ان میں لڑائی شروع کرا دی جاتی تھی، اور دیکہا جاتا تھا کہ یہ لڑکے کس پیمانہ کی جسارت اور مردانگی سے کام لے رہے ہیں، جماعت کا وہ لڑکا

جو جت اور اخلاق میں سب سے ممتاز ہوتا تہا، ایرن کہلاتا تھا اور اس کی اطاعت سب پر فرض تھی، چنانچہ یہ اپنے ماتحت طلبا سے ہر قسم کے کام لیا کرتے تھے!

لیکن اسپارٹا کی سب سے نمایاں خصوصیت جسمانی تعلیم اور ورزش تھی جس پر اس ریاست کے باشندوں کو بجا طور سے فخر تہا، اس سرزمین میں لکھنے پڑہنے کا چرچہ بہت کم تھا یہانتک کہ سلطنت کے قوانین بھی سینہ بہ سینہ پہونچتے تھے، اور مشیران سلطنت اُنکو زبانی یاد کرتے تھے، ان کو تجارت کے حساب وکتاب سے کچھ سروکار نہ تھا اس لئے اسپارٹا کے اکثر باشندے گنتی تک نہ جانتے تھے، البتہ آباؤ اجداد کے جنگی کارنامے خاندانی شجرے، بہادروںکی سوانح عمریاں، اُن کے لئے زیادہ دلچسپ تھے، اور چنانچہ یہی اُن کو راگوں کی صورت میں خوب یاد ہوتے تھے اور انہی کو وہ نہایت خضوع وخشوع کیساتھ ورد کیا کرتے تھے، تقریر کرنا اسپارٹا میں ایک سنگین جرم تھا چنانچہ اس کی تعلیم ریاست کے کسی حصّہ میں نہ ہوتی تھی، بچّوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی جاتی تھی، اور اُن کی تقریر بالعموم مختصر لیکن پرمغز ہوتی تھی،

اس ریاست میں تعلیم کا مقصد یہ نہ تھا کہ علوم وفنون حاصل کئے جائیں، دماغی اور ذہنی نشو ونما پیدا کیا جائے، بلکہ صرف بہادری وشجاعت فوجی تربیت جنگی تعلیم حاصل کرنا انکا نصب العین تھا، اور اسی مقاصد کے واسطے تمام تعلیمی جد وجہد کیجاتی تہی، لڑکے ہمیشہ افسروں کی نگرانی میں رہتے تھے، اور ذرا سے قصور پر اُن کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں، صبر وتحمل کی تعلیم اُن کی طرز معاشرت سے ہوتی تھی، تمام طلبہ کے سر اور پاؤں برہنہ، بدن پر صرف ایک موٹا لبادہ رکھتے، برہنہ ہوکر سخت دہوپ میں رقص کرتے اور کھیلتے تھے، اور اُن کا بستر گہاس پہوس کا ایک بنڈل ہوتا تہا، ان کو نہایت ذلیل اور قلیل کہانا دیا جاتا تہا اور بسا اوقات مکانوں سے باہر نکالدیا جاتا کہ وہ چرا کر اپنے اپنے لئے سامان خورد ونوش فراہم کریں،

چوری کرانا اسپارٹا کی تعلیم وتربیت کی ایک نمایاں خصوصیت تھی، بچپن ہی سے لڑکوںکو ہدایت کی جاتی کہ اپنے جماعت کے سرداروں کے لئے ترکاری اور لکڑیاں چرا کر لائیں، اور

خاص عمر پر انکو چرانیکی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی، لیکن یہ غلط فہمی اسی وقت دور کرنا ضروری ہے کہ یہ چوری بے ایمانی یا بدنیتی سے نہ کی جاتی تھی، اُس زمانہ میں اور اُس ریاست میں عجیب وغریب قوانین اور دستور العمل نافذ تھے جن کی روسے، کتا۔ گھوڑا، بیل، بکری کسی خاص شخص کی ملکیت نہ تھے جو چاہتا اُنسے کام لے سکتا، کسی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہ تھی، پس اسپارٹا کی تعلیم وتربیت بچّوں کو چوری نہ سکہاتی تھی، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اُن کا اخلاق موجودہ طرز عمل سے بالکل مختلف تہا۔ چنانچہ اسپارٹا میں بہت سی اشیا ہر قسم کی ایسی تہیں جو سرکاری حال یا بہ الفاظ دیگر کسی کی ملکیت نہیں تہیں، پس اُن پر قبضہ حاصل کرنا خواہ وہ کہیں ہوں چوری نہ تھی نہ یہ فعل اور کسی طرح معیوب تہا۔ یہاں یہ بھی عرض کردینا ضروری ہے کہ اسپارٹا کے کل باشندے ہر نقطہ نظر سے سپاہی تھے، اور اُن کی زندگی اور معاشرت بالکل فوجی تھے، چنانچہ اس چوری کو اس لئے روا رکھا گیا تہا کہ اس سے لڑکوں کو چالاکی، پھرتی، غنیم سے پوشیدہ رہکر اور موقعہ پاکر حملہ کرنا آجائے، اور یہ گویا فوجی تعلیم وتربیت کی بنیاد تھی، اگر لڑکے چوری کرتے وقت گرفتار ہوجاتے تو ان کے کوڑے مارتے تھے، اس لئے نہیں کہ اُنہوں نے چوری کی بلکہ اس لئے کہ وہ گرفتار ہوئے، اسپارٹا کے بچّوں کو تیرنا اور گھوڑے پر سوار ہونا سکہایا جاتا تہا، یہ دونو اوصاف ایک سپاہی کے لئے ناگزیر ہیں، اُنکا زیادہ وقت ورزش اور کشتی میں صرف ہوتا تہا، اور اکثر مصنوعی میدان جنگ اور لڑائیاں ترتیب دی جاتی تہیں تاکہ فوجی تعلیم اور تربیت میں کوئی نقص باقی نہ رہے، اور لڑکے فن سپہگری میں مشاق ہوکر ملک وملّت کی فوجی خدمت کے لئے طیار ہوجائیں۔

ایتھنز ایتھنز کے مشہور ومعروف مدبر سیاسی صوکن نے جسمانی اور دماغی تربیت کو ایک ہی نظر سے دیکھا ہے اور دونوں کو یکساں اہمیت اور وقعت دی ہے اس کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ”بچّوں کو ایک ہی وقت میں پڑہنا اور تیرنا سکہانا چاہئے“

جمہوریت نے خود اپنی طرف سے باشندوں کی جسمانی نشو و نما کا انتظام کیا تھا، اور موسیقی گرامر کی تعلیم پرائیوٹ مدارس میں دیجاتی تھی، ورزش کے اعلیٰ افسر کو ہر سال باشندگان شہر خود منتخب کیا کرتے تھے، اور اس شعبہ کا اہتمام اور انصرام اُسیکے سپرد کرتے تھے، لیکن امتداد وقت نے اس نظام عمل میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا، عوام الناس کی توجہ جسمانی نشو و نما کی جانب سے کم ہونے لگی، اور بچّوں کی تمام تعلیم و تربیت مجوزہ کورس تک محدود ہو گئی،

چھ برس کی عمر تک اہل ایتھنز کا بچّہ دایہ کی حفاظت میں رہا کرتا تھا، اور اسی کے خیالات سے تاثیر حاصل کرتا تھا، اس کے بعد وہ ایک غلام کی حفاظت میں موسیقی و گرامر کے اسکول اور ورزش گاہ میں حاضر ہوتا تھا، گرامر کا معلم بسا اوقات کبھی میدان میں، باغ میں، کسی شاہراہ پر، یا کسی چوک میں درس دیتا تھا، اور اُس کی تعلیم لکھنے، پڑھنے اور مذہبی تربیت پر مشتمل ہوتی تھی، گرامر کی کے بعد موسیقی کا درس شروع ہوتا تھا، اور اس کا معلّم اپنے شاگردوں کو سب سے پہلے گانا سکھاتا، اور بعد ازاں ستار اور بین باجہ کی مشق کراتا تھا، یونانی موسیقی کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور نغمہ و سرود کو روح کی تر و تازگی کے لئے اشد ضروری سمجھتے تھے، سقراط اور ارسطاطالیس جو حکمائے یونان میں ممتاز اور سربر آوردہ شمار کئے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ نغمہ و سرود کے خوشگوار اثر سے روح میں نفاست اور لطافت پیدا ہوتی ہے اور جذبات بہیمہ فنا ہو جاتے ہیں، ظالم سے ظالم انسان اور بیدرد سے بیدرد ہستی اگر شب و روز موسیقی کے دائرہ اثر اور نغمہ و سرود کے ماحول میں زندگی بسر کرے تو یقین ہے کہ اُس کی عادات اور اطوار میں ایک دل خوشکن انقلاب پیدا ہو جائیگا، اس طرح رفتہ رفتہ سوسائٹی کا ایک مفید اور کار آمد فرد بن سکتا ہے، دنیا کو پورے طور سے معلوم نہیں کہ اہل یونان کی زندگی کا ہر ایک شعبہ کسقدر موسیقی سے لبریز تھا، اور ایتھنز کی آب و ہوا کسقدر نغمہ و سرود سے معمور تھی! پبلک کو قوانین تک راگ کی صورت میں سناتے تھے، مذہبی فرائض کو ادا کرنے میں گانا لازمی تھا، ہر مجلس و محفل کامیاب نہیں تصور کیجاتی تھی جسکا پروگرام نغمہ سے خالی ہوتا تھا،

گرامر، موسیقی اور ورزش یونان میں ابتدائی تعلیم کے اجزا شمار کئے جاتے تھے، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تعلیم ہر کس و ناکس کے لئے مروج نہ تھی، صرف امرا کے بچے اور حکام بالادست کے لڑکے اس فیض سے بہرہ اندوز ہو سکتے تھے، صولن نے کہا ہے کہ غربا کو پڑہنا، تیرنا، اور تجارت کرنا سکہاؤ، صولن کا یہ خیال ہے کہ سوسائٹی کے ہر طبقہ کو ایک ہی قسم کی تعلیم و تربیت دینا نہایت مضر ہے، کیونکہ اس طرز عمل سے حفظ مراتب مفقود ہو جاتا ہے، اور سوسائٹی کی بقا محال ہو جاتی ہے، لیکن یہ خیال مشاہدے نے غلط ثابت کر دیا، دور حاضرہ کی طرز تعلیم سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تعلیم خواہ کتنی ہی عام کیوں نکر دی جائے ہر پیشہ اور ہر ہنر کے متوالے ملجاتے ہیں اور نظام معاشرت میں کچھ بھی فرق پیدا نہیں ہوتا، یونان میں جمہوریت کا زور شور تہا اور شہر کا ہر باشندہ ہر معاملہ میں رائے زنی کر سکتا تہا، اور ریاست میں بلاتکلف شریک ہو سکتا تہا، اجلاس بالعموم کہلی جگہ میں منعقد ہوتے تہے، اور ارباب حکومت اپنے خیالات پبلک پلیٹ فارم پر علانیہ بیان کرتے تہے، اور اشخاص متعلقہ نکتہ چینی کر سکتے تھے، اس وجہ سے منطق اور تقریر کی تعلیم دینے کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگی، اور رفتہ رفتہ معلموں کا ایک ایسا زبردست گروہ پیدا ہوا جو اپنے شاگردوں کو لکچر دینے اور مناظرے کرنیکی تعلیم دیا کرتے تہے، اور منطقی دلائل و براہین میں دشمن کو پہانس کر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکہاتے تہے، ان حضرات کا مقصد علم یا سچائی کی جستجو نہ تھی بلکہ صرف تقریر کرنے اور مباحثہ میں کامیاب کرانیکی ضرورت مند تہے، اس گروہ کو ہم سوفطائی کہتے ہیں ان میں چند ایسے گذرے ہیں جن کو ہم دراصل فلسفی اور حقیقی حکیم کہہ سکتے ہیں ورنہ بیشتر حصہ ان افراد پر مشتمل تہا جن کو علم و حکمت سے نفرت تہی جنکے اخلاق، خیالات خراب اور حوصلہ پست ہوتے تہے اور جو اس ذلیل پیشہ کو جس میں سچ اور جھوٹ کی تمیز بالکل غائب ہو جاتی ہے اپنا ذریعہ معاش بناتے تہے، باقی

مسلم یونیورسٹی، محمد عبدالشکور۔ بی۔ اے۔ علیگ

پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

منٹگمری

خدا کا شکر ہے کہ سال گذشتہ سے پنجاب میں تعلیمی کانفرنس کے اجلاسوں کا سلسلہ جاری ہے ایک اجلاس ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اوس کے بعد گذشتہ اپریل میں دوسرا اجلاس لاہور میں بصدارت مسٹر عبداللہ بن یوسف علی ہوا۔ اور اسی سال میں ایک اور اجلاس منٹگمری میں ۱۷-۱۸-اکتوبر کو نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ مہمانوں کیلئے قیام وطعام کا نہایت عمدہ انتظام تھا ایک وسیع پنڈال جو سادگی کے ساتھ ستھرے پن اور نفاست میں اپنی نظیر آپ تھا بنایا گیا۔ نشست فرش پر تھی، اور ایک وسیع اور شاندار ڈائس (چبوترہ) کے کونوں میں رپورٹروں اور دیگر اقوام کے معزز مہمانوں کے لئے چند کرسیاں اس عمدگی سے بچھائی گئی تھیں کہ کرسیوں پر بیٹھنے والے چبوترہ والوں اور زمین پر بیٹھنے والوں کے درمیان عالم برزخ کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ اور اون کی حالت پر کوئی شخص رشک نہ کرسکتا تھا۔

۱۶ تاریخ کو ۱۲ بجے کی گاڑی سے آنریبل صاحبزادہ افتاب احمد خانصاحب علی گڈھ سے تشریف فرما ہوئے۔ اون کے استقبال کیلئے معززین شہر اور مسلمان طلبا کا انبوہ اسٹیشن پر موجود تھا۔ ۱۷ کی صبح کو جناب چودہری شہاب الدین صاحب پریسیڈنٹ معہ لاہور پارٹی کے ریل سے اترے اور اون کا استقبال بڑی دہوم سے ہوا۔ یہ دونوں گاڑیوں میں لاہور سے آئے تھے

کانفرنس کا اجلاس ۹½ صبح سے شروع ہوا۔ تلاوت کلام پاک اور چند نظموں کے بعد جناب دیوان محمد شاہ صاحب سجادہ نشین پاکپتن شریف کی طرف سے ایک صاحب نے استقبالیہ ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس دوران میں خود جناب سجادہ نشین صاحب رونق افروز جلسہ ہوئے۔ اس ایڈریس میں صاحب موصوف نے تعلیمی امور میں امداد دینے کا پورا وعدہ

فرمایا۔ اس کے بعد پیر سید محمد حسن شاہ صاحب ایم۔ ایل۔ سی نے دیوان صاحب موصوف کی تعلیمی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب موصوف نے فریدیہ اسکول قایم کیا ہے جسکو اب کالج کے درجہ پر پہونچانے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد چودھری شہاب الدین صاحب نے اپنا اعلیٰ پایہ ایڈریس ڈیڑھ گھنٹہ میں پڑھا جسکی نسبت ہم آیندہ پرچہ میں اظہار خیال کریں گے۔ یہ ایڈریس نہایت قابلیت کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ اس اجلاس کے اختتام سے قبل سبجیکٹ کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ہوا۔

سہ پہر کے اجلاس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے پورے ایک گھنٹہ تک تعلیم کے متعلق تقریر کی جس کا اقتباس ہم آیندہ پرچہ میں دیں گے۔ اس کے بعد پندرہ ہزار روپیہ جمع شدہ چندہ کا اعلان ہوا۔ اور چندہ دہندگان کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس سے متاثر ہوکر ہر طرف سے چندوں کی بہار ہونے لگی اور کل فہرست پینتالیس ۴۵ ہزار تک پہونچگئی یہ رقم مقامی تعلیمی کاموں میں صرف ہوگی۔

رات کے وقت ایک طرف تو سبجکٹ کمیٹی کا جلسہ ہوتا رہا اور دوسری طرف پنڈال میں متفرق تقریروں اور نظموں نے حاضرین کو محظوظ اور مصروف رکھا۔ ۱۸ تاریخ کی صبح کو تلاوت کلام پاک کے بعد شیخ نیاز علی صاحب وکیل لاہور نے ایک مفید تقریر کی۔ آپ نے اس امر پر زور دیا کہ انجمنوں کے ذریعہ سے تعلیمی کام کرنے کا تجربہ بالعموم ناکام ثابت ہو رہا ہی اسلئے تعلیمی ترقی کیلئے انفرادی کوشش کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جہالت کیوجہ سی دیہات کے لوگ ساہوکاروں کے بُری طرح شکار بن رہے ہیں ایک خفیف اور فرضی رقم رفتہ رفتہ بڑھکر ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے اور غریب کاشتکاروں کا خاتمہ کردیتی ہے۔ اور انہیں فقیر بنادیتی ہے اور یہ محض اسوجہ سے ہوتا ہے کہ کاشتکار ناخواندہ ہیں اور نہیں جانتے کہ دستاویز میں کیا لکھا گیا ہے۔ کتنا سود ہے سود در سود ہوکر چند دنوں میں کتنا بڑھ جاتا ہے۔ صاحب موصوف نے زمینداروں کی اسطرف توجہ دلائی کہ وہ اپنے غریب کاشتکاروں کی

مدد کریں اور اونہیں ساہوکاروں کی دستبرد سے بچائیں اور اون کے فریب سے آگاہ کریں اور حتی الامکان مہاجن کو اپنے حدود سے خارج کر دیں۔ آپ نے یہ بھی مشورہ دیا کہ زمینداروں کو چاہئے کہ طلبہ میں سے کاشتکاروں کے بچوں کیلئے ایک اوستاد مقرر کریں جو دو تین گانوں کے حلقے کے بچوں کو تعلیم دے۔ مسلمانوں کو ہر جگہہ اپنا اسکول قائم کرنے کا خبط ہے جو پورا نہیں ہو سکتا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اپنے بورڈنگ ہوس بنا دیئے جائیں جن میں طلبا رہکر سرکاری مدارس میں تعلیم پائیں۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ استادوں کی عزت کریں اور مسجد کے اماموں کی مدارات کریں۔ اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو تعلیم دلاکر ابھاریں۔

وقت کی تنگی کی وجہ سے شیخ عبد القادر صاحب نے مختصر الفاظ میں فرمایا کہ ہندوستان میں تعلیمی تحریک چالیس سال سے جاری ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستانیوں نے بہت کم ترقی کی ہے۔ حالانکہ اتنے ہی زمانہ میں جاپان نے حیرت انگیز کرلی اور دنیا کی بڑی طاقتوں میں اوس کا شمار ہونے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی زیادتی اون کی تعلیم میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہے یہ اُلٹی بات ہے۔ زمینداران منٹگمری کی نسبت آپ نے فرمایا کہ وہ سادہ اور مضبوط اور محنت کش لوگ ہیں اور مسلمانان پنجاب کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ اس لئے اونہیں ابھارنے کے لئے ہمیں پوری کوشش کرنی چاہئے آپ نے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی اس تجویز کو بہت پسند کیا کہ ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے علم کی زکوٰۃ اس طرح دے کہ ہفتہ، یا مہینہ، یا چھ مہینہ یا سال بھر میں ایک دن کسی گانوں میں جاکر جہلا کو مفید اور کارآمد باتیں بتائے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص اسپر عمل کرے تو جاہل دیہاتیوں کی حالت بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ شیخ صاحب نے آخر میں اس امر پر زور دیا کہ ہر شخص کو خود رائے نہونا چاہئے بلکہ کسی سردار کے حکم کا تابع بننا چاہئے بغیر اس کے نہ دنیا کا کام چل سکتا ہے نہ دین کا حتیٰ کہ عبادت میں بھی ایک امام بنانا پڑتا ہے۔ اسوقت پراونشل کانفرنس ہماری امام ہے۔ جو رزولیوشن اوس میں پاس ہوں اون پر ہمیں عمل کرنا چاہئے۔ اگر وہ تجربہ سے

مفید ثابت نہوں تو پھر کسی جلسہ میں اون کی تنسیخ کیجائے مگر جب تک کہ ایک رزولیوشن موجود ہے اوس کی تعمیل کئے جانا چاہیئے۔

اس کے بعد مولوی غلام محی الدین صاحب وکیل لاہور نے چند مختصر مگر باا ثر الفاظ میں مسلمانوں کے اخلاقی، جسمانی اور دماغی تنزل کا خاکہ کھینچکر انہیں ہدایت کی کہ قرآن پاک سے استفاضہ حاصل کریں آپ کی مختصر تقریر خوش بیانی اور فصاحت کا ایک نمونہ تھی ۱۸ تاریخ کے سہ پہر کے اجلاس میں مولوی احمد علی صاحب لاہوری کا وعظ ہوا جس میں صاحب موصوف نے فرمایا کہ کانفرنس کا مقصد اشاعت تعلیم ہے۔ مگر مغربی علوم کے ساتھ دینی علوم کی سخت ضرورت ہے اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ مذہبی تعلیم کے متعلق الفاظ سے گذر کر دائرہ عمل میں قدم رکھیں۔ آپ نے جدید فیشن والوں اور داڑھی منڈانے والوں کی خوب تفضیح کی۔

اسکے بعد خان بہادر شیخ عبد القادر صاحب نے جناب نوابصاحب بہاولپور کا پیام جو کانفرنس کی ہمدردی میں نواب سر خدابخش خانصاحب لائے تھے سنایا اور جناب نوابصاحب کی شکر گذاری میں ایک رزولیوشن پیش کیا جو بالاتفاق پاس ہوا۔ پھر جناب سر مولوی رحیم بخش صاحب اور سر خدابخش خاں صاحب نے تقریریں فرمائیں۔ اور نواب صاحب بہاولپور کے پانچ ہزار روپیہ عطیہ اعلان فرمایا۔

آخری جلسہ ۵ بجے شام کے ہوا جس میں میاں چراغ الدین نے ایک نظم موسوم بہ عشق کی لہر پنجابی میں پڑہی اوسکے بعد پریسیڈنٹ صاحب نے خاتمہ کی تقریر میں حاضرین اور چندہ دہندگان اور کارکنان کا شکریہ ادا کیا۔ اور ملک زماں مہدی خانصاحب کمشنر اور مسٹر پکل و دیگر حکام ضلع کی جنہوں نے کانفرنس کو ہر قسم کی امداد دی تھی شکر گذاری کا اظہار کیا۔ اس کے بعد چودھری نذیر احمد صاحب سکرٹری استقبالیہ کمیٹی نے صاحب صدر دیگر کارکنان کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح جلسہ بخیر وخوبی ختم ہوا۔ آیندہ نمبر میں پاس شدہ رزولیوشن درج کئے جائیں گے۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ اجلاس کے ساتھ

تعلیمی نمایش

۲۶ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۲۳ء بمقام علی گڈھ

بصدارت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب

جملہ اقوام کے علم دوست اصحاب کو دعوت

امسال کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ تعلیمی نمایش ہوگی جس میں عام فہم لکچروں کے ذریعے سے زمانہ حال کے تعلیمی تحقیقات کے نتائج و مسائل سے حاضرین کو آگاہ کیا جائے گا۔ نمائش کا سامان صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اپنے ساتھ انگلستان سے لائے ہیں اور وہاں کے تعلیمی کارخانے اپنی طرف سے تعلیمی سامان بھیج رہے ہیں۔ صوبہ متحدہ اور پنجاب کے افسران تعلیم نے اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے پوری مدد کا وعدہ کیا ہے اور صوبہ متحدہ کے گورنر سر ولیم میرس صاحب بالقابہ ۲۶ دسمبر کو نمایش کا افتتاح فرمائیں گے۔

علاوہ تعلیمی آلات اور سامان کے اس نمایش میں فرامین اور نادر الوجود قلمی کتب و تحریرات عربی و فارسی و اردو کی بہترین مطبوعات جو فن تعلیم و تربیت اور تاریخ و جغرافیہ اور تعلیم القرآن کے متعلق ہوں فراہم کرکے رکھی جائیں گی۔ امید ہے کہ اہل مطابع اور مصنفین اور وہ اصحاب جن کے پاس شاہی فرامین اور نادر الوجود قلمی کتابیں ہیں کانفرنس میں بھیجکر نمایش کو کامیاب بنانے میں خاص حصہ لیں گے اس سامان کی آمد و رفت کا خرچ کانفرنس دیگی اور انگلستان سے

کارخانے اپنا تعلیمی سامان کانفرنس میں اپنے خرچ سے بھیج رہے ہیں۔

نیز عرض ہے کہ جن اصحاب کو اجلاس کے لئے رزولیوشن بھیجنے ہوں وہ ۱۰ دسمبر تک مرحمت فرمائیں اور جو اصحاب ممبر ہونا چاہیں وہ فیس ممبری مبلغ پانچ روپیہ ارسال فرمائیں۔ اجلاس ۲۷ دسمبر سے ۳۱ دسمبر تک ہوگا تعلیمی نمایش کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ حسب ذیل پروگرام سے ہوگا۔

نمبر ۱۔ فرامین شاہی اور قدیم نایاب قلمی کتابوں کی نمایش اور ان کے متعلق لکچر۔

نمبر ۲۔ تعلیم جغرافیہ کے متعلق بہترین سلسلۂ کتب، نقشوں، خاکوں اور کروں وغیرہ کی نمایش اور ان کے متعلق مفید لکچر۔

نمبر ۳۔ علم تاریخ کے متعلق مطبوعات اور طریقۂ تعلیم لکچر۔

نمبر ۴۔ زبانیں سکھانے کے متعلق آلات اور مطبوعات اور طریقۂ تعلیم پر لکچر۔

نمبر ۵۔ حساب جبر و مقابلہ کے متعلق مطبوعات و آلات اور مقصد تعلیم اور طرز تعلیم پر لکچر۔

نمبر ۶۔ علم طبقات الارض، علم نباتات، علم کیمیا کے متعلق نمایش و لکچر۔

نمبر ۷۔ کنڈرگارٹن، مونٹیسوری و ڈالٹن طریقۂ تعلیم کے متعلق سامان کتابیں و لکچر۔

نمبر ۸۔ تعلیم نسواں۔ بچہ اور ماں کے تحفظ صحت، انتظام خانہ داری اور لڑکیوں کے پڑھنے کے واسطے مفید کتابیں اور اس باب میں لکچر۔

نمبر ۹۔ فزیکل کلچر یعنی تربیت جسمانی اور کھیلوں کے متعلق مطبوعات اور سامان اور اس بارہ میں مفید لکچر۔

نمبر ۱۰۔ ناقص العقل اور ناقص الخلقت بچوں کے متعلق مطبوعات اور سامان اور اس بارہ میں لکچر۔

نمبر ۱۱۔ بچوں کا معائنۂ طبی اس کے متعلق مطبوعات اور لکچر۔

نمبر ۱۲۔ بوائز اسکاؤٹ کے متعلق کتابیں اور لکچر۔

نمبر ۱۳۔ جوان العمر اشخاص کی تعلیم کے متعلق کتابیں اور لکچر۔

نمبر۱۴۔ تجاویز تعلیمی مرتبہ ماہرین فن۔
نمبر۱۵۔ تعلیم قرآن مجید کے متعلق سہولتیں مثلاً ایام جاہلیت اور مابعد مصر، افریقہ اور عرب کے نقشے اور شجرہ دستیاب ان اقوام اور تاریخی واقعات کے متعلق اُردو میں مختصر قصوں کی کتابیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ آنحضرتؐ کے جانشینوں کی مختصر سوانح عمری اور اس باب میں لکچر۔
نمبر۱۶۔ اسکولوں کے کم خرچ عمارت کے نقشے اور اُن کے تخمینے۔
نمبر۱۷۔ انجمن ہائے امداد باہمی کے متعلق کتابیں اور لکچر۔
نمبر۱۸۔ انجمن ہائے انگلستان کے مطبوعات اور لکچر
نمبر۱۹۔ سوشیل سروس یعنی خدمت خلق کے متعلق مطبوعات اور لکچر۔
نمبر۲۰۔ صنعتی تعلیم کے متعلق مطبوعات اور لکچر۔

جلسہ کی شرکت کی حسب ذیل صورتیں ہونگی:۔

(۱) ادائگی فیس ممبری مبلغ پانچروپیہ جس سے اجلاسوں میں تقریر کرنے اور رائے دینے کا حق بھی حاصل ہوگا اور جلسہ کی کارروائی طبع ہوکر خدمت میں بھیجی جائیگی۔
(۲) ادائگی فیس وزیٹری مبلغ دو روپیہ سے اجلاسوں اور نمائش میں صرف شریک ہونیکا حق ہوگا۔ مگر تقریر کرنے اور رائے دینے کا منصب نہوگا۔
(۳) فیس طعام بحساب چھ آنہ فی وقت
(۴) قیام کے لئے کوئی فیس نہ ہوگی۔

آخر میں عرض ہے کہ جن صحاب کو کوئی تحریک اجلاس میں پیش ہونے کے لئے بھیجنی ہو ۱۰ دسمبر تک ارسال فرمائیں اور ارادہ تشریف آوری سے ۲۰ دسمبر تک مطلع فرمائیں اور ہر قسم کی فیس چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام ارسال فرمائیں۔

خاکسار طفیل احمد۔ جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ علی گڑھ

تنقید و تبصرہ

رسالہ تحریک لاہور

یہ ایک ماہواری ادبی رسالہ ہے جو پنجاب کے دارالحکومت لاہور سے شائع ہوتا ہے، اس میں اُردو زبان کی اصلاح، شعرو شاعری، ناول نویسی اور ڈرامہ نگاری کے متعلق دلچسپ و عام پسند مضامین شائع ہوتے ہیں، رسالہ کے ساتھ ایک دلچسپ سیاسی ناول انقلاب فرانسہ، کا ترجمہ بھی شائع ہوتا ہے، پنجاب ہمیشہ اُردو کی کچھ نہ کچھ خدمت کرتا رہا ہے، یہ رسالہ بھی اس خدمت کا تازہ ثبوت ہے، امید ہے، کہ اس کی قدر کیجائیگی۔ قیمت سالانہ سے [?] رہے جو کچھ زیادہ نہیں۔

مظاہر جدید

ایک ماہوار رسالہ ہے جو دیرہ دون سے شائع ہوتا ہے، ابھی صرف پہلا نمبر پیش نظر ہے، رسالہ کا مقصد سائنس، و صنعت و حرفت کی حمایت ہے، جو بے شبہ ایک مفید مقصد ہے، البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ مختصر ضخامت کا ایک ماہوار رسالہ اس ضرورت کو کہاں تک پورا کر سکے گا تاہم نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے، پہلا نمبر مضامین کی حیثیت سے قابل قدر ہے لیکن صنعت و حرفت کے متعلق کوئی عملی چیز اس میں نہیں ہے۔

امید ہے کہ رفتہ رفتہ رسالہ عملی مضامین کی حیثیت سے بھی ترقی کریگا اور اپنے ناظرین کے لئے مفید ہوگا

قیمت بلحاظ قسم اوّل و دویم تے رو عا [?] سالانہ ہے۔

ملنے کا پتہ۔ ناظر پریس دہرہ دون

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰×۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپے گا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف (ستے) مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑہ بھیجنا چاہیے اور منی آرڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کر دیجائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین پر بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شائع ہوسکتے ہیں اُجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑہ ہونا چاہیے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علیگڑہ

سلسلۂ جدید جلد ۲
نمبر ۵

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۲۸

نومبر ۱۹۲۳ء
ربیع الآخر ۱۳۴۲ھ

کانفرنس گزٹ

یعنے

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

مرتبۂ حامد علی صدیقی

جس میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصولِ تعلیم، نظامِ تعلیم مروجۂ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر تنقید کی جاتی ہے

زیرِ نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولنا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبد السلام

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہو ۱۳۴۲ھ

اور صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ سے شائع ہوا

فہرستِ مضامین

صفحہ

۱۔ شذرات

کلمات طیبات
تعلیم جدید کا مجسمہ
ایجوکیشنل کانفرنس
تعلیمی نمائش
انشا پردازی
} از ایڈیٹوریل اسٹاف ۱ تا ۸

تعلیمی تحریک اور بعض خدامِ ملت کی مساعی جمیلہ۔ از مولوی اکرام اللہ خاں ندوی ۹ تا ۳۱

۲۔ مقالاتِ علمیہ

تعلیم کے مقاصد از حامد علی صدیقی ۳۲ تا ۳۸

اصلاحِ تمدن

فیشن کے بندے مولانا ابوالحسنات قریشی ۳۹ تا ۴۱

ہماری تعلیمی نمائش کا ایک درجہ از حامد علی صدیقی ۴۲ تا ۴۷

اشتہارات وغیرہ ×

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

کلماتِ طیّبات رسالہ کے آئندہ صفحات میں کتب خانہ محمدیہ کے حالات کے سلسلہ میں ایک قلمی رسالہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کا نام "کلماتِ طیّبات" ہے اس رسالہ میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے اقوالِ پاکیزہ کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے، بزرگوں کے اقوال کی قدر و منزلت اہلِ مشرق خصوصاً مسلمانوں کا خاص رتبہ ہے، اور اس قسم کے اقوال اہلِ مشرق کے لٹریچر میں ضرب المثل کے طور پر رائج ہو جاتے ہیں، بلکہ زینتِ کلام کا باعث ہوتے ہیں، اس بنا پر ہم تبرّکاً چند کلماتِ طیّبات مع ترجمہ منظوم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

گفت امیرِ مومناں سرچشمۂ صدق و صفا | شیرِ یزداں شاہِ مرداں ابنِ عمِ مصطفےٰ

(۱) تا بہ کے گم کردن خود را زمانے با خدا
خویش را بشناس اگر خواہی کہ بشناسد خدا
(۱) من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

(۲) دعوئ راحت دریں عالم کسی را میرسد
کو بکلی بگذرد از کینہ و بغض و حسد
(۲) لا راحت مع الحسد

(۳) ہیچ شادی نیست بے غم ہیچ راحت بے رنج
نوش با نیش ست و گل با خار و خواری با طمع
(۳) الذل مع الطمع

(۴) سرِ خود در دل نگہدارد مدام اہلِ خرد + تا ز دل خصت نیابد بر زبانش بگذرد (۴) لسان العاقل فی قلبہ

(۵) قول و فعل خوب باشد صورتِ عقل اے ادیب + ایں نشان رہبر کجا بی از ادب نا سد نصیب (۵) الادب صورۃ العقل

تعلیم جدید کا مجسمہ

ہمارے قومی تعلیم کے نظام میں ابھی کایا پلٹ حوادث نے کام نہیں کیا کہ دورِ جدید کی ہستی کو مطبوع مجلّدات کی صورت میں محفوظ کرنے کی ضرورت ہو بلکہ دورِ جدید کا مجسمہ ملک کی یونیورسٹیوں کی صورت میں ابھی اسی آب و تاب سے موجود ہے اور معلوم نہیں اور کب تک رہیگا۔ اس مجسمہ کا اعلیٰ حصہ پختہ مگر اسفل کو خام چھوڑا گیا تھا۔ جو ابتک اسی طرح قائم ہے۔ گو اس میں کچھ کچھ اضافے ہوئے ہیں یہ اصولی نہیں بلکہ فروعی تغیرات ہیں۔ اس مجسمہ کو دیدہ ورانہ نظر سے دیکھئے تو صاف معلوم ہوگا کہ ایک عالی شان اور رفیع المنازل عمارت آسمان سے باتیں کرنے کا ارمان رکھتی ہے اسکی چند بالائی منزلیں چونہ گچ اور لوہا لاٹ ہیں۔ سالہا سال زمانہ کی رگڑ کا مقابلہ کرینگی یہ اعلےٰ حصہ ہے جس پر اعلیٰ تعلیم کا کتبہ نصب ہے۔ مگر یہ سارا ڈھیر ایک خیالی محراب پر کھڑا ہے اور اسفل حصہ بنیاد تک سب کا سب خام ہے۔ کچی دیواریں ہیں اور پھونس کی چھتیں۔ یہ خیال کرکے دل دہلتا ہے کہ اگر تمام مجسمہ سرتاپا پختہ اور سنگیں نہ ہوا تو جدید تعلیم ایک مردہ قوم میں جان نہیں ڈال سکتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو نظام تعلیم ابتدائی تربیت اور ادنیٰ تعلیم گاہوں سے لیکر انتہائی منزل تک پختہ نہو وہ کسی ڈوبتی ہوئی قوم کو کیسے ترا سکتا ہے۔ گون اور تمغے اُس وقت زیب دیتے ہیں جب حقیقی تعلیم و تربیت کا جواہر نگار قلم بچپن سے جوانی تک تصویر میں رنگ آمیزی کرتا چلا جائے۔ ہم قوم سے عاجزانہ اپیل کرتے ہیں کہ تعلیم کے ابتدائی مدارج پر توجہ کرے۔ اور ایسے قابل عمل نقشے بنائے جن سے سلسلہ کی یہ خامی دور ہو۔ اور بچے ابتدائی مدارج سے نکل کر ثانوی میں اور ثانوی سے اعلیٰ درسگاہوں میں اس طرح داخل نہوں جس طرح ایک دہقان کسی مغربی شہر میں داخل ہو کر تصویر حیرت بن جاتا ہے۔ بچوں کے ذہنی دفینوں کو شروع ہی سے آہستہ آہستہ کھولا جائے۔

ایجوکیشنل کانفرنس

کی ہستی کوئی عارضی چیز نہیں نہ تیس چالیس برس کی ہے۔ بلکہ حقیقت میں یہ سوسائٹی کا دوسرا قالب ہے اور ایم اے او کالج اور پھر یونیورسٹی اور پھر

مُسلم یونیورسٹی اِسی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ جو روح سوسائٹی میں کام کرتی تھی اسی نے کانفرنس میں کام کیا اور گو اب وہ ظاہرا ہمارے ساتھ نہیں مگر اُس کے ذرائع ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ اُس نے سوسائٹی کی شکل میں ایک برقی آلہ بنایا تھا۔ اور اپنے اعلیٰ مقاصد کی خارجی شان دکھانے کے لیئے اس وسیع قطعہ زمین کو عالی شان عمارتوں سے معمور کیا۔ چونکہ جدید نظامِ تعلیم اور اُس کے مقاصد میں اور قوم کی دیگر ضروریات زندگی میں اضافے ہوتے گئے اس لیئے سوسائٹی کا کہنہ قالب چھوڑ کر ایجوکیشنل کانفرنس کو وجود میں لایا گیا۔ جس نے سالہا سال وہی برقی قوت پیدا کر کے ملک کے دور و دراز حصوں میں حرارت پیدا کی اور یہ مسلم یونیورسٹی جو آج مسلمانانِ ہند کی مادر تعلیم کہی جاتی ہے۔ اس کی ہستی قایم کرنے میں کانفرنس کی خاموش کوششوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کانفرنس مسلمانوں کی جدید تعلیم کی ماں ہے۔

تعلیمی نمائش گاہ

نمائش گاہ کا اندازہ علی گڑھ کی معمولی سالانہ نمائش سے نہیں کرنا چاہیئے۔ اس نمائش میں اُن تعلیمی ترقیات کی راستوں کے مرقعے ہونگے جن پر آج کل مغربی دنیا گامزن ہے۔ ہم غلط سمجھتے ہیں کہ یورپ محض سیاسیات کا گھر ہے۔ حقیقت میں وہ علوم و تعلیمات کا گھر ہے۔ اُن کی تعلیمی حالات کے خاکے دیکھنے سے ثابت ہوگا کہ زندگی کی جدید ضرورتوں کے ساتھ دنیا میں اب جدید دورِ تعلیم کا آغاز ہو رہا ہے جو جلد یا بدیر ہمارے نظامِ تعلیم میں بھی انقلاب پیدا کریگا۔ لہٰذا ہمیں بھی اُس کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو جانا چاہیئے۔ مثلاً تعلیمی نمائش میں جو کتابیں اور اُن کے ساتھ آلات کی صورت میں جیتی جاگتی امثال دکھائی جائینگی اُن سے ثابت ہوگا کہ تعلیم کا پرانا مقصود اب نہیں رہا۔ کہ حقائق اور اشیاء کے علم سے خارجی جلوہ آرائی کر کے نوجوانوں کو تیار کر دیں۔ بلکہ اب چھپی ہوئی قوتوں کو اندر سے اُبھارا اور ترقی دینا مقصودِ تعلیم ہے۔ کیونکہ جب ذہنیات فطری قدیر تک پہنچتے ہیں تو علوم ظاہری کے چشمے اُن سے خود بخود اُبلتے ہیں

تعلیمی نمائش سے واضح ہوگا کہ قوم کا مستقبل آج اُن بچوں کے ہاتھ میں ہی جو ہماری تحویل میں ہیں۔ ہم اُنھیں بغیر اسکے تیار نہیں کر سکتے کہ موجودہ طرز تعلیم کو بدلیں۔ اس کے ثبوت میں یہ دکھایا جائیگا کہ جدید طرزِ تعلیم کس قدر مؤثر ہی۔ مثلاً مانٹی ساری طریقہ یا کنڈر گارٹن کی طرزِ تعلیم نے جو نیا رُخ بدلا ہی اُس کا لٹریچر اور ساز و سامان دکھایا جائیگا۔ جو سات برس تک کی عمر کے بچوں کے لیئے مخصوص ہی۔ باضابطہ مدرسے کے کام کے لیئے ڈالٹن کا مجوزہ نقشہ کار ایجاد ہوا ہی۔ اور اور کئی طریقے یورپ میں جاری ہیں۔ جن کا اتباع کرنے سے طلباء کے مدرسہ کا کام حسن و مقدار دونوں میں بڑھ جاتا ہی۔ اس کے ساتھ اخلاقی تعلیم کے طریقے بھی بتائے جائینگے۔ مگر وہ بھی جدید اُصول پر بچوں کی اندرونی قوتوں کو ترقی دینے میں مدد دیتے ہیں۔ جس سے وہ خود بخود شائستہ باضابطہ اور خوش خصال ہو جاتے ہیں۔

نمائش میں یہ بھی بتلایا جائیگا کہ علم النفسیات نے بچوں کے تعلیم کے اُصول اور ضابطہ کو اب کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہی۔ گھر اور مدرسہ کی تعلیم میں جو تجربے ابتک ہوئے ہیں۔ اُن کا بھی اندازہ کرایا جائیگا۔ خلاصہ یہ کہ یورپ میں آج ہر طرف اس بات کا غلغلہ ہی کہ تعلیم کا مقصودِ حقیقی بچوں میں وہ شوق و شغف پیدا کرنا ہی جس سے وہ مادیات کو مغلوب اور روحانیات کو غالب کریں۔ اور اس غلبہ کو اپنی روزانہ زندگی میں ہر پہلو پر باعمل ظاہر کریں۔ یعنی روحانیات کو محض تسبیح و مصلے میں مُقیّد کرنا کافی نہیں بلکہ خلوص اور صداقت بالعمل کی مشق کرنی چاہیئے۔ چنانچہ سوشل سروس یا اپنے ابنائے جنس کی بلا معاوضہ خدمت کرنا بھی روحانیت کی ایک عملی شکل ہی جس سے بے شمار خدام انجمنوں کی شاخیں پھوٹتی ہیں ان سب کی تفصیل بھی اُن کتابوں میں موجود ہے جو نمائش میں پیش کی جائینگی۔

یورپ میں ایک اور زبردست قوت۔ تعلیمی ترقی کے لیئے برقی آلہ کا کام کر رہی ہے۔ ایک

یعنی والدین کی انجمنیں۔ یہ مدارس کے اساتذہ کے مجالس کے ساتھ ملکر بچوں کی تعلیم و تربیت میں وہ کام کر رہی ہیں کہ کبھی دیکھا نہ سُنا۔ نمایش میں اس کا نظام اساسی اور ضابطہ کارروائی ان کی سالانہ روداد یں وغیرہ کا پورا مواد پیش کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ تعلیم کا کوئی طریقہ اور کوئی علم اُصولی علم یا شاخ علم ایسی نہیں جسے ترقی دینے کے لیئے ایک نہایت مستحکم اور باقاعدہ انجمن قایم نہ ہو۔ یہ بڑے شدّ و مد سے ذی اثر اشخاص کی حمایت میں اُس طریقہ یا شاخِ علم کو مقبول عام بنانے میں کوشش کرتی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ کام کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ چنانچہ مانٹی ساری ڈالٹن وغیرہ تمام طریقوں کی ترویج کے لیئے جابجا زبردست انجمنیں قایم ہیں۔ اہل مغرب کی تعلیمی سرگرمیوں کے جیتے جاگتے خاکے اس نمایش میں دیکھکر آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا یورپ کے جسم کا ہر رگ و پیٹھہ بال بال ناخن تک تعلیمی میدان میں جدوجہد کر رہا ہے۔ خدا سے کیا بعید ہے کہ نمایش گاہ کا سامان دیکھکر ہمارے ملک و قوم میں بھی کچھ ایسے صاحبدل اُٹھ کھڑے ہوں جو آنیوالے وقت کے لیئے ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔ اس تعلیمی نمایش میں سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ آلات لٹریچر اور کتابیں ہونگی جو دماغی پیمایش کے فن سے متعلق ہیں۔ جسمانی پیمایش اور اس کے ماتحت تمام مفاہیم تو کم و بیش سمجھ میں آتے ہیں۔ آنکھ، ناک، کان، ہاتھ پیروں کے اور حواس ظاہری کے قوتیں کسی نہ کسی طرح نپ تل سکتی ہیں اور بچے یا بڑے کی تندرستی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے مگر حیرت انگیز یہ امر ہے کہ اہلِ مغرب نے ذہنیات کو تولنے کے لیئے آلات ایجاد کیئے ہیں اور اگرچہ یہ فن ابھی تحقیق کی انتہائی منزل تک نہیں پہنچا لہذا اس کے مطالعہ سے کوئی یقینی فوائد نہیں پہونچ سکتے نہ ان کی بنا پر مستحکم اور مستقل اُصول و ضوابط قایم ہو سکتے ہیں مگر کیا ضرورت ہے کہ جب مغرب میں کوئی علمی غذا پک کر تیار ہو جائے تب ہی ہم قاب کی طرف مفت خوروں کی طرح ہاتھ بڑھائیں کیوں نہ شروع ہی سے شریک عمل ہوں اور اُن کی تحقیق و تدقیق کی رفتار کو نتیجہ خیز بنائیں

سے ساتھ ساتھ دیکھتے رہیں۔ دماغی پیمایش کی ہم ایک مثال دیتے ہیں جس سے قارئین کرام کو کسی قدر اندازہ ہوگا۔

مثلاً فنِ قرارت کا کمال کم سے کم تین قابلیتوں پر منحصر ہے:۔

(۱) حروف و نقوش اور علامات کو صحیح مخارج سے نکلے ہوئے اصوات میں منتقل کرکے زبان سے ادا کرنا۔

(۲) زبان سے ادا کرتے وقت لب و لہجہ اس قدر صاف اور آواز اس قدر بلند رکھنا کہ سامعین بے تکلف سن اور سمجھ لیں۔ یہ بات بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ

(۳) زبان سے ادا کرتے وقت الفاظ کے صحیح مفاہیم ساتھ ساتھ سمجھتے بھی جائیں اور سمجھ کر ادا بھی کرتے جائیں۔ اب ان میں ہر ایک قابلیت کا ایک جدا مبدا ہے۔ پہلی صفت نظام جسمانی کی ہیئت سے اور دوسری قوتِ نطق کی استعداد سے متعلق ہے۔ ان میں پہلی قابلیت کی پیمایش کرنا ممکن ہے دوسری کا اندازہ کرنا دشوار ہے مگر ناممکن نہیں۔ تیسری قابلیت ذہن کی نوعیت پر منحصر ہے لہذا اس کی پیمایش کرنا ابتک قطعاً ناممکن تھا مگر اب اس کے آلات پیمایش بھی ایجاد ہوئے ہیں چنانچہ نمایش گاہ کے ایک درجہ میں ذہنیات کی میزانیں بھی کسی نہ کسی شکل میں ناظرین کو ملینگی۔ یہ سچ ہے کہ ابتک ذہن یا سمجھ کی حدود تعریف معین نہیں ہوئی۔ بینے سے لیکر ٹرمین، اسپرمین، برٹ اور بلارڈ تک جسقدر اس فن کے محقق گذرے ہیں اور جنھوں نے اس فن کی تدوین کے لیئے مواد جمع کیا ہے وہ بھی ذہن یا سمجھ کی تعریف کرتے ہوئے کچھ پس و پیش کرتے ہیں ہنوز یہ نہیں ثابت ہوا کہ حسیات یا جذبات یا خارجی موجودات یا تجربات سے بالکل جدا ہو کر ذہن یا سمجھ کوئی قوت ہے کہ نہیں۔ اگر ہے تو پیمایش کا کلیہ صحیح ہے اور اگر نہیں ہے تو پھر جن عناصر سے وہ مرکب ہے ان کی الگ الگ پیمایش کرنے سے کل کی پیمایش ہو سکتی ہے اگر خیال کسی عقدہ کو حل کرنے کی قوت رکھتا ہے تو بلاشک ذہن یا سمجھ بھی کسی نہ کسی طرح حلِ عقدہ کا ذریعہ ہو سکتا ہے اور

ذہنی پیمایش کا مسئلہ بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ مگر ابھی اس امر کا فیصلہ نہیں ہوا بعض سمجھ یا ذہن کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ حیثیت ہے جو ہستی کے عقدوں اور حقیقتوں تک پہونچنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ یا وہ قوت ہے جو ان پر وارد ہو کر انھیں حل کرتی ہے۔ یا کم سے کم ان سے متصادم ہوتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس فن کے ماہر اس قوت کو نہیں ناپتے۔ بلکہ بچہ کے سامنے چند مسائل مختلف صورتوں میں ڈال کر اُس کے ذہنیات کا اندازہ کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو فطرتِ الٰہی اور نہ حیاتِ انسانی کسی کے سامنے اس قرینہ سے حقیقتوں اور عقدوں کو پیش کرتی ہے۔

زیادہ بحث کرنے سے طول کلام ہوتا ہے ہم نے صرف چند نکتے با مذاق ناظرین کے سامنے بے قرینہ ڈال دیئے ہیں تصویر کا دوسرا رُخ اس تاریک رُخ سے بہت زیادہ روشن ہے اور ہمیں بہت شوق ہے کہ کسی طرح غیر مرئی طاقتوں کو مرئی آلات سے ناپ تول کر محدود کرنے کا قاعدہ معلوم ہو جائے تو بہت ہی آسانی ہوگی۔ فاتر العقل بچے صحیح عقل کے ساتھ گھوڑ دوڑ کے میدان میں نہ کھینچینگے دونوں کا نظام تعلیم و تربیت جدا جدا ہو جائیگا تو اساتذہ کا اعمال نامہ اب سے زیادہ زرّیں ہو جائیگا۔

ہم اس موضوع پر پہلے بھی بحث کر چکے ہیں کہ مدارس اور خصوصاً ابتدائی مدارس کی ایک جماعت میں صحیح اور ناقص ذہن کے بچوں کا ایک ساتھ پڑھنا قوم کی تعلیمی ترقی پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ محض اس لیئے ہے کہ داخلہ کے وقت نہ تو طبی معائنہ ہوتا ہے جس سے قوائے جسمانیہ اور ذہنیہ کا اندازہ ہو سکے اور نہ ہمارے ملک کے والدین خواہ مستطیع ہوں یا غیر مستطیع اس بات کی پروا کرتے ہیں کہ بچہ کیساتھ اُسکا اعمال نامۂ صحت بھی مہتمم مدرسہ کے حوالہ کر دیں۔ اور کریں کہاں سے وہ بچوں کے حقوق بھی ادا کرنا نہیں جانتے اُنھیں جانوروں کی طرح پالتے ہیں۔ خیر یہ ایک فسانۂ غم ہے جسے ہم اس ضمن میں اکثر سناتے رہتے ہیں اگر کسی طرح طبی معائنہ کا قاعدہ جاری ہو جاتے اور قوم بھی جاگ اٹھے تو ناقص العقل بچے صحیح ذہن کے بچوں سے جدا ہو کر اپنے حسبِ حال تعلیم و تربیت پائیں۔

اِنشاپردازی

ہمارے ملک میں انشاپردازی کا سرچشمہ تراجم ہیں اور جیسا کہ ظاہر ہے انگریزی تصانیف بکثرت زیرِ مشق رہتی ہیں۔ آج اخبارات و رسائل مستقل تصانیف و تحریرات انگریزی لٹریچر سے بے نیاز الا ماشاء اللہ۔ کچھ غیر انگریزی داں اصحاب بھی ہیں جن کے قلم سے کچھ مواد نکلتا ہے مگر وہ مصر و بیروت کے انشاپردازوں کے قلم کا صدقہ ہے۔ ترجمہ صحیح معنوں میں گویا ایک حد تک قلم کی پکی غلامی ہے جب تک مترجم کا قلم اصل کتاب کے لفظوں کے ساتھ پابہ زنجیر نہ ہو جائے اسوقت تک ہم اُسے صحیح ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔ مگر یہ خیال کسقدر تعصب کی حد تک پہونچتا ہے۔ اگر اصل زبان اور ترجمہ کی زبان کی بندشوں میں اور صرفی و نحوی ترکیبوں میں مناسبت ہے تو لفظی ترجمہ کچھ بھی مشکل نہیں۔ مثلاً انگریزی و عربی زبان کہ ان کی ترکیبیں بہت کچھ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ پرانی مغلیہ زمانہ کی رسمی شان بھی تقریباً ایسی ہی ہے۔ چنانچہ عربی اور انگریزی دونوں میں ایک ہی جملہ مرکب توصیفی اور اضافی اور صلہ اور موصول کے اضافہ کرنے سے تقریباً آدھے صفحہ پر ختم ہو سکتا ہے۔ عربی سے انگریزی میں ترجمہ کیجئے تو اصل جملہ کی ترکیب مشکل سے کہیں بدلیگی۔ ورنہ بجنسہ قائم رہیگی۔ بجز اس کے کہ فاعل اور مفعول اور فعل پس و پیش کیئے جائیں۔ مگر بیچاری اُردو کا یہ حال نہیں۔ اوّل تو ٹھیٹ لفظوں کا ذخیرہ محدود پھر چھوٹے چھوٹے جملے مقبول، پھر ملک میں ایک جماعت کو عربی، فارسی الفاظ کی عادت نہیں رہی۔ اُدھر اُردو میں مفاہیم کی قلت بھی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ایک صفحہ میں جب تک پچاس جگہ لفظ جو اور جو کہ نہ آئے تب تک ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ خوش نہیں ہوتا۔ جن کے قبضہ میں قدرشناسی کا طرہ ہے۔ خدا مترجموں پر رحم کرے۔

صدیقی

تعلیمی تحریک اور بعض خدّام ملّت کی مساعی جمیلہ

اسلام کی تعلیم ہے کہ "خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسِ" یعنی بہترین شخص وہی جو دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچائے، گویا نوعِ انسان کی خدمت انسان کا ایک بہترین فرض ہے، انبیاء علیہم السلام کو عام انسانوں پر جو فضیلت و شرف حاصل ہے اُس کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ مقدس و برگزیدہ جماعت نوعِ انسان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے بعد اور بزرگ ہستیاں بھی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے عہد میں گم گشتہ راہ انسانوں کی اصلاح و فلاح کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور خود ہر قسم کے مصائب برداشت کرکے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

اگرچہ دنیا میں بڑے بڑے اولوالعزم مشاہیر گزرے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے زمانہ میں ممتاز تھے، لیکن دنیا نے ہمیشہ اُن لوگوں کو عزت سے یاد رکھا ہے جن کا وجود نوعِ انسان کے لیے مفید و بابرکت تھا، لیکن بلحاظ اختلافِ زمانہ نوعِ انسان کی خدمت کا معیار ہر زمانہ میں مختلف رہا ہے، یہی سبب ہے کہ دنیا میں جو مصلحین آئے انھوں نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق قوم کی رہ نمائی کی۔

ہندوستان اور تعلیمی تحریک

انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان میں بھی قومی خدمت کا ولولہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا، اور اربابِ فکر نے قومی ضروریات پر غور کرکے یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے مقدم ضرورت "تعلیم" ہے، جس کے بغیر وہ کسی قسم کی ترقی دنیا میں حاصل نہیں کر سکتے، چنانچہ مختلف اصحاب تعلیم کی توسیع و اشاعت کی خدمت میں مصروف ہو گئے، ان میں بہت سے سربرآوردہ لوگ بھی تھے جن کو دنیا نے جانا اور پہچانا، اُن کے نام کے نعرے بلند کیے اور اُن کی گاڑیاں کھینچیں، یہاں تک کہ اُن کی قومی خدمت کی داستانیں ہندوستان

میں کم گم ہیں گئیں۔ لیکن کچھ لوگ اور بھی تھے جن کو "معمولی شخص" سمجھا جاتا تھا، بلاشبہ وہ معمولی تھے، لیکن اُن کے دل میں قوم کے لیئے سوز و گداز تھا، اور وہ ایک زبردست جذبہ قومی خدمت کا اپنے اندر رکھتے تھے، اس لیئے اُنھوں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام قومی خدمت کے لیئے صرف کر دیئے۔ لیکن محض اس لیئے کہ وہ "معمولی شخص" تھے بجز ایک محدود حلقے کے دنیا اُن سے ناواقف رہی اور اُن کی اصلی قدر قیمت کو نہ پہچانا، یہ غنیمت ہی کہ ان معمولی اشخاص کا مقصد حُبِ جاہ نہ تھا اور وہ کبھی شہرت اور نیکنامی کے طالب نہ تھے ورنہ یہ حوصلہ فرسا اور دلشکن حالات اُن کے جوشِ عمل کو سرد کر دیتے اور وہ ہمت ہار کر کام چھوڑ بیٹھتے، لیکن خدا جن لوگوں کو اپنے بندوں کی خدمت کی سعادت عطا فرماتا ہی اُن کے حوصلہ بلند ہوتے ہیں نہ تو لوگوں کی ملامت اُن کو آزردہ کرتی ہی نہ توصیف و ستائش اُن کو مغرور بناتی ہی بلکہ وہ ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر کام میں مصروف رہتے ہیں یہانتک کہ یا تو اُس کو تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں یا خود اسی دُھن میں فنا ہو جاتے ہیں مگر دنیا کو شاذ و نادر اُن سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہی۔

اگر مسلمانوں میں صحیح احساس ہو تو اُن کا فرض ہی کہ وہ ان قومی خدمتگزاروں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کریں اور اُن کے کارناموں کو شہرت دیں تاکہ قوم کو اُن سے واقف ہونے اور قومی کاروبار میں اُن کی معاونت کرنے کا موقع ملے، اور اُن معمولی لوگوں کو بھی جنکو مبدءِ فیاض نے اعلیٰ درجہ کی ذہنی قوتیں اور صلاحیتِ عمل عطا کی ہی کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہو، اور وہ شکستہ دل ہو کر اپنے ارادہ سے باز نہ رہیں۔

ہندوستان میں علیگڑھ مغربی تعلیم کا مرکز ہی اور گزشتہ زمانہ میں ہر قومی خدمت کرنے والے کا کچھ نہ کچھ تعلق یہاں سے رہا ہی، خصوصاً ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ تو ایک ایسی مجلس ہی جس نے حتی الامکان اپنے پلیٹ فارم پر ہمیشہ قومی خدمت گزاروں کی خدمات کا اعتراف کیا ہی اور پبلک کو اُن کی اعانت پر توجہ دلائی ہی۔ اس لحاظ سے یہ

مناسب ہوگا کہ کبھی کبھی پبلک کو ان "معمولی اشخاص" کے حالات سے باخبر کیا جائے جنھوں نے محض اپنی ذات اور خداوند عزوجل کے اعتماد پر خاموشی کے ساتھ مسلمانوں کی "غیر معمولی" خدمت کی ہے، اور ان کی مساعی جمیلہ کے ثمرات سے قوم کے بہت سے نونہال متمتع ہو رہے ہیں۔

آگرہ کی تعلیمی حالت

اس سلسلہ میں سب سے پہلے آگرہ کی تعلیمی حالت اور بعض قومی خدام کا تذکرہ کیا جاتا ہے، آگرہ تمام دنیا میں تاریخی شہرت رکھتا ہے وہ اکبر اعظم اور شاہنشاہ جہانگیر جیسے اولوالعزم سلاطین تیموریہ کا پایہ تخت ہے، اس کی عدیم المثال اور حیرت انگیز عمارات کے ساتھ ایسی پر عظمت داستانیں وابستہ ہیں جس نے اس کو ایشیا میں نہایت ممتاز بنا دیا ہے، وہ درحقیقت مسلمانوں کے عروج و زوال کا مرقع ہے، عروج تو گزر گیا لیکن زوال پیش نظر ہے۔ آگرہ اگرچہ ایک ایسے صوبہ میں واقع ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے، دہلی کے قریب ہے، اور دربار مغلیہ کے بڑے بڑے نامور اور کامل الفن علماء اور یگانہ روزگار فضلاء کا مسکن و موطن ہے۔ اور اب بھی وہاں مسلمانوں کی کافی تعداد ہے، لیکن با ایں ہمہ آگرہ نے اپنی علمی حیثیت زائل کر دی تھی، اور مسلمان جس طرح ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پسماندہ ہیں یہی حالت اُن کی آگرہ میں بھی تھی اور شاید جہالت کی یہ تاریکی اور بھی بڑھتی لیکن خدا بھلا کرے بعض غریب الوطن اور بیمایہ دردمندانِ قوم کا جنھوں نے قابل تقلید ایثار و قربانی سے کام لے کر، مسلمانان آگرہ کے بچوں کے لیے تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور اس خوبی سے اس خدمت کو ادا کیا کہ جس پر بعض لوگ رشک کرتے ہیں اور بعض تعجب۔

ایک شاہی مسجد کا تحفظ

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آگرہ کی کچہری کلکٹری کے قریب شاہی زمانہ کی ایک خوبصورت اور شاندار مسجد ہے جو نواب لشکر خاں کی مسجد کے نام سے موسوم ہے، اس مسجد کے علاوہ قرب و جوار میں اور کوئی مسجد نہیں ہے جہاں مسلمان نماز پڑھ سکیں یہ مسجد بھی آباد نہ تھی بلکہ شکستہ اور مرمت طلب تھی

خود رو گھانس اور کوڑے کرکٹ نے اس کو غیر کارآمد اور بھیانک بنا رکھا تھا، عدالت کے بعض غریب اہلکاروں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس مسجد کی مرمت کر کے نماز باجماعت کا انتظام کیا کر دیا جائے تو قرب و جوار کے رہنے والوں اور عدالت کے مسلمان اہلکاروں کو سہولت ہو، لیکن نہ تو ان غربا کے پاس سرمایہ تھا نہ کسی سے مانگنے کی ہمت پڑتی تھی مگر بغیر مانگے چارہ کار نہ تھا۔ اس لیئے دستِ طلب دراز کرنا پڑا یعنی چندہ کی ایک باقاعدہ فہرست کھولدی جس میں صرف نہایت ضروری مرمت اور صفائی کے لیئے طوعاً یا کرہاً لوگوں سے چندہ کے لیئے اپیل کی گئی اور کل دو سو روپیہ پبلک سے طلب کیا لیکن اس پر بھی طلب کرنے والے اپنی گمنامی کی وجہ سے مایوس تھے اُن کا خیال تھا کہ شاید یہ قلیل رقم بھی وصول نہو سکیگی۔

یہ شاہی مسجد جس کی مرمت کا خیال چند غریب مسلمانوں کو پیدا ہوا ۱۸۶۶ء میں واگزاشت کی گئی تھی اس سے پہلے یہ سرکاری مطبع اور میونسپل بورڈ کے مطبع کا کام دیتی تھی اور ۱۸۵۷ء میں صدر تحصیل تھی، اگرچہ واگزاشت ہونے پر بعض لوگوں نے اس کی مرمت و نگہداشت کی لیکن پورے طور پر مرمت کا انتظام نہ ہو سکا۔

غرض کہ ۶ رجولائی ۱۹۰۹ء کو منشی سعید احمد صاحب اہلکار کلکٹری نے بمشورۂ بعض دیگر اصحاب مسجد کی مرمت کے لیئے ایک درخواست مرتب کی سب سے پہلے نواب حاجی محمد اسماعیل خاں نے بیس روپیے دیئے جن سے مرمت کی ابتدا ہوئی، اسی زمانے میں مولانا محمد شعیب صاحب لٹریری اسسٹنٹ آثار قدیمہ نے مرمت مسجد کے لیے منشی سعید احمد صاحب کو پانچ روپیہ دیئے، اس کے بعد مسجد کی حالت اور کام دیکھ کر مولانا موصوف کو اس کے لیئے ایسا جوش اور تعلق خاطر پیدا ہوا کہ انھوں نے اپنی فرصت کا تمام وقت اس کام کے لیے وقف کر دیا وہ گھر گھر پھرتے تھے اور گلے میں جھولی ڈال کر بازار میں چندہ مانگتے تھے، جب مسجد فی الجملہ درست ہو گئی تو مسجد کی آبادی کے لیئے ایک مکتب جاری کرنا تجویز کیا گیا، چنانچہ ۲۳ رمئی ۱۹۱۱ء کو مدرسہ محمدیہ کے نام سے اس مکتب کا افتتاح ہوا، تین بچے مکتب میں داخل ہوئے پانچ روپیہ ماہوار کا مدرس

مقرر کیا گیا، مولانا محمد شعیب صاحب کو اس مکتب کے قیام ترقی کا خاص خیال تھا لیکن اُنھوں نے جولائی ۱۹۱۳ء میں وفات پائی، اُس وقت مدرسہ کا خرچ ترقی کرکے سینتیس روپیہ ماہوار تک پہنچ گیا تھا۔

انگریزی اسکول

مولانا محمد شعیب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد منشی سعید احمد صاحب نے باوجود بے بضاعتی اس بار کو اُٹھایا، اُنھوں نے جو کچھ کیا اسکا حال ناظرین کو آئندہ سطور سے معلوم ہوگا۔ غرض مدرسہ محمدیہ علیٰ حالہ جاری رہا اور اس کے علاوہ ۲۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کو پانچویں درجہ تک کی تعلیم کے لیئے ایک انگریزی اسکول بھی جاری کیا گیا اور بیادگار مولانا محمد شعیب مرحوم اس کا نام شعیب محمدیہ اسکول رکھا گیا، بے سروسامانی کی یہ حالت تھی کہ ماسٹر کے واسطے کرسی بلکہ مونڈھا تک نہ تھا کچھ مدت تک ماسٹر نے ایک پرانے ٹاٹ پر بیٹھ کر تعلیم دی۔

۷ ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو پرنس حمید اللہ خاں بہادر کے توسل سے جو بسلسلہ اجلاس کانفرنس آگرہ تشریف لائے تھے، علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں امداد کے لیئے درخواست پیش کی گئی، علیا حضرت نے جنوری ۱۹۱۴ء سے پچاس روپیہ ماہوار جاری فرمائے بعد ازاں نومبر ۱۹۱۶ء سے اس رقم کو دو چند فرماکر سو روپیہ ماہوار کر دیئے جس سے اسکول کی بنیاد مستحکم ہو گئی۔

انجمن محمدیہ اور اس کے مقاصد

ابتدا سے یہ سب کام انجمن محمدیہ کے ماتحت ہوتے تھے جو چند عزیزوں نے قائم کی تھی۔ ۱۰ ر جنوری ۱۹۱۹ء کو (ساڑھے نو سال کی عمر میں) انجمن رجسٹرڈ ہو گئی اور باقاعدہ طور پر اس کے ضوابط و مقاصد مرتب و مکمل کیئے گئے، ممبروں اور عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا، چنانچہ جن لوگوں نے آغاز کار سے اس کام میں حصہ لیا تھا زیادہ تر اُنہی کی جماعت میں سے ممبروں کا انتخاب ہوا، اور انجمن کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

(۱) آگرہ کی شاہی مسجد موسومہ مسجد لشکر خاں (مسجد ٹلکٹری) کی مرمت و نگہداشت اور اُس کی زیب و زینت و آبادی کا انتظام کرنا، اور بشرط ممکن آگرہ یا قرب و جوار کی دیگر مساجد کو اپنے زیر اہتمام لے کر اُن کی مرمت و نگہداشت کا انتظام کرنا۔

(۲) آگرہ کے موجودہ مدرسہ محمدیہ کو جو ۲۲ مئی ۱۹۱۱ء سے جاری ہے اور جس میں سنی المذہب مسلمان بچوں کو دینی اور دنیوی اور عام بچوں کو دنیوی اور اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے قایم و برقرار رکھنا اور جہاں تک ممکن ہو اس کو ترقی دیکر اعلیٰ درجہ کی اخلاقی اور مذہبی درسگاہ بنانا۔ الخ

(۳) آگرہ کے موجودہ شعیب محمدیہ ہائی اسکول کو جو مولانا محمد شعیب صاحب ٹونکی المتوفی شعبان ۱۳۳۱ھ کی یادگار میں ۲۹ دسمبر ۱۹۱۳ء سے جاری کیا گیا ہے اور جسمیں اسکول لیونگ تک تعلیم ہوتی ہے مسلمان لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے واسطے اور جہاں تک اس مقصد میں رکاوٹ پیدا نہ ہو دیگر اقوام و مذہب کے لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے واسطے قایم و برقرار رکھنا اور جہاں تک ممکن ہو اُس کو ترقی دینا اور حسب ضرورت اس کی شاخیں و سکشن قائم کرنا اور اس میں سررشتہ تعلیم کے قواعد کے مطابق انگریزی اور دینی عام تعلیم کے علاوہ مسلمان بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کرنا۔

(۴) کتب خانہ محمدیہ کو جو ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ سے عوام الناس کی فائدے کی غرض سے اور بالخصوص شعیب محمدیہ اسکول اور مدرسہ محمدیہ کے طلبہ کے مطالعہ کی غرض سے قایم کیا گیا ہے، قایم و برقرار رکھنا اور اُس کی موجودہ کتابوں، قدیم یادگاروں، اور دیگر علمی اشیاء کی حفاظت کرنا، اور اُن میں اضافہ کرنا خصوصاً اردو، عربی، فارسی، انگریزی کی ایسی مذہبی اور اخلاقی اور تاریخی کتابیں جمع کرنا جن کے مطالعہ سے مسلمانوں میں صداقت اسلام اور اخلاقِ حسنہ پیدا ہوں اور اُن کی مذہبی اور تاریخی معلومات میں ترقی ہو۔

(۵) بشرط ممکن قدیم نادر و نایاب اور جدید مفید مذہبی اخلاقی اور تاریخی کتابوں کو شایع کرنا یا شائع کرنے میں امداد دینا۔

(۶) آگرہ کے صغیر فاطمہ نسواں اسکول کو جو دسمبر ۱۹۱۰ء سے جاری ہی قایم و برقرار رکھنا اور جہاں تک ممکن ہو اس کو ترقی دینا۔

(۷) حتی الامکان بلا لحاظ مذہب و ملت قابل امداد غریبوں مسافروں، بیواؤں، یتیموں اور مریضوں کی امداد اور دستگیری اور تیمار داری کرنا اور لاوارث مسلمان مردوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا یا اور کوئی رفاہ عام کام انجام دینا۔

(۸) تبلیغ اسلام اور مسلمانوں کو بذریعہ وعظ و نصیحت پابند شرع شریف بنانے کی کوشش کرنا اور اخلاق حسنہ کی تعلیم دینا۔ الخ۔

یہ امر باعث مسرت اور قابل ستایش ہی کہ انجمن کے پرجوش بانی اور کارپردازوں نے نہایت جوش اور مستعدی سے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے سعی کی اور اُنکی سعی کے نہایت خوش گوار نتائج ظاہر ہوئے، عام انجمنوں کی طرح یہ مقاصد صرف کاغذی نہیں ثابت ہوئے بلکہ ان پر عمل بھی کیا گیا جس کی کیفیت حسب ذیل ہی۔

مسجد کی تجدید

(۱) آگرہ کی شاہی مسجد (یا مسجد کلکٹری) جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہی نہایت شکستہ حالت میں تھی اگر چند روز اور توجہ نہ کی جاتی تو منہدم ہو جاتی لیکن انجمن کی توجہ سے عہد شاہی کی یہ یادگار محفوظ رہ گئی، انجمن نے ۶ جولائی ۱۹۰۹ء سے مسجد کی تعمیر و تجدید کا کام شروع کیا ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء تک انجمن کو اس مقصد کے لیے [illegible] ۴ر۶ چندہ ملا، جس میں سے [illegible] ۱۳ بمد مرمت اور [illegible] ۱۱ر۹ بمد دیگر اخراجات کل [illegible] ۸ر۹ صرف ہوا، بقیہ رقم یعنی [illegible] ۵ر۹ میں سے مبلغ [illegible] بطور دست گرداں اسکول کے ذمہ رہا، اور [illegible] ۵ر۹ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء تک زیر تحویل تھا علاوہ اس روپیہ کے جو مرمت مسجد کے سلسلہ میں انجمن نے براہ راست صرف کیا انجمن کی

تحریک سے دوسرے اربابِ خیر نے بطور خود بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیا، چنانچہ ایک خوش نصیب بزرگ نے مسجد کا شاندار صدر دروازہ اور پتھر کا پختہ فرش ڈیڑھ ہزار کے صرف سے تعمیر کرایا، تعمیر و تجدید کا سلسلہ اب تک جاری ہے مسجد خوب آباد و پُر رونق ہے، پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے، خصوصاً جمعہ کو بہت بڑا مجمع نمازیوں کا ہو جاتا ہے۔ اسکول اور بورڈنگ کی وجہ سے اس مسجد کی رونق اور بھی بڑھ گئی ہے، اور گرد و پیش کی جدید تعمیر نے اس کے منظر کو نہایت دلچسپ اور پُر عظمت بنا دیا ہے۔

مدرسۂ محمدیہ

(۲) انجمن کا مقصد ثانی مدرسہ محمدیہ کی تکمیل و ترقی ہے، اس مدرسہ کا افتتاح ۲۳ رمئی ۱۹۱۱ء کو عمل میں آیا تھا۔ اور اس کا مقصد مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت تھا۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ مدرسہ برابر ترقی کر رہا ہے اس مدرسہ میں پہلے قرآن مجید، اُردو، فارسی، حساب اور جغرافیہ کی تعلیم دیجاتی تھی، کچھ مدت بعد عربی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا، اس مدرسے نے نہایت مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کرلی ہے۔ شہر کے ہر محلہ کے لڑکے یہاں پڑھنے آتے ہیں۔ تعلیمی نتائج قابل اطمینان ہیں اور طلبہ کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ اس مدرسہ نے اُردو اور دینیات کا نصاب خود تیار کر کے جاری کیا ہے جسکو اسلامیہ مکتب کمیٹی نے منظور کر لیا ہے اور جو رفتہ رفتہ دوسرے مقامات میں بھی رائج ہو رہا ہے۔ اسکول میں علاوہ تعلیم کے تربیت کا بھی خاص اہتمام ہے، غریب نادار بچوں سے کوئی فیس نہیں لیجاتی بلکہ حتی الامکان کتابیں بھی مدرسہ کی طرف سے مہیا کی جاتی ہیں۔

۲۳-۱۹۲۲ء (۱۲ ماہ) میں مدرسہ کی آمدنی [illegible] ۹/۶ اور خرچ [illegible] ۱۴/۹ رہا منجملہ اس کے [illegible] ۱۰/۶ صرف تنخواہ ملازمین پر صرف ہوا، میونسپل بورڈ آگرہ سے اس مدرسہ کو بطور امداد [illegible] ماہوار ملتا ہے۔ انسپکٹر صاحب مدارس اسلامیہ اور دوسرے معزز صاحبان نے معائنہ کے بعد مدرسہ کے متعلق نہایت عمدہ رائے قائم کی ہے اور حساب کتاب کی خوش اسلوبی اور صفائی کا خصوصیت سے اعتراف کیا ہے۔

شعیب محمدیہ اسکول

(۳) انجمن کا ایک مقصد شعیب محمدیہ اسکول کی تکمیل و ترقی ہے، اسکول کا افتتاح ۲۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ہوا، پانچویں درجہ تک تعلیم کا انتظام تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ ۵ جولائی ۱۹۱۵ء کو آٹھواں درجہ (مڈل) کھولا گیا یکم اگست ۱۹۱۷ء کو یونیورسٹی سے الحاق ہوا، ۲۱ جولائی ۱۹۱۸ء سے سائنس اور کامرس کی تعلیم شروع ہو گئی، آغاز کار سے ۳۱ دسمبر ۱۹۱۸ء تک اسکول کی آمدنی [illegible] اور مصارف [illegible] ہوئے، جولائی ۱۹۱۹ء سے ایک ایم اے ایل ٹی ہیڈ ماسٹر کا تقرر کیا گیا، اسٹاف کی تنخواہوں کا صرف قریباً نو سو روپیہ ماہوار تک پہنچ گیا، سائنس، کامرس اور ڈرائینگ کی تعلیم پر معقول توجہ کی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں [illegible] کا سامان اور آلات سائنس مہیا کیے گئے، پانچ جدید ٹائپ ایک ہزار نو سو روپیہ میں خریدے گئے اس مد میں ایک ہزار روپیہ گورنمنٹ نے بھی دیا اس اضافہ سے اسکول میں ٹائپ کی دس مشینیں ہو گئیں بقدر گنجائش عمارت و فرنیچر کا انتظام بھی کیا گیا اور چند کمرے تعمیر کیے گئے چنانچہ اس وقت ۱۳ بڑے کمرے اور ۹-۱۰ چھوٹے اور کافی سامان اسکول میں موجود ہے، ۱۹۱۹-۱۹۲۰ء میں جدید قسم کا فرنیچر خاصی مقدار میں مہیا کیا گیا، جس پر [illegible] صرف ہوئے منجملہ اس رقم کے [illegible] گورنمنٹ سے ملا۔

۷ جولائی ۱۹۱۹ء سے یہ اسکول ترقی کر کے ہائی اسکول ہو گیا ہے اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہر مسلمان کی توجہ کا مستحق ہے، بالفعل اسکول میں ۲۷۶ طلبہ تعلیم پاتے ہیں، اور یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ منجملہ ان کے ۵۹ ہندو ہیں ۱۶ طلبہ پرائیویٹ طور پر پڑھتے ہیں۔

۱۹۱۹-۱۹۲۰ء میں اسکول کی جملہ مدات کے مصارف [illegible] تھے (اور انجمن کی جملہ مدات کا مجوزہ بجٹ [illegible] تھا) خالص تعلیمی مد کے علاوہ تعمیر، فرنیچر، ٹائپ، سامان سائنس اور وظائف پر مبلغ [illegible] صرف کیا گیا، من جملہ اس کے [illegible] گورنمنٹ

سے وصول ہوا۔

سنہ ۱۹۲۲ء/۱۹۲۳ء (از اپریل سنہ ۱۹۲۲ء تا مارچ سنہ ۱۹۲۳ء) میں مختلف ذرائع سے ۱۳ر۹ کی آمدنی ہوئی اور ۱۲ر۹ صرف ہوا من جملہ ان مصارف کے ۱۳ر۳ تنخواہ ملازمین اور ۱۱ر۳ تعمیر و مرمت کے متعلق ہی۔

اسکول کا عام چندہ نہ تو زیادہ ہی نہ مستقل، یکمشت عطایا کی مقدار بھی ناکافی ہی، آمدنی کا بڑا ذریعہ لوکل گورنمنٹ، دولتِ آصفیہ، اور دربار بھوپال کی مستقل اعانت اور فیس کی آمدنی ہی، لیکن ایک اعلیٰ درجے کے ہائی اسکول کے لوازم بہم پہنچانے کے لیئے مزید سرمایہ اور مستقل آمدنی کی ضرورت ہی، اور یہ ضرورت مسلمانوں کی ادنی توجہ سے پوری ہو سکتی ہے بشرطیکہ مسلمان اس ضرورت کو محسوس کریں۔

یہ مسئلہ مدت سے طے ہو چکا ہی کہ مسلمانوں کے مخصوص اسکول اور کالج اُن کے لیئے گورنمنٹ کے عام اسکولوں اور کالجوں سے زیادہ مفید ہیں اور مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کو بہتر طریقہ سے پورا کر سکتے ہیں، اس بنا پر مسلمانوں کا یہ فرض ہی کہ جو اسلامی اسکول و کالج قائم ہو چکے ہیں اُن کے استحکام و ترقی سے غفلت نہ کریں، شعیب محمدیہ اسکول بھی ایک قومی اسکول ہی جو آگرہ اور قرب و جوار کے مسلمانوں کی ایک بڑی خدمت انجام دے رہا ہی۔ اسکول میں لڑکوں کی مذہبی و اخلاقی تعلیم کا خاص اہتمام و انتظام ہی یہاں تک کہ تمام اساتذہ کے لیئے ارکان اسلام کی پابندی لازمی ہی، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندو لڑکوں کی مذہبی تعلیم کا بھی ایک گھنٹہ مقرر ہی اور ایک پنڈت اس کام پر مامور ہی۔

اسکول کا اسٹاف نہایت بہتر ہی، حتی الامکان طلبہ کے لیئے تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں، غیر مستطیع طلبہ کی فیس یا تو معاف کر دی جاتی ہی یا بقدر نصف لی جاتی ہی، حسب گنجائش پڑھنے کی کتابیں بھی اُن کو دیجاتی ہیں۔

انجمن محمدیہ کے ماتحت علاوہ مدرسہ محمدیہ اور شعیب محمدیہ اسکول کی اور مکاتب و مدارس

بھی ہیں جن میں سنہ ۱۹۲۰ء کی رپورٹ کے مطابق ۳۰۶ طلبہ زیرِ تعلیم تھے، غرض یہ اسکول اور جملہ متعلقہ مدارس اسقدر مفید کام کر رہے ہیں جس کا ہر معائنہ کرنے والے کو اعتراف کرنا پڑتا ہی۔

کُتب خانہ

(۴) انجمن کا ایک مقصد کتب خانہ محمدیہ کا قیام ہی، یہ درحقیقت انجمن کا ایک لائق ستائش کارنامہ ہی، یہ کتب خانہ قایم ہی اور ترقی پذیر حالت میں ہی، اس کے تفصیلی حالات ہم آخر میں عرض کرینگے۔

تالیف و اشاعت

(۵) انجمن کا ایک مقصد مفید کتابوں کا شائع کرنا ہی، باوجود بیمائیگی اس سلسلہ میں انجمن نے جو کام کیا ہی وہ بسا غنیمت ہے، چنانچہ مسلمان بچوں کیواسطے مذہبی و تاریخی رسالوں کا ایک مفید سلسلہ مرتب کیا ہی۔ اس سلسلہ کی چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو اسقدر مفید ہیں کہ مختلف اسلامی مکاتب نے انکو اپنے نصاب میں داخل کر لیا ہی ان رسائل کے علاوہ آگرہ، فتحپور سیکری اور مساجد آگرہ کے متعلق بھی بعض مفید و دلچسپ کتابیں شائع کی گئی ہیں، مثلاً بوستانِ اخیار، اور رہنمائے فتحپور سیکری وغیرہ۔ اُمید ہی کہ سرمایہ بہم پہنچنے پر انجمن اس سلسلہ میں زیادہ مفید کام انجام دیگی۔

زنانہ اِسکول

(۶) انجمن کا ایک مقصد زنانہ اسکول کا قیام تھا جس کا افتتاح ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء کو عمل میں آیا، چار لڑکیوں سے زنانہ اسکول کی ابتدا کی گئی، مارہرہ کے ایک بزرگ حافظ محمد سعید صاحب نے اپنی مرحومہ لڑکی صغیر فاطمہ کا زیور و اسباب اس مقصد کے لیئے عطا فرمایا، جس سے اس مدرسہ کا ابتدائی سامان بہم پہنچایا گیا، بالفعل یہ اسکول ایک کرایہ کے مکان میں جاری ہی، لڑکیوں کو گھر دینے لانے کیلئے سواری کا بھی انتظام ہی کم و بیش ۶۰ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں سنہ ۱۹۲۲ء ۱۹۲۳ء میں زنانہ اسکول کی آمدنی ۳۱۳ ص ۸ اور مصارف ۹ / ۸ / ۱۱۵۵ تھے، زنانہ اسکول کو آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس سے بھی معقول ماہانہ امداد ملتی ہی۔

غربا کی امداد

(۷) انجمن کا ایک مقصد غربا کی امداد اور مسلمان مردوں کی تجہیز و تکفین ہی اس مقصد کے متعلق بھی انجمن نے بقدر گنجائش مفید کام کیا ہی چنانچہ انفلوئنزا (جنگی بخار) کے زمانہ میں انجمن کے ممبروں اور کارپردازوں نے گھر گھر پھر کر دوائیں

تقسیم کیں اور مردوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔

اِس سلسلہ میں خاص کام انجمن نے یہ کیا کہ سول سرجن آگرہ سے مراسلت کرکے شفاخانہ آگرہ کے لاوارث مسلمانوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام اپنے ذمہ لیا پہلے یہ صورت تھی کہ شفاخانہ کی طرف سے نعش عہ دیا جاتا تھا اور جن لوگوں کے متعلق یہ کام تھا وہ کسی نہ کسی طرح مردوں کو زمین میں داب دیتے تھے۔ جب یکم مئی ۱۹۲۱ء سے یہ خدمت انجمن کے متعلق ہوئی تو اس نے پہلے ہی سال (۱۹۲۱ء میں) ۲۰ لاوارث مسلمانوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا، اس کام میں بعض مقامی ارباب خیر بھی انجمن کی مدد کرتے ہیں اور بروقت ضرورت کفن وغیرہ کا انتظام کر دیتے ہیں ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں انجمن نے ۱۲ ۱۰ تجہیز و تکفین پر اور امداد غربا و مساکین پر صرف کئے

تبلیغ اسلام

(۸) انجمن کا ایک مقصد تبلیغ اسلام، مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح اور بذریعہ پند و موعظت ان کو پابند شرع بنانا ہی، آج ۱۹۲۳ء میں ہر شخص اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہی لیکن انجمن محمدیہ مدت سے عملی طور پر بقدر استطاعت اس خدمت کو انجام دے رہی ہی۔ جب سے فتنۂ ارتداد نے سر اُٹھایا ہی تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہی کہ اس فتنہ کی استیصال کا سب سے بہتر طریقہ دیہات میں اسلامی مکاتب کا قیام ہی نیز یہ کہ ملکانہ راجپوتوں کی طرف جو مسلمانوں کی بے پروائی کی وجہ سے برائے نام مسلمان رہ گئے ہیں خاص طور پر توجہ کی ضرورت ہے۔ انجمن محمدیہ کو اس ضرورت کا اب سے چند سال پہلے احساس ہو چکا تھا، چنانچہ اس نے ساندھن (ضلع آگرہ) میں ایک مدرسہ (صدیقیہ) جاری کر دیا تھا، "ساندھن" وہ مقام ہی جو فتنۂ ارتداد کے آغاز سے مختلف جماعتوں کی کشمکش و مقابلہ کا میدان بنا ہوا ہی، اور پے در پے آریوں کے حملے اس پر ہوتے رہتے ہیں، اخبارات کے ذریعہ سے اس مقام کو خاص شہرت ہو چکی ہی، آج کل بھی انجمن فتنۂ ارتداد کے متعلق خاص کام کر رہی ہی جس کو عام طور پر شائع کرنا غیر ضروری بلکہ ناموزوں ہی۔ غرض انجمن کے تمام کاروبار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ہر حیثیت سے وہ مسلمانوں کی نہایت مفید خدمت کر رہی ہی۔

کتب خانہ

ہر تعلیم گاہ کے ساتھ کتب خانہ کی ضرورت ایسی مسلم ہے کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا، ترقی یافتہ ممالک میں معمولی معمولی آبادیاں اور اسکول بھی کتب خانہ اور میوزیم سے خالی نہیں کتب خانوں کا وجود قوموں کی علمی ترقی اور احساس و بیداری کی علامت ہے، لیکن افسوس کہ ہندوستان میں ابھی تک کتب خانوں کے قیام کا رواج نہیں بڑے بڑے شہر جہاں پڑھے لکھے لوگوں کی کافی تعداد موجود ہے کتب خانوں سے خالی ہیں، اس حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کوئی کتب خانہ کہیں نظر آجاتا ہے تو اُس کا وجود غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

انجمن محمدیہ کے ماتحت بھی کتب خانہ محمدیہ کے نام سے ایک کتاب خانہ موجود ہے۔ جو ۱۸ رجنوری ۱۹۱۶ء سے قائم ہے اگرچہ تعداد کتب کے لحاظ سے یہ کتاب خانہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تہی دستی کی حالت میں بغیر صرف زر محض شوق و ولولہ کی بنا پر ایسا قیمتی ذخیرہ کتابوں کا جمع ہو گیا ہے تو تعجب ہوتا ہے، چھپی ہوئی کتابوں کے علاوہ قلمی کتابوں کا بھی ایک کافی ذخیرہ یہاں موجود ہے جن میں بعض نادر الوجود ہیں، متعدد کتابیں خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یا نظر ثانی کی ہوئی ہیں، موجودہ عہد کے بعض مشہور مصنفین کے مسودات بھی موجود ہیں، مثلاً علامہ شبلی کی مشہور کتاب شعر العجم کی ایک جلد کا مکمل مسودہ جسکا بڑا حصہ خود مصنف مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور پورے مسودہ پر مصنف نے جا بجا اصلاح و ترمیم کی ہے کتب خانہ محمدیہ میں محفوظ ہے۔

تعداد و نوعیت کتب تمام کتابیں ۲۰ اصناف پر تقسیم کی گئی ہیں، آخر اکتوبر میں جب ہم نے کتب خانہ دیکھا تو کتابوں کی تفصیل بلحاظ نوعیت و تعداد حسب ذیل تھی۔

فن	اُردو	فارسی	عربی	دیگر السنہ	میزان
(۱) قرآن مجید و تفسیر	۳۸	۱۵	۹۱	۱	۱۴۵

فن	اُردو	فارسی	عربی	دیگر السنہ	میزان
(۲) حدیث	۹	۲	۹۶	۰	۱۰۷
(۳) فقہ، عقائد، فرائض وغیرہ	۱۳۹	۴۲	۸۴	۱	۲۶۶
(۴) اوراد، وظائف، خطب وغیرہ	۱۰۳	۲۱	۴۷	×	۱۷۱
(۵) تصوف و اخلاق، پند و موعظت	۱۱۵	۱۱۸	۸	۳	۲۴۴
(۶) الف۔ سیرت نبوی، نعت و مولود	۱۴۴	۲۲	۱۹	۱	۱۸۶
(۶) ب۔ بزرگانِ دین کے حالات	۱۳۹	۲۲	۹	۴	۱۷۴
(۶) ج۔ عام تاریخ، سوانح عمریاں، سفرنامے	۲۸۷	۸۷	۴	۱۰	۳۸۸
(۷) ادب و انشاء	۱۹	۱۲۷	۲۹	×	۱۷۵
(۸) کلیات و دواوین	۷۲	۸۴	۷	۵	۱۶۸
(۹) مثنویات	۳۵	۸۹	×	×	۱۲۴
(۱۰) صرف و نحو، و درسیات وغیرہ	۱۰۰	۱۴۹	۲۴۷	۱	۴۹۷
(۱۱) قصص و افسانہ	۸۱	۶	۵	۲	۹۴
(۱۲) مناظرہ	۱۳۲	۱۰	۱۲	×	۱۵۴
(۱۳) لغت و مصطلحات	۱۰	۳۱	۹	۶	۵۶
(۱۴) طب و حکمت	۳۴	۱۳	۱۰	×	۵۷
(۱۵) صنعت و حرفت، تجارت و زراعت	۲۴	×	×	×	۲۴
(۱۶) جغرافیہ	۲۱	×	×	×	۲۱
(۱۷) تعلیم نسواں یا زنانہ لٹریچر	۱۱۵	×	×	×	۱۱۵
(۱۸) مختلف علوم	۲۰۳	۳۹	۱۰	۱	۲۵۳
(۱۹) موقت الشیوع رسائل، رپورٹ، لیکچر	۹۱۹	۱	۱۰	×	۹۲۱

(۲۰) مُصنّفین و مولفین کے خود نوشت مسودے ۳۳ ۳ ۱ × ۳۷
۲۷۷۲ ۸۸۲ ۶۸۹ ۳۵ ۴۳۷۸

مندرجۂ بالا تفصیل کے مطابق ۴۳۷۸ کتابیں السنۂ مشرقیہ کی کتاب خانہ محمدیہ میں موجود ہیں منجملہ اس تعداد کے ۱۴۱۴ قلمی ہیں، انگریزی کتابیں جو اسکول لائبریری کے متعلق ہیں اور روزمرّہ کے استعمال یا مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں اس کے علاوہ ہیں۔

نادر الوجود کتابیں

قلمی کتابوں کے متعلق تو عام طور پر لوگوں کا خیال ہی کہ اُن میں بعض کتابیں نایاب یا نادر الوجود ہوتی ہیں لیکن مطبوعہ کتابوں کو عموماً کوئی اہمیت نہیں دیجاتی بلکہ یہ سمجھا جاتا ہی کہ چھپی ہوئی کتابیں بازار میں آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں اور ضرورت کے وقت ہر شخص اُن کو حاصل کرسکتا ہی حالانکہ یہ صحیح نہیں اُردو، فارسی عربی کی سینکڑوں چھپی ہوئی کتابیں ایسی ہیں جو قلمی کتابوں کی طرح عزیز الوجود ہیں، جو کتابیں تھوڑی تعداد میں ایک دفعہ شائع ہوئیں اور دوبارہ اُن کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی وہ سب اسی مد میں شامل ہیں، یہ کتابیں اب بازار میں دستیاب نہیں ہوسکتیں، پرائیوٹ کتب خانوں میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں لیکن لوگوں کو عام طور پر اُن کی اطلاع نہیں۔ خود ہماری نظر سے ایسی بہت سی کتابیں گزری ہیں جو اب کہیں نہیں ملتیں، کتب خانہ محمدیہ بھی اس قسم کی کتابوں سے خالی نہیں۔

حقیقت یہ ہی کہ اپنی مادری زبان کی طرف سے مُسلمانوں کی بے توجہی افسوسناک حد تک پہنچ گئی ہے، ضرورت تھی کہ ابتدا سے ابتک اُردو زبان میں جو کچھ شائع ہوا ہے اُس کا ایک ایک پُرزہ جمع کرکے کسی ایک مرکزی کتب خانہ میں محفوظ کرلیا جاتا تاکہ اُردو زبان کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوتا، نیز یہ کہ عہد بعہد جو تبدیلیاں زبان میں ہوئیں یا اختلاف مذاق و انقلاب حکومت سے جو اثر زبان پر پڑا اُس کا حال آسانی سے معلوم ہوجاتا، سب سے بڑھکر یہ کہ ہمارے اسلاف کی سالہا سال کی جانکاہ دماغی محنت کے نتائج محفوظ ہوجاتے، جس سے

اُردو زبان اور اُس کی بہترین تصنیفات کی تاریخ مرتب کرنے میں آسانی ہوتی ، جس قدر اس کام میں تاخیر ہوتی جائیگی اس قسم کی تاریخ مرتب کرنے کی دشواریاں بھی بڑھتی جائیں گی ، جب اُردو تصنیفات کی کم یابی کی حالت یہ ہی کہ شمس العلما ، محمد حسین آزاد جیسے ریزہ چین اور قدرشناس کو جو قدما اور اساتذہ کا ایک ایک لفظ سر د آنکھوں پر رکھتے تھے ، بعض شعرا کے دواوین اور تذکرے باوجود جستجو نہ ملسکے اور اُن کو اُردو زبان کی صحیح اور مکمل تاریخ مرتب کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی حالانکہ وہ بہ نسبت ہمارے اُن مصنفین اور شعرا سے قریب العہد تھے تو ایسی حالت میں اس کی کیا توقع ہو سکتی ہی کہ اب یا آئندہ جب کہ ناقدر شناسی کا یہ عالم ہی ۔ یہ جواہر گرانمایہ جمع ہو سکینگے ۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اُس کا یہ موقع نہ تھا لیکن اسلاف کی صدسالہ علمی جدوجہد کی بربادی ایک ایسا افسوسناک واقعہ ہی جس پر ماتم کرنے کے لیئے کسی موقع کی ضرورت نہیں

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہی

نالہ پابند نے نہیں ہی

بہرحال یہ عرض کرنا مقصود تھا کہ باوجود قلّت بضاعت اور فقدان وسائل کتب خانہ محمدیہ جیسے قلیل العمر کتب خانہ میں جو کچھ موجود ہی وہ بسا غنیمت ہی ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم بالاجمال بعض کتابوں کے حالات لکھتے ہیں ۔

(۱) تفسیر زاہدی مصنفہ ابو نصر احمد بن محمد بن الحسن سلیمانی الشہیر بزاہدی المتوفی ۵۱۹ھ یہ مکمل تفسیر کتب خانہ محمدیہ میں موجود ہی ، مالک کا نام قاضی عبداللہ ابن فیروز لکھا ہی ، سنہ کتابت نہیں معلوم ، لیکن ایک جگہ سنہ خرید ۹۳۵ھ لکھا ہی ، اس لحاظ سے بھی یہ کتاب ۴۰۰ سال سے زیادہ عمر رکھتی ہی قاضی عبداللہ سے مراد غالباً قاضی عبداللہ سندھی ہیں جو علمائے قرن عاشر سے تھے ، کتاب کی ابتدا حسب ذیل الفاظ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ نُوْرًا مضئًا وَجَعَلَ اتباعه دِیْنًا رضیًا الخ

(۲) نفحات الانس مصنفہ مولانا جامیؒ یہ کتاب ۸۸۳ھ میں تصنیف ہوئی، پیش نظر نسخہ زمانہ تالیف کے قریباً ۱۲ برس بعد مصنف کی زندگی ہی میں (۸۹۵ھ میں) لکھا گیا، ۱۲ ر شعبان کو اس کی کتابت ختم ہوئی، یہ نسخہ ایک مرتبہ ۱۰۹۹ھ میں بمقام لاہور اور دوسری دفعہ ۱۱۵۲ھ میں بمقام شاہ جہاں آباد فروخت ہوا، مصنف نے ۱۸ محرم جمعہ ۸۹۸ھ میں وفات پائی تاریخ وفات "من دخلہ کان آمنا" اس نسخہ کے متعلق یہ بھی کہا گیا کہ خود مصنف کے ہاتھ لکھا ہوا ہے لیکن میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔

(۳) شرح عقائد نسفی - عقائد کی مشہور کتاب جو درس نظامیہ میں داخل ہے مصنف کا نام علامہ سعد الدین تفتازانی ہے، اس کتاب کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ کتب خانہ محمدیہ میں موجود ہے، جس پر مصنف کے قلم کی لکھی ہوئی حسب ذیل عبارت حاشیہ پر درج ہے۔

۷۸۶

"اتفق اتمام ہذا الشرح لی اواخر شعبان سنۃ ثمان وستین وسبعمائۃ

وانا مؤلفہ الفقیر الی اللہ القوی مسعود بن عمر القاضی المدعو بسعد الدین

التفتازانی غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن فی الدار الیہما والیہ"

گویا یہ نسخہ قریباً چھ سو سال کا لکھا ہوا ہے، اور مصنف کے ہاتھ میں رہ چکا ہے، ان وجوہ سے اسکے نادر الوجود ہونے میں کلام نہیں۔

(۴) کلمات طیبات، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زریں مقولوں کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا ہے تمام کتاب مطلا و مذہب ہے اور خطاطی کے لحاظ سے بھی نظر افروز کتابت کا ۹۲۶ھ ہے۔

(۵) زیج الغ بیگی، کتابت ۲۳ ر ذی الحجہ ۱۰۹۴ھ نوشتہ مظفر علی ولد محمد حسین محرر حیدر محل مالک محمد رضا ولد غیاث الدین محمد منجم یہ زیج جدید سلطانی کی شرح ہے، شارح کا نام عبد العلی بن محمد بن حسن برجندی ہے، جو علمائے قرن عاشر سے ہیں۔

سلطان السعید الغ بیگ میرزا اپنے والد شاہرخ میرزا ابن امیر تیمور کی وفات کے

بعد فرماں روا ہوا، اس کا دار السلطنت سمرقند تھا، اس کے فرزند میرزا عبد اللطیف نے اُس سے بغاوت اور سرکشی کی، آخر الامر میرزا الغ بیگ اپنے ناخلف فرزند کے حکم سے قتل کیا گیا لیکن اس برگشتہ بخت بیٹے کو بھی ۶ ماہ سے زیادہ سلطنت کرنا نصیب نہ ہوا، مرزا الغ بیگ علم ہیئت کا بڑا ماہر تھا اُس نے رصدگاہ موسومہ رصد اُلغ بیگ سمرقند میں بنوائی تھی۔

اس کی تاریخ وفات حسب ذیل ہے ؎

الغ بیگ آں شاہ جم اقتدار | کہ دین نبی را از و بود پشت
ز عباس شہد شہادت چشید | شدش سال تاریخ عباس کشت

(۶) کتاب لیلیٰ مجنوں موسوم بہ بہارستان عشق مصنفہ غلام اعظم الدین خاں بہادر نامی، یہ ایک مثنوی ہے، جو ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی، اُس زمانہ کی جنوبی ہند کی اُردو کا دلچسپ نمونہ ہے، مصنف نے دیباچہ میں نواب کرناٹک کی مدح میں اپنی سادگی سے جو اشعار لکھے ہیں اُن میں سے بعض نقل کیے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ عبرت و بصیرت کا باعث ہونگے۔

اشعار مدح

عمدۃ الامرا بہادر کا جناب | اس زمانہ کا ہے بے شک آفتاب
ملک کرناٹک کا شاہ بے نظیر | ہے امیر ابن الامیر ابن الامیر
دودمانِ انوری کا ہے چراغ | اس سے تازہ خانداں کا خانہ باغ
فیض میں ثانی والا جاہ ہے | کیوں نہو آخر وہ ظل اللہ ہے

پھینک کر تدبیر اور دانش کا دام | کرلیا انگریز کوں اپنا غلام
رام اُسکے ہوگئے کفار سخت | عقل کی قوت ہے یہ یا زور بخت
باوجود شانِ و شوکت کے تمام | آگے اس کے دستہ بستہ ہیں غلام
سب فرنگی روبرو اس کے ذرا | کر نہیں سکتے ہیں کچھ چون و چرا

یہ تو کیا ہیں بلکہ اُن کا بادشاہ | حکم میں اُس کے ہی ہر شام وپگاہ
بھیجتا ہی جو ولایت سے جہاز | بھیجتا ہی اس کو وہ نذر و نیاز
ایسے موذی ہو گئے محکوم جب | عقل کامل ہیچ اس کے کیا عجب

(۷) نغمہ آرا، ترجمہ اردو مثنوی غنیمت، سید نظام الدین صاحب ٹونکی نے یہ دلچسپ ترجمہ ۱۸۸۸ء میں کیا ہی اب تک شائع نہیں ہوا، مثال کے طور پر دو شعر مع اصل و ترجمہ نقل کئے جاتے ہیں ؎

نہ دیدم کشورے غارتگر تاب | } | نہ دیکھا میں نے کوئی ملک ایسا
بخوبی ہائے حسن آباد پنجاب | | کہ ہی پنجاب حسن آباد جیسا
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور | } | وہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خوردہ بجانش آب کوثر | | قسم کھاتا ہے جس کی آب کوثر

(۸) اشعار والہ داغستانی، یعنی ایران کے مشہور شاعر علی قلی خاں کے چیدہ کلام کا مجموعہ جس کو ۱۱۵۶ھ میں شمس الدین فقیر المتوفی ۱۱۸۱ھ نے جمع کیا ابتدا میں ایک مختصر دیباچہ بھی ہی۔ یہ مجموعہ (یا بیاض) حُسنِ کتابت و لطافت مذاق کے لحاظ سے بھی قابل دید ہی، اس سے اندازہ ہوتا ہی کہ اُس زمانہ میں باوجود بُعدِ مسافت ہمعصر شعرا اور اہلِ علم کے باہمی تعلقات کیسے تھے۔

(۹) شرح فصوص الحکم (مولانا جامیؒ)، کتابت ۹۶۰ھ، یہ نسخہ بھی نادر الوجود اور قابل مطالعہ ہی، ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہی، الحمد للہ الذی زین خواتم القلوب الخ

(۱۰) مواہب لدنی۔ یہ بھی پرانا نسخہ ہے کتابت ۱۰۳۱ھ مصنفہ احمد بن محمد بن الخطیب القسطلانی نوشتہ میر محمد ابن نور محمدؒ

(۱۱) عوارف المعارف شیخ شہاب الدین سہروردی، تصوف کی مشہور کتاب ہی جو نسخہ کتب خانہ محمدیہ میں ہی وہ ۱۰۱۹ھ کا لکھا ہوا ہی۔

(۱۲) کیمیائے سعادت، اگرچہ یہ کتاب عام طور پر چھپ چکی ہے لیکن یہ نسخہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ شاہنشاہ عالمگیرؒ کے وزیر دانشمند خاں (ملا شفیعائی) کا تصحیح کردہ ہے اور جابجا حاشیہ پر اُن کے دست وقلم کی عبارتیں موجود ہیں۔

(۱۳) گلزار ابرار (فارسی) کتابت ۲۹ محرم ۱۱۲۱ھ سنہ ۳ جلوس شاہ عالم بادشاہ نوشتہ غلام محمد بن عبدالوہاب (مقام قلعہ مندو صوبہ مالوہ) مصنف کا نام مولوی محمد غوثی ابن حسن ابن موسیٰ شطاری ہے ولادت ۹۶۲ھ بمقام قصبہ مانڈو جس کو زمانہ قدیم میں مندو کہتے تھے، یہ شیخ وجیہ الدین احمد علوی احمد آبادی کے شاگرد تھے، گلزار ابرار کی تالیف سے ۱۰۲۲ھ میں فراغت پائی، ساتویں صدی کے آغاز سے ۱۰۲۲ھ ۴۲۲ برس کے اولیاء اللہ کے حالات لکھے ہیں اصل کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی، ایک فیاض رئیس کی بدولت اُردو ترجمہ شائع ہوا تھا اب وہ بھی نہیں ملتا، کتاب نہایت دلچسپ اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔

(۱۴) بحر الحقیقت حکیم ثنائی نوشتہ ۱۰۴۳ھ۔

(۱۵) ارشاد الطالبین مولانا جلال محمود تھانیسری نوشتہ ۱۰۶۷ھ

(۱۶) رسالہ وحدت وجود حضرت شیخ عیسیٰ نوشتہ ۱۰۵۰ھ

(۱۷) مخزن اسرار مولانا نظامی گنجوی نوشتہ دیوان مان سنگھ ۱۰۹۰ھ

(۱۸) مخزن اسرار نظامی کتابت ۱۰۳۴ھ

(۱۹) دیوان عرفی، اس کے دو نہایت عمدہ قلمی نسخے موجود ہیں ایک رجب سنہ ۵ جلوس محمد شاہی کا، دوسرا ۱۱۵۰ھ

(۲۰) رقعات عالمگیری کے متعدد صحیح نسخے موجود ہیں ایک نسخہ ۱۲۳۴ھ کا لکھا ہوا ہے

(۲۱) احکام عالمگیری بہار دانش کے مصنف نے جمع کئے ہیں پُرانا قلمی نسخہ ہے۔

(۲۲) گل رحمت مؤلفہ محمد سعادت یار خاں روہیلکنڈ کے مشہور نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی دلچسپ پُر از معلومات قلمی سوانح عمری اس کتاب کے مصنف خود نواب

ممدوح کے خاندان سے ہیں ۱۲۴۹ھ میں تالیف ہوئی۔

(۲۳) شرح مواقف، پرانا نسخہ ۱۱۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۲۴) شرح القطر مصنفہ احمد ابن علی الکربلائی (در علم نحو) کتابت ۹۸۰ھ

(۲۵) کشف اللغات والاصطلاحات مؤلفہ احمد سوز نوشتہ ۱۰۹۶ھ

(۲۶) فرہنگ رشیدی مؤلفہ عبدالرشید الحسینی (عہد شاہجہانی کا لکھا ہوا نسخہ)

(۲۷) ستہ ضروریہ حکیم یوسفی نوشتہ ۹۲۴ھ

(۲۸) دفتر سوم مثنوی مولنا روم نوشتہ ۵ شعبان ۱۰۹۲ھ

(۲۹) خزائن الفتوح امیر خسرو دہلوی نوشتہ محمد صلاح جعفری کتابت ۱۱۸۲ھ

(۳۰) مثنوی خواجو کرمانی المتوفی ۷۴۲ھ نوشتہ ۱۲۱۸ھ

(۳۱) وقایہ مع حاشیہ سنہ کتابت رجب ۸۴۳ھ

(۳۲) تفسیر حسینی نوشتہ ۸۹۹ھ

(۳۳) چہار عنصر مرزا بیدل نوشتہ ۱۲۰۵ھ

(۳۴) گلستان نوشتہ ۱۱۳۷ھ و بوستان نوشتہ ۱۱۳۰ھ

(۳۵) ترجمۂ اردو گلستان (قلمی) مسمیٰ بہ باغ اردو ۱۸۰۲ء میں بمقام کلکتہ بعہد مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ہند لکھی گئی، خاتمہ پر حسب ذیل اشعار ہیں ؎

عون و توفیق رب سبحانی | ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے پیر عقل سے کی | میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدائے بہار سے یہ کہا | باغ اردو ہوئی گلستان اب

(۳۶) نگار راضی ترجمہ گلستان منظوم از دیوان جانی بہاری لال بھرت پوری

(۳۷) دلآرام راضی ترجمہ بوستان منظوم " " "

(۳۸) ارژنگ راضی ترجمہ انوار سہیلی منظوم " " " ۱۲۸۹ھ

(۳۹) قصہ چہار درویش اُردو کے ابتدائی دور کی مشہور کتاب یہ نسخہ ۱۲۶۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب کا نام عباس بیگ عرف آغا مرزا،

(۴۰) قصہ حیرت فزا، مصنفہ کمتر شاہ، کتابت ۱۲۴۹ھ قدیم اُردو کا دلچسپ نمونہ

خاتمۃ الکلام ہم نے بخوف طوالت صرف چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، کتابوں کے علاوہ کتب خانہ میں اور بھی نامور و کمیاب چیزیں موجود ہیں (گویا ایک میوزیم کی بنیاد بھی پڑ چکی ہے) مثلاً مختلف قسم کے پتھر جو آگرہ یا ہندوستان کے بعض دوسرے مقامات میں موجود ہیں، مختلف ظروف جو قدیم ہندوستانی صنعت کا نمونہ ہیں، مشہور خوشنویسوں کے قطعات اور تحریریں مثلاً دور آخر کے مشہور خطاط میر پنجہ کش کی ایک تحریر، مختلف نقشے گزشتہ جنگ کے متعلق تصویریں اور دوسرے معلومات، اور قریباً سو برس کی جنتریوں کا مکمل سلسلہ، علم تجوید کے متعلق کاشغر کی ایک نہایت عمدہ قدیم تصویر جس میں نہایت خوبی سے حروف کے مخارج کو بتایا ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، غرض اس قسم کی متعدد چیزیں موجود ہیں لیکن قلتِ گنجائش تفصیل سے مانع ہے۔

بہرحال آگرہ کا اسکول، کتب خانہ اور مدرسہ وغیرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ معمولی اشخاص بھی اگر عزم و استقلال سے کام لیں تو کیسے بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں آگرہ کا یہ کاروبار نتیجہ ہے منشی سعید احمد صاحب مارہروی کی سعی و کوشش کا جن کی لگاتار محنت، بلند ہمتی اور دیوانہ وار مصروفیت کی بدولت سینکڑوں مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو گیا، وہ کلکٹری کے ایک اہلکار رہیں، ہائی اسکول کے منیجر اور مسجد کے مہتمم و جاروب کش ہیں، مدرسہ و کتب خانہ وغیرہ کے بانی و نگراں اور قومی گداگر ہیں، متعدد تاریخی کتابوں اور اسکول کے سلسلہ دینیات کے مؤلف و مصنف ہیں، دفتر کے محرر اور اسکول و بورڈنگ کی تعمیر کے انجنیر ہیں، غربا و مساکین کے دوست ہیں اور انکی دوستی صرف زندگی تک محدود نہیں، بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی ساتھ نہیں چھوڑتے یہاں تک کہ بے کس و لاوارث غربا کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر کے اُن کو

پہلی منزل تک پہنچا دیتے ہیں، ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جب ضرورت ہوتی ہے تو پھاوڑہ لے کر مزدوروں کے ساتھ کام کرتے ہیں، یہ سعادت اُن کو بارہا نصیب ہو چکی ہے، بڑی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہے، اس پر قانع نہیں، اُن کی بلند نظری کا تقاضا اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

ہماری دعا ہے کہ خدائے عزوجل اُن کے ارادوں میں برکت اور اُنکے عزم و استقلال اور اخلاص میں روز افزوں ترقی دے، اور مسلمانوں کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ قوم کے اصلی خدام کی عزت کرنا اور مدد کرنا سیکھیں۔

محمد اکرام اللہ خاں (ندوی)

نوٹ: متعلق مضمون بالا:- (۱) بالفعل مدرسۂ محمدیہ کے اسٹاف کا ماہانہ صرف سالانہ [illegible] ہے، نو اُستاد تعلیم پر مامور ہیں، شعیب محمدیہ ہائی اسکول کے اساتذہ و معلمین اور ملازمین دفتر وغیرہ کی تنخواہیں [illegible] ماہوار ہیں ہیڈ ماسٹر ایم اے، ایل ٹی، سائنس ماسٹر بی ایس سی، ایل ٹی۔ تین اسسٹنٹ ماسٹر بی اے بقیہ ماسٹرین مختلف قابلیت کے (لیکن سند یافتہ) ہیں، عربی و فارسی کے استاد پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل و منشی فاضل ہیں، مع ہندی ٹیچر کے کل ۱۲ اُستاد تعلیم پر مامور ہیں۔ (۲) پرائیویٹ میٹرک کلاس مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے سلسلہ میں ۹۰ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ (۳) ایک مدرسہ شبینہ بھی جاری ہے جسمیں بالفعل ۲۲ لڑکے داخل ہیں اور دو استاد انگریزی اور اُردو و دینیات کی تعلیم دیتے ہیں، انمیں ایک بلا تنخواہ کام کرتے ہیں۔ (۴) لوکل گورنمنٹ سے [illegible] ماہوار اور حیدرآباد سے [illegible] ماہوار شعیب محمدیہ اسکول کو ملتا ہے۔ (۵) زنانہ اسکول بالفعل ابتدائی حالت میں ہے۔ استانیوں وغیرہ کی تنخواہوں کا خرچ [illegible] ماہوار ہے۔

ندوی

مقالاتِ علمیہ

تعلیم کے مقاصد

ہمارے ملک میں ابھی تک نہ نظام تعلیم مکمل ہوا ہے اور نہ پڑھانے لکھانے کا مقصد ہنوز معین و محدود ہے تاہم موجودہ نظام پر سرسری نظر ڈالنے سے دو بڑے مدسامنے آتے ہیں پہلا یہ کہ صنعت و حرفت یا پیشہ کے لیے تیار کرنے کی غرض سے علوم الطبعیہ کی مناسب شاخوں کی تعلیم دیں اور نوجوان کو اس قابل بنا دیں کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی حوائج زندگی کو بے منت پورا کر سکے اگرچہ اس سے ملک و ملت کے حقوق و فرائض ادا کرنے کی نفی نہیں ہوتی پھر بھی تعلیم کا رُخ کچھ خود بخود نفس پرستی اور تن آسانی کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ ایسے تعلیم یافتہ کی عمر انفرادی مطالبوں کے پورا کرنے میں گزر جائے اور اجتماعی مصلحتوں کا اسے کچھ بھی خیال نہ رہے۔ اس سے اخلاق کا دامن بھی آلودہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح کی تعلیم کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ مرئیات اور اشیاءً موجود فی الخارج کی حقیقت تک ناپ تول کر پہونچنے کی عادت ہو جاتی ہے اور وہ جو کچھ سائنس کے اصول و مسلمات قائم کرتا ہے انہی سے مذہب و روحانیت کا اندازہ بھی کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص ان باتوں کا عادی ہوگا تو اُس کے اخلاق و عقاید کی شہ رگ کمزور ہو جائینگی قوم و ملت کے ساتھ مشترک بخیال و عمل نہ رہیگا

دوسری مد میں علوم عامہ۔ ادبیات۔ تاریخ و سیر کی تعلیم آتی ہے اس کا مقصود یہ ہے دل و دماغ کی تربیت جس سے انسان کے اعلیٰ قوائے ذہنیہ۔ لطیف احساسات۔ اور برگزیدہ جذبات منکشف اور مجلی کرنا مقصود ہے مثلاً متصورہ اور خیال کی پروا نہ

بڑھے۔ فیوض باطنی کو مدد ملے۔ ذہن و ذکاوت ترقی پذیر ہوں۔ جو حسن و قوت کا مبدء ہیں بصیرت میں صفائی۔ حواس میں نظام پیدا ہو۔ خلاصہ یہ کہ اس تعلیم کا منشا ہے دل و دماغ کو نورانی کرنا۔ اور اگرچہ یہ مقام محمود ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوتا پھر بھی اپنی اپنی فطرت اور جبلت کی مناسبت سے تنویر کا حصہ کم و بیش سب کو مل جاتا ہے اور اُس میں وہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جن کے اشارے سے ذاتی منفعت کے بغیر ملک و ملت کے حقوق و فرائض پہچان لیں اور اُن کے ادا کرنے کا شوق پیدا ہو جائے۔

علوم الطبیعہ کے احسانات سے انکار کرنا بالکل لغو ہے یہ وہ قوت ہے جو ذہن کے سامنے نوادر قدرت کے انبار لگا کر اُسے خود ہی متحیر اور بیخود کرتی ہے اور پھر خود ہی اسباب و نتائج کے سلسلے سامنے ڈال کر ذہن کو مقام حیرت سے باہر نکال لاتی ہے۔ علم الطبیعات ہی ہے جو ذہنی قوتوں کو بے محابا اور آوارہ گرد نہیں ہونے دیتا بلکہ بار بار مشق کرا کر اُنھیں قواعد اور ضوابط کا پابند کرتا ہے۔ تطبیق و تناسب قایم کرنا سکھاتا ہے صحیح مشاہدہ کا ملکہ بلا واسطہ اس سے تربیت پاتا ہے۔ مشترکات اور محسوسات ذاتی سے استدلال کرنے اور نتائج نکالنے کی عادت اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ نوجوان علم الطبیعہ کی مدد سے صحیح اصول و مسلمات قایم کرنے سیکھتے ہیں بلکہ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ اگر علم الطبیعہ مدونہ کرے تو ذہن کو ترتیب و انضباط کی عادت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ خصوصاً ہمارے ملک کا نظام تعلیم اور حلقہ اساتذہ دونوں اس کے سخت مزاحم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نوجوانوں میں اکثر بے فکری اور سہل انکاری کی عادت ہوتی ہے۔ اساتذہ اُن میں تحقیق و تدقیق کی قوتوں کو زندہ نہیں کر سکتے نتیجہ یہ ہے کہ کسی کرشمہ قدرت کو دیکھ کر ان کے دل میں کوئی تموج پیدا نہیں ہوتا کہ ذہن اُس کی ریشہ دوانی میں مصروف رہے اور سہل انکاری غالب نہ ہونے پائے۔ مگر علوم الطبیعہ کی تعلیم دل میں تموج پیدا کرنے کی استعدادوں کو زندہ کرتی ہے۔ طبیعہ کی تعلیم سے قوت حافظہ کو بڑی مدد ملتی ہے مگر متصورہ پر زیادہ اثر نہیں ہوتا طبیعات کے ماہر صراحتاً یا معناً

ہر وقت مصروف کار رہنے میں وجہ یہ کہ اسباب و نتائج کل نظر کے سامنے تنقید کی ترازو میں تلتے
رہتے ہیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا نازیبا نہ ہوگا کہ طبیعات کے منتہی اگر ادبیات سے بھی ذوق رکھتے
ہوں تو اس کو جیہ میں بھی وہ بہت اچھے مبصر اور نقاد سخن بن سکتے ہیں۔ الغرض نوجوانوں
کو خارجی ملکات کو طبیعات سے بڑی ترقی ہوتی ہے۔ مگر باینہمہ انسان کو ایک ایسے بلند
مطمح نظر کی ضرورت بھی ہے جو اُسے علوم و معارف کے سدرۃ المنتہیٰ کا راستہ بتلائے۔
تجارت کے بازار میں کام کی تعداد اور خارجی جلوہ آرائی کی بنا پر معاوضہ ملتا ہے یہاں
حسن باطن کی قدر نہیں مگر معارف کے مینا بازار میں صرف قوت کا حسن بکتا ہے مادیات کی
وہاں زیادہ قدر نہیں اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیمی مقاصد اس طرح معین کیے جائیں کہ نہ
صرف علمی مدارج سے گزرنے میں بلکہ دنیاوی زندگی کی منزل آخر تک ہر طرح کا زاد راہ انسان
کے ساتھ رہے تعلیم کا مقصد اولین صنعت و دستکاری کو عبور کرنا نہیں بلکہ علمی اور ادبی مسائل
میں تجربہ حاصل کرنا ہے۔ نقد و تبصرہ کا ملکہ طبیعات سے ضرور بڑھتا ہے مگر مافی الضمیر کو
ادا کرنے کی قابلیت فلسفہ اور ادبیات کے ہاتھ ہے یعنی تبصرہ کے نتائج کو اسقدر جامعیت
اور اختصار کے ساتھ بیان کرنا کہ گویا کانٹے میں تلا ہوا ہے تخمیناً اور تقریباً کے الفاظ کے
پردے نہ پڑے ہوئے ہوں کہ یہ بھی تذبذب اور ابہام اور شک کی ایک صورت ہے۔ یہ
سب علوم و فنون قدیمہ کی تحصیل کامل پر منحصر ہے جیسے کہ کسی انسان کو صرف کھانے کپڑے
ہی کی ضرورت نہیں بلکہ اور بہت سے فرائض بھی اس کے ذمہ ہیں۔ ہم پیشہ و ہم مشرب
جماعتوں کا وطن اور ملت کا ایک ایک فرض اس کے ذمہ عائد ہوتا ہے۔ پھر خود اس کے
دل و دماغ کے جذبات ذہنی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ احساسات پر عدل و حریت کے مطالبے
حقوق عامہ کے تقاضے غرضکہ انسان ٹیلیفون کی بیٹری کی طرح بے شمار تاروں کا مرکز ہے
اور اسے ہر بات کا جواب دینا لازم ہے۔ گو مشینوں کلوں کی ساخت پر ملک کی صنعت
و حرفت کا دار و مدار ہے اور اسی پر ملک کی فلاح کا انحصار۔ مگر محض مادی مقاصد جینے

کے لیے کافی نہیں زندگی کی عالی شان عمارت میں ایک منزل پر اسباب تن پروری کا کتبہ بھی نصب ہے حالانکہ تعلیم کا مقصد زندگی کی تمام ضروریات کے لیے نوجوانوں کو تیار کرنا ہے پیشہ وروں اور حرفت کاری کی قابلیت پیدا کرنے سے یا سائنس اور ٹیکنیکل محض کی تحصیل سے صرف انسان کا اخلاقی یا ظاہری حصہ یقیناً آراستہ ہو جائیگا لیکن وہ باطنی اور روحانی جسد جو اس غلاف کے اندر ہے اور جو جمیع اقسام کی ذہنی اور اخلاقی جذبات سے بھرا ہوا ہے اُس کی حسن افزائی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ علوم عامہ اور فنون لطیفہ کی تحصیل لاحاصل ہے۔ اور نہ السنہ قدیمہ و اقوام گذشتہ کے علوم وفنون کا مطالعہ تضیع اوقات ہے حقیقت میں علوم جدیدہ کی بنیاد اُنھیں پر ہے بغیر اس کے انسانی تہذیب ومعاشرت کا مکمل سلسلہ نظر کے سامنے نہیں ہوگا۔ سیر وتواریخ کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ اسلاف کے قومی حیات کے حوادث کیا تھے اُن کے مکتوبات اور مفروضات سے اُن کے احساسات اور جذبات کا پتہ ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی گھوڑ دوڑ میں کس طرح گام زن تھے اور ہم کس طرح ہیں اُن کا زاویہ نظر کس طرف تھا اور ہمارا نکتہ نگاہ کہاں ہے۔ اُنھیں ہم پر اور ہمیں اُن پر کن کن خصوصیات میں افضلیت حاصل ہے قدما کے علوم وفنون کو اُن کے صدیوں کے حسن سعی وعمل مخلصانہ جد وجہد کی تاریخ کا مطالعہ بیکار نہیں۔ نہ معارف مذہبیہ اور فلسفہ کُبرا کی تعلیم بے سود ہے بلکہ ان میں عادت الٰہی اور قانون فطرت کی منشا چھپے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے بالمقابل موجودات فی الخارج کی گتھیہ تک پہونچنا اور اس مقصد کے لیے علوم الطبیعہ کی ایک یا چند شاخوں پر عبور کرنا بھی ایک ناگذیر ضرورت ہے یہ دونوں چہرہ انسانیت کی دو آنکھیں ہیں۔ زندگی کی دو سانسیں ہیں میزان حیات کے دو پلّے ہیں اور بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ۔

ہر نفس کہ فرو مے رود

ان وجوہ کی بنا پر علوم وفنون کی پرورش فرض اولین ہے مگر یہ بات اُسوقت

حاصل ہوگی کہ نصاب تعلیم میں جامعیت ہو یعنی علوم و معارف کے چشمے بھی اُس سے جاری ہوں اور علوم الطبیعہ اور صنعت و دستکاری کے لوازم بھی ساتھ شامل ہوں لیکن یہ دونوں باتیں جو ہمیں آج متضاد معلوم ہوتی ہیں اُسوقت ایک ساتھ حاصل ہونگی کہ ہم ابتدائی تعلیم و تربیت کو صاحبزادے آفتاب احمد خاں صاحب کی تجویز کے مطابق بدل ڈالیں اور بچپن ہی سے دونوں شعبوں کی تعلیم دینی شروع کریں حسن اتفاق سے فطرت کا منشا بھی یہی ہے اس لیے کہ بچے ہاتھ کے کاموں اور دستکاری کی جانب طبعًا مائل ہوتے ہیں اُن کے اس میدان سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور مانٹی ساری طریقے کو ملک میں رائج کرنا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ولایت میں جس تفصیل سے یہ کام ہو رہا ہے بجنسہ اُسکی نقل ہندوستان میں اُتاری جائے۔ بلکہ اصول کا دامن نہ چھوڑیے ہمیں امید ہے کہ علی گڑھ کی تحریک بھی اب اپنا رخ بدلیگی۔ اور ملک کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ابتدائی تعلیم کی استحکام کی جانب متوجہ کریگی۔ اس لئے کہ اگر بزرگی اور بڑائی جوانی سے پیدا ہوتی ہے تو بزرگی اور جوانی دونوں بچپن کے خانہ زاد اور پروردہ ہیں۔ تعلیمی دُنیا میں جوانی گویا ثانوی تعلیم کے ہم پلہ ہے اور بزرگی اعلیٰ تعلیم کے ہم رتبہ ہے مگر یہ دونوں ابتدائی تعلیم کے قدرتی نتائج ہیں اور اُس سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ جب بچپن کی نشو و نما صحیح ہوتی ہے تو انسان بڑھاپے تک مقبول اور برگزیدہ رہتا ہے۔ جوانی میں جوان صالح اور بڑھاپے میں پیر دانا کہلاتا ہے۔ اسی طرح اگر بچہ کی ابتدائی تعلیم صحیح اصول پر کی گئی ہے تو والدین و مربی مطلقًا فکر نکریں وہ خود اپنے ذوق سے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم تک ضرور پہونچیگا اس لیے مقدم بچپن کی تعلیم و تربیت ہے نہ کہ یونیورسٹی کے مدارج حاصل کرنا۔

اگر ملک و ملت نے اس طریقہ تعلیم و تربیت کو قبول کرلیا تو صدیوں کی کشمکش جو بچہ اور بڑے میں چلی آتی ہے بہت کچھ ختم ہوجائے گی یعنی بچہ اپنے فطری تقاضوں کے مطابق کچھ چاہتا ہے اور بڑا اپنے خیال کے مطابق اُسے کچھ دیتا ہے۔ فطرت الٰہی بچہ کو ایک مدت مدید اس لیے

دیتی ہے کہ وہ تفکر کے گرداب میں پڑنے سے پہلے اپنے جسم کی تعمیر مکمل کر لے۔ پھر ایک اور مہلت اس لیے دیتی ہے کہ بچہ اپنے محسوسات سے وہ مواد ذخیرہ کر لے جس کی بنا پر وہ رائے قائم کرکے اپنی نئی سی زندگی کے لیے اصول مسلمات مستخرج کر لے مگر بڑا۔ کمال چیرہ دستی سے فطرت کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ اپنے بچپن کو بھول جاتا ہے اور بچہ کو بڑا ہونے سے پہلے بڑا بنانا چاہتا ہے یہی وہ کشمکش ہے جسے ختم کرنے کے لیے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بڑے استقلال کے ساتھ جدید طریقہ نہ صرف لفظوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ تعلیمی نمائش میں کرکے دکھانا چاہتے ہیں۔

اصلاح تمدن

فیشن کے بندے

تن آسانی گزیند خویشتن را — زن و فرزند بگذارد بہ سختی

تعطل اور معزولی یا بیکاری گو بجائے خود ایک حد تک ناقابلیت کی دلیل ہے مگر یہ افتاد کبھی کبھی آ پڑتی ہے اور انسان کا روزمرہ اور نقشۂ ضبط اوقات درہم و برہم ہو جاتا ہے ایسی حالت میں ہر آدمی معذور اور قابل معافی ہے۔ لیکن فیشن کے بندے مشغول اور برسر کار ہوں تب بھی پابند اوقات اور انضباط پسند نہیں کرتے۔ رات کو دیر تک تاش اور گنجفے کے طرح طرح کے کھیل کھیلتے کھیلتے بارہ ایک بج جاتا ہے۔ خبط و جنون کے انداز دکھاتے دکھاتے کبھی اس سے بھی زیادہ رات تک جاگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ صبح کو آٹھ بجے سے پہلے نہیں اُٹھ سکتے ان کے خادم اور نوکران سے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ انھیں مجبوراً دو گھنٹے پہلے اُٹھ بیٹھنے کی عادت ہوتی ہے۔ اور جس وقت یہ اپنے مختل دماغ کو جھوٹی نیند سے صحیح کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں تو اُن کے خادم صبح کے سہانے وقت سے جسمانی اور روحانی دونوں فائدے اُٹھاتے ہیں آخر کار شب خوابی کے لباس میں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کر ایک ملائم مخمل سلیپر میں پاؤں ڈال کر کھڑے ہوتے ہیں اور فاقہ کش بے برگ و نوا غریب آدمیوں کی روحیں فریاد اور رشک بھری نظر سے ان کے بستر پر نظر ڈالتی ہیں جہاں نواڑی پلنگ پر ایک گدگدا بچھونا ولایتی کمبل کی کئی تہیں اس پر ایک ریشم کے کام کی سوزنی بچھی ہوئی ہے اور ایک بیش بہا لحاف اور کئی ریشمی دلائیاں بکھری پڑی ہیں۔ اس تہذیب یافتہ جماعت میں بہت کم ایسے خوش نصیب ہیں جو موسمی

کافوری بتی کو اُٹھا کر خود گل کر دیں یا گل کرادیں یا اُٹھنے سے پہلے پلنگ کے برابر رکھی ہوئی گول تپائی سے سیز ر قینچی بھری کا سل کے بکس سے ایک سگرٹ منہ میں لیکر نہیں سلگا لیں۔ ہم نے یہ دلفریب نظارہ اکثر دیکھا ہے کہ علی الصباح جب محنت کش اور قلی صرف پیٹ بھرنے کی فکر میں بھاری بھاری بوجھ تیز قدمی سے لیجاتے یا کھینچتے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو ہمارے فیشن کے بندے سڑک کے کنارے مکان میں ایک بلند دریچہ سے سر باہر نکال کر نہایت اطمینان کے ساتھ سگرٹ کا دھواں اوڑا اوڑا کر ہوا میں زلف چلیپا بنایا کرتے ہیں۔ اس کے بعد غسل شروع ہوتا ہے جو معمولاً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں ختم ہوتا ہے طرح طرح کے خوشبودار قیمتی صابن کا استعمال ہوتا ہے۔ کئی قسم کے برش باری باری کام میں لائے جاتے ہیں بعض ممالک مثلاً مغرب میں اور خصوصاً انگلستان اور فرانس میں تو فیشن کے بندوں کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ غسل میں زیادہ سے زیادہ گیلن پانی اور صابن کی ایک دو ٹکیاں بہا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ریشمی حاشیہ کی بڑے بڑے ملائم روئیں دار تولیوں سے جسم پاک صاف کر کے سنگھار خانہ کی جانب قدم بڑھاتے ہیں اور ایک نرالے قسم کے بڑے آئینہ کے سامنے تقریباً گھنٹہ بھر کنگھے اور برش کا شغل جاری رہتا ہے جس کا بیشتر حصہ ڈاڑھی کی صفائی میں صرف ہوتا ہے۔ موسم کے مطابق جوڑا پہنکر سنہری کمانی کا چشمہ ناک کی جڑ پر چڑھاتے ہیں اور پھر مختلف جیبوں میں مختلف چیزیں محفوظ کرتے ہیں مثلاً کسی میں گھڑی۔ پڑھنے کا چشمہ۔ ناک صاف کرنے کا معمولی رومال۔ اور کسی میں ایک بیش بہا نفیس ریشمی رومال محض خالی ناک بجانے کے لیے۔ یہ رومال خصوصیت کے ساتھ طرح طرح کی خوشبوؤں سے بسا ہوا ہوتا ہے۔ ایک جیب میں کچھ نقد روپیہ یا نوٹ اور ایک میں کچھ خوردہ۔ ایک میں نام کے کارڈ۔ ایک میں پاکٹ بک اور ایک نفیس سنہری رو پہلی پنسل غرض خدا خدا کر کے آرائش و زیبائش ختم کر کے دن کے کام کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ مگر آغاز کار بھی لذیذ کھانوں سے ہوتا ہے۔ ایک سجی ہوئی چاریا کافی کی کشتی سامنے رکھی جاتی ہے جس میں دودھ اور مصری

کے علاوہ کئی قسم کے میٹھے نمکین بسکٹ انڈے کی ٹکیاں مکھن۔ امرود یا اناس کی جیلی (مربا) بالائی وغیرہ۔ اس وقت کی ایک راگنی یہ بھی ہے کہ بائیں ہاتھ میں ملک کا ایک ممتاز اخبار بھی کھلا ہوا ہو۔ اور یہ ایک گھبرائی ہوئی مگر کہنہ مشق نظر اپنے مذاق کے مضامین کی تلاش میں مختلف کالموں پر سرسری طور پر نظر ڈال رہے ہوں مگر بعض عالمانہ اور فلسفیانہ سرخیوں پر بغیر اس کے کہ ذیل کا مضمون پڑھیں سرخ یا نیلی پنسل سے صرف نشان بناتے ہیں محض اس لیئے کہ اُور پڑھنے والوں پر اپنے اعلیٰ علمی مذاق کا رعب جما دیں اسوقت منھ میں ایک اعلیٰ قسم کا سگار بھی ہوتا ہے۔ جس کا دھواں منھ کے بجائے ناک سے نکلتا ہے الغرض بریک فسٹ یا ناشتہ سے فارغ ہو کر خراماں خراماں گھر سے نکلتے ہیں اور دفتر یا دوکان یا کارخانہ کا رخ کرتے ہیں۔ اگر حیثیت دار ہیں تو اپنی شان کے مطابق گاڑی میں بیٹھ کر دستوں سے گپ کرنے باہر چلے جاتے ہیں۔ گیارہ سے ایک بجے تک کس وقت جو ہر درجہ زندگی کے لیئے الگ الگ معین ہے پھر وہی کھانے کی میز یا دسترخوان آراستہ ہوتا ہے وہی پرندوں اور چوپایوں کے گوشت وہی گاؤدیدہ شیرمال۔ ہلکی چپاتیاں یا توش۔ وہی میٹھے کی قاب تر میوہ۔ کافی وغیرہ کے تین چار دور ہوتے ہیں۔ پھر وہی وہسٹ، ٹرمپ، برج کے کھیل، پیانو یا ہارمونیم کے مزے عشق انگیز ناولوں کے گہرے مطالعے۔ بذلہ سنجی لطیفہ گوئی ان مشاغل میں بمشکل شام پکڑتے ہیں اور عیش و عشرت کا پھر ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے جس میں ٹینس شٹل کاک کے کھیل سرتاپا نئے لباس میں شروع ہوتے ہیں۔ جس کا ایک لازمی جزو ایک اونی سوئیٹر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ورزش جسمانی کے لیئے مطلق نہیں بلکہ صحبت دوست اور آشنا پرست ہونے کی حیثیت سے ہوتا ہے وجہ یہ کہ اسوقت کا بیشتر حصہ ٹینس کورٹ کی برابر لگی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر گذار دیتے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر پھر وہی چاء اور کافی کا دور وہی پیٹ کی غلامی وہی زبان کے چٹخارے جن کا سلسلہ دراز ہو کر

نو بجے رات کے کھانے سے مل جاتا ہے پھر وہی تاش اور شطرنج کی تفریح شروع ہوتی ہے اور مزا یہ ہے کہ لکھے پڑھے آدمی اعلیٰ تعلیم یافتہ بزرگ منش سب اسی گرداب میں چکر کھاتے رہتے ہیں۔ اور کمال سنجیدگی سے اسے تفریح سمجھتے ہیں۔

یہ ہے روزمرہ اُن صاحبوں کا جو نیک اور وضعدار کہلاتے ہیں اور جنھیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم میں کوئی اخلاقی ذمائم نہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا جینے کا یہی منشا ہے کیا اعلیٰ مقاصد حیاتیہ اسی تنگ دائرہ میں محدود ہیں۔ کیا انسان دنیا میں اس لیئے آیا ہے کہ حلقہ احباب میں بیٹھکر گرمیِ سخن دکھائے اور کھیلنے میں دکھلائے پھلی کے کباب یوں بنتے ہیں۔ مرغ مُسلم اس طرح تیار ہوتا ہے۔ لوا اور بٹیر یا کبوتر کا گوشت فلاں موسم میں بہت موافق آتا ہے مگر تمام لحوم میں بکری سے بہتر کوئی گوشت نہیں جس کا ہر عضو انسان کے ہر عضو کو طاقت بخشتا ہے۔ انڈا کھانے سے ایک پورے مرغ کی طاقت (شاید اُس کے تمام افعال کی قوت بھی) جسم میں حلول کر جاتی ہے۔ سب سے زیادہ ہاضم دوا سفوف بادیانی ہے۔ یا رحیہ بختہ سونف اتنی اور مصری اُتنی۔ ہمیں اس پر ذرا بھی اعتراض نہیں کہ بعض احباب عادتاً خوش گپ ہوتے ہیں وہ جس رنگ اور درجہ کے آدمی سے باتیں کرتے ہیں اُن کے ساتھ ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ بے شک یہ قبول عام کا بڑا اچھا لٹکا ہے۔ مگر لہو الحدیث کی حد میں آنے سے بچنا چاہیئے اپنے سے بلند تر اخلاق اور زیادہ متورع شخص سے مل کر وہ جب اونچی باتیں کریں تو اپنے افعال اور اعمال کو بھی اُسی کے مطابق بنانے کی کوشش کریں اور اگر کسی نیچی حیثیت کے آدمی سے ملکر اُس سے اُس کی سطح کی باتیں کریں تو وہ محض گلا بازی ہی پر ختم نہ کردیں بلکہ اُس آدمی کو نیچے درجہ سے اُٹھا کر اپنے عقائد اور خیالات کی بلندی تک لانے کی کوشش کریں ورنہ خوش گپی ریاکاری کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ وجہ یہ کہ نہ تو اس صورت میں اُنکا قول اُن کے عقائد کے مطابق ہوگا اور نہ قول فعل کے مطابق حالانکہ انسانیت کی بہت بڑی میزان یہی ہے اگر انہیں سے ہر ایک پلّہ دوسرے کے مطابق نہیں تو بجز اس کے کہ انسان۔ انسان ہی

صورت یہ ہے کہ حقیقت [illegible] - (ایڈیٹر)

ہمارِی تعلیمی نمائش کا ایک درجہ

یا

بچوں کی سچی مادرِ تعلم

پروفیسر مانٹی ساری کا طریقۂ تعلیم تین سے آٹھ برس تک کی عمر کے بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں تعلیم نہیں بلکہ آغوشِ مادر میں ننھے بچوں کی تربیت کے ہم پلہ ہے۔ آج مغربی ممالک میں اس جدید طرز کا وہ غلغلہ ہے کہ اس کی آواز بازگشت مشرق تک پہنچ گئی ہے ہندوستان میں بھی متعدد مقامات پر مثلاً دہلی میں اس وضع کے تربیت خانے چپکے چپکے اپنا کام کر رہے ہیں مگر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جو عرصہ دراز تک ولایت میں رہ کر اس طریقہ کا اچھی طرح سے مطالعہ کر چکے ہیں چاہتے ہیں کہ اپنے برادرانِ ملت و وطن کو علانیہ دعوت دیں اور بالعمل بتائیں کہ ننھے بچوں کے لیئے یہ طرزِ تربیت کتنا موزوں ہے تعلیمی نمائش جیسی بڑی مہم کا بوجھ انھوں نے اِسی واسطے اپنے ذمہ لیا ہے اور اگرچہ اور بھی بلند اور برگزیدہ تعلیمی مقاصد پیشِ نظر ہیں بلکہ درحقیقت تعلیم کے تمام مدارج میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک کایا پلٹ کرنا مقصود ہے اور والدین اور طلبا، اور اساتذہ میں سے ہر ایک جماعت میں اپنے فرض کا احساس پیدا کرنا مدنظر ہے لیکن تعلیمی عمارت کا سنگ بنیاد ننھے بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہی ہے۔ اور یہی نمائش کا مقصدِ اولیں ہے۔

شاید ہمارے احباب کو یہ بات سُن کر تعجب ہوگا بلکہ ایک قسم کا مشتبہ پیش آئیگا کہ پروفیسر مانٹی ساری کو مغربی دُنیا میں محض اس لیئے درجہ قبول و امتیاز ملا کہ اُس نے بچوں کی تربیت میں فطرت الٰہی کو اپنا امام وہادی بنایا اور یہ شرع شریف کے عین مطابق ہے۔ اِس لیئے کہ ہر بچہ فطرت کے دین و ایمان پر پیدا ہوتا ہے۔ اگر تعلیم و تربیت کی ذمہ دار

اُسے ایک خاص عمر تک فطرت کے احکام کی متابعت کا عادی بنا دیں تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ گویا انھوں نے بچّہ کو ایک پاک ودیعت سمجھ کر فطرت کے بخشے ہوئے دین و ایمان پر قایم رکھا۔ ورنہ اُسے گمراہ و مضلول کرنے کا بوجھ اپنی گردن پر لیا۔

فطرتِ الٰہی بچّہ میں دو خصوصیتیں ودیعت کرتی ہے۔ حریت کی محبت اور ظاہری اعضا جسم سے استغان۔ اوّل الذکر اس کے ذہنیات کی صحیح ربوبیت کرتی ہے اور دوسرے جسم کی پرورش ہمارا طرزِ تربیت اس کے بالکل برعکس ہے ہم ننھے بچوں کو ڈرا دھمکا کر غلامانہ فرماں برداری سکھاتے ہیں۔ انھیں اپنے اُصول و مسلمات کے مطابق کٹ پتلی بنا لیتے ہیں جس سے اُن کا دل و دماغ۔ جوش و جذبہ مُردہ ہو جاتا ہے ۔ ماہِ گزشتہ میں کانفرنس گزٹ کے شذرات کے ذیل میں اس موضوع پر کافی بحث ہو چکی ہے ۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ہم اسقدر سنگدل اور بےحس ہیں کہ چار پانچ برس کے بچوں کو زبردستی ملّا مکتبوں اور باقاعدہ مدرسوں میں جھونک دیتے ہیں جس سے اُن کی جسمانی نشوونما برباد اور ذہنی قوت پژمردہ ہو جاتی ہے۔ کیا اُس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان معصوموں سے فطرت کا بخشا ہوا دین و ایمان چھین لیتے ہیں۔ اس مختصر بیان سے بھی اس امر کا بالکل فیصلہ ہو جاتا ہے کہ پرفیسر مانٹی سا ری کا طرزِ تربیت شریعت الٰہی کے مطابق ہے یا ہمارا طریقہ

اس پیارے طریقہ کی تفصیل۔ اس کا نظام عمل اور نقشہ کار کاغذ کے صفحوں پر لکھنے کے قابل نہیں بلکہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جن میں شوق ہو وہ اس تعلیمی نمایش میں شریک ہو کر خود دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ اہل مغرب کی حیرت انگیز ترقی کا اصل راز کیا ہے ہم میدان زندگی میں صدہا ٹھوکریں کھا کر مردہ دلی کے اس انتہائی درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ۔ مرا ہوا پتہ۔ دبی چال۔ محنت کی عادت۔ بات سننے کو ظرف بےحد وسیع مگر باایں‌ہمہ حریت و آزادی پر اتنا مرتے ہیں کہ جس کاغذ پر یہ پاک لفظ لکھا ہوا ملتا ہے۔ اُسی بے اختیار چومنے کو جی چاہتا ہے۔ حریّت کا لفظ کان میں پڑتا ہے تو نغمہ قدسی کی مانند

کیفیت وجد طاری کردیتا ہے۔ ایک ننھے بچے کے دل سے پوچھیے کہ اُسے حریت سے کتنی محبت ہے اور قدم قدم پر حریت ہی اس کی رہنما ہے۔ جسمانی حرکت وسکون میں حریت خیال و ذہن کی ہر ایک معصومانہ پرواز میں حریت۔ کھیل اور شغل کے انتخاب کرنے میں حریت۔ نشوونما میں حریت، قصہ مختصر یہ ہے کہ بچہ حریت کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا اور یہی اُسے نصیب نہیں ہوتی۔ ہم اُسے اس طرح تربیت دیتے ہیں کہ گویا ایک دیوار ہے جس کی سطح پر سنہری روپہلی گلکاری کی گئی ہے مگر بنیاد ریت پر ہے اور اندر کھوکھلا ہے۔ نتیجہ یہ کہ صدہا کتابیں پڑھ کر اور ہزاروں صفحے کالے کرکے دیوار کی دیوار ہی رہتے ہیں۔ نہ اُن میں تخلیقی قوت پیدا ہوتی ہے نہ ذمہ داری کی عادت نہ فرض کا احساس نہ انتخاب صحیح اور ناطق فیصلہ کی قابلیت ہماری تربیت اُن میں کچھ بھی نہیں چھوڑتی ع

اگر ہے کسی میں تو ہے اتفاقی

مانٹی ساری سسٹم کا دوسرا جزو یعنی الف، بے، تے پڑھانے اور تختی لکھانے کے بجائے انھیں دستکاری سکھانا اور ایسے مشغلوں میں مصروف رکھنا جن سے حواسِ خمسہ ظاہری کی نشوونما فطرتِ الٰہی کے مطابق ہو یا ورزشِ جسمانی کی وساطت سے بدن کی خام قوتیں پختہ ہوں۔ یہ سب عین عقل ہے۔ ہم بارہا کانفرنس گزٹ میں بتا چکے ہیں بلکہ جدول دے کر ثابت کر چکے ہیں کہ سات آٹھ برس کی عمر تک فطرت کا رجحان بچے کی تعمیر جسم کی جانب رہتا ہے۔ ذہنیات کی ترقی کا سلسلہ برائے نام جاری ہوتا ہے اگر تم اس عمر میں انھیں چھپی ہوئی کتابوں کے مجہول الفاظ جبراً پڑھاؤ گے تو یہ تعمیر رک جائیگی اور ادھر دماغ بھی جاتا رہیگا۔ کوئی منصفی سے کہدے کہ مشیت الٰہی کا اتباع کون سے طریقہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مانٹی ساری طریقہ کی تعلیم میں استاد بچہ کے ساتھ مثل ایک شفیق رفیق کے رہتا ہے اس پر کلی اعتماد کرتا ہے اور اگرچہ باطن کی آنکھ تو ہر وقت نگراں رہتی ہے مگر ظاہر ادہ بچہ کو آزاد چھوڑ کر اس کا دست بن جاتا ہے۔ تاکہ اس کی فطرت

اچھی طرح اُبھر آئے۔ نشو و نما کی قوت کا جوہر اسی حرّیت میں ہے اور بچہ کی حقیقی زندگی کی
تعمیر میں بھی یہی ایک زبردست مسالا ہے۔ اُس میں ایک اور بڑا گہرا راز ہے یعنی مروجہ طریقہ
تعلیم میں تو اُستاد یا اتالیق کو نسبتاً زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اور بچہ کا وقت زیادہ تر غلامانہ
فرماں برداری اور تسلیم و رضا میں گذرتا ہے۔ مگر جدید طریقہ میں کام کا زیادہ بوجھ بچے
پر پڑ جاتا ہے اور چونکہ اس تلخی میں حرّیت کی چاشنی ہوتی ہے اس لیے بچہ خوشی خوشی زیادہ
کام کرتا ہے جس سے طباعی کی قوت کو روز افزوں ترقی ہوتی ہے۔

بچہ کی مثال ایسی ہے جیسے قطعہ زمین میں بیج کے دانے بکھیر کر باغبان کی سپرد کر دیا
جائے۔ اگر یہ سمجھدار ہے تو جب تک دانے پھوٹ کر نکلیں اور یہ اُن کو جان پہچان لے کہ
کہاں کہاں کیا کیا پودے کس کس طرح کے ہیں۔ تب تک وہ آب پاشی اور نگرانی کے
سوا کوئی دست اندازی نہیں کریگا۔ اور پھر پھول پھل کانٹا دیکھ کر بھال کر کیاریاں بنائیگا
جس طرح باغ سے کانٹے الگ نہیں ہو سکتے مگر ہاں مختصر اور کم تکلیف دہ ہو سکتے ہیں اسی طرح
بچہ میں برائیاں خفیف ہو سکتی ہیں۔ یہ جدید طریقۂ تربیت ہی اُصول سکھاتا ہے کہ پودے
اُگنے سے پہلے کھیت کو اپنے حسب دل خواہ تہ و بالا کیا جائے اور رو نما ہونے پر بھی شاخوں
کا سراپا نہ بدلا جائے بلکہ ہر ایک کی تراش خراش بجائے خود کی جائے تاکہ جیسا فطرت
نے اُسے بنایا ہے وہ ویسا ہی ہو کر پروان چڑھے۔ مروّجہ طریقہ میں یہ بڑا عیب ہے کہ
نتائج جلد دیکھنے کے شوق میں انجام آخر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ صحیح تدبر اور
مخلصانہ سعی مقدم ہے۔ بچّہ میں فطرت ہر قسم کے مادّے ودیعت کرتی ہے اگر اُسے ایک خاص
حد تک آزادی دے دی جائے تو وہ اپنے جسم دل و دماغ کی تعمیر قدرت کے بنائے ہوئے
نقشہ کے مطابق خود کر لیتا ہے۔ اُس میں جسم، ذہن، روح یا یوں کہیئے کہ قوت ذہن اور
اخلاق تینوں استعدادوں کا کافی ذخیرہ ہوتا ہے۔ اِن میں سے ہر ایک کے انکشاف
کے بہت سے ذریعے اُسے حاصل ہوتے ہیں۔ اِن میں سے کسی کی فطری نشو و نما میں مزاحمت

کرنا بچپن اور جوانی دونوں کو برباد کرتا ہے۔

جدید طرز تعلیم کے نصاب میں کتابوں کی بجائے زیادہ تر کھلونے ضرور ہوتے ہیں۔ مگر یہ سب زیادہ تر حواسِ ظاہری اور دیگر جسمانی قویٰ کو تربیت دینے والے ہوتے ہیں۔ اور کچھ اس طرح کے علمی اصول پر وضع کیے جاتے ہیں کہ بچّہ بغیر زیادہ تلقین کے خود بخود ترقی کرتا ہے۔ مثلاً چھونے کی قوت کے لیئے نرمی اور کھردراپن بتانے والے کھیل ایک حکیمانہ ترتیب سے بچے کے سامنے چُنے جاتے ہیں اور وہ ایک کو دوسرے سے خود بخود پہچان لیتا ہے۔ یا قوتِ سامعہ کی تربیت مختلف آوازوں کے جھنجھنوں سے کرتے ہیں جو ایک جگہ نصب ہوتے ہیں اسی طرح ہلکی اور بھاری چیزوں کا اندازہ کرا کر وزن اور بوجھ کی تمیز کو بچہ میں بیدار کرتے ہیں نیز قوتِ باصرہ کے لیئے دو تین آلات اِس حکمت سے بنائے ہیں کہ بچہ کی نظر اُن کے دیکھنے سے خود بخود سدھ جاتی ہے۔ مثلاً لکڑی کی یکساں لمبائی کی دس بوتلیں کم از کم پتلی سے زیادہ موٹی تک ایک جگہ ترتیب دی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور دوسری جگہ ایک سی موٹائی کی بوتلیں زیادہ اور کم سے کم لمبی سلسلہ وار نصب ہوتی ہیں۔ اور تیسری جگہ موٹائی اور لمبائی دونوں کے لحاظ سے اتنی ہی بوتلوں کو ترتیب دیتے ہیں۔ اِسی طرح بلندی کے لحاظ سے دس چھوٹے بڑے لکڑی کے ٹکڑوں کا ایک مخروطی مینار بچوں سے چنوا کر بلندی کا اندازہ کراتے ہیں۔ اِسی طرح جسامت کی پہچان بھی اسی قسم کے کھیلوں سے کرائی جاتی ہے۔ وضع اور شکل کا اندازہ بھی مختلف قسم کے کاغذ کی کٹی ہوئی شکلوں سے کراتے ہیں مثلث، مربع، مخمس، مدوّر، بیضاوی، قوس، ہشت پہلو وغیرہ وغیرہ اسی طرح رنگوں کی شناخت کراتے ہیں اور ایک چوکھٹے میں زیادہ سے زیادہ چونسٹھ قسم کے رنگین کپڑے بکس میں جسٹر کر سامنے دھرتے ہیں۔ اِن ہی کھیلوں کے پیرایہ میں لکھنے اور نقشے بنانے کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے حروف کی شکلیں بنانے کی مشق اور پہچان ہو جاتی ہے پھر حروف سے دو حرفی سہ حرفی

الفاظ بنانا سکھلاتے ہیں یونہی بے معلوم بچہ ہندسہ اور حساب سیکھ جاتا ہی۔ یہاں تک کہ ایک نہایت پُر لطف اور عجیب طریقہ سے اِنہی حکیمانہ وضع کے کھلونوں میں کسورِ عام اور کسور اعشاریہ کی اتنی اچھی پہچان ہو جاتی ہی کہ ہمارے خیال میں باضابطہ ابتدائی مدارس کے طلبا کو بھی میسر نہیں۔

یہ عجیب و غریب مدرسہ اور اس کا انوکھا نصاب اور عمل اور بچے غرض تمام تماشہ بچشم خود دیکھنے کے لیئے امسال تعلیمی نمایش میں شریک ہوجئے جو محض صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے خالص تعلیمی مذاق اور مخلصانہ سعی اور گہری حُبِّ وطنی اور قومی کا ثمرہ ہی۔

خاکسار

حامد علی صدیقی

بقیہ تنقید و تبصرہ

رسالہ تحریک لاہور

یہ ایک ماہواری ادبی رسالہ ہے جو پنجاب کے دارالحکومت لاہور سے شائع ہوتا ہے اس میں اردو زبان کی اصلاح، شعر و شاعری، ناول نویسی اور ڈرامہ نگاری کے متعلق دلچسپ و عام پسند مضامین شائع ہوتے ہیں رسالہ کے ساتھ ایک دلچسپ سیاسی ناول انقلاب فرانس کا ترجمہ بھی شائع ہوتا ہے۔ پنجاب ہمیشہ اردو کی کچھ نہ کچھ خدمت کرتا رہا ہے، یہ رسالہ بھی اس خدمت کا تازہ ثبوت ہے، امید ہے کہ اس کی قدر کی جائیگی۔ قیمت سالانہ ۳؎ ہے جو کچھ زیادہ نہیں۔

مظاہر جدید

ایک ماہواری رسالہ ہے جو دہرہ دون سے شائع ہوتا ہے، ابھی پہلا نمبر پیش نظر ہے، رسالہ کا مقصد سائنس صنعت و حرفت کی حمایت ہے، جو بے شبہ ایک مفید مقصد ہے۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ مختصر ضخامت کا ایک ماہوار رسالہ اس ضرورت کو کہاں تک پورا کرسکیگا۔ تاہم نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے، پہلا نمبر مضامین کی حیثیت سے قابلِ قدر ہے لیکن صنعت و حرفت کے متعلق کوئی عملی چیز اس میں نہیں ہے۔ امید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ رسالہ عملی مضامین کی حیثیت سے بھی ترقی کریگا اور اپنے ناظرین کے لیئے مفید ہوگا۔ قیمت بلحاظ قسم اول و دوم ۳؎ و عگم سالانہ ہے۔

ملنے کا پتہ:- **ناظر پریس دہرہ دون**

کار آمد جنتری سنہ ۱۹۲۴ء

مذکورۂ بالا جنتری مولوی نظام الدین حسین صاحب اڈیٹر ذو القرنین نے نظامی پریس بدایوں سے شائع کی ہے، ضخامت ۵۶ صفحہ تقطیع بڑی جنتری کانپوری کے مطابق۔

یہ جنتری بہت ہی مفید اور کار آمد معلومات پر مشتمل ہے، مثلاً بارہ سو برس کی جنتری، جنتری سود، جنتری برآورد تنخواہ، جنتری پیمائش چوب، محصول ریلوے پارسل، فہرست تعطیلات پنجاب، ممالک متحدہ، و ممالک محروسہ سرکار نظام، اور مختصر معلومات متعلق حفظ صحت وغیرہ اس کے علاوہ جنتریوں میں تاریخ و سنین، رفتار سیارگان وطلوع و غروب کے متعلق جو کار آمد باتیں ہوتی ہیں، وہ سب بھی اس میں موجود ہیں، ہر تاریخ کے سامنے یادداشت کا خانہ بھی ہے۔

چونکہ یہ جنتری وقت سے بہت پہلے چھپ گئی ہے اس لئے امید ہے کہ زیادہ تعداد میں شائع ہوگی۔

اودھ اخبار

جس کو سنہ ۱۸۵۸ء میں منشی نولکشور آنجہانی نے جاری کیا

ہندوستان کا قدیم روزانہ اخبار ہے اس کو سابق حالت سے زیادہ بہتر اور دلچسپ بنایا گیا ہے پبلک کے حقوق کا حامی اس کا مشیر و مددگار ہے۔ مذہبی تعصب سے پاک! ملک کی تازہ برقی خبریں قانونی کونسلوں کی مفصل رودادیں۔ نیز دیگر دلچسپ معلومات اور مفید مضامین شائع ہوتے ہیں کاغذ کتابت اور چھپائی اودھ اخبار کی ملک کے اردو اخبارات میں بہترین ہے اودھ اخبار میں اشتہار دیکر تاجر کثیر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہندوستان سے باہر بھی یہ اخبار جاتا ہے قیمت روزانہ اڈیشن سالانہ عہ قیمت ہفتہ وار اڈیشن سالانہ عہ

مینیجر:- اودھ اخبار لکھنؤ

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپیگا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف (مے) مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجنا چاہئیے اور منی آرڈر کوپن میں صاف طور سے اس کی تشریح کر دی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لئے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کیساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شایع ہو سکتے ہیں اجرت کا فیصلہ خط وکتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط وکتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ ہونا چاہیئے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمان خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

سلسلۂ جدید جلد ۲
نمبر ۶

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۲۸

دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء
جمادی الاول سنہ ۱۳۴۲ھ

کانفرنس گزٹ

یعنے

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

مرتبہ حامد علی صدیقی

جس میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک، اصولِ تعلیم، نظام تعلیم مروجۂ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر تنقید کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولنا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبد السلام

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۳۴۲ھ

(اور صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ سے شائع ہوا)

فہرست مضامین

شذرات	اڈیٹوریل اسٹاف	۱ تا ۸
محل الحواس ناقص الخلقت بچے		
خیراتی کام		
مقالاتِ علمیہ	"	۹ تا ۱۷
ابتدائی طرز تعلیم وتربیت بدلنے کی ضرورت		
اردو زبان اور مسلمان	اکرام اللہ خاں ندوی	۱۸ تا ۳۶
انگلستان کا موجودہ نظام تعلیم	اڈیٹر	۳۷ تا ۴۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

شذرات

دسمبر کا آخری ہفتہ ہندوستان کا قومی ہفتہ کہلاتا ہے یوں تو یہ ہفتہ تعطیل کا ہے جس میں اکثر سرکاری دفاتر بند رہتے ہیں اور ارباب حکومت یکسالہ محنت و مشقت کے بعد اپنا وقت پُرلطف دعوتوں، نشاط انگیز صحبتوں اور سیر و تفریح کے جلسوں میں صرف کرتے ہیں برخلاف اس کے ہندوستانی قومی کاروبار میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے اور سال گزشتہ کے قومی کام پر بحث و تبصرہ کرتے ہیں اور سالِ نو کے لیے جدید نظام عمل بناتے ہیں گویا اس ہفتہ میں تمام خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور باوجود موسم سرما کے افسردہ کن اور خون کو منجمد کرنے والی کیفیت کے خلاف توقع خون میں ایک تازہ جوش اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ یہ ہفتہ خصوصیت کے ساتھ زیادہ پُرکیف و شان دار ہوگا جس کے آثار ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں، سیاسی ہلچل تو ملک میں مدت سے برپا ہے لیکن اس سال ارباب سیاست کے شدید باہمی اختلاف نے پبلک کو سیاسی مسائل

کی طرف اور زیادہ متوجہ کردیا ہے، البتہ مسلمان آہستہ آہستہ خانہ زار سیاست سے باہر نکل رہے ہیں اور سنجیدہ لوگ اس کو محسوس کرنے لگے ہیں کہ گزشتہ سہ سالہ زمانہ میں تعلیم کی طرف سے جو غفلت کی گئی، اس کا انجام اچھا نہیں ہوا۔

امید ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کا آیندہ اجلاس مسلمانوں کے اس تازہ احساس کا نمایاں ثبوت ہوگا اب تک یہ اجلاس سہ روزہ ہوا کرتا تھا، لیکن اس دفعہ مسلسل ۷ روز تک جاری رہیگا۔ اور یہ تمام زمانہ نہایت مصروفیت میں گزریگا، انہی ایام میں شاندار تعلیمی نمائش بھی منعقد ہوگی جو کانفرنس بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی چیز ہے، یہ سب آثار اس بات کے ہیں کہ قوم میں از سر نو تعلیمی ضرورتوں کا احساس پیدا ہو رہا ہے، اور بالکل ممکن ہے کہ اس اجلاس کے بعد مسلمانوں کا ایک جدید تعلیمی دور شروع ہو جو پہلے دور سے زیادہ شاندار اور فائدہ بخش ہو۔

یہ کہا جاتا ہے کہ سیاسی مسائل کے انہماک نے عام مسلمانوں کو تعلیم جیسی فرسودہ وافسردہ تحریک سے لاپرواہ کردیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو قابل افسوس ہے کیونکہ سیاسی غلبہ واقتدار کی بنیاد بھی درحقیقت اعلیٰ تعلیم پر ہے، اور یہ امر بداہتہً ثابت ہے کہ ہندوستان کے میدانِ سیاست میں وہی قومیں پیش پیش ہیں جو زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، اور پبلک کی آواز انہی صوبوں میں زیادہ طاقتور ہے، جہاں کی آبادی تعلیم میں ممتاز ہے۔ پس اگر مسلمان تعلیم میں پیچھے رہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ سیاست میں بھی سب سے پیچھے رہینگے اور آجکل سیاست میں پیچھے رہنا ہلاکت کے ہم معنی ہے پس جو لوگ تعلیم سے استغنا ظاہر کرتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے سیاسی مستقبل کو برباد کررہے ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ سنجیدہ مسلمانوں میں اب اس فرد گزاشت کا احساس پیدا ہوگیا ہے، اور وہ زمانہ دور نہیں جب کہ وہ لوگ جو راستہ سے ہٹ گئے ہیں پھر اصلی شاہراہ پر واپس آجائینگے، اور یہ کوشش کرینگے کہ اُن کی قوم اپنی علمی وذہنی قابلیت کے لحاظ سے ہندوستان کی

ہر بہتر سے بہتر قوم کے ہمپایہ بن جائے۔

مختل الحواس ناقص الخلقت بچے ہم پہلے بھی اشارۃً بتا چکے ہیں کہ اب اہل مغرب کا التفات عام بچوں کی ابتدائی تعلیم کی جانب نہیں رہا بلکہ ناقص الخلقت مختل الحواس اور اپاہج بچوں کی جانب خاص توجہ ہے۔ اس میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ قوم اپنے افراد کثیر کے بار مصارف سے بہت کچھ سبکدوش ہوجاتی ہے۔ ایسے بچے خاص تعلیم و تربیت سے اس قابل ہوجاتے ہیں کہ اپنی ضرورتوں کو آپ پورا کریں۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ اس قابل رحم طبقہ میں اکثر ایسے افراد نکل آتے ہیں جن کے امراض کو باقاعدہ علاج سے ازالہ ہوجاتا ہے اور ان کی نسل ان امراض میں مبتلا نہیں ہوتی بلکہ اچھے تندرست افراد قوم کی طرح ملک و ملت کو فائدہ پہونچاتے ہیں۔

انگلستان میں اپاہج اور دائم المریض بچوں کے لئے سب سے پہلا تربیت گاہ یا مدرسہ ۱۸۵۱ء میں قایم ہوا تھا پھر ۱۸۶۵ء میں ایک اور مدرسہ اسی قسم کا قائم ہوا جس میں ضروری مضامین کی تعلیم زبانی دی جاتی تھی۔ اس طرح کے اور بہت سے مدرسے انیسویں صدی کے آخر تک جابجا قایم ہوتے رہے۔ مگر یہ سب فیاض منش افراد کی عنایت سے تھے حکومت کو کچھ سروکار نہ تھا۔ بالآخر ۱۸۹۹ء میں تعلیمی قانون میں اس قسم کے مدرسوں کے متعلق ایک جدید اضافہ ہوا۔ چنانچہ اس تحریک کی تاریخ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت کس طرح تمام افراد قوم نے ہم آواز ہوکر حکومت کو ترمیم پر آمادہ کیا تھا پھر بھی قوم کا رُخ زیادہ تر لنگڑوں کی جانب رہا چنانچہ جب ۱۹۱۰ء میں شمار کیا گیا تو پینتیس ۳۵ اور سینتیس ۳۷ ہزار کے درمیان لنگڑے تھے اور ملک بھر میں کل اٹھائیس مختلف مقامات میں ان کے مدرسے قایم تھے۔ بہرحال ناقص الخلقت ہونے کی تعریف اس صدی کے دوسرے عشرہ میں وسیع ہوکر اس حد تک پہونچی کہ اس کے ذیل میں ہر قسم کے ناقص الخلقت بچے داخل ہوگئے۔

آج اگر انگلستان کے تعلیمی نظام پر اس لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ ملک بھر میں صرف اندھوں کے لیئے ایک سو بارہ ۱۱۲ اور بہروں کے لیئے ۴۴ اور اور اسی طرح کے اپاہج بچوں کے لیئے جو خلقتاً ناقص ہیں ۹۳ مدرسے اور تربیت خانے قایم ہیں ان کے علاوہ ۲۰۰ سے زیادہ مدارس صرف مختل الحواس بچوں کے لیئے ہیں مگر قارئین کرام یہ نہ سمجھیں کہ ان سب کی بنا اور اہتمام صرف ایک حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ان کی خالق مجازی اور وہی اُن کی رب دنیاوی ہے۔ رضاعت سے بلوغ تک وہی ان کا سہارا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ بے شمار انجمنیں اور سوسائٹیں تمام ملک میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں وہ حقیقت میں اس کار خیر کی مجوز اور وہی بارکش ہیں حکومت بھی اپنی فرصت کے مطابق ان کا ہاتھ بٹاتی رہتی ہے۔ ان کی تعداد قلمبند جو ہم تک پہنچی ہے تقریباً ۱۵۰ ہے جس پر قوم کے تمام افراد کی تعداد منقسم ہو گئی ہے۔ مصارف کا یہ حال ہے کہ ۱۹۲۱ء ۱۹۲۲ء میں ۱۷۰۰۱۸ لاکھ پونڈ صرف ان مدارس پر خرچ ہوا جو مسلمہ اور مستند ہیں خاص خیراتی مدارس کی تعداد ہمیں معلوم نہیں۔ اس میں بورڈ اور ایجوکیشن کی جانب سے صرف چند ہزار کی امداد دی ہے۔

یہ ہے دنیا میں رہنے کا ڈھنگ جو قومیں اس حبِّ قومی اور حبِّ وطنی سے محروم ہیں انھیں طرۂ حکومت و امتیاز کی تمنا میں مرنے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

جیتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اِس نظامِ تعلیم کی ایک جدید روداد سالانہ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اپاہج بچوں کی زندگی کی کوئی ایسی ضرورت نہیں جس کی فکر ایک زبردست ذی اثر اور ذی مقدور سوسائٹی کو نہ ہو ہر ضرورت کے لیئے ایک انجمن سرگرم عمل ہے اور ہر ایک انجمن کا چلتا ہوا پرزہ ایک سلاڈیک کا ایکونٹ ایک ارل سے کم درجہ نہیں رکھتا

جس کے ساتھ ایک جم غفیر، تہہ دل سے کام کرنے والوں کا مصروف ہے۔ ہم قارئین کرام سے بہ تعظیم واجب پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک اور قوم میں کتنے اُمرا ہیں جو اس قسم کے واجب الرحم بچوں کی ربوبیت کرتے ہیں۔

نامیدی از وصالِ تو طاقت گداز بود
صد جا گرہ زدیم اُمیدِ بُریدہ را

سال بھر تو جو کچھ ہوتا ہے اُسے ہمارا ہی دل جانتا ہے مگر سال کے اخیر پر جب محبّانِ قوم و وطن قومی کام کے مرکزوں پر آکر قوم کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا تو سینہ کوبی کرتے ہیں اور چشمِ قال سے زار زار روتے ہیں مگر اُس وقت ضمیر نامی ایک فطری قوت ان کے رونے پر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ ان اشراف مخلوقات میں وہ کونسے ملکات ہیں جو فطرت نے ودیعت نہیں کئے لیکن تن آسانی، جاہ طلبی، غفلت شعاری، ادنیٰ درجہ کی حُبِّ دنیا نے روح و اخلاق کو اس طرح کھا ڈالا ہے جس طرح گھُن اندر ہی اندر لکڑی کو کھا ڈالتا ہے۔ مساحمت، بلکہ مقاومت مجہول اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ جو قوم تعلیم کے دورِ جدید کے آغاز میں ہماری اقتدا کی آرزو کرتی تھیں اُن کی امامت پر ہم آج اپاہجوں کی طرح رشک آلود نگاہیں ڈالتے ہیں اور پست ہمتی سے کہتے ہیں کہ ع

نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

جہاں اوّل آکے بیٹھے تھے وہیں بیٹھے ہیں۔ مگر کیا زندگی کے سنجیدہ افکار اور فیصلہ کن مسائل محض عشرت کدوں کے سامانِ زیبائش کی وساطت سے حل ہو سکتے ہیں؟

خیراتی کام

ہماری شامتِ اعمال سے یہ وسیع المعنی لفظ بھی اپنے اصلی مرکز سے گرتے گرتے ادنیٰ ترین درجہ پر پہنچ گیا ہے۔ کچھ تانبے کے پیسے یا نکل کی اکنیاں کسی مانگنے والے کو دے ڈالنا خیرات کا بڑا منشا نہیں بلکہ حقیقت

میں ابنائے جنس وملت کی دکھ درد میں رفاقت کرنا اصلی خیرات ہے اور ان مقاصد کو
ولایت کی خیراتی انجمنیں پورا کرتی ہیں جو اپنے حلقہ اثر میں بغیر کسی معاوضہ کے ہر ایک
از پا افتادہ کی دستگیری کے لئے تیار رہتی ہیں۔ خیرات کا یہ منشا رہے کہ برادران
ملت و وطن کی بہبودی اور خیر طلبی با لعمل کی جائے۔ اس جذبہ کا انحصار دو باتوں پر
ہے۔ انفرادی حریت اور ذمہ داری کا صحیح مفہوم پورا کرانا اور خاندان کی اجتماعی
زندگی کو مرفہ الحال اور فارغ البال کرنا یہ دونوں ضرورتیں ایسی عام ہیں کہ امیر و
غریب سب گھرانوں میں کھلی یا چھپی موجود ہیں لہذا خیراتی انجمن کی امداد کی احتیاج
سب ہی کو ہے۔ ملک کی حکومت کیسی ہی ہو، افراد قوم کسی درجہ پر کیوں نہ ہوں اس انجمن
کے وہ بھی محتاج ہیں۔ بغیر اس کے ہمارا نظام آسائش مکمل ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم میں
سے ہر ایک دوسرے کی بلا بدل خدمت کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہے۔ اور پھر سب
ہم مینال افراد ایک جسم منتظم کی صورت میں بدل کر اشتراک عمل کے ساتھ خدمت کریں
انفرادی زندگی کا جیسا کہ خاندانی اور ملی حیات کا معیار ہر پہلو پر بلند کرنا اور اس مقصد
کے لیے قابل عمل اسکیمیں تیار کرنا وغیرہ اس کے بڑے بڑے کام ہیں۔ ولایت میں
اٹھارہ بڑے مرکزی انجمنوں کے تحت میں تینتیس خیراتی انجمنیں صرف اضلاع میں کام
کر رہی ہیں۔ پھر ہر ضلع کی نگرانی میں مقامی انجمنیں الگ قائم ہیں جن کی صحیح تعداد
بتانا مشکل ہے۔ ان کے علاوہ اس خیراتی نظام میں رجسٹریشن کا صیغہ بہت بڑا شاندار
ہے۔ یعنی جو صاحب دل ان دفتروں میں اپنا نام درج کراتے ہیں انھیں وقتاً فوقتاً
خیراتی کاموں کا ایک روزنامچہ ملتا رہتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس انجمن کو کیا کیا
خیراتی کام درپیش ہیں اور ہر کس و ناکس کو یہ حق ہے کہ اپنے افکار و محسنات کو رفع
کرنے کی غرض سے اپنا نام اس دفتر میں درج کرادے۔ جس کی اطلاع اس خاص طبقہ
کے افراد کو پہنچ جاتی ہے۔ جو اس قسم کی امداد کی مقدرت رکھتے ہیں مگر اس کے

یہ معنی نہیں کہ ایک محرر اور اہلمد کو ترقی اور تنزل کی فکر ہو تو وہ بھی خیراتی انجمن کی گھنٹی جا کر ہلا دے۔ واضح ہو کہ دنیا میں ہر آدمی اپنا بوجھ آپ اُٹھاتا ہے ہمیں صرف اُس کی اخلاقی امداد کرنی چاہیئے۔ اور بس باہمی معقول امداد کا یہی طریقہ ہے۔

اہلِ برطانیہ کو دیکھئے کہ اُس قومی اتحاد اور اتفاق کے باوجود جس کی زندہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہ پھر بھی افراد قوم میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور سوشل سروس کے مقصد کو روز بروز بلند کرتے جاتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو مشترک بخیال۔ متحد العمل اور ہم ضمیر کرنے کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔ اِس کے بعد ہمیں دیکھئے کہ کوئی گھرانہ پھوٹ سے خالی نہیں۔ ایک جگہ دو آدمی متحدہ مقاصد کے ساتھ چند گھنٹے شریک کار ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو گرا دینے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔

ولایت میں خیرات کی سیکڑوں شکلیں ہیں۔ مظلوم بچّوں کی حمایت اور خبرگیری کرنے کی ایک انجمن ہے جس کی بیسیوں شاخیں ہیں۔ ابنائے ملت میں احساس فرض اور حق شناسی کا جذبہ مستحکم کرنے کے لیئے بھی ایک انجمن ہے جس کا تمام ملک میں جال پھیلا ہوا ہے۔ یتیم بچوں کی تربیت گاہوں کی نگرانی کرنے والی انجمنیں بھی ہیں۔ بیکار عورتوں کو کام پہ لگانا۔ نادار کا علاج کرنا۔ غرض کہ خیراتی کام کی تمام شاخوں کو قلمبند کرنا نہایت دشوار ہے۔ کانفرنس کے کتب خانہ میں اس کا جسقدر مواد موجود ہے اُس پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی قوم کا ہر ایک فرد جو عاقل و بالغ ہے دوسرے کی خدمت اور مدد کے لیئے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ اور کسی کام کے آدمی کو کسی وقت معذور و بیکار نہیں چھوڑتا۔

ہم سب کو بالاتفاق تسلیم ہے کہ معاشرت کے دامن پر سب سے گہرا دھبّہ ناداری ہے۔ ایک غنیٔ دولت مند سے محتاج فقیر و بے نوا کا مقابلہ کرکے ہمارا دل بھر آتا ہے۔

ہم اپنے ملک میں اس افتراق کو روز بروز ترقی کرتا ہوا پاتے ہیں۔ اقتصادی نظر سے دیکھنے پر ہم چاہے کسی نتیجہ پر پہنچیں مگر پہلی دفعہ خیال کرکے یہ افتراق بہت چبھتا ہے۔ اور ہمیں بے اختیار خیرات پر آمادہ کردیتا ہے۔ دولتمند ہی اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنی ہمت اور مقدرت کے مطابق کچھ نہ کچھ جیب سے نکال کر یا اور طرح پر مفلس و ضعیف کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ خیرات کا کوئی نظام نہیں اس لیئے آب ضائع ہوتا ہے اور ہر سال لاکھوں روپیہ یوں ہی خرچ ہوجاتا ہے۔ نیت اور سعی کے مطابق کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ خیرات کے طریقے بھی سرے سے لغو ہیں۔ کسی میں بے جا مصرف ہے۔ بعض خیرات سے اُلٹے نتیجے نکلتے ہیں۔ مانگنے کی عادت اور مکر و فریب کا ملکہ ترقی پذیر ہوتا ہے۔ حقدار محروم رہ جاتے ہیں۔ غرض کہ یہ سرتاپا مکھیوں کا تودہ ہے جس کے خیال ہی سے نفرت ہوتی ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ انفرادی خیرات گو کہ خیرات کا صحیح مصرف ہو اس دھبہ کو نہیں دھو سکتی۔ دوسرے یہ کہ مستطیع طبقہ کو جس طرح غیر مستطیع کی امداد کرنی چاہیئے وہ حقیقت میں ایک فن ہے ایک مستحکم ضابطہ ہے جسے مطالعہ کیئے بغیر نہ مخیر کی نیت پوری ہوتی ہے اور نہ محتاج کی حاجت۔ ان میں اول الذکر کا یہ تقاضا ہے کہ ایک مشترکہ نظام قایم کیا جائے اور دوسرے کا یہ تقاضا ہے کہ اول معلومات ہم پہنچائی جائیں اور اس ذخیرے پر باضابطہ بحث کرکے ایک ضابطہ کار بنایا جائے اور غنی اور محتاج کے لیئے حقوق فرایض معین کیئے جائیں۔ لیکن اس سارے نظام میں روپیہ کی اتنی ضرورت نہیں جتنی دَرد بھرے دل کی ضرورت ہے جو دوسرے کی تکلیف دیکھکر لوٹ جائے اور پھر اس جذبۂ رحم کو بھی معقول حد سے نہ بڑھنے دے۔

مقالاتِ علمیہ

ابتدائی طرزِ تعلیم و تربیت بدلنے کی ضرورت

اگر خدا قوم کو توفیق دے اور وہ سمجھے تو بچوں کی تعلیم و تربیت سے زیادہ کوئی مسئلہ اہم نہیں۔ قوم کے اعلیٰ اور برگزیدہ مقاصد اور سچے اور صحیح جذبات و تصورات پر کسی بات کا اتنا دیرپا اثر نہیں جتنا ابتدائی تعلیم کا ہے۔ اصل میں اگر تعلیم کو بلند ترین اہرامِ مصری سے تشبیہ دی جائے تو ۳ سے ۷ برس تک کے عمر کے بچوں کے مدرسوں اور تربیت گاہوں کو اس کی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ جہاں بچے طور و تمیز میں اور پھر طور تعقل میں پہلی دفعہ آنکھ کھولتے ہیں اور اُن کے دل و دماغ پر ذہنیات کے سورج کی پہلی کرنیں پڑتی ہیں اور جہاں اُن کے اور خیالات ترقی کر کے اوّل مرتبہ سرگرمیٔ عمل کی مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ جو قومیں تاج حکمرانی سر پہ رکھنے کے لیئے بے تاب ہیں اور مجلس فرماں روایان میں آڑے ترچھے ہو کر کرسی نشین بننا چاہتے ہیں کیا اُن کے لیئے اس سے زیادہ کوئی اور خطرناک غلطی ہو سکتی ہے کہ وہ قومی تعلیم کے سنگِ بنیاد کی جانب سے غافل ہوں۔ افسوس کہ تعلیم میں اُن کی پہلی ہی بسم اللہ غلط ہو گی۔ اُن کے بچوں کی زندگی شروع ہی میں اُن کے نفس و روح کا تزکیہ کر سکیگی زندگی سے دل بستگی اور اسبابِ زیست سے دلچسپی بچپن ہی میں پیدا ہو سکتی ہے اور یہی وہ قوتِ متحرکہ ہے جو آیندہ بچے سے منازلِ حیات پُر شوق قدموں سے طے کراتی ہے۔ شغل و مصروفیت کی عادت بھی شروع ہی میں پیدا ہوتی ہے اور یہی وہ برق ہے جو میدانِ زندگی کے اگلے حصوں میں بڑی بڑی مشکلات اور مہمات کا

مقابلہ کامیابی کے ساتھ کراتی ہے۔

ماہرانِ فن تعلیم متفق الرائے ہیں کہ تین سے چھ سات برس تک کی عمر کا زمانہ نہایت نازک ہے یہ تین چار سال بلحاظ اہمیت عمر کے باقی حصّوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے ہیں بھلی اور بری باتوں کا اثر اس وقت سے زیادہ پھر کبھی نہیں ہوتا اگر اسے فطری تقاضوں کے موافق ماحول میسر ہو گیا تو وہ نیک خصلت اور تن ومند ہو کر نکلیگا اور اگر ہمارے مروجہ شکنجۂ استبداد میں پھنسا رہا تو جسم اور روح دونوں میں بچہ جینوٹا بن جائیگا۔ لاغر بدن اخلاقی جراءت سے خالی اور روحانی قوت سے محروم ہوگا اس واسطے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کی جانب قوم کو متوجہ ہونا چاہیئے۔

اگرچہ اس مد میں مطالبوں کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ ملک و ملت نہ انفرادی نہ اجتماعی کوشش سے سب کو ایک ساتھ پورا کر سکتے ہیں مثلاً زمانہ کا تقاضا ہے کہ ناقص الخلقت اور مختل الحواس بچوں کے لیئے ہر ایک صوبہ میں ایک شفاخانہ کھولا جائے جس سے ایک دار الاقامت بھی ملحق ہو۔ اِس کے ایک حصّہ میں صحت یاب بچے عارضی طور پر مقیم رہیں اور دوسرے میں مایوس العلاج مستقل طور پر رکھے جائیں اور اُن کے لیے حسب حال مشاغل بھی مہیا کیئے جائیں۔ اسی طرح اپاہج بچوں کے لیئے ایک دار الاقامت و مدرسہ قایم کیا جائے۔ اندھے، بہرے، گونگے بچّوں کے لیئے ایک تعلیم گاہ الگ ہو۔ مگر اتنا بڑا انتظام قائم کرنا کچھ خواب کی سی باتیں ہیں۔ سردست اسی قدر کافی ہے کہ کچھ پرانی وضع کے ابتدائی مدرسے توڑ کر ایک بڑا کنڈر گارٹن وضع کا مدرسہ بنا کر اُس میں تین سے سات برس تک کے تندرست بچوں کو تعلیم دی جائے۔ مگر مدرسہ ہو۔ ڈھونگ ہو۔ نہ آج کل کے یتیم خانوں کی طرح۔ آلہ زراندوزی۔ اور چند منچلے سفید پوش حضرات کا ذریعہ کسبِ معاش ہو۔ بلکہ مستحکم اور باضابطہ بنیاد پر بامذاق اور صاحب دل اصحاب کے اثر میں قایم کیا جائے اونچے سے نیچے تک تمام کارپرداز اس طرح منتخب کیئے

جائیں کہ اُن میں بچّے کی فطرت، اور بچپن کے خواص وعوارض سمجھنے اور اُن کی مطابقت کرنے کی پوری قابلیت ہو اور بچے اُن کی نگرانی کو آغوشِ مادر سے کم نہ سمجھیں یعنی یہ اُن سے دلی شفقت سے پیش آئیں اور وہ اُن کی تعظیم کریں۔ تعلیم و تربیت کے ذمہ دار خصوصیت کے ساتھ والدین جیسی جاں نثاری رکھتے ہیں اُن کی ضرورتوں کو سمجھیں اور کام لینے میں بچوں کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے مزاحم ترقی نہوں۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ ایسی تعلیم گاہ کی نظام میں بعض نہایت اہم مسائل فیصلہ طلب ہیں مثلاً نئے بچّوں کی تعلیم و تربیت کی بہترین قابلیت مستورات میں ہوتی ہے لیکن پردے کا رواج صحیح انتخاب میں مزاحمت کریگا اور اگر لے پرن اقوام سے مستورات منتخب کی جائینگی تو شاید والدین اور مربیوں کے پرانے تعصبات گریبان گیر ہونگے۔ چنانچہ ہمارے موجودہ زنانہ مدارس میں بھی کشمکش ابھی تک مزاحم ترقی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ جدید تعلیم گاہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیئے الگ الگ ہونگے یا اکھٹے دونوں صورتیں نہایت پیچیدہ ہیں۔ مگر بعض سن رسیدہ مرد بھی انتہائی درجے کے بچہ پرور ہوتے ہیں اُن کی محبت بھری نگاہ دیکھ کر بچے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے انتخاب کیا جائے تو مردانہ تعلیم گاہ عارضی طور پر چل سکتی ہیں لیکن ان کی مستقل مشین مستورات ہیں۔ اور جب تک اشراف قوم و ملک یہ روش اختیار نہ کرینگے کہ اپنی مستورات کو خالصۃً للہ سمجھ کر اپنا آئندہ نسلوں کی پاس خاطر سے ان تعلیم گاہوں کے نظام میں شامل کریں اُس وقت تک نہ تو عوام کو اعتبار ہوگا اور نہ کام چل سکیگا۔ ساز و سامان تربیت اور نصاب تعلیم میں اپنی قومی ملکی ضروریات کے مطابق رد و بدل کرنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایک تہذیب دوسری تہذیب کے کسی شعبہ کو بجنسہ جذب نہیں کر سکتی پھر کیسے ممکن ہے کہ مونٹیساری یا کنڈرگارٹن طریقہ بجنسہ اختیار کر لیا جائے۔ الغرض یہ تمام مسائل بڑے غور و فکر سے اوّل طے ہونگے مگر کس طرح ؟ یہ سوال بجائے خود اہمیت

رکھتا ہے جس کے حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام یا متعدد صوبوں سے با مذاق اصحاب فنِ تعلیم اور علم معاشرت کے ماہر منتخب کرکے ایک کمیشن کی شکل میں باقاعدہ تحقیقات کریں اور نیک نیتی سے فیصلہ آخر صادر کریں۔

یہ تمام مشکلات حل ہونے والی ہیں بشرطیکہ ہم ملک وملت کے معاشرتی اور تعلیمی مسائل کی اہمیت کو محسوس کرلیں۔ حقیقت میں یہ قوم کی حیات وممات کا سوال ہے۔ بچوں کے لیئے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی صحت اور اعتدال مزاج حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں معلوم ہوتا۔ قوم کو اس وقت بے دماغی کند ذہنی سستی اور دیگر اخلاقی جرائم نے ہر طرف سے گھیر کر ترقی کو بالکل مسدود کردیا ہے۔ پچاس برس سے ہم اسی ایک چکر میں گردش کر رہے ہیں اور ایک قدم بھی جدت کی طرف نہیں بڑھا سکے۔ اِس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ بچوں کی صحت اور تندرستی، چستی وچالاکی اور ذہنیات کو تقویت، خیال اور ارادے کی قوتوں کو حریت و استحکام دیں تاکہ اُن میں عملی سرگرمی کا مادہ بڑھے وہ نیک اور قابل افرادِ قوم بنیں اور اپنے ملک وملت کی تہ دل سے خدمت کریں۔ بعض احباب کا یہ خیال ہے اور وہ ہم سے تحریرًا اختلاف بھی کرچکے ہیں کہ کوئی جدید طریقہ تعلیم جو گورنمنٹ کی پالیسی کے مطابق اور مروجہ نظام تعلیم کے ہمنوا نہو چلنے والا نہیں۔ مگر ہم بہ تعظیم مناسب اُن سے التماس کرتے ہیں یہ خیال ایک حد تک صحیح نہیں اس لیئے کہ ہر ایک ملک کی گورنمنٹ کو صرف اس بات پر اصرار ہوتا ہے کہ نوخیز جماعت جب تک کی درس گاہوں سے نکلے تو گورنمنٹ کے مصلحتوں کے خلاف عقائد لیکر نہ نکلے یعنی وہ سیاسی بساط کو اُلٹ نہ دے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بساط کی مُہروں کو بھی حرکت نہ دے۔ گورنمنٹ کا ہمیشہ یہ مقصود ہوتا ہے کہ محکوم اور حکمران دونوں کا نظام آسایش۔ متصادم ہوئے بغیر ترقی کرے اور قایم رہے۔ تعلیم بشرطیکہ حقیقت اور صداقت کی تعلیم ہو اس میں خلاف عقائد کی تبلیغ مضمر نہو گورنمنٹ اسکی ترقی

کو ہمیشہ محبت کی نگاہ سے دیکھے گی حقیقت میں ہر ملک کی گورنمنٹ کا رُخ رعایا کے ہاتھ میں ہوتا ہے نہ کہ رعایا گورنمنٹ کے ہاتھ میں۔ رعایا جس قدر اپنے آپ کو عملاً قابل اور مستحق ثابت کرتی جاتی ہے اُسی قدر، اور اُسی حد تک عنانِ حکومت کا رُخ بھی بدلتا جاتا قابلیت کا نشان معروف دھواں دھار تقریریں اور انقلاب انگیز تحریریں نہیں بلکہ اعمال صحیح ہیں۔ ہم اس فلسفہ کو سمجھنے سے قطعاً معذور ہیں کہ کنڈر گارٹن وضع یا مانٹی ساری سسٹم کے مدرسے کھولنے میں گورنمنٹ مزاحمت کرے گی۔ البتہ ایک بات ضرور ہے اگر قوم و ملک اس طرح کے مدارس جاری کرتے ہی گورنمنٹ کے سامنے دستِ سوال دراز کرے گی تو ضرور مایوسی اور رنج کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ قوم کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ اور فعل و عمل سے یہ بتلا دینا چاہیئے کہ اس قسم کی دوا ہمارے اخلاقی امراض کے لیے مفید ہے۔ اِس صورت میں گورنمنٹ کو مجبوراً یا لطیب خاطر ماننا پڑیگا الغرض اس قسم کے عذر چلنے والے نہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان جدید وضع کے مدرسوں کی ہیئتِ کذائی میں اور ان میں اور مروّجہ مدرسوں میں کیا خصوصیات اور مابہ الامتیاز ہیں۔

جدید نظام تعلیم کے دو بڑے رُخ ہیں۔ جسمانی صحت اور دماغی اعتدال۔ صحت تندرستی کیلئے وہی پُرانا نسخہ یعنی ستہ ضروریہ کی احتیاط۔ غذا صحت بخش۔ کپڑا صاف اور ستھرا۔ سونے بیٹھنے کا کافی سامان تازہ ہوا۔ حفظانِ صحت کا پورا لحاظ اور سب سے زیادہ یہ کہ ماحول فرحت افزا صحبت نیک اور جسمانی ورزش اور دماغی قوتوں کی نشو و نما کا ضروری سامان مہیا ہو۔ ستہ ضروریہ میں سے ہر کام کا ایک وقت اور مقدار مقرر ہو۔ نیند بھر سونے کا موقع دیا جائے۔ غسل اور صفائی پر خاص توجہ کی جائے۔ سرد موسم میں کافی گرم مگر ڈھیلا لباس ہو تاکہ بچہ کو حرکت و سکون میں دقت نہ واقع ہو۔ اور اُسے اتنی آزادی حاصل ہو کہ وہ جو کام کرنا چاہے بے خلل و غشت کر سکے

بچے کا جسم ہر لحظہ ہر دم بڑھتا ہے۔ اس لیئے ڈھیلا لباس ایک طبی حکم کی متابعت ہے نہ کہ شان و تکلف کی۔ بُرے الفاظ یا بے تمیزی کی حرکات سے ایک ایسے با اثر طریقہ سے روکیں کہ وہ پھر اُدھر رُخ نہ کرے۔ حواسِ خمسہ ظاہری اور اعضاء جسم ہر وقت مصروف رکھیں۔ اگر وہ باتیں کرے یا غنغنائے تو منع نہ کریں۔ تعلیم کا سامان بچہ کے گرد اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ اُس کا دل ہر وقت شوق و شغف اور جستجو سے بھرا رہے۔ اور وہ اپنے بلا واسطہ تجربوں سے سبق لیتا رہے۔ باضابطہ پڑھانے کی فکر سے اُس کے دماغ کو گراں بار نہ کریں۔ بلکہ آزاد چھوڑ کر خود تجربہ اور مشاہدہ حاصل کرنے دیں اور اپنے ذخیرۂ معلومات سے اپنے لیئے کلیات اور مسلمات خود قائم کرنے دیں۔ یہ اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ کہ اُسے اپنے گھڑے ہوئے اُصول پر چلائیں یا اپنے شکنجہ استبداد میں جکڑ کر اُس کے جذبات کو مُردہ کر دیں۔ بچہ میں بعض خصوصیات عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ مثلاً نیکی۔ بھولاپن بے خبری۔ تحیر۔ جدت پسندی۔ حسن اور تماشہ سے عشق۔ محبت بھی اور ایک بے مثل شانِ محبوبیت بھی۔ اگر اتالیق ان صفات کو زندہ رکھتا ہے یا بیدار کر لیتا ہے تو سمجھئے کہ اُس نے قوم کی کئی نسلوں کو سیدھے رستے پر ڈال دیا۔ بچے کے افعال اور اقوال ہمیشہ کے لیئے ان صفتوں کی مُہر لگ گئی۔ اور پھر جب وہ رفتہ رفتہ بڑا ہوگا تو اُس کے ساتھ ہی یہ صفتیں بھی بڑی ہونگی۔ اس لیئے کہ اس عمر کی پختہ عادتیں۔ ہمیشہ معین ترقی رہتی ہیں۔ جدید طریقہ تعلیم کا بڑا حسن یہی ہے کہ وہ بچوں کی ان فطرتی صفات کو نہ صرف سوتے سے جگا دیتا ہے بلکہ انھیں چاند ستاروں کی طرح روشن کر دیتا ہے۔

مونٹیسّاری کنڈر گارٹن مدرسہ کا سب سے نمایاں خط و خال کھیل کود ہے۔ پرانی وضع کے احباب جو صدیوں سے معصوم بچوں کو شکنجہ استبداد میں پرورش کرانے کے عادی ہیں اور انھیں توڑ مروڑ کر اپنی پسند کے مطابق ڈھال لیتے ہیں وہ شاید معترض ہونگے کہ غریب محنت کش گھرانوں کے بچے اگر اس طرح شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیئے جائینگے اور

کھیل کود کے عادی ہو جائینگے تو کل بڑے ہو کر وہ کیونکر بار کشی کر سکینگے۔ انھیں تو بچپن ہی سے محنت کش اور جانفشاں ہونا چاہیئے مگر اس کا یہ جواب ہے کہ امیر ہو یا غریب بلند رتبہ ہو یا فروتن جب تک وہ تنومند اور قوی نہ ہوگا اُس کی دماغی اور جسمانی قوتیں ہرگز اپنے فرائض انجام نہیں دے سکینگی۔ بچپن کا کھیل کود درحقیقت بڑی عمر میں بھاری بھاری کاموں کی تیاری ہی خواہ وہ دماغی ہوں یا جسمانی۔ علم النفسیات کا گہرا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بچپن کا کھیل ہی وہ فعل ہی جسے ہم بڑے ہو کر مشاغلِ زندگی سے موسوم کرتے ہیں۔ جس بچے کا جی آج کھیلنے کو نہیں چاہتا اُسے کل بڑا ہو کر بھی کسی کام سے دل لگی نہو گی۔ بعض نکتہ چیں شاید یہ خیال کریں کہ صاف ستھرے لباس اور مکان میں۔ صحت بخش آب و ہوا میں پُر تکلف اور آزاد زندگی بسر کرکے بچے اس قابل نہ رہیں گے کہ کل تنگ اور تاریک مکانوں میں دل لگا کر رہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو بچہ آج میل کچیل سے نفرت نہیں کرتا اور غلیظ ماحول سے بیزار نہیں ہوتا وہ کل انتہا درجہ کا بدتمیز اور غلیظ کیوں نہو گا اور کیوں ویسے ہی اُسکے نفس اور روح بھی غلیظ نہونگے۔ شاید بعض حیوان بھی اُس سے نفرت کریں۔ یہ اور اسطرح کے اور بہت اعتراضات ایسے ہی لغو ہیں جیسے بنو اسرائیل اور پھر قریش مکہ نے کیئے تھے۔ اگر جدید مدرسے صرف دن دن کے رہیں اور شبانہ روز کے بجائے صرف صبح سے شام تک بارہ گھنٹہ کے لیئے بچوں کو رکھیں۔ تو کم سے کم یہ تو ہوگا کہ جو بچے غلیظ ماحول اور تنگ و تاریک گھروں کے رہنے والے ہیں اُنھیں آدھے وقت کے لیئے بہتر زندگی کا تجربہ ہو گا۔ وہ بڑے ہو کر جائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرکے اونچے درجہ کی زندگی بسر کرنا سیکھینگے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس طرز تعلیم سے کچھ بھی فائدہ نہیں مگر کیا بچوں کی اموات بھی نہ گھٹینگی۔ گھر کی صفائی خواہ جھونپڑا ہی کیوں نہ ہو لباس کو میل کچیل سے پاک صاف رکھنا۔ خواہ وہ کیسے ہی موٹے کپڑے کے ہوں۔ صحت بخش غذا جو گندے پانی اور سڑی ہوئی اشیا سے نہ تیار ہوئی ہو۔ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو غربت اور امارت پر منحصر نہیں۔ بلکہ تمیز اور

سلیقہ کی عادات پر منحصر ہے ؎

دو تائے نان گر از گندم ست یا از جو — سہ تائے جامہ گر از کہنہ است یا از نو
چہار گوشۂ ایوانِ خود بخاطر جمع — کہ کس نہ گوید از یں جا بخیز و آنجا رو
ہزار مرتبہ بہتر بہ نزد ابن یمین — ز فرِ مملکتِ کیقباد و کیخسرو

نفسِ مطمئنہ بھی محض ایک نتیجہ ہے۔ ظاہری اور باطنی صفائی اور پاکیزگی سے نکلتا ہے۔

اِن خصوصیات کے علاوہ جو سلسلہ بیان مندرجہ بالا میں آگئی ہیں جدید اور مروجہ مدرسوں اور مکتبوں میں اور بھی کئی باتوں کا امتیاز ہے۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہوتی ہیں اور اساتذہ کو ہر ایک بچہ کی طرف پوری توجہ کرنے کا موقع ملتا ہے تعلیم و تربیت میں اسکی خوب حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اُن خاص لوازم و وسائل تعلیم کی بدولت جو اُن مدارس کی جان ہیں آنکھ، ہاتھ کان، گلا اور زبان کو کام میں لاکر قوائے ظاہریہ کو ترقی دینے کا کافی موقع حاصل ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ حواسِ خمسہ ظاہری کو حکما اس واسطے جواسیس کہتے ہیں کہ اُن کی مدد سے باطنی حواس بیدار اور زندہ ہوتے ہیں۔ اگر جاسوس کی قوتِ عملیہ کو مشق و استعمال کے وساطت سے پورے مدیر نہ پہنچایا جائے تو دماغ کی چھپی ہوئی قوتوں کا خزانہ بھی پورا منکشف نہ ہوگا۔ ایسے مدرسہ میں بچوں سے کتابی تعلیم کی بجائے ہاتھ کے سیدھے سادھے کام زیادہ کرائے جاتے ہیں۔ اور اُنھیں اس بات کا عادی کرتے ہیں کہ اپنے فطری جذبات، خیالات اور ارادوں کو زبان سے یا عمل سے دستکاری کی صورت میں جس طرح جی چاہے ظاہر کریں اس سے اُن کی عام سمجھ کو ترقی ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ بغیر کسی ظاہری تعلیم اور تلقین کے ہوتی ہے۔ اس لیئے کہ کنڈرگارٹن میں بچوں کے آزادانہ افعال کی اصلاح عملاً کی جاتی ہے۔ اور وہ اسی طرح رفتہ رفتہ غیر کی مدد سے بے نیاز ہو کر کام کرنا بھی سیکھ جاتے ہیں اور اُن میں انسانوں کی غلامی اور بندگی کی بجائے اپنے فرض اور کار منصبی کی متابعت اور ضبط نفس کی عادت انضباط و ترتیب اور کام کرنے کا سلیقہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اُن میں کٹھ پُتلی کی خاصیت پیدا ہو جائے کہ اُنگلیوں کے اشارو

پر بے سوچے سمجھے حرکت کرنے لگیں اور اسمعو وسلمو (سنو اور مانو) کے اصول پر چلیں
ان کی نگرانی ہر طرح ہوتی ہے۔ کھیل کے میدان میں بھی مدرسے کے کمرہ اور آرام گاہ میں
بھی استانیوں کی آنکھیں بچوں کی نظر سے چھپ کر اپنا کام کرتی ہیں شبانہ روز کہ
مدرسہ میں کھانا کھانے کے آداب بھی سکھلائے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ شائستہ زندگی
کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی مشق اس چھوٹی سی عمر میں بچوں کو نہ کرائی جاتی ہو۔ آئن
اجتماعی زندگی کی خصوصیتیں اور معاشرتی صفتیں بھی پیدا ہوجاتی ہیں اور وہ مدرسہ میں
اس طرح رہتے ہیں جیسے ایک گھرانہ میں بھائی بہن ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں باہم ملکر
بسر کرتے ہیں کثیر التعداد اور مختلف العادات بچوں میں یہ جدید مدرسہ اتنا بڑا انقلاب
والدین اور مربیوں کی مدد بغیر نہیں کرسکتا اس لیئے لازم آتا ہے کہ یہ بھی ایک باضابطہ
اجتماعی شکل اختیار کرکے اساتذہ کے خیالات اور ارادوں سے باخبر رہیں اور ایک
دوسرے کی مدد کریں۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر مدرسہ دن کا ہے تو جو تربیت
بچّہ کو یہاں دیجاتی ہے والدین گھر میں بھی اس کا اثر ضائع نہیں ہونے دیتے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم ملک وملت سے بہت زور کے ساتھ اپیل کرتے ہیں کہ وہ
تعلیم کا رُخ بدلیں اور اعلےٰ مدارج کے زیادہ شیفتہ نہ ہوں اگر ابتدائی تعلیم صحیح ہے
تو اعلیٰ کا پھل اس میں خود بخود آئیگا بہت تھوڑی آبیاری اور نشو ونما کی ضرورت ہوگی
بچپن میں جو فطری مذاق ومیلان پختہ ہوجاتا ہے وہ کبھی نہیں فنا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ادب
فلسفہ، علوم الطبیعہ ہر ایک شاخ کی ترقی کا انحصار انسان کے فطری مذاق پر ہے۔ جن
کاموں کے ذریعہ ننھے بچّوں کی تعلیم وتربیت کی جاتی ہے اور جو سامان اور کھلونے
کتابوں کے بجائے استعمال ہوتے ہیں اُن کی تفصیل اور ترتیب بتانے کے لیئے موقع
نہیں وہ سب دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ کام کرنے کا ارادہ کیا جائے
اس کے بعد ہر کام آسان ہوجاتا ہے۔

اُردو زبان اور مسلمان

جب کوئی قوم دنیا میں عروج حاصل کرتی ہے تو زندگی کے ہر شعبہ میں اور اپنے جملہ عادات و خصائص میں دوسروں سے ممتاز نظر آتی ہے، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے جب تک یہ نہو دنیا کی دوسری قوموں پر اس کی برتری تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

اپنی خصوصیات اور تہذیب و معاشرت کے تحفظ کا جذبہ ترقی یافتہ قوموں میں ایک قسم کی عصبیت پیدا کردیتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہی عصبیت اُن کو مضبوط اور ممتاز بنا دیتی ہے۔ اگر یہ نہو تو وہ دوسری قوموں میں جذب ہو کر فنا ہو جائیں، ان ترقی یافتہ قوموں میں بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی گزشتہ تاریخ کے صفحات بالکل سادہ ہوتے ہیں نہ تو اُن کی پرانی تہذیب قابل توجہ ہوتی ہے نہ ان کی زبان وسعت اور خوبی کے لحاظ سے کوئی امتیاز رکھتی ہے، لیکن جب اُن میں ترقی کا میلان پیدا ہوتا ہے تو اصلاح و تبدیلی کے بعد رفتہ رفتہ ہر چیز ترقی کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اُن کی زبان جو محدود و سادہ حالت میں ہوتی ہے ترقی کر کے ایک علمی زبان بن جاتی ہے، کیونکہ قوم کے ہزاروں افراد محض اس لیئے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں کہ اصلاح و تہذیب کے بعد اپنی زبان کو دنیا کی ایک ممتاز زبان بنا دیں اور ہر قسم کے علوم و فنون سے اُس کو مالامال کردیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقصد میں اُن کو کامیابی ہوتی ہے، اور یہ مُردہ زبانیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں جگہ حاصل کر لیتی ہیں۔

عربی کا دورِ عروج

عربی زبان بھی ابتدا میں بالکل سادہ حالت میں تھی اس کا خزانہ علوم و فنون سے یکسر خالی تھا، تاریخی حیثیت سے اس کا سرمایہ صرف قومی و جنگی روایات یا علم الانساب تک محدود تھا، یا شعراء کا کلام تھا جو زبان

خاص و عام تھا، لیکن جب اہلِ عرب کی ترقی کا دور آیا تو انھوں نے اپنی زبان پر بھی توجہ کی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں جو کچھ مل سکا اس کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔ اور اسکے بعد ان علوم میں اس قدر کمال اور مہارت حاصل کی اور اس پر اسقدر اضافہ کیا کہ ان کو اپنا بنا لیا، یہاں تک کہ حوادث زمانہ سے اصل کتابیں فنا ہو گئیں اور صرف مسلمانوں کے ترجمے باقی رہ گئے، گویا قدیم سرمایہ آج تھوڑا بہت جو کچھ محفوظ ہے وہ مسلمانوں کی بدولت محفوظ ہے۔

جب کوئی قوم ترقی کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے تو دوسری قوموں کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے علاوہ اپنی گزشتہ تاریخ پر بھی توجہ کرتی ہے، اور پوری جدوجہد اور کاوش کے بعد جو کچھ ہاتھ آتا ہے اس کو مرتب و مدون کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے، تلاش و تحقیقات کا یہ سلسلہ برسوں جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک ایک پرزہ جمع ہو جاتا ہے، اور تاریخ و ادب کا تمام سرمایہ منظر عام پر آجاتا ہے، اہل عرب نے اپنے دورِ عروج میں یہی کیا، جب کہ ان کی ایک جماعت دوسری زبانوں کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کر رہی تھی، اور ارسطو و افلاطون کا فلسفہ عربی میں مدون ہو رہا تھا تو ارباب ذوق کی ایک دوسری جماعت عرب کی تاریخی روایات اور اشعار جاہلیت کی جستجو میں صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کر رہی تھی۔

ذوق و شوق کی یہ حالت کہ اگر زمانہ جاہلیت کے کسی شاعر کا ایک شعر کسی صحرا نشین بدو، یا اور کسی معمولی شخص کی زبان سے نکلتا تھا اور یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ کسکا شعر ہے، تو عام لوگوں کا کیا ذکر ہے، امرا و سلاطین کا علمی ذوق اس حد تک ترقی کر گیا تھا کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کس شاعر کا شعر ہے اور پورا قصیدہ کیا ہے، انکو چین نہیں آتا تھا، چنانچہ شاہی قاصد تیز رو سواریوں پر علما ادب کے پاس روانہ کیے جاتے تھے تاکہ اس شاعر و قصیدہ کی کیفیت معلوم کریں، بعض اوقات بہت سے شعرا، اور ارباب ادب

دربارِ خلافت میں طلب کیے جاتے تھے اور عربی زبان کا کوئی شعر یا ضرب المثل فقرہ اُن کے سامنے پیش کیا جاتا، اور اس کے معانی و مطالب پر بحث و گفتگو ہوتی تھی بعض اشعار میں ایام جاہلیت کے اوہام و رسوم کی طرف اشارہ ہوتا تھا جس کو عام طور پر لوگ نہیں سمجھتے، اس قسم کے اشعار کے متعلق خاص طور پر تحقیقات کی جاتی تھی۔

غرض اس تلاش و تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ شعرائے جاہلیت کا قریباً تمام کلام محفوظ و مدوّن ہوگیا، تمام قبائل عرب کے انساب قلمبند ہوگئے جس کے بغیر جاہلیت کی تاریخ یقیناً ناقص و نامکمل رہتی، عرب کے اوہام و رسوم، عادات و اطوار، اور ادیان و ملل کے متعلق کافی سرمایہ جمع ہوگیا اگر یہ نہ ہوتا تو اشعار عرب کا سمجھنا ناممکن تھا، قبائل عرب کے باہمی محاربات کے حالات بھی قلمبند ہوگئے، ایام جاہلیت کی شاعری کا قریباً نصف حصہ انہی واقعات پر مشتمل ہے، غرض ایام جاہلیت یا عرب کے غیر تاریخی زمانہ کے متعلق اس قدر سرمایہ جمع ہوگیا ہے کہ ہم اہل عرب کے عادات، و اطوار، تہذیب و معاشرت اور خیالات و اوہام سے بخوبی واقف ہوگئے ہیں لیکن اگر اہل عرب اپنی ترقی کے زمانہ میں ان سب چیزوں کے جمع کرنے کے لیے سعی و محنت نہ کرتے تو آج ہمارے پاس کچھ بھی نہ ہوتا، اور اسقدر طویل زمانہ گزرنے کے بعد ہمارے لیئے یہ ناممکن ہوتا کہ عرب کی گزشتہ تاریخ کے سلسلہ میں ایک چیز بھی حاصل کرسکیں۔

عرب کا ذکر صرف مثال کے طور پر کیا گیا ہے ورنہ ہر ترقی پذیر قوم کی یہی حالت ہے کہ اُس کو اپنی تہذیب اور زبان عزیز ہوتی ہے، اور اس کے افراد کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی تہذیب و زبان کو ترقی دیں اور اُس کو دنیا کے ہر حصہ میں پھیلائیں، چنانچہ آج کل بھی ہم یہی حالت دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی تمام قومیں اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق اپنے علوم و زبان کی اشاعت و ترویج میں کوشش کر رہی ہیں، اور یورپ خصوصیت کے ساتھ اس معاملہ میں پیش پیش ہے، خود ہندوستان

کی یہ حالت ہے کہ ہمارے برادرانِ وطن ہندوستان کی مختلف گمنام اور مردہ زبانوں کو زندہ کرنے اور ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس قسم کی کوشش کے آثار کہیں نظر نہیں آتے۔

اُردو زبان کی حالت اُردو ہندوستان کے ایک بڑے حصّہ کی زبان ہے، اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ خصوصیت صرف اُردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے قریباً ہر حصہ میں سمجھی جا سکتی ہے، یہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی زبان نہیں، بلکہ جہاں اس کا رواج ہے وہاں کے سب رہنے والے ہندو ہوں یا مسلمان۔ اس کو بولتے ہیں، لیکن ملک کے بدنصیبی سے ہندو اُس کو اپنی زبان نہیں سمجھتے اور اس کے مقابلہ میں ہندی یا بھاشا کے رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسی صورت میں اُردو کے تحفظ و ترقی کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر رہ جاتی ہے، لیکن مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اُن کو اُردو کے باقی رہنے یا فنا ہو جانے کی کچھ پرواہ نہیں، صرف یہی نہیں بلکہ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اُردو میں لکھنا پڑھنا یا گفتگو کرنا اپنے لئے باعث عار و ننگ خیال کرتے ہیں، جب یہ حالت ہے تو اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے کہ ہماری زبان کسی زمانہ میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پایہ بن جائے گی،

اگر اُردو زبان کی طرف سے بے پروائی کا یہ سبب ہے کہ وہ یورپ کی کسی ترقی یافتہ زبان کی مانند کوئی وسیع یا علمی زبان نہیں ہے، تو یہ بے پروائی اور بھی لائق افسوس ہے، اُردو کی کم مائگی کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہم اور زیادہ جوش سے اس کی طرف توجہ کرتے اور ہماری غیرت قومی ہم کو اس پر آمادہ کرتی کہ اپنی زبان کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی برابر وسیع بنائیں، نہ یہ کہ اُس سے بالکل دست کش ہو جائیں ہمارے لئے تو فخر و مباہات کا موقع اُسی وقت ہوگا جب خود ہماری زبان وسعت

و شہرت حاصل کرے، دوسری زبانوں کی ترقی نہ ہمارے لیے باعثِ فخر ہے نہ قابلِ مسرت اگر آج یورپ ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر چکا ہے، اور علم و ہنر یا فراوانی دولت کے لحاظ سے تمام دنیا میں ممتاز ہے تو اس پر ہم مسلمانوں کو فخر کرنے کا کیا موقع ہے۔ یورپ کی ترقی ہماری ترقی نہیں ہے، نہ یورپ کو اس منزل تک پہنچانے میں ہمارا کوئی حصہ ہے، یہ کیسی مضحکہ انگیز بات ہے کہ ہم دوسروں کے کمالات کو اس غرور بیجا کے ساتھ بیان کریں کہ جس کے یہ معنی سمجھے جائیں کہ گویا سب کچھ ہمارا کیا دھرا ہے، حالانکہ ہم ان سب چیزوں سے مراحل دور ہیں۔

قومی عصبیت

ہر قوم کی یہ فطرتی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ایک مستقل اور جداگانہ ہستی کی مالک ہو، اور یہ بات اس وقت تک میسر نہیں آسکتی جب تک کہ ہماری تہذیب ہماری معاشرت، اور ہماری زبان بالکل جداگانہ اور مستقل بالذات نہ ہو۔ اس لیئے ہم کو بغیر اس کے چارہ کار نہیں ہے کہ ہم اپنی جداگانہ شخصیت اور قومیت کے تحفظ کے لیے وہ سب کچھ کریں جو دنیا کی ہر باحمیت قوم کرتی ہے، ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ "عصبیت" قومی ترقی کی روح ہے، جس قوم میں عصبیت نہیں وہ مردہ ہے، اور اس کو دنیا میں اپنی مستقل ہستی قایم رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی وہ قومیں جن میں عصبیت کی روح نہ تھی باوجود کثرت تعداد خود بخود یا دوسروں میں جذب ہو کر فنا ہو گئیں، امید ہے کہ مسلمان اس خطرناک غلطی میں مبتلا نہ ہونگے، ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں، اور اُن کا طرزِ عمل مسلمانوں کے ساتھ یقینی طور پر ناقابل اطمینان ہے مسلمانوں کو اور بھی زیادہ تدبر و دوراندیشی سے کام لینے اور اپنی روایات اور زبان کے تحفظ کی ضرورت ہے۔

مادری زبان کا تحفظ

تہذیب و تمدن، مذہب اور قومی تاریخ کے تحفظ کی بحث ایک وسیع و مستقل بحث ہے۔ بالفعل صرف مادری زبان (اردو) کے تحفظ و ترقی کے متعلق کچھ

عرض کیا جاتا ہے، ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی مخصوص زبان نہیں ہے
لیکن چونکہ ہندو اس کو اپنی زبان نہیں سمجھتے اس لئے اُردو کو ترقی دینے کی تمام ترذمہ
داری مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے، اور ملکی مسائل پر تو ہندو مسلمانوں کا اتفاق ممکن بھی
ہے لیکن اُردو کے متعلق یہ توقع کرنا بیجا ہے کہ برادران وطن اس کو ملک کی مشترکہ زبان
تسلیم کر لینگے، بے شک اب سے چالیس برس پہلے جب کہ ملک میں جدید تعلیم نہیں پھیلی تھی
اور ہندو مسلم تعلقات خوشگوار تھے، اُردو زبان کے متعلق یہ بحث نہیں چھڑی تھی،
ہندو نہایت شوق و رغبت سے اُردو سیکھتے تھے، شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے،
اُردو زبان میں کتابیں لکھتے تھے، اور عموماً ان کتابوں کو حمد و نعت سے شروع کرتے تھے
لیکن جب مغربی ہوا ملک میں چلی تو خیالات بدل گئے اور سرسید مرحوم ہی کے زمانہ میں اُردو
ہندی کا مسئلہ چھڑ گیا۔ سرسید نے اُردو کی پرزور حمایت کی، سرسید کے بعد اُن کے
جانشین نے بھی ہندی فتنہ کا مقابلہ کیا، اور اُردو کی زبردست حمایت کی لیکن با این ہمہ
جد و جہد برادرانِ وطن بدستور اُردو کے مخالف رہے، یہ واقعہ ہے کہ سرسید مرحوم
آخر عمر میں ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو گئے تھے، جس کا ایک سبب منجملہ دیگر اسباب کے
اُردو ہندی کا مسئلہ بھی تھا، سرسید جیسے دُور بیں مدبر کا اندیشہ غلط نہ تھا۔ آخر کار
وہی ہوا کہ ہندو مسلمانوں کا اختلاف برابر بڑھتا گیا اور اُردو کو ہندوؤں نے بالکل
بائیکاٹ کر دیا، نہ صرف یہ بلکہ اُردو کو مٹانے کے لیئے زبردست کوششیں شروع کر دیں
جن کے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

ابتدائی زمانہ میں انگریز بھی اُردو کے حامی تھے، چنانچہ خود حکومت کی تحریک سے
متعدد اُردو کتابیں لکھی گئیں بلکہ خود بعض انگریزوں نے براہ راست اُردو زبان میں کتابیں
تصنیف کیں، اس زمانہ میں صرف چند محدود الاشاعت اُردو اخبار تھے، جن کو بمشکل اخبار کہا
جا سکتا ہے، لیکن ہر اخبار کے خریداروں میں کچھ نہ کچھ انگریز بھی شامل تھے، لیکن اس زمانہ کے

بعد گورنمنٹ کا رویہ بدل گیا، اور مشرقی علوم و السنہ کی حمایت سے اس نے ہاتھ اٹھا لیا، لہذا موجودہ صورت میں اردو کی اشاعت و ترقی صرف مسلمانوں کی کوشش پر منحصر ہے، اب سرسید مرحوم جیسی شخصیت رکھنے والے بزرگ اردو کی حمایت کے لئے موجود نہیں ہیں، تاہم اُن کے جانشین اس خدمت کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ قوم کی اس اہم ضرورت پر توجہ فرمائیں۔

اُردو کی اشاعت و ترقی کے سلسلہ میں بہت سے کام ہیں، ضرورت ہے کہ یہ سب کام ایک ساتھ شروع کئے جائیں، ہم اختصار کے ساتھ ان کاموں کو بیان کرتے ہیں۔

پریس کا مسئلہ

(۱) اُردو زبان کی ترقی و اشاعت میں پریس کی مشکلات بھی مانع ہیں، دنیا کی تمام مشہور اور زندہ زبانوں کی کتابیں اور اخبارات اب ٹائپ پر چھپتے ہیں لیتھو کا رواج اُٹھتا جاتا ہے، ٹرکی اور ایران میں مدت سے ٹائپ کا رواج ہو گیا ہے، مصر و شام میں تمام عربی کتابیں ٹائپ پر چھاپی جاتی ہیں، خود ہندوستان میں ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ تمام ترقی یافتہ زبانوں کے لئے ٹائپ تیار ہو گئے ہیں، جس کی وجہ سے کثیر الاشاعت اخبارات اور کتابوں کے چھاپنے میں آسانی ہوتی ہے اور وقت بھی کم صرف ہوتا ہے، لیکن اُردو کو یہ سہولت ابتک میسر نہیں، لیتھو کی پیچیدگیاں بدستور اس کے لئے زنجیر پا ہیں، جو اس کو ہمعصر زبانوں کے مقابلہ میں اُبھرنے نہیں دیتیں ان مشکلات کا اصلی سبب یہ ہے کہ خط نستعلیق کا ٹائپ ابتک ایجاد نہیں ہوا، اور اگر اردو کو نسخ میں چھاپا جائے جیسا کہ آج کل رواج ہے تو لوگ پڑھنے سے گھبراتے ہیں، اسی وجہ سے اہل مطابع اور مصنفین موجودہ ٹائپ سے کام لینے میں تامل کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک قسم کی کمزوری ہے، جب تک نستعلیق کا ٹائپ تیار نہ ہو اگر موجودہ نسخ کے ٹائپ سے کام لیا جائے تو لوگ تھوڑی مدت میں اس سے مانوس ہو جائینگے، آخر اب بھی ہزاروں آدمی بے تکلف ٹائپ کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں۔

سرسید مرحوم نے بھی اپنے زمانہ میں اس ضرورت کو محسوس کیا تھا انھوں نے اپنا اخبار ٹائپ پر نکالا اور اپنی متعدد کتابیں بھی ٹائپ ہی پر طبع کرائیں - حالانکہ سرسید کے زمانہ میں اُردو اخبارات اور کتابوں کی زیادہ اشاعت نہ تھی اب بفضلہ کافی اشاعت ہے اس لیئے ٹائپ کا رواج ناگزیر ہے - لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں اس معاملہ میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوئی، اور لوگ بدستور لیتھو کی مشکلات میں مبتلا ہیں، جنکے یہاں فن روز بروز روبانحطاط ہے - اور پہلے جیسے خوشنویس اب کہیں موجود نہیں ہیں، لیکن اس پر بھی لوگ اس قدیم طریقہ طباعت سے اس قدر مانوس ہیں کہ اُس کو چھوڑنا نہیں چاہتے - لیکن اپنی مادری زبان کی خاطر لوگوں کو ٹائپ سے مانوس ہونا چاہیئے تاکہ اُن کی زبان بھی ہمعصر زبانوں کے مقابلہ میں ترقی کرسکے جب ٹائپ کا رواج ہوجائیگا تو کتابیں نسبتاً ارزاں تیار ہونگی اور یہ ارزانی بھی کثرت اشاعت کا سبب ہوگی -

ٹائپ کے رواج کے لیئے بالفعل حسب ذیل صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں:-

(ا) تمام بڑے بڑے مطبع والے جہاںکہ بکثرت خلاصی کتابیں چھپتی ہیں، ابتدا میں تھوڑا سا نقصان گوارا کرکے ٹائپ کی مشینوں پر کام شروع کردیں - جب ٹائپ کو رواج ہوگا تو رفتہ رفتہ اس نقصان کی تلافی ہوجائیگی -

(ب) سرکاری اور غیر سرکاری مکاتب داسکولوں کے کورس کی تمام کتابیں ٹائپ میں چھاپی جائیں تاکہ بچے ابتدا ہی سے ٹائپ سے مانوس ہوجائیں -

(ج) تمام مشہور مُصنّفین جن کی کتابیں رغبت وشوق سے عام طور پر پڑھی جاتی ہیں آئندہ ٹائپ استعمال کریں، موجودہ مُصنّفین کے علاوہ دوسرے ممتاز مصنفین مثلاً سرسید، مولانا نذیر احمد، علامہ شبلی دغیرہ کی تصنیفات بھی ٹائپ پر طبع ہوں -

(د) تمام اسلامی انجمنیں اسکول اور کالج، اپنی کارروائیاں۔ رپورٹیں اور کتابیں ٹائپ میں طبع کرائیں۔

(ھ) اُردو کے تمام روزانہ اخبارات آئندہ لیتھو کی جگہ ٹائپ سے کام لیں، حقیقت یہ ہے کہ روزانہ اخبارات کو سب سے زیادہ ٹائپ کی ضرورت ہے، بغیر اسکے وہ انگریزی کی روزانہ اخبارات کے مقابلہ میں تازہ خبریں اپنے ناظرین تک نہیں پہنچا سکتے۔

اگر ان طریقوں پر عمل کیا جائے تو تھوڑی مدت میں آسانی سے ٹائپ کا رواج ہوجائیگا اور اُردو کی ترقی کے راستہ میں جو دشواریاں حائل ہیں وہ دُور ہوجائینگی۔

تالیف و ترجمہ

(۲) ٹائپ کا مسئلہ تو اُردو کے بنیادی استحکام سے تعلق رکھتا ہی، جس پر آئندہ اُردو کی مستقل ترقی کا انحصار ہی اس کے بعد جو مسئلہ سامنے آتا ہی وہ اُردو کے علمی خزانہ میں اضافہ کا مسئلہ ہی، یہ سب کو معلوم ہی کہ اُردو کوئی قدیم زبان نہیں ہی، وہ اس قدر قلیل العمر ہی کہ ابھی پوری تین صدیاں بھی اس پر نہیں گزریں، اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ تو اس زبان میں بہت بعد کو شروع ہوا۔

اس کے علاوہ ایک بڑی بدنصیبی یہ ہی کہ اُردو ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی جب کہ مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہورہا تھا، اور علمی انحطاط کا زمانہ تھا۔ اس لیئے اُردو کو امرا اور سلاطین کی مربیانہ حمایت نصیب نہیں ہوئی البتہ ہمارے زمانہ میں اعلیحضرت نظام نے جامعہ عثمانیہ اور صیغہ تالیف و ترجمہ قائم فرماکر اُردو کو علمی زبان بنانے کی کوشش کی ہی، علیاحضرت فرماں روائے بھوپال کو بھی اُردو کی طرف خاص توجہ ہی، اور ریاست کا محکمۂ تاریخ، تعلیم و تربیت، حفظِ صحت اور دوسرے مفید مطالب پر کارآمد کتابیں شائع کررہا ہی، ورنہ اس سے پہلے صرف چند اہل مطابع اور مصنف اس فرض کو ادا کرتے تھے۔

بے شبہ والیانِ ملک کی یہ توجہ حوصلہ افزا ہے، لیکن قوم کو ابھی اپنا فرض ادا کرنا باقی ہے، اُردو کے علمی خزانہ میں اس وقت تک اضافہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ پوری قوم اس مقصد کے لیئے آمادہ نہ ہو، بالفعل اُردو کو علمی زبان بنانے کے لیئے صرف دو جماعتیں کام کر رہی ہیں یعنی دار المصنفین اعظم گڑھ اور انجمن ترقی اُردو حیدر آباد، لیکن ان جماعتوں کے پاس بھی اسقدر سرمایہ نہیں ہے، کہ وہ وسیع پیمانہ پر اُردو کی خدمت کر سکیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر حیدر آباد اور بھوپال کی شاہانہ اعانت نہ ہو تو ان جماعتوں کے لیئے موجودہ پیمانہ پر بھی کام کا جاری رکھنا دشوار ہو جائے، پس درحقیقت اِن جماعتوں کے ساتھ بھی والیانِ ملک کا ہاتھ کام کر رہا ہے، جس پر قوم کو فخر و مباہات کا کوئی موقع نہیں ہے۔

غرض اگر کام اسی پیمانہ پر رہا تو ابھی اُردو کو علمی زبان کا رتبہ اور وسعت حاصل کرنے کے لیے ایک زمانہ درکار ہے بلکہ کیا تعجب ہے کہ اُردو کی یہ آہستہ خرامی ہندوستان کی دوسری زبانوں کو یہ موقع دے کہ وہ آگے بڑھ کر اس علمی منصب کو حاصل کر لیں اور اُردو کے لیے کوئی گنجایش باقی نہ رہے، اس بنا پر تمام حامیانِ اُردو کا یہ فرض ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اُردو کی علمی حیثیت بلند کرنے کی کوشش کریں۔

جب کوئی زبان ابتدائی منازل طے کر کے آگے بڑھتی ہے، تو قدرتاً اس قوم کے ذی علم لوگوں کو اپنی زبان میں مختلف علوم و فنون منتقل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اُس وقت اقتباس و ترجمہ کا دور شروع ہوتا ہے، یعنی دوسری زبانوں کی علمی کتابیں تلخیص یا ترجمہ کر کے اپنی زبان میں منتقل کر لی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ایک بڑا علمی ذخیرہ علوم و اصطلاحات کا تیار ہو جاتا ہے جس سے قوم کے عام مذاق میں تبدیلی و ترقی پیدا ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس زبان کے بولنے والوں میں بڑے بڑے ماہرینِ فن پیدا ہو جاتے ہیں، جو ان منتقل شدہ علوم پر اضافہ کرتے ہیں بلکہ بحث و نظر کے بعد ان علوم کو نقائص و اغلاط سے پاک کر کے مکمل کر دیتے ہیں بعینہ یہی صورت مسلمانوں کو پیش

آئی خلافتِ عباسیہ کے عہد میں فلسفہ اور مختلف علوم کی کتابوں کا ترجمہ ہوا، لیکن اس دور کے بعد خود مسلمانوں میں ایسے ایسے ماہرینِ فن اور حکما پیدا ہوئے جو ارسطو و افلاطون کے ہم پایہ تھے۔ بو علی سینا، فارابی، ابن رشد وغیرہ جیسے متعدد حکما ہیں جن کی شہرت سے دنیا گونج اٹھی۔ یہ اس رتبے کے لوگ تھے جن کے کارنامے علمی بیان کرنے کے لئے ہزاروں صفحات بھی ناکافی ہیں۔

اہلِ یورپ نے بھی اسی طرح دوسری قوموں نے ان خصوصاً مسلمانوں سے علوم حاصل کیئے ان کے طلبہ سیلاب کی طرح تمام مشرقی ممالک میں پھیل گئے۔ اور اس کے بعد یورپ واپس جاکر اپنی قوم میں ان علوم کو پھیلایا، یہاں تک کہ پھر خود یورپ میں بڑے بڑے نامور حکما پیدا ہوئے جنھوں نے ان علوم کو ترقی دے کر کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا اور چونکہ یورپ کا دَور ترقی اور عروج ابھی موجود ہے، اس لئے تحقیق و تفحص کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہزاروں شخص ہیں جو علم کے ہر شعبہ کے متعلق تحقیقات میں مصروف ہیں جن کی مساعی جمیلہ کے ثمرات سے دنیا لذت اندوز ہو رہی ہے، اور جدید انکشافات ہر شخص کو متحیر کر رہے ہیں، یورپ کے یہ علمی کارنامے اس قدر حیرت انگیز و شاندار ہیں کہ اُن کے بیان کرنے کے لیے مستقل کتابوں کی ضرورت ہے۔

اِن واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد جب ہم اپنی زبان کے علوم جدیدہ سے محروم رہنے پر نظر کرتے ہیں تو سخت افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اب تک اپنی زبان کی کچھ خدمت نہیں کی، قریباً پچاس برس سے ہمارے نوجوان بغرض تحصیل علم یورپ جا رہے ہیں، ہزاروں ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا چکے ہیں، متعدد اصحاب ایسے ہیں کہ جنھوں نے مختلف علوم میں اعلےٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں، جس پر ہماری قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، لیکن سوال یہ ہے، کہ ان قابل عزت نوجوانوں نے اپنی زبان کی کہاں تک خدمت کی، اور علوم جدیدہ سے کس حد تک اپنی قوم کو آشنا کیا، ظاہر ہے کہ

اس سوال کا جواب نفی میں ہے، ہماری زبان علوم جدیدہ سے ابتک بے نصیب ہے۔ قوم بدستور جہالت کی تاریکی اور جمود میں مبتلا ہے، صرف چند ہزار اشخاص ایسے ہیں جو کم و بیش مغربی خیالات سے آشنا ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی علمی زندگی نہیں رکھتے، علمی خدمت یا تالیف و ترجمہ کا کام کرنے والے تمام ہندوستان میں شاید ایک دو درجن سے زیادہ نہیں ہیں، جو اگر تمام عمر بھی محنت کریں جب بھی اُردو کو ایک ترقی یافتہ زبان کے رتبہ تک نہیں پہنچا سکتے نہ قوم کی علمی سطح کو بلند کر سکتے ہیں۔

بے شبہ آپ کو اہلِ مطابع کی فہرستوں میں سینکڑوں نام ایسی کتابوں کے نظر آئینگے، جو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوئیں، لیکن یہ علمی کتابیں نہیں بلکہ ناول اور افسانے ہیں جن سے بجز تھوڑی سی دماغی تفریح کے اور کچھ حاصل نہیں، علمی ذخیرہ کی تو یہ حالت ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی مطبوعات کو چھوڑ کر ابھی اسقدر ذخیرہ بھی اُردو میں مہیا نہیں ہوا جو ایک الماری کو پُر کر سکے، یہ حالت نہایت اندوہناک ہے، ضرورت ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب اپنی زبان کی اس بیمائگی کو محسوس کریں تو دس پندرہ سال کے اندر زبان کی حالت بدل سکتی ہے۔ مثلاً اگر ہر سال قلاً پچاس علمی کتابیں اُردو میں تالیف ہوں (جو بآسانی ممکن ہیں) تو دس سال کے اندر اُردو کے علمی خزانہ میں پانسو علمی کتابوں کا اضافہ ہو جائیگا، جو ایک اطمینان بخش تعداد ہے، کتابوں کا انتخاب ہر مترجم اپنے مذاق و واقفیت فن کے لحاظ سے کر سکتا ہے، البتہ اسکی خاص طور پر ضرورت ہے کہ ہر فن کی بہترین و مستند کتابیں جو ماہرین فن کی لکھی ہوئی ہیں، ترجمہ کی غرض سے منتخب کی جائیں، تاکہ جو چیزیں ہماری زبان میں منتقل ہوں وہ معتبر و قابل اعتماد ہوں۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر یہ کہا جائے کہ یہ کوئی جدید تحریک نہیں ہے، سب سے پہلے سر سید مرحوم نے یہ کام شروع کیا تھا یعنی دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی غرض سے ایک سوسائٹی قایم کی تھی، لیکن بعد کو نا قابل عمل یا غیر مفید سمجھ کر یہ کام بند کر دیا گیا، اور براہِ راست مغربی علوم و السنہ کی تعلیم ضروری قرار دی گئی۔ اس کے متعلق

یہ غرض ہے کہ جب سر سید مرحوم نے سوسائٹی قائم کی تھی اُس وقت تمام ہندوستان میں صرف چند تعلیم یافتہ مسلمان تھے عام حالت یہ تھی کہ انگریزی تعلیم سے لوگوں کو نفرت تھی، علما بھی اس تعلیم کے مخالف تھے، مسلمانوں کا کوئی قومی اسکول یا کالج ہندوستان میں موجود نہ تھا، لہذا اس موقع پر سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس تعصب و نفرت کو دور کیا جائے اور لوگوں کو براہ راست جدید تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے تاکہ وہ ان علوم سے متمتع ہو کر اپنی قوم کو فائدہ پہونچا سکیں، یہ بالکل ظاہر ہے کہ علوم جدیدہ اردو میں اس وقت منتقل ہو سکتے ہیں جب کہ پہلے ماہرین علوم و السنہ ہماری قوم میں پیدا ہوں جو براہ راست ان علوم کے اصلی سرچشموں سے سیراب ہو کر اپنی قوم کو فائدہ پہنچائیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ تالیف و ترجمہ سے پہلے تحصیل و تعلّم کا کام شروع ہوجائے لہذا سر سید نے اگر تالیف و ترجمہ کا کام شروع کر کے بند کر دیا تو اس خیال سے نہیں کہ وہ غیر مفید تھا بلکہ اس لئے کہ قبل از وقت تھا۔ اور اُس وقت مسلمانوں میں مختلف علوم و فنون کے اس قدر ماہر موجود نہ تھے جو ہر علم و فن کی کتابیں اُردو میں منتقل کر دیتے۔

لیکن اب حالت بدل گئی ہے۔ ملک میں ہزاروں تعلیم یافتہ موجود ہیں، جو اس کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں، اس کے علاوہ بعض لوگوں کا یہ اندیشہ بھی غلط ہے کہ اگر اُردو میں جدید علوم و فنون منتقل ہو گئے تو لوگ مستغنی ہو جائینگے اور انگریزی پڑھنا چھوڑ دینگے۔ کیونکہ لوگ عموماً معاش کی ضرورت سے انگریزی پڑھتے ہیں نہ کہ علمی ذوق سے لہذا جب تک ضرورت باقی ہے انگریزی سے استغنا ممکن نہیں، اس کے علاوہ خواہ علوم و فنون کی تمام کتابیں اُردو میں منتقل ہو جائیں جب بھی انگریزی کی ضرورت باقی رہیگی کیونکہ انگریزی ایک زندہ قوم کی زبان اور اس میں علوم و فنون کا برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے لہذا ایک دفعہ چند کتابوں کا ترجمہ کر لینے کے بعد ہم انگریزی سے بالکل مستغنی نہیں ہو سکتے سب سے زیادہ یہ کہ جب تک انگریزوں کی حکومت موجود ہے انگریزی سے استغنا ممکن نہیں۔

اُردو میں علوم جدیدہ کا منتقل کرنا اس غرض سے ہے کہ قوم کے عام افراد ان علوم سے متمتع ہوں، اور اُن کے معلومات میں اضافہ ہو وہ موجودہ متمدن ممالک کے خیالات و تہذیب سے آشنا ہوں اُن میں قومیت کا احساس و ترقی کا جذبہ پیدا ہو، اور وہ ترقی کے جدید وسائل و اسباب سے باخبر ہوں، ظاہر ہے کہ قوم کی ضرورتیں ابھی مدت تک باقی رہینگی، کیونکہ یہ یقینی ہے کہ ہماری قوم کے تمام افراد مغربی علوم و السنہ کی اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کر سکتے، جس کا بڑا سبب افلاس ہے۔ لوگوں میں خود تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت نہیں، قوم اس قدر دولتمند نہیں کہ لاکھوں بچوں کی تعلیم کے لیئے وظائف مہیا کر سکے، قوم ہی مفلس افراد سے مرکب ہے، اُس کے پاس دولت کہاں، اُس پر مصیبت یہ کہ تعلیم کے مصارف روز افزوں، اب وہ زمانہ تو ہی نہیں کہ مسجد کے صحن یا کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ کر کوئی شخص کسب کمال کر لے جب یہ حالت ہی تو کیونکر ممکن ہے کہ قوم کے سب بچے تعلیم یافتہ ہو جائیں۔

اِس کے علاوہ ہم کو یہ بھی غور کرنا چاہیئے کہ دنیا میں یا ہندوستان میں ہر شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیئے نہیں پیدا کیا گیا ہے، نہ ہر انسان کسی اسکول یا کالج کا طالب علم بن سکتا ہے، دنیا صرف پرفیسروں اور طالب علموں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اُس میں اور لوگ بھی رہتے ہیں جو مختلف قسم کے کاروبار میں مصروف ہیں، اور جب تک اس کائنات کا یہ نظام قائم ہے مصروف رہینگے، پس ہم کو اس خطرناک غلطی میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے کہ ہر شخص کو طالب علم بنادیں، دنیا کو مزدوروں اور معماروں کی بھی ضرورت ہے، کاشتکاروں اور دکانداروں کی بھی ضرورت ہے، کان کھودنے والوں اور ملاحوں کی بھی ضرورت ہے، اور اس طرح کے صدہا پیشہ وروں کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت ہمیشہ رہیگی لہذا یہ سب لوگ کسی کالج کے طالب علم نہیں بن سکتے، پس ہم کو سنگلاخ زمین میں تخم ریزی کرنا چاہیئے، اور ہرگز یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ ایک مزدور پہلے کسی اسکول میں تعلیم حاصل کر کے مزدوری یا حمالی کا کام شروع کریگا، یا اسٹیشن کا ایک قلی، مسافروں کے

ساتھ علم الاقتصاد کے مسائل پر بحث کرتا ہوا نظر آئیگا۔

ہم جو کچھ اپنی قوم کے لیئے کر سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہی کہ ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے لوگوں کے لیئے ابتدائی تعلیم کا انتظام کریں اور یہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہو، ابتدائی کتابیں سادہ اور سہل عبارت میں ہوں، زراعت وکاروبار کے متعلق ہم جدید معلومات سے اُن کو آگاہ کریں لیکن اس طریقہ سے کہ وہ آسانی سے ان چیزوں کو سمجھ سکیں، اوران معلومات سے اپنے پیشہ کے متعلق کام لے سکیں، اخلاقی اور مذہبی تعلیم بھی مادری زبان کے ذریعہ سے ہو اور ایسے مؤثر و دل نشیں طریقہ سے کہ وہ شوق و رغبت سے اس کو حاصل کریں، اگر ہم اس طریقہ سے کام کریں تو قوم کے عام افراد اور کاروباری لوگوں کو ایک حد تک جہالت کی تاریکی سے نکال سکتے ہیں۔

ایک کافی جماعت ایسے لوگوں کی ہی جو کسی خاص کاروبار سے تعلق نہیں رکھتے اور نسبتاً زیادہ وقت تعلیم و مطالعہ میں صرف کر سکتے ہیں اور فی الجملہ مشرقی علوم و ادب سے واقف ہیں، لیکن جدید تعلیم حاصل کرنے کی فرصت یا استطاعت نہیں رکھتے، ایسے لوگوں کے سامنے ہم علوم جدیدہ کی کتابیں اُن کی مادری زبان میں پیش کریں تاکہ مغربی علوم والسنہ کی ناواقفیت سے جو نقصان اُن کو پہنچا ہی، وہ اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے اُس کی تلافی کر سکیں۔

اب تک مُسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے پیچھے پڑے ہیں، بڑی بڑی شہروں میں تعلیمی تحریک نشو و نما حاصل کر رہی ہی، لیکن دیہات اور قصبات کے لاکھوں مسلمان تعلیم سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ اپنی مادری زبان میں بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے نہ اُن کو اُردو میں اس قسم کی کتابیں میسر آتی ہیں جو اُن کے لیئے موزوں اور مناسب ہوں، اور اُن کی ضرورت کو پورا کر سکیں، اسی کا نتیجہ یہ ہی کہ مسلمانوں پر مختلف بلائیں فتنۂ ارتداد وغیرہ کی صورت میں مُسلط ہیں، اس کے علاوہ جو مادی اور دنیوی

نقصان جہالت سے پہنچ رہا ہے اُس کا تو کچھ ٹھکانا نہیں، اگر ہماری زبان میں ایسی مفید وکارآمد کتابیں ہوتیں جو ان واجب الرحم مسلمانوں میں بیداری اور خودشناسی پیدا کرتیں اور ہم ان کتابوں کے ذریعہ سے ان میں تعلیم پھیلاتے تو یہاں تک نوبت نہ آتی۔ لیکن ہم صرف خرگوش اور لومڑی کی کہانیاں اور فضول کتابیں پڑھا کر یہ اُمید کرتے ہیں کہ قوم ترقی کے تمام منازل طے کریگی۔

اعلیٰ تعلیم کی یہ حالت ہے کہ وہ غیر ملکی زبانوں میں دیجاتی ہے، اس لیے غیر زبان کی مشکلات مدت تک تحصیل علوم میں سنگِ راہ رہتی ہیں۔ اور طلبہ کا زیادہ وقت زبان کے سیکھنے میں صرف ہوجاتا ہے، یہی سبب ہے کہ بہت کم نوجوانوں کو علوم پر دسترس حاصل ہوتا ہے، اس مشکل کا حل بھی یہی ہے کہ علوم کی تعلیم مادری زبان میں ہو اور انگریزی بطور ایک زبان کے حاصل کیجائے۔ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ اسی اُصول کے ماتحت قایم کی گئی ہے۔ یہ ایک جدید تجربہ ہے، لیکن تمام واقف کار اصحاب کا خیال ہے کہ اس تجربہ میں کامیابی حاصل ہوگی۔

یہ تجربہ ہندوستان کے لیئے تو بیشک جدید ہے لیکن دوسرے ممالک میں مدت سے اس پر عمل ہو رہا ہے، ایشیا میں اس وقت جاپان سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملک ہے لیکن وہاں پچاس برس سے تمام علوم مادری زبان میں پڑھائے جاتے ہیں اور یہ طریقہ نہایت کامیاب اور مفید ثابت ہوا ہے، یورپ میں بھی ہر جگہ مادری زبان میں تعلیم دیجاتی ہے یعنی علوم کسی خاص زبان کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھے جاتے البتہ ہر زبان کا علم ادب ایک جداگانہ چیز ہے جو اسی زبان کے ساتھ مخصوص ہے۔

یورپ کی علمی ترقی محتاج بیان نہیں لیکن باوجود اس ترقی کے اب بھی یورپ میں لاکھوں شخص ایسے ہیں جو اپنی مادری زبان کے سوا اور کسی زبان سے واقف نہیں، حالانکہ وہ اپنے مذاق اور تعلیم کے لحاظ سے مختلف علوم میں کامل دستگاہ رکھتے

ہیں اس موقع پر یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یورپ کی زبانیں کافی وسعت اور گنجایش رکھتی ہیں اس لیئے ان زبانوں میں علوم کا منتقل کرنا سہل ہے، لیکن اُردو ابھی اسقدر وسیع نہیں نہ اُس میں مختلف علوم کی اصطلاحات موجود ہیں، لیکن یہ شبہ یا اعتراض چنداں وقیع نہیں، اُردو میں اگر علمی اصطلاحات بالفعل موجود نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں، جس طرح گزشتہ صدی میں ہزاروں جدید الفاظ اور اصطلاحات کا اضافہ ہوگیا ہے آئندہ بھی ہو سکتا ہے، ناگزیر ضرورتیں ہر زبان کو وسیع کر دیتی ہیں، چنانچہ جدید علوم اور ایجادات کی بدولت گزشتہ صدی میں ہر زندہ زبان نے نہایت تیزی سے وسعت حاصل کی ہے، یہانتک کہ آج کل کوئی مشہور زبان بھی خالص اور بے میل نہیں ہے۔ کسی زبان میں الفاظ و اصطلاحات کا اضافہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، ہر زندہ زبان میں صدیوں سے یہ اضافہ ہو رہا ہے، عربی میں دولتِ عباسیہ کے زمانہ سے ابتک ہزاروں معرب و دخیل الفاظ کا اضافہ ہو چکا ہے، ترکی اور فارسی زبانوں میں بھی ہزاروں جدید الفاظ داخل ہو گئے ہیں جب جدید علوم و فنون اُردو میں منتقل ہونے لگینگے تو رفتہ رفتہ اُردو بھی مزید وسعت حاصل کرتی جائے گی، علوم جدیدہ کے اُردو میں منتقل کرنے کے کام کو اُسوقت تک ملتوی رکھنا کہ پہلے تمام علوم کی اصطلاحات وضع ہو جائیں، اور زبان کافی وسعت اختیار کرلے ایک مغالطہ ہے، ایسا کہیں بھی نہیں ہوتا، زبان ہمیشہ علوم کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتی ہے نہ یہ کہ پہلے زبان وسعت و ترقی حاصل کرلے اس کے بعد علوم پیدا ہوں۔

بے شبہ اگر مادری زبان میں تعلیم کا ارادہ کیا گیا تو ابتدا میں مشکلات کا سامنا ہوگا کیونکہ سردست اس قسم کی کتابیں موجود نہیں ہیں، لیکن ضرورت تمام مشکلات کو حل کرسکتی ہے، البتہ ہندوستان کا عام نظام تعلیم بغیر گورنمنٹ کی شرکت عمل کے تبدیل نہیں ہو سکتا مگر ہم کو بغیر مزید تاخیر کے اپنے دائرہ میں کام شروع کر دینا چاہیئے، اُمید ہے کہ جب تک ہم ابتدائی مراحل طے کرینگے ہندوستان کے نظامِ حکومت میں ایسی خوشگوار تبدیلی پیدا

ہو جائیگی، کہ کم از کم صیغہ تعلیم میں اس قسم کا تغیر قابل اطمینان طریقہ سے ممکن ہوگا۔

اُردو زبان کی توسیع و ترقی سے علاوہ علمی فوائد کے بہت سے پولیٹکل فائدے بھی مسلمانوں کو حاصل ہونگے جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

اُردو کا کتب خانہ

(۳) زبان کی ترقی و تحفظ کا ذریعہ کتب خانے بھی ہیں کتب خانوں کے قیام کا رواج زمانہ دراز سے تمام متمدن اقوام میں چلا آتا ہے، آج بھی تمام ترقی یافتہ ممالک میں جا بجا کتب خانے قایم ہیں جو ان اُولوالعزم اقوام کی ہمّت و حوصلہ کے مطابق نہایت وسیع و شاندار ہیں۔ لیکن اُردو کو یہ رتبہ ابتک نصیب نہیں ہوا۔

ہمارا مقصد اُردو کے ایک مکمّل کتب خانہ سے ہے، جس میں اُردو کی تمام قابل لحاظ کتابیں جو ابتدائے عہد سے ابتک تالیف یا ترجمہ ہوئی ہیں موجود ہوں، تاکہ ہم کو یہ اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اپنے خزائن علمی کے لحاظ سے اُردو کو السنہ مشرقیہ کی صف میں کیا مرتبہ حاصل ہے، اور بحالت موجودہ اس میں کس قسم کے اضافہ یا اصلاح و تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اُردو کے ایک مکمّل کتب خانہ کی ضرورت پر اسی رسالہ میں ایک دفعہ نہایت مفصّل بحث ہو چکی ہے۔ اعادہ کی حاجت نہیں البتہ اس قدر عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ یہ ایسا ضروری کام ہے جس کو اب سے بہت مدت پہلے شروع ہو جانا چاہیئے تھا مگر اب بھی اگر ابتدا کر دی جائے تو غنیمت ہے ورنہ آئندہ نسلیں جو یقیناً ہم سے زیادہ ذکی الحس ہونگی ہماری اس بے پروائی کو تعجب و افسوس کی نظر سے دیکھینگی۔

ماحصل تمام مذکورۂ بالا خیالات کا یہ ہے کہ مادری زبان کے تحفظ و ترقی کی سخت ضرورت ہے جس کے بغیر نہ تو تعلیم عام ہو سکتی ہے، نہ قوم کے عام افراد میں ترقی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے، نہ ہم زندہ قوموں کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں، یوں تو یہ فرض ہر اُس

شخص کا ہی جو اُردو کو بطور مادری زبان کے استعمال کرتا ہی، لیکن تعلیم یافتہ اصحاب کو خصوصیت سے اس فرض کا احساس ہونا چاہیئے یہی جماعت ہی جس سے ہر شخص کی اُمیدیں وابستہ ہیں اور جس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہی کہ وہ اپنی قوم کے لیئے کچھ کرے گی۔

آجکل قومی خدمت کا ولولہ زیادہ تر نوجوانوں میں پایا جاتا ہی، اور قومی خدمت کا پہلا درجہ یہ ہی کہ ہم کو اپنا مذہب، اپنا وطن، اپنی تہذیب، اپنی زبان، غرض اپنی ہر چیز عزیز ہو ؎

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

اس سے کیا حاصل کہ امریکہ ترقی کر رہا ہی، اور یورپ کا آفتاب اقبال نصف النہار پر پہنچ چکا ہی، دیکھنا تو یہ ہی کہ ہم کس منزل پر ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ بے شبہ یورپ کی زبانوں میں بہت کچھ علمی ذخیرہ موجود ہی، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہی کہ یورپ کی کوئی زبان ہماری مادری زبان نہیں ہی۔ ہمارے لیئے تو فخر کا موقع جب ہوگا کہ جو کچھ یورپ نے اپنے ملک اور اپنی زبان کے لیئے کیا ہی ہم بھی اپنے وطن اور اپنی زبان کے لیئے کریں ورنہ دنیا میں تو سب ہی کچھ ہو رہا ہی اور کرنے والے سب ہی کچھ کر رہے ہیں، ہمارا اس میں کیا حصہ ہی جس پر ہم فخر کریں،

محمد اکرام اللہ خاں ندوی
سلطان جہان منزل
علیگڑھ

انگلستان کا موجودہ نظامِ تعلیم

کسی غیر ملک یا قوم کے نظامِ تہذیب کو کلاً یا جزءً غیر قوم بجنسہٖ اپنے لئے راہِ ترقی نہیں بنا سکتی۔ لیکن اگر دو قوموں کے کسی شعبۂ تہذیب مثلاً سیاست یا تعلیم کے کچھ اجزا باہم مشارکت رکھتے ہوں تو افضل قوم کے نظام کا بالاستعیاب مطالعہ کرنا پست قوم کے لیے سبق آموز ہونے سے خالی نہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر آج میں اس قوم کی نظامِ تعلیم کا خاکہ کھینچنا چاہتا ہوں جس نے محض علوم و فضائل کی برکات سے آج دنیا کی قوموں کو مسخر کیا ہے یعنی انگلستان، لیکن انگریزی نظامِ تعلیم کی موجودہ ہیئت بیان کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی گزشتہ تاریخ پر سرسری نظر ڈالی جائے۔

تاریخ التعلیم

انیسویں صدی شاید پہلے ہی سے ایک زبردست انقلاب کے لیے مقدر تھی جس کے شروع ہوتے ہی تہذیب و معاشرت کے تمام منزلوں میں کایا پلٹ کا نقشہ نظر آنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ مغرب ہی میں ہوا مشرق تک اس کا بہت کم اثر پہنچا مغرب میں جس قدر انقلابات ہوئے ان سب کی تہ میں یہی تعلیمی انقلاب تھا اور اسی نے اہلِ مغرب کی دنیا بدل دی۔

ابتدائی

برطانیہ میں ابتدائی تعلیم کا نظام ۱۸۳۳ء تک ہندوستان میں ہمارے نظامِ تعلیم کی طرح حاملانِ شریعت کے ہاتھ میں تھا یہاں اور وہاں یہی طبقہ جز و کل کا مالک تھا۔ تعلیم کے مصارف بھی دونوں جگہ مستطیع افراد کی فیاضانہ داد و دہش سے پورے ہوتے تھے ۱۸۳۳ء میں پارلیمینٹ نے پہلی مرتبہ اپنے فرضِ اولیں کو پہچانا اور بیس ہزار پونڈ کا سالانہ عطیہ ابتدائی تعلیم کے لئے منظور

کیا۔ چھ برس بعد یہ رقم ڈیوڑھی ہو گئی۔ اور دو مرکزی انجمنوں کی وساطت سے جو اس وقت ملک میں تعلیم کی ذمہ دار تھیں عطیہ صرف ہوتا تھا مگر صرف تعمیر مدارس میں باقی خرچ پھر اسی طرح چندہ اور خیرات سے پورا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ اتنی جدت ضرور ہوئی کہ تعلیم کی نگرانی کے لیئے پریوی کونسل کی طرف سے ایک خاص جماعت کھڑی کی گئی۔ یہی پہلا سر رشتہ تعلیم تھا پھر بھی اس سے پرانے نظام تعلیم میں چنانچہ ایک خارجی تغیر ہوا۔ روح وہی مذہبی تھی جس کے ہاتھ میں ابتدائی مدارس کا اندرونی نظم و نسق تھا۔ آخر کار ۱۸۷۰ء میں ایک جدید قانون پاس ہوا جس کے اثر سے ابتدائی تعلیم کی روح و جسم دونوں بدلنے شروع ہوئے یعنی سرکار کی جانب سے ایک نئی جماعت لنڈن اسکول بورڈ کے نام سے بایں اختیارات قایم ہوئی کہ ابتدائی مدارس میں حسب ضرورت اضافہ اور مصارفِ تعلیم محاصل سے پورا کیے اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جس طرح آج ہمارے ملک اور قوم میں بچے دو عملی کی مصیبت میں مبتلا ہیں ایک طرف ٹول پاٹ شالے۔ مُلا مکتبیں اور آزاد قومی مدرسے اُن کا دامن کھینچتے ہیں اور دوسری طرف لوکل بورڈوں کے مدرسے یا گورنمنٹ اسکول کی شاخیں اُن کا گریبان پکڑتی ہیں۔ بعینہ یہی حال اُنیسویں صدی کے ربعہ آخر میں انگلستان کے بچوں کا تھا۔ پادریوں کے مدارس اور اسکول بورڈ لنڈن کے مدرسے پہلو بہ پہلو جاری تھے چونکہ حکومت کو دونوں آنکھیں برابر تھیں جیسا کہ آج ہمارے ملک میں برابر ہیں اس لیئے ایک مہربان ماں کی طرح پارلیمنٹ دونوں قسم کے مدرسوں کی امداد کرتی تھی علاوہ اس کے دونوں فیس بھی لیتے تھے مگر جب ۱۸۹۱ء میں پارلیمنٹ نے سالانہ عطیّہ میں اضافہ کر دیا تو ابتدائی تعلیم مفت ہو گئی اور خصوصًا بورڈ کے مدارس میں فیس لینے کی قطعًا ممانعت تھی۔ اُدہر جب ۱۹۰۵ء میں کونسل نے دوسری قسم کے مدارس کا بار مصارف بھی اپنے ذمہ لے لیا تو ان میں

بھی تعلیم مفت ہو گئی۔

ثانوی

ثانوی تعلیم کا یہ حال تھا کہ شروع میں یہ بھی اہل مقدور کی فیاضی پر منحصر تھی۔ چنانچہ صدیوں سے اکثر مدارس محض اوقاف کے سہارے پر چلے آتے تھے اُن کو بھی اسی کایا پلٹ دور میں سرکاری امداد کا شرف پہلی دفعہ حاصل ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں ایک عظیم الشان نمائش منعقد ہوئی جسے دیکھ کر پارلیمنٹ کو علوم وفنون اور طبعیات کی اعانت کا خیال آیا اور ایک اور سرکاری محکمہ سائنس اور آرٹ ڈپارٹمنٹ کے نام سے قایم ہو کر اس کے ذریعے سے ثانوی مدارس کو امداد ملنے لگی ۱۸۸۹ء میں ضلع اور قصبہ کے بورڈوں کو جنھیں ہمارے ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے ہم پلہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ اختیارات ملے کہ ٹیکنکل تعلیم کے مصارف کو تعلیمی محاصل لگا کر کلاً یا جزءً ادا کریں۔ مگر یہ صرف ایک ہی سال کے لیئے تھا۔ ۱۸۹۰ء میں شاہی خزانہ نے تمام بار مصارف اپنے ذمہ لے کر محاصل کو موقوف کر دیا تعلیم کا جدید دور اس وقت سے شروع ہوا مقامی کونسلوں نے سرکاری عطیات کمال دانشمندی سے صرف کر کے ٹیکنکل تعلیم کو بے حد ترقی دی جدید مدرسے قائم کیئے یا کرائے۔ ساتھ ساتھ سائنس اور آرٹ کی تعلیم کے ذرائع بھی مہیا کیئے۔ السنہ مروجہ اور علم تجارت کے متعدد شعبوں کی تعلیم کا بھی کافی انتظام کیا۔ الغرض اس وقت سے انگلستان کی تعلیم ایک پختہ شاہراہ پر پڑ گئی۔

اِس اجمال سے معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی کے اختتام پر گو انگلستان میں نظام تعلیم بدلا مگر فی الجملہ ایک خلط مبحث ہو گیا۔ ایک طرف تو ابتدائی تعلیم ایک سرکاری محکمہ کے ہاتھ میں تھی اُدھر ثانوی اور ٹیکنکل تعلیم دوسرے سررشتہ کی نگرانی میں تھی پھر ابتدائی مدارس کی بھی دو قسمیں تھیں یعنی اوّل خواص کے مدرسے جن کی آمدنی ناکافی تھی دوسری قسم میں بورڈ کے مدرسے تھے جن کے مصارف تعلیمی محاصل سے پورے

ہوتے تھے پھر مقامی ذمہ داران یعنی ضلع اور بورڈ کی کونسلیں تو ثانوی اور ٹیکنیکل تعلیم کی حامی تھیں اور اسکول بورڈ جن کو مقامی جماعتیں کہنا چاہیئے اپنی قوت سے باہر ہوکر اعلیٰ تعلیم کی معین ومددگار بن گئی تھیں الغرض تعلیم کا ساز تو بن گیا مگر اس کے متعدد تار الگ الگ آواز دیتے تھے۔ جو ایک طرح کی بدنظمی تھی۔ آخر کار ۱۸۹۹ء میں ایک جدید قانون پاس ہوا جس کا یہ اثر تھا کہ دونوں جماعتیں ٹوٹ کر بورڈ آف ایجوکیشنل کے نام سے ایک جماعت ذی اختیار قایم ہوئی۔ اور دوعملی حالت جاتی رہی۔ ۱۹۰۲ء میں ایک اور قانون پاس ہوا جس کی رو سے تمام مقامی جماعتیں ہر قسم کی تعلیم کی ذمہ دار قرار پائیں غیر سرکاری مدرسوں کی کفالت بہ استثنائے عمارات انہی کے ذمہ عاید ہوئی اور اب وہ خلط مبحث بالکل مفقود ہو گیا۔

اگرچہ نظام تعلیم میں نمایاں تغیرات ہوئے مگر متعلموں کی حالت بدستور خراب و خستہ تھی ان کی حق شناسی اور حق رسانی کا کسی کو خیال تک نہ تھا ۱۹۰۶ء میں قانون خوراک طلبہ پاس ہوا جس کی رو سے محتاج طلبہ کو خوراک مہیا کرنے کی ذمہ داری مقامی جماعتوں پر عاید کی گئی۔ اگلے سال ۱۹۰۷ء میں طبی معائنہ کا قانون پاس ہوا جس کے اثر سے طلبہ کی صحت کا معائنہ کرنا اور معالجہ کرانا لازمی قرار دیا گیا ۱۹۰۹ء میں ایک اور قانون کے ذریعے سے لازم ہوا کہ جو بچے بے غور و پرداخت تھے یا غیر صحت بخش مقامات میں رہتے تھے اُن کے لیے بہتر اہتمام کیا جائے اسی طرح ۱۹۱۳ء میں مختل الحواس بچوں کا قانون منظور ہوا جس سے ان کا تحفظ صحت ذمہ داران تعلیم کے سپرد ہوا۔ مگر اس سلسلہ کا آخری قانون ۱۹۱۸ء میں پاس ہوا۔ جس کا یہ اثر ہے کہ تمام مقامی جماعتوں کے اختیارات و فرایض بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ قانون مذکور کے بعض احکام تعلیمی خدمت اور حقوق متعلمین کے لحاظ سے نہایت اہمیت اور خاص شان رکھتے ہیں۔ مثلاً

(۱) ۱۹۰۲ء کے قانون کی رُو سے مقامی جماعتوں کو صرف یہ اختیار تھا۔ پابندی کچھ نہ تھی کہ اپنے اپنے حدود ارضی میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کریں۔ مگر ۱۹۱۸ء کے قانون نے ہر ایک ضلع اور مسلمہ قصبہ کی مقامی جماعتوں پر یہ لازم کر دیا کہ تمام مدارج تعلیم کے ذرائع ادنیٰ سے اعلیٰ تک مہیا کریں۔ یعنی ابتدائی۔ ثانوی۔ ٹیکنکل اور یونیورسٹی کی تعلیم کا انتظام کریں۔ گویا عام تعلیم کی اک ایسے مکمل قومی نظام کا اہتمام کرنا ان کمیٹیوں پر فرض ہو گیا جس سے ہر قابل شخص مستفید ہو سکے۔

(۲) لازمی تعلیم حد آخر چودہ سال ہے اس سے نکلکر تمام لڑکے اور لڑکیاں دو برس اور یعنی سولہ برس تک ایک اور قسم کے مدارس میں تعلیم پانے پر مجبور ہیں جو تتمہ مدارس کہلاتے ہیں۔ اور جن کا قایم کرنا ان ہی جماعتوں کا قانونی فرض ہے۔ دو سال کا اضافہ صرف سات برس کے لیئے ہوا ہے اس میعاد کے بعد ہر ایک لڑکا لڑکی اٹھارہ سال کی عمر تک تتمہ مدارس میں اجرائے تعلیم پر مجبور ہو گا۔ واضح ہو کہ معمولی مدارس کے اوقات سے تتمہ کے اوقات تعلیم عمداً مختلف رکھے گئے ہیں تاکہ لڑکوں کی اور مشاغل میں مداخلت نہو۔

(۳) طلبار کا طبی معائنہ اور معالجہ کرانا انہی مقامی کمیٹیوں کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ نیز ایام تعطیل میں طلبار کے لیئے جابجا اجتماعی مرکز قایم کر کے جسمانی ورزش اور دماغی تفریح کا سامان فراہم کرنا مثلاً کھیل کے میدان۔ حمام۔ حوض شناوری اور اسی قسم کی سہولتیں جو تمدنی اور جسمانی تربیت کے لیئے ضروری ہیں وغیرہ یہ بھی انہی مقامی کمیٹیوں کا فرض ہے۔

(۴) پارلیمینٹ کا فرض ہو گا کہ ہر ایک مقامی جماعت کو منظور شدہ مصارف تعلیم کا کم از کم پچاس فی صدی حصہ سالانہ بطور امداد ادا کرے۔ الغرض ۱۹۱۸ء کے قانون نے زندگی کی جمیع ضروریات کو پس پشت ڈال کر محض تعلیم کو ملتحاج

قرار دیا ہے۔

حالتِ موجودہ اب انگلستان کا نظام تعلیم یہ ہے کہ بورڈ آف ایجوکیشن کے نام سے اعلیٰ مرکزی قوت بجائے خود قایم ہے جس کا بڑا فرض محض نقد اور تبصرہ اور تعلیمی مشین کی نگرانی ہے۔ اِس کے تحت میں لندن کونٹی کونسل کے نام سے ایک کارکن جماعت قائم ہے جو ابتدائی کے زیرو بالا پر عملاً قابض ہے۔ بقیہ نظام تعلیم یعنی ثانوی اور اعلیٰ مدارج یونی ورسٹی تک کے تمام شعبوں میں وہ اور متعدد جماعتوں کے ساتھ مل کر بطور مشیر کام کرتی ہے۔ مثلاً لندن یونیورسٹی کی جماعتِ منتظم شہر لندن کی تعلیمی کمیٹیاں۔ مہتممانِ اوقافِ تعلیمی۔ اُن مدارس کی جماعتہائے متولیاں جن میں ٹکنکل سائنس اور متعدد ٹکنکل پیشوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کونسل کے تحت میں پھر ایک اور کارپرداز جماعت ہے جو ایجوکیشنل کمیٹی کہلاتی ہے۔ اِس کو ماسوا تعلیمی محاصل اور قرضہ سے روپیہ فراہم کرنے کے جمیع اختیارات حاصل ہیں۔ کمیٹی کے نظام میں اڑتیس اراکین ہاؤکونسل کے نظام میں سے اور بارہ اراکین غیر طبقوں سے یعنی کل پچاس ممبر مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ اِس کے تحت میں نو اور سب کمیٹیاں مختلف فرایض انجام دیتی ہیں۔ اِن کے علاوہ ابتدائی تعلیم کے صیغہ میں ایک سو چوراسی مقامی مجلسیں مدد دیتی ہیں جن کے نظام میں امدادی مدارس کے منیجر باضابطہ اور قانوناً شامل ہیں اور تین سو اکیاون باضابطہ جماعتیں جن میں غیر امدادی مدارس کے منیجر ہیں کمیٹی کی اعانت کرتی ہیں۔ یہ سب ملکر ابتدائی مدارس میں کمیٹی کا ہر طرح پر ہاتھ بٹاتی ہیں اسی طرح کمیٹی مذکور کو اپنے ثانوی مدارس۔ ٹریننگ کالج۔ ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ اور علوم و فنون کے مدارس وغیرہ کے جماعتہائے منتظمین میں کمیٹی اپنے نامزد ممبروں کو شامل کرنے کا حق بھی رکھتی ہے۔ کمیٹی کا بجٹ ابتدائی تعلیم کے صیغہ میں ساڑے دس کرور اور ثانوی میں سوا دو کرور کُل روپئے تیرہ کرور سالانہ کا ہے۔

ابتدائی تعلیم

کونسل کے جمیع انتظامی افسروں کی تعداد اگرچہ ساڑھے گیارہ سو ہے اور کل علاقہ زیر اثر بارہ ضلعوں اور چار قسمتوں میں منقسم ہے مگر آٹھ افسروں کے فرائض زیادہ اہم ہیں۔ یعنی چار قسمت کے انسپکٹر ایک افسر اس لیئے کہ طلبار کی تمام خبرگیر کمیٹیوں مقامی انجمنوں اور مدرسہ کمیٹیوں کے جلسوں کا اوقات مقررہ پر اہتمام کرے۔ نیز حاضری طلباء اور خارج از مدرسہ لڑکوں کے لیئے فکر روزگار کرے۔ طبی معائنہ اور معالجہ اور خوراک کے لیئے روپیہ فراہم کرائے۔ دوسرا افسر شبینہ مدارس کی نگرانی کرتا ہے۔ تیسرا میڈیکل افسر ہے جو طلبار کی جسمانی قوی اور ہوش وحواس کا معائنہ کرتا ہے۔ چوتھے کے سپرد صرف مدرسہ کی عمارات کا تیار کرانا اور ان کی نگرانی کرنا ہے۔ مگر امدادی مدارس کی عمارات خاص بانیوں کے ذمہ ہے۔ مذہبی تعلیم بھی بانی مدرسہ کے عقائد کے مطابق خاص ہوتی ہے مگر کونسل کے مدارس میں اناجیل کی تعلیم عام اخلاقی اور نصرانی اصول پر دیجاتی ہے۔ اس وقت لندن میں چھ سو سے زیادہ تعداد کونسل کے مدارس کی ہے۔ ان میں چھ سات لاکھ بچے تعلیم پاتے ہیں جن کی حاضری کا اوسط پانچ لاکھ سے زیادہ ہے ان کے علاوہ تین چار سو کے درمیان امدادی مدارس الگ ہیں۔ جو تین تا پانچ برس کی عمر کے بچوں کے لیئے مخصوص ہیں۔ تین سو پچاس افسر صرف اس بات پر متعین ہیں۔ کہ گھر گھر پھر کر بچوں کو تعلیم کے لیئے مدرسوں میں لائیں۔ جبری تعلیم کا یہ نظام ہے کہ مدرسوں کی جانب سے ان افسروں کو غیر حاضر بچوں کی فہرستیں وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہیں۔ ہر ایک فہرست سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کون بچے مسلسل حاضر نہیں ہوتے۔ افسر تحقیق کرکے اول خود اصلاح کرتا ہے اگر کچھ نتیجہ نہ نکلے تو مقامی کمیٹی کو جو اس کام کے لیئے ہے مقدمہ کی صورت میں توجہ دلاتا ہے اس پر بھی اگر بچہ کی اصلاح نہو تو مقدمہ باضابطہ عدالت کی سپرد ہوتا ہے۔ یہاں بیس شلنگ جرمانہ

تک کی سزا دیجاتی ہی۔ جبری تعلیم پانچ تا چودہ برس کی عمر کے لیئے محدود ہی۔ کونسل کے مدرسہ کے کسی صیغہ میں تین سو پچاس سے زیادہ طلباء نہیں پڑھ سکتے۔ اور نہ کسی جماعت میں اڑتالیس سے زیادہ طلباء۔ تین اور پانچ برس کی درمیانی عمر کے اور چالیس سے زیادہ بڑے لڑکے داخل ہو سکتے ہیں۔

نصاب تعلیم نصاب تعلیم بھی بہت ہلکا اور عمر کے مطابق ہوتا ہی۔ یعنی انتظام خانہ داری۔ دستکاری۔ مطالعہ فطرت۔ جسمانی ورزش باقاعدہ کھیل و تفریحات۔ تیرنا۔ کہیں کہیں اتفاقاً زبان دانی بھی لیکن یہ دراصل مرکزی مدارس کا مضمون ہی۔ ابتدائی مدارس میں تمام تعلیم ان ہی مدات کے ذیل میں دیجاتی ہی۔ اول الذکر دو مضامین کے لیئے خاص خاص تعلیمی مرکز ہیں جہاں ایک محدود حلقہ کے مدارس سے بچے جمع ہو جاتے ہیں اور کام سیکھتے ہیں۔ انتظام خانہ داری۔ کھانا پکانا۔ گاذری۔ گھر کی دیکھ بھال جس میں مستورات کے غالباً تمام انتظامی فرائض شامل ہیں۔ اِس مضمون کو ہر لڑکی الگ الگ سیکھتی ہی۔ مگر گیارہ برس کی عمر سے پہلے اس درجہ میں دخل نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ تین ماہ یا نوّے اسباق کا کورس ہے اسی طرح دستکاری کی تعلیم بھی اسی عمر سے تندرست لڑکوں کو شروع کراتے اور اکثر لکڑی کے کام سکھاتے ہیں۔ صرف بیس مدارس دھات کے کام کے ہیں۔ دستکاری کے مدارس میں اب دودخانی یا برقی مشین بھی داخل ہوتی جاتی ہیں نیز نقشہ کشی اور بینچ ورک کی تعلیم بھی شروع ہو گئی ہی۔ مطالعہ فطرت چھوٹے بڑے بچوں کے لیئے عام اور ابتدائی نصاب کی جان ہی۔ بچہ کو اشیاء گرد و پیش سے آشنا کرتا ہی مثلاً حیوانات۔ جمادات۔ پہاڑی اور صحرائی مناظر قدرت کا مشاہدہ بجائے خود اصل حالت میں کرانا کتابی تعلیم سے ہزار درجہ زیادہ سبق آموز ہی۔ چنانچہ مدرسہ کے احاطے اور کھیل کے میدان میں انواع و اقسام کے پودے لگاتے ہیں۔ اسباق لاشا

اور سائنس کے کرشمے اور اسی قسم کے اور مفید کیفیات دکھا کر علم کو وسیع کرتے ہیں جس کے مصارف اساتذہ کو کونسل سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ علم النباتات سے چیدہ نمونے بھی فراہم کرتے ہیں چنانچہ سال بھر میں اسی نوے لاکھ کے درمیان پودے اطراف و جوانب ملک سے جمع کرکے مدرسوں میں بھیجتے ہیں۔ صدہا آدمی اسی کام پر متعین ہیں۔ اس طرح کے علمی باغات میں بیس باغات کا سالانہ اضافہ ہوتا ہے اسکے علاوہ طلبا، کو عجائب گھروں میں اور گرد و نواح کے علاقہ میں سیاحتاً بھیجکر انھیں سبق آموز اشیا کا مطالعہ کراتے ہیں۔ ہفتہ ہفتہ بھر اسکول کیمپ میں اور ورزش کے کھیل تماشوں میں مشغول رکھتے ہیں۔ جس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ انگلستان میں رسمی امتحان کا شکنجہ روز بروز ڈھیلا ہوتا جاتا ہے۔

خبر گیر کمیٹی جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ایجوکیشن کمیٹی کی صدہا شاخیں ہیں مگر ان میں سب سے زبردست شعبہ خبر گیر کمیٹی ہے جس کے فرائض حسب ذیل ہیں۔

(۱) مفلوک الحال بچوں کی اور اگر ضرورت ہو تو اُن کے گھر بھر کے لیئے خوراک بھی۔ اور ساتھ ساتھ والدین کے لیئے سبیل روزگار بھی مہیا کرنا۔ پارلیمنٹ کا قانون آزوقہ اطفال سنہ ۱۹۰۶ء اس کا حامی ہے۔

(۲) ہر ایک بچہ کا طبی معائنہ اور بیمار کا عندالضرورت مفت معالجہ حسب منشاء قانون طبی معائنہ سنہ ۱۹۰۷ء چنانچہ ۹ برس مدت تعلیم ابتدائی کے اندر تین مرتبہ تو یہ معائنہ لازمی ہے اور پھر اس طرح پر نہیں کہ نبض و قارورہ دیکھ کر اور نسخہ لکھکر رہ جائیں بلکہ معائنہ کے وقت خبر گیر کمیٹی کا افسر اور والدین بھی موجود ہوتے ہیں انھیں مفصل ہدایات دی جاتی ہیں اگر کوئی مربی حاضر نہ ہو تو کمیٹی کا افسر بچہ کے مکان پر جاکر شفاخانہ یا ماہر فن ڈاکٹر کا پتہ دیتا ہے اور اس کے بعد برابر استفسار اور تاکید کرتا رہتا ہے اگر عمداً غفلت کریں تو ایک خاص قانون کی رو سے مقدمہ

عدالت کے سپرد کر دیا جاتا ہے اگر بچہ معذور و بیکار ثابت ہو تو بیکار بچوں کی خبر گیر کمیٹی کو سپرد کر دیتے ہیں۔ نادار ہوں تو کمیٹی خود علاج کرتی ہے اگر معائنہ کنندہ عینک کی سفارش کرے تو کمیٹی اپنے پاس سے دے کر اس کی قیمت باقساط قلیل والدین سے وصول کرتی رہتی ہے۔

بیکار بچوں کی خبر گیر کمیٹی بجائے خود ایک بہت بڑا وسیع نظام ہے جس کے تین مینتیس مرکزی دفتر ہیں۔

(۳) خبر گیر کمیٹی کا یہ بھی قانونی فرض ہے کہ بے کس و بے چارہ بچوں کی غور و پرداخت کرے۔ اول اصلاح حال میں کوشش کی جاتی ہے۔ والدین کو ذرائع تحفظ سمجھاتے ہیں۔ اور جب غفلت ثابت ہوتی ہے تو اسی خاص قانون کے ماتحت مقدمہ سپرد عدالت ہو جاتا ہے۔ وہ خاص قانون تشدد اطفال ہے۔ جس نے والدین کو بھی طاق میں بٹھا دیا ہے۔ یہ بچہ کے حقوق محفوظ کرنے میں انھیں بھی مجرم اور مستوجب سزا قرار دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں تشدد حیوانات کی زندہ مثالیں دن رات دیکھتے ہیں مگر کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ تعلیم یافتہ جنٹلمین لنگڑے گھوڑے کی گاڑی میں بے تکلف لد جاتے ہیں اپنا اسباب آرائش زخمی بیل کے ٹھیلے میں لاد دیتے ہیں ایک بے زبان کی معذوری کی کچھ بھی پروا نہیں ہوتی مگر اہل مغرب کو دیکھئے کہ تشدد اطفال کو جس کی آواز گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتی اندر گھس کر پکڑتے ہیں اور سزا دیتے ہیں۔ ہماری اور ان کی ضمیر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

(۴) خبر گیر کمیٹی کا یہ بھی فرض ہے کہ اختتام تعلیم ابتدائی کے بعد ۱۴ برس کی عمر اگر والدین قاصر ہوں تو بچہ کے لئے روزگار کی فکر کرے۔ چنانچہ انگلستان کی مشہور لیبر اکسچینج یا انجمن العمال و صناع کے نظام میں ایک جدید شاخ کا اضافہ کیا گیا ہے

جس کے بے شمار شعبے تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی مدد سے بچہ کو اس کے فطری اور اکتسابی قابلیت کے لحاظ سے کسی موزوں کام پر لگا دیتے ہیں۔ غرض کہ یہ خبرگیر کمیٹی بچوں کو بھوت کی طرح لپٹ جاتی ہے۔ وہ بیکار رہو جائیں تب بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اور پختہ دماغ ہونے تک ہر طرح اُن کے اخلاق و عادات کی اصلاح کرتی رہتی ہے۔ جس لڑکے کو جب چاہتی ہے پکڑ بلاتی ہے اور اس سے باز پرس کرتی ہے اور اُسے بدراہ اور بیکار رہونے کا موقع نہیں دیتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز والدین اہل ہند کی طرح بچے پیدا کرنے کے بعد یہ نہیں سمجھ لیتے کہ ہم نے اپنا حق ادا کر دیا۔ بلکہ اولاد کے اُدھیڑ ہونے تک اجتماعی طور پر اُن کے حقوق کمال دانشمندی سے ادا کرتے رہتے ہیں۔

مرکزی مدارس

ابتدائی تعلیم معمولاً ۱۴ برس کی عمر تک ختم ہو جاتی ہے لیکن ۱۱ سے ۱۵ برس تک کے لیئے اب ایک خاص نظام تعلیم بھی قایم کیا گیا ہے یعنی مرکزی مدارس جن میں خاص تجارت و کاروبار کی تعلیم کے لیئے ایک جداگانہ نصاب عمل پذیر ہے۔ ان میں مقابلہ کے امتحان سے چنیدہ طلبار لے کر اور اُنھیں اسکولر شپ یا وظائف دے کر خاص اس فن کے لیئے تیار کرتے ہیں۔ اسکولرشپ کا نظام بھی ہمارے یہاں کے وظائف سے بالکل مختلف ہے۔ شخص واحد کی خوشنودی یا سفارش کی بجائے کھلے امتحان مقابلہ میں محض لیاقت سے اسکولرشپ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسوقت کل پچاس ساٹھ کے درمیان مرکزی اسکول ہیں۔ بعض میں صنعت و دستکاری کے اور بعض میں صرف تجارت اندرون بیرون ملک کی۔ اور بعض میں دونوں مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔

کھلے میدان کے مدارس

یہ ایک جدید نظام ہے جس کے ابھی صرف دو نمونے مختلف مقامات میں بطور آزمائش قایم ہوئے ہیں۔ ہر ایک نمونہ

طلبہ کے لیئے خصوصاً تو وہ بچے جن کی صحت بڑے طبی معائنہ مرکزی اعتدال سے گری ہوئی ثابت ہوئی۔ مگر چونکہ وقتاً فوقتاً طبی معائنہ سے ثابت ہوتا ہے کہ طلبہ اس نظام کے تحت میں تعلیم پانے سے تنومند ہو جاتے ہیں اور پھیپھڑے کے امراض کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اب تجویز ہے کہ آٹھ مدرسے اور کھولے جائینگے یہ ایک خاص نظام ہے۔ عام مدارس میں بھی ایسے بچوں کے لیئے یہ انتظام کر دیا گیا ہے کہ انھیں کھیل کے میدانوں میں تعلیم دیجائے۔ چنانچہ ابتک تقریباً سو جماعتیں کامیابی سے میدانوں میں تعلیم پا چکی ہیں۔ نادار باشندوں کی گنجان آبادی میں بعض کھیل کے میدان ایسے مقامات میں اس تعلیم کے لیئے منتخب کیئے گئے ہیں جہاں صرف غبار کی نہایت گنجان آبادی تھی اس پر بھی سینہ کے کمزور طلبہ کو نفع ہوا

ناقص الخلقت اور مختل الحواس اس جماعت کی تعلیم کے متعلق ہم مجملاً ذکر کر چکے ہیں اس وقت انگلستان میں سات آٹھ ہزار کے درمیان مختل الحواس اور تین چار ہزار کے درمیان ناقص الخلقت اور معذور و بیکار بچے اڑتیس یومیہ مدرسوں میں اور تین خاص شفاخانوں میں زیر تعلیم و تربیت ہیں مگران کا آدھا وقت دماغ کے بجائے ہاتھ پاؤں کو مصروف رکھنے میں گزارتے ہیں۔ زیادہ عمر کے طلبہ کو باقاعدہ دستکاری کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً لکڑی اور دھات کے کام جوتے بنانا کپڑے سینا وغیرہ سکھاتے ہیں۔ لڑکیوں کو فن خانہ داری اور سوزن کاری سکھاتی ہیں ایسے مدرسہ ۱۲ مردانہ اور ۵ زنانہ ہیں۔ جن بچوں کی زیادہ نازک حالت ہوتی ہے انھیں ایک خاص تربیت خانہ میں جسے ہوم کہتے ہیں بھیجدیا جاتا ہے۔

ناقص الخلقت کے تین مدرسہ تو انہی کے شفاخانوں کے ملحق ہیں۔ اور بیس جداگانہ ہیں۔ علاوہ اس کے مختلف کارخانوں کے مالکوں اور منتظموں کی رضامندی سے اکثر بچوں کو کام سیکھنے کے لیئے اُن کے پاس بھیجا جاتا ہے۔

اندھوں' بہروں کی تعلیم یوں تو ملک میں ایک قانون ہی نافذ ہے جس کی رو سے

تعلیم کی ذمہ دار جماعتیں اندھوں اور بہروں کو سولہ برس کی عمر تک تعلیم دینے پر مجبور ہیں اور اگر ضرورت ہو تو یہ اُن کی متکفل بھی ہوتی ہیں۔ بجز مستطیع کے تعلیم سب کو مفت دیجاتی ہے چنانچہ اس وقت پانچ تا سولہ برس کے عمر کے تقریبًا ساڑھے چار سو اندھے اور سات سو سے زیادہ بہرے بچے ابتدائی مدارس میں زیر تعلیم ہیں۔ مگر اکثر کوئی کونٹی کونسل اپنے سے غیر مدارس میں بھی بھیجتی رہتی ہے۔ چنانچہ بہبودی یا رومن کیتھلک طلبہ کونسل کے مدارس میں اندھوں اور بہروں کے لئے چھ چھ یومیہ مدارس ہیں۔ دو اندھوں کے اور تین بہروں کے شبانہ روز کے مدرسے ہیں۔ سکونت وغیرہ بھی انہی میں ہے۔ ان میں تقریبًا پونے چار سو اندھوں کی اور سات سو بہروں کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ مخلوط مدارس میں بھی پانچ تا تیرہ برس کے اندھے یا بہرے تعلیم پاتے ہیں۔

ایک جماعت میں پندرہ سے زیادہ اندھے اور دس سے زیادہ بہرے نہیں ہوتے ان کے پڑھنے کے حروف خاص ہوتے ہیں۔ مگر اب بجائے ابھرے ہوئے حروف کے محض نقطوں کے علامات سکھاتے ہیں۔ ان میں بھی ناقص الخلقت یا مختل الحواس ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ تقریبًا چھ سو بچے ایسے ہیں جن کو کم سجھائی دیتا ہے اور ڈیڑھ سو اونچا سُنتے ہیں اُن کے لیئے بالترتیب پندرہ اور تیرہ مدرسے ہیں۔ اور اکثر معمولی مدارس میں صحیح بچوں کے ساتھ تعلیم پاتے ہیں۔

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپیگا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف (ستے) مقرر ہے جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجنا چاہیئے اور منی آڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کر دی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لئے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کیساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے ورنہ درخواست خریداری پر اول پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شایع ہو سکتے ہیں اُجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ ہونا چاہیئے

خاکسار

محمد حبیب الرحمان خان شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

سلسلہ جدید جلد ۲
نمبر ۲

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۲۲۸

فروری سنہ ۱۹۲۴ء
رجب سنہ ۱۳۴۲ھ

کانفرنس گزٹ

یعنے

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہوار تعلیمی رسالہ

مرتبۂ حامد علی صدیقی

جس میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک اصولِ تعلیم نظام تعلیم مروجۂ ملک اور دیگر اہم تعلیمی امور پر تنقید کی جاتی ہے

زیر نگرانی

عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری کانفرنس

باہتمام محمد عبدالسلام

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۳۴۲ھ

[illegible]

فہرست مضامین

نمبر شمار		نمبر صفحہ
ا شذرات	ایڈیٹوریل	۱-۸
۱- ہمارا مطمح نظر	"	۲-۴
۲- حساب نصاب کے مواخذ	"	۳-۴
۳- ذہنی پیائش کے آلات	"	۴-۵
۴- جسمانی تعلیم	"	۶
۵- ذہنی تعلیم	"	۶-۷
۶- اخلاقیات	"	۷-۸
۷- کام کی تنظیم	"	۸
ب- ۱- تعلیم کی تاریخ	سید اشفاق احمد صاحب بی اے متعلم ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی	۹-۱۶
۲- فن مصوری و نقاشی	مسٹر واسدیو شرما پروفیسر ٹریننگ کالج لاہور	۱۷-۲۹
۳- یونیورسٹی سے کیا حاصل	حامد علی صدیقی	۳۰-۳۲
۴- کانفرنس کی مختصر روداد	آنریری جنرل سکرٹری	۴۳-۴۵
۵- کانفرنس کے اخبار و حوادث	مولوی اکرام اللہ خانصاحب ندوی	۴۶-۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس

شذرات

ہمارا مطمح نظر فن تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے؟ یہ پہلا سوال ہے جو ہر ایک ذی شعور کے دل میں پیدا ہونا چاہیے۔ کیا محض یہ ہے کہ سند فضیلت لے کر ہم آغوش مادر سے نکلے ہوئے بچوں کو مانٹیسوری سسٹم یا کنڈرگارٹن طریقہ سے انگریزی یا مادری زبان کے حروف سے آشنا کر کے انہیں اگلی جماعتوں کے لیے تیار کر دیں، یا ثانوی اور اعلیٰ مدارس میں درجہ وار امتحانوں میں کامیاب ہونے کے قابل بنا دیں؟ ممکن ہے کہ یہ اور اور بہت سے اغراض ہوں۔ مگر مقصد اولین یہ نہیں ہو سکتا۔ فن معلمی کی تعلیم کی صرف ایک ہی غرض ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم جس ملک و ملت سے ہیں اس کے مطمح نظر کو بچہ سے لے کر بڑے تک کے دل میں بٹھا دیں اور جس قدر چھوٹے بڑے راستے اس بلند اور برگزیدہ مقصد تک پہونچنے کے ہو سکتے ہیں اُن سے طلبا کے دلوں کو آشنا کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ راستے بہت سے ہیں پیچیدہ بھی ہیں۔ اُن کے نام بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں وہ اپنی نوعیت میں بھی ایک دوسرے سے متفاوت ہیں۔

اسی طرح ہر ملک و ملت کا مطمح نظر بھی الگ ہی۔ اور ہر ایک کے پیرووں کی تعداد جداگانہ ہی۔ مگر یہ امر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس اختلاف کے باوجود بھی دنیا کے تمام اقوام و ممالک میں ایک غرض مشترک بھی ہی۔ جس کا رُخ انسان کے نظام آسائش کو برقرار رکھنا ہی۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک ملت و قوم کا مطمح نظر دوسری میں فنا ہو جائے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ دنیا سے مٹ گئی۔ غرض مشترکہ صرف اس حد تک تسلیم ہو سکتی ہی کہ گویا ایک شہر ہی کہ جس کے چاروں طرف سے بیشمار سڑکیں آ کر شہر پناہ تک مسافر کو پہونچا دیتی ہیں۔ اور مسافر اپنے اپنے متاع زندگانی کو ایک مشترک بازار میں پیش کر دیتا ہی، جہاں سب آپس میں مبادلہ ہوتا ہی مسافر ایک دوسرے سے مستفید ہوتے ہیں اور دنیا کے مال میں خواہ وہ علمی ہو یا عملی اضافہ کرکے پھر اپنے اپنے راستہ سے لوٹ جاتے ہیں۔

لیکن باوجود اس کے ہر آنے والے کی متاع دوسرے سے الگ ہی وہی اُس کا قومی اور ملی مطمح نظر ہی وہ ہر روز اسی میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا ہی۔ ہم قارئین کرام سے ادب کے ساتھ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا مطمح نظر کیا ہی؟ ہماری کامیاب اور ناکام زندگی کا فیصلہ اسی کے جواب پر منحصر ہی۔ ہم اُس میں پہاڑ سے لے کر رائی کے دانہ تک کچھ نہ کچھ۔ ہر روز۔ ہر ہفتہ۔ ہر ماہ یا ہر سال اضافہ کرنا طلبا کو سکھاتے ہیں یا سکھانا چاہتے ہیں؟ اگر ہمارا کوئی مطمح نظر نہیں تو کیا ہم اور کسی کے مطمح نظر میں اضافہ کرتے اور کراتے ہیں؟ دن بھر کشتی کرا کے۔ اپنے پانی بھرے ڈول کو کس حوض میں اُلٹ رہے ہیں؟

خود ہمارے لبوں پر تو مہر سکوت ہی۔ مگر وائی کونٹ ہال ڈین کا قول ہی کہ ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہ کیجئے کہ آپ ایک غیر ملک کے نمونہ پر چل کر کوئی اطمینان بخش کام کر سکیں گے۔ ہمارے خیالات و عقائد کچھ اور ہیں اور جرمنی کے کچھ اور۔

جدید نصاب کے مواخذ

اُردو لٹریچر کا تعلیمی حصہ ملک ملت کے اہل قلم سے روز بروز زیادہ تقاضا کرتا جاتا ہے۔ کہ نئی کتابیں لکھ کر ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ نصابات کے لیے حسب حال مواد مہیا کریں۔ اس وقت ٹیکسٹ بک کمیٹیوں سے جاری کیے ہوئے نصابات کی یہ حالت ہے کہ کسی درجہ کی مثلاً بچوں کی کوئی اُردو کی کتاب اٹھاکر دیکھیے تو اس میں دو خصوصیات ملیں گی اول بچپن کے تقاضوں کے مطابق چھوٹے چھوٹے مضامین سادا بول چال کی اُردو میں ہوں گے پھر ہر ایک مضمون میں کسی نہ کسی علمی شاخ کے ابتدائی مسائل کو روزمرہ کی باتوں میں بچوں کے سامنے بیان کیا گیا ہے مثلاً فطرت کا مطالعہ۔ حیوانات۔ نباتات جمادات کے سلسلہ میں اسی طرح علم اخلاق و معاشرت وغیرہ وغیرہ کو روزمرہ کی باتوں میں پیش کیا گیا ہے ان کتابوں کی ترتیب و تالیف کا یہ حال ہے کہ آج کل اکثر مضامین نصاب خود مصنف نے اپنے دماغ اور مطالعہ کی مدد سے یکجا کردیے ہیں اور ساتھ ہی دور اول کے اساتذہ کی تصانیف سے بھی انتخاب کیا گیا ہے۔ اکثر شاخہائے علوم کی تصانیف کا اقتباس بھی شامل ہوتا ہے مگر اب سے دس پندرہ برس پہلے اساتذہ ہی کے کلام سے انتخاب کرتے تھے۔ یعنی ایسے ادیب اور مصنف جیسے مغلیہ کے بزم آخر کے شعرا اور سرسید۔ مولانا حالی۔ مولوی نذیر احمد۔ منشی ذکاء اللہ۔ مولانا آزاد۔ علامہ شبلی۔ مولوی سید احمد وغیرہم جو پچاس ساٹھ برس ملک بھر کے صدہا نصابات ہر سال اسی ذخیرہ سے بنتے رہے۔ مگر یہ علمی۔ ادبی حوض کہاں تک آبیاری کرتا آخر مُنتَ گیا۔ اور چند سال سے نصاب بنانے والوں نے یا قند مکرر سے کام لیا اور یا اپنے دماغ کو ترجمہ یا تصنیف کی مدد سے دخل در معقولات کی تکلیف دی۔ ظاہر ہے کہ اساتذہ کے کلام کے اقتباسات پیشہ ور نصاب سازوں کے نتائج فکری سے بہتر ہیں ایک شخص اس قدر ہمہ دان نہیں ہو سکتا کہ اُسے تمام شاخہائے علوم پر عبور ہو

اور وہ ایک ایسا نصاب بنادے جو زمانہ حال کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ بہتر ہی کہ عالم ماہر فن اپنے فن کے ماہر کتابیں لکھیں اور لکھنا کے معنی صاف صاف بات کہنی چاہیئے انگریزی کتابوں کا آزاد ترجمہ کریں کہ اس میں یہ سہولت ہی کہ معنی آفرینی کی مصیبت سے بچیں گے صرف اُردو الفاظ کا لباس پہنانا پڑے گا اور جدید تحقیق کے نتائج سے لٹریچر کا تعلیمی حصہ مالامال ہو جائے گا۔ مگر خدارا لفظی ترجمہ نہ سمجھ لیں یہ بڑی زہریلی چیز ہی بہتر یہ ہی کہ اپنی ملکی خصوصیات کا دامن پکڑ کر چلیں اور ہر موضوع پر گویا ایک مستقل کتاب لکھیں اس طرح ایک جدید ذخیرہ تیار ہو جائے گا۔

پچھلے ذخیرہ سے اب مطلقاً کام نہیں چلتا دور اول کے ساتھ اُنکی معاشرتی اور ذہنی خصوصیتیں بھی رخصت ہو گئیں۔ اب دور دوم ہی جس کے مسلمات پہلے سے بہت کچھ مختلف ہیں ہر چیز ہر بات کی حد و تعریف ہی بدل گئی۔ مثلاً کبھی اطاعت فرمانبرداری کے معنی تھے "سُنو اور مانو" پر بلا شرط کے عمل کرنا مگر اب اطاعت ایک ایسے ضابطہ کی پابندی کا نام ہی جسے ایک اجتماعی اور منتظمی قوت نے وضع کیا ہو بچہ بچہ تعظیم و تکریم کا دعویٰ کرتا ہی۔ تو کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ معاشرت نے نیا چولا بدل لیا ہی۔ پھر لٹریچر کیوں نہ بدلے۔

ملک کی مجالس علمیہ کو اس طرف جلد متوجہ ہونا چاہیے۔ جدید ذخیرہ میں عوام کی روزمرہ کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ضروری ہی تا کہ ہر ایک کتاب نصاب ماخذ بھی بن سکے اور گھر کی کم پڑھی ہوئی عورتوں اور کاروباری مردوں کو بھی فائدہ پہونچائے۔

ذہنی پیمائش

امسال اجلاس کانفرنس میں تعلیمی نمائش کے موقعہ پر۔ عجیب بات یہ تھی کہ اکثر احباب کمرے کمرے پوچھتے پھرتے تھے۔ کہ ذہنی پیمائش کے آلات کس کمرے میں سجائے گئے ہیں۔ ہمارے بھولے

وستوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اُنھیں ذہن کو تولنے ناپنے کی ترازوئیں
یا گز دیکھنے کا شوق تھا مگر ذہن اور خیال سجھائی دینے والی (مرئی) چیز نہیں کہ اُس کی
پیمائش ترازوؤں سے کی جائے۔ سر کا بھیجا۔ بھیجے کے وہ اعصاب جو جال کی طرح
پھیلے ہوئے ہیں صحیح یا غیر صحیح تول ناپ میں آسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ سجھائی دیتے ہیں۔
ور کم و بیش جسامت رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں قدرت کاملہ نے جو قوتیں مخفی کی ہیں
وہ نہ نگہ کی گرفت میں آسکتی ہیں اور نہ اُن کی پیمائش۔ گز یا ترازو سے ہو سکتی ہے
بلکہ اُن کو انداز کرنے کے لیئے ویسی ہی غیر مرئی آلات کی ضرورت ہے۔ یہ سب خدا
کے فضل سے۔ اُس کمرے میں موجود تھے۔ جو براہ راست ہمارے سپردگی میں تھا
ہنی عقل اور علم کے بیشمار خزانے جن کتابوں اور تصویروں کے مرقعوں میں مخفی تھے وہ سب
سی کمرے میں تھے۔ مثلاً بنے۔ ٹرمین سپیرمین۔ برٹ۔ بلارڈ جیسے زبردست محققوں
کے مجلد۔ جن کا مواد فراہم کرنے اور ترتیب دینے میں۔ اُنھوں نے عمریں گزار دیں۔
پھر دور دوم کی محققوں کی تصانیف۔ مثلاً منرو۔ گریگری میکال وغیرہ جنھوں نے
س عجیب عمارت پر دوسری منزل چنی۔ یہاں تک کہ ۹۲۲-۲۳ سنہ کی تازہ تحقیق کے
تائج جن انگریزی رسائل اور صحائف میں شائع ہوئے وہ بھی موجود ہیں اس سے
گے چلئے۔ تو مختلف نقشے۔ جدولیں۔ ڈائیگرام۔ مختلف دماغی قوتوں کا اندازہ
رنے کے لیے۔ لفافوں میں محفوظ تھے۔ مگر کسی کو اس طرف توجہ نہ تھی۔ اصل میں
یں علم کی طلب تو ہے مگر ذوق شوق کی کیفیت ہم پر طاری نہیں۔ یہ نشہ ابھی پورا
ہیں چڑھا۔ کبھی سیاست کی۔ کبھی نسل و ملت کی کبھی معاشرتی جلوہ آرائیوں
ں ہلکی ہلکی ترشیاں زبان کو چھو کر۔ اس نشہ کو کافور کر دیتی ہیں۔ اور ہم پھر
سی پر آشوب جنگل میں کودنے پھاندنے لگتے ہیں۔ مگر اب وقت آگیا کہ ملک کی
نیورسٹیاں اکیڈمیاں علمی سوسائٹیاں اور پروفیسر توجہ کریں اور اس جدید تحقیقات

کے نتائج سے اُردو زبان میں اہل ملک کو آگاہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ عوام کے لیے یہ علم بھی کرامات میں داخل ہو جائے

جسمانی تعلیم بچے خصوصاً شیر خوار کی تندرستی کے متعلق مغرب میں زور کی جد و جہد ہو رہی ہے مقرروں کے حلق سوکھ گئے کثرت تصانیف سے دارالاشاعتوں کو سو ہضمی ہو گئی۔ ماں بچہ کی تحفظ صحت کی تدابیر کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے اتنی انجمنیں ہیں کہ گنوانا مشکل۔ سمندر میں طغیانی آتے آتے آخر آب ضائع کی نوبت پہونچی۔ پانچ سات برس سے جھراؤ کا پانی ہندوستان میں اُتر آیا۔ چنانچہ یہاں ہر سال وقت معینہ پر بڑے بڑے شہروں میں بچوں کی نمائش ہوتی ہے جس میں تصویروں۔ تماشوں اور لکچروں کے ذریعہ سے صحت کو عزیز رکھنا سکھاتے ہیں موٹے تازے بچوں کو انعام دے کر ماؤں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اس تحریک سے اہل مغرب کو جس قدر جسمانی فائدہ پہونچا وہ ایک یورپین کے سراپا سے ظاہر ہے۔ امید ہے کہ اہل ہند بھی مستفید ہوں گے۔

ذہنی تعلیم جسمانی کے ساتھ ساتھ مغرب میں ایک جماعت نے بچوں کی ذہنیات کی جانب بھی توجہ کرنی شروع کی اور علم النفس کے متعلق اس قدر سراغ رسانی اور ریشہ دوانی کی کہ علمائے مغرب کی نگاہ میں مجرم۔ مجرم نہیں رہا بلکہ معذور و مجبور ہو گیا یعنی دغابازی چوری لوٹ مار بد وضعی قتل یہ سب خلل دماغ کے نتائج ہیں علما کی بارگاہ نے قطعی فیصلہ دے دیا کہ جرم کی رغبت اصل میں دماغ کا خلل ہے جس پر مجرموں کو بدنصیبی سے کچھ بھی قدرت نہیں پس یہ گنہگار نہیں بلکہ مختل الحواس ہیں ان کے حواس و ذہن کا علاج کرنا چاہیے نہ کہ سزا دینا۔ اگر کامل سمجھ رکھتے تو مرتکب جرم کیوں ہوتے یہ دلیل بہت معقول ہے۔ جرم اور گناہ کی تعریف یہ ہے کہ ہر وہ قول و فعل جس سے سوسائٹی کی آسائش کا نظام

بگڑ جائے اور عاقل اور سمجھ دار کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے ہر قول و فعل سے معاشرت کے نظام کو مکمل کرے۔ ٹوٹنے نہ دے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجرم اور گنہگار بے سمجھ مختل الحواس ہے اس نے جو کچھ کیا خلل دماغ سے کیا۔ لطف یہ ہے کہ انگلستان کے واضعان آئین و قوانین نے علمائے نفسیات کے فیصلہ کو اس حد تک تسلیم کرلیا ہے کہ پہلے ۱۸۹۹ء کے قانونی میں مختل الحواس کی تعریف گویا تعلیمی ناقابلیت سے کی گئی تھی مگر ۱۹۱۳ء کے اس نئے قانون میں تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ گویا معاشرتی ناقابلیت کا نام خلل دماغ ہے۔ البتہ معدلت گستری پر اتنا احسان کیا کہ اس قانون کے اثر کو بچوں ہی پر محدود رکھا ہے اس میں بھی ایک خاص قسم کی ستم ظریفی ہے یعنی یہ کہ جس بچپن میں سات خون معاف ہوں وہی بڑا ہو کر خود بخود صحیح دماغ ہو جائے گا اور قانونی جواب دہی کا ذمہ دار سمجھا جائے گا شکسپیر نے سچ کہا ہے کہ عقلمندوں میں ایک جز بدعقلی کا اور بدعقلوں میں ایک عنصر عقلمندی کا ضرور ہوتا ہے۔

مگر ایں ہمہ یہ بالکل مسلمہ ہے کہ اہل مغرب نے نفسیات و ذہنیات کے سلسلہ میں بچوں کو بہت ہی فائدہ پہونچایا خصوصاً کنڈر گارٹن اور مانٹسوری طریقوں سے بچپن برباد ہوتے ہوتے بچ گیا۔

اخلاقیات

جسمیات اور ذہنیات کی حدود سے گزر کر جب ہم برادران مغرب کے اخلاقیات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قدر اندھیرا گپ ہے کہ تیز مشعل کی ضرورت پڑتی ہے۔ معاشرت کے ادنیٰ درجہ میں اخلاق کی کمی نہیں اور اسی کے مطابق نمونے بھی بکثرت ملتے ہیں مگر اعلیٰ اور برگزیدہ اخلاق جو روحانیات کا آغاز ہے اس میں اگرچہ کتابیں بکثرت ہیں مگر نمونے مشکل سے خال خال ملیں گے۔ شاید علمائے نفسیات کا فیصلہ اعلیٰ اخلاق کا مانع ہوتا ہے

بہر حال ہم دن رات دیکھتے ہیں اور تجربہ رکھتے ہیں کہ اہل مغرب کے خوگر اور فیض یافتہ ہونے کے بعد ہمارے برادران ملت ہماری ہی نظر میں نہیں جچتے۔ اہل مغرب کی حیات ملی مذہب کے اعلیٰ منازل تک نہیں پہونچتے اس لیے روحانیت کی تعلیم پر بحث کرنا لاحاصل ہے۔

کام کی تنظیم دنیا میں جتنے شاندار کام ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ان میں کام کرنے والوں کے تین حصے ہیں۔ اصل قوت ہاتھ پیروں سے یا دماغ سے کام کرنیوالوں کی ہے۔ انہی میں جب بعض افراد مشق اور ملکہ حاصل کر لیتے ہیں تو کارفرمائی کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ ایک اور گروہ کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ کیے ہوئے کام کو جانچیں۔ اور کارفرما اور کارکن جماعتوں کے سامنے حسن افزا مواد جمع کریں۔ اس آخری فرقے کے فرائض بہت ہی اہم اور نازک ہیں۔ یہ اگر چاہیں تو ایک میٹھے بول اور ایک قدرشناسی کے لفظ سے۔ کارفرما اور کارکن دونوں کی قوت عمل کو دوچند سہ چند کر سکتے ہیں۔ اور یا انہیں بددل پست حوصلہ۔ ضدی اور غصیارا بنا سکتے ہیں۔ کام کے نظام میں دوسری اہم شرط مساوات کی ہے۔ قومی ملی کاموں کے مرکزوں پر جن کا مقصود محض خدمت خلق اللہ ہے۔ اس میں مساوات کا سلوک جو افسری سے نخوت اور ماتحتی کی تحقیر سے خالی ہو۔ ترقی کے لیے مشعل راہ ہے یہاں محض فرائض کا فرق ہے۔ یہاں افسری کے معنی ہیں ہمہ گیری۔ جماعت، کام کی ہر ایک شاخ پر عبور اور ماتحتی کے معنی ہیں اپنے صرف ایک کام میں کامل انہماک ماسوا سے استغنا اور جماعت بندی سے نفرت۔

مقالات

گزشتہ سے پیوستہ

کیا تاریخ یہ شرائط پوری کرتی ہی

جب ہم اِن شرائط کی بجا آوری کے لیے تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو مایوسی کا عالم نظر آتا ہی طلبا کو جو کام گھر پر کرنے کے واسطے دیا جاسکتا ہی وہ دو طرح کا ہوتا ہی یا تو نئے سبق کی تیاری کے واسطے اُن کو بتایا جائے کہ وہ اس بیان کو پڑھ کر آئے یا یہ کہ جو بیان مدرسہ میں پڑھا دیا گیا ہی اس میں سے سوالات دے دئے جائیں کہ اُن کے جوابات لکھ کر اگلی باری پر دکھائیں۔ تاریخ میں یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں پہلی صورت میں یہ مصیبت ہی کہ جب طالب علم گھر پر ایک بار اُس بیان کو جو کل اسکول میں پڑھایا جائے گا۔ پڑھ لیگا تو اس کی دلچسپی قبل از وقت جاتی رہے گی اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ شوق بھی مفقود ہو جائے گا وہ خیال کرنے لگے گا کہ اس میں کونسی نئی بات ہی کہ جماعت میں توجہ کروں دوسری حالت میں یہ وقت ہی کہ اُن سوالوں کے جوابات جو وہ گھر سے لکھ کر لائیں گے اچھے خاصے بلبے ہوں گے اور اُستاد اول تو اُن کے پڑھنے سے گھبرائیگا اگر پڑھنے کی تکلیف گوارا بھی کی تو یہ مصیبت تو ہر روز کی ہی کب تک لاچار یا تو وہ اس کو قطعی خیرباد کہنے پر مجبور ہوگا ورنہ سرسری نظر دوڑانے پر اکتفا کیا کرے گا جس میں ممکن ہی کہ طلبا کی غلطیاں درست کی جاسکیں خصوصاً لمبی جماعتوں میں تو سرسری نظر ڈالنا بھی بارگراں نظر آئے گا۔

علاوہ ازیں سب سے بڑا نقص اس میں یہ ہی کہ اُستاد کو اس میں زیادہ سے زیادہ اور طلبا کو کم سے کم کام کرنا پڑتا ہی۔ طلبا کا کام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہی کہ وہ اُستاد کی تقریر کو بے اعتنائی سے بیٹھے سنتے رہیں۔ بچہ کے واسطے یہ قطعاً ناممکن ہی

کہ وہ گھنٹے پون گھنٹے بالکل خاموش نقش بدیوار ہو کر بیٹھا ہے۔ اُس کی پنہاں قوتیں کسی نہ کسی صورت میں اظہار کے واسطے بے چین ہوں گی اور اگر ہر روز یہی حالت رہی تو یا تو وہ شوخ۔ بیباک۔ گستاخ ہو جائے گا یا اُس کی تمام زکاوت ذہانت۔ تیزی وطراری جاتی رہے گی۔ علاوہ ازیں ایسا مضمون جس میں طلبا نکمے رہیں بہت جلد بارخاطر ہو جاتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ دلچسپ سے دلچسپ لیکچر بھی جو اول اول توجہ کو بالکل اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے آہستہ آہستہ دلچسپی کی حیثیت سے گرتا چلا جاتا ہے اور آخرکار کچھ دیر کے بعد وہ بالکل ناگوار معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس پر طرہ یہ ہے کہ بادی النظر میں زندگی کا کوئی کام اس کے بغیر اٹکتا معلوم نہیں ہوتا ہربرٹ سپنسر اپنی کتاب ایجوکیشن میں لکھتا ہے کہ تاریخ کی وہ تعلیم جو سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اُس سے کوئی فائدہ عملی طور پر مترتب نہیں ہوتا تاریخ ایسے سوانح کا نام ہے کہ جن سے کسی قسم کے سودمند نتائج اخذ نہیں کیے محض تفریح وتفنن کے طور پر اُن کو پڑھ لیا جائے تو خیر ورنہ اس کے علاوہ وہ کسی مرض کی دوا نہیں۔

مندرجہ بالا سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ تاریخ کا نصاب مدارس میں شمولیت کا کوئی حق نہیں رکھتا اگر وہ تعلیم وتربیت کے اصلی مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ نہ ہوتا اب ہم یہ ثابت کریں گے کہ یہ مضمون تعلیم کے مدعا کو بوجہ اتم اس طرح پورا کرتا ہے کہ کسی دوسرے مضمون کو اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کر سکتے۔

تعلیم کی علت غائی جملہ ارباب التعلیم اس پر متفق الرائے ہیں کہ تعلیم کا آخری مقصد انسانی کیریکٹر کی تکمیل ہے۔

کشف غطا اس مقولہ کی روشنی میں کہ "کوئی تعلیم مکمل نہیں کہلائی جاسکتی جب تک کہ وہ ساتھ ساتھ جسمانی دماغی اور اخلاقی تربیت کی متضمن نہ ہو" یہ شکوک پیدا ہوتے ہیں کہ کیا جسمانی تربیت تعلیم کا مقصد نہیں کیا تعلیم روحانی غذا یعنی علم بہم پہونچانے کے

واسطے نہیں دی جاتی۔ اگر ایسا ہی تو کیا تعلیم کا مقصد انسانی کیرکٹر کی تکمیل قرار دینا تعلیم کو ناقص نہ بنا دے گا۔ لیکن یہ اعتراض ایک غلط فہمی پر مبنی ہی اور وہ یہ کہ کیرکٹر کے معنی کو بہت محدود سمجھ لیا گیا ہی۔ عمدہ کیرکٹر اور زبردست کیرکٹر کا آدمی غلطی سے محض ان صفات کا حامل سمجھا جاتا ہی جو وعدہ کا سچا ہو۔ حقوق اللہ و حقوق العباد کا پورا پورا خیال رکھتا ہو۔ تحصیل علم۔ اکتساب ہنر۔ تربیت جسم بھی کیرکٹر میں شامل ہیں۔ حدیث نبوی قصم ظہری رجلین جاہل متنسک عارف متہتک علم اور اخلاق کو لازم و ملزوم قرار دیتی ہی۔ پس ظاہر ہو گیا کہ آدمی کے اعمال اُس کے علم پر منحصر ہیں لیکن آدمی کا علم اس کے رجحان طبعی کے موافق اختلاف پذیر ہوتا ہی بالفاظ دیگر یوں کہو کہ کیرکٹر کی وسعت معنی میں اخلاقی پہلو کے ساتھ ساتھ وہ فطری قابلیت بھی شامل ہی جو خدائے عزوجل ہر فرد بشر کو جداگانہ اُس کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ودیعت کرتا ہی۔ ؏

ہر یکے را بہر کارے ساختند

جسمانی صحت کا اثر اخلاق پر بدیہی ہی زیادہ شرح و بسط کا محتاج نہیں روزانہ تجربات و مشاہدات اس کی صداقت کے شاہد ہیں:۔

موجودہ تمدن۔ تہذیب شائستگی۔ ترقیٔ علم و ہنر کسی فرد واحد یا ایک قوم یا ایک ملک کی کوششوں کا نتیجہ نہیں کہلائی جا سکتی بلکہ ہر فرد بشر (بوڑھا ہو یا جوان۔ دانا ہو یا نادان۔ منطقہ حارہ کی تپتی ہوئی سرزمین کا رہنے والا یا فلسطین کے قرب و جوار کا باشندہ) کی متحدہ کوشش کا نتیجہ ہی تہذیب کی موجودہ عظیم الشان عمارت میں ایک ایک رخنہ باقی رہ جاتا اگر ہر فرد اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی بساط کے موافق اس کو بند کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ نیز ابھی ایسے رخنے باقی ہیں جن کا بھرنا آیندہ نسلوں کی متحدہ کوششوں کا محتاج ہوگا۔

حضرت سبحانہ تعالی کا افراد انسانی سے یہ خطاب "افحسبتم انما خلقناکم عبثاً"

بتا رہا ہے کہ ناچیز سے ناچیز ہستی بھی نوع انسان کی سود و بہبود میں حصہ لے رہی ہے۔

تعلیم کے اصل مقصد کے حصول میں تاریخ کس حد تک مدد دیتی ہے

مندرجۂ بالا بحث سے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ نوع انسان کی سود و بہبود میں حصہ نہ لے سکنا فرد بشر کی سب سے بڑی کمی ہے اور تعلیم کی علت غائی اسی نقص کو رفع کرنا ہے۔ نیز یہ کہ تمدن حاضرہ ہم کو اسی صورت میں نہیں ملا اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے موجودہ صورت کس طرح اختیار کی یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس تہذیب کو انسان اُس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ اسکی اصل کو نہ سمجھے۔ اُن مدارج کو معلوم نہ کرے جو موجودہ حالت تک پہونچنے سے پہلے طے کرنے پڑے ہیں۔ ابتدائی حالت کے نقائص موجودہ حالت سے ہی مقابلہ کر کے معلوم کیے جا سکتے ہیں نیز یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح رفع ہوئے کس نے رفع کیے۔ اپنی موجودہ تہذیب کا حسن و قبح معاصر قوموں کی تہذیب کے مقابلہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں کیا بات اچھی ہے وہ اُنھوں نے کس طرح حاصل کی اور ہم میں وہ بات کس طرح پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ تمام صرف مطالعہ تعلیم ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں بغیر اس کے انسان کی سیاسی اور علمی نظر خیرہ رہتی ہے۔ صرف تاریخ ہی بتا سکتی ہے کہ قومیں کس طرح بنتی ہیں کیسے بگڑتی ہیں۔ باہمی حفاظت اور تعاون عمل کا سلسلہ کس طرح ترقی پذیر ہوتا ہے۔ اس میں کیا نقائص ہوتے ہیں کس طرح رفع کیے جا سکتے ہیں۔

تاریخ حالات گزشتہ کو واقعاتِ حاضرہ کی سلک تعلق میں منسلک کر کے صراحتاً بتاتی ہے کہ کس طرح خیالات و حالاتِ ماضیہ و اقعات آئندہ کا حتی المقدور صحیح اندازہ لگانے اور حالات حاضرہ کے سمجھانے میں مدد دیتے ہیں۔ مختلف اقوام اور متعدد افراد قومی کے تجربات بلوغت کو پہونچنے والے نوجوان طالب علم کی عقل و فہم میں پختگی پیدا

کرتے ہیں اور قوت فیصلہ کی تربیت کرتے ہیں۔

تاریخ کا اثر اخلاق پر

اب ہم تاریخ کا اثر کیرکٹر کے دوسرے پہلو یعنی اخلاق پر دکھاتے ہیں علامہ شبلی اپنی بے مثل تصنیف سیرۃ النبی کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کے عام ذرائع وعظ و پند ہیں اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ علم الاخلاق میں اعلیٰ تصانیف لکھی جائیں۔ ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو اُن کی تعلیم دلائی جائے لیکن سب سے زیادہ صحیح سب سے زیادہ کامل اور سب سے زیادہ مؤثر اور عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری نقوش پیش کیے جائیں بلکہ فضائل و اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے جس کا ہر ہر اشارہ اوامر سلطانی بن جائے دنیا میں اخلاق کا جو سرمایہ ہے وہ انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے لیکن عالم فانی کی کوئی شے ابدی نہیں اس لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان کا ہر ہر لفظ اُس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا اُس کے حلیہ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لیا جائے کہ مراحل زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کرے"

یعنی اُن مقدس ہستیوں کی لائف کا ہر پہلو سوانح عمری میں اگر نمایاں طور پر دکھایا جائے تو ہر حالت میں ہر وقت اور ہر جگہ ایک رہبر کامل ہمارے پاس موجود رہتا ہے۔ آگے چل کر مولانا تحریر کرتے ہیں کہ

"علوم و فنون کی صف میں سیرت (Biography) کا ایک خاص درجہ ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے واسطے دلیل راہ ہیں چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیا کیا عجیب خواہش رکھتا ہے کیا کیا منصوبے

باندھتا ہے اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے غرض سعی عمل - جد وجہد - ہمت وغیرت کی جو عجیب غریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں بعینہ وہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے"

آنریبل سر سید مرحوم نے المامون کے دیباچہ کو اس مقولہ سے شروع کیا ہے

"قوم نہایت ہی بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے اُن کارناموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہوں بھلادے یا اُنھیں نہ جانے بزرگوں کے قابل یادگار کارناموں کو یاد رکھنا اچھا اور بُرا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے اگر خود کچھ نہ ہوں اور نہ کچھ کریں اور صرف بزرگوں کے کاموں پر شیخی کیا کریں تو سمجھو اِن جد فروشی کے سوا اور کچھ نہیں اور اگر اپنے میں ویسا بننے کا چسکا ہو تو وہ پھر امرت ہے"

مولنٰا حالی حیات سعدی میں رقمطراز ہیں :-

"سیرت اُن بزرگوں کی لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائیں خصوصاً وہ قومیں جو عملی ترقیات کے بعد تنزل اور پستی کے درجہ کو پہونچ جاتی ہیں اُن کے لیے ایک تازیانہ ہے جو انہیں خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے جب وہ اپنے اکابر واسلاف کی زندگی کے حالات اور کمالات دریافت کرتے ہیں تو اُن کی غیرت کی رگ جوش میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت پیدا کرنے کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے دنیا میں اکثر لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر پہنچایا تھا"

سمائلس کا قول ہے کہ

"مشاہیر کی سوانح عمریاں نوع انسان کی ترقی کا مشہور مفید ذریعہ ہیں - جس طرح کہ

پہاڑ پر روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہی اُسی طرح اُن کی روحانی روشنی آیندہ نسلوں کے واسطے اپنی چمک جاری رکھتی ہی"

تاریخ رائے کو صائب بناتی ہی

ارسطاطالیس کا قول ہی کہ اصابت رائے کے حصول میں تاریخ ایک غیر معمولی معاونت کرتی ہی اس کے مطالعہ سے مشکلات میں دل کو صبر اور اطمینان ملتا ہے اُمم سابقہ کے حالات اور اُن کے افراد کی سرگزشتوں میں طالب علم اپنی آپ کو ایک عرصہ کے واسطے بھول جاتا ہی جب وہ یہ معلوم کرتا ہی کہ بڑی سے بڑی مصیبت بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہوتی۔ اور متعدد مثالیں وہ اپنے مطابق پاتا ہی تو اس کو مایوسی ہجوم اُمید میں گم ہو جاتی ہی وہ اُس مژدہ جاں بخش کو (ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین الذین اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون) یاد کرکے کرب کو طرب کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں

تاریخ صداقت سکھاتی ہی

مورخ محنت و مشقت سے فسانہ و روایات کے طومار اُلٹ کر قصص و دفتر کنگھال کر سچے واقعات کی تلاش کرتا ہی۔ ملی تعصبات کو ایک ایک کرکے شہادت معتبر کی بنا پر معاملہ کو ہر پہلو سے جانچ کر غیر جانبدارانہ فیصلہ دیتا ہی۔

سکیلٹین کا قول ہی کہ انسان کی مختصر زندگی کی اصلاح صرف تاریخ سے ممکن ہی۔

وسعت علم اور تاریخ

اس احسن الخالقین کی مخلوق اس قدر وسیع ہی کہ اس کا احاطہ محال ہی اس پر تنوع کا یہ عالم ہی کہ۔ ہر اقلیم کے اصول و قوانین۔ پیداوار۔ اوضاع و اطوار بالکل جدا جدا ہیں۔ کل حالات کے استدراک کا ذریعہ صرف تاریخ ہی ہو سکتی ہی۔

انکشافات عالم کا مدار محسوسات پر ہی لیکن تمام دنیا کا مشاہدہ چل پھر کر نا تو محال

ہو لامحالہ مسموعات پر جو علم تاریخ کا ماخذ ہیں بھروسہ کرنا پڑتا ہو اور اسی علم کی
تحصیل سے ہفت اقلیم کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

تاریخ علم کی زیادتی کا واسطہ ہو اور درستیٔ رائے و تدبیر کا وسیلہ اس سے
عقلائے عالم کے ساتھ مشورت نصیب ہوتی ہو۔ یہ غرائبِ انقلاب کا مخبر ہو جن کے
علم سے ہم مالک الملک کی قدرت قاہرہ کو پہچان جاتے ہیں۔

حب الوطنی اور تاریخ یہ کہا جاتا ہو کہ تاریخ حب الوطنی کا سبق دیتی ہو اس میں
شک نہیں کیا جا سکتا کہ ان جذبات کو یہ پاک اور بے لوث
بنا دیتی ہے۔

پیکن لکھتا ہو کہ تاریخ کا مطالعہ آدمی کو عاقل بناتا ہو اس سے اس کا دل اپنے
ملک کی محبت سے لبریز ہوتا ہو اُس کے ساتھ ساتھ اُس کی یہ تمنا ہوتی ہو کہ وہ اس کے
معتبر و مستند حالات معلوم کرے کہ میرے ملک کی اصل عظمت کن وجوہ سے ہو اور
اسباب کو کس طرح قائم و دائم بنایا جا سکتا ہو۔

قوت متخیلہ اور تاریخ شاید ہی کوئی اور مضمون طالب علم کی قوت متخیلہ کو وسعت
دینے پر اس قدر قادر ہو جتنا کہ تاریخ۔ گزشتہ واقعات
جن کو مدت مدید ہوئی اتنے عرصہ تک پیش نظر رکھنا کہ اُن سے نتائج اخذ کیے جا سکیں
قوت متخیلہ کی حیرت انگیز وسعت ہو۔ (باقی آیندہ)

۲۸ر دسمبر ۱۹۲۳ء بروز جمعہ ۳۰-۸ صبح

جلسہ ششم

مسٹر جی اینڈرسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب ...... خطبہ صدارت تحریری

مسٹر ایچ وائٹ پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور ...... لیکچر تحریری

مسٹر جے ۔ سی ۔ ویل پروفیسر انجینرنگ کالج رُڑکی ...... لیکچر تحریری

مسٹر داسدیو شرما سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور نے فن مصوری پر حسب ذیل لیکچر دیا ۔

فن مصوری و نقاشی

میں اپنے مضمون کو اپنی ہی زبان میں ادا کروں گا تو بھلا معلوم ہوگا ۔ اس فن کے سیکھنے میں ایک خصوصیت نہایت اہم ہے ۔ یعنی سچائی اور صداقت کا ساتھ دینا ۔ ؎

راستی موجب رضائے خدا است　　کس ندیدم کہ گم شد از راہ راست

اس شعر کے مفہوم کو جس قدر مصوری اور نقاشی میں پورا کیا جائے تھوڑا ہے ۔ کچھ اسی پر منحصر نہیں بلکہ معمولی سے معمولی باتوں میں بھی سچائی ہی وہ قوت ہے ۔ جو منزل مقصود تک پہونچانے میں انسان کی مشتعل راہ رہتی ہے ۔ میں تو یہ کہتا ہوں ۔ کہ اگر کوئی شخص دراصل خوبصورت نہیں ۔ تو مصور کا فرض ہے کہ اس کی رنگت و شباہت کو اصلی پیرایہ میں ظاہر کرے نہ کہ اس کے برعکس تصویر میں اس کا رنگ گورا اور چہرہ خوبصورت بنادے ۔ آدمی جب تک جئے سچائی کی تلاش میں رہے ۔ راست گوئی کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے ۔ شعر و سخن میں حقیقت نگاری ہی اونچا مقام ہے ۔ پس میرا لیکچر درحقیقت اول سے آخر تک سچائی کی شان دکھانے پر ہوگا ۔ مصوری و نقاشی کو ایک مثال محض سمجھئے ۔

مغرب میں فن مصوری و نقاشی کو محض سچائی اور حقیقت نمائی سے آج وہ

درجۂ قبول ملا ہی۔ کہ دنیا ان کی شاگردی پر فخر کرتی ہی، مگر اہل مغرب کی اساتذہ کی پشت پر ایک اور زبردست قوت کام کرتی ہی۔ جو ان کی ہنرمندیوں کو اچھال دیتی ہی۔ وہ کیا ہی۔ ملک کے اخبار نویس اور نامہ نگار۔ جو اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور مصوروں و نقاشوں کے کام کے حسن و قبح۔ دکھا کر باعث شہرت ہوتے ہیں۔ تصویر کے ہر خط و خال نوک پلک اور دیگر خصوصیات کو بھی مصور کے خیالات کا پتہ لگا کر دلکش پیرایہ میں پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور زبردست قوت شعرا کی ہی۔ جن کے جادو بھرے کلام سے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی ہی۔ افسوس ہی کہ ہمارے ملک میں ان باتوں کی طرف توجہ نہیں۔ تیسری قوت جو ہر اہل فن کو حوصلہ افزائی کرتی ہی۔ خصوصاً مصور کا دل بڑھاتی ہی۔ وہ عوام الناس کی قدر شناسی و لیاقت ہی۔ در اصل نہ صرف مصور بلکہ شاعر۔ ادیب۔ موسیقی کا ماہر یا اور فنون لطیفہ کے کاملین۔ تدبیر منازل و تعمیر۔ مینت کاری۔ گلکاری۔ لکڑی اور دھات پر کھدائی کا کام۔ شیشہ آلات۔ ہر طرح کے ڈیزائن اور اختراعات۔ خوشنویسی۔ لیتھو۔ بوقلمونی وغیرہ سب اسی فن کے شعبے ہیں جن کے اساتذہ بغیر اس قدر شناسی کے گویا فی الحقیقت مرجاتے ہیں۔ مگر قدر شناسی کچھ توصیف ہی پر منحصر نہیں۔ بلکہ اصل شی توجہ ہی۔ خواہ وہ توجہ نقد و تبصرہ کی صورت میں ہو خواہ کھلے اعتراض یا نکتہ چینی کی شکل میں ہو۔ بہر حال اگر کسی اہل فن کو یہ مقام نصیب ہو گیا۔ کہ پبلک نے اُس کے کام پر ان میں سے کسی طرح پر توجہ کی تو سمجھو کہ وہ جی اُٹھا۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا۔ کہ ایک دفعہ امریکہ میں ایک ایسی تصویر عام پر آئی۔ کہ اُسے دیکھنے کے لیے کئی روز تک خلقت کا تانتا بندھا رہا۔ اور ملک کے اخباروں کا یہ عالم تھا۔ کہ تصویر کے ہر خط و خال پر کالم کے کالم سیاہ کرتے تھے۔ در اصل یہ اخبار نویس ہی ہیں۔ جو کسی اہل فن کے خیالات کو چاہے وہ نظم و نثر کی صورت میں ہوں یا تصویر۔ مجسمی یا پیکر کی شکل میں ہوں۔ ترتیب و تسلسل کے ساتھ پبلک کو دکھاتے

ہیں، کاش ہمارے ملک میں بھی یہ قوت خواب سے بیدار ہو۔ تاہم مجھے اپنے ملک شعرا کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کہ اُنھوں نے ہندوستان کی پبلک پر نسبتاً زیادہ احسان کیا پچھلے تین سال کے جہاں آشوب مانہ میں اپنا سحر آفرین کلام سنا سنا کر گویا دو ر بدل دیا ہی۔ شیخ سنوسی نے اپنے کلام میں جو برجستہ تمثیلیں و استعارے بیان فرماتے ہیں۔ اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہی۔ کہ وہ درحقیقت مصور کامل تھا۔ چنانچہ لکھتا ہی ؎

خوش بود در من صحرا و تماشائے بہار ۔۔۔۔ بامداداں کہ تفاوت نکند لیل و نہار

ہمہ شاخ پر میوہ سر بر زمیں ۔۔۔۔ تواضع کند ہوشمند گزیں

مگر اس طوبی شیراز کا کیا کہنا۔ وہ شاعر نہ تھا بلکہ مصور فطرت تھا۔ اس میں وہ بلند فلسفہ پوشیدہ ہی۔ جس کے جیتے جاگتے انسان کو قدم قدم پر ضرورت ہوتی ہی۔ مگر اسی کے بالمقابل ہمارا حالی بھی کچھ کم پایہ نہیں رکھتا۔ وہ بھی انسان کی انگلی پکڑ کر زندگی کی راہوں پر گویا خود رہنما بن کر چلتا ہی۔ حالی ؎

اس میں کی تاخیر اُس نے جس قدر اچھا کیا ۔۔۔۔ کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے

بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا اچھا کیا ۔۔۔۔ کب کیا۔ کیونکر کیا۔ یہ پوچھتا کوئی نہیں

۲۔ مگر کمپوزیشن۔ یعنی مختلف اشکال کی ترکیب و ترتیب ایک اور بڑا باب ہی۔ مثلاً لڑائی کا نظارہ دکھانا ہی۔ تو اس مرقعہ میں جس قدر اجزائے ترکیبی ہیں۔ پھر ہر چند کے اجزا الگ الگ ہیں۔ اُن سب کو اس طرح ترتیب دینا کہ موزونیت کا دامن نہ چھوٹے اصل چیزوں میں جس طرح باہم تناسب ہی۔ وہی تصویر میں بھی قائم ہی۔ یہ فکر کمپوزیشن ہی۔ خیالی تصاویر بھی اسی سلسلہ میں آتی ہی۔ جن کا اول پنسل سے خاکہ تیار کرتے ہیں۔ یہ اصل چیزوں کی تصویریں نہیں ہوتیں۔ بلکہ محض واقعات۔ حوادث یا کیفیات سے خیالی خاکے ہوتے ہیں۔ اور صرف قوت متخیلہ سے پیدا ہو کر مصور کی مدد سے صفحہ قرطاس پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس کو حقائق کے مقابلہ پر عالم مثال

سمجھئے۔ مثلاً امن ( ) غصہ یا وقتِ شام کی تصویر بنانے کے ایک فرضی دیوی یا غصبناک آدمی اور ایک عورت کی تصویر بنانا۔

۳۔ کلر سکیم یا رنگ آمیزی۔ یہ فنِ مصوری کا ایک ورشان دار باب ہے جب تصویر کو لباس پہناتے ہیں۔ تو لباس کا رنگ منتخب کرنے میں بہت بڑے فکر رسا کی ضرورت ہوتی ہے۔ رنگ کچھ زیبائش ہی منحصر نہیں۔ بلکہ قوم کی معاشرت و تہذیب آب ہوا۔ وقت اگر موقعہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستانی تصویر میں عموماً رنگ زیادہ شوخ ہوتے ہیں۔ کیونکہ گرم ملک ہے۔ دھوپ خوب چمکتی ہے۔ ہر ایک رنگ حد سے زیادہ تیز ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح لباس کی قطع وضع میں قوم کی معاشرت جھلکتی ہے۔ اور مختلف جگہ پر ایک ہی رنگ کے ٹون (یعنی ہلکا و بھاری پن یا پھیکا گہرا پن) کا خیال کرنا نہایت ضروری ہے۔ خاص کر جب تصویر کا کچھ حصہ سایہ میں ہے۔ اور دوسرا حصہ تیز روشنی میں ہے۔ یہ نہایت ضروری باب ہے، آج کل میں کئی شہرہ آفاق اشخاص ہیں جنھوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا ہے۔ پروفیسر فرینک برنگ وائن پروفیسر گیرلڈ مور اور پروفیسر ولیم روتھن سٹائن پرنسپل رائل کالج آف آرٹ لنڈن بہت بڑے ماہر فن ہیں جو مشہور زندہ مصوروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اِن کا کام یورپ اور امریکہ کے میوزیم (عجائب گھر) اور پکچر گیلریوں میں موجود ہے۔ ہرشی ٹاگور نے اپنی مشہور تصنیف گیتانجلی کا تہدیہ انہی کے نام نامی پر کیا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ فن بھی درجہ کمال پر تھا۔ آج کل معرض فراموشی میں پڑا ہوا ہے۔

دراصل ڈرائنگ ہر فن و ہنر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے پنسل کا خاکہ تیار کرنا ضروری ہے بعد میں خواہ کپڑے پر لکڑی۔ لوہے۔ مٹی شیشہ وغیرہ کسی پر کام کریں۔ یہ سب فنون کی روح رواں ہے اس کے بعد قابل لیکچرار نے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں دکھائیں۔ جو مختلف اقسام کی پنسل۔ چارکول کریان

واٹر کلر یا پسٹل کلر اور آئل کلر کی بنی ہوئی تھیں۔ جن میں سے پارک کا نظارہ۔ یاترا کا منظر۔ زندگی کی شام۔ درجن اینڈ چائلد (مریم و حضرت عیسیٰ) وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں آخیر میں ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم کی بڑی قد آدم روغنی تصویر (آئیل پینٹنگ) دکھائی۔ تو ناظرین نے تالیوں سے پرتپاک خیر مقدم کیا اور تصویر کی عمدگی اور خوبصورتی کی ایسی داد دی کہ تمام ہال گونج اٹھا۔

اختتام تقریر پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مقرر سے پوچھا کہ مغرب اور مشرق کے آرٹ میں کیا فرق ہے۔ اور اس فن (ڈرائینگ و پینٹنگ) کو مدرسوں میں رواج دینے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ مقرر نے جواب دیا۔ کہ یہ بہت پیچیدہ اور وسیع سوال ہے۔ اس امر کے جواب کے لیے مغربی مصنفوں کے علاوہ مسٹر ہاول اور مسٹر کمار سوامی جی کی تصانیف کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ فن مصوری پر مغرب و مشرق کی تہذیب۔ اسم و رواج۔ آب و ہوا۔ پوشاک۔ پیداوار۔ علم ادب۔ نظم و نثر۔ روایات۔ مذہب کا جداگانہ اثر ہوا ہے۔ اگر آپ ان سے واقف ہیں۔ تو فوراً آپ مغرب و مشرق کے آرٹ میں فرق معلوم کر سکتے ہیں۔ البتہ مشرق میں رمنی۔ اسے چر ( ) اور باریکی و اجزا کی طرف زیادہ رجحان رہا ہے۔ مگر برعکس مغرب میں آئل پینٹنگ در بہت مجموعی بڑی بڑی باتوں پر زور دیا ہے۔ مشرق میں عموماً تصاویر پردہ ایل (صرف یک رخی جس میں صرف ایک آنکھ اور ایک کان نظر آئے) کی طرز پر ہیں۔ مگر مغرب میں فرنٹ ویو (جس میں ہر دو آنکھیں یا ایک آنکھ بڑی اور دوسری ذرا فاصلے پر چھوٹی نظر آئے) تصاویر میں دکھلایا ہے)۔ مشرق میں رنگ کی سکیم شوخ مگر مغرب میں مدھم اور دلکش ہے۔ مشرق میں موزونیت (سمٹری) مثلاً روضہ تاج محل آگرہ کے ایک طرف سرخ مسجد ہے۔ تو اس کے جواب کے لیے ویسی ہی عمارت سمیٹریکل بنانے کے لیے موجود ہے۔ علاوہ اس کے مشرق

میں علم نظارہ (پرسپکٹو) کی کمی ہے۔ یعنی موازنہ کا خیال ہمیشہ مدنظر رکھا گیا ہے۔ مگر جنوب میں یہ ضروری نہیں۔ موجودہ زمانے میں مغرب میں فن مصوری کو کمال پر پہنچانے کیلئے برہنہ عورت و مرد کے زندہ ماڈل سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس کو معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس قسم کی باتوں میں خیال کی غایت حد تک شرم و حیا کے جذبہ کو قائم رکھتے ہیں۔ اور مغرب کا اخلاق ا   میں بہت بلند ہے۔ مشرق میں پوشاک اور انوار نے جسم انسانی کو اس قدر ڈھانپ رکھا ہے۔ کہ مصور کو سرفس لے ناٹولی کی ضرورت نہیں۔ اور اسی لیے خیالی تصاویر پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ مدرسوں میں اس فن کو رواج دینا آسان نہیں۔ تاوقتیکہ محکمہ تعلیم کے اعلےٰ افسران اس طرف توجہ نہ کریں اور اس میں خاص طور پر دلچسپی نہ لیں۔ اور عوام اس مضمون کی ضرورت کو خود محسوس نہ کریں۔ اور جو طلباء اس مضمون کی طرف فطرتاً راغب ہوں۔ اُن کی حوصلہ افزائی امداد اور اعلیٰ تعلیم مصوری کا بندوبست کیا جاوے تو مدرسوں میں یہ مضمون ہر دل عزیز ہو سکتا ہے۔

نمائش کا علمی حصّہ

نادرالوجود قلمی کتابیں، فرامین شاہی، قدیم تحریرات وکتبات

گزشتہ دسمبر ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس علی گڈھ میں منعقد ہوا، جس کا سلسلہ چھ روز تک جاری رہا، اس اجلاس کی نمایاں خصوصیت تعلیمی نمائش بھی جو اپنی نوعیت، اور فراہم شدہ اشیاء کی ندرت اور تنوع کے لحاظ سے قابل دید چیز تھی، جدید تعلیمی آلات، نقشہ جات، تصاویر اور قدیم و جدید کتابوں کا کافی ذخیرہ نمائش کے کمروں میں موجود تھا، انگلستان اور جرمنی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصص سے بکثرت چیزیں فراہم کی گئی تھیں، خصوصاً تاریخ، جغرافیہ، علم ہیئت وغیرہ کے متعلق کافی ذخیرہ موجود تھا، زمانہ دستکاری کے خوش نما نمونے بھی جابجا نظر آتے تھے، ہندوستان کے مختلف اسکولوں کے طلبا کا کام بھی قابل تعریف تھا بعض پر انعامات بھی دیئے گئے، غرض یہ تعلیمی نمائش، نہایت مفید دلچسپ اور سبق آموز تھی۔

نمائش کا ایک شعبہ نادرالوجود قلمی کتب، فرامین شاہی اور قدیم کتبات کے لیے مخصوص تھا، اس شعبہ کا سامان فراہم کرنے کے لیئے نہایت تنگ وقت میں کوشش کی گئی تھی، تاہم اس قدر ذخیرہ فراہم ہوگیا کہ جس کے رکھنے کے لیے بمشکل جگہ نکل سکی۔ یہاں تک کہ نمائش کے افتتاح کے بعد بھی قلمی کتابوں وغیرہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔

ہم اس موقع پر صرف اسی ایک شعبہ کے مختصر حالات عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اس شعبہ سے ایک بڑا کام یہ لیا جا سکتا تھا کہ نادرالوجود قلمی کتب، اور فرامین شاہی کے متعلق مفصل نوٹ لکھ دیئے جاتے جن میں ان کتب و فرامین کی خصوصیات اور وجہ ندرت کا خاص طور پر ذکر ہوتا، خاص خاص فرامین کا جن سے اس عہد کے کسی خاص

واقعہ یا تمدن پر روشنی پڑتی ہی، عکس لے لیا جاتا، تاکہ مصنفین و ارباب ذوق تحقیق فائدہ اُٹھاتے، لیکن یہ اُس وقت ممکن تھا جبکہ ہر کتاب و فرمان یا تحریر کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جاتا مگر وقت ناکافی تھا اور پہلا موقع تھا، اس لیے جو کچھ ہو گیا وہ بھی اُمید سے زیادہ تھا۔

قریباً دو سو شاہی فرامین، اور کتبات اور تخمیناً ڈہائی سو قلمی کتابیں نمائش کے کمرہ میں جمع تھیں، فرامین شاہی کا ذخیرہ غالباً اٹاوہ کی برابر کسی اسلامی کتبخانہ میں نہیں ہی، مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر و منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کو فرامین شاہی، قدیم کتبات، اور قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق ہی، اُنھوں نے سالہا سال کی سعی و محنت اور تلاش و جستجو سے سینکڑوں شاہی فرامین اور مختلف قسم کی قدیم دستاویزیں اور تحریریں نیز ایک بڑا ذخیرہ عزیز الوجود قلمی کتابوں کا ہائی اسکول کی لائبریری کے لیے جمع کیا ہی، یہ ذخیرہ اس قابل ہی کہ اہل ذوق اگر اس کے دیکھنے کے لیے سفر کریں تو بالکل بجا ہی۔

اڈیٹر صاحب ممدوح نے اپنے خاص تعلقات کی بنا پر اس قیمتی ذخیرہ کا بہترین حصہ کانفرنس کی تعلیمی نمائش کے لیے علی گڑھ بھیجدیا تھا، اس ذخیرہ میں اکثر چیزیں ایسی نادر و نایاب تھیں کہ جو دیکھتا تھا تعجب کرتا تھا، متعدد فرامین اور مختلف قسم کے کاغذات شہنشاہ اکبر کے عہد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ تک سلسلہ وار موجود تھے، مثلاً فرامین متعلق بہ عطلاے التمغہ و اراضی یا مدد معاش، یا عطائے سند متعلق منصب قضا یا دوسرے کاغذات مثلاً وقف نامہ، اجارہ نامہ، کابین نامہ، معافی نامہ، پروانہ تقرری بیعت نامہ، پروانہ راہداری، تحقیقات یا فیصلہ مقدمات وغیرہ۔

ان چیزوں کے علاوہ مختلف قطعات و کتبات بھی تھے، منجملہ اُن کے ایک انگریز میجر جان جیکب کا خط تھا جو اُس نے اپنے ہاتھ سے نہایت پاکیزہ خط نسخ میں کسی مغلیہ

شاہزادے کے نام لکھا تھا، غرض مختلف قسم کی ۴۲ تحریریں اور فرامین تھے جو اٹاوہ سے آئے تھے۔

کاغذات و فرامین کے علاوہ قلمی کتابیں تھیں، جن کی تعداد ۷۰ تھی، بعض مطبوعہ کتابیں بھی تھیں جو اب بالکل نایاب ہیں، اور مولوی بشیر الدین صاحب نے اِن کو بڑی تلاش کے بعد پرائیویٹ کتاب خانوں سے جمع کیا ہے، زبان کے اعتبار سے زیادہ تر کتابیں فارسی کی تھیں جو ادب اور متعلقات ادب، اور تاریخ، تصوف، اور اخلاق پر مشتمل تھیں، اُردو کی بھی کچھ کتابیں تھیں جو زیادہ تر افسانہ اور نظم سے تعلق رکھتی تھیں، اِن کتابوں سے اردو کے ابتدائی دور کی خصوصیات اور طرز تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔ عربی کی متداول کتابیں بھی نمائش میں موجود تھیں جن کی نمایاں خصوصیت قدامت اور حسن کتابت تھی۔

اٹاوہ کے علاوہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے چند نادر الوجود کتابیں اور دوسری چیزیں آئی تھیں، نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کا ذوق علمی محتاج بیان نہیں، ممدوح کا ذاتی کتب خانہ علمی زر و جواہر سے مالامال ہے، چنانچہ اس گنج گرانمایہ کا ایک حصہ ارباب ذوق کی نظر افروزی کے لیے تعلیمی نمائش میں موجود تھا، کتابوں کے علاوہ مشاہیر اہل قلم کے قطعات اور بعض دوسری چیزیں مثلاً عہد شاہجہانی کا اصطرلاب اور شمس الامرا نواب امیر کبیر کا آلہ ساعت نما بھی تھا جس پر ہر شخص کی نظریں پڑتی تھیں، ایک مرقع تصاویر و کتبات کا تھا جو آپ اپنا نظیر تھا۔

چند کتابیں جناب نواب حبیب گنج پورہ کے یہاں سے آئی تھیں، جن میں ایک مصوّر شاہنامہ اور مثنوی مولانا روم کا خوش خط نسخہ خاص طور پر قابل دید تھا، چند قلمی کتابیں منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار نے اپنے کتاب خانہ سے بھیجی تھیں،

کچھ کتابیں اور ایک کتبہ سید احسن شاہ صاحب تحصیلدار علی گڑھ نے عنایت فرمایا تھا،
آٹھ اعلیٰ درجہ کے کتبات مولوی شرافت اللہ صاحب (علیگڈھ) کے یہاں سے
آئے تھے۔ جو مشاہیر فن کے ہات کے لکھے ہوئے تھے، کچھ کتابیں اور نادر چیزیں
میر وقار حسین صاحب لائے تھے، جن کے دیکھنے کے لیے نمائش گاہ میں ہر وقت
ہجوم رہتا تھا۔ غرض نمائش کا یہ شعبہ بہمہ وجوہ نہایت دلچسپ کامیاب رہا۔

اس شعبہ کی تمام چیزوں پر تبصرہ کرنا مشکل ہے، البتہ بالاجمال ایک مختصرہ
تبصرہ ناموزوں نہ ہوگا جو حسب ذیل ہے،

عربی | ارباب ذوق کی روحانی لذت سرور کے لیے متعدد مطبوعہ اور قلمی قرآن مجید
نمائش گاہ کی عزت کا باعث تھے، جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حیثیت سے ممتاز
تھا۔ مثلاً ایک مطلاو مذہب قرآن مجید جو اٹاوہ سے آیا تھا، حسن کتابت اور سنہری
کام کی لطافت کے لحاظ سے بے نظیر تھا، سیاہی کی آب تاب اور طلائی نقش و
نگار کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ افسوس ہے کہ اس قرآن مجید کے کاتب
اور سنہ کتابت کا حال معلوم نہ ہو سکا، ایک پورا قرآن مجید نہایت خوبی سے
کاغذ کی ایک پٹی پر لکھا ہوا تھا جس کا طول ساڑھے چار گز اور عرض ایک گرہ سے
زیادہ نہ تھا، خط اگرچہ خفی تھا تاہم بخوبی پڑھنے میں آتا تھا، ایک حمائل شریف
کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی تھی کہ وہ شہنشاہ اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی
تلاوت میں رہ چکی ہے، متعدد قرآن مجید خط نسخ کا ابتدائی نمونہ تھے، کاغذ سے
قدامت کا پتہ چلتا تھا لیکن اُن پر سنہ کتابت موجود نہ تھا، جن کے سنہ کتابت
کا پتہ چل سکا اُن میں کوئی نویں صدی ہجری سے پہلے کا نہ تھا، حدیث کے سلسلہ
میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مشکوٰۃ شریف کے قلمی نسخے قابل دید تھے۔

موخرالذکر کتاب پر جو اٹاوہ سے آئی تھی یہ لکھا تھا کہ یہ کتاب شہنشاہ اورنگ زیب

کے زیر مطالعہ رہ چکی ہے' اور بادشاہ ممدوح کے ہات کے حواشی کتاب پر موجود ہیں لیکن سرسری تلاش میں یہ حواشی ہماری نظر سے نہیں گزرے' ایک عمدہ نسخہ شمائل ترمذی کا بھی تھا جو افسر اسباب خاں نے شاہنشاہ اورنگ زیب کو نذر دیا تھا' بخاری شریف کا ایک پرانا نسخہ ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار کے یہاں سے بھی آیا تھا جس پر "ایک مالک کتاب" نے سنہ خرید ۱۰۴۲ھ لکھا تھا کتابت یقیناً اس سے بھی پہلے کی ہوگی'

فارسی فارسی میں تصوف' اخلاق' دواوین' اور مثنویات کا حصہ زیادہ تھا' حبیب گنج کے کتابخانہ میں یہ ذخیرہ نہایت وافر ہے' مولوی بشیر الدین صاحب نے بھی سالہا سال کی تلاش سے بہت کچھ جمع کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو نادر کتابیں نمائش گاہ میں موجود تھیں اُن کا اکثر حصہ انہی دو کتابخانوں سے آیا تھا اجمالاً چند کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) شاہنامہ نوشتہ میر علی مشہدی ۹۹۵ھ

(۲) ہفت پیکر نظامی گنجوی نوشتہ ۱۰۲۰ھ

(۳) خمسہ حضرت امیر خسرو ۱۰۵۲ھ

(۴) قرآن السعدین ۱۰۱۰ھ

(۵) رقعات عالمگیری نوشتہ ۱۱۰۴ھ

(۶) ساقی نامہ ظہوری نوشتہ ۱۰۶۳ھ

(۷) ہفت نظر ہاتفی ۱۲۲۲ھ

(۸) دیوان خواجہ آصفی ۹۴۵ھ

(۹) مثنوی مولانا روم ۱۰۴۰ھ

(۱۰) قصائد حسین ثنائی ۱۱۵۶ھ

(۱۱) قطعات و مخمسات و رباعیات فیضی نوشتہ ۹۹۵ھ

(۱۲) کلیات جامی ۱۰۷۰ھ

(۱۳) دیوان مرزا مظہر جانجاناںؒ ۱۱۸۳ھ

اس دیوان کا خط نہایت عمدہ ہی چند سطریں مصنف کے ہات کی لکھی ہوئی بھی ہیں

(۱۴) مثنوی ناصر علی نوشتہ ۱۱۰۵ھ

(۱۵) کریما نوشتہ میر پنجہ کش ۱۲۶۷ھ مطلا و مذہب قابل دید،

(۱۶) دیوان حافظ نوشتہ ۱۰۹۶ھ (ایک نسخہ ۱۰۳۰ھ کا بھی تھا)

(۱۷) سبحۃ الاحرار نوشتہ ۹۴۶ھ

(۱۸) گوے چوگاں نوشتہ میر علی کاتب در عہد بابر ۹۳۶ھ

حبیب گنج کے کتابخانہ سے آئی تھی۔

(۱۹) نفحات الانس نوشتہ ۹۰۰ھ اس کے علاوہ نفحات کا ایک اور نسخہ ۱۰۲۱ھ کا تھا)

(۲۰) نفحات الانس دستخطی مصنف (ملا جامی) نوشتہ ۸۸۳ھ

یہ گوہر بے بہا حبیب گنج کے کتاب خانہ سے آیا تھا،

(۲۱) سیر اکبر ترجمہ اپنشد داراشکوہ ۱۱۴۱ھ

(۲۲) شمس المعارف صغری شرح اکابر اطراف ۹۷۰ھ

(۲۳) تاریخ قطب شاہی نوشتہ نواب سر سالار جنگ کے کتب خانہ سے آئی تھی

(۲۴) عظمیٰ خاں آرزو

(۲۵) تذکرہ میر یعنی میر تقی میر کی خود نوشت سوانح عمری

جو اب تک طبع نہیں ہوئی، اٹاوہ سے آئی تھی قابل دید چیز ہے۔

اردو اردو کی قلمی کتابوں کے علاوہ متعدد مطبوعہ کتابیں ایسٹ انڈیا کمپنی

کے زمانہ کی تھیں جو اب بالکل نایاب ہیں، قلت گنجایش کی وجہ سے ہم اُن کی تفصیل نظر انداز کرتے ہیں، البتہ صرف دو کتابوں کا تذکرہ کریں گے،

(۱) انتخاب لاخوین، یہ کتاب ایک قانونی کتاب ہے جو سرسید مرحوم اور ان کے برادر اکبر نے سنہ ۱۸۴۰ء میں لکھ کر طبع کرائی۔

(۲) قواعد اُردو یہ غالباً سرسید مرحوم کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو اب تک نہیں چھپی سنہ تالیف سنہ ۱۸۴۱ء ہے، مولوی بشیر الدین صاحب کے ذوق و تلاش کی بدولت ہات آئی ہے۔

اُردو کتابوں کے سلسلہ میں مصنفین کے دست قلم کے چند مسودے بھی تھے، الفاروق اور البرامکہ کے مسودوں کو لوگ بڑے شوق سے دیکھتے تھے، البرامکہ کے اصلی مسودہ پر مولانا شبلی مرحوم کی اصلاحیں اور ہدائتیں جابجا موجود تھیں،

نمائش کے علمی شعبہ کا یہ نہایت مختصر خاکہ ہے جو ہم نے پیش کیا، لیکن یہ سب چیزیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں، الفاظ کے مساعدت سے صحیح کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔

محمد اکرام اللہ خاں ندوی

یونیورسٹی سے کیا حاصل

ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی حد و تعریف یا اُن کے اغراض و مقاصد بیان کرنا مشکل ہی مگر عام طور پر دیکھا جائے تو یونیورسٹیوں کی آخری غرض و غایت ہمیشہ حکومت کا ہاتھ بٹانا ہوتی ہی اس طرح پر کہ وہ ایک طرف علوم و فنون کو ترقی دیں اور دوسری طرف پکے شہری یا سیٹیزن تیار کرکے ملک میں بھیجیں۔ شہری سے مراد شہر یا قصبہ یا گاؤں کا رہنے والا نہیں بلکہ وطن کا سچا فرزند اور قوم و ملک کے فوائد کا حامی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ شہریت مقدم ہی یا علوم و فنون کی ترقی۔ مگر دنیا کی تاریخ بتاتی ہی کہ انسان کے نظام آسائش کو اور سوسائٹی کی خوشحالی کو تعلیم و تعلّم سے اور ترقی علوم و فنون سے زیادہ فائدہ پہونچا ہی۔ ہر قوم اور ملک کو اسی نے بلند کیا ہی۔ پھر بھی ہم یونیورسٹی کی ان دونوں مقصدوں میں کوئی تقابل یا رقابت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ علوم و فنون حاصل کیے بغیر شہریت کے محاسن انسان میں پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اور نہ جب تک انسان میں یہ محاسن نہ ہوں وہ علوم و فنون کی قدر اور پرورش کر سکتا ہی شہریت کی ایک بڑی صفت یہی ہی کہ انسان میں اپنے فرائض کا پورا احساس اور ضابطہ کی پابندی کا پورا شوق اس طرح پیدا ہو جاتا ہی کہ گویا اُس کی خانہ زاد صفت ہی۔

بہرحال اگر کوئی یونیورسٹی طلبہ میں شہریت اور ترقی علم کا شوق پیدا نہیں کرتی تو بلاشبہ وہ حکومت کو بھی کوئی مدد نہیں دیتی۔ ترقی علوم سے یہ مراد ہرگز نہیں اور نہ کہیں دنیا میں لی جاتی ہی کہ فضیلت کے کچھ نشانات معروف اور ایک سند لے کر بیٹھ رہیں اور نہ اس درجہ تک تعلیم دینے سے یونیورسٹی کا منشا پورا ہوتا ہی بلکہ اصلی چیز علمی تحقیق اور جستجو ہی۔ جدید دور اصلاحات کے ساتھ یہ ضرورت بالکل ناگزیر ہو گئی ہی۔ علمی تحقیق یا ریسرچ کرنے والوں کو کتاب کا کیڑا کہنے کا وقت گزر گیا۔ مغرب میں بھی تقریباً

پچیس سال عوام الناس سائنس ہی کے غلام رہے۔ نیچرل سائنس کی شاخوں میں علمی تحقیق کر کے عینک اور دوربینوں کے آئینے۔ اُون اور کپڑے رنگنے کے رنگ فطرت کے دفینوں سے ٹٹول ٹٹول کر نکالتے رہے کبھی پیٹرول کے بدل کی جستجو تھی تو کبھی تو کبھی پتھر کے کوئلہ کی ہیبلہ اشیاء کی تلاش تھی۔ مگر اب ایک بڑے تجربہ کے بعد تسلیم کرنا پڑا کہ انسانی تاریخ کے بعض واقعات و حوادث اور گزرے ہوئے انسان خیالات و تجربات کی ریشہ دوانی بھی ریسرچ کی حد سے باہر نہیں۔ فن تاریخ و سیر اور فن ادب کے محقق بیکار عزلت نشینوں کی جماعت نہیں بلکہ یہ بھی قوم و ملک کیلئے ایک حیات بخش طبقہ ہے۔

ہم ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے اتنی ہی ریسرچ کے لیے اپیل کرتے ہیں غور سے دیکھئے تو ریسرچ یا تحقیق د تفحص کیا ہے وہ بھی تو ایک سچائی کی ایک تلاش ہے جس طرح سائنس میں حقیقت و صداقت کا پتہ لگاتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ سائنس کے محققین اپنے منہ کے سامنے کی چھپی ہوئی صداقتوں کو ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور سیر و تاریخ کے محققین ان چیزوں کے ڈھونڈتے ہیں جو ان کی پیٹھ کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ جستجو کی محنت میں دونوں برابر ہیں۔ اب رہا استفادہ کا سوال۔ تو اس میں بھی دونوں کا پلہ برابر ہے اور دونوں کا مطلوب انسان کے نظام و آسائش کو فائدہ پہونچانے والا ہے۔ گزرے ہوئے انسانوں کے خیالات اور اُن کے تجربے بھی حکومت اور ہیئت اجتماعی کے لیے اتنا ہی مفید ہیں جتنا نیچرل سائنس کے دریافت کیے ہوئے خواص فائدہ مند ہیں۔ تاریخی معلومات سے انسانی حقیقت کا علم بڑھتا ہے اور موجودہ نسلوں کا سلسلہ قدیم نسلوں سے مل کر ایک ہو جاتا ہے جس کی ہر کڑی پر محققانہ نظر ڈالنے سے ارتقا کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔

اگر ہندوستان کی یونیورسٹیاں تہ دل سے اس طرف متوجہ ہوں اور محقق

خانہ پوری نہ کریں نہ اپنی سالانہ روداد کے لیے مواد ہی مہیا کرنے کے خیال میں رہیں کہ ملک و قوم سن کر واہ واہ کرے اور بس۔ اگر یہ اس کام کو کام کی طرح کریں تو مشرق کی تاریخ اور مشرقی لٹریچر ایک اتنا بڑا سمندر ہی کہ سب مل کر اُسے پچاس برس میں نہیں کھنگال سکتے۔ مشرق کی تاریخ کا شیرازہ ایسا بکھرا ہی اُس کا ہر ورق ایسا پریشان ہوا ہی کہ ایک دقیق النظر محقق کو ہولانی کیفیت معلوم ہوتی ہی نہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کا پتہ ہی نہ کسی ایک فرمانروا خاندان یا فرد واحد کے پالیسی کی خصوصیات الگ معلوم ہوتی ہیں معلوم نہیں کہ خاندان امیہ کیوں مٹ گیا اُس کی حکومت کا دستور العمل کا کوئی جزو آج کل کے کسی ایشیائی حکومت کے دستور العمل سے مشابہ ہی کہ نہیں اور کیوں نہیں امویوں کے بعد عباسی کیوں مسند پر آچڑھے الغرض یہ اور ہزاروں تاریخی مسائل ایسے ایسے دلچسپ چھپے پڑے ہیں کہ اُن پر ایک ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہی۔ مگر افسوس اسے کون کرے۔ کیا اس قسم کی بزم علمیہ کو وہ افراد ترتیب دے سکتے ہیں جنھیں شہرت اور ناموری کی ہوس ہی جو اپنے کاموں کے نقارے اور نفیریاں بجوانا چاہتے ہیں جن کی ایک بات اور ہزار داستان ہی جن کے تمام محاسن قوت گویائی میں ختم ہو جاتے ہیں۔ ذرا بنگالہ پر نظر ڈالئے۔ مدراس پر نظر ڈالئے۔ یورپ کی سوسائٹیوں کو دیکھئے۔ شمالی ہندوستان کی ممتاز اکیڈیمیوں پر نظر ڈالئے۔

ناامیدی از وصال تو طاقت گزار بود
صد جا گرہ زدیم امید بریدہ را

صدیقی

کانفرنس کی روئیداد سالانہ

بابۃ ۲۳-۱۹۲۲ء

ترتیب۔ سال گزشتہ کی روئیداد میں کانفرنس کے طویل کارنامہ پر پنجسالہ ادوار میں تقسیم کرکے نظر ڈالی گئی تھی اور ہر دور کے اعداد شمار کے تعلیمی نقشے پیش کرکے قوم کی ترقی و تنزل کی رفتار دکھائی گئی تھی۔ یہ طریقہ اس لیے زیادہ موزوں اور مستحکم ہے کہ کانفرنس کے ہر ایک سال کا کام بہ لحاظ مقدار و حسن دکھانے میں پنجسالہ کے اندر رہنا کافی ہے اور ہر ایک پنجسالہ کے اختتام پر گزشتہ پنجسالہ سے اس کا با آسانی مقابلہ ہوسکتا ہے۔ اس میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ کانفرنس کے لیے ہر دور پنجسالہ کا ایک معقول پروگرام یا نظام عمل بن سکتا ہے۔ جس کی تعمیل میں ایک طرح کی سہولت ہوتی ہے۔

اس ترتیب سے چلا جائے تو ۲۳ء جس کی روئیداد آج آپ کے سامنے ہے کانفرنس کے آٹھویں دور پنجسالہ کا گویا تیسرا سال ہے جو سنین ماسبق سے زیادہ مشغول گزرا۔ یعنی کانفرنس نے تقریباً ہر صیغہ میں کچھ نہ کچھ ترقی کی جس کی تفصیل آپ کو آیندہ صفحات میں اپنے اپنے موقعہ پر ملے گی۔

سرسری نظر۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ کانفرنس کے کام دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ کام جو کانفرنس کو ہر سال جدید تجاویز کی صورت میں سپرد کیا جاتا ہے دوسرے وہ جن کا سلسلہ پہلے سے کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے مطابق معمولاً زیر تعمیل رہتا ہے۔ دونوں قسم کے کاموں میں سال زیر تبصرہ میں کامل سرگرمی اور مصروفیت رہی۔

جدید حصہ کار۔ اُس کی تفصیل یہ ہے کہ سال گزشتہ ۲۳ تجاویز پاس ہوئیں۔ اُن میں سے پہلی بارہ تجاویز تعزیتی یا سیاسی تھیں اور دو اعلانی تھیں۔ چار محض

اطلاعی بھیں اور بارہ میں گورنمنٹ یا ریاستوں سے تحریک کی گئی تھی۔ ان سب کی تعمیل کانفرنس کے دفتر سے شروع سال ہی میں کردی گئی۔ چنانچہ تمام حصص ملک کے ممتاز اخباروں میں جن کی تعداد تیس سے کم نہیں وہ رزولیوشن جو پبلک سے متعلق تھے شائع کیے گئے اور اُن پر بحثیں ہوئیں۔ ایک رزولیوشن مسلم یونیورسٹی میں ٹریننگ کالج قائم کرنے کے متعلق تھا اور نہایت خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی نے امسال ٹریننگ کالج کھول دیا۔ کانفرنس کے کتب خانہ میں پہلے سے تعلیمی کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ تھا امسال اُس میں ڈھائی ہزار روپیہ کی کتابوں کا اضافہ ہوا۔ اس کتبخانہ سے مذکورہ بالا ٹریننگ کالج نفع اُٹھا رہا ہے اس کے علاوہ کانفرنس نے دو ہزار روپیہ اس ٹریننگ کالج کے طلبہ کو قرض حسنہ دینے کے لیے مخصوص کردیئے اس طرح امسال کانفرنس نے ایک نہایت مفید تجویز میں نمایاں عملی حصہ لیا۔

مختلف گورنمنٹوں اور ریاستوں کے متعلق حسب ذیل تجاویز پاس ہوئی تھیں تعلیمی امداد کے طریقہ میں اصلاح۔ مدارس صوبہ متوسط میں تخفیف کا انسداد، حکومت صوبہ جات متحدہ کے صنعتی بورڈ میں ترمیم، صوبہ مدراس کے سالانہ رو داد تعلیم میں اصلاح، ہائی کورٹ پنجاب میں مسلم یونیورسٹی کے کاملین قانونی کا داخلہ سررشتہ تعلیم کشمیر میں مسلمانوں کا حصہ، میونسپلٹی کے اسلامی مدارس اور مکتب کمیٹی کے تعلقات کی بحالی اسلامیہ مکاتب کی جداگانہ حلقہ بندی۔ متعدد صوبوں کے اکابر اور ممتاز اصحاب جو پچھلے سال شریک جلسہ ہوئے تھے۔ امید ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے صوبہ کی حکومتوں کو کانفرنس کی طرف سے توجہ دلانے اور ان ضرورتوں کی جانب رغبت دلانے کی کوشش کی ہوگی۔ اس سلسلہ میں اتنا ضرور ہوا کہ صوبہ مدراس کی حکومت نے سالانہ رو داد تعلیم کے چند نقشوں میں ترمیم کردینے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ رو داد گزشتہ اور دیگر مطبوعات صوبہ جو سالہا سال سے کانفرنس

کو بلا قیمت ملتے تھے اب بالکل بند ہو گئے ہیں، جس سے کانفرنس کے کتب خانہ کا ایک اہم حصہ تشنہ رہ گیا۔

سال گزشتہ کی تجاویز میں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور بنیادی تجویز نمبر سترہ تھی جس میں یہ طے ہوا تھا کہ صوبہ وار تعلیمی کمیٹیاں قائم کی جائیں اور پنجاب اور صوبہ متحدہ دونوں صوبوں سے چیدہ چیدہ اصحاب کو نامزد بھی کیا گیا تھا، چنانچہ کانفرنس کی جانب سے اُن اصحاب کو توجہ دلائی گئی مگر نتیجہ کچھ نہیں ہوا، حالانکہ یہ مسلمانوں کے اصلی مرض کے لیئے صحیح نسخہ تھا۔ یہی وہ مطالبہ ہے جس کے لیے ہم حکومت ہند سے جس قدر انتزاع کریں اُسی قدر اچھا ہے۔ یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ بھی بہت ہی اہم ہے۔ تقریباً تمام صوبوں کی حکومتوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی مگر اس زمانہ میں حقوق طلبی آسان چیز نہیں۔ حکومت کسی ملک میں بھی "سنو اور مانو پر" عمل نہیں کرتی۔ بلکہ اُسے بار بار اور ہر بار زیادہ موثر طریقے سے توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صنعتی بورڈ میں مسلمانوں کے حقوق کو محفوظ کرنے کی بے حد ضرورت ہے جیسا کہ پچھلے سال محرک اور موید صاحبان کی تقریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ تجویز کی نقل گورنمنٹ میں بھیجنے کے بعد بعض اکابر قوم سے جنھیں صنعت و تجارت میں مسلمہ مہارت حاصل ہے متعدد بار استمداد کی گئی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

اوقاف کے رزولیوشن میں اگر کہیں سے حوصلہ افزائی ہوئی تو وہ زندہ دل پنجاب ہے۔ چنانچہ اُس صوبہ میں کانفرنس کی مجلس منتظمہ نے ۱۰ ار فروری کو ایک تجویز منظور کر کے قرار دیا کہ ضلع کی کمیٹیاں تعلیمی اوقاف کے متعلق اپنے اپنے علاقہ میں معلومات حاصل کریں اور جناب محسن مرزا صاحب کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اخبارات صوبہ میں اس اہم مسئلہ پر مسلسل بحث کریں۔

اس سلسلہ میں رزولیوشن نمبر ۲ کی اہمیت کا تذکرہ نہ کرنا ایک بڑے فرض کو نظر انداز کرنا ہے۔ اس میں گزشتہ سال قرار دیا گیا تھا کہ کانفرنس کے آیندہ کام کیلئے ایک مکمل نظام عمل مرتب کر کے پیش کیا جائے گا۔ اس کا اب وقت ہے اور اگرچہ کمیٹی کے دس ممبروں میں سے جو اُس وقت اس اہم کام کی انجام دہی کے لیے نامزد کیے گئے تھے بعض حضرات نے مسودہ نظام عمل دفتر کانفرنس میں بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر اب تک کوئی کاغذ موصول نہیں ہوا۔

۲۔ اب میں کانفرنس کے کارنامہ کے دوسرے حصہ کی روداد پیش کرتا ہوں معمولی خدمات۔ اس کے تحت میں دو بڑی مد واقع ہوتی ہیں یعنی تعلیمی اور تبلیغی تعلیمی میں وہ ابتدائی یا ثانوی مدارس یا مکاتب ہیں جو کانفرنس کے مصارف سے یا نگرانی یا اثر میں پہلے سے جاری ہیں یا سال زیر تبصرہ کے دوران میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں ایک جلالی ضلع علی گڑھ کا ہے جو ۱۹۲۲ء میں قائم ہوا تھا اور اُس وقت سے افزوں ترقی کرتا چلا آتا ہے۔ اُس کے معائنہ کے وقت انسپکٹر صاحب سررشتہ تعلیم نے اطمینان ظاہر فرمایا اور کافی سرمایہ جمع ہونے پر الحاق کی پختہ امید دلائی اور اگرچہ شروع میں ایک رقم کثیر جمع ہونے کے متعلق کسی قدر مایوسی تھی مگر عالیجناب نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب خان بہادر کی فیاضانہ سرپرستی سے بہت جلد اُمید ہو گئی کہ کم سے کم آٹھ ہزار روپیہ کا سرمایہ بذریعہ چندہ جمع ہو جائے گا۔ اہل جلالی کے ایڈریس کے جواب میں جناب موصوف نے دو ہزار روپیہ کے چندہ کا اعلان کیا۔ اُس وقت سے امیدیں بڑھ گئیں ہیں اور اب اس مدرسہ کی بنیاد عنقریب پختہ ہونے والی ہے۔ مدرسہ میں اس وقت ستر لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ کانفرنس کی جانب سے خانصاحب میر ولایت حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ کانفرنس ہر مہینہ مدرسہ کا معائنہ کرتے ہیں۔ اسی طرح سکندرہ راؤ کا مدرسہ بھی نواب صاحب

موصوف کی اعانت کا ممنون ہی اور اب اُس کا الحاق بھی سرشتہ تعلیم سے ہو گیا ہی تعداد طلبار نوٹے ہی۔ خانصاحب محمد یوسف علی خاں صاحب پریسیڈنٹ اور آغا نعمت خاں صاحب سکرٹری شب و روز مدرسہ کی اصلاح و ترقی کی فکر میں مصروف رہتے ہیں۔

سیوہارہ ضلع بجنور کا قدرت مسلم اسکول شیخ قدرت اللہ صاحب مرحوم کے تعلیمی وقف سے جاری ہی۔ شیخ رحمت اللہ صاحب جو واقف کے بھتیجے اور خود بھی زمیندار ہیں اس مدرسے کے منیجر اور وقف کے متولی ہیں، سرگرم خدمات رہتے ہیں۔ جائنٹ سکرٹری صاحب نے ایک بتہ اس مدرسہ کا معائنہ کیا ہی۔ مدرسہ اچھی حالت میں ہی۔

سہاور اسلامیہ اسکول۔ مولوی احمد اللہ خاں صاحب رئیس کی نگرانی میں کچھ عرصہ سے جاری ہی جس میں چھوٹے بچوں کی تعلیم کی جانب خاص توجہ کی جاتی ہی اور سکرٹری صاحب موصوف باوجود اپنی ریاست کے کاروبار کے بچوں کی تعلیم کی براہ راست نگرانی کرتے ہیں۔

برین میو اسکول۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا تھا۔ سال گزشتہ کی روداد میں اس کا تذکرہ ہو چکا ہی۔ یہ مدرسہ نوح ضلع گوڑگانوہ میں مسٹر برین ڈپٹی کمشنر ضلع کی توجہ اور امداد سے یکم اپریل ۱۹۲۳ء سے ہائی اسکول کے درجہ پر پہنچکر سرشتہ تعلیمات سے ملحق ہو گیا ہی۔ ضلع کے افسر اور عمائد و اکابر کی نظر جس کام پر پڑتی ہی اُس کی ترقی رکتی نہیں یہ اسی کا ثمرہ ہی کہ ۲۸ مارچ ۱۹۲۳ء کو جناب آنریبل میاں فضل حسین صاحب وزیر تعلیمات پنجاب نے اس مدرسہ کا سنگ بنیاد نصب فرمایا، اس تقریب پر بڑی دہوم دہام کا جلسہ ہوا۔ گورنمنٹ نے دو سو اکتیس روپیہ ماہوار کی اور ڈسٹرکٹ بورڈ نے تین سو روپیہ ماہوار کی امداد منظور کی۔ یہ سلسلہ

اُس وقت سے جاری ہے۔ اُدھر مدرسہ کی عمارت کا سلسلہ نہایت عجلت سے جاری ہے سررشتہ تعلیم نے اکتوبر ۱۹۲۳ء میں دس ہزار روپیہ تعمیر کے واسطے دیا۔ لیکن ہمیں بھولنا نہیں چاہئیے کہ جب تک انسان اپنی آپ مدد نہیں کرتا اور اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کی سعی نہیں کرتا اُس وقت تک کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ امداد اُس وقت شروع ہوئی جب کہ خود قوم میو اُٹھ کر اپنی تعلیمی حالت کی اصلاح میں عملاً مصروف ہو گئی اور مال گزاری پر دس فیصدی کے حساب سے زائد رقم مصارف تعلیم کے لیے دینے کی ہمت کی۔ اب تک تحصیل نوح اور فیروزپور اور ضلع گوڑگانوہ سے جہاں اس جوانمرد قوم کی آبادی بہت زیادہ ہے تقریباً پینتیس ۳۵ ہزار روپیہ وصول ہو چکا ہے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں کانفرنس کا خاص حصہ رہا ہے۔ چنانچہ کانفرنس کے ایک سفیر وہاں رہ کر جملہ ضروری خدمات انجام دیتے ہیں جس کی تفصیل سال گزشتہ کی رپورٹ میں بیان ہو چکی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ نوح کا اسکول جو اب تک ڈسٹرکٹ بورڈ کی عطا کردہ عمارت میں تھا اُس کی جداگانہ تعمیر کی تیاریاں ہو رہی ہیں اُس کا نقشہ مسلم یونیورسٹی کے انجنیر مسٹر عبدالرؤف نے بڑی توجہ اور محنت سے تیار کیا ہے۔ اسکول کے طلبار کی تعداد اس وقت ۲۴۶ ہے اسکول کی کمیٹی منتظمہ کے سکرٹری مولوی مشتاق احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل گوڑگانوہ ہیں جو اپنے وقت کا بڑا حصہ اسکول کی فلاح و بہبود میں صرف کرتے ہیں۔

اسکول کے علاوہ علاقہ میوات میں بیس مکاتب میو قوم کی طرف سے قائم کیے گئے ہیں جن سے اُس قوم میں ابتدائی تعلیم رائج ہو رہی ہے۔ اس کام میں بھی کانفرنس کے سفیر نے حصہ لیا بڑی ناشکری ہوگی اگر اس سلسلہ میں مسٹر اتمارام صاحب بی اے انسپکٹر مدارس کا تذکرہ نہ کیا جائے جنھوں نے برین میو اسکول کو کامیاب

بنانے میں نہایت امداد کی اور کر رہے ہیں۔

فیض عام اسکول رامپور۔ کانفرنس کی فہرست مدارس میں امسال فیض عام رامپور اسکول کا اضافہ ہوا ہے۔ سہارنپور کے مشہور وکیل مولوی ناظر حسن صاحب مرحوم نے اپنی جائداد تعلیمی اغراض کے لئے وقف کر کے ایک مدرسہ جاری کیا تھا اُن کے انتقال پر مرحوم کی زوجہ متولیہ ہوئیں۔ اُنھوں نے مدرسہ کو مرحوم کی ایک ودیعت سمجھ کر ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اُن کا شوق حقیقت میں اکثر مردوں کے شوق تعلیم سے بدرجہا زیادہ ہے۔ متولیہ نے اس مدرسہ کو کانفرنس کی نگرانی میں دے دیا ہے، مگر بوجہ بعد مسافت یہ مصلحت سمجھی گئی کہ مدرسہ کی نگرانی فی الحال قریب کے اسلامیہ تعلیمی مرکز سے وابستہ کر دی جائے یعنی اسلامیہ ہائی اسکول سہارنپور کی انتظامیہ کمیٹی اُس کی نگرانی کرے۔ مولوی نیاز محمد خانصاحب بی اے وکیل و آنریری سکرٹری کمیٹی اُس کے منیجر قرار پائے اور نظم و نسق کے فرائض اُن ہی کے ذمہ ہیں۔ چنانچہ اسٹاف فراہم کرنا مدرسہ کی عام نگرانی وغیرہ کا کام مولوی محمد محمود احمد صاحب کارکن مدرسہ کے ساتھ مل کر جو مرحوم کے عزیز بھی ہیں سکرٹری صاحب کرتے ہیں۔ کانفرنس کے جوائنٹ سکرٹری میری ہدایت پر اُس کے انتظامات کے لیے متعدد بار وہاں گئے اور ایک بار خانصاحب میر ولایت حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ کانفرنس نے اُس کا معائنہ کیا۔

ضلع آگرہ میں مکاتب۔ شروع سال رواں میں ملکانوں میں ارتداد کا طوفان نہایت زور و شور سے اُٹھا جس سے کانفرنس متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور اگرچہ عام مسلمانان ہند کے براہ راست شریک حال ہو کر وہ کوئی کام نہیں کر سکتی تھی مگر اپنے اغراض و مقاصد کے دائرہ کے اندر کانفرنس کو یہ حق تھا کہ رقبہ ارتداد میں جابجا مکاتب قائم اور جہل کو جو ارتداد کا مبدا ہے رفتہ رفتہ دور کرے۔ اس

قسم کی خرابیاں ہمیشہ جہل و تعصب سے پیدا ہوتی ہیں چنانچہ جائنٹ سکرٹری کانفرنس متعدد بار اور سپرنٹنڈنٹ کانفرنس نے ایک بار وہاں جاکر حالات کا اندازہ کیا اور وہاں مکاتب قائم کئے۔ اکثر اصحاب موضع سانڈھن کے نام سے واقف ہوں گے جو اس زمانہ میں مذہبی جلسوں اور مناظروں کا بڑا مرکز بن گیا تھا اس لیے یہاں کانفرنس نے اپنے مصارف سے ایک مدرسہ تعمیر کرکے اُسے تعلیمی مرکز بنایا اور پھر ایک مکتب صالح نگر میں قائم کیا۔ ابھی یہ نظام زیر ترتیب ہی تھا کہ احمدیوں کی جانب سے احمدی مدرسہ قائم ہونے پر اصرار ہوا چنانچہ رفع اختلاف کی بنا پر کانفرنس نے اپنے مدرسہ کو دوسرے مقام پر منتقل کر دیا۔ اس کے علاوہ نگلہ میواتیاں اور بھوجپور ضلع آگرہ میں بھی مکاتب قائم کیئے گئے اور ایک عالم سفیر اُن کی نگرانی کے لیئے متعین ہیں۔ ان تمام مکاتب کا صرف کانفرنس برداشت کرتی ہے۔

ٹریننگ کالج۔ ٹریننگ کالج کا (جو مسلم یونیورسٹی نے امسال قائم کیا ہی) میں کچھ تذکرہ کر چکا ہوں۔ یہ وہ شاندار کام ہی جو کانفرنس کے مقاصد کی جان ہی۔ اگر اسلامیہ ٹریننگ کالج نہ ہو تو اسلامی اساتذہ تیار نہیں ہو سکتے اور اگر یہ نہوں تو بچوں اور لڑکوں میں تعلیمی مذاق کے ساتھ شعائر اسلامی پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہی کہ کانفرنس کی توجہ امسال فیصدی پچھتر درجہ اسی تعلیمی نظام کی تکمیل کی جانب مائل رہی اور بحمد اللہ کہ کانفرنس کی ناچیز کوشش کا آج یہ نتیجہ ہی کہ ٹریننگ کے اساتذہ اور اسٹاف سے قطع کرکے دیکھیں تو اس شعبہ کا تمام بار مصارف گویا کانفرنس ہی اُٹھائے ہوئے ہی یعنی معلموں کی تعلیم و تربیت میں اور اُنھیں بچوں اور لڑکوں کی تعلیم کے لیئے تیار کرنے میں جس قدر کتب اور آلات جدید کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ سب کانفرنس نے اپنے کتب خانہ میں مہیا کیئے ہیں۔ اب تک تعلیم کے

مسائل جدید پر جس قدر مواد تھا وہ ۱۹۱۰ء تک کے نتائج تحقیقات کا خلاصہ تھا۔ کتابوں کی تعداد بھی پانچ اور سات سو کے درمیان تھی۔ ہم ہندوستان کے باشندے تعلیم کی جس منزل پر ہیں اس کے لئے اتنا ذخیرہ بھی کافی تھا لیکن مغرب جو اس قسم کی ترقیات کا گھر ہی اس دوسرے عشرہ میں کہیں سے کہیں پہونچ گیا ہو اس لیے ہمارے صدر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بہادر کے مشورہ سے ۱۹۲۳ء تک کی جدید تصانیف فراہم کی گئیں۔ یہ محض اصول تعلیم ہی پر نہیں بلکہ ضابطہ اور طرز تعلیم دونوں کا ذخیرہ ہی۔ ان کے علاوہ آلات اور ذرائع مظاہرہ بھی فراہم کیے گئے ہیں جو ہندوستان اور مدارس میں کمتر ہوں گے۔ چنانچہ نمائش کے بیشتر کمروں میں انہی کتابی اور آلاتی ذخیروں کا جلوہ نظر آتا ہی میں اس عظیم الشان جلسہ کے بامذاق اہل قلم کو آج دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور کانفرنس کے اس سرمایہ سے اپنے اپنے مذاق کے مطابق انتخاب کریں اور اصلاح و ترمیم کے کثیر التعداد مسائل اپنی زبان میں لکھیں بچوں سے لیکر جوانوں تک کے لیئے موزوں نصابات تیار کریں بلکہ تعلیم کی حد سے تجاوز کرکے اگر تمدن و معاشرت کی اصلاح و ترقی کا خیال ہو تو کانفرنس کے کتب خانہ میں اس کا مواد بھی موجود ہی۔ کتب خانہ کی ترقی ہونیکے بعد سے کانفرنس کے اس صیغہ میں روز بروز رونق ہوتی جاتی ہی۔ ٹرننگ کالج کے طلبہ اور اساتذہ بکثرت اس سے مستفید ہوتے ہیں اور اب وہ خاص کمرے جن میں پہلے قفل پڑا رہتا تھا اب صبح سے شام تک کھلے رہتے ہیں چنانچہ اس سال ہی میں ۲۲۰ کتابیں زیر مطالعہ رہیں یہ بہت مبارک آغاز ہی۔

کانفرنس گزٹ۔ اس سلسلہ میں ایک ضروری کڑی ہی۔ ہمارا گزٹ اردو زبان کا اپنی وضع کا ایک رسالہ ہی جس میں تعلیم جدید کے مسائل پر جو اصولی ہوں یا فروعی علمی مصطلحات کو ساتھ لیئے ہوئے بحث ہوتی ہی۔ جسمانی اور دماغی پیمائش جیسے دقیق

مسئلے بچہ کی اصل و حقیقت اور بچپن کے خواص و عوارض جیسے بلند مضامین. تعلیمی کاموں پر اور سررشتہ تعلیمات کے ملفوظات اور مکتوبات پر تنقید و تبصرہ، مشرق و مغرب کے ماہران فن تعلیم کے اقوال وغیرہ سال بھر درج رسالہ ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کے مضامین قبول عام کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے اور اس لحاظ سے رسالہ کی اشاعت دو سو سے زیادہ نہیں لیکن علمی طبقہ میں کانفرنس گزٹ مقبول ہے۔ چنانچہ سال رواں میں ملک کے اکثر ممتاز اخبارات نے مضامین کی نقل کی۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا خادم التعلیم پرچہ آپ صاحبان کی قدر شناسی اور فیاضانہ امداد سے بے نیاز ہے۔ اگر پانسو خریدار بھی مستقل ہو جائیں تو کانفرنس اس کو مہینہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ شائع کرنے کی آرزو مند ہے۔

وقار حیات — تالیف و اشاعت کے سلسلہ میں علاوہ کانفرنس گزٹ کے کانفرنس نے نواب وقار الملک مرحوم کی سوانحمری کی ہے جو عنقریب پریس میں جانے والی ہے ارباب نظر پر اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ نواب وقار الملک مرحوم اُن بزرگوں میں ہیں جنھوں نے کامل نصف صدی تک نہایت جوش اور ولولہ سے مسلمانوں کی خدمت کی ہے۔ دنیا میں بہت کم ایسے خوش نصیب ہیں جن کو اس قدر طویل مدت تک اپنی قوم کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ لیکن نواب وقار الملک کی صرف یہی ایک خصوصیت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اخلاقی فضائل و محاسن کے اعتبار سے بھی ہماری قوم میں نہایت ممتاز تھے یہاں تک کہ اُن کے دشمن بھی ان کے اوصاف کا اعتراف کرتے تھے۔

سرسید مرحوم اور اُن کے رفقا نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے اس کی تاریخ نہایت دلچسپ اور سبق آموز واقعات سے لبریز ہے لیکن یہ تمام واقعات ابھی تک نظر عام پر نہیں آئے۔ اب تک صرف سرسید کی سوانحمری

لکھی گئی ہے جس سے مسلمانوں کی تعلیمی و سیاسی جد وجہد کے ابتدائی ابواب تو ہمارے سامنے آجاتے ہیں لیکن مابعد کے واقعات پر بدستور پردہ پڑا رہتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ سرسید کے اور رفقاء کے حالات بھی جمع کیے جائیں تاکہ اس کے ذیل میں مسلمانوں کی پنجاہ سالہ قومی جد وجہد کی تاریخ بہمہ وجوہ مکمل ہوجائے اور سلسلہ واقعات کی تمام کڑیاں باہم مل جائیں۔ نواب وقار الملک کی سوانحعمری میں اس ضرورت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

ابھی نواب وقار الملک کے دیکھنے والے بلکہ اُن کے ساتھ کام کرنے والے موجود ہیں اس لیے ممکن ہے کہ بالفعل اس کام کی اہمیت محسوس نہ کی جائے لیکن کچھ زمانہ بعد اس کام کی قدر وقیمت کا اندازہ ہوگا جب سرسید کے سوانحعمری لکھی گئی تو اُس وقت اُن کے بہت سے دیکھنے والے موجود تھے لیکن اب اُن کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور کچھ مدت بعد بجز حیات جاوید کے سرسید کے حالات معلوم کرنے کا اور کوئی جامع ذریعہ باقی نہیں رہے گا بقیہ یہی صورت نواب وقار الملک کی سوانحعمری کی ہے۔

اصلاح تمدن کانفرنس گزٹ میں آخری صفحے اصلاحی مضامین کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ امسال سادگی اور صحت اور کفایت شعاری کی زندگی وغیرہ پر مسلسل مضامین نکلے۔ اکثر اخباروں نے مضامین نقل کیے۔ اس کے علاوہ کانفرنس نے اصلاح و تمدن کے لیے ایک اور سلسلہ شروع کیا تھا یعنی مسلمانوں سے اس بات کا اقرار لے کہ وہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ کم سے کم پس انداز کیا کریں مگر افسوس ہے کہ اس میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی جس کی وجہ ایک عام عدم توجہی ہے اور کچھ یہ بھی ہے کہ اب تک اراکین کانفرنس میں سے ایک خاص جماعت نے جدا ہوکر اسے اپنا مقصد نہیں بنایا اور نہ اس کی باضابطہ اشاعت و تبلیغ کی۔

بہرحال اصلاح و تمدن ایسا خیال نہیں کہ اُسے ترک کر دیا جائے اگر ممکن ہو تو احباب اسے مستقل شعبہ بنانے کی کوشش کریں۔

تعلیمی بیمہ؛ جس نسبت سے اس زمانہ میں تعلیم کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے اسی نسبت سے تعلیمی اخراجات بھی روز افزوں ترقی کر رہے ہیں اُدھر مسلمانوں کی مالی حالت اسی رفتار سے منزل کرتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یک طرف ثانوی بھی مسلمانوں کی دست رس سے باہر ہوئی جاتی ہے اور متوسط الحال لوگ کالجوں اور ہائی اسکولوں میں اپنے بچوں کے اخراجات کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے اس لیے کانفرنس نے جستجو کر کے ایک ایسے سلسلہ کا پتہ چلایا ہے جس سے ہر معمولی آمدنی کا آدمی اپنے بچہ کی تعلیم کی طرف سے بہت تھوڑے عرصہ میں مستغنی ہو سکتا ہے۔ وہ سلسلہ تعلیمی بیمہ ہے۔ اُسکی صورت یہ ہے کہ مثلاً تیس سال کی عمر کا کوئی شخص چاہتا ہے کہ اس کے بچہ کو جسکی عمر ایک سال ہے پندرہ سال کے بعد سولہ روپیہ ماہوار پانچ برس تک ملیں۔ اُس کے لیے اُسے باون ؎۵ روپیہ سال یعنی للعہ ماہوار پندرہ سال تک ادا کرنے پڑیں گے اور اس کا لڑکا پانچ سال میں ایک ہزار روپیہ پانے کا مستحق ہوگا اور بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ والد یا سرپرست اگر ایک سال کی قسط دینے کے بعد فوت ہو جائے تب بھی بچہ کو وہ روپیہ پندرہ سال کے بعد ملے گا اور اگر خدانخواستہ بچہ فوت ہو جائے تو ایک سال کی قسط کی منہائی کے بعد والد یا سرپرست کو یہ روپیہ واپس مل جائے گا۔

بیمہ کی چند کمپنیاں اس قسم کا تعلیمی بیمہ کرتی ہیں چنانچہ امسال کانفرنس نے اپنی معرفت پندرہ بچوں کا بیمہ کرایا ہے۔ پنجاب پراونشل کانفرنس منٹگمری میں بھی بیمہ کا رزولیوشن گزشتہ اپریل میں منظور ہوا ہے اور اسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ امید ہے کہ افراد قوم اس مفید طریقہ سے فائدہ اُٹھا کر اپنے بچوں کی تعلیم کے اخراجات کی طرف سے اطمینان حاصل کریں گے۔

انعامی مضامین۔ کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اس بار پہلے سے زیادہ مضامین کئی ایک عنوان پر موصول ہوئے مگر جیسا کہ پہلے اشارۃً عرض کرچکا ہوں کانفرنس کا رجحان اب زیادہ تر ابتدائی طرز تعلیم و تربیت کی جانب ہی اس لیے مضمون نگاروں کی طبع آزمائی کے لیئے اسی کے مد ذیل میں متعدد موضوعوں کا اعلان کیا گیا تھا چنانچہ ماسٹر نذیر احمد صاحب بی اے گجرانوالہ کا مضمون سب سے بہتر رہا۔ کانفرنس کا اصل مقصود یہی ہی کہ ملک میں سنجیدہ اور مفید مسائل پر بحث کرنے کا رواج ترقی کرے۔

تعلیمی اعداد و شمار گزشتہ سال کی روداد میں ۱۸۵۵ء سے ۱۹۲۰-۲۱ء تک کے اعداد و شمار مناسبہ نقشوں کی صورت میں پیش کیے گئے تھے جن میں مسلمانوں کی رفتار ترقی و تنزل کا شعبہ وار اندازہ غیر اقوام کے مقابلہ پر دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۱-۲۲ء آتا ہی مگر حسن اتفاق سے دفتر میں اب تک صرف صوبجات متحدہ پنجاب معہ صوبہ سرحدی اور صوبہ بمبئی کی تعلیمی اعداد و شمار موصول ہوئے ہیں۔ مدراس اور کلکتہ کی روداد تعلیم حسب دستور سابق موصول نہیں ہوئی۔ اگرچہ ان تینوں صوبوں کے اعداد پر کانفرنس گزٹ میں مفصل تنقید و تبصرہ ہو چکا ہی مگر اس کا خلاصہ جداگانہ روداد میں مکرر پیش کیا جاتا ہی۔

شکریہ احباب۔ روداد ختم کرنے سے پہلے مجھ پر اُن احباب کا شکریہ واجب ہی جنھوں نے از راہ ہمدردی امسال کانفرنس کی اعانت فرمائی۔

سکرٹری

کانفرنس

(اخبار و حوادث)

خدا کا شکر ہی کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کے اجلاس کے بعد صوبجات متحدہ کے مسلمانوں میں ایک گونہ تعلیمی بیداری شروع ہو گئی ہی چنانچہ اس سلسلہ میں یہ خبر نہایت مسرت سے سنی جائیگی کہ بدایوں میں پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس قرار پایا ہی جو مارچ کے آخری عشرہ میں منعقد ہوگا، کارکنان پراونشل کانفرنس کی یہ خواہش ہی کہ صوبہ کے تمام سربرآوردہ اور تعلیم یافتہ اصحاب جلاس میں شریک ہو کر تعلیمی مباحث میں حصہ لیں۔ اور اپنے صوبہ کی تعلیمی جد وجہد میں شریک ہو کر قوم کی سب سے زیادہ ضروری اور اہم خدمت بجا لائیں،

اجلاس کے سلسلہ میں تعلیمی نمائش بھی منعقد ہوگی، جو لوگ اپنے بچوں کی تعلیم سے کچھ بھی دلچسپی رکھتے ہیں، اُن کو اس نمائش کی خاطر ضرور کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہونا چاہیے، جو اصحاب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مجبوری سے شریک نہیں ہوں گے وہ علی گڑھ کی شاندار تعلیمی نمائش نہ دیکھ سکنے پر اب تک متاسف ہیں، اب اس کی تلافی اسی قدر اس طریقہ سے ہو سکتی ہی کہ وہ بدایوں کی تعلیمی نمائش میں شریک ہوں، کیونکہ جو سامان علی گڑھ کی نمائش میں جمع تھا اس کا ایک حصہ بدایوں کی نمائش میں بھی موجود ہوگا۔

یہ امر باعث مسرت ہی کہ قوم کے فیاض محسن اور حامی تعلیم عالیجناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہادر رئیس بھیکم پور نے پراونشل کانفرنس کے اجلاس کی صدارت قبول فرمائی ہی، ہم کو اُمید ہی کہ نواب صاحب ممدوح کی رہنمائی میں کانفرنس کا اجلاس نہایت شاندار کامیاب ہوگا۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کے سفیر،

منشی ایوب حسن صاحب پراونشل کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کیلئے صوبجات متحدہ کا دورہ کر رہے ہیں ان کے علاوہ پراونشل کانفرنس نے بھی اپنے سفیر مقرر کیے ہیں، امید ہی کہ پبلک ان سفیروں کی حوصلہ افزائی کر کے کارکنان پراونشل کانفرنس کو شکر گزاری کا موقع دے گی،

قصبہ مارہرہ، مسلمان شرفا کی ایک قدیم بستی ہی جہاں گزشتہ عہد میں بڑے بڑے ارباب کمال ورصاحبدل بزرگ پیدا ہو چکے ہیں، ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ اس مردم خیز خطہ میں ایسے صاحب کمال موجود تھے کہ وہ جس مقام پر بھی ہوتے وہاں کے لیے باعث افتخار تھے، لیکن افسوس کہ حوادث زمانہ نے ایسا انقلاب پیدا کیا کہ وہ حالت باقی نہیں رہی، تاہم موجودہ زمانہ میں بھی مارہرہ اپنے کسی ہمسر قصبہ سے پیچھے نہیں ہی، اگرچہ مشرقی علوم اور ادب و انشا کا اب وہاں چرچا نہیں ہی لیکن مغربی تعلیم میں وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سرگرم کا اظہار کر رہا ہی، اور آج بھی باوجود قلیل اسلامی آبادی کے اس قدر تعلیم یافتہ مسلمان وہاں موجود ہیں کہ تمام صوبہ میں اس آبادی اور حیثیت کے کسی دوسرے قصبہ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

مارہرہ میں قریباً ۲۵ سال سے مارہرہ اسلامیہ اسکول قائم ہی، جو نہ صرف مقامی طور پر نہایت مفید خدمت انجام دے رہا ہی، بلکہ قرب جوار کی آبادی کو بھی فائدہ پہونچا رہا ہی، اس بنا پر منتظمین مدت سے یہ ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ ایک بورڈنگ ہاؤس قائم کیا جائے تاکہ قرب جوار کے مسلمان بچے جو مارہرہ اسکول کی تعلیم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہاں رہ کر بسہولت اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں،

خدا کا شکر ہی کہ یہ تجویز بار آور ہوئی، اور یہ قرار پایا کہ ۲۴ فروری ۱۹۲۴ء کو ایک شان دار جلسہ منعقد کر کے مجوزہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے، اب تک جو اطلاعیں

ہم کو پہونچی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ نہایت کامیاب و شاندار ہوگا، اسکول کے اولڈ بوائے اور مارہرہ کے دوسرے اصحاب جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں دور دور سے اس جلسہ کی شرکت کے لیے آرہے ہیں علیگڑھ سے بھی متعدد اصحاب تشریف لے جارہے ہیں

عالیجناب آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سی۔ ایس۔ آئی پرو وائس چانسلر کو خاص طور پر مدعو کیا گیا ہے۔

جلسہ کی صدارت عالیجناب نواب سر مزمل اللہ خانصاحب بہادر نے قبول فرمائی ہے۔ چنانچہ ۴ ۲ر فروری کو جناب ممدوح کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا جائے گا، اس کے بعد نواب صاحب مجوزہ عمارت کا سنگ نصب فرمائیں گے، جس کا نام مزمل ہوسٹل ہوگا،

کانفرنس کے پُرانے کارکن مولوی انوار احمد صاحب ایم اے اس جلسہ کے اہتمام و انتظام میں مصروف ہیں ہم کو امید ہے کہ اُن کی سعی بار آور ہوگی اور سنگ بنیاد کی رسم بخیر و خوبی انجام پائے گی،

اودھ اخبار

جس کو ۱۸۵۸ء میں منشی نولکشور آنجہانی نے جاری کیا۔

ہندوستان کا قدیم روزانہ اخبار ہے اس کو سابق حالت سے زیادہ بہتر اور دلچسپ بنا یا گیا ہے پبلک کے حقوق کا حامی اس کا مشیر و مددگار ہے۔ مذہبی تعصب سے پاک، ملک کی تازہ ترین برقی خبریں قانونی کونسلوں کی مفصل روداد یں۔ نیز دیگر دلچسپ معلومات اور مفید مضامین شائع ہوتے ہیں کاغذ کتابت اور چھپائی اودھ اخبار کی ملک کے اردو اخبارات میں بہترین ہے اودھ اخبار میں اشتہار دیکر تاجر کثیر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہندوستان سے باہر بھی یہ اخبار جاتا ہے قیمت روزانہ ایڈیشن سالانہ عسہ قیمت روزانہ ایڈیشن سالانہ معہ

منیجر۔ اودھ اخبار لکھنؤ

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ میں ایک دفعہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شائع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم عموماً تین جزو ہوگا اور ۲۰×۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپیگا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف (سے؍) مقرر ہی جو بنام چیف اکونٹنٹ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجنا چاہیئے اور منی آڈر کوپن میں صاف طور سے اس کی تشریح کردی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیئے ہی اور منی آرڈر ارسال کرنے کیساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صیغہ دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہی ورنہ درخواست خریداری پر اوّل پرچہ دفتر کانفرنس سے قیمت طلب روانہ ہوگا۔

(۴) عمدہ مضامین بشرط پسند نامہ نگاروں کو کافی معاوضہ دیا جائیگا۔

(۵) کانفرنس گزٹ میں ہر قسم کے مہذب اشتہارات شایع ہوسکتے ہیں اجرت کا فیصلہ خط و کتابت سے ہوگا۔

(۶) سوائے ترسیلِ زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب صیغہ دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ ہونا چاہیئے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمان خاں شروانی آنریری سکرٹری

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

سلسلہ روداد سالانہ اجلاس سی و پنجم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

نمبر ۳

مرقعۂ تعلیم

یا

مسلمانوں کی تریسٹھ سالہ رفتار ترقی پر تنقیدی نظر

جس کو

مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری کانفرنس نے

بشکل روداد عمل بابتہ ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء

پینتیسویں ۳۵ اجلاس منعقدہ ماہ دسمبر ۱۹۲۲ء

بمقام علی گڈھ پیش کیا

مطبع نظامی بدایوں میں چھپکر شائع ہوا

نظام الدین حسین مینجر

غلط نامہ

نمبر شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۱۵	حیات نغزلی	حیات منزلی
۲	۳	۱۱	اس (پہلا لفظ)	ان
۳	۶	۱۵	ہے (آخری لفظ)	(قلمزد ہونا چاہیے)
۴	۶	۱۷	جہالت ہے	جہالت عام ہے
۵	۱۰	۱۱	کوئی کانفرنس سے	کوئی کانفرنس کے دل سے
۶	۱۱	۹	عنفوان شباب سے کامل ۵۵ سال	عنفوان شباب سے لیکر ۵۵ سال تک
۷	۱۵	۱۹	علمی کیمیا	علم کیمیا
۸	۱۶	۱۵	کو وہ کانفرنس	نو تصانیف ظاہر ہوکر وہ
۹	۱۷	۷	داخل ہوا ہے	داخل ہو رہے
۱۰	۲۰	نوٹ	نکلتی نہیں معلوم ہوئی	نکلتی نہیں معلوم ہوتی
۱۱	۲۳	۲۲	۲۳	(قلمزد ہونا چاہیے)
۱۲	۲۷	۱۷	تعطل	عزلت

فہرست مضامین

رپورٹ آنریری سکریٹری

نمبر	مضمون	صفحہ
۱	سال گزشتہ میں اجلاس نہ ہونے کی وجہ	۱
۲	یورپ میں تعلیمی ضرورتوں کا احساس	۲
۳	مسلمانوں کی تعلیمی ترقی شمار و اعداد میں	۳
۴	میوات میں احیاء تعلیم	۶
۵	نواح علی گڑھ میں مدارس کا انتظام	۸
۶	دیگر اضلاع میں سفیروں کا کام	۹
۷	وظائف	۱۰
۸	تصنیف و تالیف	۱۱
۹	کانفرنس گزٹ	۱۳
۱۰	انعامی مضامین	۱۳
۱۱	تعلیمی اعداد و شمار کی ترتیب	۱۴
۱۲	ماہواری لکچر	۱۵
۱۳	انعام خوشخطی	۱۶
۱۴	کانفرنس کا تعمیری کام	۱۹
۱۵	مسلمان طلبہ کا اعلیٰ تعلیم میں تدریجاً کم ہوتا جانا	۱۷
۱۶	سائنس میں مسلمانوں کی کمی	۲۰
۱۷	افلاس نہیں بلکہ اسراف باعث تنزل ہے	۲۱
۱۸	مسلمان زمینداروں کا تنزل	۲۱
۱۹	غیر منقولہ جائداد باقی رہنے کی ضرورت	۲۲
۲۰	صنعت و تجارت کی ضرورت	۲۳
۲۱	اصلاح تمدن	۲۴
۲۲	تعلیمی بیمہ	۲۷
۲۳	جدید انتظامات دفتر	۲۷
۲۴	گوشوارہ حساب جمع خرچ بابت ۱۹۲۱ء	۴۲
۲۵	″ ″ ۱۹۲۲ء	۴۳
۲۶	ضمیمہ فہرست ممبران استقبالیہ کمیٹی	۴۸

رپورٹ آنریری سکریٹری

جو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پینتیسویں اجلاس مقام علی گڈھ میں بصدارت آنریبل میاں فضل حسین صاحب وزیر تعلیمات صوبہ پنجاب ۲۷ دسمبر ۱۹۲۲ء کو بوقت سہ پہر پڑھی گئی

سال گزشتہ میں اجلاس نہ ہونے کی وجہ

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس وقت سے آج سینتیسواں جلسہ ہوتا مگر یہ پینتیسواں ہی وجہ یہ ہے کہ اس خادم التعلیم کی عمر کے دو برس ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء زمانے کے روزنامچہ حالیوں میں درج ہونے سے رہ گئے۔ سن اول الذکر کو تو اس لیے کہ کانفرنس کے بانی اور روح و رواں یعنی سر سید علیہ الرحمہ کی عمر کا یہ آخری سال ور خاص قسم کی مصائب و آلام سے مملو تھا۔ مرحوم کو اہتمام جلسہ کا موقع نہ ملا۔ کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت بھی ٹرکی اور یونان کی جنگ نے اچانک بیچ میں حایل ہو کر مسلمانان ہند کے نظام دماغی کو کسی قدر برہم کر دیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں مسلمانوں کو ٹرکی کے سیاسی انقلاب سے پھر نئے جینی ہوئی۔ اپنی حیات ملی کے دو رفیع الشان شعبوں یعنی خلافت مقدسہ اور دولت اسلامیہ کو محفوظ و مصئون رکھنے کا خیال اس قدر مرکوز خاطر ہوا کہ انھیں اپنی حیات منزلی کے کسی شعبہ کی پروا نہ رہی۔ آرام و آسایش۔ دولت و ثروت کے تمام سامان و ذرائع انکی نگاہ میں ہیچ ہوگئے شعبہ تعلیمات بھی اسی جھپیٹ میں آگیا جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی

تعلیم گاہیں کم و بیش بے رونق ہو گئیں۔ انگریزی و عربی مدارس دونوں کی رفتار ترقی کو شکستگی و افلاس کی وجہ سے صدمہ پہونچا۔ ایسی حالت میں کانفرنس جو اسی سلسلہ کا آخری سرا ہی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ ۱۹۲۰ء میں سالانہ اجلاس منعقد ہو سکا۔ پھر بھی کانفرنس کی جد وجہد میں کسی طرح کمی نہیں ہوئی۔ اور اس کی سعی بھی مشکور ہونے سے خالی نہ رہی جس کا تذکرہ آئندہ سلسلہ بیان میں اپنے موقع پر کیا جائے گا۔

بہر حال اب کہ وہ پریشانی ایک گونہ فرو ہو گئی ہے۔ مشرق قریب کا مطلع صاف۔ ٹرکی کی حالت امید افزا۔ اور مسلمانان ہند کو خدا کے فضل سے گونہ سکون و دلجمعی حاصل ہے۔ کانفرنس انہیں علمی اور مادی ترقی کی جانب پھر متوجہ کر کے التماس کرتی ہے کہ انسان کی سب سے بڑی فضیلت اور تہذیب انسانی کا سب سے اعلیٰ جوہر اور مسلمانوں کی عظمت و کامیابی کا راز تعلیم ہی ہے۔ انگلستان اسی کی بدولت برطانیہ عظمیٰ بنا۔ امریکہ کی مختلف النسل قوموں نے تعلیم ہی کے اثر سے متحد ہو کر دنیا میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد قایم کی۔

یورپ میں تعلیمی ضرورت کا احساس

ممکن ہے کہ آپ اسے ایک تخیل محض سمجھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ حدود ہندوستان سے باہر نکل کر بصیرانہ نظر سے دیکھئے تو مہذب اور تعلیم یافتہ قوموں کا آج یہی دستور العمل ہے چونکہ انہوں نے حیات ملی اور حیات مغربی کی تمام برکتیں صرف تعلیم کی بدولت حاصل کی تھیں۔ اس لیے جنگ جیسے کٹھن مقام امتحان سے نکل کر وہ پھر تعلیمی جد وجہد میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ہیں انگلستان کے اکابر آج صرف تعلیمی مسایل کے حل کرنے میں مشغول ہیں۔ تمام قوم کا رجحان ابتدائی تعلیم کی جانب ہے۔ تربیت و تعلیم پر ہزارہا کتابیں سالانہ اور لاکھوں مضامین اخبار میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تمام قوم پر اس قدر ننے پینی طاری ہے کہ گویا وہ ابتک نئے نئے تشنہ علوم ہے۔ امریکہ کو دیکھئے۔ بڑے بڑے دولتمندوں نے ہزاروں ڈالر بطور انعام دیکر اخلاقی تعلیم کے متعلق مبسوط کتابیں لکھائی ہیں۔ اور ملک کے ہر صوبہ سے ممتاز ماہران فن تعلیم کو منتخب کر کے ان سے اخلاقی تعلیم کے لئے نظام عمل تیار کرائے ہیں۔ جنگ کے بعد سے یورپ کے ہر ملک کا یہی حال ہے گویا پچھلے جنگ کے میدان میں انہوں نے جس قدر ٹھوکریں کھائیں

وہ سب اپنے عقیدہ میں نقص تعلیم کی وجہ سے کھا ئیں۔ اور اب وہ ان کی تلافی اور حفظ ماتقدم تعلیمی اصلاح کے ذریعہ سے کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہر ضلع کے اکابر ایک مقامی ایجوکیشنل کانفرنس کے ارکین بن گئے ہیں۔ اس مختصر بیان سے جس کو میں نے ممالک مغربی کے اخبارات اور رسایل سے اخذ کیا ہی۔ واضح ہوگا کہ تعلیمی جد و جہد کبھی کسی قوم و ملک میں ختم نہیں ہو سکتی اگر قوم مردہ اور تن بیجان ہو جائے۔ تب بھی شاید تعلیمی جماعتیں صرف نیم مردہ اور نیم جان ہو جائیگی۔ لیکن مفقود و معدوم کبھی نہیں ہو سکتیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی شمار و اعداد میں

بعض احباب کا خیال ہی کہ یہ کانفرنس قوم کو تعلیمی ضرورت کا احساس کرا کر اپنا کام ختم کر چکی لہذا اب اس کا عدم و وجود برابر ہی۔ کانفرنس کی غفلت شعاری اور بیکار رہنے کے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہی لیکن جب ہم دنیا کی مہذب قوموں کا موازنہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں تعلیم کو ایک اہم مد سمجھا جاتا ہی اور تعلیمی جماعتوں کے قیام کو قومی تعلیم کا منحصر علیہ تصور کیا جاتا ہی تو ہمیں تعجب ہوتا ہی کہ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ طبقہ سے کانفرنس کے خلاف کیوں آوازیں اُٹھتی ہیں۔ یہ ایک امر مسلمہ ہی کہ کانفرنس نے قوم کو بیدار کر کے بہت کچھ کام کر لیا۔ جس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ گزشتہ بیس سال میں مسلمانوں نے بمقابلہ پیوستہ بیس سال کے علوم عامہ اور دیگر شاخوں میں حیرت انگیز ترقی کی۔ بلکہ علوم عامہ میں شاید وہ اپنے حریفوں سے نسبتاً بڑھ گئے جیسا کہ دفتر کے نقشہ جامع نمبر پنجم سے واضح ہوگا۔ میں اس کا خلاصہ ذیل کی جدول میں پیش کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم ۱۸۳۵ء سے شروع ہوئی۔ لہذا ۱۸۸۵ء تک یعنی ۵۰ سال کے زمانے کو قرن اول قرار دیا ہی اور ۱۸۸۶ء سے ۱۹۱۰ء تک کو قرن دوم اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۵ء تک قرن سوم ہی۔ اعداد و شمار سے ثابت ہی کہ مسلمانوں نے جن اسباب ظاہری سے متاثر ہو کر تعلیم میں چوگنی پچگنی ترقی کی۔ ان میں کانفرنس کی سعی سبب اول کہلانے کی مستحق ہی۔ اس لیئے کہ ملک میں اور کوئی ایسی زبردست اور جامع قوت نہ تھی جو انہیں اتنا جلد بیدار کرتی۔

سنہ		علوم عامہ	سائنس	قانون	طب	انجینرنگ
سنہ ۱۸۵۸-۸۰ء	مسلمان	۴۰	×	۱۳	۱۳	۰
	ہندو	۲۳۵۶	×	۹۳۳	۴۷۳	۱۴۰
سنہ ۱۸۸۱-۱۹۰۰ء	مسلمان	۹۶۵	۰	۲۲۲	۴۴	۷
	ہندو	۱۶۰۰۰	۸۴	۴۷۶۳	۱۱۳۷	۶۰۷
سنہ ۱۹۰۱-۲۰ء	مسلمان	۴۶۹۲	۲۶۵	۱۰۰۱	۱۲۵	۴۳
	ہندو	۴۳۸۷۸	۴۷۰۱	۱۴۱۱۳	۲۵۲۵	۸۲۴

پروفیشن کی تعلیم یعنی مفید مشاغل حیاتیہ کے لیئے تیار کرنا ایک اور اہم بحث ہے جس پر میں آئندہ بحث کرونگا۔ سردست علوم عامہ کو دیکھئے۔ قرن اول سے قرن دوم میں مسلمانوں نے چوبیس گنی اور ہندوؤں نے سات گنی ترقی کی۔ قرن دوم سے قرن سوم میں مسلمانوں نے پانچ گنی اور ہندوؤں نے سہ گنی ترقی کی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر قرن میں نسبتاً ہمارے رفقائے سفر کی تعداد زیادہ ہے۔ فی صدی اوسط یا آبادی کی نسبت سے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر یہاں صرف اتنا مسئلہ زیر بحث ہے کہ کانفرنس کی آواز سن کر مسلمان کتنا جاگے اور منزل مقصود کی جانب کتنا بڑھے یہ امور اس بحث کے دوسرے اور تیسرے جزو ہیں کہ انھیں اس میدان تقابل میں کس قدر بڑھنا چاہیئے تھا اور اب ملک میں وہ کونسی قوت ہے جو انھیں آئینۂ حقیقت دکھا کر ان کے تعلیمی چہرہ کے اصلی خدوخال معائنہ کرا دے اور یقین دلا دے کہ ابھی چہرہ مکمل نہیں۔ ابھی میدان تقابل میں بڑی رستاخیز باقی ہے۔ یہ کچھ کم حیرت انگیز بیداری اور ترقی نہیں مسلمان اس ملک میں صدہا برس حکمران رہنے کے بعد زوال سلطنت کے اثرات سے متاثر ہو کر ابتداءً جدید تعلیم کی جانب متوجہ نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ دور جدید کے قرن اول میں انھوں نے حریفوں کی ۲۳۵۶ تعداد کے مقابلہ میں کل ۴۰ گریجویٹ پیش کیئے تھے یعنی ساٹھواں حصہ یا ۲ فی صدی سے بھی کم! غور کیجئے اگلے بیس سال یا قرن دوم میں وہ کون قوت تھی جس نے انھیں نہ صرف بیدار ہی کیا بلکہ حریفوں کے

مقابلہ میں ان کی تیز قدمی کو سہ چند کر دیا۔ اور پھر تیسری قرن میں بھی ان کے قدم سست نہیں ہوئے۔ کیا کوئی انصاف سے کہہ سکتا ہے کہ یہ بدون اجتماعی کوشش کے ممکن تھا؟ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ سنہ ۱۹۲۰ء تک سلسلہ وار اور باضابطہ ترقی نہ کرتے بلکہ قافلہ کے ساتھ کچھ دور چل کر رہ جاتے۔ چونکہ جدول ذیل کے دیکھنے سے میرا یہ دعوے بالکل ثابت ہو جائے گا۔ یہ گویا قرن سوئم کی پنج سالہ ترقی کی مختصر روئداد ہے۔

قرن		علوم عامہ	سائنس	قانون	طب	انجینئرنگ
سنہ ۱۸۹۶ء - ۱۹۰۰	مسلمان / ہندو	۳۲۶ / ۶۲۳۰	۰ / ۱۴	۱۱۰ / ۱۸۱۷	۱۸ / ۳۹۳	۵ / ۱۸۴
سنہ ۱۹۰۱ - ۱۹۰۵	مسلمان / ہندو	۵۴۲ / ۶۲۱۴	۲۷ / ۳۷۷	۸۴ / ۲۳۴۲	۳۱ / ۴۸۸	۵ / ۱۰۳
سنہ ۱۹۰۶ - ۱۹۱۰ء	مسلمان / ہندو	۷۰۶ / ۷۶۶۵	۱۵ / ۴۱۶	۱۰۳ / ۲۳۳۵	۲۶ / ۵۴۰	۶ / ۲۹۸
سنہ ۱۹۱۱ - ۱۹۱۵ء	مسلمان / ہندو	۱۱۱۶ / ۱۰۷۱۶	۸۶ / ۱۴۸۲	۳۰۷ / ۳۴۸۷	۲۴ / ۴۷۲	۱۲ / ۲۰۹
سنہ ۱۹۱۶ - ۱۹۲۰ء	مسلمان / ہندو	۲۳۲۸ / ۱۹۲۸۳	۱۳۷ / ۲۴۴۶	۵۰۷ / ۵۹۵۹	۴۴ / ۱۰۲۵	۱۸ / ۳۴۷

میں نے ترقی کی تدریجی رفتار دکھانے کے لیے قرن دوم کے آخری پنج سالہ کو بھی لیا ہے تمام مدات خصوصاً علوم عامہ کی مد کے ذیل میں اعداد و شمار قرن وار ترقی کرتے نظر آتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ قوم بیدار ہو کر رفتار زمانہ کے مطابق حوائج زندگی کو محسوس کر کے نہ صرف چل نکلی ہے بلکہ قافلہ کے ساتھ ساتھ باقی رہا۔ یہ امر کہ قوم کو اس حد تک کس نے بیدار اور منزل مقصود کے لیے تیار کیا؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ سید محمود مرحوم کے نقشوں کے مطابق جو انھوں نے سنہ ۱۸۹۶ء میں مرتب کر کے کانفرنس میں پیش کیے تھے - سنہ ۱۸۹۱ء لغایت سنہ ۱۸۹۵ء پانچ سال کے اعداد و شمار علوم عامہ کی مد میں حسب ذیل تھے۔

مسلمان۔ ۱۲۵ ہندو۔ ۳۹۷۳

گویا کانفرنس کے قایم ہونے کے پہلے پنج سالہ میں مسلمانوں کا سالانہ اوسط ۲۵ ہوا (اس سے پہلے قرن میں پورا پندرہ بھی نہ تھا) یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخری پنج سالہ میں بھی اوسط سالانہ

...ہ کر ۶۰ تک پہونچ گیا۔ یہ کانفرنس ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا جو نہ ابھی ختم ہوئی اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ جبتک قوم زندہ ہے تب تک کانفرنس بھی زندہ ہے۔ یہ درحقیقت مسلمانوں کا شعبۂ تعلیمات ہے بغیر اس کے قوم کی تعلیم زندہ نہیں رہ سکتی۔

ہم نے علوم عامہ کی مد کو اس لیئے بنیاد قرار دیا ہے کہ بغیر اس مرحلہ سے گزرے نوجوان کسی مفید پیشہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ طب، انجینئرنگ، وکالت یا سرکاری محکمہ کی منزل اعلیٰ میں داخل ہونے کے لیئے اس شاہراہ سے گزرنا لازمی ہے۔

کانفرنس نے اپنی عمر کے تقریباً نصف حصہ میں محض پاسبانی کا کام کیا جس کے نتائج مجملاً اعداد و شمار مندرجہ بالا کی صورت میں میں نے آپ کے روبرو پیش کیئے ہیں۔ اس کے بعد جب قوم کو اندازہ ہو گیا کہ تعلیم میں جد و جہد کرنا چاہیئے تو کانفرنس پبلک کے ساتھ گویا عملی میدان میں داخل ہوئی۔ اس کے کاموں کی تفصیل سے سالانہ روئدادیں بھری پڑی ہیں جن کا اعادہ کرنا تضیع اوقات سے خالی نہیں۔ منجملہ اُن کے یونیورسٹی کے قیام میں کانفرنس کی سعی و کوشش نہ صرف قابل قدر خدمت بلکہ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ کے لیئے ایک یادگار رہے گی۔

اب میں سال رواں کے کاموں کی ایک مختصر فہرست پیش کرتا ہوں۔

میوات میں احیاء تعلیم

۴۔ ضلع گوڑگانوں کی آبادی میں غالب عنصر قوم میو کا ہے جن کی تعداد دس لاکھ سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سرزمین جو ضلع مذکور کو ساتھ لیئے ہوئے ہے الور اور بھرتپور تک چلی گئی ہے۔ اسی دلیر اور فیاض قوم کے دیہات سے معمور ہے ان کا پیشہ کاشتکاری ہے مگر جہالت ہے۔ ابو مشتاق احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگ وکیل گوڑگانوں اور چودھری محمد یسین خاں صاحب بی۔ اے۔ انسپکٹر کوآپریٹیو سوسائٹیز تحصیل نوح و فیروز پور کی توجہ سے قصبہ نوح ضلع گوڑگانوہ میں قوم میو کا ایک مختصر سا مدرسہ کچھ عرصہ سے قایم ہو گیا تھا۔ سال حال میں صاحبان موصوف کے طلب کرنے پر میر ولایت حسین سپرنڈنٹ دفتر کانفرنس مدرسہ مذکور کے معائنہ کو گئے۔ بعد امتحان منتظمین کو بقائے مدرسہ کے واسطے مفید مشورے دیئے اور فراہمی چندہ میں امداد کے واسطے سفیر کانفرنس بھیجنے کا وعدہ کیا چنانچہ ۹ جون سنہ ۱۹۲۲ء کو منشی ایوب حسن سفیر کو میوات میں بھیجا گیا اور مسٹر برین ڈپٹی کمشنر گوڑگانوہ کو سفیر کے

کی امداد کے واسطے لکھا گیا۔ صاحب موصوف کی توجہ سے سفیر مذکور نے میوات میں دیہہ بدیہہ دورہ کر کے قوم میو سے ان کی مالگذاری پر ۱۰/ فی روپیہ مستقل تعلیمی ٹیکس وصول ہونے کے واسطے رضامندی حاصل کی اور ۲۷ جولائی ۱۹۲۲ء کو میر ولایت حسین سپرنٹنڈنٹ دفتر کانفرنس ہز اکسلینسی گورنر پنجاب سے بمقام گورگانوہ اس مقصد سے ملے کہ گورنمنٹ پنجاب حسب خواہش قوم میوان سے مالگذاری پر ۱۰/ فی روپیہ مستقل تعلیمی ٹیکس مدرسہ نوح کے واسطے وصول کرنا منظور کرے مگر یہ درخواست منظور نہ ہوئی بعد ازاں مسٹر برین ڈپٹی کمشنر کی توجہ سے ڈسٹرکٹ بورڈ ضلع گورگانوہ سے مبلغ پونے تین سو روپیہ ماہوار کی امداد اس مدرسہ کی عمارت مل گئی اور قرار پایا کہ اگر میو چاہیں تو ایک سال کے واسطے ان کی مالگذاری پر ہر گاؤں کے ملبہ خرچ میں سے مالگذاری پر ۱/ فی روپیہ کی شرح سے تحصیلدار صاحبان وصول کر لیں چنانچہ سفیر کانفرنس نے دیہہ بدیہہ دوبارہ گشت کر کے اس جدید تجویز پر قوم میو کی رضامندی حاصل کی اور اب یہ چندہ مالگذاری کے ساتھ وصول ہو رہا ہے۔

مسٹر برین کی توجہ سے اس مدرسہ قوم میو کو علاوہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی امداد کے سررشتہ تعلیم پنجاب سے ایک معقول امداد ملنے والی ہے اور یکم اپریل آئندہ سے یہ مدرسہ ہائی اسکول بن جائے گا اور برین میو ہائی اسکول کہلائے گا۔ ۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو میر ولایت حسین سپرنٹنڈنٹ دفتر کانفرنس نے حسب خواہش قوم میو اس مدرسہ کے انتظام کے واسطے ایک انتظامیہ کمیٹی منظور کرائی۔ سفیر کانفرنس نے علاوہ میو ہائی اسکول کے جو قصبہ نوح میں واقع ہے میوات میں متعدد مکاتب قایم کیے ہیں جن کا خرچ اہل دیہہ برداشت کرتے ہیں۔ ان مکاتب میں کلام مجید اردو اور حساب کی تعلیم ہوتی ہے اور کوشش ہے کہ میوات کے ہر گاؤں میں ایک مکتب اور بڑے بڑے گاؤں میں پرائمری یا مڈل اسکول قایم ہو جائیں جو برین میو ہائی اسکول واقع قصبہ نوح کی شاخیں ہوں اور اس طرح پر کل میوات سے جہالت کی تاریکی دور ہو کر میو لوگ پکے اور سچے مسلمان بن جائیں۔

میوات میں اشاعت تعلیم میں اس قدر کامیابی کانفرنس کے صیغہ سفارت کی قابلیت اور مسٹر برین ڈپٹی کمشنر گوڑگانوہ کی مسلسل توجہ اور دلچسپی سے ہوئی ہے۔ ہم ان کے بدل ممنون

ہیں۔

نواح علی گڈھ میں مدارس کا انتظام

ضلع علی گڈھ میں بھی کانفرنس نے امسال خاص کوشش کر کے جابجا مدرسے قایم کرائے ہیں اور کانفرنس کے کارپردازوں نے ان مدارس کا ماہوار امتحان لیکر انھیں ایک باقاعدہ اور باضابطہ تعلیم گاہ بنادیا ہی۔ مگر مشکل یہ ہی کہ ہر جگہ روپیہ کی ضرورت ہی۔ اگر قوم نے کانفرنس کی مدد کی تو جابجا مدارس قایم کیئے جائیں گے۔ ان مدارس کی تفصیل حسب ذیل ہی۔

(الف) قصبۂ جلالی میں جو قوم سادات کا ایک قدیم زاد بوم ہی ایک مدرسہ قایم کرکے ایک کمیٹی انتظامیہ کے سپرد کیا گیا ہی جس کے آنریری سکریٹری سید علی اکبر صاحب جوائنٹ سکریٹری سید حکمت علی صاحب اور صدر جناب سید خورشید علی صاحب ہیں۔ میر ولایت حسین صاحب کانفرنس کے سپرنٹنڈنٹ فن تعلیم کے ماہر ہیں۔ وہ مدرسہ کا امتحان ماہوار جاکر خود لیتے ہیں۔

(ب) سکندرہ راؤ میں بھی ایک اسلامیہ مدرسہ قایم تھا جس کی امداد کے لیئے جلسہ عام ہوا۔ جس میں آنریبل خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور نے بذات خود شرکت کر کے ایک ہزار روپیہ عنایت فرمایا۔ اس مدرسہ کا معائنہ بھی سپرنٹنڈنٹ صاحب موصوف متعدد بار کرچکے ہیں۔ انتظامیہ کمیٹی کے پریسیڈنٹ خان صاحب محمد یوسف علی خانصاحب رئیس وچیرمین میونسپل بورڈ سکندرہ راؤ اور آنریری سکریٹری آغا محمد نعمت خاں صاحب ہیں جن کی کوششیں قابل تعریف ہیں۔

(ج) سہاور ضلع ایٹہ کے مدرسہ کا امتحان بھی سپرنٹنڈنٹ صاحب کانفرنس نے لیا اور بہت اچھی رائے ظاہر کی۔ انتظامیہ کمیٹی کے آنریری سکریٹری ہمارے کالج کے ایک پرانے طالب علم احمد اللہ خاں صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ ہیں اور اپنے وقت عزیز اور قوت کا بڑا حصہ مدرسہ کی بہبودی میں صرف کرتے ہیں۔

(د) مدرسہ اسلامیہ مظفر نگر کا معائنہ ایک بار میں نے خود کیا اور متعدد بار جوائنٹ سکریٹری صاحب نے کیا۔ مدرسہ کے ملحق پارچہ بافی کی تعلیم کی ایک شاخ ہی۔ جہاں چھوٹے

بچوں کو اس مفید فن کی عملی تعلیم دی جاتی ہے یہ اگرچہ ابتدائی حالت میں تھا مگر جناب نواب عظمت علی خاں صاحب کرنال کے وقف سے اسکو اب مدد ملنی شروع ہوئی ہے۔ امید ہے کہ نمایاں ترقی کرے گا۔ مدرسہ کے سکریٹری منشی فضل احمد صاحب اور منیجر منشی محمد ناظم صاحب سابق سفیر کانفرنس ہیں۔ یہ دونوں اصحاب اپنا بہت سا قیمتی وقت اور دل و دماغ مدرسہ کی بہبودی میں صرف کرتے ہیں۔

دیگر اسکولوں میں سفیروں کا کام

ملک کے مختلف حصوں سے اکثر مدارس اسلامیہ کی مینجنگ کمیٹیاں اپنے سالانہ جلسوں میں کانفرنس کی جانب سے سفیر طلب کرتی رہتی ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں مولوی نیاز محمد خاں صاحب وکیل و منیجر اسلامیہ ہائی اسکول کی تحریک پر کانفرنس نے اپنے سفیر کے ذریعہ سے مسلمانان ضلع کو اپنے مقامی مدرسہ کی امداد پر آمادہ کیا اور کانفرنس کی جانب سے سالانہ جلسہ کے موقع پر میں خود سہارنپور گیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے بھی تکلیف فرمائی اور کوشش کر کے مدرسہ کی عمارت کے لیئے تقریباً بیس ہزار روپیہ چندہ کی اپیل کی گئی تھی پھر معلوم نہیں ہوا کہ کب تک وصول ہوا ہے۔ سہارن پور میں کانفرنس کے سفیر نے مسلسل دو ماہ تک کوشش کر کے مسلم پبلک میں ایک تحریک پیدا کی ہیں مولوی نیاز محمد خاں صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جو برسوں سے اسلامیہ اسکول سہارن پور کے لیئے ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔

چند سال ہوئے اراکین اسلامیہ اسکول لودھیانہ نے کانفرنس سے ایک سفیر طلب کیا تھا جنھوں نے وہاں دورہ کر کے قریب پانچ ہزار روپیہ کے مقامی چندہ فراہم کر دیا تھا امسال اس مدرسہ کو جوائنٹ سکریٹری کانفرنس نے دیکھا۔ وہاں کا مشن اسکول ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس میں تعداد طلبہ بڑھ کر چار سو کے قریب ہوگئی ہے اور بجائے مڈل اسکول کے اب ہائی اسکول ہوگیا ہے۔ لڑکوں کی کمی نہیں۔ البتہ سرمایہ کی کمی ہے۔ سرمایہ ہو تو اعلیٰ درجہ کا اسٹاف اور عمدہ عمارت ہو جائے۔ امید کہ اہل لدھیانہ اس عمدہ موقع سے جبکہ ان کے طلبہ کی تعداد اچھی ہے فائدہ اٹھا کر مدرسہ کو خوب ترقی دیں گے۔

مدرسوں کا معائنہ کانفرنس کے سپرنٹنڈنٹ ممبر ولایت حسین صاحب کرتے ہیں جو ہمارے کالج کے قابل گریجویٹ ہیں۔ عرصہ تک ہمارے کلیجیٹ اسکول کے سکنڈ ماسٹر اور قایم مقام ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں۔ اور فن تعلیم میں مہارت اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔

اصلیت یہ ہو کہ کانفرنس کے پاس کافی سرمایہ ہو اور ہماری قوم کانفرنس کے اہم کاموں کا پورا پورا احساس کرے تو اسلامیہ مدرسوں کی نگرانی کا کام بہت بڑھ سکتا ہو اکثر مقامات سے خطوط آتے ہیں جن میں کانفرنس کے سفیروں کو دعوت دیتے ہیں یا مالی امداد طلب کرتے ہیں مشکل سے شاید کوئی ایسا مقام ہوگا جہاں کہ مقامی اسلامیہ مدرسہ کو بیرونجات سے مالی امداد کی احتیاج نہ ہوگی اور حقیقت یہ ہو کہ قوم کی تعلیم اتنی اہم اور عظیم الشان ضرورت ہو کہ جب تک مختلف مقامات۔ ضلاع اور امصار بین الاقوامی اصول پر ایک دوسرے کو مدد نہ دیں خواہ براہ راست یا کسی ایک مرکز مشترکہ یعنی کانفرنس کے ذریعہ سے۔ تب تک یہ ضرورت پوری نہ ہوگی اور قوم تشنہ ہی رہے گی۔ کوئی کانفرنس سے پوچھے کہ وہ سال کے بارہ مہینے اور ہفتہ کے سات دن ہمیشہ العطش العطش کی صدائیں ہر طرف سے سنتی رہتی ہو مگر افسوس کہ قلت سرمایہ کی وجہ سے مدد نہیں کرسکتی۔ اگر خدا دے تو کانفرنس کی یہ آرزو ہو کہ ہر ایک ضلع یا مرکزی مقام یا خطے میں ایک ہائی اسکول قایم کرکے گرد و نواح میں اس کی شاخیں قایم کی جائیں مرکزی تعلیم گاہ کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ہائی اسکول اٹاوہ کی طرح دور و دراز مقامات کے طلبہ وہاں آکر تعلیم پاسکیں اور مدرسہ مذکور مقامی درسگاہ کی حیثیت سے بلند ہو جائے۔ زنانہ اسکول علی گڈھ بھی اسی شان کا ہو۔ کانفرنس ان دونوں تعلیم گاہوں کی سالہا سال سے مالی امداد کرتی ہو۔ لیکن کانفرنس کا خزانہ اس قدر معمور نہیں کہ ہر مرکزی تعلیم گاہ کی دستگیری کرسکے یا اس شان کی مرکزی تعلیم گاہیں خطہ بخطہ قایم کرا کر ان کی مالی امداد مستقل طور پر کرسکے۔ اگر فضل الہی شامل حال ہوا اور قوم نے اس جانب توجہ کی تو اس کی آرزو پوری ہونی مشکل نہیں۔

وظایف کانفرنس بقدر اپنے سرمایہ کے اپنی آمدنی کا معتد بہ حصہ ضرورتمند طلبا کو بشکل وظایف امداد دینے میں صرف کرتی رہتی ہو۔ چنانچہ ابتک اسّی ہزار روپیہ سے زائد کے تعلیمی وظایف دیئے گئے ہیں۔ صرف چند سال گزشتہ سے یہ سلسلہ ڈھیلا پڑ گیا۔

ہمدرنی کے ساتھ وظایف میں بھی کمی ہوگئی۔ اصل میں اس قسم کے امدادی وظایف اس معہود ذہنی کی بنا پر جاری کیئے گئے تھے کہ ہنر اور قابل نوجوان۔ اختتام تعلیم کے بعد سر رشتہ تعلیم میں داخل ہوکر قوم کی تعلیم کو خصوصاً اور فن تعلیم کو عموماً ترقی دیں گے لیکن افسوس ہو کہ ہندوستان کے سر رشتہ تعلیم میں کچھ اچھی توقعات نہیں ہیں تعلیم یافتہ اس سر رشتہ کی ملازمت کو محض ایک ایسی جگہ خیال کرتے ہیں جہاں وہ بیٹھ کر حسب منشا موقع کا انتظار کر سکیں۔ اور بس اسی وجہ سے کانفرنس کے ذہنی توقعات اور اصلی اغراض و مقاصد پورے نہ ہوتے تھے۔ آخر یہ نتیجہ ہوا کہ دو سال سے کانفرنس کے قانون میں ترمیم کر دی گئی جس کی رو سے اب وظایف صرف ٹریننگ کالج میں پڑھنے کے لیئے دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ سال رواں کے بجٹ میں مبلغ دو ہزار روپیہ اس مقصد کے لیئے مختص کیئے گئے ہیں۔ اگر قوم کانفرنس کے سرمایہ کی جانب توجہ کرے تو کانفرنس کی دلی تمنا ہو کہ صنعت و حرفت کے متعلق وسیع وظایف طلبا کو دیئے جائیں جن کے ذریعہ سے وہ اس زمانہ کی کشمکش حیات میں کامیابی سے مقابلہ کر سکیں۔

تصنیف و تالیف کانفرنس کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ قوم کے ممتاز افراد کی سوانح عمریاں لکھا کر شایع کرے۔ چنانچہ مرحوم نواب وقار الملک کی مکمل حیات مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ترتیب دے رہے ہیں جو تحریر میں عمدہ دستگاہ رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ کام نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہو۔ جن بزرگوں نے ملک و ملت کی خدمت سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا اور قوم کے لیئے ہر قسم کی زحمتیں برداشت کیں ان کی حق شناسی و نیز ملک و ملت میں عملی زندگی قایم رکھنے کا یہ موثر طریقہ ہو۔ نواب صاحب مرحوم نے عنفوان شباب سے کامل پچپن سال جان گداز محنت اور دلی شوق سے ملک و ملت کی خدمت کی ہو۔ انکی ذات اپنے زبردست کیریکٹر کے لحاظ سے اسلامی اخلاق و شایستگی کا قابل تقلید نمونہ تھی۔ اس سوانح عمری کی تکمیل کے لیئے خاص طور پر اہتمام کیا گیا۔ نواب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد سب سے پہلے امروہہ سے ایک بڑا ذخیرہ معلومات حاصل ہوا۔ اس کے بعد اسی ضرورت سے سوانح نگار نے حیدرآباد کا سفر کیا۔ اور صوبہ ورنگل میں پہنچ کر وہاں سے مواد بہم پہنچایا۔ خوش قسمتی سے

حیدر آباد میں کافی مواد ملا اور جن صاحبوں نے مرحوم کے ساتھ حیدر آباد میں کام کیا تھا ان میں سے جو اصحاب موجود تھے ان سے خاص طور پر مدد ملی۔ غرض مواد کی فراہمی کے لحاظ سے یہ سفر نہایت کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ اخبارات کے پرانے فائلوں، کالج کی رپورٹوں مختلف قومی جلسوں کی روئدادوں اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی پرانی جلدوں وغیرہ سے ریفرینس کر کے حالات فراہم کیے گئے۔

کانفرنس کے علاوہ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال بھی اس کام میں مدت سے مصروف تھے۔ انھوں نے کوشش اور محنت سے جو مواد فراہم کیا تھا وہ بعض شرائط پر کانفرنس کے حوالہ کر دیا۔ اور اب گویا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس سے ایک مکمل سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ سوانح کا ایک بڑا حصہ مرتب ہو گیا ہے بعض حصص جو باقی ہیں زیر تالیف ہیں انشاء اللہ سال آئندہ یعنی ۱۹۲۳ء میں یہ سوانح عمری مکمل ہو کر ملک میں شائع ہو جائے گی اور ہماری قوم کے نوجوانوں کے لیے ایک رہنما اور ایک عالی مرتبہ بزرگ کی بہترین یادگار ہو گی۔

اسی سلسلہ میں دو اور جدید اور مفید کتابوں کی اشاعت کا ذکر نے موقع نہ ہوگا یعنی التربیت والاستقلالیہ جس کا ماخذ ایک فرانسیسی ماہر فن تعلیم کی جدید تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ عربی سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے اردو میں کیا ہے۔ اور دوسری رہنمائے تعلیم جو ایک مبسوط کتاب بارہ باب پر مشتمل ہو گی۔ اس میں مسئلہ تعلیم پر بچپن سے لیکر کامل تحصیل ہونے تک علمی اور عملی زندگی کا مکمل نظام عمل (پروگرام) درج ہوگا۔ بچے میں قوت گویائی پیدا ہونے کے وقت سے مدرسہ میں داخل ہونے کے زمانہ تک۔ پھر ابتدائی تعلیم کے مدارج سے لیکر تعلیم ثانی اور اس وقت سے کالج کی تعلیم تک تمام مدارج کا مفصل تذکرہ ہو گا۔ طرز تعلیم نفس تعلیم مضامین تعلیم۔ زمانہ طالبعلمی کی زندگی۔ اخلاق و تربیت۔ اور آئندہ مشاغل کا انتخاب وغیرہ وغیرہ۔ اس کے کئی باب مکمل ہو چکے ہیں۔ غالباً سال آئندہ کے وسط میں چھپکر شائع ہو گی۔

کانفرنس اس قسم کا مواد بھی جمع کر رہی ہے جس سے ابتدائی مدارس کے لیے ایک نصاب کا جدید کورس تیار کرے اور اپنے اثر کے مدارس میں اسے جاری کرے۔ یہ کورس امریکہ اور یورپ کے مشہور و ممتاز ماہران فن کی ملفوظات اور مکتوبات پڑھکر اسی اصول پر تالیف کیا

جائے گا۔ صرف اپنے ملکی، قومی اور تمدنی ضرورتوں کے لحاظ سے فروع میں کچھ تغیر کیا جائے گا۔

۹۔ کانفرنس گزٹ یہ حقیقت میں کوئی صحیفہ یا رسالہ نہیں تھا بلکہ کانفرنس کی ایک زبانِ بیان تھی جس طرح ہر آدمی عرض حال کے لیے ایک زبان رکھتا ہے لیکن جنگ کے اثرات سے پرچہ کا خرچ آمدنی سے اتنا بڑھا کہ مجبوراً اس زبان کو بند کرنا پڑا اور کانفرنس عرصہ تک بے زبان رہی لیکن اب کہ اشاعتِ تعلیم کا کام ایک وسیع پیمانہ پر شروع کیا گیا ہے۔ ماہ جولائی سے یہ رسالہ پھر جاری کیا گیا ہے خیال یہ ہے کہ اس کے تمام شعبات کے متعلق اس میں اعلیٰ مضامین شائع ہوں۔ اور ہر مضمون کا رُخ جدت طرازی اور عملی تجاویز کی جانب ہو اور یہ کانفرنس کا صحیح معنوں میں ترجمان بن جائے۔ الحمد للہ کہ یہ مقاصد حاصل ہوتے جاتے ہیں اور پرچہ روز بروز درجۂ قبول حاصل کرتا جاتا ہے خصوصاً اصلاحِ تمدن کے مضامین کی وجہ سے گزٹ کو عصرِ جدید کا رتبہ حاصل ہوتا جاتا ہے۔ کانفرنس کی آرزو ہے کہ اس ماہواری رسالہ کو پندرہ روزہ اور پھر ہفتہ وار رسالہ کی صورت اور اعلیٰ شان میں شائع کرے اور جہاں تک ممکن ہو اس کے دو حصے کر دیئے جائیں۔ حصۂ اول میں علوم و تعلیمات پر قابلِ عمل مضامین شائع کیے جائیں۔ تربیت و اخلاق خاص موضوع ہوں اور حصۂ دوم میں کانفرنس کے کاموں کی تفصیل ہو۔

۱۰۔ انعامی مضامین امسال کانفرنس کی جانب سے قوم کے با مذاق افراد کو دعوت دی گئی کہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاق پر مفید مضامین لکھیں اور ان پر انعام کا اعلان کیا گیا۔ چنانچہ اکثر قومی اخبارات نے از راہ عنایت ہماری دعوت کو اپنے اخبارات میں شایع کیا اور سررشتہ تعلیم کے بعض ڈائرکٹروں نے بھی ہماری مجوزہ فہرست کو صوبہ کے اسکولوں تک پہونچایا۔ جناب ڈائرکٹر صاحب صوبہ سرحد کی عنایت کا تہہ دل سے شکریہ ہے کہ انھوں نے اس بارے میں بہت مدد دی چنانچہ حسب ذیل مواضیع پر تحریرات موصول ہوئیں۔ ان میں چودھری محمد اکبر صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اسلامیہ ہائی اسکول وزیر آباد ضلع لائل پور کو ہم مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے بچوں کو سچ بولنے کی عادت ڈالنے کے

طریقوں کے متعلق مضمون لکھنے پر انعام حاصل کیا بہر حال یہ مفید سلسلہ جاری ہے۔

تعلیمی اعداد و شمار کی ترتیب

یاد ہوگا کہ مسٹر محمد اکبر نذر علی حیدری صاحب بالقابہ نے بہ حیثیت صدر اجلاس کانفرنس جو بمقام کلکتہ دسمبر ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوا تھا۔ اپنے ایڈریس کے شروع میں فرمایا تھا کہ "کانفرنس کو ایسے اعداد و شمار فراہم کرنے چاہئیں جن سے ہر شخص یہ معلوم کر سکے کہ اول مختلف صوبوں کے مسلمانوں نے تعلیم کے مختلف مدارج اور شعبوں میں کہاں تک ترقی کی۔ دوم یہ کہ بالمقابل اقوام کی بہ نسبت ان کی رفتار ترقی کیسی رہی، اُن میں تعلیم نے جہالت سے نسبتاً کتنا کم یا زیادہ تفاوت پیدا کیا ہے اور یہ کہ تعلیم کے میدان میں وہ اغیار سے نسبتاً کس قدر بعید یا قریب ہوتے جاتے ہیں"۔ آگے چل کر آپ نے فرمایا کہ "جبتک کانفرنس کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس قسم کے صحیح اور مکمل اعداد و شمار اور واقعات شایع نہ ہوتے رہیں گے اس وقت تک ہم صحیح طور سے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ہماری حالت کیا ہے اور کون سے ایسے مسایل ہیں جن پر ہمیں فوری توجہ کرنی چاہیئے۔ اور کونسی تجویزیں ہیں جو ہمارے مرض کی دوا ہو سکتی ہیں۔ اور کون سی ایسی ہیں جو ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہیں۔ یہ کانفرنس کا فرض ہے کہ ہر شعبہ تعلیم کے ہر ایک پہلو اور تمام جزئیات و کلیات کے اعداد و شمار اور واقعات و حقایق کمال احتیاط محنت صبر اور دقت نظر کے ساتھ مہیا کرے بلکہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو دفتر میں اسی کام پر لگا دیئے جائیں۔ ہر مسئلہ کو ایک شخص لیکر نتائج تحقیق کو مکمل یہاں شایع کرے۔ افسوس ہے کہ اس بارے میں مکمل اور صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں کہ مسئلہ تعلیم پر مفصل بحث کی جائے۔ میرے نزدیک اس فرض کی ادائیگی میں اب کانفرنس کو کچھ عذر نہیں ہو سکتا ہے جبکہ فخر رؤساء ہند اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ کی شاہانہ امداد نے اسے مالی احتیاج کی طرف سے بے نیاز کر دیا ہے"

کانفرنس اس مشورہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جس انجمن یا نظام میں اعداد و شمار کے نقشے اور جدولیں نہیں اس کے پاس اپنے کاموں کا پیمانہ نہیں۔ ہم کسی میدان میں مقابل بغیر ترقی نہیں کر سکتے اور نہ تناسب بغیر کسی روئداد میں کسی کام کا اندازہ کر سکتے ہیں چنانچہ ۱۸۹۲ء کے اجلاس میں سید محمود مرحوم نے آغاز تعلیم انگریزی یعنی ۱۸۳۵ء سے لیکر ۱۸۹۳ء تک کے

نسبتی اعداد و شمار ایک مبسوط رپورٹ کے ساتھ کانفرنس میں پیش کیئے تھے۔ جو نہایت ہی قابل قدر ذخیرہ ہی اور جس سے مسلمانوں کی تعلیم کا آئندہ پروگرام مشتق ہوتا ہی۔ اس میں مرحوم نے متعدد نقشوں میں مسلمانوں کی تعلیم کا ایک ابھرا ہوا خاکہ کھینچا ہی۔ اس کے دس سال بعد ۱۹۰۲ء کے اجلاس میں پروفیسر عبدالقادر نے پھر اس سلسلہ کو لیا۔ اور ۱۸۹۳ء سے شروع کر کے ۱۹۰۲ء تک یعنی دس سالہ ترقی تعلیم کی روداد دس مفصل نقشوں کے ذریعہ سے دکھائی۔ یہ گویا اس قسم کی روداد نویسی میں دوسرا قدم تھا۔ مگر ۱۹۰۲ء کے بعد یہ کام ملتوی رہا۔ مسٹر حیدری کی ۱۹۱۸ء کی تقریر نے پھر متوجہ کیا۔ چنانچہ اب کانفرنس نے بیس پچیس نقشوں کے ذریعہ سے گزشتہ بیس سال کی ترقی تعلیم کو قوم وار، صوبہ وار۔ اور قرن وار نقشوں میں بہ تناسب ہندو مسلمانان ۱۸۸۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کے تعلیمی اعداد و شمار کو ہر علم و فن کے لحاظ سے قرون پنج سالہ میں مرتب کر کے پھر اس کا خلاصہ ایک چھوٹے جدول میں دکھایا ہی جس سے میں نے اس رپورٹ کے شروع میں اپنی جدول اخذ کی ہی اور آئندہ کے لیئے ہر نقشہ کا ایک رجسٹر کھولا گیا ہی جس میں صوبہ وار ہر قسم کے تعلیمی اعداد و شمار سالانہ اضافہ ہوتے رہیں گے اور مسلمانوں کی تعلیم کی حقیقی روداد ہر وقت نظر کے سامنے رہے گی۔ اس کو مولوی حامد علی صاحب صدیقی نے مکمل کر دیا ہی۔

۱۲۔ ماہواری لکچر — سال رواں میں کانفرنس کے کاموں کی فہرست میں ایک اور جدید کام کا اضافہ ہوا یعنی سلطان جہاں منزل (دفتر کانفرنس) کے ہال میں مختلف مضامین پر لکچروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس میں اصحاب ذیل نے لکچر دیئے۔

(۱) خلیل احمد صاحب مراد پروفیسر مسلم یونیورسٹی مشاہدہ قدرت پر۔

(۲) پروفیسر عبدالعزیز صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ علمی کیمیا پر۔

(۳) سید طفیل احمد صاحب سرمایہ داروں کی غلامی اور مسلمان۔

پہلے دو لکچر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی صدارت میں ہوئے تھے کانفرنس کے چند لکچروں کے بعد چونکہ مسلم یونیورسٹی میں خود ہفتہ میں دو بار لکچروں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان تمام تر اس طرف متوجہ ہوگئے اس لیئے کانفرنس میں

جداگانہ لکچروں کا انتظام نہ ہوسکا۔

۱۳۔ انعام خوشخطی کانفرنس میں ایک شاخ یہ بھی ہو کہ ہر سال صوبہ متحدہ کے سرکاری وغیر سرکاری اسکولوں کے لڑکوں کی اردو تحریر کے نمونے سررشتۂ تعلیم کی معرفت دفتر کانفرنس میں وصول ہوا کرتے ہیں۔ اور منتخب تحریرات پر خوشخطی کا انعام دیا جاتا ہو تاکہ خوشخطی کا فن لطیف جو کبھی اہل مشرق کا ایک نمایاں امتیاز تھا قایم رہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہو۔

۱۴۔ کانفرنس کا غیر مرئی کام بیان بالا سے واضح ہوگا کہ کانفرنس کا وجود بیکار نہیں بلکہ کارکن ہو۔ گو اس کی محنت اور جان فشانی کے نتایج یونیورسٹی کے کیلنڈر میں درج نہیں ہوسکتے وجہ یہ کہ وہ محض تحریک کرنے والی اور اُبھارنے والی جماعت ہو۔ ایک قابل عمل اور مفید تجویز قوم کے روبرو پیش کرنا اور اس پر عمل کرنے کے طریقے بتانا اس کانفرنس کا فرض ہو۔ بلکہ سچ یہ ہو کہ وہ خود اپنے کسی مفید مطلب تجویز پر بھی قوم کی مدد بغیر عمل پیرا نہیں ہوسکتی۔ آپ حضرات نے جس ذوق وشوق سے میری عرض حال کو سنا میں نہایت ممنون ہوں۔ ممکن ہو کہ بعض قلوب اس سے متاثر ہوکر تعلیم کی طرف توجہ کریں یا کانفرنس کے تعلیمی لٹریچر سے ان کے قلب میں ایک تحریک پیدا ہو اور وہ تعلیم کی اشاعت میں شریک ہوں تو وہ کانفرنس میں اپنے خیال کے تغیرات اور اپنے ارادوں کو کانفرنس کے ملفوظات ومکتوبات کی طرف منسوب کرکے کانفرنس کو کوئی سارٹیفکٹ نہیں بھیجیں گے کہ فلاں فلاں تقریر وتحریر کا ہم پر یہ اثر ہوا۔ اگر کسی واعظ یا خطیب کی نصیحت سن کر سامعین میں سے کوئی صاحب سچے نمازی ہوجائیں تو وہ اپنے ہاتھ سے اس واعظ کے نامۂ اعمال میں یہ اصلاح وتغیر درج نہ کریں گے۔ یہ اور بات ہو کہ کراماً کاتبین کا غیر مرئی ہاتھ اس نیکی کو درج کردے۔ بہرحال ہر ذی شعور کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کانفرنس کے کام گو بظاہر غیر محسوس ہیں تاہم وہ ایک خاموش کارکن کی طرح اپنا کام موثر پیرایہ میں کرتی چلی جارہی ہو۔ اس نے مختلف مقامات میں درسگاہیں کھلوائیں۔ مسلم یونیورسٹی قایم کرانے میں پوری قوت سے کام لیا۔ یعنی اسی کے وعظ اور درس و

برس سے یہ تحریک ایک حد تک کامیاب ہوئی مگر اسی کے ساتھ اعداد و شمار کی بنا پر
سا یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جس نسبت سے مسلمانوں نے حصول تعلیم کا عام چرچا کیا اس نسبت
سے کامیابی حاصل نہیں کی۔

مسلمان طلبہ کا اعلیٰ تعلیم میں بتدریج کم ہوتا جانا

تعلیم ایک ایسا درخت ہے کہ جس کا پھل انسان کو چوٹی پر پہونچکر ملتا ہے۔ گو کہ اس پھل کی آرزو جڑ ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم پرائمری مڈل یا انٹرینس تک پہونچکر
رہ جانا گویا افسردگان خام کی فہرست میں داخل ہوتا ہے۔ یہ بات میں افادہ اور استفادہ کی
بنا پر نہیں کہتا بلکہ حقیقی تعلیم جو انسان میں فضایل پیدا کرتی ہے اس کی بنا پر عرض کرتا ہوں۔ یہ
بات ہے کہ اب انٹرینس کے ساتھ ایف۔اے۔ نے مل کر کالج کی تعلیم کو بلندی سے پستی پر
ڈالا ہے اور سرکاری ملازمت سے کوئی قوم فضیلت حاصل نہیں کرسکتی خصوصاً ادنیٰ درجہ کی
ملازمت سے محض اپنا تن پیٹ پال سکتی ہے سوسائٹی میں کوئی امتیاز میسر نہیں ہوسکتا۔ یہ جوہر
ہی یونیورسٹی کی تعلیم پیدا کرتی ہے۔ جب ان خیالات کے ساتھ ہم تعلیمی اعداد و شمار پر نظر
ڈالتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے کہ فی صدی پندرہ بیس مسلمان بھی اس درجہ تک نہیں پہونچتے۔
زیادہ تر اپر پرائمری کچھ مڈل تک پہونچ کر اور بہت کچھ انٹرینس تک جا کر رہ جاتے ہیں۔ بی۔اے
اور ایم۔اے یا یوں کہو کہ یونیورسٹی کے درجہ تک پہونچ کر آخر حاصل کرنے والے پانچ
فی صدی بھی نہیں ملتے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حدود اختیار میں طلبا کی تعداد حسب ذیل
تھی۔

	کالج	ہائی سکول	مڈل	اپر پرائمری	لوئر پرائمری	اسپیشل	پرائیویٹ
مسلمان	۵۸۳۰	۲۶۱۵۰	۴۲۹۴۹	۶۸۵۵۹	۹۸۷۳۹۲	۴۳۳۷۷	۱۳۸۸۴۳
ہندو	۳۴۹۳	۱۳۶۵۵۵	۲۲۰۳۸۱	۴۸۷۰۹۹	۲۳۲۱۳۸۹	۳۸۵۰۱۳	۱۲۸۷۵۹

تناسب کو نظر انداز کر کے دیکھیں تو مسلمانوں کی تعداد لوئر پرائمری سے کالج تک پہنچنے
میں تیز رفتاری کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے گویا ایک کمزور اور فاقہ کش سپاہ ہے جس کی تعداد

میدان جنگ کے ہر اگلے حصہ تک اقدام کرنے میں فی صدی ۱۰ باقی رہتی ہو اور بقیے اپنے دشمن کی گولیاں کھاکر ڈھیر ہو جاتی ہو۔ اسی طرح مسلمان لڑکے تنگدستی اور افلاس سے مجبور ہو کر کالج پہنچتے پہنچتے لاکھوں کی تعداد سے صرف پانچ چھ ہزار پر آتر آتے ہیں نقشہ بالا میں کالج کی بیس نر تعلیم طلبا کی تعداد ۵۰۰۳ ہو لیکن نقشہ ذیل میں کامیاب طلبا کی تعداد اوسی مد میں ۷۵۳ ہو گویا اوسط کی بنا پر قیاس غالب یہ ہو کہ تخمیناً چھ ہزار کی تعداد نقشہ نامزدگی مرتب ہونے کے وقت تک گھٹکر تخمیناً دو ہزار رہ گئی جن میں سے کل تخمیناً ساڑھے سات سو کامیاب ہوئے بقیہ مسلمان طلبا اسی افلاس و تنگ دستی کی وجہ سے ثمرۂ محنت حاصل کرنے سے محروم رہیں گے۔

نتایج امتحانات یونیورسٹی ہائے ہند بابت ۱۹۲۰-۲۱ء

	آرٹس	سائنس	قانون	طب	انجینئرنگ
مسلمان	۵۹۴	۳۵	۹۹	۱۸	۷
ہندو	۴۶۷۳	۵۳۸	۱۲۸۳	۳۳۱	۹۰

مسٹر حیدری نے اجلاس ۱۹۱۸ء کے ایڈریس میں مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی کمی کا سبب تنگدستی اور افلاس بتایا۔ مسٹر پرنجپائی وزیر تعلیمات صوبہ بمبئی کا اپنے صوبہ کی نسبت یہی خیال ہو کہ بمبئی کے مسلمانوں کی تعداد ابتدائی تعلیم میں کم نہیں مگر اعلیٰ تعلیم میں افلاس کی وجہ سے نہایت کم ہو۔ مسٹر حیدری نے جو کچھ خیال ظاہر کیا ممکن ہو کہ دیگر حصص ملک کے متعلق وہ صحیح ہو لیکن بمبئی کی نسبت مسٹر پرنجپائی کی رائے کسی قدر مبالغہ آمیز ہو۔ اس صوبہ کے مسلمان اکثر تجارت پیشہ اور نسبتاً بہت زیادہ دولتمند ہیں مصارف تعلیم بخوشی برداشت کر سکتے ہیں مگر تجارت کے ذریعہ سے وہ اس قدر روپیہ پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کو تعلیم کی پرواہ نہیں رہتی۔ بدنصیبی سے بمبئی میں بھی جیسا کہ ہندوستان بھر میں علمی مذاق اتنا بلند نہیں ہوا کہ ہر ایک پیشہ کی بنیاد کو علم ہی پر قایم کیا جائے۔ یہ ہمارے نظام تعلیم کا ایک نقص ہو پس بمبئی میں تعلیم کے احتیاج مند بیشتر وہی نوجوان ہیں جو بیوپار کے ذریعہ سے روپیہ پیدا کرنے سے قاصر

ہیں۔ خواہ بوجہ بد مذاقی یا نے زری تعلیم حاصل کرکے یہ پرائیویٹ یا پبلک آفسوں میں نوکر ہو جاتے ہیں یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ دولتمند تاجروں کو تعلیم کی کچھ پروا نہیں صوبہ بمبئی کا ۲۰ سالہ نقشہ تعلیم بھی ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے اور صوبوں کے مقابلہ میں نہ وہاں مسلمان زیادہ تعداد میں ڈگریاں حاصل کرتے ہیں اور نہ برادران ہنود۔ حالانکہ بہت زیادہ مستطیع اور صاحب مقدرت باشندے ہیں۔ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ بمبئی کے مسلمان تاجروں کی یہ غلط فہمی ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم بغیر بھی تجارت کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ سکتے ہیں حقیقت میں یہ لوگ یورپ کے تاجروں کا مال بیچ کر ایجنٹوں کی طرح روپیہ پیدا کرتے ہیں نہ کہ حقیقی تاجروں کی طرح۔ علم و سائنس بغیر تجارت نہیں ہو سکتی۔ البتہ دکانداری کر سکتے ہیں۔ کامرس یا تجارت کی اعلیٰ ڈگریاں بمبئی یونیورسٹی نے ۱۹۱۳ء سے دینی شروع کیں تب سے آج تک کا پنج سالہ نقشہ حسب ذیل ہے۔

پنج سالہ نقشہ تعداد کامیاب طلبا گریجویٹ تجارت بمبئی یونیورسٹی

نام سن	تعداد امیدواران	ہندو	پارسی	دیگر اقوام	مسلمان	میزان کامیاب طلبا
۱۹۱۷ء	۵۷	۲۳	۳	۰	۰	۲۶
۱۹۱۸ء	۱۲۴	۴۴	۶	۰	۲	۵۲
۱۹۱۹ء	۱۰۴	۴۰	۹	۶	۱	۵۶
۱۹۲۰ء	۵۷	۱۸	۵	۱	۰	۲۴
۱۹۲۱ء	۵۹	۱۷	۶	۰	۰	۲۳
میزان	۳۹۴	۱۴۲	۲۹	۷	۳	۱۸۱

یہی حال زراعت کا ہے جس میں صرف دو برس کے عرصہ میں پنجاب میں جو زراعت کا مشہور مرکز ہے ۹ مسلمان بمقابلہ ۱۴ ہنود یونیورسٹی سے زراعت کے گریجویٹ ہو کر نکلے۔ میں نے صرف علم ادب اور فلسفہ سے بحث کو شروع کیا تھا۔ اتفاقاً سائنس کی تعلیم کا ذکر سلسلۂ بیان میں آگیا جو قریب قریب تمام معززنہ پیشوں کی کنجی ہے یعنی سائنس بغیر طبیب

یا ڈاکٹر ہو سکتے ہیں نہ انجینیر بن سکتے ہیں نہ زراعت میں ترقی کر سکتے ہیں نہ تجارت میں۔ یہانتک کہ بعض سرکاری اعلیٰ عہدے بھی ایسے ہیں کہ محکمے کے مدارج طے کیئے بغیر اگر یونیورسٹی سے نکل کر براہ راست اُن تک پہونچنا چاہیں تو جب تک سائنس میں آنرز نہ لیں تب تک اُمیدوار ہونا بھی ممکن نہیں مثلاً فوریسٹ یا جنگلات میں ولایت جاکر اعلیٰ درجہ کی سند حاصل کرنے کے لیئے اول سائنس میں آنرز لینا لازمی ہے ورنہ داخلہ بھی ممکن نہیں۔

ملاحظہ ہو گورنمنٹ کا ریگولیشن صیغہ جنگلات اشتہرہ سنہ ۱۹۱۲ع یہی وجہ ہے کہ طب۔ انجینرنگ زراعت اور تجارت وغیرہ معزز پیشوں میں بہت تھوڑے مسلمانوں نے یونیورسٹی کی سند حاصل کی ہے نقشہ ذیل ملاحظہ کیجئے۔

سائنس

قرن		پنجاب	الہ آباد	کلکتہ	بمبئی
سنہ ۱۹۰۱ع	مسلمان / ہندو	۰ / ۹	۵ / ۲۶	۲۲ / ۳۲۴	۰ / ۱۷
سنہ ۱۹۰۶ع	مسلمان / ہندو	۳ / ۳۱	۲۶ / ۱۶۴	۸ / ۲۱۸	۱ / ۳۹
سنہ ۱۹۱۱ع	مسلمان / ہندو	۱۵ / ۱۰۵	۳۸ / ۳۱۱	۳۳ / ۹۶۴	۰ / ۹۴
سنہ ۱۹۱۶ع	مسلمان / ہندو	۵۲ / ۲۴۳	۴۲ / ۴۳۴	۳۹ / ۱۴۹۸	۴ / ۱۸۴
میزان بست سالہ	مسلمان / ہندو	۷۰ / ۴۸۸	۸۸ / ۹۰۳	۱۰۲ / ۲۹۸۲	۵ / ۳۴۹

نوٹ:۔ مدراس یونیورسٹی میں سائنس کی فیکلٹی نہیں معلوم ہوئی۔

اس جدول سے واضح ہوتا ہے کہ گذشتہ بیس سال کے عرصے میں ۱۰۴۴ ہندوؤں کے مقابلہ میں کل ۲۶۵ مسلمانوں نے سائنس کی ڈگریاں حاصل کیں یہی وجہ ہے کہ بیس برس کے اندر ۲۵۲۵ ہندوؤں کے مقابلہ میں کل ۱۲۵ مسلمان ڈاکٹری میں اور ۸۲۴ ہندوؤں کے مقابلہ میں کل ۲۳ مسلمان انجینرنگ میں پاس ہوئے ل میں آج کل سائنس بغیر معاش پیدا کرنا بہت مشکل ہے یہی تمام اعلیٰ پیشوں کا دروازہ ہے جب مسلمان نوجوان دروازہ ہی میں کم داخل ہوتے ہیں تو ان سائنٹیفک پیشوں میں ان کی اد کیونکر زیادہ ہوسکتی ہے۔ قانون میں سائنس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس واسطے یہاں مسلمانوں کی

تعداد ۱۰۔ الیفی اور بیٹیوں سے نسبتاً زیادہ ہے۔

۱۱۔ افلاس نہیں بلکہ اسراف باعث تنزل ہے

بہر حال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ افلاس مسلمانوں کا ایک نشان معروف بن گیا ہے اور یہی راہ ترقی میں قدم قدم پر مزاحمت کرتا ہے مگر میں ہرگز نہیں تسلیم کروں گا کہ افلاس کی وجہ ناداری ہے یعنی مسلمان کافی ذرائع آمد سے محروم نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مسرف اور فضول خرچ ہیں۔ اس لیئے اقتصاد کی ہر منزل سے خارج ہوتے جاتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ صدر سے پا انداز کی طرف گرتے جاتے ہیں۔ اگر زمیندار ہیں تو ان کی جائداد یں بکتی جاتی ہیں اگر تاجر یا دستکار ہیں تو سود خوار سرمایہ داروں کے غلام ہیں۔ اگر ملازم ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں تو نمائشی ضرورتوں کے پھندے میں پھنس کر مقروض ہیں۔

۱۲۔ مسلمان زمینداروں کا تنزل

جن اضلاع میں قدیم زمیندار خاندان آباد ہیں ان کی رپورٹ بندوبست پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام آبادی میں صرف مسلمان زمیندار ہی ہیں جن کے لاکھوں روپیہ کی جائیداد غیر منقولہ قرضہ کی بدولت بک کر اغیار کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔ مثال کے طور پر صرف ضلع بلند شہر کا ایک نقشہ پیش کرتا ہوں۔

مالیت جائداد	راجپوت	پٹھان	سادات	شیوخ	بلوچ	میو	لودھا
مقبوضہ سابقہ	۱۶۹۳۸۸	۸۳۴۰۷	۱۰۳۱۹۱	۱۹۷۲۸	۹۸۶۹	۲۹۶۰	۲۶۰
مالیت جائداد مقبوضہ حال	۱۸۰۱۰۸	۷۵۴۳۹	۷۴۳۱۰	۱۵۴۳۹	۴۰۴۴	۲۲۷۵	۵۲
کمی	۔	۷۹۶۸	۲۸۸۸۱	۴۲۸۹	۵۸۲۵	۶۸۵	۲۰۸

مسلمان راجپوت کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمان اقوام خصوصاً سادات سخت سقیم الحال ہیں ضلع مظفر نگر کے سادات کا اور سہارن پور کے شیوخ کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ مگر یہ سب اسراف و تبذیر کے نتائج ہیں۔

۱۹۔ غیر منقولہ جائداد باقی رہنے کی ضرورت

ایک اور مصیبت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے قبضہ سے جائداد غیر منقولہ نکل جاتی ہے تو وہ مفلس ہی نہیں ہو جاتی بلکہ اس قوم کا کوئی زاد بوم کوئی مرکز ثقل کوئی وطن نہیں رہتا۔ نہ حب وطنی کے جذبات رہتے ہیں نہ قومیت باقی رہتی ہے۔ وہ محض افراد کثیرہ ہو جاتے ہیں۔ نرے وزن اور نرے دقمت جیسے روئی کا گالا کہ جسامت تو رکھتا ہے مگر وزن کچھ نہیں محض افراد کثیرہ سے قومیت پیدا نہیں ہوتی۔ خود قرآن پاک میں قوم کی تعریف اَمْوَال اور بنین سے متعدد جگہ کی گئی ہے۔ سورہ نوح میں ہے۔

ویمددکم باموال وبنین (ترجمہ۔ خدا تعالیٰ مال اور اولاد سے تمہاری مدد کرے گا

...

ثم رددنا لکم الکرۃ علیہم وامددنٰکم باموال وبنین وجعلنٰکم اکثر نفیرا (ترجمہ ہم نے پھر ایک دفعہ تمہیں بحال کر کے ان پر غلبہ دیا۔ اور تمہیں مال و اولاد سے مدد دی اور جتھے والا (قوم) بنا دیا۔

اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم وہ ہے جس میں بہت سے افراد بھی ہوں اور وہ صاحب مال بھی ہوں تب ہی وہ قوم کہلائے گی ورنہ افراد کثیرہ ہیں اور بس۔ مال سے مراد روپیہ پیسہ اور ساز و سامان نہیں بلکہ زیادہ تر اراضی بخشائشیں ہیں۔ مال و متاع کی تشریح بھی سورہ آل عمران میں واقع ہوئی ہے۔

زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذہب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذٰلک متاع الحیوٰۃ الدنیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا مال و متاع دنیا میں زیادہ سے زیادہ اسقدر ہے (عورتیں۔ لڑکے۔ سونے چاندی کے ڈھیر۔ گھوڑے۔ مویشی اور کھیتیاں) اور اسمیں حیوانات۔ نباتات اور روئیدگی جمادات اور فلزات سب کچھ شامل ہیں۔

...

کی پیداوار کا مالک ہونا لازمی ہے اور افراد کثیرہ کا ہونا بھی جو اس پیداوار کو اپنی محنت سے

سوسائٹی کے قابل استعمال بنا دیتے ہیں۔ دُنیا کی بعض نہایت متمول قومیں چونکہ دولت ارض سے محروم ہیں اس لیئے مشکل قومیت کی حد میں داخل ہوسکتی ہیں۔ اب میں بہ تعظیم مناسب التماس کرتا ہوں کہ کیا مسلمان اسراف و تبذیر کے ہاتھوں مرکز قومیت سے گرنا چاہتے ہیں۔

کانفرنس تعلیم کی منزل میں ہے۔ اگر مقام سیاست میں ہوتی تو گورنمنٹ سے استدعا کرتی کہ جدید قانون سود وضع کیا جائے یا ان مفلوک علاقوں میں جہاں ناعاقبت اندیش مسلمان زمیندار آباد ہیں اور وہ اپنے اسراف کی بدولت مقروض ہوگئے ہیں۔ وہاں قانون تحفظ جائداد ہائے مکفولہ کو نافذ کرکے ان مظلوموں کو سودخوار سرمایہ داروں کے پنجے سے چھڑائے لیکن ہمیں بھولنا نہ چاہیئے کہ "غیر سے چارہ نوازی کا تقاضا" مردانگی نہیں ہے۔ ہم کیوں نہ اپنی قوم کو اصلاح تمدن اور کفایت شعاری اور سادہ زندگی کا سبق دیکر اپنی قوت بازو کی مدد سے اس خون آشام سودخواروں کے گروہ کو شکست دیں۔ زمینداروں اور تاجروں کو چھوڑکر مسلمانوں کے تیسرے طبقہ پر نظر ڈالیئے تو یہ اب کچھ عرصے سے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مامور ہونے شروع ہوئے ہیں۔ مگر یہ اس قدر فضول خرچ ہیں کہ گویا فضول خرچی ہی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیئے انھیں یہ عہدے ملے ہیں۔ ان کے اسراف کی تفصیل کے لیئے ایک دفتر چاہیئے۔ فیشن ایبل اور پرتکلف زندگی کا تمام سازوسامان ان کے مکانوں میں ملے گا لیکن اُن کے گھروں یا بنکوں میں ان کا ایک حبہ بھی جمع نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ اس زمانہ میں گویا دلچسپی کا ایک بہت بڑا سارٹفکیٹ ہے۔

صنعت و تجارت کی ضرورت

سخت ضرورت ہے کہ کانفرنس اصلاح و تمدن کی شاخوں کو بڑھائے تجارت۔ دستکاری، کاشتکاری، اور ملازمت کی طرف قوم کو متوجہ کرے تاکہ مسلمان دستکاروں کی نحوست دور ہو اور بھاری شرح سود سے انھیں رستگاری ملے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ جابجا مشترکہ سرمایہ سے امدادی
۲۳۔ انجمنیں قایم کی جائیں جو مسلمانوں کو کاروبار میں مالی مدد دیں۔ پنجاب میں اس نظام سے لاکھوں آدمیوں کو فائدہ پہونچا ہے جہاں جہاں یہ انجمنیں قایم ہوکر کام کررہی ہیں

وہاں سے سود خوار سرمایہ داروں کا کامل اخراج ہو گیا ہے۔

کانفرنس کا فرض ہے کہ ان اُمور کے متعلق لٹریچر فراہم کرے۔ کفایت شعاری اور حصول معاش کے ذرائع پر کتابیں تصنیف اور اشاعت کرائے لیکن مشکل یہ ہے کہ کانفرنس محض ایک واعظ ہے جب تک خود قوم میں کچھ افراد اس کام کا تہیہ نہ کرلیں اکیلی کانفرنس کیا کرسکتی ہے جن اصحاب کو ان ضرورتوں کا احساس ہو وہ اپنے اپنے مقامات پر کوشش کرکے حسب حال ایک نظام قایم کریں کانفرنس سے مشورہ کرتے رہیں۔ اس قسم کی مثالیں بذریعہ کانفرنس گزٹ و اعلانات و تصانیف اور کانفرنس کے سفیروں کے ذریعہ سے قوم تک پہونچتی رہیں گی۔

کانفرنس دن رات اسی اُدھیڑ بن میں رہتی ہے کہ قوم کیونکر سنبھلے طرح طرح کی تجویزیں سوچتی ہے نظام عمل بناتی ہے۔ قوم کے دل میں دل ڈالنا چاہتی ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ قوم کے ممتاز اور سمجھدار افراد بھی اس کے دست بازو نہ بنیں اور کانفرنس خیالی پلاؤ پکا کرے جائے ؎

ہر شب منم فتادہ بگرد سرائے تو
ہر روز آہ و نالہ کنم از برائے تو

۱۰۷۱ اصلاح تمدن

قوم میں مشکل کوئی فرد ہوگا جو اصلاح تمدن کا آرزومند نہ ہوگا لیکن توفیق عمل فی صدی پانچ میں بھی نہیں شادی، غمی اور دیگر لغو رسوم کو بند کرنے کے لیئے علما اور واعظین کا چلاتے چلاتے گلا بیٹھ گیا۔ بامذاق اور چیدہ اصحاب میں سادہ زندگی کے فوائد پر اکثر مکتوبات و ملفوظات پیش کیئے گئے جابجا انجمنیں قایم ہوئیں تو اب کسی قدر بیداری محسوس ہوتی ہے وہ بھی اس حصہ تک کہ موٹے کپڑے کو لباس فاخرہ کی مجلس میں جگہ مل گئی۔ ہنوز اس سے کوئی اقتصادی فائدہ نظر نہیں آتا تعلیم گاہیں اور قومی مجلسیں بوجہ افلاس اسی طرح بدرونق صنعت و حرفت پر مٹی پڑی ہوئی ہے ان کی تجارت کا بازار ٹھنڈا ہے۔ ان کے دستکار کاریگر غیر سرمایہ داروں کے اسی طرح غلام ہیں دن رات دست بازو سے کام لیتے ہیں مگر نہ پیٹ بھرتا ہے نہ تن ڈھکتا ہے اور اگر بفرض محال وہ کسی قدر

سلیقہ شعاری اور کفایت دکھا کر دو چند آمدنی اور آدھا خرچ کر لیتے ہیں تو خرچ کے اور نیئے دروازے کھل جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوم میں ضبط نفس کیوں نہیں ہا مصنوعی حاجات کے سامنے یہ کیوں سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور کیوں اپنے آپ کو ذلیل درجے کی ضرورتوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔ اس خیال کی کشمکش میں کانفرنس نے امسال اصلاح تمدن کی جانب خاص طور پر توجہ کی ہو اور جو نظام عمل اس نے تیار کیا ہو اس کی رو سے وہ اکثر اصحاب کو اس امر کا تحریری اقرار دینے پر مجبور کرتی ہو کہ وہ کم سے کم دس فی صدی آمدنی ضرور کسی نہ کسی طرح پس انداز کریں اور سال میں دو مرتبہ کانفرنس کو محاسبہ کے ذریعہ سے اس کا یقین دلا دیں۔ اس کے متعلق مطبوعہ کاغذات وغیرہ کانفرنس کے دفتر میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔ ظاہر ہو کہ بڑوں کے مقابلہ میں بچوں پر آدھی کوشش کی جائے گی تو ضرور دو چند پھل دے گی چنانچہ کانفرنس کے بجٹ میں امسال ۱۰۰۰ کی رقم اس مقصد کے لیئے مختص کی گئی ہو کہ اسکولوں کے بچوں کو کفایت شعاری کا اعلیٰ نمونہ دکھانے پر انعامات دیئے جائیں۔ ابھی یہ امر زیر غور ہو کہ کانفرنس کا اطمینان کیونکر ہو کہ بچے نے اس قدر رقم اپنی کفایت شعاری سے بچائی۔

اصلاح تمدن کے کاموں کا اعلان اخباروں میں اور مختلف اعلانات میں کیا گیا ہو۔ کانفرنس کے سفیر بھی جہاں کہیں جاتے ہیں اس کام کو کرتے ہیں چنانچہ اکثر مقامات میں اصحاب ذیل اس شعبہ کے معتمد بن کر کام کر رہے ہیں۔

فہرست اسمائے گرامی معتمد اصلاح تمدن کانفرنس

۱۔ بسط علی خاں صاحب رئیس سہاور ضلع ایٹہ۔
۲۔ سید طفیل احمد صاحب سب رجسٹرار علی گڈھ۔
۳۔ خان بہادر عبدالحمید خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کانپور۔
۴۔ سید حکمت علی صاحب رئیس جلالی ضلع علی گڈھ۔
۵۔ مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی منیجر مسلم انسٹیٹیوٹ پریس علی گڈھ

۶. منشی محمد ناظم علی صاحب عقب جامع مسجد مظفر نگر
۷. مولوی ظہور الحسن صاحب چیف رجسٹریشن کلرک سہارنپور
۸. عبد اللہ خاں صاحب پنشنر انسپکٹر معرفت عبد الصمد خاں عبد الرحیم خاں سوداگران لدھیانہ
۹. سید نائب حسین صاحب سب اوورسیر نہر سارد ہا ہیڈ ورکس بن بسا ضلع پیلی بھیت
۱۰. سید نور احمد صاحب رضوی ٹیچر ڈسٹرکٹ بورڈ صدرن ضلع فرخ آباد
۱۱. داؤد احمد صاحب معرفت ہوٹل اصغر علی خاں تلی تال نینی تال
۱۲. حامد یار خاں صاحب محلہ کٹرہ چاند خاں شہر کہنہ بریلی
۱۳. سکریٹری انجمن خادم المسلمین قاضی ٹولہ بریلی
۱۴. اکبر علی خاں صاحب راج پوت سکنڈ ماسٹر مڈل سکول کوٹ عیسیٰ خاں تحصیل زیرہ ضلع فیروز پور
۱۵. نیاز علی صاحب ٹھیکہ دار پوسٹ بداین اسٹیشن ضلع کھیری
۱۶. احمد علی صاحب محلہ پوستی خانہ اٹاوہ
۱۷. محمد یحییٰ صاحب محلہ قاضی پور خورد متصل میر شکار ٹولہ گورکھپور
۱۸. مولوی کرم غنی صاحب ایم اے ایل ٹی ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول اجمیر
۱۹. تمیز الدین احمد صاحب وکیل پٹن ضلع اورنگ آباد دکن
۲۰. منشی اللہ نارائن صاحب چک نمبر ۱۶ گ ب ممانوالہ ضلع لائل پور
۲۱. محمد عبد الصمد صاحب بزمی اہین گنج نمبر ۵ کانپور
۲۲. ملک حامد حسین صاحب معرفت ملک زاہد حسین صاحب ادریس گنج ہردوئی
۲۳. سید منظر علی صاحب رضوی گلی باریان گندہ نالہ بریلی
۲۴. مولوی انوار احمد صاحب کلرک کانفرنس آفس علی گڈھ
۲۵. سید شوکت حسین صاحب کاظمی میونسپل کمشنر بیرون دروازہ سانگانیر جے پور
۲۶. محمد نعمت خاں صاحب دفتر انجمن معین الاسلام سکندرہ راؤ علی گڈھ
۲۷. محمد طاہر صاحب فرشوری ٹولہ بدایوں
۲۸. ریاض احمد صاحب قریشی انبالوی بی اے نور منزل گوڑگانوہ چھاونی

۲۹۔ شیخ محمد یوسف صاحب ہلٹن روڈ لاجنرل جاج نون پوسٹ آفس الہ آباد

۳۰۔ مولوی محمد علی صاحب زمیندار گوٹھ ویرا ڈاکخانہ خیبر پور ناتھن شاہ ضلع لاڑکانہ سندھ

۳۱۔ سید نائب حسین صاحب سب اورسیر بن بسا ڈاکخانہ ٹنک پور منڈی ضلع نینی تال

۳۲۔ منشی عبدالمجید خاں صاحب پوٹری ڈاکخانہ جانی ضلع میرٹھ

۳۳۔ مولوی حاجی سر رحیم بخش صاحب کے۔سی۔آئی۔ای پریسیڈنٹ ریاست بھاول پور

۳۴۔ حکیم عبدالعزیز صاحب مالک شفاخانہ ہمدرد دہلیاب دہلی دروازہ لاہور

۳۵۔ محمد فیاض عالم صاحب منیجر علی جان فلورمل حمیدیہ بازار سنبھل ضلع مرادآباد

۲۲۔ **تعلیمی بیمہ** تعلیمی بیمہ ایک اور شاخ ہے جس کے ذریعہ سے بچوں کی تعلیم کا انتظام مقصود ہے ظاہر ہے کہ والدین چاہے کیسا ہی گراں قدر ورثہ چھوڑیں اگر اولاد تعلیم یافتہ نہیں تو ورثہ بڑھنا کیا معنی محفوظ رہنا بھی مشکل ہے حقیقت میں اگر کوئی چیز دنیا میں دولت زر کی پکی محافظ ہے تو وہ دولت علم ہی ہے یہی اس کو چشمہ زائندہ اور دولت پائندہ بنا سکتا ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ اثاثہ فراہم کرنے سے پہلے اولاد کو تعلیم دیں کانفرنس ان کو اس حد تک مدد دے گی کہ اگر وہ اولاد کے لیئے بچپن ہی سے تھوڑا تھوڑا ماہوار جمع کرنا چاہیں یا کسی معتبر کمپنی میں تعلیمی بیمہ کرانا چاہیں تو انہیں ہر قسم کی مدد دی جائے گی۔ اگر کانفرنس امین قرار پائے گی تو وہ اس ذخیرہ کو والدین کی ہدایت کے موافق بچے کی تعلیم پر ماہوار خرچ کرے گی ورنہ ششماہی وار کمپنی سے خرچ کرائے گی۔ تھوڑا تھوڑا روپیہ ماہوار اقساط کی صورت میں دینا والدین کو ناگوار نہ ہوگا اور نہ والدین کی وفات یا تعطل سے اس ماہواری امداد پر کچھ اثر پڑے گا۔ کانفرنس نے اپنے طور پر ایک معتبر کمپنی کو اس کام ۔ ۔ حب کر لیا ہے۔

۲۳۔ **جدید انتظامات دفتر** رپورٹ ختم کرنے سے قبل چند الفاظ میں دفتر کے جدید انتظامات کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں مسلم یونیورسٹی قایم ہونے سے قبل محمڈن کالج کا آنریری سکریٹری بہ اعتبار عہدے کے کانفرنس کا آنریری سکریٹری تھا۔ اس کا ایک جوائنٹ سکریٹری ہوتا تھا جس کے ہاتھ میں کانفرنس کا دفتر اور اس کے عملی کام رہتے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی قایم ہوگئی۔ تو امراؤتی کے اجلاس کانفرنس

میں کانفرنس کے قانون کی تمام ترمیمات کے ساتھ یہ تبدیلی کی گئی کہ مسلم یونیورسٹی کا وایس چانسلر کانفرنس کا پریسیڈنٹ قرار دیا گیا۔ اور اس کو ایک خاص اختیار دیا گیا کہ سکریٹری کانفرنس کے اُمیدواروں میں سے جس کو اس عہدے کے لیئے مناسب نہ سمجھے اس کا نام ایجنڈے میں سے خارج کر دے۔ پریسیڈنٹ کے بعد آنریری سکریٹری اور جائنٹ سکریٹری ہیں جن میں سے اول الذکر پر میرا تقرر ہوا۔ میں چونکہ حیدرآباد رہتا ہوں اس لیئے میں نے دفتر کی نگرانی کے لیئے مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں سید طفیل احمد صاحب کو جائنٹ سکریٹری کے عہدے کے لیئے نامزد کر کے آل انڈیا کانفرنس کمیٹی سے اس کی منظوری حاصل کی۔ اُسی کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر خان صاحب میر ولایت حسین صاحب۔ بی اے سابق سکنڈ ماسٹر کالجیٹ اسکول علی گڑھ کا تقرر کیا گیا جن کا تعلیمی تجربہ مسلم ہے۔ ان کی نگرانی میں دفتر کا کام عمدگی سے چل رہا ہے۔ اسی سال میں لٹریری اسسٹنٹ کے عہدے پر جو عرصہ سے خالی تھا مولوی حامد علی صاحب صدیقی کا تقرر کیا گیا جو صاحب تصنیف ہیں اور جنھوں نے سب سے اول گزشتہ بیس سال کے تعلیمی نقشوں کو مرتب و مکمل کیا ہے اور اب دفتر میں گزشتہ ۴۳ سال کے تعلیمی نقشے بہمہ وجوہ مرتب و مکمل ہوگئے۔ لائبریری کی عام نگرانی صدیقی صاحب کو دیکر لائبریرین کے عہدہ پر ایک عارضی تقرر کیا گیا اور چار عارضی سفیر مقرر کیئے گئے۔

سالانہ رپورٹ مدرسۃ الافاغنہ قصبہ سہاور ضلع ایٹہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

۱۰ر جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو ایک اُستاد کی نگرانی میں ابتدائی درجات انجمن حمایت الاسلام کے نصاب کی پابندی کے ساتھ قایم کیئے گئے جن میں علاوہ دیگر مضامین کے تعلیم دینیات کو لازمی رکھا گیا اور تعلیم انگریزی بھی دی جانے لگی ماہ فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں انگریزی تعلیم کے واسطے ایک اُستاد کا اور اضافہ ہوا جون سنہ ۱۹۲۰ء میں بوجہ کثرت طلباء حساب کی تعلیم کے

واسطے اُستاد سوم کا اور تقرر کیا گیا۔ شروع سیشن ماہ جولائی سے باقاعدہ پانچ درجے قائم کیئے گئے اور ابتدائی درجہ دو سیکشنوں میں ترتیب پا گیا علاوہ تعلیم دینیات ضروری ہونے کے الہ آباد یونیورسٹی کے نصاب کی پورے طور سے پابندی کی گئی۔ مدرسہ ہنوز پانچ درجات سے زائد قائم نہیں کرسکا ہو۔ اسکول کے اسٹاف میں تین اساتذہ اور ایک چپراسی شامل ہیں جس کا ماہواری ضروری خرچ مبلغ [illegible] ہو۔

مدرسہ ہذا میں بلاقیود مذہب تعلیم دی جاتی ہو۔

مدرسہ ہنوز ایک کرایہ کے مکان میں ہو اور مدرسہ کی ایک علحدہ عمارت قصبہ مذکور سے ملحق بلحاظ آب وہوا ایک عمدہ مقام پر زیر تعمیر ہو جو بوجہ کمی سرمایہ انجمن تکمیل کو ابتک نہیں پہونچ سکی اور جس میں ایک رقم کثیر صرف ہوچکی ہو۔

مدرسہ میں اُن قواعد وضوابط کی پابندی کی جاتی ہو جن کو کمیٹی انتظامیہ انجمن افاغنہ منظور کرتی ہو۔ تین امتحانات سالانہ ہوچکے ہیں جن میں اوسط کامیابی طلبا ۵۰ فی صدی سے زائد رہا اور اوسط حاضری طلبا ہرسہ سال تقریبًا ۵۰ فی صدی ہو۔

رجسٹر حاضری و داخلہ وخارجہ وسارٹیفکیٹ وغیرہ میں ہر طالب علم کی باقاعدہ خانہ پری اور عملدرآمد ہوتا ہو طلبا کی سہولیت اور انجمن کے فائدہ کی غرض سے کتب کورس طلبائے مدرسہ کو بہم پہونچائی جاتی ہیں جن کا منافع انجمن کے فنڈ میں جمع کردیا جاتا ہو۔

مدرسہ میں تمام سامان ضروری (فرنیچر) مہیا اور موجود ہو۔

تعداد طلبا بحالت موجودہ ۵۶ ہو۔

نقشہ تعداد طلبا مندرجہ رجسٹر ہرسہ سال حسب تفصیل ذیل ہو

۲۰-۱۹۱۹ء	۵۴	۲۱-۱۹۲۰ء	۵۵	۲۲-۱۹۲۱ء	۵۶

ان صاحبان کے اسمائے گرامی جنھوں نے بڑی رقوم عطیات مدرسہ کو مرحمت فرمائی ہیں ذیل میں درج ہیں۔

۱. آنریبل نواب خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب [illegible]

۲. مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد دکن۔ [illegible]

۳۔ مولوی محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب رئیس حبیب گنج [illegible]

۴۔ محمد عمر خاں صاحب رئیس بھیکم پور۔ [illegible]

۵۔ خان بہادر محمد ابوبکر خاں صاحب رئیس دادوں [illegible]

۶۔ حاجی غلام محمد خاں صاحب رئیس موہن پور [illegible]

(دستخط) چودھری احمد اللہ خاں سکرٹیری مدرسہ افاغنہ سہاور ضلع ایٹہ۔

انجمن معین الطلبہ بلند شہر

اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں ایک یا چند انگریزی اسکول۔ سرکاری یا دوسری قوموں کے موجود ہیں اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت اس قابل نہیں کہ اپنا جداگانہ اسکول کھول سکیں۔ ایسے مقامات کے لیئے ضرورت ہی کہ مسلمان اپنی ایک انجمن بنا کر مقامی طلبا کو کوشش کر کے سرکاری اور دیگر مدارس میں داخل کرائیں اور نادار طلبا کی فیس اور کتابوں کا انتظام کریں۔ اس نمونہ پر عرصہ چار سال سے انجمن معین الطلبہ قایم ہی جو اپنا کام عمدگی سے کر رہی ہی۔ اس انجمن کے سکرٹیری محمد عبد الغنی صاحب مختار عدالت بلند شہر نے اپنے چار سال کے کام کی ایک رپورٹ بھیجی ہی جس کا خلاصہ حسب ذیل نقشہ سے معلوم ہوگا۔

سال	آمدنی	صرف	تعداد طلبا جن کو امداد دی گئی۔		
			مدارس انگریزی	مدارس اردو و عربی	میزان
سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء	[illegible]	[illegible]	۹	۱۴	۲۳
سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء	[illegible]	[illegible]	۲۸	۳۰	۵۸
سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء	[illegible]	[illegible]	۳۰	۲۳	۵۲
سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء	[illegible]	[illegible]	۲۶	۱۵	۴۱
میزان	[illegible]	[illegible]	۹۳	۸۲	۱۷۵

(۱) اس نقشہ کے خانہ نمبر ۲ میں جو صرف دکھایا گیا ہو اُس میں چھپائی رپورٹ سالانہ۔ صرفہ ڈاک خرچ دفتر وغیرہ بھی شامل ہی۔

(۲) تاہم چار سال میں ۱۰۱۵ روپیہ میں ۱۰۵ طلبا نے تعلیم پائی۔ اس حساب سے فی طالب علم صرف ایک روپیہ ماہوار خرچ پڑتا ہی جو نہایت کم ہی۔

(۳) جن طلبار کو امداد دی گئی اُن میں سے پانچ لڑکوں نے اسکول لیونگ پاس کیا اور کئی طالب علم اس سال اسکول لیونگ میں پڑھ رہے ہیں۔ انجمن سے امداد پانے والے طلبا میں ایسی مثالیں موجود ہیں جو بوجہ تنگ دستی کے کسی طرح تعلیم نہ پاسکتے تھے اگر انجمن معین الطلبہ اُن کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہ کرتی۔

غرضکہ یہ نہایت ہی مفید اور ارزاں طریقہ مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کا ہی جو صاحب اپنے مقامات پر اس کو رائج کرنا چاہیں وہ سکرٹیری صاحب معین الطلبہ بلند شہر سے یا کانفرنس سے مفصل حالات دریافت فرمائیں۔

نقشہ صوبہ وار نمبر دوم

نتائج تعلیم یونیورسٹی ہائے ہند بہ تناسب ہندو و مسلمانان من ابتدا ۱۹۰۱ء لغایت ۱۹۲۰ء بحساب قرن پنجسالہ

نام یونیورسٹی	تفصیل دوران	علوم عامہ: تعداد ڈگری یافتگان ہندو	علوم عامہ: تعداد ڈگری یافتگان مسلمان	علوم عامہ: فیصدی نسبت مسلمانان	سائنس: ہندو	سائنس: مسلمان	سائنس: فیصدی	قانون: ہندو	قانون: مسلمان	قانون: فیصدی	طب: ہندو	طب: مسلمان	طب: فیصدی	انجینئرنگ: ہندو	انجینئرنگ: مسلمان	انجینئرنگ: فیصدی	میزان: ہندو	میزان: مسلمان	میزان: فیصدی	میزان بست سال: ہندو	میزان بست سال: مسلمان	کیفیت
پنجاب	۱۹۰۱ — ۵	۵۵۶	۱۶۲	۲۲ر۶	۹	۰	۰	۸۲	۱۲	۱۲ر۸	۷۱	۱۰	۱۲ر۳	۰	۰	۰	۷۱۸	۱۹۴	۲۱ر۲	۶۳۵۱	۱۵۹۱	
	۱۹۰۶ — ۱۰	۵۳۳	۱۶۹	۲۴	۳۱	۳	۸ر۸	۱۵۸	۲۱	۱۱ر۷	۵۱	۲	۳ر۸	۰	۰	۰	۷۷۳	۱۹۵	۲۰ر۱			
	۱۹۱۱ — ۱۵	۷۱۰	۲۱۳	۲۳	۱۰۵	۱۵	۱۲ر۵	۲۷۷	۶۵	۱۹	۷۵	۱۳	۱۵	۰	۰	۰	۱۱۶۷	۳۰۶	۲۰ر۸			
	۱۹۱۶ — ۲۰	۲۷۵۱	۷۳۲	۲۱	۳۴۳	۵۲	۱۰ر۶	۵۹۸	۹۳	۱۳ر۴	۱۲۲	۱۸	۱۳	۰	۰	۰	۳۷۸۴	۸۹۶	۱۹ر۱			
الٰہ آباد	۱۹۰۱ — ۵	۴۶۳	۱۴۷	۲۴	۲۷	۵	۱۵ر۶	۷۵	۱۹	۲۰ر۲	۰	۰	۰	۳۲	۲	۶	۵۹۷	۱۷۳	۲۲ر۵	۶۹۴۵	۱۹۱۷	
	۱۹۰۶ — ۱۰	۶۷۴	۲۷۰	۲۹	۱۳۱	۳	۲ر۲	۱۶۴	۳۶	۱۸	۰	۰	۰	۶۹	۶	۸	۱۰۳۸	۳۱۵	۲۳ر۳			
	۱۹۱۱ — ۱۵	۹۸۷	۴۷۷	۳۲ر۶	۳۱۱	۳۸	۱۰ر۹	۴۱۴	۱۷۵	۳۱ر۲	۰	۰	۰	۹۵	۹	۱۲ر۲	۱۹۷۷	۶۹۹	۲۳			
	۱۹۱۶ — ۲۰	۱۴۴۹	۷۱۵	۳۳ر۲	۴۳۳	۲۲	۴ر۸	۹۹۵	۲۴۴	۲۱	۹۷	۹	۸ر۵	۴۰	۱۰	۸	۳۳۳۴	۹۴۰	۲۲ر۵			

اس نقشہ کا سلسلہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو۔

تمہ نقشہ صوبہ وار نمبر دوم بہ سلسلہ صفحہ ۳۱

کلکتہ	۱۹۰۱ — ۵	۱۹۵۶	۱۴۰	۴٫۱	۳۲۴	۲۲	۶٫۳	۱۰۹۲	۳۰	۳٫۵	۳۲۱	۹	۲٫۷	۴۳	۳	۶٫۵	۳۷۲۶	۳۲۴	۵٫۷	۲۶۵۳۴	۱۶۷۷	[illegible]
	۱۹۰۶ — ۱۰	۲۲۹۴	۱۴۳	۶٫۵	۲۱۸	۸	۳٫۵	۹۱۰	۲۷	۲٫۹	۲٫۵	۱۳	۳	۷۵	۰	۰	۳۰۱۰	۲۲۲	۵٫۲			
	۱۹۱۱ — ۱۵	۳۹۹۶	۳۰٫۴	۴٫۲	۹۷۲	۳۳	۳٫۳	۱۱۱۲	۵۰	۴٫۳	۲۲۱	۱	۱٫۵	۵۳	۶	۳٫۶	۹۳۰۹	۳۹۰	۵٫۰			
	۱۹۱۶ — ۲۰	۹۰۷۰	۸۰۱	۸٫۱	۱۳۹۸	۳۹	۲٫۶	۲۳۱۰	۱۰۷	۴٫۲	۳۷۶	۳	۱٫۶	۶۰	۲	۳٫۲	۱۳۳۵۳	۹۵۲	۶٫۶			
مدراس	۱۹۰۱ — ۵	۲۱۸۷	۳۵	۱٫۶	۰	۰	۰	۷۰۷	۲	۱٫۳	۱۲	۰	۰	۲۸	۰	۰	۱۹۳۳	۳۷	۱٫۲	۱۳۶۳۶	۷۸۸	
	۱۹۰۶ — ۱۰	۳۶۰۳	۴۰	۱٫۵	۰	۰	۰	۶۱۳	۵	۱٫۸	۳۹	۱	۲٫۵	۲۲	۰	–	۳۲۴۰	۳۶	۱٫۳			
	۱۹۱۱ — ۱۵	۳۲۰۳	۴۵	۱٫۴	۰	۰	۰	۷۹۳	۳	۱٫۴	۹۷	۳	۳	۲۶	۰	۰	۴۱۲۰	۵۱	۱٫۲			
	۱۹۱۶ — ۲۰	۳۲۷۰	۸۰	۲٫۵	۰	۰	۰	۱۰۵۸	۱۲	۱٫۱	۱۲۰	۱	۱٫۸	۶۳	۱	۱٫۵	۳۳۱۳	۹۳	۲٫۱			
بمبئی	۱۹۰۱ — ۵	۱۰۵۲	۳۵	۳٫۵	۱۷	۰	۰	۳۷۶	۱۱	۳	۸۳	۱۲	۱٫۳	۰	۰	۰	۱۵۲۹	۶۱	۳٫۸	۱۰۵۰۱	۸۰۲	
	۱۹۰۶ — ۱۰	۱۳۴۳	۵۳	۳٫۸	۳۶	۱	۲٫۷	۴۹۰	۱۳	۲٫۸	۱۳۵	۱۰	۷	۰	۰	۰	۲۰۲۳	۷۸	۳٫۷			
	۱۹۱۱ — ۱۵	۱۸۶۷	۷۷	۴	۹۳	۰	۰	۶۹۱	۲۳	۳٫۳	۷۹	۷	۱	۶۲	۳	۴٫۶	۲۷۹۳	۱۱۱	۳٫۸			
	۱۹۱۶ — ۲۰	۲۷۳۲	۱۰۰	۳٫۵	۱۸۲	۴	۲٫۲	۹۲۸	۳۰	۳٫۱	۲۱۰	۱۳	۶	۱۵۳	۵	۳٫۳	۴۲۱۶	۱۵۲	۳٫۵			
میزان از سنہ ۱۹۰۱ تا ۲۰ ع		۴۳۹۶۸	۳۶۹۲	۸	۳۷۰۱	۲۶۵	۵٫۳	۱۳۱۱۳	۱۰۰۱	۶٫۶	۲۵۲۵	۱۲۵	۵	۸۲۴	۴۳	۵	۶۶۰۴۱	۶۱۲۶	۸٫۵			

نقشہ قرن وار نمبر سوم

نتائج تعلیم علوم وفنون جملہ یونیورسٹی ہائے ہند بہ تناسب ہندو مسلمانان از ۱۹۰۱ء لغایتہ سنہ ۱۹۲۰ء بالقرون پنجسالہ

تفصیل قرن پنجسالہ	علوم عامہ				سائنس				قانون				طب				انجینیرنگ				میزان				کیفیت
	تعداد ڈگری یافتگان		نسبت فیصدی باہمی		تعداد ڈگری یافتگان		نسبت فیصدی باہمی		تعداد ڈگری یافتگان		نسبت فیصدی باہمی		تعداد ڈگری یافتگان		نسبت فیصدی باہمی		تعداد ڈگری یافتگان		نسبت فیصدی باہمی		تعداد ڈگری یافتگان		نسبت فیصدی باہمی		
	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	
سنہ ۱۹۰۱–۰۵	۴۳۱۴	۵۲۲	۹۲	۸	۳۶۶	۲۶	۹۳.۳۴	۶.۶۶	۲۳۴۴	۸۲	۹۶.۱۵	۳.۸۵	۲۸۵	۳۱	۹۴	۶	۱۰۴	۵	۹۵.۴۲	۴.۵۸	۹۵۱۲	۷۸۹	۹۲.۳۴	۷.۶۶	
سنہ ۱۹۰۶–۱۰	۶۴۴۵	۶۰۹	۹۱.۵۴	۸.۴۶	۳۱۴	۱۵	۹۵.۴۵	۴.۵۵	۲۳۴۵	۱۰۳	۹۵.۸۵	۴.۱۵	۵۲۰	۲۴	۹۵.۶۴	۴.۳۶	۱۴۸	۴	۹۷.۳۷	۲.۶۳	۱۱۱۴۲	۸۵۴	۹۲.۸۹	۷.۱۱	
سنہ ۱۹۱۱–۱۵	۱۰۶۱۴	۱۱۱۴	۹۰.۵۴	۹.۴۶	۱۲۸۲	۸۴	۹۴.۸۵	۵.۱۵	۳۳۸۶	۳۰۶	۹۱.۶۹	۸.۳۱	۳۶۲	۲۴	۹۳.۶۴	۶.۳۶	۴۰۴	۱۲	۹۷.۱۲	۲.۸۸	۱۴۲۴۳	۱۵۸۶	۹۱.۲۴	۸.۷۶	
سنہ ۱۹۱۶–۲۰	۱۹۳۸۳	۲۳۳۵	۸۹.۴۲	۱۰.۵۸	۲۲۲۴	۱۳۶	۹۳.۷۶	۶.۲۴	۵۹۵۹	۵۰۶	۹۲.۱۴	۷.۸۶	۱۰۲۵	۳۳	۹۵.۶۹	۴.۳۱	۳۸۶	۱۸	۹۵.۶۱	۴.۳۹	۲۴۹۰۲	۲۴۳۳	۹۰.۱۵	۹.۸۵	
میزان نسبت سال گذشتہ	۳۳۸۸۳	۳۶۹۲	۹۰.۳۴	۹.۶۶	۱۶۰۱	۲۴۵	۹۳.۷۶	۶.۲۴	۱۲۱۱۴	۱۰۱	۹۳.۳۲	۶.۶۸	۲۵۲۵	۱۲۵	۹۵.۵۲	۴.۴۸	۸۲۳	۳۴	۹۵	۵	۴۴۰۱۳	۴۱۲۴	۹۱.۱۵	۸.۸۵	
میزان نسبت حال	۱۹۳۸۴	۲۴۴	۹۸.۴۶	۱.۵۴	۲۷۲	۰	۱۰۰	۰	۵۳۸۸	۳۴۰	۹۴.۰۴	۵.۹۶	۱۳۲۵	۵۳	۹۶.۴۳	۳.۵۷	۳۵۶	۱۰	۹۷.۲۴	۲.۷۶	۱۴۹۴۵	۵۸۹	۹۶.۲۸	۳.۷۲	

نقشہ قرون و امتناسبہ نمبر ششم

خلاصہ نتائج تعلیم انگریزی از آغاز سنہ ۱۸۵۸ء لغایت سنہ ۱۹۲۰ء مدت ۶۳ سال

تفصیل قرون ہائے تعلیم انگریزی از سنہ ۱۸۵۸ء لغایت سنہ ۱۹۲۰ء مدت ۶۳ سال	تفصیل علوم و فنون جن میں ڈگریاں حاصل کیں معہ تعداد ڈگری یافتگان بہ تناسب ہندو و مسلمانان بقرون پنج سالہ																	
	علوم عامہ			سائنس			قانون			طب			انجینئرنگ			میزان		
	ہندو	مسلمان	میزان	ہندو	مسلمان	میزان	ہندو	مسلمان	میزان	ہندو	مسلمان	میزان	ہندو	مسلمان	میزان	ہندو	مسلمان	میزان
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹
سنہ ۱۸۵۸ء لغایت سنہ ۱۸۸۰ء مدت ۲۳ سال	۲۳۵۶	۴۰	۲۳۹۶	۰	۰	۰	۹۳۳	۱۳	۹۴۶	۴۶۳	۱۳	۴۷۶	۱۴۰	۰	۱۴۰	۳۸۹۲	۶۶	۳۹۵۸
سنہ ۱۸۸۱ء لغایت سنہ ۱۹۰۰ء مدت ۲۰ سال	۱۶۰۰۰	۹۶۵	۱۶۹۶۵	۸۴	۰	۸۴	۴۷۶۳	۲۲۲	۴۹۸۵	۱۱۳۶	۴۴	۱۱۸۰	۹۰۶	۶	۹۱۲	۲۲۵۹۱	۱۲۳۷	۲۳۸۲۸
سنہ ۱۹۰۱ء لغایت سنہ ۱۹۲۰ء مدت ۲۰ سال	۲۲۸۶۸	۴۶۹۲	۲۷۵۶۰	۴۷۰۱	۲۴۵	۴۹۴۶	۱۴۱۱۳	۱۰۰۱	۱۵۱۱۴	۲۵۲۵	۱۲۵	۲۶۵۰	۸۲۲	۴۴	۸۶۶	۴۴۰۲۱	۹۱۲۴	۵۳۱۴۵

بیلنس شیٹ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ ۲۱-۱۹۲۰ء

نمبر سلسلہ	آمدنی	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	میزان روپیہ
۱	باقیات لغایۃ آخر مارچ ۱۹۲۰ء سیٹھ موسیٰ وظیفہ فنڈ	۰	۸	۳۶۲۶			
	امانت قیمت تاریخ التعلیم	۰	۴	۴۰			
	متفرق	۰	۳	۷			
	کانفرنس فنڈ	۴	۵	۱۰۵۱۸	۴	۴	۱۴۱۹۲
۲	گرانٹ						
	۱. گورنمنٹ نظام	۰	۶	۵۹۸۷			
	۲. ریاست بھوپال	۰	۰	۲۲۰۰			
	۳. ریاست بھاولپور	۰	۰	۱۲۰۰			
	۴. ریاست محمود آباد	۰	۰	۹۰۰			
	۵. خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور ضلع علی گڈھ	۰	۰	۳۰۰	۰	۶	۱۰۵۸۷
۳	چندہ کانفرنس ۱۹۱۷ء	۰	۰	۱۰			
	" " ۱۹۱۸ء	۳	۷	۱۳۶			
	" " ۱۹۱۹ء	۰	۰	۳۲۷۰			
	" " ۱۹۲۰ء	۹	۱۱	۱۲۷۰	۰	۳	۴۶۸۷
۴	چندہ لائف ممبری کانفرنس				۰	۰	۱۲۵
۵	چندہ وظایف				۰	۰	۱
۶	عطیہ سیٹھ حاجی صالح بھائی صاحب بمبئی (وظایف)				۰	۰	۴۰۰۰

بیلنس شیٹ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ بابت سنہ ۱۹۰۲ء

نمبر سلسلہ	خرچ	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	میزان روپیہ
۱	عملہ دفتر کانفرنس						
	۱۔ تنخواہ	۴	۲	۴۲۸۳			
	۲۔ بونس	۱۰	۱۰	۳۰۰			
	۳۔ الاونس	۰	۰	۳۲	۲	۱۳	۴۶۱۵
۲	معاوضہ بونس خدمات دیرینہ منشی محمد نجم الدین صاحب				۰	۰	۶۵
۳	مستقل سفیران کانفرنس						
	۱۔ تنخواہ	۸	۴	۹۶۱			
	۲۔ بونس	۴	۱۵	۷۵			
	۳۔ الاونس	۰	۳	۱۸۳			
	۴۔ سفرخرچ	۹	۶	۲۲۳			
	۵۔ سائرخرچ	۹	۹	۱۴	۶	۷	۱۴۵۸
۴	عارضی سفیران کانفرنس						
	۱۔ الاونس	۶	۰	۵۴			
	۲۔ سفرخرچ	۰	۵	۲۵۹			
	۳۔ سائرخرچ	۰	۳	۱۳	۶	۸	۳۲۶
۵	سائرخرچ کانفرنس آفس						
	۱۔ ڈاک	۳	۴	۱۴۶			
	۲۔ تاربرقیات	۰	۶	۹۵			
	۳۔ اسٹیشنری	۰	۱	۱۲۵			

نمبر سلسلہ	آمدنی	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
۷	چندہ سوانح نگاری اکابر قوم				۰	۰	۱۷۵
۸	منافع سرمایہ ـــ کانفرنس فنڈ (وارلون)	۰	۹	۱۶۴			
	" " ـــ " "	۶	۲	۳۷	۶	۱۱	۲۰۱
۹	" " ـــ لیف ممبری کانفرنس				۶	۱۵	۴۱۰
۱۰	سیٹھ موسیٰ وظیفہ فنڈ						
	۱- منافع نکسٹ ڈپازٹ ـــ	۶	۱۳	۱۹۹			
	۲- واپسی رقم وظیفہ از طلبہ	۰	۰	۲۴۰	۶	۱۳	۴۳۹
۱۱	واپسی رقم وظیفہ از طلبہ باقی داران کانفرنس				۰	۱۵	۱۸۰۸
۱۲	واپسی کمیشن وی پی				۰	۷	۶
۱۳	آمدنی کاشت				۰	۷	۱۳
۱۴	کانفرنس گزٹ				۶	۱	۵۵۷
۱۵	قیمت مطبوعات کانفرنس				۶	۸	۳۱
۱۶	وصول از مولوی محمود احمد صاحب منجملہ قرضہ				۰	۰	۹۰
۱۷	امانت قیمت تاریخ التعلیم	۰	۰	۷			
	" متفرق	۰	۰	۱۱			
۱۸	رقومات پیشگی				۹	۶	۱۲۰۰
۱۹	قیمت کنکریٹ				۰	۰	۵۸
۲۰	واپسی تنخواہ عملہ دفتر				۰	۰	۴
۲۱	واپسی الاونس سفیران مستقل				۷	۳	۳
۲۲	" تنخواہ کمیو باغ				۷	۲	۷
۲۳	رقم بونس اہلکاران مستعفی				۴	۷	۴۷

نمبر سلسلہ	خرچ	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
	۴۔ متفرق سائر خرچ	۶	۱	۶۴	۹	۱۲	۴۰۰
۶	وظائف کانفرنس فنڈ				۰	۰	۳۰۲۵
۷	امداد تعلیمی				۰	۰	۱۶۰
۸	وظیفہ مولوی محمود احمد صاحب برائے تعلیم انگلستان				۰	۰	۵۰۰
۹	وظائف سیٹھ یوسنی فنڈ				۰	۰	۳۱۰۰
۱۰	سفر خرچ علما وغیرہ شرکت اجلاس کانفرنس				۶	۱۲	[illegible]
۱۱	" عہدہ داران کانفرنس متعلق انتظامات اجلاس کانفرنس				۳	۱۲	۲۸۴
۱۲	اخراجات طبع رپورٹ کانفرنس				۰	۸	۱۳۱
۱۳	" طبع کاغذات متفرق				۶	۳	۱۶۳
۱۴	" طبع کتب (مطبوعات کانفرنس)				۰	۸	۳۵۳
۱۵	سفر خرچ عہدہ داران کانفرنس متعلق انتظام لیڈیز کانفرنس				۶	۱۳	۶۲
۱۶	چندہ اخبارات و رسائل تعلیمی				۰	۱۰	۸۶
۱۷	امداد اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ				۰	۰	۲۵۰
۱۸	اخراجات معائنہ مدارس اسلامی				۶		۵۹
۱۹	خرید کتب برائے مدارس اسلامی				۰	۱۳	۲۳۸
۲۰	امداد فیمیل سیکشن کانفرنس				۰	۰	۲۵۰
۲۱	باغ سلطان جہاں منزل						
	۱۔ تنخواہ مالی وغیرہ	۲	۰	۱۳۴۰			
	۲۔ اخراجات متعلق نرگاوان	۶	۱	۱۳۴			
	۳۔ خرید گملہ جات و درختان وغیرہ	۹	۱۴	۳۸			
	۴۔ متفرق اخراجات باغ	۳	۴	۵۲	۸	۴	۵۶۵

نمبر سلسلہ	آمدنی	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
۲۴	متفرق				۰	۰	۲۰
	میزان آمدنی از اپریل ۱۹۲۰ء لغایتہ مارچ ۱۹۲۱ء				۹	۱۲	۲۴۳۰۰
	بقایات سال گزشتہ				۴	۴	۱۴۱۹۲
	میزان کل				۱	۱	۳۸۴۹۳

نمبر سلسلہ	خرچ	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
۲۲	اخراجات کاشت				۰	۱	۸
۲۳	خرید کتب برائے لائبریری کانفرنس				۰	۸	۳۸
۲۴	اخراجات متعلق کانفرنس گزٹ				۳	۵	۱۰۱۲
۲۵	مرمت عمارات				۹	۱۴	۱۷۰
۲۶	واپسی امانت						
	۱۔ قیمت تاریخ التعلیم	۰	۴	۴۷			
	۲۔ متفرق	۰	۰	۶	۰	۴	۵۳
۲۷	اخراجات متعلق حصول کتب قدیمہ				۰	۰	۱۰۰
۲۸	" سوانح نگاری اکابر قوم				۰	۸	۵۵۲
۲۹	رقومات پیشگی				۰	۰	۱۱۵۰
۳۰	کمیشن فروخت کتب (مطبوعات کانفرنس)				۰	۱۰	۲
۳۱	امداد اسپیشل کمیٹی کانفرنس امراوتی				۰	۰	۵۰۰
۳۲	متفرق اخراجات متعلق اجلاس کانفرنس امراوتی				۰	۱۳	۴۹
۳۳	خریدوار لون سرمایہ				۱۰	۰	۴۸۸۸
۳۴	کمیشن بنک متعلق چندہ کانفرنس ۱۹۱۹ء	۰	۹	۷			
	" متعلق عطیہ حاجی صالح بھائی صاحب	۰	۰	۱۰			
	متفرق	۰	۱۴	۱۹	۰	۷	۳۶
	میزان اخراجات اپریل ۱۹۲۰ء لغایت مارچ ۱۹۲۱ء				۵	۶	۲۵۰۵۰
	باقی لغایت آخر مارچ ۱۹۲۱ء				۸	۱۰	۱۳۴۴۲
				میزان کل	۱	۱	۳۸۴۹۳

بیلنس شیٹ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء

نمبر سلسلہ	آمدنی	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	میزان روپیہ
۱	باقیات لغایۃ آخر مارچ سنہ ۱۹۲۱ء سیٹھ موسیٰ وظیفہ فنڈ	۰	۸	۸۶۶			
	امانت	۰	۳	۱۲			
	کانفرنس فنڈ	۸	۱۵	۱۲۶۶۳	۸	۱۰	۱۳۴۴۲
۲	گرانٹ						
	۱۔ گورنمنٹ نظام	۰	۶	۵۹۸۷			
	۲۔ ریاست بہاول پور	۰	۰	۱۲۰۰			
	۳۔ ریاست محمود آباد	۰	۰	۶۰۰			
	۴۔ نواب زادہ حاجی حافظ جنرل عبید اللہ خاں بہادر بھوپال	۰	۶	۳۳۳۳	۰	۱۲	۸۱۲۰
۳	چندہ کانفرنس سنہ ۱۹۱۹ء	۰	۰	۴۰			
	〃 〃 سنہ ۱۹۲۰ء	۰	۰	۲۶۸			
	〃 〃 سنہ ۱۹۲۱ء	۰	۰	۳۵۵	۰	۰	۶۶۳
۴	چندہ لائف ممبری کانفرنس				۰	۰	۱۲۵
۵	چندہ وظائف				۰	۸	
۶	چندہ سوانح نگاری اکابر قوم				۰	۰	۲۵۰
۷	منافع سرمایہ سمہ کانفرنس فنڈ	۰	۳	۳۲۹			
	〃 صہ	۰	۴	۱۶۶			
	〃 رقم جو وظیفہ سیٹھ موسیٰ فنڈ میں کانفرنس فنڈ سے صرف کردی گئی تھی	۰	۰	۵۲	۰	۷	۵۴۷

بیلنس شیٹ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ ۲۲-۱۹۲۱ء

نمبر سلسلہ	خرچ	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
۱	**عملہ دفتر کانفرنس**						
	۱۔ تنخواہ	۹	۱۲	۳۰۳۷			
	۲۔ بونس	۰	۸	۲۱۴			
	۳۔ سفر خرچ	۰	۱۳	۵	۹	۱	۳۲۵۸
۲	معاوضہ بونس خدمات دیرینہ منشی محمد نجم الدین صاحب				۰	۰	۵۵
۳	**مستقل سفیران کانفرنس**						
	۱۔ تنخواہ	۰	۰	۷۸۶			
	۲۔ بونس	۶	۰	۵۵			
	۳۔ الاؤنس	۰	۰	۸۰	۶	۰	۹۲۱
۴	سفر خرچ عارضی سفیران کانفرنس				۰	۰	۶۴
۵	**سائر خرچ کانفرنس آفس**						
	۱۔ ڈاک	۶	۳	۱۳۴			
	۲۔ تار برقیات	۰	۳	۱۲			
	۳۔ اسٹیشنری	۰	۵	۱۳۲			
	۴۔ متفرق سائر خرچ کانفرنس آفس	۰	۲	۷۵	۹	۱۱	۳۵۳
۶	وظائف کانفرنس				۰	۰	۷۹۶
۷	وظیفہ مولوی محمود احمد صاحب برائے تعلیم انگلستان				۰	۰	۲۵۰۰
۸	وظائف سیٹھ موسیٰ فنڈ				۰	۰	۲۲۸۰
۹	طبع رپورٹ کانفرنس				۰	۰	۶۱

نمبر سلسلہ	آمدنی	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
۸	منافع سرمایہ صیغہ لیف ممبری کانفرنس				۰	۴	۱۶۶
۹	سیٹھ موسیٰ وظیفہ فنڈ						
	۱- منافع سرمایہ	۰	۰	۱۴۸			
	۲- واپس از فکسڈ ڈپازٹ			۵۰۰۰			
	۳- واپسی رقم وظیفہ از طلبہ			۲۵۵			۵۴۰۳
۱۰	وصول رقم وظیفہ از طلبہ باقی داران کانفرنس				۰	۱۱	۱۷۱۹
۱۱	واپسی کمیشن وی پی				۰	۶	۱۲
۱۲	آمدنی کاشت				۰	۰	۲۷
۱۳	کانفرنس گزٹ				۰	۱۵	۹
۱۴	قیمت مطبوعات کانفرنس				۰	۳	۷۴
۱۵	وصول قرضہ از حاجی مظہر علیم صاحب سفیر				۶	۱۵	۲
۱۶	امانت حاجی مظہر علیم صاحب				۱۱	۱	۱۲۵
۱۷	قیمت چندہ عطیۂ آنریری سکریٹری کانفرنس				۰	۰	۵۰
۱۸	قیمت سامان باقی ماندہ اجلاس کانفرنس ۱۹۱۶ء				۰	۰	۲۰
۱۹	رقم دعوت آنریری سکریٹری کانفرنس از جانب ریاست بہاولپور				۰	۰	۳۴۴
۲۰	واپسی رقم بونس سفیران برخاست شدہ				۹	۳	۲۲۱
۲۱	وصول رقم پیشگی				۰	۰	۶۰
۲۲	قیمت ردی دفتر کانفرنس				۰	۸	۱۳۷
۲۳	کرایہ مکان اسٹاف ہوس				۰	۰	۲۶
۲۴	واپسی تنخواہ کمیرہ مبلغ				۰	۱۰	۲
۲۵	" " سفیر کانفرنس				۰	۰	۹۶

نمبر سلسلہ	خرچ	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
۱۰	طبع کاغذات متفرق				۰	۱۱	۲۴
۱۱	اخراجات طبع کتب (مطبوعات کانفرنس)				۰	۶	۱
۱۲	قیمت اخبارات و رسائل تعلیمی				۰	۰	۵۸
۱۳	آڈیٹ حسابات				۳	۰	۴۲
۱۴	امداد اسلامیہ سکول اٹاوہ				۰	۰	۲۵۰
۱۵	امداد فیمل سکشن کانفرنس				۰	۰	۲۵۰
۱۶	اخراجات متعلق سوانح نگاری اکابر قوم				۶	۴	۹۰۵
۱۷	اخراجات متعلق باغ سلطان جہاں منزل						
	۱۔ تنخواہ مالی وغیرہ	۱	۹	۳۶۱			
	۲۔ اخراجات متعلق نرگاوان	۰	۱۰	۱۹۳			
	۳۔ خرید گملہ و درختان	۰	۰	۴			
	۴۔ متفرق اخراجات باغ	۵	۱۱	۹۱	۱۰	۱۴	۶۲۰
۱۸	خرید کتب برائے لائبریری کانفرنس				۰	۴	۳۶
۱۹	لگان اراضی کانفرنس (۲ سال)				۰	۰	۱۵۰
۲۰	معاوضہ دفتر چیف اکونٹنٹ مسلم یونیورسٹی				۰	۰	۱۰۰
۲۱	اخراجات متعلق کانفرنس گزٹ				۹	۵	۱۱۰
۲۲	" مرمت عمارت				۰	۵	۶۳
۲۳	" حصول کتب قدیمہ				۳	۱۴	۱۴۳
۲۴	انعام اردو خوشخطی				۰	۱۲	۷
۲۵	اخراجات ترجمہ و طبع قواعد کانفرنس				۰	۴	۹۹
۲۶	خرید آفس کلاک برائے دفتر کانفرنس				۰	۰	۳۸

نمبر سلسلہ	آمدنی	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
	میزان آمدنی اپریل ۱۹۲۱ء لغایت مارچ ۱۹۲۲ء				۲	۹	۱۸۳۶۱
	باقیات سال گزشتہ				۸	۱۰	۱۳۴۴۲
	میزان کل				۱۰	۳	۳۱۸۰۴

نمبر سلسلہ	خرچ	پائی	آنہ	روپیہ	پائی	آنہ	روپیہ
۲۷	وردی چپراسی دفتر کانفرنس				۰	۷	۱۲
۲۸	اخراجات جلد بندی کتب لائبریری کانفرنس				۹	۴	۱۲۸
۲۹	متفرق				۰	۱۵	۴۳
	میزان اخراجات اپریل ۱۹۲۱ء لغایت مارچ ۱۹۲۲ء				۱۰	۱	۱۳۴۸۸
	باقی لغایۃ آخر مارچ ۱۹۲۲ء				۰	۲	۱۸۳۱۶
	میزان کل				۱۰	۳	۳۱۸۰۴

فہرست ممبران استقبالیہ کمیٹی اجلاس ۱۹۲۲ء بمقام علی گڈھ

پریسیڈنٹ ۔ آنریبل خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب او، بی، ای رئیس بھیکم پور

ممبران

۱۔ حاجی محمد یونس خانصاحب رئیس دتاؤلی
۲۔ خانصاحب محمد یوسف خانصاحب رئیس سکندرہ راؤ
۳۔ کنور عبد السمیع خانصاحب رئیس طالب نگر
۴۔ محمد عمر خانصاحب رئیس بھیکن پور
۵۔ محمد عابد خانصاحب رئیس
۶۔ خان بہادر محمد عابد خانصاحب رئیس بھیکن پور
۷۔ خان بہادر محمد ابوبکر خانصاحب رئیس داددں
۸۔ کنور محمد عبید اللہ خانصاحب رئیس دھرمپور
۹۔ خان بہادر چودھری لیاقت علی خاں صاحب رئیس منڈو
۱۰۔ میر حکمت علی صاحب رئیس جلالی
۱۱۔ میر خورشید علی صاحب رئیس ״
۱۲۔ میر علی اکبر صاحب رئیس ״
۱۳۔ صاحبزادہ محمد حبیب الرحمن خانصاحب رئیس حبیب گنج
۱۴۔ حاجی محمد صالح خانصاحب رئیس بھیکم پور
۱۵۔ راجہ محمد اصغر علی خانصاحب رئیس اصغر آباد
۱۶۔ ممتاز الدولہ نواب محمد مکرم علی خانصاحب رئیس پہاسو
۱۷۔ نواب حافظ احمد سعید خانصاحب رئیس چھتاری
۱۸۔ محمد یوسف خانصاحب ڈپٹی کلکٹر علی گڈھ
۱۹۔ خان بہادر سید زین الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر علیگڈھ
۲۰۔ مولوی افتخار حسین صاحب ״

۲۱۔ مولوی ولایت احمد خانصاحب وکیل علی گڈھ
۲۲۔ مولوی عبد الخالق صاحب ״
۲۳۔ مولوی علی نقی صاحب ״
۲۴۔ مولوی انوار الہدیٰ صاحب ״
۲۵۔ مولوی منظور احمد صاحب ״
۲۶۔ خواجہ محمد اسحاق صاحب ״
۲۷۔ محمد ہادی صاحب ״
۲۸۔ شیخ عبد اللہ صاحب ״
۲۹۔ مسٹر مرزا قادر بخش قادر صاحب بار ایٹ لا علی گڈھ
۳۰۔ صاحبزادہ شمشاد احمد خاں صاحب ״ ״
۳۱۔ حاجی محمد یوسف خانصاحب رئیس بڑھا نبی سرائے حمان
۳۲۔ سید نثار حسین صاحب اسسٹنٹ ڈپٹی مجسٹریٹ تہر
۳۳۔ مرزا نادر حسین صاحب سب جج
۳۴۔ آغا سید علی محمد شاہ صاحب تحصیلدار
۳۵۔ امتیاز محمد خانصاحب انسپکٹر پولیس
۳۶۔ مولوی محمد احمد صاحب انصاری منصف
۳۷۔ مولوی محمد عاقب صاحب نعمانی منصف
۳۸۔ عصمت اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل
۳۹۔ سید ظل الرحمن صاحب وکیل
۴۰۔ خواجہ عبد العلی صاحب ریٹائرڈ سب جج

سلسلہ رُوئداد اجلاس کانفرنس

منعقدہ بماہ دسمبر ۱۹۲۲ء

نمبر ۱۔ مکمل کیفیت اجلاس معہ تجاویز منظور شدہ قیمت ۴؍

نمبر ۲۔ خطبہ صدارت (از آنریبل میاں محمد فضل حسین وزیر تعلیمات پنجاب) قیمت ۴؍

نمبر ۳۔ مرقعہ تعلیم یعنی روئداد عمل کانفرنس بابت ۲۲-۱۹۲۱ء (از مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب آنریری سکریٹری) قیمت ۴؍

نمبر ۴۔ صیغہ تعلیمات اور مسلمانوں کے حقوق (تقریر ڈاکٹر شاعت احمد صاحب پروفیسر) زیر طبع

نمبر ۵۔ صنعتی تعلیم کی حقیقت (از مسٹر جوالا سہائے) ؍؍

نمبر ۶۔ جوان العمر طبقہ کی تعلیم (از کرنل لیل او بی ای) ؍؍

نمبر ۷۔ النظر فی التاریخ الھند (از پروفیسر ابن حسن ایم اے عثمانیہ یونیورسٹی) ؍؍

نمبر ۸۔ حیاۃ النبی یا سرور کائنات صلعم کے اُسوہ حسنہ (از مولوی سید محمد سلیمان ندوی

ملنے کا پتا:۔ سپرنٹنڈنٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہان منزل علی گڈھ